جانگلوس

(آخری جلد)

جانگلوس

(آخری جلد)

[illegible]
PUBLICATIONS
714, Regal Trade Square
Preedy Street, Saddar Karachi
Ph: 0092-21-2700756

شوکت صدّیقی

جانگلوس

(جلد سوم)

رکتاب پبلی کیشنز
714 ریگل ٹریڈ اسکوائر
صدر کراچی - 74400 پاکستان

© کاپی رائٹ بحق مصنف محفوظ

اشاعت	:	جنوری 2009ء
سرورق	:	سیف
پرنٹر	:	ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
قیمت	:	-/600 روپے
ناشر	:	نثار حسین
رابطے کے لئے	:	0092-21-2700750
		0092-300-2393143

چھوٹے بیٹے
شہاب کامران صدّیقی کے نام

۴۵

رحیم داد نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے مسہری پر جمیلہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ خشک اور مٹیالا پڑ گیا تھا۔ اس نے ویران نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ "تو جو چاہتا تھا وہ ہو گیا۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "دو بجنے والے ہیں۔ تاجاں کو جلد سے جلد واپس پہنچنا ہے۔"

"ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔" رحیم داد نے بہ مشکل کہا اور کھویا کھویا سا جمیلہ کے قریب بیٹھ گیا۔

اسے سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ جمیلہ اب اس سے کچھ دور نہیں تھی۔ وہ جمیلہ، جس کے بارے میں وہ مسلسل سوچتا رہا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا رہا تھا، اس کے اتنی قریب تھی کہ وہ اس کے دل آویز چہرے کو جی بھر کے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے شاخ گل کی طرح مہکتے جسم کی خوشبو سونگھ سکتا تھا، اسے چھو سکتا تھا۔ اب وہ اس کی منکوحہ تھی، شریک حیات تھی۔ وہ اور اس کی تمام جائیداد اس کی تھی۔ مگر اتنی بڑی کامیابی کے باوجود اسے یکسوئی اور اطمینان قلب حاصل نہ تھا۔ وہ خوف زدہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

رحیم داد نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور اسے منانے کی کوشش کی۔ "بہت ناراض معلوم ہوتی ہے۔" اس نے لہجے میں حلاوت اور نرمی پیدا کی۔ "پہلے میری پوری گل سن لے۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔"

مگر جمیلہ نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے گویا ہوئی۔ "مجھے

پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے' کیا نہیں چاہتا؟ اب بتانے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔"

"نہیں' تجھے کچھ پتہ نہیں۔ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح تو سوچ رہی ہے۔" رحیم داد کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس میں معذرت تھی' عاجزی تھی۔

"فضول گلاں نہ کر۔" جمیلہ نے بے زاری سے کہا۔ "چوہدری' میں ہار گئی۔ شاہ جی جیت گیا' تو بھی جیت گیا۔ میں تو سدا سے ہارتی رہی ہوں۔ مجھ ابھاگن کے ہاتھ میں جیت کی ریکھا ہی نہیں۔"

رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر جمیلہ کے نرم و نازک رخساروں کو ہولے ہولے تھپکتے ہوئے بولا۔ "بہت ناراض لگتی ہے۔"

"میں تو کنجری ہوں۔ کنجری کی کیا ناراضی' کیا خوشی۔" جمیلہ کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ "رات گزرتی جا رہی ہے اور مجھے سویرا ہونے سے پہلے پہلے تاجاں کو لے کر پنڈ میں واپس پہنچانا ہے۔ میں تو برباد ہو چکی پر اس کا جیون برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

"نہ تو برباد ہوئی اور نہ تاجاں ہو گی۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اب وہ اپنی بدحواسی اور سراسیمگی پر قابو پا چکا تھا۔ "تو فکر نہ کر۔ تاجاں بہت شان سے ویاہ کرا کے اپنی سسرال جائے گی۔"

"چوہدری' بکواس بند کر۔ مجھے تیری کوئی گل بات نہیں سننی۔" اس نے بے زاری سے رحیم داد کو جھڑک دیا۔ "مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چوہدری دروازہ بند کر دے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا اور دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔

☆

تین بج چکے تھے۔ کہر میں لپٹی ہوئی رات دھواں دھواں تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا' ویرانی تھی۔ رحیم داد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے عقب میں جمیلہ تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اجڑ کے کھنڈر بن گیا تھا۔ روشن آنکھوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ وہ رحمتے کے ساتھ سیدھی تاجاں کے پاس گئی۔ اسے دیکھتے ہی تاجاں سسکیاں بھرنے لگی۔ جمیلہ نے بڑھ کے اسے سینے سے لگایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔ تاجاں کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

رحیم داد اور نادر خان برآمدے ہی میں مل گئے۔ چاروں حویلی کے بڑے پھاٹک سے باہر نکلے۔ جیپ تیار کھڑی تھی۔ نادر خاں پچھلی نشست پر جمیلہ اور تاجاں کے ساتھ بیٹھا۔ جیپ کا انجن شور کرتا ہوا اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے روانہ ہو گئی۔

رات کے پچھلے پہر وہ کوٹلہ ہرکشن میں پہنچ گئے۔ جمیلہ نے جیپ نہر کے کنارے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رکوائی۔ ہر طرف کہر کا غبار پھیلا تھا۔ گاؤں سو رہا تھا۔ جمیلہ جیپ سے نیچے اتری۔ اس نے تاجاں کا بازو تھام کر نیچے اترنے میں مدد کی۔ تاجاں ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ رات کے اندھیرے میں اسے اغوا کر کے احسان شاہ کی حویلی میں کیوں لے جایا گیا؟ نہ یہ معلوم تھا کہ جمیلہ اسے کس طرح واپس لائی۔ وہ خاموش اور سراسیمہ تھی۔

رحیم داد جیپ سے اتر کے جمیلہ کے پاس پہنچا اور پیار سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تاجاں کی تو بالکل فکر نہ کر۔ نادر خان اسے جنت کے پاس آرام سے پہنچا دے گا۔" اس نے ہولے سے جمیلہ کے نرم و گداز بازو کو انگلیوں سے دبایا۔ "تو میرے ساتھ چل۔"

جمیلہ نے پلٹ کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا' بے زاری سے بولی۔ "چوہدری! اب تو اپنے کمرے میں جا کر سو۔ سویرے تجھے کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔ وہ جمیلہ کی بے رخی پر کبیدہ خاطر نہ ہوا۔ اپنی کامیابی پر خوشی سے وارفتہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس نے صحن عبور کیا اور دبے قدموں حویلی کے اندر پہنچ گیا۔

جمیلہ نے جیپ کے ڈرائیور کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ جیپ مڑی اور احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ کی سمت دوڑنے لگی۔ جمیلہ نے نادر خان کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں ہدایت کی کہ وہ جنت کے پاس جائے اور نہایت احتیاط سے اس کمرے کا دروازہ کھلوائے جہاں تاجاں مانجھے بیٹھی ہوئی تھی۔

جمیلہ نے تاجاں کو اپنے پہلو سے قریب کر لیا۔ تاجاں کے ہلدی میں رنگے ہوئے مانجھے کے زرد اور ملگجے کپڑوں سے بٹنے اور پسینے کی ملی جلی بو اٹھ رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ دونوں سردی سے تھرتھراتی' کہر کی دھند میں لپٹی سنبھل سنبھل کر بڑھتی رہیں۔ جب گھر کے پچھواڑے پہنچیں تو انھوں نے چراغ کی زرد زرد روشنی میں دیکھا' جنت دروازہ کھولے دہلیز پر کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔

نادر خاں دروازے کے باہر اندھیرے میں خاموش کھڑا تھا۔ جمیلہ نے تاجاں کو سہارا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔ جنت نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی اور تالا ڈال دیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں پردا پڑا تھا۔ پردے کے دوسری طرف مہمان عورتیں اور بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ تاجاں کب کمرے سے گئی اور کس وقت

واپس آئی۔

جمیلہ تاجاں کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ احتیاط سے قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکلی۔ حویلی میں پہنچی اور زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ینا اور گڈو لحاف میں دبکے بے خبر سو رہے تھے۔ جمیلہ کا بدن سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے بستر پر دراز ہو کر لحاف اپنے ٹھٹھرتے ہوئے جسم پر ڈال لیا۔ جسم میں حدت اور حرارت پیدا ہوئی تو اسے احسان شاہ کی حویلی کی ایک ایک بات کچوکے لگانے لگی۔ وہ بے قرار ہو کر رونے لگی۔

☆

صبح ہو گئی۔ نیلگوں کہر کا گاڑھا گاڑھا غبار پھیلنے لگا۔ رات اب رخصت ہو چکی تھی۔ دودھیا روشنی دھیرے دھیرے فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ سورج مشرقی افق پر ابھرنے لگا۔ کہر میں لپٹی مٹیالی دھوپ منڈیروں پر جھلکنے لگی۔ حویلی میں رفتہ رفتہ چہل پہل ہونے لگی۔ چھاتاں کے کچھ رشتے دار اور شریکے پہلے ہی آ گئے تھے اور اب تک جو آ نہ سکے تھے وہ بھی سویرے سویرے پہنچ گئے۔

جمیلہ نے پورے گاؤں کو تاجاں کے بیاہ میں شریک ہونے کا بلاوا دیا تھا۔ سورج اوپر چڑھ کر درختوں کی شاخوں کی آڑ سے جھلملانے لگا۔ ہر طرف سنہری دھوپ بکھرنے لگی۔ حویلی کی رونق اور گہما گہمی اور بڑھ گئی۔ عورتوں اور بچوں کے شوخ اور بھڑک دار لباس سرما کی گہری بسنتی اور چمک دار دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

جمیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شام کو تاجاں کی برات آ رہی تھی۔ برات کے پہنچنے سے پہلے پہلے اسے شادی کی تمام تیاری مکمل کرنا تھی۔ اس نے نہا دھو کر جلدی جلدی ناشتا کیا۔ اونی شال اوڑھی۔ مہمان خانے میں پہنچی۔ نادر خاں اور جلیل وہاں موجود تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جمیلہ نے دونوں کو اسکول کی جانب روانہ کیا۔ برات کے ٹھہرنے کا بندوبست اسکول ہی میں کیا گیا تھا۔

دن ڈھلے چہل پہل اور بڑھ گئی۔ شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی جگہ جگہ گیس کے ہنڈے اور پیٹرومیکس روشن کر دیے گئے۔ برات کے پہنچنے کا وقت لحہ بہ لحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ اپنا دکھ درد بھول کر جمیلہ سرگرمی سے ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ پڑچھتی کے قریب نوجوان سہاگنیں اور الھڑ دوشیزائیں چادریں تانے کھڑی تھیں۔ تاجاں کو تنی ہوئی چادروں کے پیچھے سرکنڈوں کی تیلیوں سے بنے ہوئے کھارے میں غسل کے لیے بٹھا دیا گیا تھا۔ میراثن اور نوجوان لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر اونچی آواز سے گیت چھیڑا۔

بدل گئے کھارے نی بی بی، آج ہوئی پرائی

نائن نے کھارے کے نیچے دیا روشن کر دیا۔ جمیلہ قریب ہی کھڑی تھی۔ دیے کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے خوبصورت چہرے پر مسرت سے مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ آگے بڑھی، چادروں کے عقب میں پہنچی، جھکی اور مٹھی بھر ریزگاری جھلملاتے ہوئے دیے کے پاس نیک شگون کے طور پر رکھ دی۔ نائن نے ساری ریزگاری اٹھائی اور اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لی۔ یہ اس کا حق تھا۔

نائن نے تاجاں کے میلے کچیلے مانجھے کے زرد کپڑے اتار کے ایک طرف رکھ دیے۔ اس نے ڈونگے میں گرم پانی بھر بھر کے تاجاں کے بدن پر ڈالا اور خوش بودار صابن سے مل مل کر اسے غسل دینے لگی۔ جب تک تاجاں نہاتی رہی کھارا لہائی کی رسم کے مطابق پھاتاں سات بار کھارے کے سامنے سے گزری۔ مراثن نے اونچی آواز سے گیت چھیڑا۔

کھارا چڑ متر، کھارا اڈیا، کھارے توں اتارو ویر وڈیا

میراثن کے ساتھ آواز ملا کر نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی گانے لگیں۔ پھاتاں بھی ان کے ساتھ گا رہی تھی۔ گاتے گاتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ تاجاں غسل کر چکی تھی اور اس کا بھیگا ہوا بدن خشک کر کے چادر اوڑھا دی گئی تھی۔ مگر وہ کھارے میں بیٹھی رہی۔ اس کا کوئی بھائی نہ تھا جو نائن کو کھارا لہائی دیتا اور اس کا بازو تھام کر کھارے سے اٹھاتا۔ پھاتاں اپنی بیٹی کی اس محرومی پر آنسو بہا رہی تھی۔

جمیلہ تڑپ کے پھاتاں کے قریب پہنچی، تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "تو رو رہی ہے پھاتاں۔ حد کر دی تو نے۔ چنتا نہ کر۔" اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "تاجاں کا کوئی ویر نہیں تو کیا ہوا۔ میں کھارا لہائی دوں گی۔ آنسو پونچھ۔ خوشی کے سمے اس طرح آنسو نہیں بہاتے۔"

جمیلہ نے نائن کو کھارے لہائی کے پچاس روپے دیے۔ مگر نائن اڑ گئی۔ وہ زیادہ نیگ چاہتی تھی، ہنس کر بولی۔ "زمین دارنی، میں نے کھارے لہائی میں تجھ سے تو نج لینی تھی۔ نج نہ دے پر اپنی شان دیکھ کر تو نیگ دے۔" جمیلہ نے حیل حجت نہ کی۔ نائن کو سو روپے اور دیے۔ خوشی سے نائن کی باچھیں کھل گئیں۔

جمیلہ نے چادر میں لپٹی، سردی سے تھرتھراتی تاجاں کا بازو پکڑ کے اٹھایا اور سہارا دے کر کھارے سے نیچے اتارا۔ اپنی اونی شال کا پلو اس کے سر پر ڈالا، سہاگنوں اور مٹیاروں کے جھرمٹ میں تاجاں کو بڑھتی سے کمرے کی جانب لے گئی۔ تاجاں کے غسل کرنے سے کچے فرش کی جو مٹی گیلی ہو گئی تھی اسے شگون کے طور پر اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا۔

نائن بھی تاجاں کے ساتھ ساتھ پڑچھتی سے نکل کر کمرے میں پہنچی۔ اس نے سسرال سے آیا ہوا سرخ اور سنہری کاغذ کا سہاگ پڑا کھولا۔ اس میں آئینہ، کنگھی، مہندی، خوش بودار تیل، سرمہ، کاجل، زعفران، موتی، صندل اور سنگھار کی دوسری اشیا موجود تھیں۔ نائن نے تاجاں کے سر کے بالوں کو اجلے کپڑے سے خشک کیا۔ تھوڑا سا تیل تاجاں کے سر میں ڈالا۔ کنگھی سے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا، آنکھوں میں کاجل لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی کی ہلکی ہلکی تہہ جمائی، پیشانی کے بالائی حصے اور بالوں پر افشاں چھڑکی۔ سسرال سے آیا ہوا بری کا جھلملاتا ہوا سرخ جوڑا پہنایا۔ ناک کے سوراخ میں نتھ ڈالی۔ کانوں میں جھمکے پہنائے، گلے میں تختیاں ڈالیں۔ ماتھے پر ٹیکا سجایا۔ کلائیوں میں چوڑیوں کے علاوہ کنگن پہنائے۔ پیروں میں جھانجھر ڈالیں۔

تاجاں کو دلہن بنانے اور اس کا سنگھار کرنے میں نوجوان سہاگنیں اور دوشیزائیں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ نائن کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ دلہن کا بناؤ سنگھار ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ ڈھولک پر سنگھار کے گیت بھی گونجتے رہے۔

کنگھے نی رنگ رتے، میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے نائناں تو پچھو
مندی نی رنگ رتے، میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جاکے پنساری تو پچھو
دلیرے سرب سہاگنے میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے سنیارے تو پچھو

سنگھار کے بعد تاجاں کا چہرہ تر و تازہ گلاب کے مانند شگفتہ اور دل آویز نظر آرہا تھا۔ گوٹا کناری لگے سرخ عروسی جوڑے میں، زیورات سے سجی بنی وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ جمیلہ نے گھونگھٹ اٹھایا۔ تاجاں کا تابندہ چہرہ دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ٹھوڑی اٹھا کے تاجاں کا چہرہ اوپر کیا اور بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

سنگھار کے گیت گونجتے رہے۔ کھنکتی ہنسی کی چھاگلیں بجتی رہیں۔ یکایک غلغلہ پڑا۔ "جنج آگئی جنج آگئی۔" نوجوان عورتیں، الھڑ کنواریاں اور بچے برات دیکھنے دوڑے۔

برات گاؤں کی گلیوں سے گزر کر حویلی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ برات کے آگے ڈھول اور بین باجے بج رہے تھے۔ پٹاخے داغے جا رہے تھے۔ پھل جھڑیاں اور ماہ تابیاں چھوڑی جا رہی تھیں۔ برات کے ساتھ گیس بتیاں روشن تھیں۔ ان کی تیز روشنی میں دولھا پھولوں کے زرتار سہرے سے

چہرہ چھپائے گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے گھوڑوں، تانگوں اور ریڑھوں پر سوار براتی تھے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی پیدل چل رہی تھی۔ وہ رک رک کر بھنگڑا ڈالتے اور کانوں پر ایک ہاتھ رکھ کر اونچی آواز سے تان لگاتے۔ کوئی ٹپّا الاپتے۔ برات میں شامل عورتیں اور لڑکیاں سر سے سر ملا کر بیاہ کے گیت گا رہی تھیں۔

گاؤں کی عورتیں اور مٹیاریں چوباروں اور چھتوں سے برات گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ برات حویلی کے عین سامنے پہنچی تو منڈیروں کی آڑ سے جھانکتی ہوئی تاجاں کی سہیلیاں اور نوجوان رشتے دار عورتیں تالیوں کی تھاپ پر ہنس ہنس کے سٹھنی اور کامن گیت گانے لگیں جن میں دولھا اور براتیوں پر پھبتیاں کسی جا رہی تھیں۔

چرکا کیوں ڈھکا لاڑیا، وے چرکا کیوں ڈھکا؟
جلی سکنے پائی وے، تیری ماں سکنے پائی وے!
لاڑیا کسوتریا، تیری ماں منجے تے موتریا!!
تک وڈھیاوے، تیری ماں منجے تے ہگیا!

مگر براتی عورتوں اور لڑکیوں نے اس طعنہ زنی پر نہ جوابی گیتوں کے ذریعے دلہن اور اس کے رشتہ داروں اور شریکوں کی دل آزاری کی کوشش کی اور نہ کسی طرح کی جھنجلاہٹ اور خفگی کا اظہار کیا، مسکراتی رہیں اور گیتوں کی تلخی اور استہزا برداشت کرتی رہیں۔

دولھا کی ماں کا اشارہ ملتے ہی برات کے ساتھ آنے والی میراثن نے اونچی آواز سے ایک گیت چھیڑا۔ برات میں شامل لڑکیوں اور عورتوں نے بھی اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ اس گیت میں طنز اور طعنہ زنی کے بجائے محبت کی حلاوت رچی ہوئی تھی۔

ہس کے بلا، دل ہو گیا رضا
ساڈا پردیساں دا راکھا اے خدا
ڈھولکی بجا، ذرا ہس کے بلا
لوکاں بے سمجھیاں دی جانے کی بلا
گولی ہاں میں تیری، میرا جانندا خدا
ماپے تیرے آپے پئے کرن گے نکاح

حویلی کی چھت پر کھڑی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں نے یہ گیت سنا تو ان کی آوازیں مدّھم پڑ گئیں۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر نہیں رہی۔ دفعتہً قہقہے بلند ہوئے اور تالیاں بھی بجنے لگیں۔ دولھا کا ہنس

ہنس کر اس طور خیر مقدم کیا گیا۔

کی کراں کریاں، آج بنا تھی آیا مہمان

برات دھیرے دھیرے حویلی کے سامنے سے گزرتی ہوئی اسکول کے قریب پہنچی۔ وہاں برات کا خیر مقدم کرنے کے لیے رحیم داد پہلے سے موجود تھا۔ اس نے بڑھ کر براتیوں کا استقبال کیا۔ ایک ایک سے مصافحہ کیا، گلے ملا، خیریت پوچھی، دولھا کو مسند پر بٹھایا۔ مسند پر حویلی کے بڑے کمرے کا قالین بچھا تھا۔ آگے دریاں تھیں جن پر چاندنی کا فرش تھا۔ دولھا کے بیٹھتے ہی حویلی کے نائی نے اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ڈالی اور دودھ پلایا۔ یہ پُش کارہ تھا۔

پش کارے کی رسم کے بعد براتیوں کے سامنے حقے تازہ کر کے رکھے گئے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر براتیوں کے لیے ہر کمرے میں انگیٹھی روشن تھی۔ رضائیوں کا بھی بندوبست تھا۔

کھانے کے بعد رات گئے تک رونق رہی۔ رحیم داد دولھا کے باپ اور رشتے داروں کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ اسکول کی عمارت میں گیس بتیوں کی تیز روشنی تھی اور ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔

☆

آدھی رات ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نادر خاں اور جلیل کو مہمانوں کی دیکھ بھال پر لگا کر وہ حویلی میں چلا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا زینے کے قریب پہنچ گیا۔ سیڑھیاں طے کیں، جمیلہ کے کمرے کی جانب چلا، آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مگر اس کی لو مدّھم تھی۔ بستر پر جمیلہ کی بیٹی نینا لیٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لحاف میں دبکا ہوا گڈو بھی سو رہا تھا۔ ایک گوشے میں انگیٹھی رکھی تھی۔ اس کے قریب ہی چٹائی پر دوہرا اوڑھے حویلی کی ملازمہ تاراں بے خبر سو رہی تھی۔

کمرے میں جمیلہ نہیں تھی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد کمرے کے باہر چھت پر آہٹ ابھری۔ رحیم داد چونکا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھا، باہر نکلا۔ ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کہر کی گاڑھی گاڑھی دھند میں رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ چاپ رفتہ رفتہ مدّھم پڑ گئی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ رحیم داد دیر تک ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر نیچے اتر گیا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

وہ زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ نکاح کے لیے فجر کی نماز کے بعد کا وقت مقرر ہوا تھا۔ اذان ہونے سے

پہلے پہلے رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کے جلدی جلدی اسکول کی عمارت میں پہنچ گیا۔ تمام براتی جاگ رہے تھے۔ جو سو گئے تھے وہ بھی اب بیدار ہو چکے تھے۔ نکاح خواں وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ نماز کے بعد نکاح پڑھایا گیا۔ براتیوں کی جانب سے چھوارے اور مکھانے نچھاور کیے گئے۔ رحیم داد نے دولھا اور اس کے باپ کو مبارک باد دی اور گرم جوشی سے دولھا کو گلے لگایا۔

جمیلہ بھی نکاح کے وقت دوسری عورتوں کے ساتھ عروسی جوڑے میں ملبوس تاجاں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہو گیا اور نکاح کی رسم مکمل ہو گئی تو جمیلہ نے آگے بڑھ کر تاجاں کو سینے سے چمٹا لیا۔ تاجاں رو رہی تھی۔ جمیلہ کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔

جمیلہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔ پھاتاں نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے جمیلہ کو اشارہ کیا اور دونوں آنگن میں پہنچ گئیں۔ پھاتاں حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔ جمیلہ کو بھی فکر ہوئی۔ لیکن اس نے تحمّل کیا اور خاموش کھڑی رہی۔

پھاتاں ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "بھین جی! برا نہ منا تو ایک گل پوچھوں؟"

"پوچھ، ضرور پوچھ۔" جمیلہ نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر تو تو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔"

"گل ہی ایسی ہے جی۔" پھاتاں بے قراری سے بولی۔ "میں نے سنا ہے تو نے پرسوں رات پیراں والہ میں احسان شاہ کے سامنے چوہدری سے نکاح پڑھوا لیا۔" اس کی آواز اٹکنے لگی۔ "مجھے تو شام ہی کو پتہ چل گیا تھا۔ میں تو سنتے ہی اچنبھے میں رہ گئی۔ بھین جی! یہ سب ہوا کیسے؟ سمجھ نہیں آتی، تو سچ سچ بتا۔"

جمیلہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسے دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ یہ راز رحیم داد یا نادر خاں کے سوا کوئی اور افشا نہیں کر سکتا تھا۔ جمیلہ اپنا غم و غصہ پھاتاں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور پھاتاں سے صرف اتنا پوچھا۔

"تجھے یہ بات کس نے بتائی؟"

"یہ بات تو سبھی کو ملوم ہے۔ براتیوں تک کو پتہ ہے۔" پھاتاں نے مطلع کیا۔ "مجھ سے تو اس بارے میں پھاتاں کی ساس بھی پوچھتی تھی۔" اس نے جمیلہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "کیا یہ سچ ہے بھین جی؟"

"ہاں پھاتاں! میں نے چوہدری سے ویاہ کر لیا۔" جمیلہ انکار نہ کر سکی۔ لیکن اس نے فوراً بات بنائی۔ "تجھے تو پتہ ہے۔ تاجاں کے سسرال والوں نے جھگڑا ڈالا تھا کہ میں رنڈ بیوہ ہوں' اس کارن تاجاں کے ویاہ میں نہیں بیٹھ سکتی۔" اس نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پر تاجاں تو میری دھی سمان ہے ناں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس کے ویاہ میں نہ بیٹھوں' سو میں نے نکاح کر لیا۔ رنڈ نہیں رہی' سہاگن بن گئی۔ تو تاجاں کی ساس سے کہہ دینا' اب تو اسے میرے بارے میں کوئی گلہ نہیں رہا۔"

پھاتاں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بھین جی! میں تاجاں کی ماں ہوں پر اس کے پیار میں تو مجھ سے بھی آگے نکل گئی۔ بھین جی! تو کتنی چنگی ہے' میرے پاس تیرے لیے دعا نکالنے کو بول نہیں رہے۔" وہ جمیلہ کے کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگی۔

جمیلہ نے اس کی پیٹھ ہولے ہولے تھپ تھپائی۔ "خوشی کے سمے تو رو رہی ہے پھاتاں!" وہ زیر لب مسکرائی۔ "اب یہ رونا رلانا چھوڑ۔ تو نے ابھی کئی کام کرنے ہیں۔"

پھاتاں نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور جمیلہ کے ساتھ پھر تاجاں کے پاس پہنچ گئی۔ دونوں سب کچھ بھول بھال کر ایک بار پھر شادی کے ہنگاموں میں کھو گئیں۔

☆

سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ گیا۔ حویلی کے سامنے میدان میں دیگیں چڑھی تھیں۔ پلاؤ' زردہ اور قورمہ پک رہا تھا۔ ایک طرف بڑا سا تندور لگا تھا جس سے تندوریا گرم گرم روٹیاں نکال رہا تھا۔ ہر طرف طرح طرح کے کھانوں کی مہک پھیلی تھی۔

دوپہر کے کھانے پر بھی رحیم داد موجود تھا۔ وہ ہر براتی اور مہمان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا اور اصرار کر کے کھانا کھلا رہا تھا۔ اس کے رویّے میں میزبان کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حویلی کے سربراہ کا طنطنہ بھی جھلک رہا تھا۔ ہر کام اس کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ وہ اونچے طرّے کی پگ سر پر رکھے' آن بان سے کرسی پر بیٹھا احکام جاری کر رہا تھا۔

مرد کھانا کھا چکے تو رحیم داد نے نادر خاں کو طلب کیا اور گردن اونچی کرتے ہوئے بولا۔ "نادر! اب تو زمیں درانی کے پاس جا۔ اسے کہہ کہ زنانیوں کے لیے روٹی کا بندوبست کرے۔"

نادر خاں اس کی ہدایت پر فوراً حویلی کی جانب چلا گیا۔

جمیلہ پہلے ہی عورتوں کے لیے دسترخوان بچھوا کر کھانا لگوا چکی تھی۔ وہ مہمانوں کے درمیان سرگرمی سے ادھر ادھر بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھی۔ وہ بظاہر بہت مسرور اور شادمان نظر آ رہی تھی۔

مہمان کھانے سے فارغ ہوئے تو جمیلہ نے تاجاں' پھاتاں' جنت اور زینت کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کچھ دیر بستر پر لیٹ کر آرام کیا۔ سورج مغرب کی سمت ڈھلکنے لگا تھا۔ دھوپ کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ سائے بڑھنے اور پھیلنے لگے تھے۔ وہ جلد ہی اٹھ گئی۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا' بال خشک کیے۔ تھوڑا سا تیل ڈال کر اہتمام سے بال سنوارے' آنکھوں میں دنبالہ کاجل لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی کی ہلکی سی تہہ جمائی۔ ماتھے پر جڑاؤ جھومر سجایا' کانوں میں مندرے پہنے' کلائیوں میں کنگن ڈالے۔ بائیں ہاتھ میں ہاتھی دانت کا منقش چوڑا پہنا۔ گہری نارنجی ریشمی شلوار اور اسی رنگ کی قمیص پہنی۔ قمیص کے گریبان اور آستینوں پر سبز اور سیاہ دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ اس نے آئینے کے روبہ رو اپنے سنگھار کا جائزہ لیا اور سنہرے کنارے کی فیروزی شال اوڑھ لی۔

اس سج دھج سے وہ دلہن کے پاس پہنچی تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے محفل میں چاند اتر آیا ہو۔ اس کے شگفتہ اور تابندہ چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ راج ہنس کی طرح گردن اٹھائے ہنستی مسکراتی چکاچوند پیدا کرتی مہمان عورتوں کے درمیان بیٹھ گئی۔

دن ڈھلے دولھا زنان خانے میں بلایا گیا۔ پھاتاں کے اصرار پر جمیلہ نے دولھا کو نیم گرم دودھ پلایا۔ پھاتاں نے مٹھائی کی تھالی بڑھا کے اس کے سامنے کر دی۔ جمیلہ نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دولھا کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ مسکرائی اور دل جوئی سے اسے مٹھائی کھلائی۔ سلامی میں پانچ سو روپے اور ایک گھڑی دی۔ تاجاں کی رشتے دار اور دوسری عورتوں نے بھی حسب توفیق سلامی دی۔

سلامی کے دوران تاجاں کی سہیلیاں اور دوسری مہمان لڑکیاں دولھا سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ اسے طرح طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ دولھا کی بہنیں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنے دوپٹوں کے جھل ملاتے آنچلوں سے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ قہقہے گونجتے رہے۔ میراثن نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے ایک چھند گیت شروع کیا۔ گیت کے بولوں میں بھی دولھا سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔

چنڈیر آگے آیئے جایئے' چھنڈیرا گے شگنا
اک ویاہ کے لے چلے دوجا جیتھے شگنا!
چھنڈیرا گے آیئے جایئے' چھنڈیرا گے کولا
پرہاں ہو کے بولو کڑیو' جمیرا پالیا رولا

دن اور ڈھل گیا۔ سائے طویل ہو گئے۔ رحیم داد دولھا کے باپ اور دوسرے براتیوں کو کھٹ دکھائی کے لیے اپنے ہم راہ مہمان خانے میں لایا۔ یہاں صحن میں چارپائیوں پر جہیز کے رنگین اور چمکتے ہوئے ملبوسات اور دیگر ساز و سامان سجا کر رکھا گیا تھا۔ براتی جہیز سے سجی ہوئی کسی چارپائی کی جانب بڑھتے تو ڈھولی گردن میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور سے چوٹ لگاتا۔ حویلی کا میراثی آگے بڑھ کر ہر سامان کے بارے میں براتیوں کو بتاتا۔ براتی باری باری ہر چارپائی کے قریب جاتے۔ سلیقے سے سجا سجایا جہیز دل چسپی اور اشتیاق سے دیکھتے۔ وہ خاصے مرعوب نظر آرہے تھے۔ جمیلہ نے بڑے اہتمام اور لگن سے جہیز تیار کیا تھا۔ جہیز براتیوں کی توقع سے زیادہ قیمتی اور شان دار تھا۔ وہ حیرت سے ہاتھ بڑھا کر ہر چیز احتیاط سے چھوتے اور مسکرا کر اپنی پسند کا اظہار کرتے۔

شام کا جھٹ پٹا ہوتے ہی براتیوں کی جانب سے رخصتی کا تقاضا شروع ہوا۔ انھیں لگ بھگ آٹھ میل فاصلہ طے کرنا تھا۔ اندھیرے کے ساتھ سردی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ سورج کی کرنیں حویلی کی منڈیروں پر دھندلی پڑتی جارہی تھیں۔ شام ہولے ہولے نیچے اتر رہی تھی۔

رخصتی کے وقت تاجاں بلک بلک کر رونے لگی۔ ہر چہرہ سوگوار ہو گیا۔ جمیلہ تاجاں کو تسلی دینے لگی۔ مگر تسلی دیتے دیتے بے اختیار خود جمیلہ کا دل بھر آیا۔ اس نے آنچل سے آنسو پونچھے، تاجاں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر کھڑا کیا اور سہارا دیتی ہوئی کمرے سے نکل کر آنگن میں پہنچی۔

بیرونی دروازے کی دہلیز پر ڈولی رکھی تھی۔ جمیلہ اور دوسری عورتیں تاجاں کے ہم راہ ڈولی کی جانب بڑھیں۔ پھاتاں بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ میراثن نے رخصتی کا گیت چھیڑ دیا۔

لے چلے بابلا لے چلے
مینوں ڈولی پا کہار
بابلا لے چلے
رکھ لے بابلا، ہن دہاڑے چار
ہن کی بابلا تیرا دعوا
دس پرائی کوڑا بابلا

میراثن سوز بھری لے میں سندھا گا رہی تھی۔ گیت کے بولوں میں ایسا درد تھا، ایسی کسک اور چبھن تھی کہ ہر شخص تڑپ اٹھا۔ ہر آنکھ پر نم ہو گئی۔ گیت کے اتار چڑھاؤ میں وہی ہل چل تھی جو دلھن بن کر ہر دوشیزہ کے دل میں رخصتی کے وقت طرح طرح کے خدشات اور وسوسوں میں ڈھل

کر موج زن ہوتی ہے۔ یہ اس کے مچلتے امڈتے اور تڑپتے احساسات تھے جو منڈھے کے بول بن کر اس طرح فریاد کناں تھے۔

بابل' میری ڈولی لے کر کہار جا رہے ہیں
بابل' مجھے چند روز کے لیے اپنے پاس اور رہنے دے
دیکھ بابل' اب مجھ پر تیرا کیا دعوا
میں تو پرائے دیس کی ہو چکی

تاجاں زاروقطار رو رہی تھی۔ جمیلہ کی آنکھوں سے بھی جھڑی لگ گئی تھی۔ اس کے سلگتے ارمان سینے میں دھواں بن کر امڈ رہے تھے' بادل بن کر برس رہے تھے۔ اسے اپنے بابل کے گھر سے دلھن بن کر اس طرح رخصت ہونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ بہت دن ہوئے اس نے بھی ایک الّھڑ دوشیزہ کی طرح دلھن بننے کے خواب دیکھے تھے۔ اس کے خواب ادھورے ہی رہ گئے۔ رخصتی کے درد کی کسک محسوس کرنے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا۔ آج تاجاں کو رخصت کرتے ہوئے وہ اس درد کی لذت محسوس کر رہی تھی۔ میراثن گا رہی تھی۔

لے چلے بابلا' لے چلے
میتوں ڈولی پا کہار

ڈولی میں سوار ہونے سے پہلے تاجاں تڑپ کے جمیلہ کے سینے سے چمٹ گئی۔ جمیلہ اسے سینے سے لگائے آنسو بہاتی رہی۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ گیس بتیاں روشن کر دی گئی تھیں۔

جمیلہ نے تاجاں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بھاتاں اور دوسری عورتوں کی مدد سے تاجاں کو ڈولی میں سوار کرایا۔ منڈھے کے بول اونچے اور اونچے ہوتے گئے۔ میراثن کی آواز کا سوز فضا میں بکھرتا جا رہا تھا۔

سرما کی کہر آلود شب اداس اور نڈھال کھڑی تھی۔ ہر طرف سسکیاں ابھر رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔

کہاروں نے ڈولی اٹھائی۔ برات' ڈھول اور بین باجے بجاتی' پٹاخے چھوڑتی رخصت ہو گئی۔ تاجاں اپنے دولھا کے ساتھ سسرال چلی گئی۔ حویلی کی چہل پہل ماند پڑنے لگی۔ کھنکتے قہقہوں کے جل ترنگ خاموش ہو گئے۔

کچھ مہمان عورتیں شام ہی کو رخصت ہو گئی تھیں۔ جو ٹھہر گئی تھیں' جمیلہ ان کے ساتھ کچھ دیر

بیٹھی رہی۔ وہ بہت بجھی بجھی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچی۔

رحیم داد دروازے پر موجود تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جمیلہ نے اشک آلود نظروں سے اسے دیکھا' گردن جھکائی اور زینے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ وہ بہت شکستہ اور دل گرفتہ تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ حویلی پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ جمیلہ کمرے میں تنہا تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اچانک کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ جمیلہ نے حیرت سے دیکھا' رحیم داد دروازے پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جمیلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اطمینان سے جمیلہ کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر رحیم داد کی آواز ابھری۔

"جمی لے!"

جمیلہ نے چونک کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس نے پہلی بار جمیلہ کو اس قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا تھا۔ صرف اللہ وسایا مرحوم اسے پیار سے "جمی لے" کہتا تھا۔ کمرے میں سلگتی ہوئی انگیٹھی کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ ان میں ایسی تیز اور چبھتی ہوئی چمک تھی کہ وہ دم بہ خود رہ گئی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ رحیم داد اس کے دل میں امڈتی ہوئی ہل چل سے بے نیاز زیرلب مسکراتا رہا۔ اس نے پیار جتانے کی کوشش کی۔

"جمی لے! تو اتنی اداس اور پریشان کیوں ہے؟"

"ہاں چوہدری! میں بہت نراش اور دکھی ہوں۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"تو نے خاماخا کی پریشانی مول لے رکھی ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "لگتا ہے' جانے کب سے بیمار ہے۔ تو نے تاجاں کا ویاہ تو ایسی دھوم دھام سے کیا جیسے تیری اپنی دھی ہو۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ وہ میری دھی سمان ہے۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "نہ اس کا پیو ہے' نہ ویر ہے' نہ کوئی بھین' میرا بھی کوئی نہیں۔ میں اسے....."

رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "ایسا کیوں سوچتی ہے۔ تو مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟"

جمیلہ گم صم بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے دل جوئی کی کوشش کی۔ "لگتا ہے' تجھے تاجاں سے بہت

پیار ہے۔"

جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس سے اتنا پیار نہ ہوتا تو میں احسان شاہ کی حویلی میں کیوں جاتی۔ اسے واپس لانے کے لیے تیری اور احسان شاہ کی ہر گل بات کیوں مان لیتی۔ پر چوہدری تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تلخی اور کاٹ محسوس کی۔ آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس کے بارے میں نہ سوچ۔ آگے کی سوچ۔"

"آگے کی کیا سوچنا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "میں نے تو اسی حویلی میں رہنا ہے۔ تیری گھر والی ہی بن کے رہنا ہے۔"

رحیم داد جھوم اٹھا مگر اس نے اپنی وارفتگی کا اظہار نہیں کیا۔ نادم اور پشیمان ہونے کے انداز میں نظریں جھکا کر گویا ہوا۔ "تیری ناراضی بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اس رات تجھے بہت دکھ پہنچایا۔ مجھے بھی اس کا دکھ ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے جمیلہ کے چہرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ گہری سانس بھری اور چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ "جمی لے! تو اتنی سوہنی ہے' اتنی خوبصورت ہے کہ بس یہی جی کرتا ہے تو میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں تجھے دیکھتا رہوں۔" وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی انگلیوں میں بھینچ لیا۔

جمیلہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا' مسکرائی اور گردن کو خم دے کر دیکھا۔ "پیار ہی جتانا ہے تو آرام سے جتانا۔ آج مجھے نیند لگ رہی ہے۔ طبیعت بھی گڑبڑ ہے۔ تو بھی اپنے کمرے میں جا کر سو۔"

"نہیں' میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ بچوں کی طرح مچلنے لگا۔ جمیلہ کے رخسار پر ہولے سے چٹکی بھر کر بولا۔ "میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تو بہت پریشان لگ رہی ہے۔"

"چوہدری! ضد نہ کر۔" جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "میں نے کہہ دیا نا کہ میری طبیعت آج ٹھیک نہیں۔ سر میں درد بھی ہے۔"

"تو آرام سے لیٹ جا۔" رحیم داد خوشامد پر اتر آیا۔ "لا' میں تیرا سر دبا دوں۔ تو سو جائے گی تو میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔"

"مجھے تنگ نہ کر۔" اس دفعہ جمیلہ نے بیزاری سے کہا۔ "اب تو جا۔ مجھے اس سمے اکیلا ہی چھوڑ دے۔ مجھے اکیلے ہی میں آرام ملے گا۔" اس نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے پہلے ہی کم گھاؤ لگائے ہیں' اب اور تنگ نہ کر۔"

رحیم داد نے جمیلہ کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گیا۔ "جیسی تیری مرضی۔" وہ روٹھنے کے انداز میں بولا۔ "میرے یہاں ٹھہرنے سے تجھے تکلیف ہوتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"برا نہ منا۔" جمیلہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سچ جان' میری طبیعت اس سے ٹھیک نہیں۔ میں سویرے تیرے پاس آؤں گی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ منہ لٹکائے باہر چلا گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ جب سناٹے میں مکمل مل کر ڈوب گئی تو جمیلہ بستر سے نیچے اتری' آگے بڑھی۔ اس نے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور بستر پر لیٹ گئی۔

دوسرے روز وہ رحیم داد کے پاس نہیں گئی۔ اس نے سویرے ہی سویرے جلیل کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جلیل ابھی تک اپنی بیوی' زینت اور بچوں کے ساتھ حویلی میں ٹھہرا تھا۔ جمیلہ نے اپنا ایک خط دے کر جلیل کو نہال دین کے پاس شامار کے روانہ کر دیا۔

جلیل کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اتری اور سیدھی ان مہمانوں کے پاس چلی گئی جو تاجاں کے بیاہ میں شرکت کرنے آئے تھے۔ وہ تمام وقت انھی کے ساتھ رہی۔ دونوں وقت کا کھانا بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا اور رات گئے تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ جب اندھیرا بڑھ گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو وہ زینت کے ہم راہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جلیل ابھی تک شامار کے سے واپس نہیں آیا تھا۔

رحیم داد اپنے کمرے میں بیٹھا جمیلہ کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی مضطرب نظریں دالان میں کھلنے والے دروازے کی جانب بار بار اٹھ جاتیں لیکن دروازہ نہ کھلا۔ رحیم داد نے بھی جمیلہ کے کمرے کی جانب جانے سے خود کو روکے رکھا۔

ایک اور رات گزر گئی۔

دوپہر تک رحیم داد' جمیلہ کے آنے کی آس میں کمرے میں ٹھہرا رہا اور آخر اکتا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ ادھر ادھر بے زاری سے گھومتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد واپس اپنے کمرے میں آیا اور کھانا کھا کے تھکا ہوا سا بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو وہ کمرے میں تنہا تھا۔ جمیلہ اس کے دروازے کے سامنے سے گزری۔ اس کے ہم راہ جلیل' زینت اور ان کے بچے تھے۔ وہ دیپال پور واپس جا رہے تھے۔ جمیلہ انھیں رخصت کرنے حویلی کے پھاٹک تک گئی۔ پھاٹک کے عین سامنے تانگا کھڑا تھا۔ جلیل' بیوی بچوں کے ساتھ تانگے

میں سوار ہو گیا۔

واپسی پر جمیلہ ایک بار پھر رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ رحیم داد بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز سے جمیلہ کو ٹوکا۔ "جمی لے!"

وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "تو کل سویرے آئی نہیں۔ میں رات کو بھی دیر تک تیرا انتظار کرتا رہا۔ تو مہمانوں کے پاس بیٹھی گلاں کرتی رہی۔ وہاں سے اٹھی تو ادھر نہیں آئی۔ زینت کے ساتھ سیدھی اوپر چلی گئی۔"

جمیلہ خاموش بیٹھی رہی۔

مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجہ بدل کے قدرے مسکرایا۔ "اب تو تجھے ویاہ کے چکروں سے چھٹی مل گئی۔ سوچتا ہوں' سامان اوپر بھیج کر میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں تو اکیلے بہت جی گھبراتا ہے۔"

"تو پہلے بھی تو اسی کمرے میں اکیلا رہتا تھا' چند روز اور ٹھہر جا۔ فیر آجانا۔ اب تجھے روک بھی کون سکتا ہے۔"

"سامان تو کل سویرے بھی پہنچ سکتا ہے۔" جمیلہ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو وہ اترانے لگا اور بے تکلفی سے بولا۔ "میں تو آج تیرے ہی پاس رہوں گا۔ تیرے بنا اب مجھے نیند نہیں آتی۔" اس نے ایسی چبھتی ہوئی نگاہوں سے جمیلہ کی جانب دیکھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں۔ رحیم داد اور بے قابو ہو گیا۔ "سچ' آج تو بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔"

جمیلہ نے نرمی سے انکار کر دیا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے' تاجاں آج ہی مکلاوے پر آئی ہے۔ وہ میرے ہی ساتھ ٹھیری ہے۔"

"تو نے اس کا ویاہ کر دیا اور بہت دھوم دھام سے کر دیا۔" رحیم داد نے برہمی کا اظہار کیا۔ "اب مکلاوا شکلاوا چھوڑ' اس چکر میں زیادہ نہ پڑ۔ بہت ہو گیا۔"

"چوہدری! تو کیسی گلاں کر رہا ہے۔" جمیلہ نے کسی قدر ناز سے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "جب اس کا ویاہ کیا ہے تو ساری ہی ریتاں رسماں کرنی پڑیں گی۔ مکلاوا بھی کرنا پڑے گا۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

رحیم داد تیوری پر بل ڈال کر تیز لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں اب یہ چکر ختم ہو جائے۔"

"نراض نہ ہو۔" جمیلہ نے رسان سے کہا۔ "دو تین روز اور شانت رہ۔ تاجاں روز روز تو آنے

سے رہی۔ اب وہ پرائے گھر کی ہو چکی ہے۔"

"تو نے تاجاں کے بہت لاڈ کر لیے' آگے جو ہونا ہے' پچاتاں سے کہہ کہ وہ کرے۔ وہ اس کی ماں ہے۔ اس نے بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔ تو نے ہریات کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔"

"ٹھیک ہے' جیسا تو کہہ رہا ہے' ویسا ہی ہو گا۔" جمیلہ اس دفعہ بھی نرمی سے بولی اور کھڑی ہو گئی۔ "میں نے اب جانا ہے۔"

"چلی جانا۔ کچھ دیر اور ٹھہر جا۔"

"مجھے اب نہ روک۔" وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ "مہمانوں میں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ تو روٹی کھا اور سو جا۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ رحیم داد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

دو دن اور گزر جانے کے باوجود جمیلہ اس کے پاس نہیں آئی۔ تیسرے روز تاجاں اپنے دولہا کے ہم راہ چلی گئی۔ رحیم داد نے دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا مگر زیادہ دیر کمرے میں نہ ٹھہر سکا باہر نکل گیا۔

☆

سہ پہر کو نہال دین آگیا۔ رحیم داد اس وقت تک واپس حویلی میں نہیں آیا تھا۔ وہ ربیع کی فصلوں کی دیکھ بھال کی غرض سے کھیتوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ نادر خان لاہور گیا تھا۔ جمیلہ نے اس سے کچھ ایسی دوائیں منگوائی تھیں جو لاہور ہی میں مل سکتی تھیں۔

جمیلہ اپنے کمرے ہی میں تھی۔ اس نے نہال دین کو وہیں بلوا لیا۔ وہ اسے بہت عرصے سے جانتی تھی۔ اللہ وسایا سے ملنے' پہلے بھی نہال دین کئی بار حویلی میں آچکا تھا' مگر اللہ وسایا کے قتل کے بعد اس روز پہلی بار آیا تھا اور جمیلہ کے بلوانے پر آیا تھا۔ وہ جمیلہ کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ آدھ گھنٹے بعد نیچے اترا اور خاموشی سے چلا گیا۔

غروب آفتاب سے کچھ ہی دیر قبل رحیم داد اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر ایک پیالی گرم گرم چائے پی۔ شام ہو گئی۔ رحیم داد نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو اس نے جمیلہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ جمیلہ دروازہ کھول کر داخل ہوئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر تابندگی اور نکھار تھا۔ وہ اس وقت بن سنور کر آئی تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین اور دل ربا لگ رہی

تھی۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو بے قرار ہو گیا۔ سینے میں ہوک سی اٹھی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جمیلہ کرسی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ رحیم داد پھر بھی نہ بولا۔ آخر جمیلہ نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"چوہدری! تو چپ کر کے اس طرح کیوں بیٹھا ہے؟"

"یہ بتا تو مجھ سے کب تک دور دور رہے گی۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "اب تو سارے مہمان شیمان چلے گئے پر تیرے دھندے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔" اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "صاف، صاف بتا، تو چاہتی کیا ہے؟"

رحیم داد کے چہرے کی تلخی جمیلہ نے بخوبی محسوس کی۔ لیکن وہ مرعوب نہیں ہوئی، کھل کر مسکرائی۔ "ایک گل پوچھوں، صاف صاف بتائے گا؟"

"پوچھ، کیا پوچھنا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"چوہدری! کیا تو سچ مچ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے؟"

"تجھے کیا پتہ، میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔" رحیم داد وارفتہ ہو کر بولا۔ "تیرے لیے تو میں نے بھکر میں تک کھے پیر کی زیارت پر منت تک مانی۔ میری ایک پگ میں اب تک منت کی گرہ لگی ہے۔ میں نے اس پگ کو سنبھال کر الگ رکھ چھوڑا ہے۔"

"تو بھکر بھی گیا تھا؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"جن دنوں تو مجھ سے ناراض تھی اور بات کرنی چھوڑ رکھی تھی، میں بھکر چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے منت مانی کہ تو سدا کے لیے میری بن جائے۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔ تو نے دیکھ لیا میری مراد کس طرح پوری ہوئی اور تو مجھے مل گئی۔ یہ سب کچھ منت ہی کا نتیجہ ہے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" جمیلہ نے نظریں نیچی کرلیں۔ "لگتا ہے تکھا پیر بہت زبردست بزرگ رہا ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ اس کی زیارت کو بھکر چلوں گی۔"

"ضرور چل، بھکر میں میرا یار سردار مراد خاں شاہانی رہتا ہے۔ دونوں اس کی حویلی میں ٹھہریں گے۔" رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔ "مراد خان، بیٹ کا وڈا زمیں دار ہے۔ بہت شان ہے اس کی۔ حویلی بھی شان دار ہے۔"

"مراد خان شاہانی سے تیری کب کی دوستی ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"اب تو میری گھر والی بن گئی ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ تجھے صاف صاف بتا دوں گا۔ پر تو میرے پاس بیٹھتی ہی کب ہے۔ اب تک تجھے بتا بھی چکا ہوتا۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر پہلے مجھے یہ بتا' آج رات تو میرے پاس یہیں رہے گی یا میں تیرے ساتھ اوپر چلوں؟"

"تو نے ابھی روٹی نہیں کھائی۔ روٹی کھا کر میرے پاس آجانا۔"

"میں روٹی تیرے ساتھ ہی کھاؤں گا۔" رحیم داد ضد کرنے لگا۔ "میں تو ابھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تو میری گھر والی ہے۔ اب یہ کوئی راز نہیں رہا۔ سب کو پتہ ہے۔"

"تو نے ہی سب کو بتایا ہے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جھوٹ، تو نہیں بتایا۔ نراض کیوں ہوتی ہے۔" رحیم داد ڈھٹائی سے ہنس کر بولا۔ "تیرے ساتھ میرا باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔ پیراں والہ کے ملّا نے پڑھایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کب انکار کیا۔" جمیلہ نرم پڑ گئی۔ "تو الٹی سیدھی گلاں سوچ کر اپنے تئیں پریشان نہ کر۔" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نگاہوں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بات کیول اتنی ہے کہ میرے پاس پھاتاں اور پنڈ کی کئی دوسری زنانیاں آرہی ہیں۔ ان سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ سمجھ گیا ناں؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پر تو پھاتاں شاتاں کا چکر اب چھوڑ دے تو زمین دارنی ہے' مزارعوں اور کمیوں کی زنانیوں سے تیرا میل ملاپ مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"لے' تو نے ابھی سے مجھ پر رعب جمانا شروع کر دیا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ چنبیلی کی کلیوں کے سے اس کے سفید سفید دانت جھلکنے لگے۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی روشنی میں دیکھی۔ "چوہدری! ابھی سات بجے ہیں۔ وہ دو اڑھائی گھنٹے سے کم تو میرے پاس نہیں ٹھیریں گی۔ تو دس بجے تک آجانا۔ کل سویرے اپنا سامان بھی اوپر بھجوا دینا۔ اب تجھے وہیں رہنا ہے ناں۔" وہ ایک بار پھر ہنسی۔ فضا میں جل ترنگ بجنے لگی۔ "لے اب تو خوش ہو جا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی اونی شال درست کر کے اوڑھی اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچ گئی۔

رحیم داد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ملازم سے کھانا منگوایا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رحیم داد کو قرار نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بستر سے نیچے اترا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس نے اوپر کی منزل پر جانے والے زینے پر آہٹ سنی۔ ساتھ ہی نسوانی آوازیں

ابھریں۔ رحیم داد نے اندازہ لگا لیا کہ پھاتاں اور گاؤں کی دوسری عورتیں واپس جا رہی ہیں۔ کمرے کے دروازے کا صرف ایک پٹ کھلا تھا۔ رحیم داد نے مڑ کر باہر دیکھا۔ وہ دھیمے لہجے میں باتیں کرتی صحن سے گزریں، پھاٹک پر پہنچیں اور چوکی دار سے کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ رحیم داد کا کمرہ دور تھا اور دھند بہت گاڑھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ نہیں سکا اور یہ بھی نہیں سن سکا کہ وہ چوکی دار سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ وہ حویلی سے چلی گئیں۔ چوکی دار نے پھاٹک بند کر دیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ کبھی کبھی چوکی دار کی کھنکار اور کھانسی گہری خاموشی میں ابھرتی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ رحیم داد نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے کپڑے اتار کر اجلا لباس پہنا۔ سوٹ کیس سے شیشی نکال کر کرتے اور ڈاڑھی پر عطر لگایا۔ سر میں خوشبو دار تیل ڈالا۔ کنگھی سے سر اور ڈاڑھی کے بال سنوارے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر مختلف زاویوں سے اپنی سج دھج دیکھنے لگا۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا اور گنگنا رہا تھا۔ اس نے اونی دُوہرا اوڑھی، کمرے سے نکلا اور دروازہ باہر سے بند کیا۔

دھند میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ حویلی کے تمام نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کر کے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ صرف چوکی دار جاگ رہا تھا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ زینے کی جانب بڑھا۔ ابھی وہ قریب نہیں پہنچا تھا کہ دالان کے اندھیرے میں ایک دھندلا سایہ لہرایا۔ رحیم داد ٹھٹک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دھند اتنی زیادہ تھی کہ وہ اسے پہچان نہ سکا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ کوئی سر سے پیر تک چادر لپیٹے بڑے پراسرار انداز میں دیوار سے لگا کھڑا ہے۔

رحیم داد نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ سائے میں حرکت ہوئی۔ پھر قریب سے اندھیرے میں آواز ابھری۔ "چوہدری میں ہوں جنت۔" وہ سامنے آ گئی اور رحیم داد کے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"تو اتنی رات گئے کیسے آ گئی؟"

"تجھے پتہ ہے، نادر لہور گیا ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولی۔ اس کا جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ "میں تو بہت دیر سے جاگ رہی تھی، انتظار کر رہی تھی کہ تو آج ضرور آئے گا۔ پر تو نہ آیا تو سوچا، خود جا کے دیکھوں۔"

رحیم داد نے جنت کو ٹرخانے کی کوشش کی۔ "تو اپنے کمرے میں جا۔ تیری بچّیاں اکیلی ہیں۔" جنت نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو کدھر جانے کے لیے نکلا تھا۔ میری

طرف آرہا ہو گا؟"

"نہیں!" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں جمیلہ کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اب تو وہ تیری گھر والی بن چکی ہے' جب چاہے اس کے پاس جا سکتا ہے۔"

"میں نے تو اس سے شام کو وعدہ کیا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اب وہ پہلی سی جمیلہ نہیں رہی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔ ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ نادر مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "پر تجھے یہ پتہ نہیں' زمین دارنی تجھ سے نکاح کرنے پر خوش نہیں۔ اس کی باتوں سے یہی لگتا ہے۔" اس نے رحیم داد کو بد ظن کرنے کی کوشش کی۔ "اب یہی دیکھ' وہ روز اپنے کمرے میں اکیلی سوتی ہے۔ تیری بالکل پرواہ نہیں کرتی۔ تو کیسا گھر والا ہے؟" وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "میں تو کہتی ہوں' وہ آج بھی آرام سے سو رہی ہو گی۔ تو اس کے لیے اب تک جاگ رہا ہے۔"

"نہیں' وہ بھی جاگ رہی ہو گی۔" وہ جنت کا رخسار تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔ "تجھے پتہ نہیں میں اس کے پاس نہیں گیا تو وہ نیچے اتر کر میرے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ میں وہاں نہ ملا تو ہو سکتا ہے مجھے ڈھونڈتی ہوئی تیرے گھر پہنچ جائے۔ سوچ تب کتنی گڑ بڑ ہو گی۔" اسی وقت سیڑھیوں پر آہٹ ابھری۔ رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے جنت سے کہا۔ "وہ نیچے آ رہی ہے۔ وہ جمیلہ ہی ہو سکتی ہے۔"

جنت نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ رحیم داد کا کمرہ فاصلے پر تھا اور زینہ قریب ہی تھا۔ کمرے تک جانے میں خطرہ تھا۔ دونوں اندھیرے میں دیوار سے چمٹے ہوئے دم بخود کھڑے رہے۔

چاپ قریب آتی گئی۔ چند لمحوں بعد دونوں نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ جمیلہ نیچے آ گئی ہے۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے موٹا اونی دھسّا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ رحیم داد اور جنت سانس روکے کھڑے تھے۔ جمیلہ چند قدم کے فاصلے پر زینے کی نزدیک کھڑی تھی۔ رحیم داد کو خدشہ تھا کہ جمیلہ اس کے کمرے میں نہ پہنچ جائے مگر وہ اس طرف نہیں گئی۔ مہمان خانے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے میں داخل ہو گئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ "میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔"

"پر وہ تیرے کمرے کی طرف نہیں گئی۔" جنت نے سرگوشی کی۔ "مہمان خانے میں کیوں گئی ہے؟"

"لگتا ہے تیرے گھر کی طرف گئی ہے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

جنت نے دبی زبان سے تائید کی۔ "مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"اس نے تجھے گھر میں نہ پایا تو کیا سوچے گی؟"

"تو فکر نہ کر۔" جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دوں گی۔ وہ میری بات مان لے گی۔" وہ مڑی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"تو اب کہاں جائے گی؟"

"یہ سب تو مجھ پر چھوڑ دے۔" جنت نے کہا۔ "اب تو اپنے کمرے میں جا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ کے پاس جانا۔ تب تک وہ اپنے کمرے میں واپس پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے وہ تیرے ہی کمرے میں آجائے۔"

"یہ تو بتا' اتنی رات کو وہ تیرے گھر کیوں گئی ہے؟" رحیم داد نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے ڈھونڈنے کے ارادے سے تو نہیں گئی؟ اس رات اسے کچھ شبہ تو ہو گیا تھا جب میں تیرے گھر کے پچھلے کمرے میں چھپا ہوا تھا اور وہ نادر کے ساتھ اچانک پہنچ گئی تھی۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے کوئی شبہ ہوا تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طور مجھ سے ضرور پوچھتی۔ وہ کسی اور ہی کام سے میرے گھر گئی ہوگی۔ تجھے ڈھونڈتا ہوتا تو پہلے تیرے کمرے میں جاتی۔"

"تیری گل ٹھیک ہی لگتی ہے۔ اب تو ٹُر جا۔"

جنت دروازے سے گزر کر مہمان خانے میں چلی گئی۔ جمیلہ بھی ادھر ہی گئی تھی۔ رحیم داد کچھ دیر بعد زینے کی جانب بڑھا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ جمیلہ کے کمرے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگیٹھی کے پاس دو کرسیاں رکھی تھیں۔ کرسیوں سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ مسہری تھی۔ اس پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔ رحیم داد چند لمحے بستر کو تکتا رہا پھر اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے قریب رکھا ہوا لحاف گھسیٹا اور ٹانگوں پر ڈال لیا۔ وہ جمیلہ کے انتظار میں دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

☆

چھت پر چاپ سنائی دی اور رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور جمیلہ اندر آگئی۔ اس نے سردی سے تھرتھراتے ہوئے دروازہ بند

کیا۔ مگر کنڈی نہیں لگائی۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں جمیلہ نے رحیم داد کو بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے لیکن جلد ہی غائب ہو گئے۔ وہ مسکرائی۔

"چوہدری' تو کب آیا؟"

"مجھے تو آئے دیر ہو گئی۔" رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ "پر تو اتنی رات گزرے سردی میں کہاں گئی تھی؟"

جمیلہ نے دھسا اتار کر ایک طرف رکھا۔ کھونٹی پر لٹکی ہوئی سرخ شال اتار کر اوڑھی۔ کرسی پر بیٹھی اور دونوں ہاتھ انگیٹھی پر پھیلا کر تاپنے لگی۔ انگاروں سے ابھرتی ہوئی ہلکی ہلکی آنچ میں جمیلہ کا چہرہ شفق کے مانند سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خوب صورت اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے دہکتے انگاروں کو تک رہی تھی۔ رحیم داد بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر گہری سانس بھری اور آہستہ سے پوچھا۔

"تو نے بتایا نہیں تو کہاں گئی تھی؟"

"سوچا تھا نادر خان لہور سے واپس آ گیا ہو گا۔" جمیلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "میں نے اس سے دوائیاں منگائی تھیں' وہ لینے گئی تھی۔"

"نادر خان لہور سے لوٹ آیا؟"

"نہیں!" جمیلہ نے نہایت مختصر جواب دیا۔

"تو نادر کے گھر گئی تھی؟"

"نہیں' میں اس کے گھر نہیں گئی۔ ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مہمان خانے سے باہر نکلی تو حمامل گیا۔ جانے اتنی رات کو کہاں سے آ رہا تھا۔ اسی نے بتایا کہ نادر ابھی نہیں لوٹا۔ اس سے باتیں کرتے کرتے مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ میں نے اسے نور محمد کے گھر کی طرف بھیجا ہے۔"

"تاراں نہیں تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"مجھے تو نظر آئی نہیں۔ لگتا ہے' حویلی میں ہو گی۔ ویسے بھی عام طور پر وہ حویلی میں رہتی ہے۔"

"مجھے پتہ ہے' وہ حمے سے خوش نہیں۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "اس کی ناراضی ہے بھی ٹھیک۔ شام ہوتے ہی نکل جاتا ہے اور کبھی کبھی تو رات بھر نہیں لوٹتا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مہمان خانے کی دیکھ بھال کے لیے کوئی اور ہی بندہ لگانا پڑے گا۔ حما تو وہاں رات کو بھی نہیں ٹھہرتا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" جمیلہ نے اس سے اتفاق کیا۔ "میں نے پہلے بھی سوچا تھا پر تاجاں کے

ویاہ میں ایسی پھنسی کہ یاد ہی نہ رہا۔ ویسے ان دنوں نادر خان بھی اپنے بال بچوں سمیت مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پہلے تو وہاں ہوتا تھا۔ پر اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"مہمان خانہ اس طرح رات کو خالی نہیں رہنا چاہیے۔ حمدے کا کیا ہے، من موجی بندہ ہے، جب چاہا اٹھ کر چلا گیا۔ میرے سامنے بھی روز ہی ایسا کرتا تھا۔ سنا ہے پنڈ کی کسی مُیار کے چکر میں رہتا ہے۔"

جمیلہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ رحیم داد بے قرار ہو کر بولا۔ "اُدھر کیوں بیٹھی ہے، ادھر میرے پاس آجا۔ تجھے سردی نہیں لگ رہی؟ ویسے آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"ہاں، آج سردی زیادہ ہے۔" جمیلہ بولی۔ "انگیٹھی کی آگ سے ہاتھوں کو سینکنے میں بہت سواد مل رہا ہے۔" رحیم داد بستر سے اٹھا اور جمیلہ کے روبرو کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی گردن جھکا کر اپنے ہاتھ انگیٹھی کے اوپر پھیلا دیے۔ دونوں گردن جھکائے انگارے تک رہے تھے۔ انگاروں پر سفید راکھ کی ہلکی تہہ جم گئی تھی۔

رحیم داد نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور بڑے چاؤ سے بولا۔ "جمی لے! میں تبھی یہاں آیا جب تو نے بلایا۔" اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ "تو سوچ بھی نہیں سکتی، میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔ تجھے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے۔ بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔" جمیلہ کے ہونٹوں پر زہرخند پھیل گیا۔ "اسی لیے تو نے احسان شاہ سے مل کر اللہ وسایا کا خون کرا دیا۔"

رحیم داد سٹ پٹا گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ بات تجھے اس سور دے پتر دینے نے کہی ہو گی۔"

"کسی نے بھی کہی ہو، پر جھوٹ تو نہیں ہے۔"

"جس نے بھی تجھ سے ایسی گل کی، بالکل بکواس کی۔" رحیم داد نے جمیلہ کو منانے کی کوشش کی۔ "تو میرے دل میں جھانک۔ دیکھ اس میں تیرے لیے کتنا پیار ہے۔ تجھے کیا پتہ، میں تیرے پیار کی آگ میں کب سے جل رہا ہوں۔"

جمیلہ نے گردن اونچی کی اور رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "ایسی گلاں تو کتنی اور زنانیوں سے پہلے کہہ چکا ہے۔" وہ مسکرائی مگر اس مسکراہٹ میں پیار یا لگاؤ نہیں تھا۔ "اس رات جنت سے بھی تو نے یہی بات کہی ہو گی جب تو اس کے گھر کے پچھلے کمرے میں پردے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ تیرے ننگے پیر چادر کے نیچے سے صاف نظر آرہے تھے اور تیرے جوتے اگلے کمرے میں منجی کے نیچے پڑے تھے۔" اس کے لہجے میں تلخی نمایاں ہو گئی۔ "جنت کے ساتھ تو نے

کب سے یاری لگا رکھی ہے؟ تو نے اسی لیے تو نادر کو مینیجر نہیں لگایا؟"

رحیم داد بوکھلا کر بولا۔ "تو ایسی کڑوی گلاں کیوں کر رہی ہے؟" وہ سخت حیران نظر آ رہا تھا۔

جمیلہ نے تڑ سے جواب دیا۔ "اور کیسی گلاں کروں۔ تیری طرح جھوٹا پیار جتاؤں' یہی چاہتا ہے ناں؟"

رحیم داد دم بخود بیٹھا رہا۔ انگیٹھی میں انگارے سلگ رہے تھے۔ رات دبے قدموں گزرتی رہی۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تجھے سونا نہیں ہے؟ بہت رات ہو گئی۔" اس نے جمیلہ کا ہاتھ تھام کے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ "بہت ہو گئی ناراضی۔ ادھر آ' میرے ساتھ۔"

جمیلہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ "بیٹھ' ابھی میں نے تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"صبح کر لینا۔" رحیم داد نے جمیلہ کا شانہ تھپکا۔ لیکن جمیلہ کرسی پر بیٹھی رہی۔ "تجھے نہیں اٹھنا؟" اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ درشت تھا۔ جمیلہ انگیٹھی پر ہاتھ تاپتی رہی۔ رحیم داد کے صبر کا پیانہ چھلک اٹھا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ "کان کھول کر سن لے' میں نہ اللہ وسایا کی طرح مجھو ہوں نہ کبھی اس کی طرح تیرے پیو کا مزارع رہا۔ میرا نام چوہدری نور الٰہی ہے۔ میں جتنا سیدھا سادا بندہ نظر آتا ہوں اتنا ہی اندر سے ٹیڑھا بھی ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیسا بندہ ہے' بہت ٹھیک طرح پتہ ہے۔" جمیلہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر تلخ لہجے میں کہا۔ وہ رحیم داد کے غصے سے ذرا مرعوب نہ ہوئی۔

رحیم داد کے چہرے پر جھلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے جمیلہ کا بازو پکڑ کے زور سے جھٹکا دیا۔ جمیلہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر گئی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔ جمیلہ نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے اسے بستر پر پھینک دیا۔

جمیلہ کے بال بکھر کر منہ پر آ گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال درست کرتے ہوئے جل کر بولی۔ "چوہدری! تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ میں تجھے اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتی تھی۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

رحیم داد کے رویے میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے غصے سے جمیلہ کو ڈانٹا۔ "چپ کر میں نے بہت سن لی تیری کڑ کڑ۔" وہ بستر پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے سہمی ہوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور دور سرکنے کی کوشش کی مگر رحیم داد نے

ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا۔ جمیلہ اس کے ہاتھوں کے حصار سے نکلنے کے لیے تلملائی بھی' تڑپی بھی لیکن خود کو آزاد نہ کرا سکی۔ ناچار اس نے رحیم داد کے بازو میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ رحیم داد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر خون ابل آیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر جمیلہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ جمیلہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ رحیم داد نے جھک کر دوبارہ اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر چھت پر قدموں کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا اور ڈھاٹے باندھے ہوئے دو آدمی آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ قد و قامت اور چال ڈھال سے دونوں خاصے دبنگ نظر آتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ دوسرے کے ہاتھوں میں بھی چھوٹی رائفل دبی تھی۔

☆

رحیم داد سکتے میں رہ گیا۔ دونوں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آگے والے شخص نے جھٹ ڈھاٹا ہٹایا۔ رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ جمیلہ کا بڑا بھائی ہردیال تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ اسی طرح رات کے اندھیرے میں جمیلہ کو لینے آیا تھا۔ اس وقت اللہ دسایا زندہ تھا اور جمیلہ نے ہردیال کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ رحیم داد کو وہ رات یاد آ گئی۔

جمیلہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتری اور بے قرار ہو کر بولی۔ "میرا ویر آ گیا۔" وہ ہردیال کے سینے سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

ہردیال نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ "پارو! تو ابھی تک ویسی ہی پگلی ہے۔ رو کیوں رہی ہے؟ میں تو تجھے لینے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے کسمسا کر پہلو بدلا۔ دوسرے آدمی نے جھٹ آگے بڑھ کر رائفل کی نال اس کی طرف موڑ دی اور ڈپٹ کر کہا۔ "چپ کر کے بیٹھا رہ۔ گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی بھیجا پھاڑ کر باہر نکال دے گی۔" رحیم داد بستر پر جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح دم سادھے بیٹھا رہا۔

ہردیال نے شفقت سے جمیلہ کا سر پکڑ کر چہرہ سامنے کیا۔ اس کی پیشانی چومی اور وارفتگی سے بولا۔ "نہال دین نے سنتو کھے کے ہاتھ جیسے ہی مجھے تیرا پتر پہنچایا' میں نے اسی سمے تیرے پاس آنے کی تیاری کر لی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو سندیسا بھیجے اور میں نہ آؤں۔ میں تو اس دن کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔"

جمیلہ نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "نہال دین میرے پاس دن ڈھلے آیا تھا۔ کہتا تھا تو آج رات

ساڑھے دس بجے تک یہاں پہنچ جائے گیا۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ "میں تجھے دیکھنے مہمان خانے سے باہر بھی گئی تھی پر تو دکھائی نہیں دیا۔ تو نے آنے میں دیر کردی۔"

"ہاں، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" ہردیال نے بتایا۔ "وہ ایسا ہوا کہ ایک جیپ میں پنکچر ہو گیا تھا۔ پہیا بدلنے اور اسٹپنی لگانے میں سمے لگا۔ ویسے آج دھند بھی بہت ہے۔ رستہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔"

"ماتا جی کا کیا حال ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"تجھے دیکھے گی تو اسے دوسرا جیون مل جائے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پتا جی تو تجھے یاد کرتے کرتے سورگ باشی ہو گئے اور ماتا جی تیرے لیے روتے روتے سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ آنکھوں سے اب تو دکھائی بھی کم پڑتا ہے۔ پارو! تو ہمارے گھر کا اجالا تھی۔ تو پہنچے گی تو ہمارے آنگن میں سورج اتر آئے گا۔"

"بھاجی، تو سچ کہہ رہا ہے؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ جانے کیا ہو۔" اس نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اور مڑ کے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ویسے میں کبھی واپس نہ جاتی۔ تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔ پر حالات ایک دم اس طرح پلٹ جائیں گے۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

ہردیال دل جوئی کرنے لگا۔ "تو ہماری پاروتی تھی، پاروتی ہی رہے گی۔ نراش نہ ہو۔ تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بالکل چنتا نہ کر۔" جمیلہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ "جو کچھ ہوا اس میں تیرا دوش ہی کیا تھا۔" ہردیال بولتا رہا۔ "پگلی! تو اپنی ہی ماتا اور بھائیوں سے ڈر رہی ہے۔ تو ہم چار بھائیوں کی اکلوتی بھین ہے۔ تجھے کیا پتہ، تیرے بنا ہم پر کیا بیتی۔ آٹھ برس سے اوپر ہو گئے پر ہم تجھے نہ بھول سکے۔ ہم تجھے کیسے بھول سکتے ہیں، پارو میری بھین۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے جمیلہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جمیلہ بھی سسکیاں بھرنے لگی۔

دوسرے آدمی نے ہردیال کو ٹوکا اور سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے سے خبردار کیا۔ "جیجا جی! رونا دھونا چھوڑ۔ سمے بہت کم ہے۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے ہی بارڈر کراس کرنا ہے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

ہردیال نے آنسو پونچھتے ہوئے جمیلہ سے پوچھا۔ "پارو! یہ بتا، نینا اور گڈو کدھر سو رہے ہیں؟ تو انھیں فوراً جگا دے۔ جتنا سامان چاہے لے چل۔ میرے پاس دو جیپیں ہیں۔" وہ اپنے سالے کی طرف متوجہ ہوا۔ "کشوری! تو جلدی سے رام مورتی اور شیدے کو بلا لا۔ سامان اٹھانا ہے۔ بچے نیند میں ہوں گے۔ انھیں گود میں اٹھا کر چلنا ہو گا۔"

کشوری چلا گیا۔ ہردیال نے ریوالور کا رخ رحیم داد کی جانب کر دیا۔ پھر سے کرسی کھسکائی۔ اور اس پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ برابر والے کمرے میں گئی۔ وہ باری باری تین سوٹ کیس اٹھا کر لائی اور دروازے کے پاس ہی رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد کشوری واپس آگیا۔ اس کے ہم راہ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو اور آدمی آئے۔ ان کے کندھوں پر بھی رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ دونوں نے سوٹ کیس اٹھائے اور باہر چلے گئے۔

جمیلہ سوتی ہوئی نینا کو اٹھا کر لائی اور اسے ہردیال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہردیال نے اسے سینے سے لگایا اور ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جمیلہ برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کی گود میں گڈو تھا۔ وہ بھی گہری نیند سو رہا تھا۔

جمیلہ آگے بڑھی اور عین رحیم داد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "چوہدری! خوش ہو۔ تجھے میری زمیں داری بھی مل گئی۔ یہ حویلی' یہ زمین یہ کھیت' سب کچھ اب تیرا ہی ہے۔ آرام سے جیون گزار۔ موجاں کر۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"تو جا رہی ہے جمیلہ۔" رحیم داد پہلی بار بولا۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔

"تو کس جمیلہ کی بات کر رہا ہے۔" جمیلہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "جمیلہ کو تو نے اسی رات مار ڈالا تھا جب احسان شاہ کی حویلی میں نکاح کا ناٹک رچایا گیا تھا۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا اور ہانپتے ہوئے بولی۔ "اللہ وسایا کی جمیلہ تو مر گئی۔ میں تو اب پاروتی ہوں۔" اس نے ہردیال کی جانب اشارہ کیا۔ "دیکھ یہ میرا ویر کھڑا ہے۔ یہ اپنی بھین پاروتی کو لینے آیا ہے۔"

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس نے جمیلہ کو روکنے کی کوشش کی۔ "تجھے اس طرح اپنی زمیں داری' اپنا گھر بار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔"

"میں نے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں' یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔" جمیلہ نے بے رخی سے کہا۔ "تجھے میرے بارے میں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو زمین اور جائیداد چاہتا تھا' وہ تجھے مل گئی۔ بیع نامے پر تو پہلے ہی مجھ سے زبردستی دستخط کرا چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتا ہے۔ جو کچھ تجھے چاہیے تھا' سب مل گیا۔" جمیلہ مڑی۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ "جمی لے گل سن۔"

وہ ایک دم بپھر گئی۔ "تو مجھے جمی لے کہنے والا کون ہوتا ہے؟ میرا تیرا کیا ناتا۔ تو مجھے جمی لے کہتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے' تیرا منہ نوچ لوں۔ اللہ وسایا کو مار کر تو اللہ وسایا بننا چاہتا ہے۔ پاپی' خونی۔" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں اور سانس پھول گئی۔

رحیم داد تلملا کر بولا۔ "تو ہندنی تھی ناں، ہندنی ہی نکلی۔"

"میں نے بھی تیرا مسلمان دیکھ لیا۔ بالکل ٹھیک طرح دیکھ لیا۔" وہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔

رحیم داد غضب ناک ہو کر چیخا۔ "بکواس نہ کر۔" وہ بستر سے کودا اور نیچے آگیا۔ "میں تجھے نہیں جانے دوں گا۔ تو یہاں سے نہیں جا سکتی۔" وہ تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔

کشوری جھٹ سامنے آگیا۔ "چپ کر کے بیٹھ جا۔" اس نے رائفل کا بٹ گھما کر رحیم داد کے سر پر مارا۔ سر تو نہیں پھٹا مگر چوٹ ایسی کراری آئی کہ رحیم داد ڈگمگا گیا۔ کشوری نے اسے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑکھڑاتا ہوا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

ہردیال نے جمیلہ سے کہا۔ "پارو! دیر نہ کر۔ تو کشوری کے ساتھ چل۔" اس نے بینا کو کشوری لال کی گود میں دے دیا۔ جمیلہ نے گڈو کو سینے سے چمٹا کر شال کا پلو اس پر ڈال دیا۔

کشوری لال آگے بڑھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر چھت پر پہنچ گئے۔

ہردیال بڑھ کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ چوٹ بھرپور آئی تھی۔ رحیم داد کی سانس دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔ وہ بے سدھ پڑا تھا مگر ہردیال کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رحیم داد کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کیے اور جمیلہ کے ایک پرانے دوپٹے سے مضبوطی سے باندھ دیے۔ رحیم داد نے مطلق مزاحمت نہیں کی۔ وہ بستر پر کروٹ کے بل بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ہردیال دروازے کے قریب پہنچا۔ اس نے ٹھٹک کر ایک بار پھر رحیم داد پر نظر ڈالی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں وہ مردے کی طرح بے جان نظر آرہا تھا۔ ہردیال نے کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور حویلی سے گزر کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ مہمان خانہ سنسان تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ جمیلہ دروازے کے پاس کشوری لال کے ساتھ کھڑی تھی۔ دونوں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہردیال نے ایک بار پھر منہ پر ڈھاٹا باندھا۔ ریوالور، جیب میں رکھا اور اسٹین گن کندھے سے اتار کر ہاتھ میں دبا لی۔

ہر طرف کہر کی گاڑھی گاڑھی دھند کا نیل گوں جال پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے نہر کی جانب بڑھے۔ ان کی چاپ، آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔ یکایک

سناٹے میں مویشیوں کے باڑے کی رکھوالی کرنے والے پہرے دار کی کھنکار سنائی دی۔ وہ رک رک کر کھنکار رہا تھا مگر تینوں رکے نہیں۔ انھوں نے رفتار اور تیز کر دی۔ ہر دیال نے اسٹین گن مضبوطی سے تھام لی اور چوکنّا ہو کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

پت جھڑ لگ چکا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے پہنچے تو خشک پتے پیروں تلے چرمرا کر آہٹ پیدا کرنے لگے۔ جمیلہ نے گڈو کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ مگر اسے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں جیپیں کھڑی تھیں اور دھند میں سیاہ دھبوں کے مانند نظر آ رہی تھیں۔

ہر دیال کے بازو کے سہارے جمیلہ جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ہر دیال اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کشوری نے نینا کو ہر دیال کی گود میں دے دیا اور خود دوسری جیپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سناٹے میں ابھری۔

دونوں جیپیں خشک پتے روندتی، آہٹیں پیدا کرتی تیزی سے دوڑنے لگیں۔ ہر دیال کی جیپ پیچھے تھی۔ اس نے نینا کو جمیلہ کی گود میں دے دیا۔ اب وہ اسٹین گن سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ایک اور شخص بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنی رائفل سنبھالے اندھیرے میں ادھر ادھر چوکنّا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جیپیں ہچکولے کھاتی نہر کے کنارے کنارے دوڑ رہی تھیں۔ کہر کی دھند میں لپٹا ہوا کوٹلہ ہرکشن سو رہا تھا۔ جمیلہ مڑ مڑ کر حسرت بھری نظروں سے گاؤں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کوٹلہ ہرکشن کے دھند میں الجھے ہوئے مکانات اور کھیت کھلیان نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جیپیں آگے بڑھتی رہیں۔ گاؤں پیچھے رہ گیا۔

رحیم داد حویلی کی بالائی منزل کے کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ تاریک ہوتی گئی، گزرتی گئی۔ رحیم داد کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا اور دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ کسمسایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کونے میں لیمپ روشن تھا لیکن انگیٹھی میں سلگتے ہوئے انگارے بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔

رحیم داد دروازے پر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا، اسی اثنا میں باہر سے کنڈی کھلنے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ جنت سردی سے کپکپاتی اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب پہنچی۔ اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور جلدی جلدی اس کے ہاتھ کھول دیے۔

رحیم داد نے دونوں کلائیاں سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "جنت تو کیسے آگئی۔ کیا جمیلہ چلی گئی؟"

"ہاں جی، وہ چلی گئی۔" جنت نے بتایا۔ "اسے گئے ہوئے بھی دیر ہو گئی۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا وہ چلی گئی؟"

"مجھے سب پتہ ہے کیا کیا ہوا۔" وہ بستر پر رحیم داد کے قریب بیٹھ گئی۔ "جب وہ آئے تھے تو میں جاگ رہی تھی۔ پورے چھ بندے تھے۔ منہ پر منڈاسے باندھے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں بندوقیں دبی تھیں۔ چار تو مہمان خانے کے باہر ہی ٹھہر گئے۔ پہلے دیوار پھاند کر دو اندر گئے۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ دو اور اندر چلے گئے۔ دو بندے بندوقیں سنبھالے دروازے پر کھڑے

رہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو نے انھیں کیسے دیکھا؟"

"دروازے کی آڑ سے۔ میرے ہی سامنے زمین دارنی گڈو کو گود میں اٹھائے باہر نکلی۔ فیر دوسرے بھی باہر آگئے اور وہ ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔ تیں نوں پتہ ہے وہ جیپوں میں بیٹھ کر آئے تھے۔ میں نے نہر کی طرف جیپوں کی آواز سنی تھی۔"

"میں نوں پتہ ہے وہ جیپوں میں ہی بیٹھ کر آئے تھے۔" رحیم داد نے کہا۔ "یہ بتا انھیں گئے ہوئے کتنی دیر ہوگئی۔ مجھے تو ایک نے رائفل کا بٹ اس زور سے سر پر مارا کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلا وہ کب گئے اور کیسے گئے۔"

"میں نے بتایا نہیں، انھیں گئے ہوئے تو بہت دیر ہوگئی۔ اب تو میلوں دور چلے گئے ہوں گے۔ میں تیرے پاس پہلے ہی آجاتی پر اتنی ڈری ہوئی تھی کہ باہر نکلنے کی دیر تک ہمت نہیں ہوئی۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "کون تھے وہ؟ تجھے پتہ ہے؟"

"ایک تو جمیلہ کا وڈا بھرا ہردیال تھا۔ دوسرا ہردیال کا سالا کشوری لال تھا۔ وہ جمیلہ کو لینے آئے تھے۔ جمیلہ نے انھیں خود بلایا تھا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "اب جمیلہ نہیں آئے گی۔ وہ چلی گئی۔"

"چوہدری! یہ ٹھیک ہی ہوا وہ چلی گئی۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا وہ تیری کبھی نہیں بن سکتی۔" اس نے منہ بگاڑ کر نفرت کا اظہار کیا۔ "وہ ہندنی تھی ناں، اسے تو ایک روز یہاں سے جانا ہی تھا۔" جنت مسکرانے لگی۔ "پر اس کے جانے سے کیا ہوتا ہے، پوری زمیں داری تو اب تیرے ہی پاس آگئی۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔ "میرے سر میں بہت درد ہے۔"

"تو بیٹھا کیوں ہے؟ لیٹ جا۔" جنت نے اظہار ہمدردی کیا۔ "لگتا ہے، سر میں زیادہ چوٹ آئی ہے۔ لا میں تیرا سر دبا دوں۔"

رحیم داد نڈھال ہو کر خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ جنت نے اس کے جسم پر لحاف ڈال دیا۔ کھسک کر قریب ہوگئی اور سرہانے بیٹھ کر رحیم داد کا سر ہولے ہولے دبانے لگی۔

☆

رحیم داد دن چڑھے تک بستر پر پڑا رہا۔ اس نے کمرے ہی میں ناشتا کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں

کھایا۔ نہ وہ کمرے سے باہر نکلا اور نہ نیچے اترا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان تھا۔ جمیلہ کے چھوٹ جانے کا اسے سخت ملال تھا۔

جمیلہ کا جانا زیادہ دیر چھپا نہ رہ سکا۔ حویلی کے نوکروں کو صبح ہی معلوم ہو گیا تھا۔ سہ پہر تک پورے کوٹلہ ہر کشن میں یہ خبر پھیل گئی۔ کچھ مزارعے رحیم داد سے ملنے آئے بھی مگر اس نے کسی سے ملنا اور جمیلہ کے بارے میں بات کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ بستر پر لیٹا رہا یا پھر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

دن ڈھلے' غروب آفتاب سے کچھ پہلے نادر خاں لاہور سے آگیا۔ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں نادر خاں کو بتایا۔ "نادر! جمیلہ کل رات اپنے بھائی ہردیال کے ساتھ سرحد پار چلی گئی۔"

"مجھے پتہ ہے جی! جنت نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پر گل سچی ایہہ اے جی! اس نے تو ایک روز یہاں سے جانا ہی تھا۔ اس کا مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔"

"تو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں تاجاں کے ویاہ کی بھاگ دوڑ میں پھنسا رہا۔ تجھ سے گل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔" نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ "ویسے تجھے پتہ چل بھی جاتا تو تو اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔"

رحیم داد نے نادر خان کی تائید کی۔ "مجھے تو اس نے آخر تک دھوکے میں رکھا۔ اس کی کسی بات سے شبہ ہی نہیں ہوا کہ وہ یہاں سے جانے کی تیاری کر چکی ہے۔"

"وہ تو جی' لگتا ہے ہر طرح تیاری کر چکی تھی۔" نادر خان نے کہا۔ "تبھی تو اس نے مجھے دوائیاں خریدنے لہور بھیج دیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں' اسے دوائیوں شوائیوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ مجھے یہاں سے ہٹانے کا بہانہ تھا۔ دیکھ لے' جو دوائیاں میں خرید کر لایا ہوں' وہ میرے ہی پاس پڑی ہیں۔ اور وہ چلی بھی گئی۔"

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "اب تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی گئی۔"

"چوہدری! فکر نہ کر۔" نادر خاں نے رحیم داد کو تسلی دی۔ "وہ وہاں رہ نہ سکے گی۔"

"کیوں؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "وہاں رہنا نہ ہوتا تو یہاں سے جاتی ہی کیوں؟"

"زینت بھی تو چلی گئی تھی۔" نادر خاں نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ "پر وہ رہ نہ سکی' واپس آگئی۔"

نادر خاں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ حویلی کے پھاٹک پر جیپ ٹھہرنے کی آواز سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر کہا۔ ”نادر! لگتا ہے' باہر جیپ آکر رکی ہے۔ دیکھ کون آیا ہے؟“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”جمیلہ تو ہو نہیں سکتی۔“ نادر نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد بے چین ہو کر سوچنے لگا کہ اس وقت جیپ میں کون آسکتا ہے۔ وہ بار بار دروازے کی جانب دیکھتا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں کے ساتھ احسان شاہ آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے دور سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچ کر گرم جوشی سے احسان شاہ کا خیر مقدم کیا اور اسے کرسی پر لا کر بٹھایا۔ احسان شاہ سیڑھیاں چڑھ کر آیا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چوہدری' مجھے دوپہر ہی کو پتہ چل گیا تھا کہ رات جمیلہ چلی گئی۔“

”ہاں شاہ جی! وہ چلی گئی۔“ رحیم داد کے لہجے میں حزن و ملال تھا۔

”کیا اس کا بھرا ہردیال اسے لینے خود آیا تھا؟“

”ہاں جی' ہردیال خود آیا تھا۔ اس کا سالا کشوری لال بھی تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”چار بندے اور تھے۔ سب پوری طرح مسلح تھے۔“

”مسلح ہو کر تو انھیں آنا ہی تھا۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”پر بہت حیرت کی بات ہے' وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اتنی آسانی سے جمیلہ کو پنڈ سے نکال کر لے گیا۔“ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف دیکھا۔ ”تو کہاں تھا؟“

”مجھے تو جی زمیں دارنی نے سویرے سویرے دوائیاں خریدنے لہور بھیج دیا تھا۔“ نادر خان نے صفائی پیش کی۔

”تو نہیں تھا تو کیا ہوا۔“ احسان شاہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”حویلی کے راکھے' نوکر چاکر' سب ہی ہوں گے۔ وہ سب کے سب پڑے مردوں کی طرح سوتے رہے۔ کسی کی آنکھ بھی نہ کھلی؟ کوئی انھیں نہ روک سکا؟“ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ ”یہ بتا نادر! وہ آئے کس رستے سے تھے؟“

”جب وہ آئے تو میری گھر والی جاگ رہی تھی' پر وہ بالکل اکیلی تھی۔ گھر میں صرف چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں۔“ نادر خان نے بتایا۔ ”وہ مہمان خانے کی دیوار پھاند کر داخل ہوئے تھے۔“

”مہمان خانے میں کوئی نہیں تھا؟“

"کوئی مہمان خانے میں نہ ہو' تب بھی حمدا ضرور رہتا ہے۔ اس کی گھروالی بھی عام طور پر وہیں رہتی ہے۔ حمدا تو جی مہمان خانے ہی کے کام کاج کے لیے ہے۔ وہ رات کو تو ضرور رہتا ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "ویسے جی حویلی کے پھاٹک پر راکھا بھی رہتا ہے۔"

"پر یہ سارے بذ حرام اس وکت کہاں تھے؟" احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر دریافت کیا۔

"کم سے کم شور تو مچا سکتے تھے۔ پنڈ میں جاگ ہو جاتی تو ہردیال اتنے آرام سے جمیلہ کو نہیں لے جا سکتا تھا۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' نوکر چاکر سب ملے ہوئے تھے۔" نادر خان نے اظہار خیال کیا۔ "حمدا تو ضرور ملا ہوا تھا۔ اسے تو مہمان خانے میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ جنت بتاتی تھی حمدا مہمان خانے میں تھا ہی نہیں۔ اس کی گھروالی بھی غائب تھی۔"

"جبھی تو وہ آرام سے مہمان خانے کے رستے آئے اور جمیلہ اور اس کے بچوں کو سامان کے ساتھ لے گئے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "جمیلہ ذرا بھی ڈری ہوئی نہیں لگتی تھی۔ اس نے آرام سے اپنے سوٹ کیس نکالے۔ بچوں کو ہردیال اور کشوری لال کی گود میں دیا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں نے اسے روکنے کی کوشش کی اور چاہا کہ دروازے سے نکل کر پنڈ والوں اور حویلی کے نوکروں کو جگانے کے لیے شور مچاؤں پر کشوری لال نے میرا راستہ روک لیا۔"

احسان شاہ گردن جھکائے سوچتا رہا' ذرا دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری! ایسے تو تیری زمیں داری نہیں چلے گی۔ حویلی کے سارے راکھے اور نوکر چاکر نکال باہر کر۔ سب کمینے اور حرام خور ہیں۔ بالکل تیرے کام کے نہیں۔" وہ نادر کی جانب متوجہ ہوا۔ "نادر! یہ کام تجھے کرنا ہو گا۔ ان سب کو بر طرف کر کے مضبوط اور تگڑے بندے لگا۔ کرندے اور راکھے تو زور آور اور حوصلے والے ہونے ہی چاہیں' پر پکے وفادار بھی ہوں۔ انھیں مسلح کرنے کے لیے اسلحہ کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"ایسا ہی کرلوں گا جی!" نادر نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔ "پر اسلحہ تو یہاں مجھے نظر نہیں آیا۔"

"اللہ وسایا کے پاس تو ایک رائفل تھی۔ اتنا تو پتہ ہے۔ کہاں ہے وہ رائفل؟" احسان شاہ نے رحیم داد سے پوچھا۔

"وہ تو جمیلہ کے پاس ہی رہتی تھی۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو بتایا۔ "مگر وہ رائفل اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ برابر کے کمرے میں ہو گی' اور بھی سامان پڑا ہے۔"

"نادر! تو رائفل کا لائسنس چوہدری کے نام تبدیل کرا لے۔ ایک ریوالور کا لائسنس نکلوانے

کے لیے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں عرضی لگا۔" احسان شاہ ہدایت دیتا رہا۔ "لائسنس کا بندوبست تو میں کرا دوں گا۔ کچھ اسلحہ چوری اور سمگلنگ کا خرید لے۔ یہ کام تجھے فنافٹ کرنا ہو گا۔"

"شاہ جی! میں کل ہی اس کام پر لگ جاؤں گا۔" نادر خان نے مستعدی سے جواب دیا۔ "یہاں کا تو جی اب تک یہ حال رہا ہے کہ کہیں آنے جانے کے لیے اپنا تانگا تک نہیں۔ گھوڑیاں ہیں، وہ تو مزارعوں کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ پر ان سے آج کل زمیں داری کا کام نہیں چل سکتا۔ میں لہور میں ایک تانگے کی خریداری کی بات کر کے آیا ہوں۔ تانگا تو جی بہت ضروری ہے۔"

"تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ تانگا ضرور ہونا چاہیے۔ تانگے کا سودا پکا کر لے۔ میرے پاس دو جیپیں ہیں۔ جب سے نئی کار لی ہے، ایک جیپ خالی کھڑی ہے۔" وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا "چوہدری! وہ جیپ میں تیرے لیے بھیج دوں گا۔"

"پر میں اس کی کیمت کیسے ادا کروں گا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "زمین داری کی ساری آمدنی تو جمیلہ کے پاس رہتی تھی۔"

"فکر نہ کر چوہدری۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ "میں تجھ سے ابھی کچھ نہیں مانگ رہا۔ ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد دے دینا۔ تجھ سے میں نے سودے بازی تو کرنی نہیں، جتنے کی دو سال پہلے خریدی تھی اس سے ہزار ڈیڑھ ہزار کم دے دینا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "چوہدری، تو بہت پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جمیلہ کے جانے کے بعد سے میں بہت پریشان ہوں۔"

"اب جمیلہ کا خیال دل سے نکال دے۔"

رحیم داد اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! یہ بات سمجھ نہیں آتی، ہردیال بے کھٹکے ادھر آجاتا ہے۔ میں نے دو بار دیکھا ہے۔ دونوں بار وہ بالکل بے خوف اور نڈر لگا۔ کیا پاکستان میں اسے کوئی خطرہ نہیں؟"

"چوہدری، سچی بات یہ ہے ادھر کے سمگلروں سے اس کی یاری ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "ہردیال خود وڈا سمگلر ہے۔ بارڈر پولیس اور رینجرز، سب کا اس نے بھتا باندھ رکھا ہے۔ اسے ادھر آنے سے کون روک سکتا ہے۔ اس کے کرندے ادھر اور اُدھر، دونوں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خود کبھی نہیں نکلتا۔ بھین کو لینے آگیا تھا۔ اس کا سارا دھندا کرندوں کے ذریعے چلتا ہے۔ ویسے اس کا ادھر بھی بہت اثر و رسوخ ہے۔ وزیروں اور وڈے سرکاری افسروں سے اس کا رابطہ ہے۔"

"وزیروں سے بھی اس کا میل ملاپ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "اس کا مطلب تو یہ

ہوا کہ سمگلنگ میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔"

احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "کیا کیا بتاؤں تجھے، نہ پوچھ چوہدری۔ زبان مت کھلوا۔ تجھے اتنا تو پتہ ہی ہو گا کہ پنجاب اور سندھ سے سرحد پار کنک سمگلنگ کر کے اتنی بھیجی گئی کہ ادھر کھانے کو بھی نہیں رہی۔ کتنے ہی وڈے زمیں داروں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ کنک کے ذخیرے روک لیے۔ حالات اور بگڑ گئے۔ پنجاب نے کنک کی ایسی کمی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہت گڑ بڑ مچی۔ مجھے یاد ہے، فروری ۱۹۵۲ء میں لہور میں کنک کی منگائی کے خلاف آٹا ڈے منایا گیا اور ایک آٹا جلوس بھی نکلا۔ میں ان دنوں لہور میں ہوتا تھا۔"

"مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔ بہت گڑبڑ ہوئی تھی۔ پر کنک کی جو کمی اور منگائی تب سے ہوئی ہے، اب تک ختم نہیں ہوئی۔"

"اس لیے نہیں ہوئی کی غلے کی سمگلنگ اب تک ختم نہیں ہوئی۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "تبھی تو امریکہ سے کنک منگوانی پڑی اور اب تک برابر ادھر ہی سے آرہی ہے۔ سمگلنگ سے کنک کی جو کمی پڑی، اس نے سندھ میں اور بھی حالات خراب کیے۔ گورنر نے وزیر اعلیٰ کھوڑو اور صوبائی وزیر مال فضل اللہ کے خلاف پیروڈا کے تحت مکدمہ کائم کیا اور دونوں کو ان کے عہدوں سے بر طرف کر دیا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔ "تجھے کہاں تک بتاؤں۔ یوں سمجھ لے۔ سمگلنگ کا چکر نیچے سے اوپر تک پھیلا ہوا ہے۔"

ایک نوکر نے انگیٹھی روشن کر کے کمرے میں رکھ دی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو گیا تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخی نے احسان شاہ اور رحیم داد کے چہرے گلابی بنا دیے تھے۔

"شاہ جی، کیا تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟" رحیم داد نے اچانک احسان شاہ سے پوچھا۔

"کوئی خاص گل بات ہے؟" احسان شاہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "بول! کیا مدد چاہتا ہے؟"

"میں جمیلہ سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔

"جان سے مارا جائے گا، اس چکر میں نہ پڑ۔" احسان شاہ نے اسے خبردار کیا۔ "ویسے تو اب اسے مل کر کرے گا بھی کیا۔ وہ تیرے ساتھ رہنا چاہتی تو یہاں سے جاتی ہی کیوں۔ وہ تیری نہیں بن سکتی۔"

"تجھے پتہ نہیں شاہ جی! مجھے اس سے کتنا پیار ہے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کے جانے کے بعد مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ حویلی ویران کر گئی۔ اب یہاں کچھ نہیں رہا۔"

اس کے لہجے میں التجا کا عنصر نمایاں ہو گیا۔ "شاہ جی! تجھے میری مدد کرنی ہی پڑے گی۔ میں اس سے ایک بار ضرور ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کرے گا مل کر؟"

"صرف اتنا کہوں گا' وہ جب بھی واپس آنا چاہے' آسکتی ہے۔ اس حویلی کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

"پر اب وہ تیرے پاس آنے ہی کیوں لگی۔" احسان شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو خود سوچ' ایک بار یہاں سے جانے کے بعد وہ کیسے واپس آسکتی ہے۔"

"جلیل کے گھر والی زینت بھی تو اپنے رشتے داروں اور برادری والوں کے پاس سرحد پار چلی گئی تھی۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر نہ اسے کسی نے وہاں کبول کیا اور نہ اس کے بچوں کو۔ اسے اتنا تنگ کیا' اتنا دکھ پہنچایا کہ ایک رات چھپتی لکتی بھاگ کر واپس آگئی۔ مجھے بتاتی تھی اسے کیسے کیسے وہاں تنگ کیا گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "شروع شروع میں تو بہت آؤ بھگت ہوئی۔ خوب پیار بھی جتایا گیا۔ پر جوں جوں دن گزرتے گئے سب کی نظریں بدلتی گئیں۔ اسے اچھوت اور کمیوں سے بھی زیادہ برا سمجھا جانے لگا۔ گھنٹوں بیٹھی روتی رہتی' کوئی دلا سا بھی نہ دیتا۔ سب دور دور رہتے۔ اس کے بچوں کو نفرت سے دھتکارتے۔ ان سے گھن کھاتے۔"

احسان شاہ بیزار ہو کر بولا۔ "زینت کو گولی مار' یہ بتا تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔"

"شاہ جی! گل سمجھنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "دیکھ زینت اور جمیلہ کا معاملہ ایک ہی جیسا ہے۔ زینت کی طرح جمیلہ بھی ایک مسلمان کے پاس اس کی گھر والی بن کر رہی۔ اس سے دو بچے بھی ہوئے۔ جس طرح زینت اور اس کے بچوں کو کبول نہیں کیا گیا' ٹھیک ایسا ہی کچھ عرصے بعد جمیلہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا' اور میں کہتا ہوں ضرور ہو گا' تب تو جمیلہ واپس آنے کا سوچ سکتی ہے۔ ادھر اس کی زمیں داری تھی۔ بہت شان تھی۔ میرے ساتھ پکے کاغذ پر اس کا نکاح بھی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر واپس میرے پاس آجائے تو تعجب کی کون سی گل ہے۔"

"سن لی' میں نے تیری ساری گل سن لی۔ اور سمجھ بھی لی ہے۔" احسان شاہ نے اکتا کر کہا۔ "سچ پوچھ تو میں جمیلہ کے بارے میں زیادہ جانتا بھی نہیں ہوں۔ تو اسے ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "پر ایک بات کان کھول کر سن لے۔ تو جمیلہ سے نہیں مل سکتا۔ ہردیال بہت زور آور ہے۔ تو نے جمیلہ کے پاس جانے کی کوشش کی اور ہردیال

کو پتہ چل گیا تو سمجھ لے' زندہ بچ کر نہیں آسکتا۔ میں تو کہتا ہوں' تو ادھر جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

"تو کہتا ہے تو میں خود ادھر نہیں جاؤں گا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی بات مان لی' مگر باز نہیں آیا۔ "پر تو میری اتنی مدد تو کر سکتا ہے کہ کسی کے ذریعے میرا یہ پیغام جمیلہ تک پہنچا دے۔ وہ جب بھی واپس آنا چاہے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ پہلے جس طرح یہاں رہتی تھی اسی شان سے رہے گی۔"

احسان شاہ نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر بار بار اس کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد احسان شاہ کی آواز ابھری۔ "چوہدری! ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہردیال کس شہر میں ہے۔"

"مجھے اتنا تو پتہ ہے وہ فیروز پور میں ہے۔"

"اگر تیری اطلاع صحیح ہے تو کام بن سکتا ہے۔ رفیع سمہ سے اس کام میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سے میری دوستی یاری ہے۔ میرے پاس آتا رہتا ہے۔ اس کا بھی سمگلنگ کا دھندا ہے۔ ہردیال سے تو شاید اس کی جان پہچان نہیں' پر اس کے کرندوں سے اس کی یاری ہے۔ ایک بار مجھے اس نے بتایا تھا۔ ویسے سمہ خود بھی وڈا زمیں دار ہے۔ اور رسا گیر تو بہت زبردست ہے۔ پر بہت زندہ دل اور یاروں کا یار ہے۔ رہتا بھی بارڈر کے نزدیک ہے۔"

"شاہ جی! تو مجھے رفیع سمہ سے ملوا دے۔ وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ تو مجھے اس سے کب ملوائے گا؟"

"اتنا بے چین نہ ہو۔ صبر سے کام لے۔ مجھے پتہ ہے' تو جمیلہ کے لیے بہت پریشان ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا امید افزا نظروں سے احسان شاہ کا چہرہ تکتا رہا۔

"چوہدری' میں تیری ضرور مدد کروں گا۔ تجھ سے یاری جو ٹھیری۔ رفیا مجھ سے ملنے آیا تو اسے لے کر تیرے پاس آجاؤں گا یا تجھے اپنی حویلی پر بلوالوں گا۔ وہ کچھ ہی دنوں بعد آنے والا ہے۔ پر تو بے صبری سے کام نہ لے ورنہ مجھے ڈر ہے' کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" احسان علی شاہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "ویسے تجھے اتنا تو سوچنا چاہیے۔ جمیلہ نئی نئی اپنے گھر والوں کے پاس گئی ہے۔ ان سے اس کا بگاڑ ہونے میں کچھ مدت ضرور لگے گی۔ تجھے کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کی بات کی اہمیت اور نزاکت محسوس کی اور اسے یقین دلایا۔ "شاہ جی! تو جیسا کہتا ہے' میں ویسا ہی کروں گا۔"

رات بھیگنے لگی تو احسان شاہ نے جانے کا ارادہ کیا۔ رحیم داد نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ جیپ تک پہنچتے پہنچتے رحیم داد اس سے مسلسل اصرار کرتا رہا۔

☆

دیکھتے ہی دیکھتے حویلی میں نت نئی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیشتر پرانے ملازمین نکال دیے گئے۔ ان کی جگہ نئے ملازم رکھے گئے۔ نادر خان نے اس سلسلے میں بڑی مستعدی دکھائی۔ اس نے احسان شاہ کی سفارش سے اللہ وسایا مرحوم کی عمدہ ساخت کی رائفل کا لائسنس تبدیل کرایا۔ رحیم داد کے لیے ریوالور کا لائسنس حاصل کیا اور جرمن ساخت کا ایک عمدہ ریوالور خرید بھی لیا۔ چھ سات کڑیل جوان حویلی کی نگرانی اور زمیں داری کا کام چلانے کے واسطے کارندوں کے طور پر ملازم رکھے۔ انھیں مسلح کرنے کے لیے چوری اور اسمگلنگ کا اسلحہ خریدا۔ آمد و رفت کے لیے ایک تانگا بھی خرید لیا گیا۔ احسان شاہ نے حسب وعدہ جیپ بھی بھجوا دی اور ڈرائیور کا بھی بندوبست کر دیا۔

رحیم داد نے جیپ پر سوار ہو کر گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ نہر کے کنارے کنارے دور تک گیا۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر احسان شاہ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ اپنے گاؤں پیراں والہ میں نہ تھا، لاہور جا چکا تھا۔

ایک عرصے سے ویران پڑے ہوئے مہمان خانے پر بھی توجہ دی گئی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے ڈالے گئے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کے نیا ڈالا گیا۔ مالی نے مہمان خانے کے وسیع صحن میں جگہ جگہ کیاریاں بنا کر قسم قسم کے پودے لگائے۔ موسم بدلا۔ پودوں میں شگوفے پھوٹے اور وہ پھولوں سے لد گئے۔ ان کی خوشبو سے صحن ہر وقت مہکتا۔ مہمان خانے میں اب رونق اور چہل پہل رہتی۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے احمد کے بجائے ایک نیا ملازم مقرر کیا گیا۔

موسم گرما شروع ہو چکا تھا۔ آفتاب غروب ہوتا، شام کا دھندلکا پھیلتا، مہمان خانے میں پیٹرومیکس روشن کر دیا جاتا۔ صحن میں کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ مہمان خانے کے پچھواڑے، باغ میں رحیم داد کبھی کبھار بیٹھتا۔ دن ڈھلتے ہی عام طور پر مہمان خانے میں بھی پہنچ جاتا اور شام ہوتے ہی صحن میں بیٹھ کر دھڑلے سے شغل مے نوشی بھی کرتا۔

ان تبدیلیوں کے ساتھ رحیم داد خود کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا۔ مگر وہ اب تک جمیلہ کو نہیں بھولا تھا۔ اس کی یاد اکثر ہوک بن کر سینے سے اٹھتی۔ احسان شاہ سے وہ اپنی اس بے قراری کا کھل کر اظہار بھی کر چکا تھا۔ وہ اسے اپنا وعدہ یاد دلانا چاہتا تھا۔ لیکن احسان شاہ لاہور سے ہنوز

واپس نہیں آیا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا' انگلستان سے بیرسٹر بن کر واپس آ گیا تھا۔ لاہور میں اس نے پریکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی وہ سیاست میں بھی داخل ہونا چاہتا تھا۔ احسان شاہ بیٹے کے لیے فضا سازگار بنا رہا تھا اور اسی مقصد سے اپنی نئی کوٹھی میں مقیم تھا۔

نادر خان اب زمیں داری کے کاموں میں زیادہ تن دہی اور سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ اس کی بیوی' جنت اپنی بچیوں کے ہم راہ میکے گئی ہوئی تھی اور وہاں چھوٹے بھائی کی شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھی۔ اس کے بھائی کی شادی فصل کی کٹائی کے بعد ہونے والی تھی۔ شادی سے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔

گندم کے پودے پک کر سنہری پڑ گئے تھے۔ اپریل کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں میں فصل کی کٹائی کی تیاری زور و شور سے ہو رہی تھی۔ اس دفعہ ربیع کی فصل بہت اچھی تھی۔ مزارعوں کے چہرے خوشی اور شادمانی سے دمک رہے تھے۔ نادر خاں بھی اسے اپنی کامیابی سمجھ کر مسرور نظر آتا تھا۔

لیکن رحیم داد کو فصل سے کوئی خاص رغبت اور دل چسپی نہیں تھی۔ اس نے فصل کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی۔ نادر خاں نئے کارندوں کے ساتھ فصل کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہی تھا۔ نادر سویرے سویرے کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور دن ڈھلے تک مزارعوں کے ساتھ رہتا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ سہ پہر کو غسل کرتا' لباس تبدیل کرتا اور شام ہوتے ہوتے مہمان خانے میں پہنچ جاتا۔

نادر خاں ہر شام گھر جانے سے پہلے رحیم داد کو فصل کی کٹائی کے بارے میں رپورٹ دیتا۔ رحیم داد کبھی کبھار کوئی بات پوچھ لیتا ورنہ عام طور پر چپ رہتا۔ وہ ان دنوں بہت بجھا بجھا رہتا تھا۔ تنہائی اور اکتاہٹ سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ پیراں والہ میں کچھ عرصہ قیام کرنا چاہتا تھا۔ وہاں اس کی دل بستگی کا سامان مہیا ہو سکتا تھا مگر شاہ جی لاہور میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔ پیراں والہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

☆

گرمی بڑھ گئی تھی۔ دوپہر ہوتے ہوتے در و دیوار سلگتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس دفعہ گرمی جلد ہی شروع ہو گئی تھی اور کچھ زیادہ بھی تھی۔ ہوا چلتی تو گرد کے گرم گرم بگولے تیزی سے اٹھتے۔ ہوا ٹھہری ہوتی تو حبس ہو جاتا۔ آسمان غبار آلود ہوتا۔ فضا اداس اور بے کیف محسوس ہوتی۔ ایک ایسی ہی بے کیف شام کو رحیم داد مہمان خانے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اچانک شام کی بڑھتی

ہوئی خاموشی میں ہارن بجنے کی تیز آواز ابھری۔ رحیم داد کا چہرہ خوشی سے جگ مگا اٹھا۔ اسے توقع تھی کہ احسان شاہ آیا ہو گا مگر وہ احسان شاہ نہ تھا' سردار مراد خان شاہانی تھا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں جوش و خروش سے بھینچ لیا' شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "شاہانی تو اتنے دنوں کہاں غائب رہا؟"

"آرام سے گل بات ہو گی۔" مراد خان نے جواب دیا۔

دونوں ہنستے مسکراتے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مراد خان نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا۔ "شاہ جی بتاتا تھا' جمیلہ تجھے چھوڑ کر سرحد پار چلی گئی۔"

"ہاں' وہ چلی گئی۔ شاہ جی نے ٹھیک ہی بتایا۔"

"سنا ہے اس کا بھرا آیا تھا اور رات کے اندھیرے میں اپنے ساتھ لے گیا۔" مراد خاں شاہانی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے اسے کیسے جانے دیا۔ روک بھی نہ سکا؟"

"میں اکیلا تھا اور وہ کئی تھے' پوری طرح مسلح تھے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "تیرے تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت نے بھی کام نہ کیا۔"

"اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ وہ تجھے مل گئی تھی۔ شاہ جی کہتا تھا جمیلہ کے ساتھ اس نے تیرا نکاح بھی پڑھوا دیا تھا۔ تو نے زیارت پر جو منت مانی تھی' وہ تو پوری ہو گئی۔"

"ایسی منت پوری ہونے سے کیا فائدہ جب وہ میرے پاس ٹھیری ہی نہیں۔"

"مجھے کیا پتہ تو نے کیا منت مانی تھی۔ میں تو یہ جانتا ہوں' تو نے یہ چاہا تھا کہ وہ تیری بن جائے۔" شاہانی زیر لب مسکرایا۔ "سچی بات یہ ہے کہ منت تو ایک طرح سے پوری ہو گئی۔ وہ تیرے ساتھ جڑ گئی۔"

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چوکنا ہو کر دیکھا۔ رحمتے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ تینوں بیٹے ہی تھے۔ وہ ماں کے ساتھ چل رہے تھے۔ رحمتے کے سر پر بڑی سی گٹھری تھی اور ہاتھ میں ٹین کا پرانا ٹرنک لٹک رہا تھا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "شاہانی یہ تو رحمتے ہے' تو اسے اپنے ساتھ کیسے لے آیا؟"

"اب اسے میرے ہی ساتھ رہنا ہے۔"

رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا' اس نے کرید کر پوچھا۔ "شاہ جی نے اسے تیرے ساتھ آنے کی اجازت کیسے دے دی؟"

"وہ تو اسے اپنی حویلی سے نکال رہا تھا۔" مراد خاں نے بتایا۔ "میں نے شاہ جی سے کہا' اسے

مجھے دے دے۔ وہ خوشی سے تیار ہو گیا۔"

"شاہ جی اب کہاں ہے۔" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"آج ہی صبح میرے ساتھ لہور سے پیراں والہ آیا تھا۔" مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "پر رات ہی بھر ٹھہرے گا' صبح واپس چلا جائے گا۔"

"دو چار روز بھی نہیں ٹھہرے گا؟" رحیم داد مضطرب ہو گیا۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے کہا۔ "اس نے اب لہور ہی رہنا ہے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال اس نے اپنے پتر نعمان شاہ کے حوالے کر دی ہے۔"

"پر وہ لہور میں کر کیا رہا ہے؟ بہت عرصے سے ادھر ہی ہے۔" رحیم داد ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔ "بات کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔ تجھے تو پتہ ہی ہو گا اسے مل کر آ رہا ہے۔"

"وہاں بیٹھا وہ سیاست لڑا رہا ہے۔ گورنر سے اس نے یاری کر لی ہے۔ اس سے اکثر ملتا بھی رہتا ہے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "آج کل شاہ جی کی کوٹھی پر ہر شام سیاست دانوں کی بیٹھک ہوتی ہے اور رات دیر تک چلتی ہے۔"

"تب تو اس کا ادھر ٹھہرنے کا لمبا ہی پروگرام لگتا ہے۔"

"ارادے تو اس کے کچھ ایسے ہی ہیں۔ ابھی تو اس نے وہیں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہاں کب تک رہے گا۔ کچھ پتہ نہیں۔" مراد خاں نے قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو خود شاہ جی کو بھی پتہ نہیں اس نے کب تک لہور ٹھہرنا ہے۔"

رحیم داد نے رحمتے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی تھی۔ "رحمتے' تو اس طرح کب تک کھڑی رہے گی؟" رحیم داد نے اونچی آواز سے مہمان خانے کے نئے ملازم کو پکارا۔ "گھماں ادھر آ۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور رحیم داد کے روبرو ادب سے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے رحمتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گھماں سے کہا۔ "اس نے ادھر ہی ٹھہرنا ہے۔ اس کے رہنے اور سونے کا بندوبست اپنی کوٹھڑی میں کر دے۔ تو حویلی میں جا کر سو جانا۔ اس کے لیے روٹی شوٹی کا بھی انتظام کر دے۔ اس نے ابھی روٹی کہاں کھائی ہو گی!!"

گھماں نہایت مستعدی سے بولا۔ "فکر نہ کریں جی۔ سارا بندوبست ہو جائے گا۔"

وہ رحمتے اور اس کے بچوں کو اپنی کوٹھری کی جانب لے جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔ "پہلے ایک گلاس تو لا۔"

وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور آن کی آن میں ایک گلاس لا کر رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بوتل کھولی اور سردار مراد خاں شاہانی کے لیے پیگ بنانے لگا۔

رحیم داد نے مراد خاں سے پوچھا۔ "تو نے رحمتے کو کہاں لے جانا ہے۔ اسے بھکر ہی میں رکھے گا؟"

"نہیں، میں نے اسے بیٹ لے جانا ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "رحمتے وہیں رہے گی۔"

"سلھڑی کا کیا بنے گا۔ وہ برا نہیں منائے گی؟"

"میں نے اسے نکال دیا۔" مراد خاں نے بے پروائی سے کہا۔

"تو نے اسے نکال دیا؟" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "وہ تو تیری جند جانی تھی، بہت چہیتی تھی۔"

"جب سے اس کے پتر کا مرن ہوا، ہر دم روتی رہتی تھی۔"

"جس روز وہ مرا، میں تو بیٹ ہی میں تھا۔"

"بس، اس دن سے جو اس نے ٹسوے بہانے شروع کیے تو بند ہی نہ ہوئے۔ جب دیکھو بیٹھی رو رہی ہے۔" مراد خاں نے تلخی سے کہا۔ "میں نے منع کیا تو چھپ چھپ کے روتی تھی۔ میں تو عاجز آ گیا۔ ویسے بھی وہ کام کی نہ رہی تھی۔ رو رو کر بیمار اور مریل لگنے لگی تھی۔ ایک رات مجھے غصہ آیا تو میں نے اسی دم اسے نکال دیا۔"

"کہاں گئی وہ؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کہاں گئی۔ پر تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو نے جس سلھڑی کو دیکھا تھا، بعد میں وہ ویسی نہیں رہی تھی۔ دیکھ کر گھن آتی تھی۔"

"تو رحمتے کو لے کر جا تو رہا ہے۔ اس کے بھی پتر ہیں۔ کوئی مر گیا اور اس نے بھی سلھڑی کی طرح رو رو کر اپنا ناس مار لیا تو اس کا کیا کرے گا؟" رحیم داد مسکرا کے بولا۔ "اسے بھی نکال دے گا؟"

"اور کیا کروں گا۔" مراد خاں نے کہا۔ "میں نے اس کا کوئی زندگی بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ایسا ٹھیکہ تو میں نے صرف اپنی ذال کا لیا ہے۔ اسے ویاہ کر لایا ہوں۔ اس سے تو میری آگے نسل چلے گی۔"

"سلھڑی کے بچے بھی تو تیرے ہی ہیں۔"

"ہوں گے، ضرور ہوں گے۔" وہ جھوم کر بولا۔ "پر اس سے کیا فرک پڑتا ہے۔ کمی رن کے بچے

بھی کمی ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی حق نہیں بنتا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "رحمتے کے نکے بھی شاہ جی ہی کے ہیں پر اس نے رحمتے کے ساتھ انھیں بھی نکال دیا۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے شکوہ کیا۔ "شاہ جی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ انھیں اپنی حویلی میں رکھتا' انھیں اپنے بچوں کی طرح پالتا۔ زمین دار بناتا' اپنی جائیداد کا وارث ٹھیراتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "برا نہ منانا چوہدری تو مجھے خاندانی زمیں دار نہیں لگتا ورنہ ایسے نہ سوچتا۔"

رحیم داد تلملا کر رہ گیا۔ جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔ "لگتا ہے تجھے کچھ آج زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ رم پی رہا ہے ناں۔ سنا ہے یہ وہسکی سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ویسے آج گرمی بھی زیادہ ہے۔"

"ایسی گالہ نہیں۔" مراد خاں شاہانی اپنے موقف پر اڑا رہا۔ "کوئی وڈا اور خاندانی زمیں دار اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا ورنہ کب کی زمیں داریاں اور جگیریں ختم ہو چکی ہوتیں۔ ایسی رناں تو زمیں داروں کا دل بہلانے کے لیے ہوتی ہیں۔" اس نے رحیم داد کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ "زمیں داری چلانے کے لیے یہ ضروری بھی ہے۔ تجھے اتنا تو پتہ ہی ہے کہ گھر والی' مرد کی عزت ہوتی ہے۔ ہوتی ہے ناں؟"

"بالکل ہوتی ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

"مزارعوں اور کمیوں کو کابو میں رکھنے کے لیے ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان میں عزت اور آن کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ مزارع سر نہیں اٹھا پاتا۔" مراد خاں نے سنجیدگی سے کہا "مزارعے اور کمی اسی طرح زمیں دار اور جگیردار کے تابع دار اور غلام رہ سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگ اور وڈیرے ایسا نہ کرتے تو مزارعے سرکشی اور بغاوت کر کے کب کے ہم سے زمیں داریاں چھین لیتے۔ کیا سمجھا؟" اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "لا' اسی بات پر ایک ڈبل بنا کر دے۔ تو نے مزہ خراب کر دیا۔"

رحیم داد نے مراد خاں کے گلاس میں رم ڈالی' پیگ بنایا اور گلاس مراد خاں کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے گلاس سنبھال کر غٹا غٹ کئی گھونٹ بھرے۔ رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ "تو دو چار روز تو میرے ساتھ ٹھیرے ہی گا؟ میں تجھے جلد نہیں جانے دوں گا۔ بہت دنوں بعد تجھ سے ملنا ہوا ہے۔"

"نہیں' میں نے کل صبح جانا ہے۔" مراد خاں نے کہا۔ "تو بھی میرے ساتھ چل۔ یہاں اکیلا پڑا ہے' ساتھ رہے گا تو تیرا دل بھی بہلے گا۔ تیرے پاس جیپ آگئی ہے' اسی میں چلیں گے۔ میں

نے پہلے ملتان جانا ہے۔ وہاں سے ٹرین پکڑ لیں گے۔"

رحیم داد تھوڑی حیل حجت کے بعد رضا مند ہو گیا۔ وہ بھی تنہائی سے اکتا گیا تھا۔ زمیں داری کی طرف سے اسے کوئی فکر نہ تھی۔ نادر خاں کی کارکردگی سے وہ مطمئن تھا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ مراد خاں نے اپنا گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے گلاس ختم نہیں کیا۔ وہ پہلے ہی بہت پی چکا تھا۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے کچھ دور ساتھ ساتھ چلے۔

سردار مراد خاں شاہانی جھومتا جھامتا رحمتے کے پاس پہنچا۔ وہ کوٹھری کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹی تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔ برابر کی چارپائی پر اس کے بچے بے خبر سو رہے تھے۔ مردا خاں کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ بالوں کو تیل ڈال کر سنوارا تھا۔ اس نے شام کو نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے تھے۔ وہ سبز لاچا باندھے ہوئے تھی۔ کرتا باریک ململ کا تھا اور دوپٹا گہرا بسنتی تھا۔ وہ پورا سنگھار کیے مراد خاں کا انتظار کر رہی تھی۔

رحمتے کا گہرا سانولا رنگ دالان میں روشن پیٹرومیکس کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ پنکھا جھلتے ہوئے اس نے مسکرا کر مراد خاں شاہانی کو دیکھا' چارپائی سے نیچے اتری' آہستہ سے بولی۔

"آج گرمی بہت ہے۔"

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر رحمتے کا بازو تھاما اور اس کے سہارے جھومتا جھامتا زینے کی طرف بڑھا۔ گھمّاں نے اس کے لیے چھت پر پلنگ بچھا کر اجلا بستر لگا دیا تھا۔ شاہانی کے قدم بری طرح ڈگمگا رہے تھے۔ رحمتے اسے بار بار سنبھالتی۔ دونوں نے سیڑھیاں طے کیں اور چھت پر پہنچ گئے۔ رحیم داد خاموش کھڑا مراد خاں شاہانی اور رحمتے کو دیکھتا رہا۔

سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی ڈرائیور نے جیپ حویلی کے پھاٹک پر لا کر کھڑی کر دی تھی۔ رحیم داد نے رات ہی کو سفر کے بارے میں گھمّاں کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ گیا تھا۔ اس نے رحیم داد اور مراد خاں کو جگایا۔ نادر خاں کو بھی مطلع کیا۔

آسمان پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلا تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے غسل کیا' لباس تبدیل کیا اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ رحمتے بھی پوری طرح تیار تھی۔ رحیم داد اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شاہانی پچھلی نشست پر رحمتے اور اس کے بچوں کے ہم راہ بیٹھا تھا۔ روانگی کے وقت حویلی کے دوسرے ملازموں کے علاوہ نادر خاں بھی موجود تھا۔ رحیم داد نے نادر کو بتایا کہ وہ سردار مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھکر جا رہا ہے۔

"واپسی کب تک ہوگی جی؟" نادر خاں نے دریافت کیا۔

اس دفعہ رحیم داد کے بجائے مراد خاں بولا۔ "چوہدری دیر ہی سے لوٹے گا' ویسے تو موجود ہی ہے۔"

"بھکر ہی میں ٹھیریں گے ناں؟" نادر خاں نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے جواب دیا۔ "بھکر نہیں' بیٹ میں ٹھیریں گے۔ وہاں شکار کھیلیں گے۔ ادھر گرمی بھی کم ہوتی ہے۔ ساتھ میں دریا بہتا ہے۔ تونے بیٹ تو دیکھا ہی ہے۔ کوئی ضروری کام ہو تو وہیں آجانا۔"

نادر خاں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ رحیم داد نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور تک نہر کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہی' پھر پختہ سڑک پر آگئی۔ سڑک ابھی تک سنسان تھی۔ ڈرائیور نے رفتار تیز کردی۔ جیپ چک بیدی کے راستے پاک پتن پہنچی اور وہاں سے شہر کی جانب روانہ ہوگئی۔ سڑک پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ بھی تھی۔ جیپ تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

مرید کوٹ پہنچتے پہنچتے دوپہر ہوگئی۔ ڈرائیور نے جیپ ٹھیرالی۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکنا کھولا۔ کھولتا ہوا گرم پانی ذرا ٹھنڈا ہوا تو اس نے ریڈی ایٹر میں اور پانی بھر دیا۔ ناشتے دان میں کھانا تھا۔ ڈرائیور نے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے سائے میں دری بچھا کر کھانا لگا دیا۔ رحیم داد اور مراد خاں کھانے سے فارغ ہوئے تو ڈرائیور نے رمتے اور اس کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا مگر انھوں نے زیادہ دیر قیام نہیں کیا۔ سب دوبارہ جیپ میں سوار ہوگئے۔ وہ ایک بار پھر سرمئی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ دن ڈھلے جیپ شہر سے گزری۔ رحیم داد کو طرح طرح کے اندیشوں نے ستایا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سہما ہوا بیٹھا رہا۔ جیپ آن کی آن میں شہر سے نکل گئی۔

☆

لالیاں والا بس اسٹاپ پر جیپ پہنچی تو ایک درخت کے نیچے راہ گیروں کا مختصر ہجوم نظر آیا۔ مراد خاں شاہانی نے جیپ رکوائی' نیچے اترا اور ہجوم کی جانب بڑھا۔ ڈرائیور اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رمتے بھی نیچے اتری اور اس کے اصرار کرنے پر رحیم داد کو بھی اترنا پڑا۔ دونوں ہجوم کی طرف بڑھے۔

قریب جا کر رحیم داد نے دیکھا' ایک عورت درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ اس کا

اوپری جسم برہنہ تھا۔ زیرِ ناف بس ایک پھٹا پرانا چیتھڑا لپٹا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال خاک دھول سے اٹے تھے اور بدن پر میل کی تہہ جمی تھی۔ نہ جانے کب سے اس نے غسل نہیں کیا تھا۔ اس کی عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں مگر بجھی بجھی اور ویران تھیں میل کی تہہ کے نیچے سے اس کی گوری جلد جھلک رہی تھی۔ کبھی وہ خوب صورت اور دلکش رہی ہو گی لیکن اب غلاظت کا ڈھیر لگتی تھی۔ سب کی نظریں اسی کی جانب تھیں اور وہ بالکل بے نیاز بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ وہ اس کے عریاں سینے پر چادر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر عورت بار بار چادر جھٹک کر ایک طرف پھینک دیتی۔ اس نے سر اٹھایا اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ایک نوجوان' جو وضع قطع سے کسی لاری کا کلینر نظر آتا تھا' عین اس کی سامنے کھڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پگلی کا چہرہ غضب ناک ہو گیا۔ چیخ کر بولی۔ "تو ادھر بھی آگیا۔ دفع ہو جا میرے سامنے سے۔" نوجوان سخت سٹپٹایا اور خجل ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

ہجوم میں سے ایک ادھیڑ شخص لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالے آگے بڑھا اور عورت کے نزدیک جا کر نرم لہجے میں عاجزی سے بولا "لے کرماں بھری' اسے پی لے۔" عورت نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور جھنجلا کے ایسا ہاتھ مارا کہ گلاس دور جا گرا۔ ساری لسی مٹی میں مل گئی۔ عورت ٹھٹھا مار کر ہنسی اور ادھر ادھر نگاہیں گھما کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے کا اچانک رنگ بدلا۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ "وے تو اکیلا ہی آگیا۔ حکیم کدھر ہے؟" رحیم داد پریشان ہو گیا۔ عورت برابر اسے گھورتی رہی۔ "تو حکیم کو جانتا ہے ناں؟ تو اسے ضرور جانتا ہے۔ تو اس کے ساتھ تھا۔ ہاں' تو ہی اس کے ساتھ تھا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر مراد خاں کی طرف دیکھا۔ مراد خاں اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری' یہ تو مست ملنگ ہے' جو سمجھ آتی ہے بولتی ہے' پتہ نہیں کون ہے۔"

"میں جی' پچھلے کئی مہینے سے اسے ادھر ہی دیکھ رہا ہوں۔" ڈرائیور نے بتایا۔ وہ مراد خاں اور رحیم داد کے عقب میں کھڑا تھا۔ "کبھی لاریوں کے اس اڈے پر نظر آتی ہے کبھی دوسرے پر۔ غصہ آتا ہے تو پتھر اٹھا کر مارتی ہے۔ کپڑے لتے پہناؤ تو چیر پھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ کبھی خوب زور زور سے روتی ہے۔ کبھی آپ ہی آپ ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے' کبھی اکیلی بیٹھی گھنٹوں بڑبڑاتی رہتی ہے۔"

"پگلی جو ٹھہری۔" مراد خاں بولا۔ "پر یہ آئی کہاں سے؟"

"یہ جی کمال گڑھ کے حکیم چشتی کی گھر والی ہے۔" ڈرائیور نے مطلع کیا۔

حکیم چشتی کا نام سن کر رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ مراد خاں شاہانی اس کی سراسیمگی سے بے نیاز تھا۔ اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔ "حکیم اب کہاں ہے؟ اسے لے کیوں نہیں جاتا۔ اس کا علاج معالجہ کیوں نہیں کراتا؟"

"وہ تو جی بہت مدت سے لاپتہ ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "سنا ہے وہ جڑی بوٹیاں' دوائی بنانے کے لیے اکٹھی کرتا تھا اور ان کی تلاش میں جھل اور ویرانوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ ایسے ہی گرمی کے دن تھے' ایک روز بوٹیوں کی تلاش میں ایسا گیا کہ فیر نہ لوٹا۔"

مراد خاں شاہانی نے حیرت اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟"

"وہ ایسا ہے جی! میرا ایک ماماں ادھر لال سائی میں ہوتا ہے۔ لال سائی جی کمال گڑھ سے نزدیک ہی ہے۔ وہ حکیم چشتی سے دوا دارو کراتا تھا۔ اسی نے حکیم کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا۔ کہتا تھا بہت نیک بندہ تھا۔"

شاہانی نے کرید کر پوچھا۔ "تھانے میں حکیم کی گمشدگی کا پرچہ تو چاک کرایا ہی ہوگا؟"

"کرایا تو تھا۔ ماماں ہی بتاتا تھا۔ پولیس نے کھوج نکالنے کی بھی بہت کوشش کی پر کچھ پتہ نہ چلا۔" ڈرائیور نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بات یہ ہے جی! حکیم کا کوئی پتر تو ہے نہیں اور نہ کوئی رشتے دار' نہ اس کی گھر والی کا ادھر رشتے دار اور شریکا ہے جو اس کا پتہ چلانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا۔" اس نے پگلی کی جانب دیکھا۔ وہ گردن اٹھائے فضا میں گھور رہی تھی۔ "حکیم کی صرف ایک جوان بیٹی تھی۔ سنا ہے ایک پولسیا جو تفتیش کے لیے حکیم کے گھر آتا جاتا تھا اسے اٹھا کر لے گیا یا وہ خود ہی اس کے ساتھ بھاگ گئی۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "وہ بھی واپس نہیں آئی؟"

"نہیں جی! وہ بھی اپنے پیو کی طرح لاپتہ ہو گئی۔ جانے اب کہاں ہے اور کیسی ہے؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں۔"

سردار مراد خاں نے حکیم چشتی کی پاگل بیوی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ "پر یہ پگلی کیسے بن گئی؟"

ایک بوڑھا قریب کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا' وہ بیچ میں بول اٹھا۔ "میں بتاؤں جی یہ پگلی کیسے بنی۔ میرا نام جی بودی ہے۔ میں کمال گڑھ میں ہی رہتا ہوں۔" اس نے مراد خاں کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "جب حکیم کی طرح اس کی دھی بھی لاپتہ ہو گئی تو یہ خود دونوں کی تلاش میں نکلی۔"

اس نے مڑ کر حکیم کی بیوی کی سمت دیکھا۔ "یہ تھانے کے چکر کاٹتی رہی۔ حکیم کے ملنے جلنے والوں کے گھر جاتی رہی۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتی رہتی' شام کو واپس گھر آتی۔ ایک شام واپسی پر اندھیرا بڑھ گیا۔ دھند ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ پڑوس کے پنڈ کا کوئی وڈا زمیں دار تاک میں لگا تھا' تب یہ تھی بھی بہت سوہنی۔ سنا ہے' اس نے اپنے کرندوں کے ذریعے اسے اٹھوالیا۔"

"پہلے سے اس نے اپنے کرندوں کو لگا رکھا ہو گا؟" ڈرائیور نے قیاس آرائی کی۔

"ایسا ہی لگتا ہے جی!" بودی نے بتایا۔ "بہت دنوں تک یہ پنڈ میں نظر ہی نہیں آئی۔ مکان خالی پڑا رہا۔ بعد میں اسے دیکھا تو بالکل پاگل دیوانی ہو چکی تھی۔ کپڑے لتے پھٹے ہوئے' بال بکھرے ہوئے۔ اور اب تو اسے ذرا بھی ہوش نہیں۔ گالاں نکالتی ہے۔ ڈانٹتی ہے چیختی چلاتی ہے۔ پتھر اٹھا کر مارنے دوڑتی ہے۔"

"کہتے ہیں جی اب تو یہ مجذوب ہو گئی ہے۔" ڈرائیور نے پگلی کے قریب بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بابا روز اس کے پاس آتا ہے۔ روٹی لاتا ہے' مٹھائی لاتا ہے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔"

"اور بھی ایسے کئی ہیں جی!" بودی بول پڑا۔ "کئی تو ایسے آتے ہیں جن کے ساتھ زنانیاں بھی ہوتی ہیں۔" اس نے مراد خاں شاہانی کی جانب دیکھا۔ "پر ایک گل اور بھی ہے جی!"

"وہ کیا؟" مراد خاں نے دریافت کیا۔

"وہ یہ ہے جی۔" بودی نے بتایا۔ "جس پر یہ غصے سے تھوک دے۔ سمجھو' اس کا کام بن گیا۔ سب یہی بتاتے ہیں۔ اسی لیے دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ منت کرتے ہیں' مٹھائی لاتے ہیں' دودھ لسی لاتے ہیں۔"

مراد خاں نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری تو اس کے پاس ضرور چلا جا۔ اسے اپنے کسی کام کے لیے کہہ۔ یہ تجھ پر غصے سے ضرور تھوکے گی اور تیرا کام فٹافٹ بن جائے گا۔ تجھ سے تو اس نے بات بھی کی تھی' جیسے تجھے پہلے سے جانتی ہو۔ تو کبھی کمال گڑھ تو نہیں رہا؟"

"نہیں جی! میں ادھر کبھی نہیں گیا۔ اسے تو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔" رحیم داد نے گھبرا کر صفائی پیش کی۔ "میں نے اس کی گالاں نہیں سنیں۔" رحیم داد نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔

"مراد خاں! بہت دیر رک لیا' اب چل۔ لما سفر ہے۔" اس نے پگلی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اس سے کچھ نہیں لینا۔"

"تیرا مطلب ہے' ساری رات سفر کرنا ہے۔ ڈرائیور کو آرام نہیں کرنا؟" مراد خاں شاہانی مسکرا کر بولا۔ "رات ملتان میں سلیم خاکوانی کی حویلی میں گزارنی ہے۔"

دونوں مڑے' جیپ کی جانب بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ رحمتے ایک اجلا دوپٹا ہاتھ میں دبائے تیز تیز قدم اٹھاتی ہجوم کی جانب بڑھی۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی حکیم چشتی کی پاگل بیوی کے قریب پہنچی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ درخت کے نیچے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ پگلی نظریں اٹھائے فضا میں گھور رہی تھی۔ درخت کی شاخوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی ڈوبتے سورج کی ایک کرن اس کے مٹیالے چہرے پر جھلملا رہی تھی۔ رحمتے اس کا جسم دوپٹے سے ڈھانکنے لگی۔ پگلی نے مطلق مزاحمت نہیں کی۔ رحمتے نے جس طرح اس کے جسم کے گرد دوپٹا لپیٹا' اس نے اسی طرح لپٹا رہنے دیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھکا اور گھونگٹ نکال کر رحمتے کی جانب مڑ کر دیکھا اور اشارے سے اسے قریب بلایا۔ رحمتے کھسک کر اور نزدیک ہو گئی۔ پگلی کھل کھلا کر ہنسی' ہاتھ بڑھایا اور رحمتے کی دھوتی کا کنارا پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ دھوتی کھل گئی۔ رحمتے نیم برہنہ ہو گئی۔ وہ سخت پریشان ہوئی۔ ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں میں سے بعض نے زور سے ٹھٹھا مارا۔

رحمتے بد حواسی میں جھک کر دہری ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی دھوتی باندھی۔ مگر وہ پگلی کے قریب سے ہٹی نہیں' وہیں بیٹھی رہی۔ پگلی نے اپنے سر اور سینے سے لپٹا ہوا دوپٹا اتار کر نفرت سے ایک طرف پھینک دیا' قہر آلود نظروں سے رحمتے کو دیکھا' ہاتھ بڑھا کے زور سے دھکا دیا اور چیخ کر بولی۔

"دفع ہو۔ میریاں اکھیاں اگوں دور ہو جا۔"

رحمتے سخت سراسیمہ ہوئی۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے اٹھی اور سیدھی جیپ کی جانب لپکی اور اپنی نشست پر جا کے بیٹھ گئی۔ رحیم داد اور مراد خاں نے مسکرا کر رحمتے کو دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور پہلے ہی اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔

رحیم داد گم صم اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ رحمتے بھی پریشان اور خجل تھی۔ وہ گردن جھکائے سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے رحمتے کو چھیڑا۔ "رحمتے! پگلی کو تجھ پر غصہ تو آیا تھا۔ اگر وہ تھوک دیتی تو تیرا کام ضرور بن جاتا۔"

"میں نے جی اس سے کیا کام لینا تھا۔" رحمتے نے جھینپ کر کہا۔ "وہ ننگی تھی' مجھے لاج آئی۔

میں بھی تو اسی کی طرح زنانی ہوں۔ سو میں نے اُسے اپنا دوپٹا اڑھا دیا۔ پر وہ تو ایک دم پگلی ہے۔ اسے ذرا بھی ہوش نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس پر ظلم بھی تو کتنا ہوا ہے۔ اس کا تو سب کچھ لٹ گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ اسے پاگل تو ہونا ہی تھا۔" رحمتے کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "اب تو اسے نہ کوئی فکر ہے، نہ غم۔"

☆

جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ گرمی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ سورج خزاں رسیدہ درختوں کی الجھی ہوئی برہنہ شاخوں کے پیچھے سرخ گولے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ شام نیچے اترنے کے لیے اپنے بازو آہستہ آہستہ پھیلا رہی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

جیپ ملتان شہر میں داخل ہوئی تو رات گہری ہو چکی تھی۔ سلیم اللہ خاکوانی جاگ رہا تھا۔ مراد خاں سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور انھیں اپنی کوٹھی میں ٹھہرایا۔

مراد خاں کا ارادہ صرف رات بھر قیام کرنے کا تھا مگر خاکوانی نے اصرار کر کے انھیں روک لیا۔ رحیم داد نے مراد خاں سے مشورہ کر کے اپنی جیپ واپس کوٹلہ ہرکشن بھیج دی۔ ملتان میں ایک روز ٹھہرنے کے بعد دوسرے روز وہ کار پر سلیم اللہ کی جاگیر کی جانب روانہ ہو گئے۔ فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ کھیتوں میں گندم اور جو کے کٹے ہوئے پودوں کے ٹھٹر نظر آ رہے تھے۔

سلیم اللہ خاکوانی اپنی جاگیر کے دورے پر نکلا تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد اس کے ہم راہ تھے۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتے پھرے۔ ہر طرف چہل پہل تھی، خوشی اور مسرت تھی جو فصلوں کی کٹائی کے بعد مزارعوں اور کمیوں کی زندگی میں ہر سال نظر آتی ہے۔ اس بار ربیع کی فصل بہت اچھی تھی لہٰذا مسرت کا اظہار بھی زیادہ کیا جا رہا تھا۔

دو ہفتے سے بھی زیادہ جاگیر میں ٹھہرنے کے بعد سلیم اللہ خاکوانی واپس ملتان پہنچا۔ مراد خاں اور رحیم داد بھی اس کے ہمراہ تھے۔ واپسی کے بعد رحیم داد اور مراد خاں نے تین روز اور ملتان میں قیام کیا۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ لو چلنے لگی تھی۔ دن بھر خاک اڑتی رہتی۔ گلی کوچے سنسان نظر آتے۔ مگر شام ہوتے ہی شہر کی رونق لوٹ آتی اور گرمی کی شدت کم ہوتی جاتی۔ رات خوش گوار ہوتی۔

مئی کی ایک غبار آلود صبح کو مراد خاں اور رحیم داد رخصت ہوئے۔ وہ خاکوانی کی کار میں اسٹیشن پہنچے۔ رحمتے اور اس کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ مراد خاں نے روانگی سے قبل اپنی آمد کے

بارے میں تار دے کر کریم بخش رادھانی کو مطلع کر دیا تھا۔ سلیم اللہ خاکوانی دونوں کو الوداع کہنے اسٹیشن تک آیا۔ اس نے گرم جوشی سے گلے مل کر دونوں کو رخصت کیا اور دوبارہ آنے پر زور دیا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد ٹرین میں سوار ہوئے اور مظفر گڑھ کے راستے بھکر کے لیے روانہ ہو گئے۔ مراد خاں اور رحیم داد سیکنڈ کلاس میں تھے اور رحمتے اپنے بچوں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک زنانہ ڈبے میں بیٹھی تھی۔

جب وہ بھکر پہنچے تو اسٹیشن کے باہر مراد خاں کی جیپ موجود تھی۔ ٹرین سے اترتے ہوئے مراد خاں نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری' تک کھے پیر کا مزار سٹیشن کے احاطے ہی میں ہے۔ ایک بار فیر منت مان لے۔"

مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا' بے دلی سے بولا۔ "نہیں جی! میں نے اب منت شت نہیں ماننی۔"

مراد خاں شاہانی نے اصرار کیا۔ "میرا کہا مان' اس دفعہ تجھے جمیلہ اس طرح مل جائے گی کہ ہمیشہ تیرے ہی پاس رہے۔"

رحیم داد کے دل میں جمیلہ کی یاد نے انگڑائی لی اور اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "تجھے یقین ہے جمیلہ واپس آجائے گی؟"

"میں تو کہتا ہوں' وہ ضرور واپس آئے گی۔ تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت اس بار بھی پوری ہو گی۔" سردار شاہانی نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "زیارت پر چڑھانے کے لیے چراغ اور میٹھی روٹیاں ڈرائیور کو بھیج کر بازار سے منگوائے لیتا ہوں۔ تو منت ماننے کو تیار ہو جا۔"

لیکن رحیم داد نے ارادہ بدل دیا۔ اس نے عذر پیش کیا۔ "بیٹ سے واپسی پر منت مانوں گا۔ ابھی رہنے دے۔"

مراد خاں نے اصرار نہیں کیا۔ وہ رحمتے اور رحیم داد کے ہم راہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ مگر بھکر میں واقع اپنی حویلی کی جانب نہیں گیا۔ بیٹ کی سمت روانہ ہو گیا۔ جیپ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی اور جب بیٹ میں داخل ہو کر ہموں والی پہنچی تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

شفق کی سرخی سے دریائے سندھ کا پانی لالہ رنگ ہو گیا تھا۔ فضا خوش گوار تھی۔ یہ ساحلی علاقہ ہے۔ ملتان اور بھکر کے مقابلے میں گرمی بھی کم تھی۔ دریا کی جانب سے بھیگے بھیگے جھونکے آرہے تھے۔ طویل سفر کے بعد سب نے فرحت اور تازگی محسوس کی۔ جیپ حویلی کے پھاٹک پر رکی۔ مراد خاں کا کاردار کریم بخش رادھانی پھاٹک پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مراد خاں جیپ سے نیچے اترا۔

رادھانی نے جھک کر سردار کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور نگاہیں جھکائے ہوئے ادب سے بولا۔

"خیر اے سیں۔ خوش ہو۔ راضی باضی ہو۔ بالیں بچیں، ڈیڈھی پر دے سب خیر اے۔ بال جان، مال ڈھگی، سب خیر اے؟"

"شکر اے۔" مراد خاں نے مسکرا کر سرپرستانہ انداز میں کہا۔ "تو اپنا حوال سنا۔ خیر سلا اے؟"

"خیر سلا اے سیں۔" رادھانی نے زیرلب مسکرانے کی کوشش کی۔

رحیم داد، رمتے اور اس کے بچے بھی جیپ سے اتر چکے تھے۔ مراد خاں شاہانی آگے بڑھا۔ سب اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ پھاٹک عبور کر کے حویلی کے احاطے میں داخل ہوئے۔ شام کالی پڑتی جا رہی تھی، اندھیرا پھیل رہا تھا۔

مراد خاں سفر کی تکان سے نڈھال نظر آ رہا تھا۔ اس کا لباس گرد آلود تھا۔ اس نے مڑ کر رادھانی کی طرف دیکھا۔ "جیپ سے سامان اتروا۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلنے ہیں۔ سو بھی جلدی جاؤں گا۔ تجھ سے صبح آرام سے بات ہوگی۔"

"فکر نہ کر سیں۔" کریم بخش رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تیرے اور چوہدری کے لیے میں نے ویہڑے میں دو منجے ڈال کر بستر لگوا دیے ہیں۔ دھاون کے لیے حمام میں پانی بھی رکھ دیا ہے۔ روٹی جلدی کھانی ہے تو وہ بھی تیار ہے۔ سیں! کوئی اور حکم؟"

مراد خاں قریب رکھی ہوئی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رمتے کچھ فاصلے پر سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ اس کے بچے بھی خاموش اور سہمے ہوئے تھے۔ کار دار کریم بخش رادھانی پھاٹک کے پاس کھڑے ہوئے نوکروں کی جانب بڑھا اور انھیں ضروری ہدایات دے کر واپس آ گیا۔ مراد خاں شاہانی کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔

"جیپ سے سامان اتار کر کمروں میں پہنچا دیا جائے گا۔ سیں تو اب حمام میں چلا جا۔ دھاون سے طبیعت ایک دم تازہ ہو جائے گی۔ ویسے آج گرمی بھی زیادہ ہی ہے۔"

مراد خاں شاہانی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو نے فصل کی واڈھی کرا دی؟"

"ہا سیں! کرا دی۔" رادھانی نے جواب دیا۔ "تیرا حکم ملتے ہی میں نے واڈھی شروع کرا دی تھی۔ اب تو گاہنے کے لیے پڑ میں بھی پہنچنے لگی ہے۔"

"سویرے تیرے ساتھ ادھر چلوں گا۔" مراد خاں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا اور مڑ کر رمتے

کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ رتیتے ہے۔ یہیں رہے گی۔ اس کے ٹھیرنے کا بندوبست سلمیٰ کی کوٹھڑی میں کر دے۔" یہ کہہ کے وہ غسل کرنے حویلی کے اندر چلا گیا۔

رادھانی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "سیں چوہدری' تو بھی نہا دھو کر کپڑے بدل لے۔ تیرا سامان کمرے میں پہنچ گیا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "تیرے لیے میں نے اسی کمرے میں بندوبست کیا ہے جس میں تو پچھلی بار ٹھیرا تھا۔"

رحیم داد نے غسل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ وہ واپس پہنچا تو مراد خاں شاہانی نہا دھو کر' اجلا لباس زیب تن کیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر بوتل تھی' گلاس تھے اور جگ میں پانی تھا۔ سردار مراد خاں نے گلاس بھرے مگر انھوں نے زیادہ دیر شغل نہیں کیا۔ کھانا کھایا اور کھڑے ہو گئے۔

مراد خاں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رحیم داد ڈیرے کی جانب بڑھا۔ صحن میں دو بڑے بڑے پلنگ بچھے تھے۔ ان کے پائے رنگین اور اونچے تھے۔ بستر صاف ستھرے تھے۔ بستروں کے سرہانے نرم اور دبیز تکیے رکھے تھے۔ پائینتی پر دوتاہی قرینے سے رکھی تھی۔ دوتاہی پر رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ رحیم داد خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک مراد خاں شاہانی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ بار بار قریب کا پلنگ دیکھتا رہا مگر ہر بار بستر خالی نظر آتا۔ مراد خاں نہیں آیا۔ آخر رحیم داد سو گیا۔

صبح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو مراد خاں شاہانی بستر پر بے خبر سو رہا تھا۔ رات وہ کب آکر بستر پر لیٹا' رحیم داد کو خبر نہیں ہوئی۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کے غسل کیا اور صحن میں واپس آیا تو مراد خاں بیدار ہو چکا تھا اور بستر پر تکیے کے سہارے بیٹھا انگڑائیاں لے رہا تھا۔

دونوں نے ناشتا کیا اور حویلی کے احاطے سے نکلے۔ کریم بخش رادھانی بھی ان کے ہم راہ تھا۔ تینوں کھیتوں کی جانب چلے۔ ربیع کی کٹائی مکمل ہو چکی تھی۔ کھیت ویران اور اجاڑ نظر آرہے تھے۔ اکا دکا ستھر بھی تھے۔ یہ کٹی ہوئی فصل کے پودے تھے جو دھوپ میں سکھانے کے لیے بکھیر دیے گئے تھے۔ کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ پڑ تھے۔ مٹی کے ان چبوتروں پر دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے گندم' جو اور چنے کے پودوں کے کھلیان تھے۔ یہ خشک پودے تھے اور سانڈھنے کے لیے ان پر گیدڑ اور بیری کی سبز شاخوں کے پھلے چل رہے تھے۔

رحیم داد کا یہ معمول ہو گیا کہ ناشتے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور رادھانی کے ساتھ صبح نکلتا۔ دوپہر تک گاؤں گاؤں کھیتوں کے درمیان گھومتا رہتا' مراد خاں یا رادھانی سے فصل کے سانڈھنے

کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا اور دوپہر کو مراد خاں شاہانی کے ہم راہ واپس آتا۔ پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا۔ مراد خاں شاہانی بھی دوپہر کے بعد کھیتوں کی طرف کم ہی جاتا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی اور روز بہ روز شاہانی کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔

☆

گرمی میں اور اضافہ ہو گیا۔ رحیم داد تیز دھوپ میں گھومنے پھرنے سے کتراتا۔ مراد خاں نے بھی اس کی پریشانی محسوس کی۔ اب وہ خود بھی کئی کئی روز حویلی سے نہ نکلتا اور اگر نکلتا بھی تو دھوپ کی حدت بڑھنے سے پہلے آجاتا۔

گرمی بڑھنے کے ساتھ ساتھ رحیم داد نے یہ بھی محسوس کیا کہ فصل کی کٹائی کے بعد عام طور پر جو خوشی اور شادمانی نظر آتی ہے، وہ کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزارعوں کے چہروں پر مسرت کے بجائے خلاف معمول خشونت ہوتی، جوش و خروش کے بجائے بے زاری اور چڑچڑاپن ہوتا۔ بٹائی کے دن قریب آتے جارہے تھے۔ مزارعوں کے چہرے زیادہ بجھے بجھے دکھائی دیتے مگر رحیم داد نے اس سلسلے میں مراد خاں سے کوئی استفسار نہیں کیا۔ مراد خاں بھی چپ چپ رہتا۔ وہ بہت کم بات کرتا۔ کبھی کبھی شام ہوتے ہی ڈھانڈلوں اور نوانیوں کے پاس چلا جاتا اور آدھی رات تک نہ لوٹتا۔

رحیم داد اکتا گیا تھا اور واپس کوٹلہ ہر کشن جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مئی کی ایک گرم اور غبار آلود رات تھی۔ مراد خاں شاہانی دن ڈھلے نکل گیا اور اب تک نہیں لوٹا تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا تھا۔ وہ دیسی شراب کے تین گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کریم بخش رادھانی آگیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "رادھانی! سردار کدھر گیا ہے؟"

"وہ تو جی! اکرم خاں نوانی کی طرف گیا ہے۔"

"کب تک واپس آئے گا؟"

"لگتا ہے، آج بھی دیر ہی سے لوٹے گا۔" رادھانی نے بتایا۔ "نوانیوں کے علاوہ ڈھانڈلے بھی ہیں۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ بات چیت لمبی ہی چلے گی۔"

"آج کل مراد خاں روز شام کو ڈھانڈلوں اور نوانی زمیں داروں کے پاس جارہا ہے، اور دیر سے لوٹتا ہے۔" رحیم داد نے رادھانی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "سردار وہاں کیا کرتا رہتا ہے؟"

"بات ہی ایسی ہے جی!" کریم بخش رادھانی نے مختصر جواب دیا۔

"مجھے تو وہ پریشان پریشان دکھائی دیتا ہے۔ تو بھی پریشان لگتا ہے۔ خیر خیریت تو ہے؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "پنڈ بھی سونے سونے نظر آتے ہیں۔ حویلی بھی ویران ویران لگتی ہے۔" رحیم داد نے نشے کی جھونک میں ہلکا قہقہہ لگایا۔ "کوئی پوپٹ رن بہت دنوں سے ادھر نہیں آئی؟"

"سیں! آج کل ایسی گالہ نہ کر۔" رادھانی کے لہجے میں تردد تھا۔ "ادھر کا حال احوال ٹھیک نہیں۔ تجھے پتہ نہیں، بہت گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔"

"لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔ پر نہ میں نے سردار مراد خاں سے پوچھا نہ اس نے بتایا۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "تو بتا' ایسا کیوں ہے؟"

"سیں! بات دراصل یہ ہے۔" رادھانی نے بتایا۔ "مزارعے کہتے ہیں' اس بار بٹائی پر وہ نکا ٹیکس نہیں دیں گے۔"

"نکا ٹیکس؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

کریم بخش جواب دینے ہی والا تھا کہ پھاٹک پر اونچی آواز سے بولنے کا شور بلند ہوا۔ مراد خاں شاہانی واپس آگیا تھا۔ رادھانی تیز تیز قدم اٹھاتا پھاٹک کی جانب بڑھا۔ ذرا دیر میں مراد خاں شاہانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا اور رحیم داد کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کئی روز سے میں تجھے پریشان پریشان دیکھ رہا ہوں۔"

"ہا سیں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

رحیم داد نے کہا۔ "یہ نکا ٹیکس کا کیا چکر ہے؟ میں نے تو کبھی ایسا ٹیکس ٹیکس نہیں سنا۔"

"تو نے سچ مچ نہیں سنا ہو گا اور تو اسے سمجھ بھی نہیں پائے گا۔ تیری طرف کے زمیں دار اپنے مزارعوں سے ایسا کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتے۔"

"ادھر کب سے وصول کیا جا رہا ہے؟"

"آج سے نہیں انگریزوں کے زمانے سے وصول کیا جا رہا ہے۔"

"یہ ٹیکس ہوتا کیا ہے؟"

"یہ ٹیکس اس طرح شروع ہوا کہ افضل خاں ڈھانڈلہ نے جو بیٹ کا بہت وڈا جگیردار تھا' اپنے پتر اسلم خاں کا پرنا کیا۔" مراد خاں اپنے لیے پیگ بنا کر بولا۔ "افضل خاں ذیل دار بھی ہوتا تھا۔ دور دور تک مشہور تھا۔ اس نے بہت دھوم دھام سے اپنے پتر کے پرنے پر جشن منایا۔ لہور اور ملتان سے کنجریاں بلائیں۔ کئی روز تک ناچ گانے کی محفل جمی۔ بہت زوردار میل ہوا۔"

"میں نے تجھ سے افضل خاں اور اس کے پتر کے ویاہ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔" رحیم داد

نے نشے سے لہرا کر اسے ٹوکا۔

"چپ کر کے سنتا جا۔" مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ایسا ہوا کہ ایک کنجری گانے کے ساتھ ساتھ ناچ بھی رہی تھی۔ مجرا کرتے ہوئے کسی طرح اس کے ماتھے کا ٹکا گر گیا۔ رات کو تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ سویرے سو کر اٹھی تو اسے پتہ چلا کہ اسکا ٹکا غائب ہے۔ وہ افضل خاں ڈھانڈلہ کے پاس پہنچی اور ٹکا کھونے پر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ افضل خاں ڈھانڈلہ بہت زور آور سردار تھا۔ اسے غصہ بھی بہت آتا تھا۔ اس نے ٹکا تلاش کرایا۔ ٹکا نہ ملا تو وہ بہت ناراض ہوا۔" شاہانی نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "جانتے ہو اس نے کیا کیا؟" رحیم داد خاموش رہا۔ مراد خاں نے بتایا "افضل خاں نے کنجری کو نیا ٹکا بنوا کر دیا اور سزا کے طور پر اپنے تمام مزارعوں پر ٹکا ٹیکس لگا دیا۔ ہر پگ بن پر ایک من کنڑک۔"

"تب تو ایک ہی فصل پر ٹکے کی قیمت سے کہیں زیادہ مالیت کی گندم مل گئی ہو گی۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "اب تک یہ ٹیکس کیسے چل رہا ہے؟ تو نے ہی تو بتایا تھا کہ انگریزوں کے زمانے سے چل رہا ہے۔"

"گالہ اچی ایہہ اے کہ ایک بار جو ٹیکس زمیں دار اپنے مزارعوں پر لگا دیتے ہیں' وہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ تجھے بھی یہ اچھی طرح پتہ ہے۔ یہ بتا انگریزوں کے زمانے کا کون سا ٹیکس ختم ہوا؟ سبھی چل رہے ہیں بلکہ زمیں داروں نے کم کرنے کی بجائے بڑھا دیے ہیں۔"

"پر ٹکا ٹیکس تو افضل ڈھانڈلہ نے اپنے مزارعوں پر لگایا تھا۔ تجھے اور نوانی زمیں داروں نے اس سے کیا لینا۔"

"ہوا تو ایسا ہی تھا پر اب تو بیٹ کے سارے زمیں دار اپنے مزارعوں سے ٹکا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔" مراد خاں نے بتایا۔ "ہوتا یہ ہے کہ ربیع کی واڈھی پر ہر زمیں دار اپنے مزارعے سے بٹائی کے وکت ایک من کنڑک ٹکا ٹیکس کے طور پر کاٹ لیتا ہے۔"

"افضل خاں ڈھانڈلہ ابھی زندہ ہے؟"

"نا سیں! اسے تو مرے ہوئے بھی برسوں ہو گئے۔" مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے' بہت زبردست سردار تھا۔ کوئی مزارع اس کے سامنے گردن اٹھا کر نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے پاس بہت عمدہ نسلوں کے کتے تھے۔ شکار بھی بہت کھیلتا تھا۔ مزارعوں کو ایک دم دبا کر رکھتا تھا۔ کوئی مزارع ذرا بھی سرکشی دکھاتا تو اس پر کتے چھوڑ دیتا' وہ اسے چیر پھاڑ کر برابر کر دیتے۔ تھانے دار اور دوسرے سارے افسر اس سے ڈرتے تھے۔؟"

"اوپر تک پہنچ ہو گی اس کی؟"

"بالکل تھی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے۔ لاٹ گورنر کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "افضل خاں ڈھانڈلہ کا مرن ہو گیا پر اس کا لگایا ہوا ٹکا ٹیکس ختم نہیں ہوا۔ ختم ہو بھی نہیں سکتا۔ چوہدری، تو خود ہی سوچ، ٹکا ٹیکس بند ہو گیا تو زمیں داروں کا کتنا گھاٹا ہو گا۔"

"مزارعوں نے ابھی تک کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟"

"یہ گڑبڑ کچھ کم ہے کہ وہ بٹائی پر ٹکا ٹیکس دینا نہیں چاہتے۔" مراد خاں شاہانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"پہلے بھی کبھی انھوں نے ٹکا ٹیکس دینے سے انکار کیا؟"

"نہیں! پہلی بار انھوں نے ایسا کیا ہے۔" مراد خاں کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "تجھے پتہ نہیں، بیٹ کے مزارعے اور کامے تو بہت سیدھے اور نیک بندے ہیں۔"

"پر وہ اچانک اتنے سرکش کیسے ہو گئے؟ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، مزارعے نظریں اٹھا کر اپنے زمیں داروں سے گل بات نہیں کرتے۔ ادھر کے مزارعے تو بہت ہی نیک بندے لگتے ہیں۔ اب ان میں اتنا حوصلہ کیسے آگیا؟" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ "کوئی نہ کوئی گل ضرور ہو گی۔"

"گالہہ کچھ اس طرح ہے چوہدری۔" مراد خاں نے بتایا۔ "لہور اور لائل پور سے کچھ بندے ادھر آگئے ہیں۔ وہ زمیں داروں کے خلاف جگہ جگہ گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔ انھوں نے ہی مزارعوں اور کاموں کو بہکا کر یہ آگ بھڑکائی ہے۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "مزارعوں اور کاموں کے ساتھ مصلی، کشانے اور کئی دوسرے بھی لگ گئے ہیں۔ ایک ملا بھی ان سے مل گیا ہے۔ اس کا نام مولوی احمد بخش ہے۔ وہ سب سے آگے ہے۔ جلسے کرتا ہے، تکریریں کرتا ہے۔ مزارعوں اور کمیوں کو زمیں داروں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔"

"ڈھانڈلوں نے اب تک ان کے خلاف کچھ نہیں کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "ادھر کی زیادہ زمیں داری تو انھی کے پاس ہے۔ وڈے زمیں دار بھی وہی ہیں۔ شاہانی تو بہت کم ہیں۔ میں نے یہی سنا ہے۔"

"تو نے ٹھیک سنا ہے۔ ہموں والی میں ڈھانڈلے زمیں دار زیادہ ہیں۔ ویسے پورے بیٹ کے زیادہ زمیں دار ڈھانڈلے ہی ہیں۔ پر سوال صرف ڈھانڈلوں کا نہیں۔ گڑبڑ تو سارے بیٹ میں پھیل

گئی ہے۔ ڈھانڈلوں کے ساتھ نوانیوں اور شاہانیوں، سب کو مل کر سوچنا ہو گا۔"

"سب نے مل کر کیا سوچا؟"

"کارروائی کرنے ہی کی سوچ رہے ہیں۔ سارے ڈھانڈلے نوانی، شاہانی، زمیں دار آپس کے تمام جھگڑے نبٹے بھول کر اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں۔ روز میٹنگیں کرتے ہیں۔ مزارعوں کو دبانے کی سکیمیں بناتے ہیں۔"

"ابھی تک سکیمیں ہی بن رہی ہیں، ہوا ہوایا کچھ نہیں۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"تجھے پتہ نہیں، زمیں داروں کے کرندوں اور دوسرے بندوں نے گڑبڑ پھیلانے والے مزارعوں پر مسلح حملے کیے۔ گھروں پر ہلا بول دیا۔ ڈھور مویشی اٹھوا لیے۔"

"تب تو وہ ڈر گئے ہوں گے۔"

"نا سئیں، ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "نکا ٹیکس دینے سے تو وہ انکار کر ہی رہے ہیں۔ اب تو انھوں نے محصول دینا بھی بند کر دیا ہے۔" اس کے چہرے پر پریشانی پھیلنے لگی۔ "پچھلے کچھ دنوں سے یہ بھی خبریں مل رہی ہیں کہ مزارعوں نے زمینوں پر کبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ زمیں داروں کے مسلح کرندوں سے ڈٹ کر لڑتے ہیں۔ پورے بیٹ میں گڑبڑ پھیل چکی ہے اور کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے آج یہ طے کیا گیا ہے کہ بارڈر ملٹری پولیس بلائی جائے۔ کرندوں سے تو وہ اب دبنے کے نہیں۔ ضرورت پڑی تو بھکر بلکہ میاں والی سے بھی پولیس آجائے گی۔"

"جو مزارعے آگے آگے ہیں، انکے خلاف چوری ڈکیتی کے الزام میں پرچے بھی تھانے میں چاک کرانے چاہئیں۔ کیسوں کو مکدمے بنا کر بند کرانا ہو گا۔" رحیم داد نے تجویز پیش کی۔

"بھی کچھ کرنا ہو گا۔ ایسے ہی تو نہیں بیٹھے رہنا۔"

دونوں نے اپنے اپنے گلاس خالی کیے، کھانا کھایا اور صحن میں بچھے ہوئے پلنگوں پر لیٹ گئے۔ مراد خاں تھکا ہوا تھا، جلد ہی سو گیا مگر رحیم داد جاگتا رہا۔ وہ واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح ہوئی، دن چڑھا۔ ناشتے پر رحیم داد کی مراد خاں سے ملاقات ہوئی۔ رادھانی بہت دیر سے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ سویرے سویرے آگیا تھا۔ مراد خاں شاہانی کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ کریم بخش رادھانی بھی سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد رادھانی اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد نے ہمدردی کے انداز میں پوچھا۔ "سردار! تو رات سے بھی زیادہ پریشان نظر آرہا ہے۔ خیر سکھ ہے؟"

"تجھے تو پتہ ہی ہے' مزارعوں اور کاموں نے گڑبڑ مچا رکھی ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "ان کے حوصلے برابر بڑھتے جا رہے ہیں۔ کسی طرح کابو میں نہیں آ رہے۔"

"کوئی خاص بات ہو گئی؟"

"رات بستی نظام میں زبردست جھگڑا ہوا۔ ادھر نوانیوں کی زمیں داری ہے۔ مزارعوں نے کنزک کے کھلیانوں اور ڈھیریوں پر جتھا کر رکھا ہے۔ کار دار اور کرندے ونڈائی کے لیے ونڈولوں کے ساتھ پہنچے تو مزارعوں نے انھیں روک دیا۔" مراد خاں ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ "کار دار اور کرندے مسلح ہو کر گئے تھے۔ انھوں نے ڈھیریاں اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کی۔ اسی پر جھگڑا شروع ہو گیا۔"

"رات کو تو نے یہ نہیں بتایا تھا۔"

"مجھے پتہ ہی کب تھا۔" مراد خاں بولا۔ "صبح رادھانی گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے مجھے بستی نظام کے بارے میں بتایا۔ کہتا تھا' مزارعوں کے ساتھ ان کے بال بچے بھی نعرے لگاتے تھے' پتھراؤ کرتے تھے۔ بہت خوں خرابہ ہوا۔ آخر زمیں داروں کے بندوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ کرتے بھی کیا۔ یوں سمجھو' ساری بستی نے ان پر ہلا بول دیا تھا۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے' یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

کمرے میں خاموشی ہو گئی۔ چند لمحے بعد رحیم داد کی آواز ابھری۔ "اپنی سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"کیسی بات؟" مراد خاں نے تجسس سے پوچھا۔

"ساری گڑبڑ نکا ٹیکس کی وجہ سے ہے ناں؟ اسے ختم کر دیا جائے تو سارے جھگڑے نمٹے اور ساری گڑبڑ ختم ہو جائے گی۔"

"سیں' گالہ صرف اتنی نہیں ہے۔" مراد خاں کا لہجہ تیکھا تھا۔ "یہ اپنے سرداروں اور زمیں داروں کی عزت اور آن کا بھی سوال ہے۔ ایک بار مزارعوں اور کمیوں کی گردن اونچی ہو گئی تو اسے جھکانا بہت مشکل ہو گا۔ آج وہ نکا ٹیکس ختم کرائیں گے تو کل پرنا ٹیکس' مرن ٹیکس' موہنڈن ٹیکس' ڈھور ڈنگر ٹیکس' دری ٹیکس' ککڑ ٹیکس' سارے ہی ٹیکس ایک ایک کر کے ختم کراتے جائیں گے۔ تب زمیں داروں کا کیا بنے گا؟ خالی ونڈائی سے فصل پر کیا ملے گا؟ تو خود سوچ' صرف اس سے کیسے

کام چل سکتا ہے؟" اس نے نظر اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سیں، تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ ادھر زمیں داری کرنا مخول نہیں ہے۔ مزارعے کو جوتی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔" اس کا چہرہ کرخت ہو گیا۔ "جہاں وہ سر اٹھائے، ٹھوکر مار کر توڑ دو۔"

"پر گڑ بڑ اور بڑھی تو آگے کے لیے زمیں داروں نے کیا سوچا۔؟" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سوچنا کیا ہے، خون بہے گا۔ دس بیس کی لاشیں پڑی ہوں گی۔" مراد خاں کے وجود میں چھپا ہوا سردار جاگ اٹھا۔ غصے سے اس کی مونچھیں پھڑپھڑانے لگی تھیں۔ "پولیس عدالت سب اپنی ہے۔ ادھر سرداروں کا کانون چلتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں چکا چوند ابھری۔ "ہو سکتا ہے، آج ایسا ہی ہو۔ گڑ بڑ زیادہ بڑھی تو یہی کرنا ہو گا۔ زمیں داروں نے سوچ رکھا ہے۔"

"تو نے رات بتایا تھا بارڈر ملٹری پولیس کو مدد کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"ہاں، آج بارڈر ملٹری پولیس پہنچ جائے گی۔ پوری طرح مسلح بھی ہو گی۔ زمیں داروں اور ان کے بندوں کے پاس بھی ہر طرح کا اسلحہ ہے۔" مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "دیکھنا ہے، گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے کتنی دیر ٹھیر سکیں گے۔ کتنی دیر پتھراؤ کریں گے۔ جو آگے آگے ہیں اور لیڈر بنے ہوئے ہیں، ان کے خلاف بلوے اور چوری ڈکیتی کے مکدمات پہلے ہی سے تیار رکھے ہیں۔ وہ آج ہی گرفتار کر لیے جائیں گے۔ پولیسے حوالات میں بند کر کے ایسی مار لگائیں گے کہ ساری زور ازاری نکل جائے گی۔"

"تھوڑی بہت جو سکت رہ جائے گی، وہ مکدمے بازی کی بھاگ دوڑ اور عدالتوں کا چکر کاٹتے کاٹتے نکل جائے گی۔" رحیم داد نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی مکدموں کا فیصلہ مہینوں اور اکثر برسوں نہیں ہوتا۔ تب تک تو ان کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے گا۔ گڑگڑائیں گے، معافی مانگیں گے، بر پکڑیں گے۔" اس نے مراد خاں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "مزارعوں کے ساتھ میں داروں اور سرداروں کے جھگڑے تو پہلے بھی ہوتے ہوں گے۔؟"

"کیوں نہیں۔" مراد خاں نے اسے آگاہ کیا۔ "بے دخلی پر تو اکثر ہوتے رہتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پر چی گالہ ایسہ ہے سیں۔ اتنی زیادہ گڑبڑ پہلے کبھی بیٹ میں نہیں ہوئی۔ اس بار تو سارے ہی مزارعوں نے زبردست اکٹھ کر رکھا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ایک ہو گئے ہیں۔" اس کے لہجے سے تردد عیاں تھا۔ "انھیں دبانے کے لیے بہت زور لگانا پڑے گا۔"

"آج تجھے تو کہیں نہیں جانا؟"

"مجھے رادھانی کے ساتھ بستی نظام جانا ہے۔"

رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "تو روز چلا جاتا ہے۔ میں یہاں اکیلا پڑا رہتا ہوں۔"

"تو بھی میرے ساتھ چل۔"

"میں تو واپس جانے کی سوچ رہا ہوں۔" رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔

"چند روز ٹھہر جا۔ تب تک گڑبڑ بھی کم ہو جائی گی۔" سردار مراد خاں شاہانی نے کہا۔ "میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔ اکٹھے لہور پہنچیں گے۔ شاہ جی سے ملیں گے۔ مجھے اس سے یہاں کے حالات کے بارے میں مشورہ بھی کرنا ہے۔"

"پر مجھے تو گڑبڑ جلد کم ہوتی نہیں لگتی۔" رحیم داد بولا۔ "یہاں ٹھہر کر میں تیری مدد بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو اب جانے ہی دے۔"

"جیسی تیری مرضی۔ پر جانا ہی ہے تو پرسوں جانا۔"

"پرسوں کیوں؟ آج ہی مجھے جانے دے۔"

"ضد نہ کر۔" سردار مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ "اس بارے میں بستی نظام سے واپسی پر بات کروں گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مراد خاں کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں پھاٹک پر پہنچے۔ سامنے جیپ کھڑی تھی۔ قریب ہی رادھانی بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ تین کارندے بھری ہوئی بندوقیں سنبھالے کھڑے تھے۔

مراد خاں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے سوار ہوتے ہی رادھانی اور مسلح کارندے بھی جیپ میں داخل ہوئے اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مراد خاں اور کاردار رادھانی کے پاس بھی بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ سردار مراد خاں کی کمر سے چمڑے کے ہولسٹر میں پستول بھی لٹک رہا تھا۔

رحیم داد نے مراد خاں کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے بستی نظام کی سمت روانہ ہو گئی۔

☆

دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ سورج درختوں کی چوٹیوں کے اوپر دہک رہا تھا۔ رحیم داد کو اپنے کمرے میں پہنچے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر آہٹ ابھری۔ اس نے نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ نادر خاں کمرے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گرد اور پسینے سے مٹیالا پڑ گیا

تھا۔ وہ تھکن سے نڈھال نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔
"تو کیسے آ گیا نادر؟ خیر خیریت تو ہے؟"
"خیریت ہی ہے جی!" وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔
"بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ بیٹھ جا۔"
نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے زور دے کر دریافت کیا۔ "تو نے بتایا نہیں، کیسے آنا ہوا؟" اس نے نادر خاں کو نظر بھر کر دیکھا۔ "فکر کی تو کوئی گل نہیں؟ تو نے فصل کی واڈھی تو کرا دی ناں؟"

"وہ تو جی کب کی ہو چکی۔" نادر خان نے بتایا۔ "اب تو بٹائی ہونی ہے۔ میں اسی سلسلے میں تیرے پاس آیا ہوں۔"

"اچھا ہوا تو آ گیا۔" رحیم داد بولا۔ "میں واپسی کی سوچ رہا تھا۔ آج ہی سردار سے گل بات ہوئی تھی۔ وہ تو مجھے روک رہا ہے۔"

"پر ادھر تو جی بہت گڑبڑ ہے۔ مزارعوں نے کھلم کھلا سرکشی شروع کر دی ہے۔"
"تجھے کیسے پتہ چلا؟" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ "ادھر آنے پر ہی پتہ چلا ہو گا۔"
"نہیں جی! مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ ایسا ہوا میں ایک روز منٹگمری گیا۔ ایک پرانا یار مل گیا۔ وہ لیہ میں ہوتا ہے۔ اس نے باتوں باتوں میں ادھر کی گڑبڑ کا ذکر کیا۔" نادر خان نے بتایا۔

"اپنی طرف تو سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"
"اپنی طرف کیا ہونا ہے جی!" نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔ "سارے ہی بندے راضی خوشی ہیں۔ فصل کی واڈھی کی بعد سے جشن کا سماں ہے۔ ڈھول بجتا ہے۔ بھنگڑا ڈالا جاتا ہے۔ ٹپے الاپے جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اب تو بٹائی کا انتظار ہے۔ تو پہنچے گا تو وہ بھی شروع ہو جائے گی۔"

"نادر! تو مزارعوں سے پچھلا کرض ادھار بٹائی پر وصول کرنے کو کہتا تھا۔" اس کے لہجے میں تشویش کا عنصر غالب تھا۔ "دیکھ، وصولی میں مزارعوں کے ساتھ زبردستی یا سختی نہ کرنا۔"
"سختی تو جی کچھ نہ کچھ کرنی ہی پڑے گی۔ آسانی سے تو کبھی وصولی نہیں ہوتی۔ اس کے بغیر کیسے کام بنے گا۔"

"نہیں، کوئی سختی کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ وہ کسانوں کی ٹکا ٹیکس تحریک

سے ڈر گیا تھا۔ "بات یہ ہے نادر! میں اپنی زمیں داری میں کوئی گڑبڑ دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"پر چوہدری یہ تو سوچ' آسانی سے ادھار وصول ہو جاتا تو کب کا وصول ہو چکا ہوتا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کی کمزوری سے مزارعوں نے فائدہ اٹھایا اور ادھار کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔" نادر نے وضاحت کی۔ "ویسے ادھر روپے کی ضرورت بھی ہے۔ جیپ کی رقم شاہ جی کو ادا کرنی ہے' اور بھی ضروری خرچے ہیں۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ ادھار وصول نہ کیا جائے۔" رحیم داد نرم پڑ گیا۔ "پر سختی سے بچنے کی کوشش کر۔ سمجھا بجھا کر نرمی سے کام نکال۔ میرا مطلب ہے' ایسا نہ کر کہ کوئی گڑبڑ ہو۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے مزارعوں کا دماغ پہلے ہی خراب کر رکھا ہے۔ انھیں دھیرے دھیرے اپنے راستے پر لانا ہوگا۔ تو سمجھ گیا ناں؟"

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا حکم ہوگا ویسے ہی ہوگا جی!" نادر نے لمحے بھر کے لیے تامل کیا۔ "واپسی کے بارے میں کیا سوچا؟"

"میں نے تجھے بتایا نہیں۔ آج ہی سردار مراد خان سے اس بارے میں میری بات ہوئی تھی۔"

"میں نے تو آج ہی واپس جانا ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "تیرے ساتھ ہی جانا ہے۔ بٹائی کی ساری تیاری ہو چکی ہے۔ میں نے تو اس کے لیے ونڈاوے بھی بلا کر بٹھا رکھے ہیں۔"

"واپسی کے بارے میں تو مراد خان کے آنے ہی پر طے ہوگا۔"

"شام تک واپسی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔" نادر خاں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

رحیم داد نے گردن بڑھا کر دروازے کی جانب دیکھا اور نوکر کو اونچی آواز سے پکارا۔ نوکر فوراً آگیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ادھر ہی ٹھیرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا اور اس کے ٹھیرنے کا بندوبست کر دے۔" نوکر کو ہدایات دینے کے بعد وہ نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "نادر تو اب جا۔ نہا دھو کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل بات ہوگی۔"

نادر خاں کے جانے کے بعد رحیم داد کمرے میں بیٹھا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ دن ڈھلے وہ نہا دھو کر صحن میں گیا۔ نوکروں نے کرسیاں اور مونڈھے ڈال دیے تھے۔ رحیم داد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نادر خاں بھی پہنچ گیا۔ رحیم داد دیر تک اس کے ساتھ اپنی زمین داری کی بارے میں باتیں کرتا رہا۔

اندھیرا پھیلنے پر نادر خاں کھانا کھانے چلا گیا۔ سفر کی تکان ابھی نہیں اتری تھی۔ وہ جلد ہی سو گیا۔

☆

رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ رات گزرتی رہی۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ رحمتے آگئی۔ رحیم داد نے اس کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔

وہ مضمحل اور تھکی تھکی نظر آرہی تھی۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ "جوڑا واپس آگیا ہے۔ وہ صبح سردار کے ساتھ بستی نظام گیا تھا۔"

"اسے تو میں نے بھی سردار کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "پر سردار اب تک نہیں آیا۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب کے ساتھ تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ "جوڑے نے یہ نہیں بتایا سردار ادھر کیا کر رہا ہے؟ بستی نظام میں زیادہ گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔ جوڑا کہتا تھا سردار رات ادھر ہی رہے گا۔ کل لوٹے گا۔ میں تجھے یہی بتانے آئی تھی۔"

"تو پریشان پریشان لگ رہی ہے۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"پچھلے کئی روز سے میری طبیعت گڑبڑ ہے۔" اس کے لہجے میں تردد تھا۔ "میرا یہاں بالکل جی نہیں لگ رہا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "گھبرا نہیں۔ مراد خاں چند ہی دنوں میں دو چار زنانیاں اٹھوا کر ادھر پہنچا دے گا۔ تب تو اکیلی نہیں رہے گی۔ ان کی انچارج بن جائے گی۔ ایسے ہی جیسے شاہ جی کے کوٹ کی انچارج تھی۔"

"میں اب اس دھندے میں پڑنا نہیں چاہتی۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "یہ بھی کوئی زندگی ہے، کنجریوں سے بھی خراب۔"

"ایسی بات تھی تو سردار شاہانی کے ساتھ ادھر آئی کیوں؟ یہ تو تجھے پہلے ہی سوچنا تھا۔"

"غلطی ہو گئی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"تجھے اب تو ادھر ٹھیرنا ہی ہو گا۔ سردار برا منائے گا۔ ایسا خیال دل سے نکال دے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"سردار سے میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔"

"بہت نراض ہوا ہو گا۔"

"نراض تو ہوا تھا، پر زیادہ نہیں۔"

"آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟" رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔

"گھر والے کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"گھر والے کے پاس؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "تو نے تو ایک بار شاہ جی کے کوٹ میں مجھے کہا تھا کہ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں' وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔"

"پچھلے دنوں مجھے پتہ چلا تھا وہ بھاول پور میں ہے۔ پہلے وہ لوہار تھا پر اب لوہار کا دھندا چھوڑ کر غلہ منڈی میں دھڑوائی لگ گیا ہے۔ میرے بچے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔ برسوں سے میں نے انھیں نہیں دیکھا۔" رجمتے کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ "بہت یاد آتے ہیں۔ اب تو اونچے ہو گئے ہوں گے۔ جانے کیسے لگتے ہوں گے۔"

"تو چلی تو جائے گی' پر تیرا گھر والا تجھے اپنے پاس رکھنے پر راضی ہو جائے گا؟" رحیم داد نے اپنے شبے کا اظہار کیا۔ "اسے پتہ ہے تو شاہ جی کے کوٹ میں برسوں رہ چکی ہے۔ نہ بھی پتہ ہو تو شاہ جی کی نشانی تیرے یہ تینوں چھوہرے تو موجود ہی ہیں۔"

"اسے پتہ ہے۔ سب کچھ پتہ ہے۔ پر وہ مجھے اپنے پاس رکھ لے گا۔" رجمتے نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "میں نے تجھے ایک بار بتایا بھی تھا۔ وہ مجھے لینے شاہ جی کے پاس آیا تھا۔ پر شاہ جی نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اس سے ملنے بھی نہیں دیا۔"

"مجھے تو نہیں لگتا اتنی لمبی مدت گزر جانے کے بعد وہ تجھے اپنی گھر والی بنا کر رکھ لے گا۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "وہ مرد ہے۔ مرد کی کچھ غیرت اور آن ہوتی ہے۔"

"غیرت اور آن کی سوچے گا تو زندگی بھر رنڈوا ہی رہے گا۔"

"رنڈوا کیوں رہے گا؟ دوسرا ویاہ نہیں کر سکتا۔ میرا تو وچار ہے اس نے اب تک کسی کڑی سے ویاہ کر بھی لیا ہو گا۔"

"میں نوں پتہ ہے اس نے اب تک ویاہ نہیں کیا۔" رجمتے کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "وہ دوسرا ویاہ کر بھی نہیں سکتا۔ ویاہ کرنا کوئی مخول ہے۔ کوئی کڑی اسے مفت تو نہیں مل جائے گی۔ اس کا پیو پورا پورا مول تول کرے گا۔ بھاری سمھاوا مانگے گا۔"

"کتنا سمھاوا مانگے گا؟"

"پندرہ ہزار سے کم سمھاوا لیے بنا کوئی بھی اپنی بیٹی کا ویاہ نہیں کرے گا۔" رجمتے نے رحیم داد کو بتایا۔ "میرا گھر والا تو اب ادھکڑ ہو گیا ہے۔ سر کے بال بھی کہیں کہیں سے چٹے ہو گئے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں یہی سنا ہے۔ جتنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اتنا ہی زیادہ سمھاوا لیا جاتا ہے۔

بڈھے سے تو کوئی کوئی اپنی بیٹی کا ویاہ کرنے کے لیے ۲۰ ہزار سے بھی زیادہ مانگتے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "میرا گھر والا غریب دھڑوائی ہے۔ غلہ منڈی سے تو اتنی ہی مزدوری ملتی ہو گی کہ مشکل سے اپنا اور اپنے دونوں نکوں کا پیٹ پال سکے۔ وہ ویاہ کرنے کے لیے وہٹی کے پیو کو پندرہ ہزار روپے سمجھاوا کہاں سے دے گا۔"

"یہ سمجھاوا تو بیٹی کو بیچنے کا سیدھا سیدھا بیوپار ہے۔" رحیم داد جل کر بولا۔ "ایویں ہی ریت بنا رکھی ہے۔"

"ایسا تو جی کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے سے جو ریتاں رسماں چلی آ رہی ہیں انھیں کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔"

"مطلب یہ کہ تو اپنے گھر والے کے پاس چلی جائے گی اور وہ تجھے اپنے پاس رکھ بھی لے گا۔" رحیم داد نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"خوشی خوشی رکھ لے گا۔ مجھ سے اسے ہر طرح کی مدد ملے گی۔ میں اس کا بازو بن کر رہوں گی۔"

"تیرے ساتھ تیرے تینوں چھوہروں کو بھی وہ رکھ لے گا؟"

"رکھ ہی لے گا۔" وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ "یہ اس کی روٹی تو نہیں کھائیں گے۔ میں بھی کہیں کام دھندے سے لگ جاؤں گی۔ خود بھی کھاؤں گی، اپنے بچوں کو بھی کھلاؤں گی۔"

"ایسا کر بچوں کو شاہ جی کے پاس پہنچا دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر رحمتے کو چھیڑا۔

"چوہدری تو کیسی گلاں کر رہا ہے۔" وہ تنک کر بولی۔ "وہ کبھی ان کو نہیں رکھے گا۔ اس نے کبھی ان کو اپنا نہیں سمجھا۔ ان کی طرح اور جانے کتنے چھوہرے چھوہریاں ہیں۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "تو شاہ جی کی گل چھوڑ۔ یہ بتا، تجھے کب یہاں سے جانا ہے؟"

"میں تو کل چلا جاؤں گا۔ میرا منیجر نادر خاں آیا ہوا ہے۔ ادھر بٹائی شروع ہونے والی ہے۔ پر میرے واپس جانے سے تجھے کیا لینا؟"

"میں بھی تیرے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ تو نے مظفر گڑھ ہی کے رستے سے لوٹنا ہے ناں؟"

"ہاں، اسی رستے سے جاؤں گا جس سے آیا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔ مجھے ملتان کے ٹیشن پر چھوڑ دینا۔ میں وہاں سے بھاول پور چلی جاؤں گی، تو اپنے پنڈ چلا جانا۔ ٹھیک رہے گا ناں؟"

"ٹھیک تو رہے گا۔ پر سردار سے پوچھ لے۔"

"اس کی فکر نہ کر۔" رحمتے بولی۔ "کل وہ آئے گا تو میں اس سے ایک بار نفسیات کر لوں گی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر رحمتے زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ "تو یہ طے رہا میں کل تیرے ساتھ ہی چلوں گی۔" اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کو خاص ادا سے دیکھا۔ "ادھر میں بالکل اکیلی ہوں۔ سردار تو صبح سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ آج میں ادھر ہی ٹھیر جاتی ہوں۔" اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔

مگر رحیم داد کا دماغ منتشر تھا۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ "نہیں 'اب تو جا کر اپنے بچوں کو دیکھ۔ تجھے کل صبح چلنا ہے تو تیاری بھی کرنی ہو گی۔"

رحمتے کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ رخسار کا سیاہ مسا بھونرے کی مانند بد نما نظر آنے لگا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ اندھیرے میں گم ہو گئی۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اٹھا اور سونے کے لیے اپنے بستر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ کوئلہ ہر کشن واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے سردار مراد خاں کا انتظار تھا۔

مراد خاں شاہانی رات کے پچھلے پہر واپس آگیا' مگر سویرے سویرے چلا بھی گیا۔ رحیم داد کو یہ اطلاع ملی تو وہ سخت حیرت زدہ ہوا۔ کسی نوکر کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ کاردار کریم بخش رادھانی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ موجود ہوتا تو مراد خاں کے بارے میں صحیح اطلاع دیتا۔

رحیم داد حیران و پریشان اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر خاں بھی موجود تھا لیکن اس نے نادر خاں سے دیر تک بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے سے چلا گیا۔ یہ موسم گرما کی ایک ویران صبح تھی۔ حویلی کے وسیع احاطے میں سناٹا تھا۔ سورج گھنے درختوں کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ دم بہ دم گرم ہوتی ہوئی چمکیلی دھوپ پھیلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ فضا میں تمازت گھلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ پھاٹک پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر اسے سخت تعجب ہوا کہ سردار مراد خان شاہانی کی جیپ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہے۔ ڈرائیور نزدیک ہی فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد پھاٹک سے گزر کر اس کے پاس پہنچا۔ ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھا اور نظریں جھکا کر ادب سے بولا۔ "سیں خیر اے! خوش ہو' راضی ہو۔ خیر سلا اے۔ چو کھڑے ہو۔ تکڑے ہو۔"

رحیم داد نے اسے مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "یہ بتا' سردار کدھر ہے' کب آیا اور کہاں گیا ہے؟"

اس نے تابڑتوڑ کئی سوالات کر ڈالے۔

"سیں! وہ پچھلی رات دیر سے لوٹا تھا۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "سویلے سویلے سردار حکم خاں ڈھانڈلہ ادھر آیا۔ وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ آگے کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد آگے نہیں گیا۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ ناشتے کے لیے دالان میں داخل ہوا تھا کہ رحمتے ایک کمرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس نے نہا دھو کر اجلا لباس پہنا تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اس سے بھی مراد خاں کے بارے میں استفسار کیا۔ "رحمتے! تجھے پتہ ہے، سردار واپس آ گیا ہے۔ پر اب وہ کدھر گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں وہ کب تک لوٹے گا۔" وہ تیکھے انداز میں بولی۔ "پر وہ رات ہی کو آ گیا تھا اور صبح بہت تڑکے کہیں چلا بھی گیا۔"

"اس کے ساتھ تیری گل بات ہوئی تھی؟"

"اس نے مجھے رات ہی کو بلوا لیا تھا۔" رحمتے نے نظریں جھکا کر شرمانے کی کوشش کی۔ "بات کی تو تھی۔" اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ "پر وہ راضی نہیں ہوا۔ کہتا تھا، میں نے تجھے نہیں چھوڑنا۔ تو میرے ساتھ ہی رہے گی۔"

"پر تو نے آگے کے لیے کیا سوچا؟"

"میں نے جی کیا سوچنا۔" رحمتے نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بات یہ ہے چوہدری" وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگی۔ "جب وہ اتنے پیار سے روکے تو میں اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ وہ نراض ہو جائے گا ناں۔"

رحیم داد کچھ نہیں بولا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ رحمتے میں اسے سلمیٰ کی جھلک نظر آئی اور اس کا انجام بھی یاد آیا۔ مگر اس نے اپنے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

رحمتے نے رحیم داد کو گم صم پایا تو آہستہ سے بولی۔ "مجھے اب جانا ہے۔ کئی کام کرنے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ پلٹی اور آگے بڑھ گئی۔

رحیم داد مراد خاں شاہانی کی واپسی کا منتظر تھا۔ مراد خاں دوپہر کو واپس آیا۔ کھانا اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی کھایا۔

رحیم داد بستی نظام کی صورت حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے مراد خاں سے پہلا سوال اسی سلسلے میں کیا۔ "سردار! بستی نظام میں مزارعوں کی گڑبڑ کا کیا حال ہے؟"

"ادھر تو اب ٹھیک ٹھاک ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "جتنے مزارعوں اور کاموں پر گڑبڑ کرنے

کر شبہ تھا' رات کو گھروں پر چھاپے مار کر سب کو اٹھا لیا گیا۔ ملا احمد بخش بھی ادھر ہی تھا۔ پر وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ رات کے اندھیرے میں نکل گیا۔ پر کب تک گرفتاری سے بچے گا۔ جلد ہی پکڑا جائے گا۔ میں نے تجھے یہ نہیں بتایا' بھکر سے ایک تھانے دار بھی پولیس پارٹی کے ساتھ پہنچ گیا ہے۔"

"یہ تو نے چنگی خبر سنائی۔" رحیم داد بے ساختہ بولا۔ "پر تو صبح حکم خاں ڈھانڈلہ کے ساتھ کہاں گیا تھا؟"

"بستی نظام میں تو گڑ بڑ گرفتاریوں کے بعد ختم ہو گئی۔ پر شریفاں والی میں بڑھتی ہوئی لگتی ہے۔ ادھر حکم خاں ڈھانڈلہ کی زمین داری ہے۔ وہ اسی کے بارے میں گل بات کرنے مجھے اپنی حویلی لے گیا تھا۔ ڈھانڈلوں کے علاوہ نوانی اور شاہانی زمیں دار بھی ادھر موجود تھے۔ میں اب تک ان کی ساتھ ہی تھا۔ مزارعوں کی گڑ بڑ ہی کے بارے میں بات ہوتی رہی۔"

رحیم داد حرف مطلب پر آگیا۔ "سردار! میں اب تیرے پاس نہیں ٹھہر سکوں گا۔ میرا منیجر نادر خاں مجھے لینے آیا ہے۔"

"کب آیا وہ؟" مراد خاں نے حیرت سے پوچھا۔ "فکر کی کوئی گالہ تو نہیں؟"

"نہیں' فکر کی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "فصل کی بٹائی ہونی ہے۔ اس کے لیے میرا ادھر موجود ہونا ضروری ہے۔"

"کب تک تیرا جانے کا ارادہ ہے؟"

"روٹی کھانے کے بعد ہی چلا جاؤں گا۔" رحیم داد نے اسے مطلع کیا۔

"جیسی تیری مرضی۔" مراد خاں نے اسے روکنے پر اصرار نہیں کیا۔

"میری جیپ تجھے بھکر پہنچا دے گی۔ وہاں سے ٹرین پکڑ لینا۔"

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے نادر خاں کو بلوایا' جیپ میں اپنا سامان رکھوایا اور کمرے سے باہر نکلا۔ سردار مراد خاں شاہانی اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے رحیم داد کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور رخصت کیا۔ رحیم داد اور نادر خاں جیپ میں بیٹھ گئے۔ شاہانی کا ایک مسلح کارندہ بھی جیپ میں موجود تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بندوق سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔

☆

جیپ کچے راستوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں کے گلی کوچوں سے گزری۔ کھیتوں

اور بستیوں کے درمیان سے آگے' اور آگے بڑھتی گئی۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جگہ جگہ کسانوں کی ٹولیاں جمع ہیں۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ جیپ دیکھ کر وہ زور زور سے نعرے لگاتے۔

سر ڈیون' جان ڈیون
ٹکا ٹکس نہ ڈیون!

ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ گلے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ چہرے درشت تھے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ رحیم داد دھڑکتے دل سے ان کے بپھرے ہوئے تیور دیکھتا رہا اور نعروں کی گھن گرج سنتا رہا۔

جیپ آگے بڑھتی گئی۔ ایک بستی سے گزری تو مردوں' عورتوں اور بچوں کے ایک ہجوم نے اسے روک لیا۔ ڈرائیور جہاندیدہ اور معاملہ فہم آدمی تھا۔ اس نے بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ ہجوم کو ہر طرف سے یلغار کرتے دیکھ کر اوسان بجا رکھے۔ بپھرے ہوئے لوگوں کو روند کر تیزی سے آگے نکل جانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ رفتار ست کر دی اور کارندے سے بندوق لے کر سیٹ کے نیچے اس طرح ڈال دی کہ نظر نہ آئے۔ اس نے بریک لگائے۔ جیپ ٹھہر گئی۔ ہجوم اس کے چاروں طرف اکٹھا ہو کر زور زور سے نعرے لگانے لگا۔ ایک پتھر بھی جیپ کے مڈگارڈ پر آ کر لگا۔ رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسانوں کی نفرت اور سرکشی بیٹ کے علاقے میں اس قدر شدت اختیار کر چکی ہے۔

مظاہرین اسے کسی سردار یا بڑے زمیں دار کی جیپ سمجھ کر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے غضب ناک چہروں اور اوپر اٹھے ہوئے ہاتھوں سے غم و غصہ عیاں تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جیپ کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دیں گے۔ اس نازک مرحلے پر ایک بار پھر ڈرائیور نے اپنے حواس بحال رکھے۔ مصلحت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن باہر نکالی۔ ایک نوجوان ہجوم کے آگے آگے تھا۔ ڈرائیور نے اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"سیں! ہم تو تیرے مہمان ہیں۔ رات منٹگمری سے آئے تھے۔ اب واپس جاتے ہیں۔ ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ ہمیں اپنے گھر جانے دے۔ رب راضی ہو۔"

ہجوم میں سے کئی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ "اگر تساں پردیسی ہو۔ ادھر کے زمیں دار بھی نہیں' تب ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ لگاؤ ہمارے ساتھ نعرہ۔" ہجوم سے نعرے بلند ہوئے۔

سر ڈیون' جان ڈیون

ڈرائیور نے ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر نعرہ لگایا۔ رحیم داد' نادر خاں اور مراد خاں کے کارندے نے بھی نعرہ لگایا۔ بچوں اور جوانوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ان کے چہروں کی درشتی مٹنے لگی۔ آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ ہونٹوں پر تبسم ہویدا ہوا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ ڈرائیور نے مسکرا کر اونچی آواز سے کہا۔

"فی امان اللہ۔ بالیں بچیں' یاریں دوستیں سب کو خیر سلا ڈیوا ہے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا۔ بکھرے ہوئے ہجوم سے بھی ہاتھ بلند ہوئے اور لہرانے لگے۔ راستہ صاف ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر دبایا۔ جیپ رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ہجوم جیپ کے پہیوں سے اٹھتے ہوئے گرد کے بادلوں میں اوجھل ہو گیا۔

جیپ راستوں کے پیچ و خم سے گزرتی' ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر آگئی۔ راہ میں اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ مگر رحیم داد سہما ہوا بیٹھا رہا۔ بھکر اسٹیشن پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

ٹرین کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ٹرین اسٹیشن پر آکر ٹھہری۔ نادر خاں نے سامان رکھوایا۔ دونوں سوار ہوئے اور مظفر گڑھ کے راستے منٹگمری کے لیے روانہ ہو گئے۔

۳۷

دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ دن ڈھلتے ہی کہر کا دھندلکا کوٹلہ ہر کشن پر پھیلنا شروع ہو جاتا۔ سورج غروب ہونے پر دھند اور گہری ہو جاتی۔ سرما کی ایک ایسی ہی سرد اور کہر آلود شام تھی۔ رحیم داد اپنے مینیجر نادر خاں کے ساتھ کمرے میں بیٹھا گندم کی فصل کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا جس کی بوائی ہو چکی تھی۔ اب کھیتوں میں گندم کے نرم و نازک پودے ہوا کے جھونکوں سے لہراتے تھے۔ ان کی ہریالی آنکھوں کو فرحت اور تازگی بخشتی تھی۔

رحیم داد سہ پہر کو پیراں والہ سے لوٹا تھا۔ وہ احسان شاہ سے ملنے گیا تھا۔ احسان شاہ سے اس کی ملاقات بھی ہوئی مگر یہ ملاقات ادھوری رہی۔ کھل کر بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ میاں سبحان پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ احسان شاہ اس کے ساتھ گفتگو میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ رحیم داد پر پوری توجہ نہ دے سکا۔ دونوں ملکی سیاست کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور رحیم داد سیاسی اتار چڑھاؤ سے نابلد اور بے خبر تھا۔ لہٰذا وہ خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا اس نے احسان شاہ اور میاں سبحان کے ساتھ کھایا۔ لیکن کھانے سے فارغ ہونے کے بعد احسان شاہ زیادہ دیر اپنی حویلی میں نہ ٹھہرا۔ میاں سبحان کے ہم راہ لاہور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد بھی پیراں والہ میں نہ رکا۔ کوٹلہ ہر کشن واپس آگیا۔

کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگاروں کی لال لال روشنی میں رحیم داد اور نادر خاں کے چہرے دمک رہے تھے۔ نادر خاں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری، اپنی ایک تجویز ہے۔ کئی روز سے اس کے بارے میں بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔“

"ضرور بات کر۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "پر اس سے پہلے بوتل اور گلاس منگوا۔ تھکا ہوا ہوں۔ سردی بھی آج زیادہ ہی ہے۔ طبیعت ذرا گرم ہو تو آرام سے گل بات ہوگی۔"

نادر خاں نے کسی ملازم کو طلب نہیں کیا' خود اٹھ کر باہر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔ وہسکی کی بوتل کمرے ہی میں موجود تھی۔ نادر نے رحیم داد کی ہدایت پر لوہے کی الماری کھولی۔ اندر سے بوتل نکالی اور میز پر رکھ دی۔ میز پر گلاس اور جگ پہلے سے رکھے تھے۔

نادر خاں نے ادب سے پوچھا۔ "اور کوئی حکم جی؟"

رحیم داد نے بوتل کھولی۔ پیگ بنا کر بڑا گھونٹ بھرا۔ مونچھوں کے بھیگے ہوئے بال ہاتھ سے صاف کیے۔ "اب بول' تجھے کیا کہنا ہے؟"

"کہنا کیا ہے جی' یہ تو چوہدری تجھے پتہ ہی ہے' اپنے پاس بہت سی پڑیلی زمین ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اس غیر مزروعہ زمین کے کچھ حصے پر جھنگر ہے۔ کہیں کھنڈل ہے کہیں کھڑ دڑ۔ پر ہے گھسو۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "ایسی زمین کو میرا بھی کہتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ آگے بتا۔"

"تب تو تجھے یہ بھی پتہ ہو گا۔ ایسی زمین کار آمد اور زرخیز ہوتی ہے۔ اس پر آسانی سے ہل چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی زمین میں ریت کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ کنک اور کپاس کی فصلوں کے لیے ٹھیک رہتی ہے۔"

"مجھے یاد ہے' تو نے پڑیلی زمین پر کھیتی واڑی کرنے کی گل جمیلہ کے سامنے بھی کی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تو نیا نیا مینیجر لگا تھا۔ بعد میں تو نے اس کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر نادر خاں کو دیکھا۔ "تب تو بہت وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔"

"میں نے تو جی جمیلہ سے اس بارے میں کئی بار کہا۔" نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ "پر اس پر تو جی سکول اور ڈسپنسری بنانے کی دھن سوار تھی۔ اس طرف اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔ بغیر روپیہ لگائے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس پر کچھ خرچ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔"

"اب تجھے کیا کہنا ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"میں نے یہ بتانا ہے جی۔ جن دنوں تو بھکر میں سردار مراد خاں کے پاس ہوتا تھا' میں نے مزارعوں اور کمیوں کو ویگار پر لگا کر جھنگر صاف کرا دیا تھا۔ پر پچھلی برسات میں فیر گھاس اور جنگلی بوٹے اگ آئے۔ ان کو تو آسانی سے صاف کرایا جا سکتا ہے۔ پر اب اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا

ہی پڑے گا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کتنی زمین ہوگی؟"

"چھ مربعے سے اوپر ہی ہوگی۔"

"یہ تو بہت ہوئی۔" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ہاں جی' کافی زمین ہے۔ اسے کابل کاشت بنا لیا جائے تو اپنی زمیں داری آٹھ سو ایکڑ کے لگ بھگ ہو جائے گی۔" نادر خاں نے کارگزاری دکھانے کی کوشش کی۔ "ابھی تو جی میں زمیں داری اور بڑھاؤں گا۔ بات یہ ہے جی' جب تک جمیلہ ادھر تھی' زمیں داری پر لگانے کے لیے اپنی پاس روپیہ ہی کہاں تھا۔ پہلی بار دو فصلوں کی آمدنی اپنے ہاتھ میں آئی ہے۔ اب تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں کنک اور کپاس کی فصلوں کی بجائے پڑیلی پر آم اور مالٹے کے باغ لگا۔" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "اس بارے میں تیرا کیا وچار ہے؟"

"آم اور مالٹے کے باغ بھی ٹھیک رہیں گے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مشکلات کا بھی کھل کر اظہار کیا۔ "پر باغ لگانے سے پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ ربیع اور خریف کی فصلوں کا جو مالیہ اور آبیانہ دیا جاتا ہے باغات کے لئے حسب ضابطہ زیادہ شرح سے دینا ہوگا اور اگلے برس ہی سے دینا ہوگا۔"

"لیکن باغوں سے آمدنی بھی تو فصلوں سے زیادہ ہوگی۔"

"چار برس سے پہلے آمدنی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "مطلب میرے کہنے کا یہ ہے' اس سے پہلے درختوں میں پھل نہیں آتے۔ آمدنی تو پھلوں ہی سے ہوگی ناں۔"

"پر چار برس بعد تو ہر برس پابندی سے آمدنی ہوگی۔" رحیم داد ہنوز باغ لگانے پر مصر تھا۔ اس کے ذہن پر بیٹ کے مزارعوں کی شورش کا خوف غالب تھا۔ اور اس نے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دیا۔ "کھیتی واڑی پر خرچ بھی زیادہ آئے گا۔ ساتھ ہی مزارعوں کا بھی چکر چلے گا۔ باغات کے معاملے میں ایسا کوئی بکھیڑا نہیں ہوگا۔"

"باغ ہی لگانا ٹھیک رہے گا۔" نادر خاں نے مزید الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

"باغ تو لگائے جا سکتے ہیں۔" رحیم داد کچھ دیر خاموش رہا' پھر نشے کی جھونک میں اچانک کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر تو نے یہ بھی سوچا' پانی کہاں سے ملے گا؟"

"میں نے جی اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔"

"کیا سوچ رکھا ہے تو نے؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

"میں نے جی محکمہ نہر کے ایک اوورسیئر سے بات کی تھی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "چوہدری' تجھے پتہ ہے' ہمیں تو راجباہ شرکی سے پانی ملتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے چار موگھے ہیں۔"

"ان چار موگھوں سے تو اپنی فصلوں کو بھی پوری طرح پانی نہیں ملتا۔"

"پہلے میری پوری گل سن لے۔" نادر خاں نے فوراً وضاحت کی۔ "ایک موگھا ہمیں اور مل جائے تو کام بالکل ٹھیک بن جائے گا۔ بہت شان دار باغ لگ سکتے ہیں۔"

"سوچا تو بہت ٹھیک ہے تو نے۔" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر اوورسیئر نیا موگھا کھولنے کے لیے تیار ہو جائے گا؟ یہ سوچ لے' کام آسان نہیں ہے۔"

"کام بن تو جانا چاہیے جی۔ پر اس کی مٹھی گرم کرنی ہو گی۔ میں ایسا کرتا ہوں' اوورسیئر کو کل شام ادھر بلوا لوں گا۔ اسے بھی پینے پلانے کا چسکا ہے" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اس کے ساتھ تیری چنگی شام گزرے گی۔ معاملے کی بات بھی ہو جائے گی۔"

"تو بھی موجود رہنا۔" رحیم داد بولا۔ "کتنے میں وہ تیار ہو جائے گا؟"

"میرا خیال ہے' دو ہزار میں اوورسیئر اپنا کام کر دے گا۔"

"کل نہیں' تو اسے پرسوں بلا۔"

"پرسوں ہی بلا لوں گا۔" نادر خاں نے جواب دیا اور پہلو بدل کے بولا۔ "میں نے جی اب جا کر روٹی کھانی ہے۔"

"کیا جنت واپس آ گئی؟"

"ہاں جی۔" نادر خاں کھڑا ہو گیا۔ "وہ دوپہر کو آ گئی تھی۔"

"پر وہ گھر میں گھسی کیوں بیٹھی ہے' ادھر نہیں آئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"وہ ایسا ہے جی۔" نادر خاں نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "جنت کے بال بچہ ہونے والا ہے۔ ایسے میں تیرے سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

نادر خاں چلا گیا۔

رحیم داد کمرے میں اکیلا بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ رات تاریک اور زیادہ سرد ہو گئی۔ رحیم داد نے گلاس خالی کیا۔ نوکر کو بلایا اور کھانا لانے کے لیے کہا۔

نوکر نے گلاس، جگ اور بوتل اٹھا کر میز صاف کی، کھانا لگایا اور دہلیز کے پاس نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد اونچا اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ جوان تھا مگر اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں سے کچھ ایسی ویرانی جھلکتی تھی کہ رحیم داد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں نے تجھے پہلی بار ادھر دیکھا ہے۔ لگتا ہے تو نیا نیا لگا ہے؟"

"میں جی پچھلے ہی مہینے ادھر لگا ہوں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"رب نواز ہے جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تیرا ویاہ ہو گیا؟" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"ویاہ تو ہو گیا ہے جی!" رب نواز سر جھکا کے بولا۔ "پر گھر والی ادھر کیمر میں ہے۔ کیمر میرا پنڈ ہے۔ نور شاہ کے پاس ہی ہے۔ میں مزارع ہوتا تھا جی، پر زمیں دار نے ناراض ہو کر بے دخل کر دیا۔ یہ پچھلے برس کی گل ہے۔"

رحیم داد کھانا کھاتا رہا۔ رب نواز دہلیز کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ "تو جانگلی ہے؟"

"ہاں جی۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اعتراف کیا۔

"تیری گھر والی تو ادھر اکیلی ہی ہے ناں؟ تو اسے بھی ادھر بلا لے۔" رحیم داد نے کہا۔ "حویلی میں لگ جائے گی۔"

"بلا لوں گا جی، بالکل بلا لوں گا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

رحیم داد کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ رب نواز برتن اٹھا کر چلا گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

☆

دن ڈوبتے ہی رحیم داد کے پاس نادر خاں آیا۔ اس کے ہم راہ محکمہ نہر کا اوورسیئر بھی تھا۔ اس کا نام اسلم تھا۔ قد میانہ تھا مگر جسم پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ رحیم داد اس وقت مہمان خانے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ اسلم کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اسلم پہنچا تو وسکی کی نئی بوتل کھلی۔ اسلم نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ نادر خاں خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد اور اسلم نے دو دو پیگ لگائے اور ہنس ہنس کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

نادر خاں نے اوورسیئر کو سرخوشی کے عالم میں پایا تو فوراً حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ "اسلم

صاحب! اپنے کام کے بارے میں کیا سوچا؟"

"یاد تو پڑتا ہے تو نے نیا موگھا کھولنے کی گل کی تھی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کب تک ہو جائے گا یہ کام!" اس دفعہ رحیم داد نے پوچھا۔ "پانی ملے تو اپنے مالٹے اور آم کے باغوں کا کام شروع ہو۔"

"نیا موگھا کھولنا تو بہت مشکل ہے۔" اسلم جھٹ سنجیدہ ہو گیا۔

"کوئی مشکل نہیں۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "تو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"ایسی گل نہیں۔" اسلم اور سنجیدہ ہو گیا۔ "چوہدری، تجھے یہ تو پتہ ہی ہے۔ آگے چھوٹی چھوٹی زمینوں والے حصے دار ہیں۔ کسی کے پاس ۲۵ کلا سے زیادہ زمین نہیں۔ سچ پوچھ تو کم زمین رکھنے والے بہت زیادہ ہیں۔ وہ پہلے ہی پانی کی کمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔"

"اپنے چار موگھے ہیں۔ ایک اور بڑھ جائے گا تو کیا فرک پڑے گا۔" نادر خاں نے مسکرا کر کہا۔

"بہت فرک پڑے گا۔" اسلم نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "گندم کی فصل کے لیے آج کل ویسے ہی پانی کی بہت مانگ ہے۔ پانی نہ ملا تو آگے کے چھوٹے زمیں دار تباہ ہو جائیں گے۔ تو نے یہ نہیں سوچا۔"

"کوئی تباہ شباہ نہیں ہونے کا۔" رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں ان کی زمینیں خرید لوں گا۔ اپنا مزارع لگا لوں گا۔ زیادہ ہی مزے میں رہیں گے۔ اسلم، تو ان کی فکر نہ کر۔"

"چوہدری تجھے یہ تو پتہ ہے، کسان کو اپنی زمین سے کتنا پیار ہوتا ہے۔" اسلم نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ایسے آسانی سے وہ اپنی زمینیں چھوڑنے والے نہیں۔ کئی تو ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی زیر کاشت زمین بڑھانا چاہتے ہیں مگر پانی کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ روز ہی اس بارے میں میرے پاس آتے رہتے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا کام نہیں بنے گا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کام بنے گا، اور ضرور بنے گا۔" نادر خاں نے مداخلت کی۔ "اب تو اسلم صاحب سے تیری یاری ہو گئی۔ تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ نیا موگھا ضرور کھلے گا۔" اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق جیب سے ہزار روپے نکال کر اوور سیئر کے سامنے رکھ دیے۔ "یہ نذرانہ رکھ لے۔ کوئی اور خدمت اپنے لیے ہو تو بتا۔"

اوور سیئر بے رخی سے بولا۔ "یہ اپنے ہی پاس رکھ۔"

"نادر' پانچ سو اور نکال۔ اسے پوری طرح خوش کردے۔" رحیم داد جھوم کر بولا اور مڑ کے اسلم کی جانب متوجہ ہوا۔ "دیکھ' اب انکار نہ کرنا۔ گلاس اٹھا' اسے خالی کر۔ تو نے ابھی کچھ نہیں لگائی۔"

"چوہدری مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔" اسلم نے سنجیدگی سے کہا۔ "تجھے پتہ ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھی انجینئر اور ایس ڈی او بیٹھے ہیں۔ بات ان تک پہنچے گی۔ اسی لیے اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ لگتا ہے۔ مجھے ان سب کو ماہانہ بھتا دینا پڑتا ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "پانی کم ملا تو آگے کے حصے دار اوپر عرضیاں لگائیں گے۔ شکایتیں کریں گے۔ وہ چپ کر کے تو نہیں بیٹھ جائیں گے۔"

رحیم داد نے نادر خاں کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "نادر پورے دو ہزار کردے۔" وہ اسلم سے مخاطب ہوا۔ "اسلم! اب میں انکار نہیں سنوں گا۔ موگھا تو اب کھولنا ہی ہو گا۔"

اسلم خاموش رہا۔ نادر نے پانچ سو روپے اور ملا دیے۔ رحیم داد نے پورے دو ہزار روپے اٹھا کر اسلم کی قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ وہ پھر بھی خاموش رہا رحیم داد نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا اور ہنس کر بولا۔

"یار اسے بھی ختم کر اور اپنے لیے خود بنا۔ وڈا بنا۔"

اسلم نے گلاس ہونٹوں سے لگا کے چڑھا لیا۔ وہ بڑا دھاکڑ پینے والا تھا۔ دونوں دیر تک پیتے رہے نادر خاں اٹھ کر جا چکا تھا۔ اسلم نشے سے لہرا کر بولا۔ "چوہدری' تو اپنا یار ہے' جگر ہے۔" اس نے رحیم داد کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

رحیم داد نے گھونٹ بھر کر کہا۔ "اب تو یاری پکی ہو گئی۔ کام بھی اپنا پکا ہونا چاہیے۔"

"فکر نہ کر چوہدری۔ تیرا کام ضرور ہو گا اور بالکل پکا ہو گا۔ میں بیل دار لگا کر کل ہی تیرے لیے نیا موگھا کھلوا دوں گا۔ ایک سے کام نہ چلے تو دوسرا بھی کھلوا لینا۔ جب تک اسلم ادھر اوور سیر لگا ہے' تیری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد نے خوشی سے جھک کر اس کا منہ چوم لیا۔ "کیا بات ہے تیری اسلم! یار ہو تو ایسا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ابھی تو ایک ہی موگھا کھول دے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔"

"جیسی تیری مرضی' میں نے تو کچھ نہیں کہنا۔"

"موگھا تو کھل ہی جائے گا۔" رحیم داد نے اسلم سے کہا۔ "پر ایسا نہ کرنا کہ ادھر کا رستہ ہی بھول جائے۔ جب بھی شام کو فرصت ملے' ادھر آجایا کر۔ میں اکیلا ہی ہوتا ہوں' تیرے ساتھ

پرلطف شام گزرے گی۔ جیپ تو موجود ہی ہے۔ ڈرائیور تجھے چھوڑ دے گا۔ تجھے لینے بھی جا سکتا ہے۔"

"اس کی فکر نہ کر۔ میرے پاس سرکاری جیپ رہتی ہے۔ ویسے ادھر آنے کے لیے تانگا بھی مل جاتا ہے۔" اسلم نے خمار آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو اتنے پیار سے بلائے گا تو کیوں نہیں آؤں گا۔ ویسے ایک بات سن لے، دیسی یا کوئی دوسری اپنے سے نہیں چلتی۔ کسی زمانے میں ساوی کا رسیا تھا۔ پر اب وہ بالکل منہ کو نہیں لگتی۔"

رحیم داد نے گردن اونچی کی اور ہنس کر بولا۔ "میں احسان شاہ کے ساتھ بیٹھ کر پینے والا ہوں۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا، وہ کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ میں بھی صرف اسکاچ وسکی لگاتا ہوں۔ تو اطمینان رکھ۔" دونوں نے گلاس خالی کر دیے۔

نوکر نے خالی گلاس اور بوتل اٹھا کر کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی اسلم واپس جانے کی لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو یقین دلایا۔ "چوہدری، جب تو کہے گا، موگھا کھول دیا جائے گا۔ تو کہہ تو کل ہی کھلوا دوں؟"

رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی نہیں۔ آرام سے کام ہونا چاہیے۔ نادر جب کہے گا تب کھول دینا۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر خاں کو بلوایا۔ اسلم سے رخصت ہوا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔

نادر خاں نے اسلم کو سنبھالا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے، آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ زبان سے پوری بات ادا نہیں ہو رہی تھی۔ نادر اسے مہمان خانے کے دروازے تک لے گیا۔ باہر کھڑی ہوئی جیپ میں اسلم بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ جیپ آگے بڑھی اور کچے راستے پر دوڑنے لگی۔

صبح ناشتے کے بعد رحیم داد نے نادر خاں کے ہم راہ غیر مزروعہ اور بڑیلی زمین کا معائنہ کیا، مزارعوں اور کمیوں کو بیگار پر لگایا اور زمین قابل کاشت بنانے کا کام شروع کر دیا۔ جھاڑیاں صاف کی گئیں، جنگلی پودے نکالے گئے۔ زمین کو ہل چلا کر ہموار کیا گیا، وٹ بندی کی گئی۔ پودے سیراب کرنے کے لیے نالیاں بنائی گئیں۔

☆

اسلم اکثر شام کو آجاتا۔ رات گئے تک پینے پلانے کا سلسلہ چلتا۔ اور عام طور پر آدھی رات

سے پہلے پہلے وہ رحیم داد کی جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔ سنیچر کی شام کو وہ ضرور آتا۔ کبھی کبھار رات بہت زیادہ ہو جاتی تو مہمان خانے ہی میں ٹھہر جاتا۔ رحیم داد اور اسلم کے تعلقات روز بروز گہرے اور خوش گوار ہوتے گئے۔ بیگانگی اور اجنبیت دور ہوتی گئی، بے تکلفی بڑھتی گئی۔

زمین قابلِ کاشت ہو گئی تو رحیم داد نے اسلم کو مطلع کیا۔ چند ہی روز بعد اوورسیر اسلم کی ہدایت پر بیل داروں نے راجباہ شرقی میں نیا موگھا کھول دیا۔ موگھے کا پانی نالیوں میں دوڑنے لگا۔ زمین نرم اور پولی ہو گئی۔ رحیم داد نے ملتان اور لائل پور کے زرعی فارموں سے آم اور مالٹے کے عمدہ پودے منگوائے۔ آٹھ ہوشیار اور تجربہ کار مالی ملازم رکھے۔ انھوں نے بیس بیس فٹ کے فاصلے پر زمین کھود کر پودے لگا دیے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں باغ لگانے کا کام مکمل ہو گیا۔ یہ پھاگن کے دن تھے۔ درختوں اور پودوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی تھیں۔ شگوفے کھلتے تھے۔ آم اور مالٹے کے پودوں میں بھی جلد ہی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

اسلم نے دو ہزار روپے لے کر اپنا کام کر دیا تھا۔ نادر خاں کے مشورے سے رحیم داد نے نہر میں جہاں نشان لگوایا، اسلم نے وہیں موگھا کھلوا دیا۔ مگر اس نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ موگھا کھلنے کے بعد نہر سے نکلنے والے سوئے میں پانی کی سطح گر گئی۔ اس سوئے سے نشیبی علاقے کے چھوٹے حصے داروں اور زمین داروں کو آب پاشی کے لیے پانی ملتا تھا۔ ربیع کی فصل ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جب گندم کے پودے گوبھ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت پودوں کا بالائی سرا پھول کر موٹا ہو جاتا ہے اور سٹوں کے پھوٹ کر باہر نکلنے میں لگ بھگ پندرہ روز کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ گوبھ کی حالت پودوں کے لیے اس قدر نازک ہوتی ہے کہ اگر اس مرحلے پر فصل کو پانی لگانے میں تاخیر یا غفلت ہو جائے تو پیداوار میں ۵۰ فیصد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گندم کے پودوں کے لئے پانی کی سخت ضرورت تھی۔

کھیتوں کو پانی ملنے میں کمی ہوئی تو حصے داروں کو پریشانی اور تشویش لاحق ہوئی۔ ابتدا میں تو پانی کی کمی کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ چھوٹے حصے داروں نے ایک دوسرے کو شک سے دیکھا۔ آڈ اور پانی کی نکاسی کی نالیوں کے نکوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ جانچ پڑتال اور روک ٹوک شروع ہوئی۔ پانی کی تقسیم پر آپس میں جھگڑے اور فساد ہوئے۔ مارپیٹ اور سر پھٹول ہوئی۔

دوسری طرف مالیوں نے رحیم داد سے آم اور مالٹے کے باغات کے لیے پانی کی کمی کا گلہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ موگھے کا منہ کچھ بڑا کر دیا جائے تاکہ پانی ضرورت کے مطابق مل سکے۔ مگر نادر خاں نے تجویز پیش کی کہ موگھا بڑا کرانے کے بجائے نیا موگھا کھلوایا جائے۔ رحیم داد نے نادر خاں کی

تجویز مان بھی لی۔

شام کو اسلم آیا۔ تین پیگ کے بعد اس پر سرخوشی طاری ہوئی تو رحیم داد حرف مطلب زبان پر لایا اور بے تکلفی سے بولا۔ "یار اسلم! تیری بادشاہت میں اپنا کام پورا نہیں بنا۔ یہ یاری تو نہ ہوئی۔"

"چوہدری تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "تو نے ایک موگھا کھلوایا ہے۔ اس سے کام نہیں بن رہا۔ میرے باغوں کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ تو ادھر کا اوور سیر لگا ہو اور میرے باغوں کے پودے سوکھ جائیں۔"

"تو چاہتا کیا ہے؟" اسلم نے نشے سے جھوم کر دریافت کیا۔ "صاف صاف بتا۔"

"بتانا کیا ہے۔ ایک موگھا اور کھلوا دے۔"

"بہت مشکل ہے۔" اسلم سنجیدہ ہو گیا۔

"اس میں مشکل کیا ہے؟" رحیم داد ہنس کر بولا۔ "ایک کھل سکتا ہے تو دوسرا بھی کھل جانا چاہیے۔"

"تجھے آگے کے حصے داروں کا بھی کچھ پتہ ہے؟"

"سب پتہ ہے، ٹھیک طرح پتہ ہے۔"

اسلم اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تجھے کچھ پتہ نہیں۔" اس دفعہ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ "ادھر پہلے ہی گڑبڑ ہے۔ ایک موگھا اور کھل گیا تو معاملہ بہت خراب ہو جائے گا۔ تو اسے نہیں سمجھ سکتا۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تو میرا کام کرنا نہیں چاہتا۔" رحیم داد نے روٹھنے کے انداز میں منہ بگاڑ کر کہا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک بجھ گئی تھی۔

اسلم نے رحیم داد کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گیا۔ "چوہدری! میں نے تجھے یار کہا ہے تو ہمیشہ اپنا یار ہی سمجھوں گا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ سوچ میرے اوپر بھی افسر لگے ہیں۔"

"میں یاری دوستی میں اپنا کام نکالنا نہیں چاہتا۔" رحیم داد نے کاروباری پینترا اختیار کیا۔ "پہلے موگھا کھلنے کا جو کچھ دیا تھا، اس بار بھی دوں گا۔ مجھے پتہ ہے تجھے اوپر والوں کو بھی حصہ پہنچانا ہوتا ہے۔"

"رب سونہہ، میں نے تجھ سے کچھ نہیں لینا۔" اسلم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "تو

میری فکر نہ کر۔ اکزیکٹو انجنیئر اور ایس ڈی او اس دفعہ بہت آنکھیں دکھائیں گے۔ ویسے سچ پوچھ تو معاملہ ہے بھی ٹیڑھا۔"

اسلم نے اپنی مجبوری اس طرح بیان کی کہ رحیم داد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر اپنے مطالبے سے دست بردار نہیں ہوا۔ زور دیتا رہا۔ آخر اسلم آمادہ ہو گیا۔ لیکن دو کے بجائے تین ہزار روپے پر۔ رحیم داد نے نادر خاں کو گھر سے بلوایا اور اسلم کو تین ہزار روپے دلوا دیئے۔

اسلم اس رات اپنے گھر نہیں گیا۔ کھانا کھایا اور مہمان خانے کے دالان میں پلنگ پر بستر لگوا کر سو گیا۔ صبح اس نے رحیم داد کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ نادر خاں بھی موجود تھا۔ اسلم کی ہدایت کے مطابق نادر خاں نے رحیم داد کی جانب سے درخواست لکھی۔ درخواست میں پانی کی کمی بیان کی گئی تھی۔ خاص طور پر آم اور مالٹے کے باغات کے لیے پانی کی قلت پر زور دیا گیا تھا۔ مزید پانی مہیا کرنے کی غرض سے دو نئے موگھے کھولنے کی ضرورت پر ہمدردی سے غور کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

نادر خاں درخواست لکھ چکا تو اسلم نے اسے توجہ سے پڑھا۔ اس میں ضروری ترمیم کی۔ نادر نے دوبارہ درخواست لکھی۔ اسلم کی ہدایت کے پیش نظر نادر نے درخواست پر چار مہینے پہلی کی تاریخ ڈالی۔ اسلم نے ایک بار پھر درخواست دیکھی۔ رحیم داد نے بھی اسے غور سے پڑھا اور دستخط کر دیئے۔

اسلم نے درخواست جیب میں رکھی اور جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ دو روز نہیں آیا۔ تیسرے روز آیا تو محکمہ نہر کے بیل داروں نے راجباہ شرقی میں ایک نیا موگھا کھول دیا تھا۔ یہ موگھا رحیم داد کی زمیں داری کی حدود میں کھولا گیا تھا اور اس کا منہ بھی پچھلے موگھوں سے بڑا تھا۔

نیا موگھا کھلنے کی بعد نہر کے سوئے میں پانی کی سطح اور گر گئی۔ نشیبی علاقے کے حصے داروں کو اور بھی کم پانی ملنے لگا۔ پانی کی بڑھتی ہوئی قلت سے فصلیں متاثر ہوئیں تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ ان میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اس دفعہ پانی کی کمی کا انھوں نے سراغ بھی لگا لیا۔

نشیبی علاقے کے متاثرہ حصے داروں نے صورت حال پر غور کرنے کے لیے پنچایت بلائی۔ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا اور فوری اقدام کے طور پر ایک وفد تشکیل دیا۔ وفد اعلیٰ حکام سے ملا۔ پانی کی چوری کی شکایت کی۔ انھیں بتایا کہ محکمہ آب پاشی کے اہل کار بڑے زمیں داروں سے ساز باز کر کے غیر قانونی طور پر ریگولیٹروں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ نئے موگھے بنا دیتے ہیں۔ نہر میں شگاف ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے ہر طرح اپنی پریشانی بیان کی۔ بہت احتجاج کیا مگر کوئی

نتیجہ نہیں نکلا۔ اسلم نے کام پکا کیا تھا۔ اس نے رحیم داد کی درخواست کی بنیاد پر موگھے کھولے تھے اور اپنی کارروائی کی تائید میں معقول جواز بھی پیش کیا تھا۔

رحیم داد کو متاثرہ حصے داروں کی بھاگ دوڑ اور سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "نادر! سنا ہے' آگے کے چھوٹے زمیں دار پانی کم ملنے پر رولا گولا کر رہے ہیں۔"

"وہ تو جی انھیں کرنا ہی تھا۔" نادر خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ تو پہلے ہی سے پتہ تھا' پر ہوتا ہواتا کچھ نہیں۔"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" رحیم داد بدستور پریشان تھا۔ "پانی کی اس طرح چوری پر اپنے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ کچھ نہ ہوا تو بھی موگھے تو بند ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہوا تو آم اور مالٹے کے باغوں کا کیا بنے گا؟ بہت پریشانی اٹھانی ہو گی۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا جی!" نادر خاں نے اطمینان دلایا۔ "اسلم بہت ہوشیار افسر ہے۔ اس نے سوچ سمجھ کر کام کیا ہے۔ اس نے اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈالنی۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔" رحیم داد مطمئن نہیں ہوا۔ "مجھے تو یہ پتہ ہے کہ موگھے کانونی طور پر نہیں کھولے گئے۔"

"بالکل کانونی طور پر کھولے گئے ہیں۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تب ہی تو اسلم نے درخواست لکھوائی تھی۔"

"درخواست سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو زیادہ پانی مانگنے کے لیے کوئی بھی زمیں دار لگا سکتا ہے۔"

"پر اپنی درخواست میں اور دوسرے زمیں داروں کی درخواست میں بہت فرک ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "ہم نے باغوں کے لیے پانی مانگا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' پاکستان بننے سے بھی پہلے کا کانون ہے کہ باغوں کے لیے دوسری فصلوں کے مکابلے میں دگنا پانی نہر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کانون اب تک نافذ ہے۔ اسلم نے اسی کانون کی رو سے اپنی درخواست پر دونوں موگھے کھول دیئے۔"

"اگر حصے دار یہ معاملہ اور اوپر تک لے گئے تو گڑبڑ پیدا کر سکتے ہیں۔"

نادر نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "اوپر کیا' وہ عدالت تک چلے جائیں' تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ اسلم نے تمام کام کانون سامنے رکھ کر کیا ہے۔ ایسے کام وہ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ اسے سب پتہ ہے۔ میں نے کہا تا اس نے اپنی نوکری نہیں چھوڑنی۔" نادر نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی

کوشش کی۔ "اس نے درخواست پر جب پچھلی تاریخ ڈلوائی تھی، تبھی میں اس کی ہوشیاری مان گیا تھا۔"

"ایسا کرنے میں کون سی ہوشیاری تھی۔" رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

"اس میں ہوشیاری یہ تھی کہ اس نے پچھلے موگھے کو بھی کانونی شکل دے دی۔ بلکہ آگے کے لیے بھی اپنے ہاتھ مضبوط کر لیے۔ اسے پہلے ہی ملوم تھا کہ بعد میں کیا کیا ہو سکتا ہے اور اس کا توڑ کس طرح کیا جائے۔ اسلم پیسہ تو دبا کے کھاتا ہے پر ہاتھ پاؤں بچا کر۔"

"سوچ لے، آگے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔"

"فکر نہ کریں جی!" نادر خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "حصے دار ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد آخر میں اپنے ہی پاس آئیں گے۔"

رحیم داد کو نادر خاں کی بات پر یقین نہیں آیا مگر اس نے مزید بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا۔

☆

ایک صبح نشیبی علاقے کے چھوٹے زمیں داروں کے دو نمائندے رحیم داد کے پاس آئے۔ نادر خاں کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سیدھا رحیم داد کے کمرے میں پہنچا۔ نادر خاں نے اسے سمجھایا۔ "چوہدری، آگے کے حصے دار پانی کا جھگڑا چکانے آئے ہیں۔ تجھے ان سے زیادہ گل بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔ پہلے بھی کئی بار ایسے معاملات طے کر چکا ہوں۔ تجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے بلا عذر اس کی تجویز مان لی۔

وہ نادر خاں کے ہم راہ حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا۔ دونوں نمائندے وہاں اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ گفتگو کا آغاز نادر ہی نے کیا۔

"کیسے آنا ہوا جی؟"

ایک جو سن و سال میں بڑا تھا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ "میں جی نیک محمد ہوں۔" اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کرم دین ہے۔ ہم دونوں پڑوس کے زمیں دار ہیں۔" وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری تو نے دو موگھے کھول کر ہمارا بیڑا گرک کر دیا۔" اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔

رحیم داد بولا۔ "میرے موگھوں سے تجھے کیا لینا؟"

اس نے جان بوجھ کر بے نیازی سے کام لیا۔

"حد ہو گئی جی!" اس دفعہ کرم دین بولا۔ "ہم چھوٹے حصے داروں کو پہلے ہی پانی کم مل رہا تھا،

تیرے موگھے کھل جانے سے سوئے میں اتنا پانی کم ہو گیا کہ فصلیں سوکھنے لگی ہیں۔ اس دفعہ برکھا بھی نہیں ہوئی۔ تو ہمیں تباہ کر دینا چاہتا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے ہم نے سوچ سمجھ کر ایسا کیا ہے۔" نادر خاں نے بھی تیکھا لہجہ اختیار کیا۔

"آگے کے حصے داروں اور زمیں داروں سے ہماری دشمنی تو ہے نہیں۔ ہم انھیں تباہ کرنے کی کیوں سوچنے لگے؟"

"دشمنی تو نہیں پر یہ تو پتہ ہے۔ آج کل، جب فصلیں تیار کھڑی ہیں اور ان کے لیے زیادہ ہی پانی کی ضرورت ہے، تو نے موگھے کھول کر پانی بند کر دیا۔ ہماری فصلیں تباہ نہیں ہوں گی تو کیا ہو گا۔" کرم دین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے صورت حال کی وضاحت کی۔

"تو یہ کہنا چاہتا ہے ہم نے غلط موگھے کھلوائے ہیں؟" نادر خاں کا لہجہ بدستور تیز اور تیکھا تھا۔

"غلط کام نہیں تو اور کیا ہے۔" کرم دین کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "سچ پوچھ تو یہ پانی کی کھلی چوری ہے۔"

"چوری ہے تو تھانے میں جا کر پرچہ چاک کرا۔" نادر خاں بھی مشتعل ہو گیا۔ "محکمہ نہر والوں کے پاس جا۔ اوپر درخواست لگا۔ عدالت میں جا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟"

نیک محمد نے بات بگڑتی دیکھی تو جھٹ مداخلت کی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کرم دین کو روکا۔ "کرمے، تو چپ کر۔ میں نوں گل بات کرنے دے۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا اور نرم لہجے میں بولا۔ "چوہدری، تجھ سے پہلے ادھر کا زمیں دار اللہ وسایا ہوتا تھا اور اس سے بھی پہلے لالہ کرشن دیال ہوتا تھا، پر پانی کے معاملے میں ہمارا کبھی کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا پانی ملتا رہا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔" رحیم داد کے بجائے نادر خاں بولا۔

"کہنا کیا ہے جی۔" نیک محمد نے اس دفعہ بھی رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری، تو وڈا زمیں دار ہے۔ ہم چھوٹے حصے دار ہیں۔ پانی نہ ملا تو ہماری فصلیں سوکھ جائیں گی۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "تو چاہے تو ہماری کھڑی فصلیں تباہ ہونے سے بچ سکتی ہیں۔"

"تو یہ چاہتا ہے کہ تیری فصلیں بچانے کے لیے ہم اپنا بیڑا غرک کر لیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کی جانب سے ترجمانی کا فرض ادا کیا۔ "ہمارے باغ پانی کے بغیر سوکھ جائیں۔ تو خود ہی سوچ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نیک محمد نے نادر سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اڈتے جذبات قابو میں

رکھے اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے زیادہ نرم لہجہ اختیار کیا۔ "پر تجھے ہماری فصلیں بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔"

"اس کے لیے تو محکمہ نہر کے افسروں سے گل بات کر۔" نادر خاں نے بے رخی سے کہا۔ "پانی تو وہی دیتے ہیں۔ وہی کچھ بندوبست کریں گے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو جی کچھ نہیں کریں گے اور نہ ان سے اوپر والے کچھ کریں گے۔" نیک محمد نے نرمی سے کہا۔ "ہماری فصلیں بچانے کے لیے تجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ ہم چھوٹے حصے داروں کی طرف سے اسی لیے آئے ہیں۔"

نادر خاں سر جھکا کر سوچنے لگا۔ رحیم داد بھی گم صم بیٹھا رہا۔

نیک محمد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور نادر خاں کی جانب دیکھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" ایک بار پھر وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "چوہدری، ہم تیرے پاس بہت امیدیں لے کر آئے ہیں۔ ہمیں نہ تیرے خلاف اوپر درخواست لگانی ہے نہ مکدے بازی کرنی ہے۔ ہمیں تو اپنی فصلیں بچانی ہیں اور وہ تو ہی بچا سکتا ہے۔"

رحیم داد نے نادر سے پوچھا۔ "نادر، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "یہ بتا، ان کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"وہی، جو ایسے معاملات میں ہوتا ہے۔" نادر خاں نے گول مول جواب دیا۔

"کیا ہو سکتا ہے جی؟" کرم دین نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔

"ہم یہ کر سکتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کچھ پانی فروخت کر دیں۔" نادر خاں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جواب دیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ دوسرے موگھے کا منہ بڑا ہونے کے باعث باغات کی ضرورت سے زیادہ پانی مل رہا ہے۔ "یہ کوئی نئی گل نہیں۔ وڈے زمیں دار چھوٹے حصے داروں کی اسی طرح مدد کرتے ہیں۔ اس کا تم کو بھی پتہ ہو گا۔"

"سنا تو ہے جی پانی اس طرح فروخت ہوتا ہے۔" نیک محمد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "پر اپنے ساتھ کبھی ایسا ہوا نہیں۔"

"پہلے نہیں ہوا تو اب ہو سکتا ہے۔" نادر خاں نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ "فصلیں بچانی ہیں تو پانی خریدنا ہو گا۔"

"یہ تو جی بہت مشکل ہو گا۔" کرم دین نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"مشکل ہو یا آسان۔ یہ میں نہیں جانتا۔" نادر خاں نے تیکھی نظروں سے کرم دین کو دیکھا۔

"تمہاری مدد میں اسی طرح کر سکتا ہوں۔" اس نے مشورہ دیا۔ "جاؤ اور دوسرے حصے داروں سے اس معاملے میں بات کرو۔ اچھی طرح سوچ لو' سمجھ لو۔" اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "میں نے اور زمیں دار نے ابھی اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

نیک محمد نے نادر کے رویے سے اندازہ لگالیا کہ زیادہ حیل و حجت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ حیل و حجت اور تکرار کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ گرمی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ گندم کے پودوں کی رنگت سنہری پڑتی جا رہی تھی۔ گرمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بخارات کے ذریعے پودوں سے پانی کا اخراج تیز ہو گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پودوں کو پانی کی شدید ضرورت تھی۔ پانی مناسب مقدار میں نہ ملنے کی صورت میں پودے تیزی سے مرجھانے لگتے ہیں جسے کاشتکاروں کی اصطلاح میں فصل کا ہل جانا کہا جاتا ہے۔ فصل ہل جائے تو بالیوں میں لہلہاتے ہوئے گندم کے دانے سکڑ جاتے ہیں۔ ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ وزن ہلکا پڑ جاتا ہے اور پیداوار بہت گھٹ جاتی ہے۔ لہٰذا صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر نیک محمد نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے نادر خان کو اپنی مجبوری کا احساس دلایا۔

"فیصلہ ہم دونوں تو جی کر نہیں سکتے۔ تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔ دوسرے حصے داروں سے گل بات کرنی ہوگی۔ اس سے پہلے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ بھی بتا دے کہ پانی کس طرح خریدنا ہو گا۔ ہم نے واپس جا کر ساری باتیں بتانی ہوں گی۔"

"پنج روپے فی کلا کے حساب سے کیمت ادا کرنی ہوگی۔" نادر خاں نے کہا۔ "اور ساری رکم پیشگی دینی ہوگی۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہے۔" نیک محمد نے عاجزی سے کہا۔ "یہ تو سوچ' چھوٹے حصے دار اتنی کیمت کیسے ادا کریں گے۔ پیشگی تو وہ بالکل نہیں دے سکتے۔ فصل کی واڈھی کے بعد ہی دے سکیں گے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ہم چھوٹے حصے داروں کی غریبی کا خیال کر۔ کیمت میں کمی کر دے اور پیشگی کی شرط بھی ہٹا دے۔"

"میں نے جو کہہ دیا' ویسا ہی ہو گا۔" نادر خاں نے رعونت سے کہا۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نادر اس کا ملازم نہیں مالک و مختار ہے۔ رحیم داد نے فوراً مداخلت کی۔ نیک محمد سے دریافت کیا۔ "آگے کے چھوٹے حصے داروں کی کتنی زمین ہو گی؟"

نادر خاں کارگزاری دکھانے میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا۔ نیک محمد کے جواب دینے سے پہلے ہی بول پڑا۔ "زمین کتنی ہی ہو۔ ہم نے اس سے کیا لینا۔ سوال یہ ہے..."

رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے نادر خاں کو جھڑک دیا۔ "نادر! چپ کر۔" وہ نیک محمد کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاں جی کتنی زمین ہو گی؟"

"لگ بھگ ۳۵ مربعے ہو گی۔"

"ایسا کر فی ایکڑ تین روپے کے حساب سے کیمت چکا دینا۔ آدھی پیشگی اور آدھی فصل کی واڈھی پر۔" رحیم داد نے چہرے پر رعب اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اور یہ بھی سن لے۔ میں نے جو فیصلہ کر دیا وہ نہیں بدلے گا۔ سارے حصے داروں کو صاف صاف بتا دینا۔"

نیک محمد اور کرم دین نے بات کو طول نہیں دیا' فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جلد آنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو کر حویلی سے چلے گئے۔

ان کے جانے کی بعد نادر خاں نے معذرت کرنے کے انداز میں صفائی پیش کی۔ "کوئی غلطی ہو گئی تو جی معافی دے دیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ انھیں اس طرح دبایا جائے کہ وہ اوپر جانے کی نہ سوچیں۔"

"تو نے انھیں بہت دبا دیا تھا۔" رحیم داد کی جھنجلاہٹ رفع ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ "اب سوچنا یہ ہے کہ وہ مان بھی جائیں گے؟"

"بالکل مان جائیں گے۔" نادر خاں بولا۔ "انھیں اپنی فصلیں بچانی ہیں۔ چوہدری' تجھے پتہ نہیں' سارے ہی حصے دار پانی کی کمی سے بہت پریشان ہیں۔ فصلوں کی بڑھوتری رک گئی ہے۔ ان کو سوکا لگنے کا ڈر ہے۔"

"ایسا ہو گیا تو اپنی دی ہوئی آدھی رکم تو نکل ہی آئے گی۔"

"میں تو پوری ہی نکلوانا چاہتا تھا۔" نادر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ خوشامد پر اتر آیا۔ "پر زمیں دار تو بہت نیک اور رحم دل بندہ ہے۔ تیرا دل بہت وڈا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میں نے تو یہ دیکھا ہے' دوسرے وڈے زمیں دار ایسے معاملوں میں چھوٹے حصے داروں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پانی کی منہ مانگی کیمت وصول کرتے ہیں۔ ذرا بھی ترس نہیں کھاتے بلکہ زیادہ سے زیادہ کیمت مانگتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ مانگتے ہیں' انھیں مل بھی جاتا ہے۔"

"نہیں جی! اتنا زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہیے۔" رحیم داد ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ "میں

تو کہتا ہوں نادر اتنا ہی مل جائے‘ کافی ہے۔"

"فکر نہ کریں جی‘ باغ لگانے پر جو خرچ آیا ہے سب مل جائے گا۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔"

"پورا خرچ کیسے نکل آئے گا۔" رحیم داد نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ "مالی بتاتے ہیں‘ بوٹے چار پانچ برس سے پہلے پھل نہیں دیں گے‘ تب تک خرچ تو ہوتا ہی رہے گا۔"

"پانی کی کیمت تو جی آگے بھی ملتی رہے گی۔ یہ تو طے ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "خریف کی واڈھی تک پودے خوب بڑھ جائیں گے۔ اگلی ربیع کی فصل پر باغ کی زمین پر کنک اور جو بوئی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی اچھی کمائی ہو جائے گی۔"

"ہاں جی! یہ تو ہو سکتا ہے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "ایسا ہی کرنا ہو گا۔"

"اطمینان رکھیں جی! بالکل ایسا ہی ہو گا۔ میں نے سب تیاری کر رکھی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر خاں رحیم داد سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

دوسرے روز سہ پہر کو نیک محمد اور کرم دین آئے۔ ان کے ہم راہ دو اور چھوٹے حصے دار بھی تھے۔ انھوں نے بات چیت میں قطعی نرم اور لچک دار رویہ اختیار کیا۔ رحیم داد نے جو شرائط پیش کی تھیں‘ ان کے بارے میں انھوں نے نہ مین میخ نکالی نہ سودے بازی کی کوشش کی۔ ہر بات بلا حیل و حجت مان لی۔ انھیں اپنی فصلوں کے لیے پانی کی شدید ضرورت تھی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ پانی کی مطلوبہ پیشگی رقم وہ ساتھ لائے تھے۔ رقم انھوں نے رحیم داد کے حوالے کی اور بقیہ نصف رقم فصل کی کٹائی پر ادا کرنے کا یقین دلایا۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چلے گئے۔

رحیم داد نے سمجھوتے کے مطابق اسی روز ایک موگھا بند کرا دیا۔ یہ چھوٹا موگھا تھا۔ اس کے بند ہوتے ہی نشیب کے حصے داروں کی فصلوں کے لیے پانی پہنچنے لگا۔

ربیع کی فصل کی کٹائی کے بعد ان کے نمائندے دوبارہ آئے اور حسب وعدہ بقیہ رقم بھی لائے۔ انھوں نے پورا حساب صاف کر دیا۔ اس دفعہ رحیم داد نے انھیں کھانا کھلایا‘ خاطر تواضع کی۔ محبت اور نرمی سے پیش آیا۔ اسی ملاقات میں آئندہ کے لیے پانی کا سودا بھی طے ہو گیا۔

☆

خریف کی فصل سے فارغ ہونے کے بعد نادر خاں نے پروگرام کے مطابق گندم کی بوائی کے لیے باغات کی زمین پر بھی ہل چلوایا اور دوسری زمینوں کے ساتھ اس پر بھی بوائی کرائی۔ رحیم داد

نے بھی اس میں پوری پوری دلچسپی لی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہونے کی بعد حویلی سے نکلتا اور دوپہر تک بوائی کی دیکھ بھال کرتا۔ اکثر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بھی چلا جاتا اور شام کو لوٹتا۔

اوور سیئر اسلم کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ اس کا لائل پور تبادلہ ہو گیا تھا مگر جب تک وہ ضلع منٹگمری میں تعینات رہا' اکثر رحیم داد کے پاس آجاتا اور ہفتے کی شام کو پابندی سے آتا۔ دونوں رات گئے تک پینے پلانے میں مصروف رہتے۔ اسلم کے بعد رحیم داد کی شامیں سونی ہو گئی تھیں۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ ان دنوں سیاسی سرگرمیوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ سیاست میں نت نئی تبدیلیوں' جوڑ توڑ' سازشوں اور دھڑے بندیوں کا دور تھا۔ احسان شاہ کبھی ایک سیاسی دھڑے کے ساتھ' کبھی دوسرے کے ساتھ لگ جاتا۔ جس کا ستارہ عروج پر دیکھتا' اس کی ہم نوائی کرتا' سیاسی وفاداریاں بدلتا اور ہر طرح کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ ان دنوں وہ لاہور میں رہتا یا کراچی میں۔ اپنے گاؤں پیراں والہ کم ہی آتا اور جب بھی آتا' ایک دو روز سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔

نادر خاں کے بچوں میں ایک کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس بار بیٹا پیدا ہوا۔ یہ تین بیٹیوں کے بعد ہوا تھا لہٰذا اس کا لاڈ پیار بھی زیادہ تھا۔ نادر کی بیوی جنت بی بی ہر وقت بیٹے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتی۔ رحیم داد شدید تنہائی میں مبتلا تھا۔ وہ تنہائی سے بچنے کے لیے زمیں داری کے امور میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتا' خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا اور شام ہوتے ہیں شغل بادہ نوشی شروع کر دیتا۔ اکیلا بیٹھا پیتا رہتا۔

ایک سہ پہر نادر خاں اس کے پاس آیا۔ وہ زمین داری کے کام کے سلسلے میں تحصیل دار سے ملنے دیپال پور گیا تھا اور سیدھا وہیں سے آرہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! میں نے جمیلہ کے بارے میں تجھ سے جو کہا تھا' وہی ہوا نا۔"

جمیلہ کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ "کیا ہوا جمیلہ کو؟"

"وہی ہوا جو میرا اندازہ تھا۔" نادر خان مسکرا کر بولا۔ "بھائیوں اور بھرجائیوں کے ساتھ زیادہ عرصے گزارا نہیں ہوا۔ ان بن ہو گئی۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "تو یہاں ہے' وہ ادھر سرحد پار' فیروز پور میں ہے۔"

"وہ ایسا ہوا جی! دیپال پور میں مجھے جلیل مل گیا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "وہ تو مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا' پر میں نہیں گیا۔ بات چیت اس سے ضرور ہوئی اور دیر تک ہوئی۔ جمیلہ کے بارے

میں وہی بتا تا تھا۔"

"پر جمیلہ سے وہ کہاں ملا؟ فیروز پور تو وہ جانے سے رہا۔" رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔

"جلیل فیروز پور تو نہیں گیا لیکن چند مہینے پہلے دہلی ضرور گیا تھا۔ دہلی میں اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ ادھر نہیں آیا۔ پاکستان بنا تو وہ دہلی ہی میں تھا اور اب تک وہیں ہے۔ بال بچے دار ہے۔ جلیل اس سے ملنے گیا تھا۔ دہلی سے واپس آ رہا تھا کہ جلندر کے سٹیشن پر اسے جمیلہ نظر آئی۔ وہ اس کے پاس گیا' بات چیت بھی کی۔"

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ "جمیلہ کے بارے میں کیا بتایا اس نے؟"

"کہتا تھا' جمیلہ کی باتوں سے اسے یہ پتہ چلا کہ ہر دیال کی گھر والی سے اس کا اتنا جھگڑا ہوا کہ وہ روٹھ کر چھوٹے بھائی منوہر دیال کے پاس امرت سر چلی گئی۔ پر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکی۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "ان دنوں وہ سب سے چھوٹے بھائی ایشور دیال کے پاس جلندر میں تھی۔ ہر دیال اسے منانے آیا تھا اور اپنے ساتھ واپس فیروز پور لے جانا چاہتا تھا' پر اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔"

"تو گویا اب وہ جلندر میں ہے۔"

"پتہ نہیں جی جلندر میں ہے یا فیروز پور میں۔ جلیل اس سے کئی مہینے پہلے ملا تھا۔ بعد میں وہ کہاں گئی یہ تو اسے بھی خبر نہیں۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "میرے بارے میں بھی اس نے جلیل سے گل بات کی؟"

"جلیل کہتا تھا' تیرے بارے میں بھی اس نے پوچھا تھا۔"

"برا ہی کہتی ہو گی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سخت نراض ہو کر گئی تھی ناں۔"

"پر اس نے جلیل سے تیرے بارے میں کسی نراضی کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اتنا پوچھا کہ چوہدری کیسا ہے؟" نادر خاں نے بتایا۔ "اس نے اوروں کا بھی حال احوال پوچھا۔ جلیل کہتا تھا' وہ اب تک کوٹلہ ہر کشن کو بھولی نہیں۔ یہاں کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک ایک بات کا ذکر کرتی تھی۔ سب کو پوچھتی تھی' سب کو یاد کرتی تھی۔ لگتا ہے یہاں سے جانے پر وہ خوش نہیں ہے۔"

"یقین نہیں آتا۔" رحیم داد بے چارگی کے انداز میں بولا۔

"چوہدری' یہ تو سوچ' وہ یہ پنڈ کیسے بھول سکتی ہے۔" نادر خاں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں رحیم داد کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ "وہ یہاں برسوں رہی ہے۔ دکھ تو دیکھے ہیں پر بہت سکھ بھی اٹھایا۔ زمیں داری تو وہی کرتی تھی' اللہ وسایا تو اس کا مزارع ہی لگتا تھا۔ سب یہی بتاتے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟ تجھے یہ بھی پتہ ہے' دو بچوں کی ماں بھی وہ یہیں بنی۔ ادھر کی تو اسے ایک ایک گل بات یاد آتی ہوگی۔"

رحیم داد کو نادر خاں کی باتوں سے سہارا ملا۔ "ویسے وہ ملے تو اصلی گل کا پتہ چلے۔" اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ "پر وہ مل بھی کیسے سکتی ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کا غبار چھا گیا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی چلی آئے۔" نادر نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں کہتا ہوں جی' بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ تیری گھر والی ہے۔ تیرے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے' اور جی سب سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کی جو شان ادھر تھی وہاں کیسے ہوگی۔ وہاں تو اسے اچھوت ہی سمجھا جائے گا۔ مسلمان کے ساتھ گھر والی بن کر جو رہ چکی ہے۔ وہ ہندو ہیں۔ اسے اور اس کے بچوں کو کیسے کبول کر لیں گے۔ جلیل کی گھر والی' زینت کے بارے میں تجھے معلوم ہی ہے۔ اسے ادھر اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر فیر ادھر آگئی۔ ایسا ہی جمیلہ کے ساتھ بھی ہو رہا ہوگا۔ جلیل کی باتوں سے تو صاف یہی لگتا تھا۔"

"کہتا تو تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔

نادر مزاج شناس تھا۔ اس نے رحیم داد کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ وہ کچھ دیر جمیلہ کے بارے میں اسی انداز سے باتیں کرتا رہا۔ رحیم داد دل چسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ نادر خاں اٹھ کر چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں کھلبلی پیدا کر گیا۔ جمیلہ کی یاد ایک بار پھر شدت کے ساتھ ابھری۔ اس کا سراپا نظروں میں سہانے خواب بن کر منڈلانے لگا۔ وہ رات اس نے بڑی بے چینی میں بسر کی۔

☆

سردی ختم ہو رہی تھی۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مارچ کی آخری تاریخوں کی ایک خوش گوار شام تھی۔ فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی' چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ اجلی اجلی چاندنی در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ رحیم داد مہمان خانے میں بیٹھا اسکاچ وہسکی سے شغل کر رہا

تھا۔ اسی عالم میں اس نے مہمان خانے کے باہر جیپ رکنے کی آواز سنی۔ مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ احسان شاہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم راہ رفیع سمہ بھی تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی رحیم داد کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور احسان شاہ سے لپٹ گیا۔

رحیم داد نے احسان شاہ اور رفیع سمہ کو کرسیوں پر بٹھایا۔ احسان شاہ نے رفیع سمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری' یہ رفیع سمہ ہے۔ آج سہ پہر بہت مدت بعد میرے پاس آیا تھا۔ میں فوراً اسے تیرے پاس لے آیا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر رفیع سمہ کی جانب دیکھا۔ اس کی عمر لگ بھگ رحیم داد کے برابر ہی تھی۔ قد اونچا اور جسم مضبوط تھا۔ رحیم داد نے جھوم کر بے تکلفی سے رفیع سمہ کو مخاطب کیا۔ "بہت انتظار کرایا تو نے۔" پھر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ "شاہ جی! تجھے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ اس بار تو لہور جا کر ایسا بیٹھا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔"

"پروگرام کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔" احسان شاہ نے وضاحت کی۔ "کیا بتاؤں چوہدری' کیسے کیسے چکروں میں گھر گیا ہوں۔ اور ابھی تک ان سے نکل نہیں سکا۔ کل سویرے ہی واپس جانا ہے۔"

"کل جا رہا ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا اب تو نے لہور ہی میں ٹھہرنے کا طے کر لیا ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لے۔" احسان شاہ مسکرایا۔ "باتیں تو ہوتی رہیں گی' پہلے دو گلاس تو منگوا۔ لگتا ہے تو اکیلا ہی بیٹھا لگا رہا تھا۔"

"اکیلا ہی بیٹھ کر لگا لیتا ہوں۔" رحیم داد نے کہا۔ "تجھے تو پتہ ہے۔ ادھر اپنا کوئی ملنے جلنے والا نہیں۔"

اس نے نوکر کو بلایا' دو گلاس منگوائے' پیگ تیار کیے۔ گلاس رفیع سمہ اور احسان شاہ کے سامنے رکھ کر بولا۔ "لو جی' اپنے اپنے گلاس اٹھاؤ۔" سب نے گلاس اٹھائے' ہاتھ بڑھا کر ہولے سے ٹکرائے اور ایک ایک گھونٹ بھرا۔

سمہ خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے گردن ادھر ادھر گھما پھرا کر مہمان خانہ دیکھا' پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری' بہت پرانی بات ہے۔ ان دنوں بنسی لال ادھر منیجر ہوتا تھا۔ میں ایک رات ہردیال سے ملنے آیا تھا' اسی مہمان خانے میں ٹھہرا تھا۔ تب یہ بہت شان دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا نے اس کا بالکل ناس مار دیا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ پہلے تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ تو نے بھی دیکھی تھی۔" رحیم داد

نے بتایا۔ ”میں نے پچھلے دنوں اسے ٹھیک ٹھاک کرایا ہے۔“

”ابھی اسے اور درست کرانے کی ضرورت ہے۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”تجھے زمیں داری کرنی ہے تو سرکاری افسروں اور آس پاس کے وڈے زمین داروں سے میل ملاپ پیدا کرنا ہو گا' انھیں روٹی پر بلانا ہو گا۔ دعوتیں کرنی ہوں گی۔ ان کی دل جسپی کا سامان بھی کرنا ہو گا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”مہمان آئیں گے تو ادھر ہی ٹھیریں گے۔ پر یہاں تو ایک ہی کمرہ ہے اور ایک کوٹھڑی رہ گئی ہے۔ پہلے تو کئی کمرے ہوتے تھے۔“

”سنا ہے اللہ وسایا نے سارے کمرے توڑ پھوڑ کر گھوڑوں کا اصطبل اور ڈنگروں کا ڈھارا بنوا دیا۔“

”اسے وڈا مہمان خانہ رکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔“ احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”وہ تو زمیں دار بن ہی نہیں سکا' مزارع کا مزارع رہا۔“

”پر میں گھوڑوں اور ڈنگروں کو کہاں لے جاؤں گا؟“

”سکول کو اصطبل بنا دے۔ ڈنگر اور مویشی بھی ادھر ہی پہنچا دے۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”سکول کی عمارت اصطبل کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔ اب وہ اسی کام آنی چاہیے۔ تجھے زمیں داری کرنی ہے۔ مزارعوں کے منڈوں کو پڑھا لکھا کر ان کا دماغ خراب نہیں کرنا۔ اب یہ سکول شکول کا چکر نہیں چلنا چاہیے۔“

”سکول تو جمیلہ کے جانے کے بعد سے بند پڑا ہے۔“

”یہ تو ہونا ہی تھا۔“ احسان شاہ بولا۔ ”اب تو اسے اصطبل اور ڈھارا بنا۔ مہمان خانے کے کمرے بڑھا۔ اس کی شان بڑھا۔ زمین داری کی اصل شان تو اسی سے ملوم ہوتی ہے۔“

رفیع سمہ بھی دوسرا پیگ ختم کر چکا تھا' ہنس کر بولا۔ ”چوہدری' تب تو شاہ جی کی طرح تجھے بھی کوٹ بنوانا ہو گا۔ ورنہ شان پیدا نہیں ہو گی۔“

”نہیں جی! میں شاہ جی کی طرح کا کوٹ نہیں بنوا سکتا۔ میں اتنا وڈا زمیں دار کہاں ہوں۔“

”کوٹ نہ بنوا پر مزارعوں کی گھر والیاں اور کڑیاں تو اٹھوانی ہی ہوں گی۔“ احسان شاہ نشے میں جھوم کر بولا۔ ”تجھے زمیں داری چلانی ہے۔ مہمانوں کے لیے دو چار پوپٹ زنانیاں تو ہونی ہی چاہیں۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”تو بھی جمیلہ کے جانے کے بعد رنڈوا رہ گیا ہے۔“

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”شاہ جی! تو نے جمیلہ کے بارے میں سمہ سے بھی بات کی؟“

”نہیں' میں اس کو ادھر ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ رات تیرے مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ تو

آرام سے خود ہی بات کر لیتا۔" احسان شاہ نے مڑ کر رفیع سمہ کی جانب دیکھا۔ "رفیے! تجھے یہ تو پتہ ہی ہے' چوہدری بھی اپنا گہرا یار ہے۔ تجھے اس کا ایک کام کرنا ہے' اور ضرور کرنا ہے۔"

"ضرور کروں گا۔ بتا کام کیا ہے؟" رفیع سمہ نے دریافت کیا۔

"یہ تو تجھے چوہدری ہی بتائے گا۔ مجھے واپس پیراں والہ جانا ہے۔ افسر مال میری ہی حویلی میں ٹھیرا ہے۔ انتظار کرتا ہو گا۔ اس سے مجھے کچھ ضروری گل بھی کرنی ہے۔ سویرے تو میں لہور چلا جاؤں گا۔"

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اور رفیع سمہ نے مہمان خانے کے باہر اسے رخصت کیا۔ دونوں واپس آئے اور اپنی اپنی کرسیوں پر پھر بیٹھ گئے۔ گلاس اٹھانے اور وہسکی کی چسکی لگانے لگے۔

رفیع سمہ نے پوچھا۔ "یہ جمیلہ کا کیا چکر ہے؟"

"وہ میری گھر والی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پہلے وہ ہندنی تھی۔ فسادات ہوئے تو ادھر رہ گئی۔ اس کے گھر والے ادھر سرحد پار ہیں۔ پچھلے دنوں اس کا بھرا ہردیال اپنے مسلح کرندوں کے ساتھ آیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ہردیال غلے کا بہت وڈا سمگلر ہے۔ تو اسے جانتا ہے؟"

"نام تو اس کا میں نے بہت سن رکھا ہے پر کبھی ملا نہیں۔" سمہ نے جواب دیا۔ "ویسے اس کے کرندوں سے میری جان پہچان ہے۔"

"سنا ہے' وہ فیروز پور میں رہتا ہے۔ مجھے یہ پتہ کرنا ہے' جمیلہ اس کے پاس ہے یا اپنے کسی اور بھائی کے گھر چلی گئی۔"

"یہ تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ پر تجھے ہردیال سے تو نہیں ملنا؟"

"نہیں مجھے اس سے نہیں ملنا بلکہ اسے تو میرے بارے میں پتہ بھی نہیں چلنا چاہیے۔ میں نے تو جمیلہ کو ایک سندیسا بھیجنا ہے۔ تیری جان پہچان کا کوئی ایسا بندہ ہے جو جمیلہ سے مل سکتا ہو؟" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "پر اسے ادھر جمیلہ کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وہاں سب اسے پاروتی کہتے ہیں۔ یہ تو میں تجھے بتا چکا ہوں' وہ ہردیال کی چھوٹی بھین ہے۔"

"اس بارے میں ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ واپسی پر کچھ کیا جا سکتا ہے۔ چوہدری' تو ایسا کر' میرے ساتھ چل۔ وہیں بیٹھ کر آرام سے سوچیں گے۔ میں کل اپنے پنڈ واپس جا رہا ہوں۔ تو میرے ساتھ چل سکتا ہے؟"

"میرا منیجر نادر خان لہور گیا ہے۔ کل سویرے آ گیا تو میں تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔" رحیم داد نے رضا مندی کا اظہار کیا۔ "نادر کل نہ آیا تو تجھے ٹھیرنا ہوگا۔ وہ پرسوں ضرور آجائے گا۔ میرے پاس جیپ ہے، دونوں اس میں اکٹھے چلیں گے۔"

"پر میں ایک روز سے زیادہ کسی طور نہیں ٹھیر سکتا۔" رفیع نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "مجھے واپسی پر کئی بہت ضروری کام کرنے ہیں۔"

"نہیں، میں نے تجھے ایک روز سے زیادہ نہیں روکنا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔

دونوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کیے۔ ذرا دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اور رفیع سمہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سمہ کو نوکر نے مہمان خانے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد حویلی میں چلا گیا۔

نادر خان دوسرے روز واپس نہیں آیا۔ مگر تیسرے روز دن چڑھے پہنچ گیا۔ رحیم داد نے اسے اپنا پروگرام بتایا اور رفیع سمہ کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر حویلی روڈ کے راستے بھاول نگر کی جانب روانہ ہو گیا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی دونوں صادق گنج پہنچ گئے۔ صادق گنج سے رفیع سمہ کا گاؤں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن راستہ کچا تھا۔ سمہ کے گاؤں پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔

☆

رفیع سمہ کھاتا پیتا زمین دار تھا۔ گاؤں میں اس کا دو منزلہ عالیشان مکان تھا۔ رہتا بھی ٹھاٹ باٹ سے تھا۔ سواری کے لیے اس کے پاس بھی جیپ تھی۔

سمہ کا مکان پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوب کشادہ تھا۔ مکان کے اردگرد وسیع احاطہ تھا جس میں جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ باغیچہ تھا۔ کنواں تھا جس سے پانی نکالنے کے لیے ہینڈ پمپ لگا تھا۔ مہمانوں کے قیام کے لئے علیحدہ ڈیرا تھا۔ نوکروں کے واسطے مکان کے پچھواڑے مٹی کی بنی ہوئی کچی کوٹھریاں تھیں۔ قریب ہی مویشیوں کا باڑا اور اصطبل تھا۔ اصطبل میں عمدہ نسل کے کئی گھوڑے تھے۔ گائے اور بھینسوں کے علاوہ اونٹ بھی تھے۔

احاطے کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے دو پھاٹک تھے۔ ایک بڑا دوسرا چھوٹا تھا۔ بڑے پھاٹک پر مسلح پہریدار مقرر تھا۔ چھوٹا پھاٹک پچھواڑے تھا جو گھر میں کام کاج کرنے والے نوکروں اور دوسرے کمیوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔

رفیع سمہ کا مکان طرز تعمیر کے اعتبار سے دیہات کی پرانی وضع کی حویلیوں کی طرح کا نہ تھا۔ نیا یا

بنا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ رفیع سمہ خاندانی زمین دار نہ تھا۔ اس نے قیام پاکستان کے بعد ترقی کی اور اس میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ مکان بھی اس نے سال سوا سال قبل تعمیر کیا تھا۔ اور اس کی توسیع کا کام ہنوز جاری تھا۔

رحیم داد کو اس نے ڈیرے کے ایک کمرے میں ٹھہرایا۔ کمرہ سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ آرام دہ بھی تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ باغیچے میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں موجود تھیں۔ مگر دونوں وہاں نہ بیٹھے۔ باغیچے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے ہال نما کشادہ کمرہ تھا جس میں قالین کا فرش تھا۔ صوفے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ یہ رفیع سمہ کی بیٹھک تھی۔

بیٹھک میں لیمپ روشن تھا۔ نوکروں نے ایک میز پر پہلے ہی تھری ایکس رم کی بوتل رکھ دی تھی جو ہندوستان سے اسمگل ہو کر آئی تھی۔ میز پر دو گلاس بھی موجود تھے اور شیشے کے جگ میں پانی بھرا تھا۔ رفیع سمہ اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے اور شراب نوشی میں مشغول ہو گئے۔

دونوں نے رات کا کھانا ساتھ بیٹھ کر کھایا اور سویرے اٹھ کر ناشتا بھی ساتھ ہی کیا۔ دوپہر کے کھانے پر رفیع نے کھل کر بات کی۔ زندہ دل اور یار باش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاف گو اور ہنس مکھ بھی تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے رحیم داد سے کہا۔

"چوہدری، میرے بارے میں شاہ جی نے تجھے بتا ہی دیا ہو گا۔ زمیں داری کے ساتھ ساتھ میرا دھندا اسمگلنگ اور رسا گیری بھی ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "رسا گیری کے بغیر زمیں دار وڈا زمیں دار بن ہی نہیں سکتا۔"

"شاہ جی نے تیرے بارے میں کچھ بتایا تو تھا، پر زیادہ گل بات نہیں ہوئی۔"

رفیع سمہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "رسا گیری تو زمیں داروں کا کھیل ہے۔ بات یہ ہے جی، زمیں داری تو سچ پوچھو منشی اور کرندے چلاتے ہیں۔ زمیں دار خالی بیٹھے کریں بھی کیا۔ وہ دوسروں کے ڈنگر اور مویشی اٹھواتے ہیں۔ مزارعوں کی زنانیاں اٹھا کے انھیں ادھر سے ادھر کرتے ہیں، بیچ دیتے ہیں، یا رکم لے کر واپس کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی دو پارٹیوں کے بیچ میں پڑ کر سودا بھی طے کرا دیتے ہیں اور اپنا کمیشن وصول کر لیتے ہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "دھندا برا نہیں۔ پر میں زنانیاں اٹھوانے کا دھندا نہیں کرتا۔"

"کیوں نہیں کرتا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"بات یہ ہے چوہدری، میری گھر والی بہت زور آور ہے۔ وہ ہے بھی وڈے گھر کی۔ یہ دھندا اسے

بالکل پسند نہیں۔"

"پر رسا گیری اور سمگلنگ اسے پسند ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بات سمجھ نہیں آئی۔"

"یار رسا گیری کو وہ کیسے ناپسند کر سکتی ہے۔" سمہ نے بے تکلفی سے کہا۔ "اس کا پیو جتنا وڈا زمیں دار ہے' رحیم یار خان کا اتنا ہی مشہور رسا گیر بھی ہے۔ میری اس کی جان پہچان اسی چکر میں ہوئی تھی۔ میں اسے ایسا پسند آیا کہ اس نے اپنی دھی مجھ سے ویاہ دی۔"

"اسے یہ پتہ تھا کہ تو سمگلنگ بھی کرتا ہے؟"

"بالکل پتہ تھا۔ پر میری گھر والی شروع میں سمگلنگ کو برا سمجھتی تھی' اب نہیں سمجھتی۔ میرا پنڈ بارڈر کے نزدیک ہی ہے۔ یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔ ادھر رسا گیری اور سمگلنگ میں بہت آسانیاں ہیں۔ بس ادھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال ادھر کرنا پڑتا ہے' فاصلہ بھی کم ہے۔ اب تک بہت آرام سے اپنا کام چل رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے اسی کمائی سے میں نے پانچ سو کلا زمین خریدی۔ نئی ماڑی بنوائی' جیپ خریدی۔" رفیع سمہ نے ایک آنکھ دبائی۔ "میں تو کہتا ہوں چوہدری' تو بھی اپنی ساتھ لین میں لگ جا۔ زمیں داری کا مزا بھول جائے گا۔ سمگلنگ کا بھی عجب نشہ ہے۔ کمائی تو ایسی ہے' سمجھو روپیہ بارش کی طرح برستا ہے۔"

"بات یہ ہے جی' میں ہوں مہاجر۔ زمین داری بھی کلیم میں نئی نئی ملی ہے۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "شاہ جی نے تجھے شاید یہ بات بتائی بھی ہو۔ رہ گئی رسا گیری اور سمگلنگ' وہ جی میں نے پہلے کبھی نہیں کی۔"

"اب شروع کر دے۔ ربیع کی فصل تو تیار ہی ہے۔ واڈھی پر شروع کر دے۔" اس نے رحیم داد کو سبز باغ دکھایا۔ "آڑھتی تجھے فصل کی اتنی کیمت کہاں دیں گے جو میں سمگلنگ کے ذریعے دلاؤں گا۔ دگنی کیمت سے بھی زیادہ مل جائے تو تعجب کی بات نہیں۔"

"نہیں' مجھے اس چکر میں نہ ڈال۔" رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔ "یہ بہت خطرناک دھندا ہے۔"

"کوئی خطرناک شطرناک دھندا نہیں۔" سمہ نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ "دور سے دیکھو تو خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔ نزدیک آئے گا تو اتنا خطرہ نظر نہیں آئے گا جتنا تو سمجھتا ہے۔" اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ "یار تجھے کیا پتہ' اوپر سے نیچے تک سب کھاتے ہیں۔ سمگلنگ کی روک تھام کرنے والے تو دبا کے کھاتے ہیں۔ وہ نہ کھائیں تو سمگلنگ کا دھندا ایک روز نہ چلے۔ نزدیک سے دیکھے گا تو اس دھندے میں تجھے ایسا ایسا چہرہ دکھائی دے گا جس

کے بارے میں تو نے کبھی شبہ بھی نہ کیا ہو گا۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رفیع سمہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "اب کچھ تیرے کام کے بارے میں بات ہو جائے جس کے لیے تو آیا ہے۔"

"وہ تو میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" رحیم داد نے کہا۔

"وہ تو مجھے یاد ہے۔ کل رات چینی اور تیل سے لدے میرے ست اونٹھ سرحد پار جا رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں شام ہی کو نکل جاؤں گا۔ سارا بندوبست پہلے ہی کرنا ہوتا ہے۔" اس نے لسی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا' چند گھونٹ پیے۔ ہاتھ سے مونچھوں میں لگی ہوئی لسی کے قطرے صاف کیے۔ "آج رات میں نے تیرے ساتھ روٹی نہیں کھانی۔ تو اکیلا ہی روٹی کھا لینا۔ جس چیز کی ضرورت ہو' میرے نوکر اکبر کو بتا دینا۔ میں سویرے لوٹوں گا۔ جہاں میں جا رہا ہوں ادھر ہردیال کا بھی ایک کرندہ ہو گا۔ ہے تو وہ سکھ پر اس سے اپنی پرانی یاری ہے۔"

"تو سنتو کھے کی گل تو نہیں کر رہا؟" رحیم داد نے جھجک کر پوچھا۔

"ہاں' میں سنتو کھے ہی کی گل کر رہا ہوں۔ ویسے اس کا صلی نام سردار سنتو کھ سنگھ ہے۔" رفیع سمہ نے حیرت زدہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو سنتو کھے کو جانتا ہے؟"

"میں اسے بالکل نہیں جانتا' کبھی دیکھا بھی نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "ہردیال جمیلہ کو لینے آیا تھا تو اس نے میرے سامنے سنتو کھے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اتنا پتہ ضرور چل گیا تھا کہ وہ اس کے بہت اعتبار کا بندہ ہے۔"

"ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔" رفیع نے تائید میں کہا۔ "سنتو کھا اس کے پیو کے زمانے کا نوکر ہے۔ اب تو ادھکڑ ہو گیا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال پکنے لگے ہیں۔ ہردیال اسے بہت مانتا ہے۔"

"تب تو سنتو کھے سے جمیلہ کے بارے میں ہر بات کا پتہ چل سکتا ہے۔"

"چل تو سکتا ہے۔ پر بہت گھما پھرا کر گل کرنی ہو گی۔" رفیع سمہ مسکرایا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں باتوں باتوں میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گا۔"

"کیا کیا پوچھے گا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں اس سے آج ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی پر کل تجھے بتا بھی دوں گا اس سے کیا بات ہوئی۔"

دونوں کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ سمہ اٹھ کر ماڑی میں چلا گیا۔ رحیم داد کچھ دیر کرسی پر بیٹھا رہا' پھر اٹھا اور بستر پر جا کر دراز ہو گیا مگر اسے نیند نہیں آئی۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے نکلا اور ٹہلتا ہوا درختوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر چار دیواری کی قریب دو نو عمر لڑکے اٹو روڑا کھیل رہے ہیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور میلے کچیلے تھے۔ ایک کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا' اس کے بال کھچڑی تھے' آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ عمر نو دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسرا اس کا ہم عمر تھا۔ سر گھٹا ہوا' چہرہ گول مٹول' قد ذرا دبتا ہوا۔ وضع قطع سے دونوں کمیوں کے بچے نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر کے دو دو ٹکڑے دبے تھے۔

ایک نے پتھر اچھالا۔ پتھر کچھ دور جا کر گرا۔ دوسرے کا قد قدرے اونچا تھا۔ اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے پتھر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ پھر سامنے پڑے ہوئے دوسرے کھلاڑی کے پتھر کا نشانہ باندھ کر ہاتھ میں دبا ہوا پتھر زور سے پھینکا مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔

اب دوسرے کی باری تھی۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا اپنا پتھر اٹھایا۔ اس نے بھی اپنے دونوں پتھروں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجایا۔ ایک ہاتھ اٹھایا اور پہلے کھلاڑی کے زمین پر پڑے ہوئے پتھر پر تاک کر اس طرح اپنا پتھر مارا کہ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ دونوں پتھروں کے ٹکرانے سے زور کی آواز پیدا ہوئی۔

جس کھلاڑی کا پتھر پٹ گیا تھا' اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ ہار گیا تھا۔ کھیل کے اصول کی رو سے وہ زمین پر دونوں ہاتھ ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ دوسرا اپنی جیت سے سرشار ہنستا مسکراتا آگے بڑھا اور اچک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

دونوں بچوں کو اٹو روڑا کھیلتے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بہت اچھا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ اس کا نشانہ بہت کم چوکتا تھا۔ عام طور پر اس کھیل میں جیتتا تھا اور ہارنے والے کھلاڑی کی پیٹھ پر شان سے اکڑ کر بیٹھتا تھا۔ منہ سے ٹخ ٹخ کی آواز نکال کر اسے چھیڑتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لڑکوں کے قریب پہنچ گیا۔ اوپر بیٹھا ہوا لڑکا ہارنے والے کھلاڑی کو چڑانے کے لیے اس کی پیٹھ دونوں ہاتھوں سے تھپ تھپا کر ہولے ہولے اچھل رہا تھا' قہقہے لگا رہا تھا۔ ہارنے والا کھلاڑی اس کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ وہ خجل اور پریشان تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ رک رک کر ہاتھ پیروں کی مدد سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحیم داد کے قدموں کی آہٹ سن کر دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ جو کھلاڑی گھوڑا بنا ہوا تھا' وہ آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹکا اور رحیم داد کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔ رحیم داد نے نزدیک سے

دیکھا تو اس کی صورت میں اسے اپنے پہلوٹی کے بیٹے کریما کی شباہت نظر آئی۔ وہی تیز چمکتی ہوئی آنکھیں' وہی رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں۔ دیکھنے میں وہ کریما ہی لگتا تھا' مگر کریما تو اپنی ماں نوراں کے ساتھ اکال گڑھ میں تھا۔ رحیم داد نے اسے آخری بار وہیں دیکھا تھا۔

کریما یہاں کیسے آگیا؟ رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔

لڑکے نے رحیم داد کو اس طرح گھورتے دیکھا تو ایسا گھبرایا کہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا لڑکا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ وہ پھسلتا ہوا دھڑام سے نیچے گرا اور جھنجلا کر لڑنے کے لیے تیزی سے اٹھا۔ مگر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی دوسرا لڑکا بگٹٹ بھاگا۔ وہ تیزی سے اس سمت بڑھا جدھر نوکروں اور کمیوں کی کچی کوٹھریاں تھیں۔ وہ مڑ مڑ کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی کے ساتھ ساتھ تعجب بھی تھا۔ نیچے گرنے والا لڑکا کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو چند لمحے تک گھورتا رہا' پھر وہ بھی اسی طرف بھاگا جدھر اس کا ساتھی گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں لڑکے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ دونوں لڑکے بھاگتے ہوئے ایسے غائب ہوئے کہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔ نہ جانے وہ کہاں روپوش ہو گئے تھے۔ ان کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔

رحیم داد مڑا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا باغیچے میں پہنچ گیا۔ شیشم کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں اور مونڈھے پڑے تھے۔ وہ تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا' سائے طویل ہو کر پھیلتے جا رہے تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ شیشم کے خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔

سورج ماڑی کی اونچی ممٹی کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔ دھوپ ملیالی پڑ گئی تھی۔ خنکی ہولے ہولے بڑھنے لگی۔ رحیم داد اٹھا اور ڈیرے کی سمت بڑھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ بیتے دنوں کی یادوں کے چراغ جل رہے تھے۔ بجھ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☆

شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ نوکر نے لیمپ روشن کر دیا مگر رحیم داد کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ سامنے سے رفیع سمہ نمودار ہوا' قریب آیا اور مسکرا کے بولا۔

"چوہدری' میں تو اب جا رہا ہوں۔ تجھ سے کل صبح ملوں گا۔"

"سنتو کھا بھی ادھر ہو گا۔ اسے بھی ملے گا ناں؟"

"ہاں' وہ ادھر ہی ہو گا۔ اس نے مجھے پہلے ہی اطلاع بھجوا دی تھی۔ اس سے تو لمی گل ہو گی۔"

"جمیلہ کے بارے میں بھی بات کرنا۔" رحیم داد نے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تجھے یہاں اپنے ساتھ لایا کس لیے ہوں۔ جمیلہ کے بارے میں تو اس سے بہت سی باتیں ہوں گی۔ اسے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ جمیلہ اپنے بھرا ہردیال کے ساتھ ہے۔"

"کیوں نہیں پتہ ہو گا۔ اسے سب کچھ ملوم ہے۔ جمیلہ نے ہردیال کو بلانے کے لیے جو خط بھیجا تھا' وہ سنتو کھے ہی نے پہنچایا تھا۔ ہردیال نے یہ گل میرے سامنے ہی جمیلہ کو بتائی تھی۔" رحیم داد نے رفیع کو آگاہ کیا۔ "اور دیکھ' اتنا خیال رکھنا سنتو کھے کے سامنے تو جمیلہ نہیں پاروتی یا پارو کہنا۔ ادھر اس کا یہی نام ہے۔"

"تو پروا نہ کر۔" رفیع سمہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "مجھے پتہ ہے' سنتو کھے سے کس ڈھب سے بات کرنی ہو گی۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔ تو اپنے کمرے میں جا کر روٹی کھا۔ آرام سے سو۔ دل چاہے تو تھوڑی سی لگا لے۔ اکبرے کہہ دینا' وہ بندوبست کر دے گا۔"

"نہیں' آج میرا پینے کا ارادہ نہیں۔ کل تیرے ساتھ بیٹھ کر لگاؤں گا۔"

سمہ نے ہنس کر کہا۔ "جیسی تیری مرضی۔" وہ آگے بڑھ کے پھاٹک کی جانب روانہ ہو گیا۔

شام اب گہری ہو چکی تھی۔ ڈیرے کے کمروں میں روشنی جھل ملا رہی تھی۔ رحیم داد کے علاوہ ڈیرے میں دو مہمان اور بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ رحیم داد برآمدے سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے دیکھا' دونوں مہمان ایک کمرے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بھاول پوری حقے پر کش لگا رہے تھے۔ رحیم داد کی ان سے شناسائی نہ تھی۔ اس کا کمرہ بھی ڈیرے کے ایک گوشے میں بالکل الگ تھلگ تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اندھیرے میں گم صم کھڑا رہا پھر وہ مڑا' کمرے کی جانب چلا مگر اندر نہ گیا۔ برآمدے میں دو مونڈھے پڑے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز بھی رکھی تھی۔ وہ ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

برآمدے کے آگے جال کے دو اونچے اونچے درخت تھے۔ رات کی آمد آمد تھی۔ درختوں تلے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اکبر نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانا چٹ پٹا اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد نے رغبت سے کھایا۔ کھانے کے بعد لسی کا پورا گلاس

چڑھایا' ڈکار لی اور مونڈھے پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ اکبر کھانے کے برتن اٹھا کر لے گیا۔ رات رفتہ رفتہ کالی کاجل ہو گئی۔ رحیم داد اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ بستر پر لیٹا مگر نیند نہ آئی۔ اس کے ذہن پر جمیلہ چھائی ہوئی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد کی آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ کھڑکی پر آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں' گردن موڑی اور کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا کوئی کمرے میں جھانک رہا تھا۔ اسے صرف دھندلا سایہ نظر آیا اور ہلکی سی جھلک۔ رحیم داد نے گردن اونچی کی حیران و پریشان ہو کر کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہ تھا۔

رحیم داد کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زور سے کھنکارا۔ بستر سے نیچے اتر کے کھڑکی پر پہنچا اور سلاخوں کی آڑ سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہر طرف تاریکی کا جال پھیلا تھا۔ ہوا تیکھی تھی۔ ہوا کے ایک سرد جھونکے نے رحیم داد کے بدن میں ہلکی ہلکی کپکپی پیدا کر دی۔ عین اس وقت درختوں کے خشک پتوں پر دبی دبی چاپ ابھری۔ لیکن اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ جب دیر تک کوئی آہٹ ابھری نہ آواز آئی تو وہ واپس جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

نیند اڑ چکی تھی۔ وہ بستر پر چپ لیٹا رہا۔ اس کی نظریں بار بار کھڑکی کی جانب اٹھ جاتیں۔ کھڑکی کے باہر گھنے درخت تھے۔ پت جھڑ لگ چکا تھا۔ خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں سے آہستہ آہستہ کھڑ کھڑا رہے تھے۔ رات گزرتی رہی۔ سردی بڑھ گئی۔ آخر رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔

رفیع سمہ آدھی رات کے بعد واپس آگیا تھا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات سویرے ناشتے پر ہوئی۔ اس وقت بھی آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کو بوندا باندی بھی ہوئی تھی۔ موسم اچانک بدل گیا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ صبح خنک اور دھندلی تھی۔

رحیم داد نے رفیع سمہ سے دریافت کیا۔ "سنتو کھے سے بھی تیری ملاقات ہوئی۔؟"

"بالکل ہوئی۔" سمہ نے مسکرا کے جواب دیا۔ "اس سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔"

"جمیلہ کے بارے میں بھی گل بات ہوئی؟"

"کیوں نہیں ہوئی۔" رفیع سمہ اس کی بے چینی پر مسکراتا رہا۔ جان بوجھ کر مختصر جواب دیتا رہا۔

"جمیلہ کے بارے میں دیر تک بات ہوئی۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" رحیم داد تفصیل معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

"تو نے جمیلہ کے بارے میں ٹھیک ہی سوچا تھا۔"

"کیا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "صاف صاف گل کر۔"

"سنتو کھا کہتا تھا' جمیلہ کے فیروز پور پہنچنے پر تو سب بہت خوش تھے' امرت سر سے ہر دیال کے دو بھائی رام دیال اور منوہر دیال' جمیلہ سے ملنے اپنے بال بچوں کے ساتھ فوراً پہنچے۔ جلندر سے چھوٹا بھائی ایشور دیال بھی پہنچا۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "کیا سب بھائی ساتھ نہیں رہتے؟" حالانکہ وہ جلیل کے حوالے سے نادر خاں کی زبانی سن چکا تھا کہ جمیلہ کے بھائی علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ مگر وہ نادر خاں سے سنی ہوئی ہر بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں!" رفیع سمہ نے مطلع کیا۔ "ہر دیال فیروز پور میں رہتا ہے۔ ماں بھی اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ہر دیال اپنے سالے کشوری لال کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ رام دیال اور منوہر اپنا الگ بیوپار کرتے ہیں۔ وہ امرت سر میں ہوتے ہیں اور سب سے چھوٹا ایشور دیال جلندر میں ہے۔"
اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "جمیلہ تیرے پاس سے گئی تو ہر دیال کے ساتھ ہی ٹھیری تھی۔"

"وہ تو ابھی تک ہر دیال کے ساتھ ہی ہو گی؟"

"نہیں اب وہ فیروز پور میں نہیں ہے۔ وہ ہر دیال کے گھر سے چلی گئی۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "وہ کہاں چلی گئی؟"

"ہر دیال کی گھر والی سے اس کا زبردست جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا تو پہلے بھی کئی بار ہوا پر اس دفعہ کچھ زیادہ ہی زوردار ہوا۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا؟"

"سنتو کھا کہتا تھا' ہر دیال کی گھر والی غصے کی بہت تیز اور جھگڑالو ہے۔ چھوت چھات بھی بہت کرتی ہے۔ جمیلہ کے بچے اس کے برتن یا روٹی چھو لیتے یا رسوئی میں چلے جاتے تو وہ سخت ناراض ہوتی۔ انھیں مارتی پیٹتی' چیختی چلاتی۔ جمیلہ بولتی تو اسے طعنے دیتی۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کو کسی قدر تفصیل سے بتایا۔ "بس جی' ایسی ہی باتوں پر جھگڑا شروع ہوا اور اکثر ہوتا رہا۔ ہر دیال گھر والی کو منع کرتا۔ ڈانٹ پھٹکار بھی کرتا پر اس کی گھر والی بہت چنڈال ہے۔ ہر دیال سے ڈانٹ کھا کر ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی۔"

"بہت خراب زنانی ہے۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"ہاں جی بہت خراب ہے وہ۔ سنتو کھا بھی یہی کہتا تھا۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ "کئی مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ ہردیال گھر پر نہیں تھا' چنڈی گڑھ گیا تھا۔ ادھر اس کی گھر والی نے جمیلہ سے سخت جھگڑا کیا۔ ننگی ننگی گالاں بھی نکالیں۔ مارنے کو بھی بار بار جھپٹی۔ جمیلہ رونے لگی۔ دیر تک روتی رہی۔ سنا ہے' اسی روز اس نے گھر چھوڑ دیا اور بچوں کو بھی ساتھ لے گئی۔"

"کہاں چلی گئی تھی۔ سنتو کھا کیا بتاتا تھا؟"

"وہ بتاتا تھا جمیلہ اپنے بچوں کے ساتھ منوہر دیال کے پاس امرت سر گئی تھی۔"

"تب تو اسے امرت سر میں ہونا چاہیے۔"

"نہیں' منوہر کی گھر والی سے بھی اس کی ان بن ہو گئی۔ کچھ دن وہ رام دیال کے ساتھ بھی ٹھہری رہی۔"

"اب کہاں ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"امرت سر سے وہ ایشور دیال کے پاس جلندر چلی گئی۔ بلکہ ہوا یہ کہ ایشور دیال اسے امرت سر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

"ہردیال اسے منانے نہیں گیا؟"

"امرت سر بھی گیا تھا' جلندر بھی پہنچا۔ سنتو کھا کہتا تھا ہردیال نے جمیلہ کو منانے اور اپنے ساتھ فیروز پور لانے کی بہت کوشش کی پر اس نے صاف انکار کر دیا۔"

"مطلب یہ کہ جمیلہ اب فیروز پور میں نہیں' جلندر میں ایشور دیال کے ساتھ ہے۔"

"سنتو کھا تو یہی بتاتا ہے۔" سمہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔

"سنتو کھے کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ایشور دیال کی گھر والی سے تو جمیلہ کا جھگڑا نہیں ہوتا چھوت چھات تو وہ بھی کرتی ہو گی؟"

"جلندر کے بارے میں سنتو کھے کو کچھ پتہ نہیں۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ زیادہ تر فانلکا میں رہتا ہے۔ جلندر اس کا بالکل جانا نہیں ہوتا۔"

"ادھر کے بارے میں کیسے پتہ چلے گا؟" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے' تو نے جمیلہ کے بارے میں پوری طرح پتہ نہیں کیا۔"

"فکر نہ کر۔" سمہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "جلندر کا حال احوال شنکر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ پچھلے دنوں ادھر ہی تھا اور ایشور دیال ہی کے گھر ٹھہرا تھا۔"

"شنکر سے تو نہیں ملا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔
"نہیں۔" رفیع سمہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ "وہ ہوشیار پور گیا ہے۔ واپسی پر اس سے ملوں گا۔ اس سے بھی میری بہت یاری ہے۔"
"وہ کب تک واپس آئے گا؟"
"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" سمہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ایسا کر تو کچھ روز اور یہاں ٹھہر جا۔"
"میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔" رحیم داد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں وہ کب لوٹے گا۔"
"میں نے آج رات بھی جانا ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے، آج ہی رات شنکر سے ملنا ہو جائے۔"
"ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک ہے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔
"شنکر سے گل بات ہو گئی تب تو میں کل سویرے آ جاؤں گا۔" سمہ مسکرایا۔ "تیرے ہی لیے آؤں گا ورنہ میرا پروگرام تو دو روز بعد لوٹنے کا تھا۔"
"اگر تو سویرے نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ شنکر سے تیری ملاقات نہیں ہوئی۔ تو نہ لوٹا تو میں سویرے واپس چلا جاؤں گا۔"
"جیسی تیری مرضی، لیکن میں چاہتا تھا کہ تو کچھ روز ٹھہر جاتا۔"
"کیا کروں گا ٹھہر کر۔ دو روز تک تو بھی ادھر نہیں ہو گا۔ اکیلے میں دل گھبرائے گا۔ ویسے کوٹلہ ہرکشن میں مجھے کئی ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"
رفیع سمہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلد ہی اٹھ کر چلا گیا۔ رحیم داد نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔
شام کو رفیع سمہ کمرے میں آیا۔ بادل آسمان پر چھائے تھے۔ سمہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ رحیم داد نے کہا۔ "سردی بہت ہے، ہوا بھی تیز ہے۔ بارش بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے میں تو کیسے جائے گا؟"
"ایسا موسم تو اپنے کام کے لیے بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"بیٹھ کر آرام سے گل کر۔" رحیم داد اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔
"نہیں، مجھے اب جانا ہے۔ باہر جیپ تیار کھڑی ہے۔"
"تو سویرے نہیں آیا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ تو شنکر سے ملنے کے بعد میرے پنڈ آ جانا۔ میں

تیرا انتظار کروں گا۔"

رفیع سمہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "میں تیرے پاس ضرور آؤں گا۔ شنکر سے جو کچھ جمیلہ کے بارے میں پتہ چلے گا تجھے بتا دوں گا۔"

"یہ بتا' تیرے کہنے پر شنکر جلندر جا کر میرا سندیسا جمیلہ تک پہنچا سکتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شنکر سے ملنے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔"

"ایسے کام نہیں چلے گا۔" رحیم داد نے اپنے بات پر زور دیا۔ "یہ کام تو شنکر سے کرانا ہی پڑے گا۔ شنکر تیرا گہرا یار ہے۔ وہ ضرور یہ کام کر دے گا۔"

"میں کب انکار کر رہا ہوں۔ تھوڑا صبر کر۔ شنکر سے میری گل بات تو ہو جائے۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "سویرے نہ آیا تو تیرے پنڈ ضرور آؤں گا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں شنکر سے ملتے ہی تیرے پاس آؤں گا۔"

رفیع سمہ مڑا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک گیا۔ گرم جوشی سے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔

☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد رحیم داد باہر نہیں گیا' بستر پر لیٹ گیا۔ رات سنسان ہوتی گئی' تاریک اور سرد ہوتی گئی۔

ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھڑپھڑا رہی تھی۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے' کھڑکھڑا رہے تھے۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا مگر وہ سو نہیں سکا۔

آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی کی جانب مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا' البتہ دروازے پر رک رک کر آہٹ ابھر رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ دروازہ بند تھا مگر رحیم داد نے زنجیر نہیں چڑھائی تھی۔ اس نے سوچا' ڈیرے کا ملازم اکبر کسی کام سے آیا ہو گا۔ رحیم داد نے کروٹ بدل کر دروازے کی سمت دیکھا اور آواز ذرا اونچی کرتے ہوئے بولا۔

"دروازہ کھلا ہے' اندر آجا۔"

دروازے کا ایک پٹ چرچراتا ہوا دھیرے سے کھلا' کوئی جھپاک سے کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے مڑ کر جھٹ دروازہ بند کر دیا۔ اس کی پشت رحیم داد کی طرف تھی مگر وہ اکبر نہیں تھا، کوئی عورت تھی۔ وہ پلٹی تو رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا۔ وہ اس کی بیوی نوراں تھی۔ وہ دروازے سے پیٹھ ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی حیران اور گھبرائی ہوئی نظریں رحیم داد کی سمت تھیں۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور سردی سے کپکپا رہی تھی۔

رحیم داد اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس نے نوراں کو پہچان کے بھی انجان بننے کی کوشش کی۔ بے رخی سے بولا۔ "کون ہے تو؟"

"آہستہ بول۔" اس نے رسان سے کہا۔ "میں نوراں ہوں۔"

"کون نوراں؟" رحیم داد نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

نوراں نے کچھ نہ کہا۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور رحیم داد کے روبرو کچھ فاصلے پر رک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تو نوراں کو نہیں جانتا؟"

"میں کسی نوراں شوراں کو نہیں جانتا۔" رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "تو یہاں کیسے آئی؟ کس لیے آئی؟"

"تجھے ملنے آئی ہوں۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"مجھ سے!" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو تجھے جانتا بھی نہیں۔ مجھ سے تجھے کیا لینا؟"

نوراں کچھ نہ بولی۔ کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ اس کے پیروں میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ وہ نیلی دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ جھگا موٹی سفید ململ کا تھا۔ دوپٹہ ہلکا بسنتی تھا۔ وہ پھول دار کھیس اوڑھے ہوئی تھی۔ اس کا لباس دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے آج ہی کپڑے دھو کر پہنے تھے۔ سردی کے باوجود غسل بھی کیا تھا۔ آنکھوں میں کاجل اور سر میں تیل ڈالا تھا۔ اس کا چہرہ روکھا اور زردی مائل تھا۔

رحیم داد نے محسوس کیا کہ نوراں کے رخساروں کے شگفتہ پھول مرجھا گئے ہیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، جن میں کبھی ستارے جھلملاتے تھے بجھ کر ویران ہو گئی ہیں۔ اس کا چمکتا دمکتا حسن اجڑ گیا تھا۔ چنچل بولتی جوانی ڈھلک گئی تھی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئی تھی۔

رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تجھے اکبر نے میرے پاس بھیجا ہے؟"

"وہ مجھے تیرے پاس کیوں بھیجنے لگا؟" اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔ وہ

گردن جھکا کر دبی زبان سے بولی۔ "میں تو خود تیرے پاس آئی ہوں۔ کل رات بھی آئی تھی۔ پر اندر آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

"لگتا ہے پچھلی رات تو کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ تو ہی تھی ناں؟"

"ہاں، میں ہی تھی۔" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"پر تو آئی کیوں؟" رحیم داد تلخی سے بولا۔

نوراں ایک بار پھر چپ ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور رحیم داد کے چہرے کو اس طرح تکنے لگی گویا کچھ تلاش کر رہی ہو۔ رحیم داد اس کی متلاشی اور نوکیلی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ گھبرا گیا۔ سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے جھٹ گردن موڑی۔ ہاتھ بڑھایا۔ سرہانے رکھی ہوئی عینک اٹھائی اور آنکھوں پر لگا لی۔

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ اس کی نظریں بدستور رحیم داد کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں تلاش تھی، جستجو تھی۔

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہی ہے؟"

نوراں اس کے لہجے کی تلخی نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "بالکل ویسی ہی آنکھیں وہی متھا۔" وہ کچھ اس انداز سے بول رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ "پہلے داڑھی نہیں تھی۔ آنکھوں پر عینک بھی نہیں ہوتی تھی۔ گال پر چوٹ کا یہ نشان بھی نہیں تھا۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "تو کہنا کیا چاہتی ہے؟" اس کے لہجے سے پریشانی اور گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور رحیم داد کے سامنے فرش پر دونوں گھٹنے اٹھا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کے چہرے کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ نرمی سے بولی۔ "مجھے تو پتہ بھی نہ تھا۔ کریمے نے تجھے ادھر درختوں تلے دیکھا تھا۔ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میرا ہتھ پکڑ کر باہر لایا۔ تو سامنے بیٹھا تھا۔ میں اور کریما درختوں کی آڑ سے چوری چوری تجھے دیکھتے رہے۔ کریما تو تیرے پاس جانے کے لیے مچل رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا۔ پر میں نے اسے روک لیا۔"

رحیم داد نے ایک بار پھر انجان بننے کی کوشش کی۔ "یہ کریما کون ہے؟ وہی منڈا تو نہیں جو کل دن ڈھلے درختوں تلے اٹو روڑا کھیل رہا تھا۔ پر وہ تو دو تھے۔ ان میں کریما کون سا تھا؟"

"وہی تھا، جس کی آنکھیں اور ناک تیری ہی طرح ہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "وہ میرا وڈا پتر

کریم داد ہے۔ آج بھی دن بھر تجھے چھپ چھپ کر دیکھتا رہا۔ وہ تو تیرے کمرے میں آنا بھی چاہتا تھا۔ پر میں نے اسے منع کر دیا۔"

"میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔" رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔ تجھے بھی نہیں جانتا۔"

نوراں تڑپ کر بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "سچ سچ بتا تو رحیم داد ہی ہے ناں؟ میں کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گی۔"

"تیرا مغز تو نہیں فیر گیا۔" رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ "میں کسی رحیم داد سحیم داد کو نہیں جانتا۔ جانے تو کس کی گل کر رہی ہے۔"

"تو' تو کون ہے؟" نوراں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"میراں ناں چوہدری نور الٰہی ہے۔" رحیم داد نے خفگی کا اظہار کرنے کی غرض سے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "تو یہاں سے جا۔ مجھے تنگ نہ کر۔"

"نراض نہ ہو۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ کسی قدر عاجزی سے بولی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے ہی دھوکا ہوا۔ تو رحیمے کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو کادر آباد کے ٹبوں کے درمیان کتل کر دیا گیا۔"

"کون تھا وہ؟"

"وہ میرا گھر والا تھا۔" نوراں کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی چمک لہرائی۔ "مجھے بہت پیار کرتا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "آنکھوں کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ اب تو اسے مرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے۔"

"کیا کرتا تھا وہ؟" اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ کھردرا نہ تھا۔

"زمیں دار تھا۔" نوراں نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بتایا۔ "بارہ کلا سے اوپر اپنی زمین ہوتی تھی۔"

"تیری زمین داری کا کیا بنا؟"

"رحیمے کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی۔" نوراں کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "گھر بار سب کچھ اجڑ گیا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے احمد کوٹ تو دیکھا ہو گا؟"

"نہیں، میں کبھی ادھر نہیں گیا؟"

"تو رہنے والا کہاں کا ہے۔؟" نوراں نے پوچھا۔

"میں گورداسپور کا مہاجر ہوں۔ موضع نصیرپور میں میرا گھر ہوتا تھا۔ ادھر اپنی زمیں داری بھی تھی۔ فسادات میں سب کچھ جاتا رہا۔ میں بچ بچا کر پاکستان آگیا۔"

"ادھر آکر کیا کر رہا ہے؟"

"کوٹلہ ہرکشن میں میری زمیں داری ہے۔ کلیم میں چوی مربعے الاٹ ہوئے تھے۔" رحیم داد نے نوراں کو بتایا۔

"تب تو وڈا زمیں دار ہوا تو' پر اپنی زمین پر تو سیف اللہ کے بھائیوں نے زبردستی کبضہ کرلیا۔ ابھی تک ان کے پاس ہے۔"

"کیوں کبضہ کرلیا انھوں نے؟"

"سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ساتھ رحیمے کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ انھوں نے کھیتوں کی وٹ بندی کی آڑ میں ہماری زمین دبالی تھی۔ جھگڑے میں سیف اللہ زخمی ہو کر اسپتال چلا گیا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔" نوراں سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔ "سیف اللہ بعد میں اسپتال میں مر گیا۔ اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں میرے گھر کو آگ لگا دی۔ میرا چھوٹا پتر شیما اگ سے جل کر مر گیا۔ میں کریمے اور چھوٹی کڑی' زینو کو لے کر اسی رات احمد کوٹ سے نکل گئی۔ وہ تو مجھے اور میرے سارے ہی بچوں کو کتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر جمال دین نے بچالیا۔ وہ مجھے اور بچوں کو لے کر اکال گڑھ آگیا۔"

"یہ جمال دین کون ہے؟" رحیم داد ہر تفصیل نوراں کی زبانی سننے کے لیے کوشاں تھا۔

"رحیمے کا بچپن کا ساتھی رہا ہے۔ دونوں میں بہت گہری یاری تھی۔ میں اکال گڑھ میں اسی کے ساتھ رہتی تھی۔" بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی۔ "تو کبھی اکال گڑھ تو نہیں گیا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ مگر فوراً ہی اس کے دل کا چور بول اٹھا۔ "یہ بات تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟"

"میں' جن دنوں اکال گڑھ میں ہوتی تھی' ایک رات مجھے تیری ہی طرح کا ایک بندہ اپنے گھر کے اندر نظر آیا تھا۔ وہ دیوار کُد کر چوری سے آیا تھا۔"

"ہو گا کوئی۔ چوری چکاری کرنے آیا ہو گا۔"

"گھر میں دھرا ہی کیا تھا جو کوئی چوری کرنے آتا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

"تجھے سفنہ آیا ہو گا۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جمال دین بھی پہلے یہی کہتا تھا۔ پر صبح میں نے اور جمال دین نے گھر کے پچھواڑے گلی میں

پیروں کے نشان دیکھے۔ دیوار پر بھی نشان تھے اور گھر کے اندر آنگن میں بھی گھاس کے مٹھے کے پاس نشان نظر آئے۔ وہ وہیں چھپ کر بیٹھا تھا۔"

☆

رحیم داد کو یاد آگیا کہ اکال گڑھ پہنچ کر اس نے کس طرح گھر کی دیوار پھاندی' اندر گیا۔ صحن میں بے خبر سوتے ہوئے کریما اور زینو کے رخساروں اور پیشانیوں کو چوما' کوٹھری کی طرف گیا۔ دروازے کی جھری سے اندر دیکھا۔ نوراں اس وقت جمال دین کے پہلو میں لیٹی تھی۔ پھر وہ اشتعال انگیز منظر اس کی نظروں کے سامنے آگیا جب جمال دین اسے بازوؤں میں اٹھائے برآمدے میں کھڑا تھا۔ نوراں نے اپنا ایک ہاتھ پیار سے جمال دین کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ وہ گھاس کے ڈھیر کے عقب میں دبکا ہوا جمال دین اور نوراں کو دیکھ رہا تھا۔

ان یادوں کے ساتھ ہی رحیم داد کا سینہ سلگنے لگا۔ غصے اور نفرت کا اچانک ایسا شدید حملہ ہوا کہ آنکھوں سے گویا دھواں اٹھنے لگا۔ اس نے جھٹ آنکھوں پر سے عینک اتاری اور انھیں ہتھیلیوں سے ملنے لگا۔ چند لمحے تک وہ آنکھیں ملتا رہا۔

اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تیری باتیں بہت سن لیں۔ اب تو یہاں سے ٹر جا۔ مجھے نیند ملوم ہو رہی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔ نراض نہ ہو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "مجھے تھوڑی دیر اور بیٹھا رہنے دے۔"

رحیم داد کو جمال دین بھی اپنے لیے خطرہ معلوم ہوا۔ وہ اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر ایک ہی گاؤں میں پلے بڑھے تھے۔ وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ اس کا پہچان لینا بہت خطرناک ہوتا۔ وہ اس کا رقیب تھا اور اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے جمال دین کے بارے میں ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"یہاں بیٹھ کر کیا کرے گی۔ جمال دین تیرا انتظار کرتا ہوگا۔"

"جمال دین میرا کیوں انتظار کرنے لگا؟" وہ منہ بگاڑ کر نفرت سے بولی۔ "وہ تو مجھے چھوڑ کر کب کا چلا گیا۔"

"کہاں چلا گیا؟" رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔

"سنا ہے جھنگ میں ہوتا ہے۔ ادھر اس نے ویاہ بھی کر لیا۔" نوراں کے چہرے پر نفرت جھنجلاہٹ بن کر ہنوز چھائی ہوئی تھی۔

"تجھ سے اس نے نکاح شکاح نہیں کیا تھا؟" رحیم داد نے نوراں کو کریدا۔ "تجھے اس نے ایسے ہی رکھ چھوڑا تھا۔"

"کیسا نکاح؟ کہاں کا ویاہ؟ خالی لارے دیتا تھا۔ جھوٹ بولتا تھا۔ بکواس کرتا تھا۔" نوراں غصے سے پھٹ پڑی۔ "ٹھیک ہی ہوا۔ نکاح ہو جاتا تو جانے وہ کیا کرتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تجھے کیسے بتاؤں وہ کتنا برا بندہ تھا۔ اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔"

"کیا' کیا اس نے؟" رحیم داد کو جمال دین کے خلاف نوراں کی نفرت انگیز باتوں سے راحت مل رہی تھی۔

"یہ پوچھ کیا نہیں کیا اس نے۔" اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "رحیما جب جیل میں تھا میں ہر ملاکات پر احمد کوٹ سے اسے ملنے جیل جاتی تھی۔ تجھے پتہ نہیں مجھے اس سے کتنا پیار تھا۔ میں اس کے لیے کتنا روتی تھی۔"

"جب ہی تو نے جمال دین سے یاری لگالی تھی۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "اب کہتی ہے مجھے رحیمے سے بہت پیار تھا۔ میں اس کے لیے روتی تھی۔"

"تجھے پتہ نہیں جمال دین نے مجھ سے یاری لگانے کے لیے کیا چکر چلایا۔ یاری میں نے نہیں اس نے لگائی تھی۔" نوراں نے صفائی پیش کی۔ "اس نے مجھے بہکایا کہ رحیمے کی سیف اللہ کی بھین کے ساتھ یاری تھی۔ وہ اسے چھپ کر ملتا تھا۔ جھگڑا تو اصلی یہی تھا۔ زمین اور وٹ بندی کا تو بہانہ تھا۔"

"تو نے آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات مان بھی لی۔"

"میں نے اس کی بات پہلے بالکل نہیں مانی تھی۔" نوراں نے وضاحت کی۔ "فیر اس نے ایسا کیا' بنی کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔ بنی بھی رحیمے کا پرانا یار تھا۔ ہردم اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ جمال دین کے سکھانے پڑھانے پر اس نے بھی رحیمے کے بارے میں ایسی ہی باتیں کیں۔ میں دونوں کے بہکانے میں آگئی۔ مجھے رحیمے پر اتنا گصہ آیا کہ اسے ملنے جیل جانا بھی چھوڑ دیا۔"

رحیم داد نے بالکل انجان بن کر دریافت کیا۔ "رحیما جیل سے رہا ہونے کے بعد تجھے ملنے نہیں آیا؟"

"وہ جیل سے رہا ہی کب ہوا تھا۔ وہ ایک اور کیدی کے ساتھ جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ جیل سے بھاگنے کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ مل جاتا تو میں جمال دین کے ہاتھوں اس طرح برباد کیوں ہوتی۔"

"پر جمال دین نے تجھے چھوڑ کیوں دیا؟"

"وہ پکا ہڈ حرام تھا۔ کرتا دھرتا کچھ نہیں تھا۔ دن بھر گھر میں پڑا رہتا۔ شام کو نکلتا تو نشہ کر کے آتا۔ اس نے میرے سارے زیور اور کپڑے لتے بیچ ڈالے۔ جب کچھ نہ رہا تو ادھار مانگنے کے لیے پاس پڑوس میں بھیجتا۔" اس کا لہجہ افسردہ ہو تا گیا۔ "ایسے کب تک کام چلتا۔ ادھار ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ کوئی کب تک ادھار دیتا۔"

نوراں بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "فیر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ میں ادھار نہ ملنے پر خالی ہاتھ واپس آتی تو وہ ننگی ننگی گالاں نکالتا۔ مجھے زمین پر گرا کر ٹھڈے مارتا۔ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا۔ منت کرتی تب بھی نہ مانتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بچے کئی کئی وکھت بھوکے رہتے۔ بھوک سے بلبلا کر روتے تو وہ انھیں بھی مارتا۔"

"تو اسے چھوڑ کر کہیں اور چلی جاتی۔"

"سوچا تو کئی بار، پر سمجھ نہیں آتی تھی، کیا کروں۔ ایک رات ایسا ہوا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر لوٹا۔ مجھے اور بچوں کو مارا۔ اس رات اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ نشے کی دہن میں خود ہی بتانے لگا کہ رحیمے کے بارے میں اس نے اور بی نے جو کچھ کہا تھا، سب جھوٹ تھا۔ رحیمے سے تو سیف اللہ کی بہن کی نہ کبھی ملاکات ہوئی نہ گل بات۔"

"یہ ملوم ہونے کے بعد بھی تو اس کے ساتھ رہی۔"

"وہ ایسا ہوا کہ جب مجھے اصلی گل کا پتہ چلا تو بہت سُکھ آیا۔ اس رات میں نے اسے چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا۔" نوراں کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "کب تک اس کی مار کھاتی۔ اس کے جھوٹ کا بھی پتہ چل گیا تھا۔" اس نے رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "رات کو جب وہ مست ہو کر سو گیا تو میں نے بچوں کو ساتھ لیا۔ چوری سے گھر کے باہر آئی اور سورج نکلنے سے پہلے نظام اولیا پہنچ گئی۔ ادھر میری رشتے کی ایک ممیری رہتی ہے۔ میں اس کے پاس ٹھیر گئی۔"

"جمال دین کو تیرے نظام اولیا جانے کا پتہ نہ چلا؟"

"بالکل چل گیا تھا۔ وہ مجھے لینے وہاں آیا۔ منت بھی کی۔ پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ مجھے گالاں نکالتا ہوا چلا گیا۔ دوبارہ نہ آیا۔"

"تجھے یہ کیسے پتہ چلا کہ جمال دین جھنگ چلا گیا اور اس نے ادھر ویاہ بھی کر لیا؟" رحیم داد نے نوراں کو چھیڑا۔ "اس کو منانے جھنگ گئی ہو گی۔"

"توبہ کرو جی' میں اس کے پاس کیوں جانے لگی۔" نوراں جل کر بولی۔ "مجھے تو بعد میں اکال گڑھ کے نائی سے پتہ چلا تھا کہ جمال دین اپنے ایک شریکے کے پاس جھنگ چلا گیا۔ اس کے ویاہ کے بارے میں بھی اسی نے بتایا تھا۔"

"نظام اولیا سے تو یہاں کیسے آ گئی؟"

"نظام اولیا میں جب ہوتی تھی تو پڑوس میں ایک چاک رہتا تھا۔ اس کی ایک بھین رانڈ ہے۔ وہ ادھر کام کرتی ہے۔ وہی مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ تب سے میں ادھر ہوں۔ چھ مہینے سے اوپر ہو گئے ادھر آئے ہوئے۔"

رحیم داد کے دل میں جو غم و غصہ تھا' نوراں کی باتیں سن کر بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ اسے وہ ایک بے سہارا اور مظلوم عورت نظر آئی۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں جذبہ ہمدردی نے سر ابھارا۔ وہ سالہا سال تک اس کی شریک حیات رہی تھی۔ وہ ایک اچھی اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔ کھیتی باڑی کے کاموں میں برابر سے اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دن رات محنت کرتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی جو بالکل بے قصور تھے۔ اور اپنی ماں کے ساتھ غربت اور ناداری کی دن گزار رہے تھے۔

نوراں نے اسے خاموش پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے اس کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا دکھ کر غبار مٹ گیا تھا۔ وہ اب مطمئن اور پر سکون نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ سوچنے لگا' کیا وہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے؟ اس پر ظاہر کر دے کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔ مگر وہ ایسا کر نہ سکا۔ وہ نوراں پر یہ حقیقت آشکارہ کر کے خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا کہ وہ حکیم نذر محمد چشتی اور چوہدری نور الٰہی کا قاتل ہے۔ اس نے چوہدری نور الٰہی بن کر جعلی کلیم کے ذریعے کوٹلہ ہرکشن میں ڈھائی سو ایکٹر زمین اور بہت بڑی حویلی اپنے نام الاٹ کرا لی ہے۔ جمیلہ کی ساڑھے تین سو ایکٹر زمین بھی ہتھیا لی ہے۔ اب وہ علاقے کا ایک بڑا زمین دار ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر اس کا راز فاش ہو جاتا تو تباہی اور بربادی کے دروازے کھل جاتے۔ اسے جیل بھی ہو سکتی تھی۔ حکیم چشتی اور نور الٰہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ جیل اور پھانسی کا خیال آتے ہی وہ سراسیمہ ہو گیا۔

"نوراں تو اب جا۔" رحیم داد نے گھبرا کر بے رخی سے کہا۔ "رات بہت ہو گئی ہے۔ تیرے بچے انتظار کرتے ہوں گے۔"

"وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ سویرا ہونے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تو ان کی فکر نہ کر۔"

رحیم داد کو اس کے رویے سے اندازہ ہوا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے نوراں سے پیچھا چھڑانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ "میں نے تجھے پہلے ہی بتا دیا کہ میں تیرا رحیے نہیں ہوں۔ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ میں چوہدری نور الٰہی ہوں۔ گورداسپور کا مہاجر۔ مجھ سے تجھے کیا لینا۔ اب تو جا کر سو۔ بہت رات ہو گئی۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

اس نے جماہی لینے کے لیے منہ کھولا۔

مگر نوراں نہ گئی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "جانے کیوں تیرے پاس سے جانے کو دل نہیں کرتا۔ تجھے نیند آ رہی ہے تو سو جا۔ میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ کسی بھی وکھت اٹھ کر چپ چاپ چلی جاؤں گی۔"

"تو یہاں کیوں بیٹھی رہنا چاہتی ہے؟"

"تجھے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے رحیے کے پاس بیٹھی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں مجھے بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"رحیے سے تجھے بہت پیار تھا۔؟"

"ہاں جی۔" اس نے آہستہ' آہستہ سر ہلایا۔ "مجھے اس سے بہت پیار تھا۔ ایسا لگتا ہے اس کے بعد میری زندگی میں کچھ نہیں رہا۔"

"ایسا کر کسی سے نکاح کر لے۔ ابھی تو جوان ہے۔" رحیم داد نے اسے مشورہ دیا۔

"کہاں جوان رہی۔" وہ شرما گئی۔ نظریں نیچی کرتے ہوئے بولی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔ میں ایسی نہ تھی۔" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ "میں نے اب کسی سے نکاح شکاح نہیں کرنا۔ دکھ اور تنگی کے جتنے دن ہیں کسی نہ کسی طرح کاٹ لوں گی۔ میرا کریما جوان ہو گیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو اسی کے سہارے زندہ ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ نوراں بھی سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کمرے میں سکوت تھا۔ باہر درختوں تلے خشک پتے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ پت جھڑ کی رات اور کالی ہو گئی۔ ڈیرا سنسان تھا۔ سب سو گئے تھے۔ صرف نوراں اور رحیم داد جاگ رہے تھے۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر نوراں کی جانب دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سفید جھگے کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ گریبان دور تک کھلا تھا۔ لیمپ کی زرد زرد مدھم روشنی میں اس کے گورے گورے سینے کا بالائی حصہ جھلک رہا تھا۔ رحیم داد کی نظروں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔ سانس

بھی بوجھل ہو گئی۔

نوراں نے گردن اٹھائی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ نوراں کی نظریں ملیں۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ نوراں اس کی نظروں کی چمک دمک کی تاب نہ لا سکی۔ شرما گئی۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی۔ ناک میں پڑا ہوا کوکا جھلملانے لگا۔ ہونٹوں پر خفیف سی لرزش ہویدا ہوئی۔

اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ نگاہیں نیچی کیں اور فرش کو تکنے لگی۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ یادوں کی پگڈنڈیوں پر چلتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ بیتے دن چراغوں کی مانند جگمگانے لگے۔ نوراں ہنوز بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ رحیم داد کو ویسی ہی نوراں نظر آئی جو خوبصورت تھی۔ جوان تھی اور جسے تنہائی میں پا کر وہ بے قرار ہو جاتا تھا۔ وارفتہ ہو جاتا تھا۔

نوراں اس وقت بھی تنہا تھی۔ رحیم دار وارفتہ ہو گیا۔ بے قرار ہو گیا۔ خود فراموشی کے عالم میں بستر سے نیچے اترا۔ دھیرے دھیرے اس طرح نوراں کی جانب بڑھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ نوراں بدستور خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے نگاہیں نہ اٹھائیں۔ رحیم داد قریب پہنچ گیا۔ اس کی سانس تیز اور بے ترتیب تھی۔ پیروں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ نوراں کے عین مقابل جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا کبڑا سایہ دیوار پر لہرا رہا تھا۔ باہر تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھ رہی تھی ہمکنا رہی تھی۔ خشک پتے گر رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کمرے میں بوجھل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیمپ کی لو ہولے ہولے بھڑک رہی تھی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ جھکا' ہاتھ بڑھا کر نوراں کا بازو پکڑا۔ اسے آہستہ سے اٹھایا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹوٹی ہوئی ڈال کی مانند جھوم کر رحیم داد کے کندھے سے لگ گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے ہانپ رہی تھی۔

☆

باہر تیز ہوا شاخوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ خشک پتے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ کھڑکھڑا رہے تھے۔ کمرے کے اندر لیمپ کی لو ہوا کے جھونکوں سے کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ رات گزرتی رہی۔ کالی ہوتی گئی۔ رات آدھی ہو گئی' ڈھلنے لگی۔

نوراں آہستہ سے اٹھی۔ بستر سے نیچے اتری۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ نوراں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکرائی۔ آہستہ سے بولی۔ "رحیمے!"

رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ سہانا خواب دیکھتے دیکھتے چونک کر بیدار ہو چکا تھا۔ یادوں کے حصار سے باہر آ چکا تھا۔ وسوسوں اور اندیشوں نے کلبلا کر سر ابھارا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ پھانسی کا پھندا سامنے لہرانے لگا۔

رحیم داد پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ بے اعتنائی سے بولا۔ "تو مجھے بار بار رحیمے کیوں کہتی ہے؟"

"اور کیا کہوں تجھے۔؟" وہ شوخی سے کھل کر مسکرائی۔

رحیم داد کھردرے لہجے میں بولا۔ "میں رحیمے نہیں ہوں۔ تجھے دھوکا ہوا۔" اس نے نوراں سے نظریں نہ ملائیں۔

"سچ بتا تو رحیمے نہیں ہے؟" نوراں تذبذب کے عالم میں بولی۔

"میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔" رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "مجھے پتہ ہے تو رحیمے ہی ہے۔ تو کوئی اور نہیں ہو سکتا۔" اس کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔ "پہلے مجھے تیرے بارے میں شبہ تھا۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا۔ تو رحیمے ہے، بالکل رحیمے ہے۔"

"بیکار کی کڑ کڑ نہ کر۔" رحیم داد نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔

"میں تیرا رحیمے نہیں۔ چوہدری نور الٰہی ہوں۔ اب تو یہاں سے ٹر جا۔"

نوراں ہکا بکا ہو کر رحیم داد کا منہ تکنے لگی۔

رحیم داد مڑا۔ تکیے کے نیچے رکھا ہوا چمڑے کا بٹوہ نکالا۔ اسے کھولا۔ سو روپے کا ایک نوٹ نکالا نوراں کی جانب پلٹا۔ اور سو روپے کا نوٹ سرہانے کھڑی نوراں کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ "لے اسے رکھ لے۔ جا موجاں کر۔" اس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر مسکرانے کی کوشش کی۔ "کسی نے ایک رات کے لیے اتنے روپے نہیں دیے ہوں گے۔"

نوراں ہاتھ میں نوٹ تھامے چند لمحے مبہوت کھڑی رہی۔ پھر وہ چونکی۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے نوٹ انگلیوں میں بھینچ کر مسلا۔ رحیم داد کے منہ پر مارا۔ تڑپ کر بولی۔ "اسے اپنے ہی پاس رکھ۔ میں کنجری نہیں ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو، ستارے بن کر جھلملانے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

اس کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ مگر

کچھ بولا نہیں۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر روتی بلکتی نوراں کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

نوراں کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ اس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے۔ اس کا چہرہ مرجھا کر پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ وہ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر مڑی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے کھولا اور باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ بستر سے نیچے اترا۔ دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ واپس آیا۔ دیکھا 'لیمپ کی دھندلی دھندلی روشنی میں سو روپے کا مڑا تڑا نوٹ بستر کی سلوٹوں کی درمیان پڑا ہے۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے نوٹ کو تکتا رہا۔ پھر وہ جھکا۔ نوٹ اٹھایا اور بٹوے میں رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ پت جھڑ کی ویران رات نڈھال کھڑی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ گر رہے تھے۔ اڑ اڑ کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔

رحیم داد بستر پر دراز ہو گیا۔ خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بے قرار ہو کر کروٹ بدلی۔ دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا اب نوراں کبھی اس کے پاس نہ آئے گی۔ وہ اپنے بیٹے کریم داد اور بھولی بھالی بیٹی زینو کو سینے سے لگا کر پیار نہ کر سکے گا۔ اس کے اور بیوی بچوں کے درمیان چوہدری نور الٰہی دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا۔ یہ دیوار اس نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی۔ مضبوط اور اونچی کی تھی۔ اب وہ اسے گرا نہ سکتا تھا۔ گراتا تو خود اس کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جاتا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ یادوں کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتا رہا۔ بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ تھک کر نڈھال ہو گیا۔ گہری نیند سو گیا۔

ملی جلی آوازوں کے ہلکے ہلکے شور سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ آوازیں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب سے ابھر رہی تھی۔ سردی اس وقت بھی اچھی خاصی تھی۔ رحیم داد بستر سے نیچے اترا۔ اونی دوہر اوڑھی۔ دروازہ کھولا۔ باہر نکلا۔ صبح ہو چکی تھی۔ مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے تھے۔ روشنی دھندلی تھی۔ احاطے میں ہو کا عالم تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس جانب بڑھا جدھر سے شور اٹھ رہا تھا۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے اکبر نمودار ہوا۔ رحیم داد ٹھہر گیا۔ اکبر قریب آکر بولا۔ "خیر اے سیں 'خوش ہو' راضی ہو۔"

"زمیں دار واپس آگیا؟" رحیم داد نے رفیع سمہ کے بارے میں دریافت کیا۔ "نا سیں' وہ ابھی

نہیں آیا۔"

"یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟" رحیم داد نے نوکروں کی کوٹھریوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"سیئں بہت برا ہو گیا۔" اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ رحیم داد خاموش رہا۔ اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ "وہ نوراں تھی ناں۔ ادھر نوکرانی لگی تھی۔" اکبر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رات جانے اسے کیا ہوا۔ اُس کے ایک نکا تھا اور ایک نکی۔ دونوں کا اس نے تیز کاتی سے گلا کاٹ ڈالا۔ اپنے کپڑوں پر تیل چھڑکا اور آگ لگا لی۔"

رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا۔ ہوا میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی ہے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ اس نے سنا۔ اکبر کہہ رہا تھا۔

"نوراں نے اندر سے در بند کر رکھا تھا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ چیخی چلائی بھی نہیں۔ چپ چاپ جلتی رہی۔ پاس کی کوٹھڑی میں رستم رہتا ہے۔ گوشت جلنے کی بو سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وکھت اندھارا تھا۔ سردی بھی بہت تھی۔ وہ باہر نکلا۔ نوراں کی کوٹھڑی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے در کھولنے کی کوشش کی، پر کھلا نہیں۔ تب رستم نے شور کیا۔ پاس پڑوس کے سارے ہی نوکر اور بانمے اکٹھے ہو گئے۔ دروازہ توڑ کر اندر گھسے تو دھواں اتنا بھرا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔"

"اب نوراں کیسی ہے؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"سیئں، اس کا تو مرن ہو گیا۔ جب میں پہنچا تو سسک رہی تھی۔" اکبر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "سیئں لگتا ہے اس پر آسیب تھا۔ جن کا اثر تھا۔ تب ہی اس نے ایسا کیا۔ بہت دکھ کی گالہہ ہے۔" اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "وہ بری ذال نہیں تھی۔ بہت دکھیاری تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔"

رحیم داد بے قرار ہو کر بولا۔ "میرے ساتھ چل۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ نوراں اور اپنے دونوں بچوں کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر اکبر نے اسے روک دیا۔ "نا سیئں، تو ادھر نہ جا۔ کیا کرے گا اسے دیکھ کر۔ جل کر اس کا منہ ایسا بگڑ گیا ہے کہ دیکھنے سے دل گھبراتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ تو وہاں نہ جا۔ ویسے بھی تجھے اس سے کیا لینا۔"

رحیم داد نے نوراں کی کوٹھری کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں واپس گیا۔

اکبر نے ناشتا لگا دیا۔ مگر رحیم داد نے کچھ نہ کھایا۔ کھایا ہی نہ گیا۔ بہت اداس اور دل گرفتہ تھا۔

اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔ سامان جیپ میں رکھوایا اور اس میں بیٹھ کر کوٹلہ ہرکشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

کوٹلہ ہرکش پہنچنے کے بعد بھی اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ وہ شام ہی سے پینے بیٹھ گیا۔ اور غم غلط کرنے کے لیے رات گئے تک شغل بادہ نوشی کرتا رہا۔ وہ رات اس نے بہت کرب اور بے چینی میں گزاری۔ اس کی کتنی ہی راتیں اسی بے چینی اور ذہنی اذیت میں کٹیں۔

☆

ایک روز دوپہر کو رفیع سمہ اچانک رحیم داد کے پاس پہنچ گیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

"شنکر سے مل نہ سکا تھا۔ اسے ملے اور گل بات کیے بغیر تیرے پاس آ کر کیا کرتا۔"

"شنکر تجھے کیوں نہیں ملا؟"

"وہ مجھے پرسوں ملا۔ ہوشیار پور سے بہت دیر بعد فانکا آیا تھا۔ ہوشیار پور میں اپنے کسی شریکے کے ویاہ میں پھنسا رہا۔ تب ہی دیر سے لوٹا۔" رفیع سمہ نے وضاحت کی۔

"جمیلہ کے بارے میں اس سے گل بات تو ہوئی ہو گی؟"

"اس کے بارے میں دیر تک بات ہوتی رہی۔"

رحیم داد نے اپنی بے قراری چھپانے کی کوشش نہ کی' پوچھا۔ "کیا کہتا تھا وہ؟"

رفیع نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد اس کی پراسرار خاموشی سے پریشان ہو گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو چپ کیوں ہو گیا؟ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

رفیع نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "چوہدری' میرا کہنا مان۔ جمیلہ کا دھیان اب چھوڑ دے۔"

"کیوں؟" رحیم داد تڑپ کر بولا۔ "تو ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟"

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کے پاس سندیسا شندیسا پہنچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔"

رحیم داد کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "صاف صاف بتا۔ شنکر کیا کہتا تھا؟"

"کیا کرے گا جان کر۔ تجھے دکھ ہی ہو گا۔"

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ "وہ زندہ تو ہے یا؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بے تابی سے

سمہ کا چہرہ سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔

"وہ زندہ ہے۔ بالکل چنگی ہے۔ پر تو نے ایسا کیوں سوچا؟"

رحیم داد کو معاً نوراں یاد آ گئی۔ مگر اس نے نوراں کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا۔ "تو بات اس طرح کر رہا ہے' میں سمجھا اس نے کہیں خود کشی تو نہیں کر لی۔"

"وہ خود کشی کیوں کرنے لگی؟" رفیع نے مسکرا کر کہا۔

رحیم داد کو اس کا مسکرانا اور چبا چبا کر بات کرنا پسند نہ آیا۔ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔ شنکر سے تیری کیا گل بات ہوئی؟ میں یہی جاننے کے لیے تیرا انتظار کر رہا تھا' اور تو گھما پھرا کر بات کر رہا ہے۔ صاف اور پوری بات بتا نا نہیں۔"

"صبر سے کام لے۔" رفیع سمہ کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ "صاف بات یہ کہ جمیلہ نے پچھلے مہینے جلندر میں ویاہ کر لیا۔ اب وہ اپنے گھر والے کے ساتھ رہتی ہے۔"

رحیم داد کا چہرہ اتر گیا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا کرتا ہے وہ؟" اس کی آواز حلق سے اس طرح نکل رہی تھی جیسے کہیں دور سے بول رہا ہو۔

"شنکر بتاتا تھا' ہے تو وہ ڈاکٹر پر دونوں آنکھوں سے اندھا ہے اور سکھ ہے۔"

"جمیلہ نے اس اندھے ڈاکٹر سے کیوں ویاہ کیا؟" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔

"اندھا اور وہ بھی سکھ۔ اسے کوئی ہندو ویاہ کرنے کو نہیں ملا۔"

"یہ تو جمیلہ ہی بتا سکتی ہے' اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں کیا بتا سکتا ہوں۔" رفیع سمہ کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "مجھے تو صرف یہ پتہ ہے کہ وہ اندھا ہے' سکھ ہے اور شرنارتھی ہے۔ فسادات ہوئے تو وہ پنڈی میں ہوتا تھا۔ شنکر کہتا تھا' رات کے اندھیرے میں اس کے مکان پر حملہ ہوا۔ اس کی جوان گھر والی اور دو بھینوں کو مسلمان بلوائی اٹھا لے گئے۔ ایک پتر بھی تھا' اسے خاندان کے دوسرے بندوں کے ساتھ حملہ کرنے والوں نے مار دیا۔"

"وہ تو بچ گیا تھا ناں؟"

"ہاں وہ بچ گیا۔" رفیع سمہ اس کے احمقانہ سوال پر مسکرانے لگا۔ "یار تو بھی کمال کرتا ہے۔ بچ نہ جاتا تو اب تک زندہ کیسے ہوتا۔ پر حملے میں وہ بھی گھائل ہو گیا تھا۔ سر پر ایسی زبردست چوٹ آئی کہ دونوں آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ کسی نہ کسی طرح سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جتھے کے ساتھ سرحد پار پہنچ گیا۔ لیکن بالکل اکیلا تھا۔ اس کا کوئی بھی نہ بچا۔"

"جمیلہ کے بھائیوں نے اس کے ساتھ ویاہ کرنے پر برا نہیں منایا؟"

"ہردیال تو سخت ناراض ہوا تھا۔" رفیع سمہ نے جواب دیا۔ "شنکر بتاتا تھا' ڈاکٹر کی جمیلہ کے بھرا ایشور دیال سے یاری تھی۔ اس کے گھر پر جمیلہ کا ڈاکٹر کے ساتھ میل ملاپ بڑھا۔ پر جمیلہ نے جب اندھے سکھ ڈاکٹر سے ویاہ کرنا چاہا تو ایشور دیال نے بھی مخالفت کی۔ جمیلہ کو منع کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ بہت ضدی ہے۔ ڈاکٹر سے ویاہ کرنے پر اس طرح اڑ گئی کہ ایشور دیال بھی راضی ہو گیا۔"

"تو گویا جمیلہ اب جلندر میں سکھ ڈاکٹر کے ساتھ رہتی ہے۔"

"نہیں ویاہ کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی گھر والے کے ساتھ چندی گڑھ چلی گئی۔" رفیع سمہ نے مطلع کیا۔ "اب وہ چندی گڑ میں ہوتی ہے۔ شنکر جمیلہ سے ملا تھا۔ کہتا تھا وہ ڈاکٹر کے ساتھ بہت خوش ہے۔ آرام سے ہے۔"

"یار حد ہو گئی۔" رحیم داد جل کر بولا۔ "اندھے کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔" سمہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ "میں نے تو نہ جمیلہ کو دیکھا نہ اس کے اندھے خصم کو۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تیرا اور جمیلہ کا بہت دنوں ساتھ رہا ہے۔ وہ تیری گھر والی رہ چکی ہے۔ تجھے اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو شنکر سے جو کچھ سنا' تجھے بتا دیا۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔" رحیم داد نے بے بسی سے اظہار خیال کیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس پر کوئی رد عمل نہ تھا۔ کوئی واضح تاثر نہ تھا۔

"میں کہتا ہوں تو جمیلہ کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ تجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاتی۔" رفیع سمہ کے چہرے سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ "ساری باتیں سن کر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ پیار کی بھوکی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی جو تو اسے دے نہ سکا۔ ڈاکٹر اندھا ہے تو کیا ہوا' جمیلہ کو اس میں دونوں ہی چیزیں مل گئیں۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "چوہدری' برا نہ منانا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور سمجھا تجھے صاف صاف بتا دیا۔ اب تجھے یہ بھی بتا دوں کہ تو اس کی واپسی کا دھیان' بالکل چھوڑ دے۔ وہ ہرگز تیرے پاس نہیں آئے گی۔"

"یہ بات تجھے شنکر نے بتائی تھی؟" رحیم داد نے اپنے ڈوبتے دل کو ڈھارس دینے کی کوشش کی۔

"نہیں' میں نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا۔" رفیع سمہ نے وضاحت کی۔ "ہاں' شنکر نے مجھے یہ ضرور بتایا کہ وہ ابھی تک اللہ وسایا کو نہیں بھولی۔ پر تجھے اچھا بندہ نہیں سمجھتی۔ میں تجھے زیادہ بتانا نہیں چاہتا۔ یوں سمجھ لے وہ تیرے پاس واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اور یہ بھی سمجھ لے کہ اندھے ڈاکٹر سے اس نے سوچ سمجھ کر ویاہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے

کا سہارا ہیں۔ ایک دوسرے کو پاکر بہت خوش ہیں۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "شنکر بتا تا تھا دونوں لٹے پٹے شرنارتھیوں کے لیے خیراتی اسپتال کھولنا چاہتے ہیں۔ ان پر ان دنوں اس کی دھن سوار ہے۔"

رحیم داد کو رفیع سمہ کا رویہ پسند نہ آیا۔ اس کے زخم خوردہ احساس کو ٹھیس پہنچی۔ مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ مضمحل اور مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اجڑا اجڑا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔

رفیع سمہ نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کی دل جوئی کی۔ "ویسے مجھے پتہ ہے تجھے دکھ پہنچا ہے۔ تو کہہ تو آگے کے لیے سوچا جائے۔ میں تیری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ پر میں تجھ سے کہوں گا۔"

رحیم داد نے اسے پوری بات کہنے نہ دی۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ مجھے اب جمیلہ کو بھول جانا چاہیے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔"

رفیع سمہ نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ "شاہ جی سے تو نہیں ملنا ہوا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ "پچھلی بار تیرے ساتھ ہی آیا تھا۔ تب سے نہیں ملا۔ وہ آج کل طرح طرح کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔"

"میں چند روز بعد لہور جاؤں گا۔ شاہ جی سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"شاہ جی سے کہنا، چوہدری تجھے بہت یاد کرتا ہے۔"

رفیع سمہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عجلت میں تھا۔ رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ دو چار روز اس کے ساتھ قیام کرے۔ مگر سمہ رضامند نہ ہوا۔ وہ اپنی جیپ میں آیا تھا۔ اس میں سوار ہوا۔ دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ جیپ آگے بڑھی اور دھول کے بادل اڑاتی تیزی سے دوڑنے لگی۔

رفیع سمہ کو رخصت کرنے کے بعد رحیم داد اور دل گرفتہ ہو گیا۔ وہ نڈھال اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔

۳۸

ربیع کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ تیز ہوائیں چلتیں تو گندم اور جو کے پودے جھولتے۔ لہلہاتی فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ اس بار فصل کچھ زیادہ ہی اچھی تھی۔ کسانوں کے چہرے خوشی سے دمکتے تھے۔

رحیم داد نے فصل کی کٹائی میں خلاف معمول زیادہ ہی دلچسپی لی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس نے پے در پے جو صدمے اٹھائے تھے ان کی اذیت اور کرب سے فرار حاصل کرنے کا اسے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ زمیں داری کے کاموں میں خود کو مصروف رکھے۔

فصل کی کٹائی ہو گئی۔ بٹائی بھی خوش اسلوبی سے ہو گئی۔ رحیم داد خریف کی بوائی کی تیار کر رہا تھا کہ ایک صبح احسان علی شاہ کا ملازم شیدا اس کے پاس آیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو پیراں والہ بلایا تھا۔

دن ڈھلے رحیم داد نے جیپ نکلوائی اور اس میں بیٹھ کر پیراں والہ پہنچ گیا۔ احسان علی شاہ اپنی حویلی کے پھاٹک ہی پر مل گیا۔ حسب معمول اس نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ گلے سے لگا کر دل جوئی کی باتیں کیں۔ "معاف کرنا چوہدری' میں ان دنوں ایسا پھنسا ہوا ہوں کہ کوشش کے باوجود تجھے اب تک نہ مل سکا۔"

رحیم داد خوش ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ بتا' آج تو نے کیسے بلایا۔ کوئی خاص گل بات ہے؟"

"خاص ہی سمجھ لے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "میں نے زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ آج ہی لہور جانا

ہے۔"

"ایسا تھا تو مجھے بلایا ہی کیوں؟" رحیم داد نے گلہ کیا۔ "میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تیرے ساتھ چند روز ٹھیروں گا۔ بہت دن ہو گئے تجھے ملے ہوئے۔ بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ مشورے لینے تھے۔"

"باتیں بھی ہوں گی اور آرام سے ہوں گی۔" احسان شاہ بے تکلفی سے ہنسا۔ "تو ایسا کر اتوار کی شام کو میرے پاس لہور پہنچ جا۔ تیرے ڈرائیور نے میری کوٹھی دیکھ رکھی ہے۔ آرام سے پہنچ جائے گا۔ وہیں ساری باتیں کر لینا۔ اب تو میں نے جانا ہے۔"

"ادھر بیٹھ کر گل بات نہیں ہو سکتی۔" رحیم داد اس کے ساتھ بیٹھ کر شغل بادہ نوشی کرنا چاہتا تھا۔ دل بہلانا چاہتا تھا۔

"نہیں۔" احسان شاہ رضامند نہ ہوا۔ "میں نے تجھے لہور میں محکمہ بحالیات کے ایک افسر سے ملانا ہے۔ اس کا ایک کام مجھ سے اٹکا ہوا ہے۔ متروکہ جائیداد کے ایک اونچے فراڈ میں پھنس گیا ہے۔ نوکری جانے کے ساتھ جیل کاٹنے کا بھی خطرہ ہے۔ وہ چاہتا ہے میں گورنر سے سفارش کر کے معاملہ دبوا دوں۔ گورنر میری بات مان لے گا۔ اسے بھی آج کل میری ضرورت ہے۔"

"پر میں نے بحالیات اور آبادکاری کے افسر سے کیا لینا۔" رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

"تیرے پاس جو کلیم ہے وہ کس لیے ہے؟" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو نے اسے کیڑوں کو کھلانے کے لیے رکھ چھوڑا ہے؟" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جو کچھ الاٹ کرانا ہے ابھی الاٹ کرا لے۔ بعد میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ کلیم کی دستاویزات پڑی پڑی سڑ جائیں گی۔ تو اکیلا کلیم ہولڈر نہیں۔ نہ جانے کتنے ہیں جو کلیم کے کاغذات دبائے الاٹمنٹ کے چکر میں سرکاری دفتروں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ سفارش بھی پہنچا رہے ہیں۔ رشوت بھی کھلا رہے ہیں۔ پر الاٹمنٹ آسانی سے نہیں ملتی۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ "میں نے بھی الاٹمنٹ کے لیے بہت چکر کاٹے ہیں۔ تجھے یہ پتہ نہیں۔"

"مجھے پتہ ہے۔ اچھا اب کام کی گل سن۔ لائل پور میں دس ایکڑ کے لگ بھگ شہری متروکہ اراضی ہے۔ کوشش کی جائے تو تیرے کلیم میں الاٹ ہو سکتی ہے۔"

"میں اس کی الاٹمنٹ لے کر کیا کروں گا؟" رحیم داد نے دبی زبان سے انکار کیا۔ وہ الاٹمنٹ

کے چکر میں پڑنا نہ چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں اس کے کلیم کی جعل سازی کا راز افشا نہ ہو جائے اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

"اس پر ٹیکسٹائل مل لگے گی۔" احسان شاہ نے اس کی عدم دلچسپی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟" رحیم داد نے ایک بار پھر کنی کاٹنے کی کوشش کی۔ "مل تو لاکھوں میں لگتی ہے۔ اس کے لیے حکومت سے پرمٹ اور لائسنس بھی لینا پڑتا ہے۔"

"تو ان باتوں کی فکر نہ کر۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔" احسان شاہ نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا۔ "بینک سے قرضہ مل جائے گا۔ مجھے جلد ہی کراچی بھی جانا ہے۔ پرمٹ اور لائسنس بھی نکلوالوں گا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "یہ تیرے سوچنے کی گل بات نہیں۔ میں سب بندوبست کر لوں گا۔ تو اکیلا نہیں ہو گا۔ میں بھی تیرے ساتھ شریک رہوں گا۔ کمپنی بنانی ہو گی۔ اسے رجسٹر کرانا ہو گا۔"

"مجھے تو جی صاف بات یہ ہے کہ کچھ پتہ نہیں۔"

"سب پتہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا نا کہ میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو خواہ مخواہ کی باتیں نہ سوچ۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے مزید الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "تو جیسا کہے گا میں نے وہی کرنا ہے۔"

"مل لگانے کے لیے اپنے پاس زمین ضرور ہونی چاہیے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے ساری سکیم سوچ رکھی ہے۔ تجھے صرف اتنا کرنا ہے کہ کلیم کے کاغذات لے کر اتوار کو لہور پہنچ جا۔ آگے کیا کرنا ہے' یہ تجھے نہیں سوچنا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔

احسان شاہ لاہور چلا گیا۔ رحیم داد واپس کوٹلہ ہرکشن آگیا۔

☆

اتوار کو رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا۔ حفاظت سے سوٹ کیس میں رکھا۔ اسے لے کر جیپ میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ جیپ سڑکوں پر دوڑتی آگے بڑھی۔ ملتان روڈ پر پہنچتے ہی ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔

مگر جیپ پتوکی کے نواح میں پہنچی تو ایک ٹائر میں پنکچر ہو گیا۔ ڈرائیور نے جیپ روک لی۔ جیک لگایا اور پہیہ اتارنے لگا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ ضیالی پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد جیپ سے اترا

اور ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

اسے کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر درختوں کی آڑ سے ایک عورت اور مرد نکل کر سامنے آگئے۔ رحیم داد نے دونوں کو دیکھا۔ اس نے مرد کو فوراً پہچان لیا۔ وہ لالی تھا۔ اس کے ہمراہ شاداں تھی۔ رحیم داد انھیں دیکھتے ہی سخت پریشان ہو گیا۔ دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا۔ اور سڑک کی سمت دیکھنے لگا۔

ملتان روڈ پر کاریں، بسیں اور دوسری گاڑیاں شور مچاتی ہوئی تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے رحیم داد کی جیپ کھڑی تھی۔ ڈرائیور پہیہ اتار کر اسٹپنی چڑھانے میں مصروف تھا۔ رحیم داد درخت کے نیچے گم صم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر ایک ہی حالت میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گردن موڑی۔ اچٹتی نظروں سے دیکھا۔ لالی کچے راستے سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رحیم دا کی جانب بڑھ رہے تھے۔

رحیم داد نے جھٹ نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیوں کو تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھبراہٹ میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ لالی کے سامنے آتے ہوئے کترا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر لالی کی تیز اور عقابی نظروں نے اسے پہچان لیا تو وہ اس کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا ہے۔ رحیم داد سے چوہدری نور الٰہی بن جانے کے بعد وہ خود کو ایسا سربستہ راز سمجھتا تھا جس میں کسی کو شامل کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس معاملے میں وہ کسی کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اسی رازداری کے باعث نوراں اور اس کے دونوں بچے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گئے۔ لالی پر تو اسے مطلق اعتماد نہ تھا۔ وہ عادی مجرم اور سزا یافتہ تھا۔

رحیم داد کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پگڑی کے شملے سے چہرہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ عقب میں قدموں کی آہٹ سنی۔ چاپ دم بدم بڑھتی گئی۔ لالی اور شاداں قریب آرہے تھے۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر جیپ کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور زمین پر اکڑوں بیٹھا ہاتھ میں پانا سنبھالے پہیے کے نٹ بولٹ کس رہا تھا۔ رحیم داد نے قدم اٹھائے اور جیپ کی سمت بڑھا۔

قریب پہنچ کر اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "عابد، ابھی کتنی دیر اور لگے گی؟"

"اب بالکل دیری نہیں ہوگی جی۔ سارا کام ختم ہو گیا۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد ڈرائیور بھی اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر

اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر جیپ میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ اسے شاداں نظر آئی۔ لالی اس کے پیچھے تھا۔ وہ لمبے کرتے کے نیچے سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ پہلے سے کچھ تگڑا بھی ہو گیا تھا۔ سر برہنہ تھا۔ بالوں میں پڑا ہوا تیل دھوپ میں خوب چمک رہا تھا۔ شاداں بھی اجلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔

رحیم داد پیٹھ موڑے چپ چاپ بیٹھا تھا اور آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ دونوں رفتہ رفتہ جیپ کے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ شاداں کی نگاہیں جیپ ہی کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اور قدموں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

رحیم داد سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "عابد! گڈی سٹارٹ کر۔"

ڈرائیور نے فوراً انجن اسٹارٹ کر دیا۔ انجن کی گڑگڑاہٹ میں قریب سے شاداں کی آواز ابھری۔ "چوہدری گل سن۔ گڈی روک لے۔ میری گل سن لے۔"

مگر رحیم داد نے اس کی ایک نہ سنی۔ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ ایک ہاتھ سے پگڑی کا اونچا طرہ درست کیا۔ اور گردن اکڑائے خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے کلچ دبا کر گاڑی گیئر میں ڈالی۔ ایکسیلیٹر پر پیر رکھا۔ جیپ تیزی سے آگے بڑھی۔ رحیم داد نگاہیں اٹھائے سامنے دیکھتا رہا۔ آگے جا کر اس نے درختوں کی اوٹ سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ شاداں ابھی تک جیپ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے برابر لالی کھڑا تھا۔ دور سے دونوں سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

جیپ فراٹے بھرتی لاہور کی سمت دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ اسی ذہنی خلفشار کے عالم میں وہ احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔

☆

یہ ایک گرم اور بے رونق شام تھی۔ ہوا دم بخود تھی۔ ہر طرف امس اور گھٹن تھی۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فضا میں گھل کر کالا پڑتا جا رہا تھا۔ احسان شاہ کوٹھی کے وسیع سبزہ زار کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا تھا۔

وہ اپنے شام کے معمولات میں مگن تھا۔ سامنے میز پر جن کی بوتل رکھی تھی۔ ایک بڑے کٹورے میں برف کے ٹکڑے بھرے تھے۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گلاس ہونٹوں سے لگاتا اور جن کے گھونٹ بھرتا۔ قریب ہی لکڑی کا اسٹول تھا۔ اس پر رکھا ہوا بجلی کا پنکھا تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "چوہدری' تو نے پہنچنے میں دیر کر دی۔"

"کیا ہو گیا شاہ جی؟" رحیم داد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کسی قدر حیرت سے بولا۔

"ہونا ہوانا کیا تھا۔ پر تو کچھ دیر پہلے آجاتا تو چیمہ سے تیری ملاقات ہو جاتی۔"

"یہ چیمہ کون ہے جی؟" رحیم داد اور حیرت زدہ ہو گیا۔

"چیمہ محکمہ بحالیات کا وہی افسر ہے جس سے تیرے کلیم پر لائل پور میں زمین الاٹ کرانی ہے۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس آگیا تھا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اس نے تیرا بھی انتظار کیا۔ اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ اسے گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے۔"

"اب وہ کب ملے گا؟"

"مل جائے گا' فکر نہ کر۔" احسان شاہ نے اس کی تشویش فرو کرنے کی کوشش کی۔ "یہ بتا' کلیم کے کاغذات تو ساتھ لے کر آیا ہے نا؟"

"بالکل لے کر آیا ہوں۔" رحیم داد نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "دیکھنے ہیں تو دیکھ لے۔"

"مجھے ان سے کیا لینا۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ "سویرے مہربان علی تیرے پاس آجائے گا۔ اسے کاغذات دے دینا۔ وہ ان کی مدد سے الاٹمنٹ کے لیے درخواست تیار کر دے گا۔ تو اس پر دستخط لگا دینا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ احسان شاہ نے میز پر رکھا ہوا خالی گلاس رحیم داد کی جانب سرکا دیا۔ "اپنے لیے خود ہی پیگ بنا لے۔" رحیم داد نے بوتل کھول کر جن انڈیلی۔ پیگ تیار کیا۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ ایک بڑا گھونٹ بھر کر بولا۔

"شاہ جی تو نے وہسکی پینی چھوڑ دی؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل نہیں۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "وہسکی آج کل گرمی بہت کرتی ہے۔ گرمی کا موسم ہے نا۔ میرے پاس ان دنوں جن ہی چل رہی ہے۔" اس نے جن کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ "تیرے لیے رم منگوا دوں۔ پچھلے دنوں سرحد پار سے چھ بوتلیں آئی ہیں۔ جی چاہے تو بیئر پی لے۔ وہ بھی موجود ہے۔"

"نہیں' میرے لیے جن ہی ٹھیک ہے۔ جو تو پیئے گا وہی میں بھی لگاؤں گا۔"

احسان شاہ نے پھر چیمہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ "چیمہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔"
"کسی لے چکر میں پھنس گیا؟"
"تجھے تو پتہ ہی ہے۔ جعلی طور بوگس الاٹمنٹوں کا دھندا کتنی زور شور سے چل رہا ہے۔ بحالیات اور آباد کاری کے سارے ہی چھوٹے وڈے افسر دبا کے رشوت کھا رہے ہیں۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "پر آپس میں لگتی بھی ہے۔ کسی نے اوپر شکایت لگا دی۔ اس پر چیمہ کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی۔ معطل ہو جاتا۔ پر ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ سچ پوچھ تو کوئی سخت کارروائی ابھی ہوئی نہیں۔ ویسے معاملہ پے چیدہ اور سنگین ہے۔ چیمہ خود بتاتا تھا' نوکری بھی چلی جائے گی اور جیل بھی ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔"
"میں نے تو جی کسی وڈے سرکاری افسر کو جیل جاتے دیکھا نہیں۔" رحیم داد نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ "شروع شروع میں بہت شور مچتا ہے۔ بعد میں سارا معاملہ اس طرح چپ کر کے دبا دیا جاتا ہے کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔
"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے' پر چیمہ کا معاملہ زیادہ ہی سنگین لگتا ہے۔ بات بہت دور تک جا پہنچی ہے۔ سنا ہے خود وزیر آباد کاری نے چیمہ کے خلاف انکوائری کا حکم دیا ہے۔"
"تو کیا سچ مچ چیمہ کو جیل ہو جائے گی؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"ہونی تو نہیں چاہیے۔" احسان شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں پرسوں گورنر سے مل رہا ہوں۔ اس سے چیمہ کے بارے میں بات کروں گا۔ اس کے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکانے پر ساری انکوائری شنکوائری ختم ہو جائے گی۔ چوہدری' وہ آج کل بہت تکڑا جا رہا ہے۔ وزیر بحالیات کیا اس کی بات تو وزیر اعلیٰ بھی نہیں ٹال سکتا۔"
"ایسا کر شاہ جی' پہلے الاٹمنٹ کرا لے۔ اس کے بعد گورنر سے چیمہ کے بارے میں سفارش کرنا۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔
"تو الاٹمنٹ کی فکر نہ کر۔ وہ تو چیمہ کو کرنا ہی پڑے گی۔ اسے ٹھیک طرح پتہ ہے گورنر سے میرے کیسے مراسم ہیں۔ چیمہ میرے ہاتھ سے نکل کر جائے گا کہاں؟" احسان شان نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "کوئی گڑبڑ کی تو دوبارہ انکوائری شروع کرا دوں گا۔"
"تو فیر مجھے چیمہ سے مل کر کیا لینا۔ کام تو وہ کر ہی دے گا۔"
"جیسی تیری مرضی۔ پر میں اتنا ضرور کہوں گا سرکاری افسروں سے تجھے میل ملاپ رکھنا

چاہیے۔ زمین داری چلانے کے لیے ایسی یاری دوستی بہت ضروری ہے۔" احسان شاہ نے نشے کی جھونک میں قہقہہ لگایا۔ "چوہدری، سچ پوچھ تو دونوں ہی کے لیے یہ ضروری ہے۔ افسر اگر زمین داروں کے کام آتے ہیں تو زمین دار بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ انھیں پروموشن دلواتے ہیں۔ ان کے تبادلے رکواتے ہیں۔ کسی چکر میں پھنس جائیں تو چھڑوا دیتے ہیں۔ اب یہ چیمہ ہی کا معاملہ دیکھ لے۔ اسے انکوائری سے بچنے کے لیے میری ضرورت ہے۔ اور مجھے زمین الاٹ کرانے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔"

"تیرا مطلب ہے، حکومت، افسر اور زمیں دار مل کر چلاتے ہیں۔ یہی کہنا چاہتا ہے ناں؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں چیمہ سے تیری ملاقات ہو جاتی۔ آگے بھی اس سے کام پڑ سکتا ہے۔ سرکاری افسروں سے ضرور میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ پتہ نہیں کل کون کیا بن جائے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "تجھے پتہ ہے، چوہدری محمد علی، وزیر اعظم ہونے سے پہلے سرکاری افسر ہوتا تھا۔ لیاقت علی خان جب وزیر اعظم ہوتا تھا تو چوہدری محمد علی سرکاری افسر لگا ہوا تھا۔ لیاقت علی خان کا پنڈی میں کتل ہوا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلاتا۔ ان دنوں اسمبلی میں مسلم لیگ سب سے وڈی پارٹی ہوتی تھی۔ گورنر جنرل اس کے لیڈر سے حکومت بنانے کو کہتا۔ پر ایسا نہ ہوا۔ چوہدری محمد علی نے اپنے بنگلے پر گورنر جنرل اور سارے وزیروں کو اکٹھا کیا۔ ناظم الدین کو وزیر اعظم لگایا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل اور خود مرکزی وزیر خزانہ بن گیا۔ نہ وہ اسمبلی کا ممبر تھا نہ مسلم لیگ کا۔"

"پر وہ کیسے وزیر بن گیا؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ افسروں کا افسر سیکریٹری جنرل جو تھا۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "غلام محمد بھی وزیر خزانہ بننے سے پہلے سرکاری افسر ہوتا تھا۔ وہ اتنا زور آور ہوتا تھا کہ اس نے وزیر اعظم ناظم الدین کو برطرف کر دیا۔ ناظم الدین نے ملکہ الزبتھ سے مدد مانگنی چاہی پر غلام محمد نے اس کے اور دوسرے وزیروں کے ٹیلی فون کی تاریں ہی کٹوا دی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ناظم الدین ہی نے ملکہ سے سفارش کی تھی کہ غلام محمد کو گورنر جنرل لگایا جائے۔ اور ملکہ نے اسے گورنر جنرل لگا بھی دیا تھا۔"

"ملکہ کو یہ اختیار کیسے حاصل ہوا۔ وہ تو انگلستان کی ملکہ ہوتی ہے۔" رحیم داد نے تعجب سے پوچھا۔ "انگریزوں کی حکومت تو کب کی ختم ہو چکی۔"

"چوہدری تجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہ انگلستان کے ساتھ ساتھ تب تک پاکستان کی بھی ملکہ تھی۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "گورنر جنرل' پاکستان میں اس کا نمائندہ ہوتا تھا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے معلوم ہے سکندر مرزا جو گورنر جنرل سے پاکستان کا پہلا صدر بن چکا ہے' پہلے سرکاری افسر ہی ہوتا تھا۔ وہ ڈیفنس سیکریٹری ہوتا تھا۔ اس سے پہلے پشاور کا ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکا تھا۔"

"سکندر مرزا' افسر سے کیسے گورنر جنرل بن گیا؟"

"سکندر مرزا نے چوہدری محمد علی سے مل کر غلام محمد کو ہٹانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ محمد علی نے ملکہ الز-بتھ کو لکھا کہ غلام محمد کو دو ماہ کی رخصت پر بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ سکندر مرزا کو گورنر جنرل لگا دیا جائے۔ ملکہ نے چوہدری محمد علی کی سفارش منظور کر لی۔" احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔ "دو مہینے گزر گئے تو غلام محمد سے چوہدری محمد علی نے کسی نہ کسی طرح استعفے پر دستخط بھی لگوائے۔ استعفیٰ فوراً ملکہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی گئی کہ سکندر مرزا کو پکا گورنر جنرل لگا دیا جائے۔ ملکہ نے غلام محمد کا استعفیٰ منظور کر لیا اور سکندر مرزا کو گورنر جنرل بنا دیا۔"

رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "شاہ جی' تو نے بہت عجیب باتیں بتائیں۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ سرکاری افسر اتنے طاقت ور ہوتے ہیں۔"

"تجھے ایک اور دلچسپ گل سناؤں۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "سردار عبد الرشید' جو ون یونٹ بن نے سے پیشتر سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا' پہلے انسپکٹر جنرل پولیس ہوتا تھا۔ خان کیوم خان تب سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اسے مرکزی وزیر لگایا گیا تو اس نے سردار رشید کو اپنی جگہ صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ سردار رشید بھی نہ صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا نہ مسلم لیگ کا۔"

"شاہ جی' یہ بتا' یہ ون یونٹ کا کیا چکر ہے؟"

"ون یونٹ یہ ہوا کہ ادھر کے تینوں صوبوں اور بلوچستان کو ملا کر ایک صوبہ مغربی پاکستان بنا دیا گیا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "جب مری میں اسمبلی کا اجلاس ہوا اور اس میں ون یونٹ بنانے کا بل پیش ہوا تو میں وہاں موجود تھا۔ سردار رشید نے بھی دوسروں کے ساتھ اس کی مخالفت کی تھی اور یہ الزام لگایا تھا کہ ون یونٹ دراصل ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ اور اسے سازش ثابت کرنے کے لیے ایک خفیہ دستاویز بھی پڑھ کر سنائی تھی۔"

"کیا تھی وہ دستاویز؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"دستاویز شستاویز کیا تھی' یہ دراصل میاں ممتاز دولتانہ کا ایک خط تھا' جو اس نے لکھ کر

چوہدری محمد علی کو دیا تھا۔ چوہدری محمد علی نے سردار رشید پر اعتماد کرتے ہوئے وہ خط اسے دے دیا۔ گل صرف اتنی تھی کہ اس میں دولتانہ نے لکھا تھا کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ون یونٹ سے پنجاب کچھ گھاٹے میں رہے گا۔"

"وہ گھاٹا کیا تھا؟" رحیم داد بیچ میں بول اٹھا۔

"وہ یہ کہ مغربی پاکستان اسمبلی میں پنجاب کے ممبروں کا کوٹا ۵۶ فی صد بنتا تھا جسے کم کر کے ۴۰ فی صد کر دیا گیا تھا۔ اور اس کا ۱۶ فی صد حصہ چھوٹے صوبوں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے بانٹ دیا گیا تھا۔"

"تب تو جی پنجاب ہی گھاٹے میں رہا۔"

"بالکل رہا۔ پر آگے چل کر دولتانہ نے اپنے کانفیڈنشل خط میں بتایا تھا کہ پنجاب کے افسروں کو شروع میں عہدوں اور نوکریوں پر اس طرح ہاتھ نہیں مارنا چاہیے کہ چھوٹے صوبے والے ناراض ہو جائیں۔ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر ون یونٹ کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو اس ناکامی سے پنجاب اور بھی زیادہ گھاٹے میں رہے گا۔ وہ اس طرح رہے گا کہ ایسٹ پاکستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وڈا اور طاقت ور بن جائے گا۔ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر بنگالی جو فیصلہ کرانا چاہیں گے کرا لیں گے۔"

"اپنی سمجھ میں تو جی صاف بات ہے کچھ آیا نہیں۔" رحیم داد نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو یہ سارا چکر افسروں اور ان کی نوکریوں کا لگتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" احسان شاہ نے وضاحت کی۔ "پنجاب کا تو صرف نام ہی نام ہے۔ اصلی چکر تو یہ تھا کہ حکومت افسروں کے ہاتھ میں رہے پر ان کے فائدے کے ساتھ اپنا بھی تو فائدہ ہے۔ اسی لیے میں نے تجھے کہا تھا کہ افسروں سے میل ملاپ رکھنے کی کوشش کر۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "تجھے یہ ساری باتیں سمجھ لینی چاہیں۔ تجھے بھی آگے چل کر سیاست میں حصہ لینا ہو گا۔ کوشش کرے گا تو کبھی وزیر بھی لگ جائے گا۔ ورنہ اسمبلی کا ممبر تو بن ہی جائے گا۔"

رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کو دیکھا۔ احسان شاہ مسکرایا۔ دیر تک اسے سیاست کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔ دونوں نے شراب نوشی ختم کی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

☆

صبح ناشتے کے بعد مہربان علی آ گیا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔

مہربان علی نے کاغذات الٹ پلٹ کر جگہ جگہ سے پڑھے۔ کلیم کے بارے میں جو نکات واضح نہ تھے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ رحیم داد سے سوالات کیے۔ پوچھ گچھ کی۔ اور کاغذات کا بستہ سنبھال کر چلا گیا۔

شام کو رحیم داد کوٹھی کے سبزہ زار پر سید احسان شاہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ احسان شاہ اور رحیم داد ایک ایک پیگ لگا کر طلوع ہو رہے تھے۔ مہربان علی بھی پہنچ گیا۔ اور الاٹمنٹ کے لیے درخواست تیار کر کے لایا تھا۔ مہربان علی نے درخواست پڑھ کر سنائی۔ احسان شاہ نے اسے توجہ سے سنا۔ مسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا "چوہدری دستخط لگا دے۔" رحیم داد نے مہربان علی کے ہاتھ سے قلم لیا اور خاموشی سے دستخط کر دیے۔

مہربان علی درخواست لے کر چلا گیا۔

وہ ایسا گیا کہ کئی روز تک نظر نہ آیا۔ احسان شاہ بھی کم ہی نظر آتا۔ ان دنوں وہ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک روٹ پرمٹ کے لیے بھی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کے نام سے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی قائم کر رکھی تھی۔ اسی کمپنی کے لیے وہ روٹ پرمٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ پرمٹ نیا نہ تھا۔ پہلے بھی وہ کئی روٹ پرمٹ لے چکا تھا۔ کمپنی کی لاریاں اور بسیں ان پرمٹوں کے مطابق مقررہ راستوں پر چل رہی تھیں۔ احسان شاہ کمپنی کا کام اور بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وسطی پنجاب میں ہر طرف اس کی کمپنی کی بسوں کا جال پھیل جائے۔ اپنے اس منصوبے کا ذکر وہ رحیم داد سے بھی کر چکا تھا۔

رحیم داد کی احسان شاہ سے دن میں تو ملاقات ہی نہ ہوتی۔ مگر اکثر شام کو دونوں مل بیٹھتے۔ شراب نوشی کرتے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ احسان شاہ عام طور پر سیاسی صورت حال کے بارے ہی میں بات کرتا۔ رحیم داد کو اپنی سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ کرتا۔

پھر ایسا ہوا کہ تین روز تک وہ رحیم داد سے بالکل نہ مل سکا۔ رات کو کس وقت واپس آتا۔ رحیم داد کو مطلق علم نہ ہوتا۔ وہ بے خبر سوتا ہوتا۔

شام کو وہ ملا تو بہت نڈھال اور تھکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "شاہ جی' تو ادھر کہاں غائب رہا۔ پتہ نہیں تو کن چکروں میں پڑا ہے۔" اس کے انداز میں تجسس تھا۔ "تیرے روٹ پرمٹ کا کیا بنا؟"

"وہ تو مل گیا پر میں اِمر ایک اور چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔"

"وہی سیاست کا چکر ہو گا۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔

"ہے تو وہی چکر۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "گورنر نے میری یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ مسلم لیگی ممبروں کو گھیر گھار کر ری پبلکن پارٹی میں لاؤں۔ وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت میں ان سے اسمبلی کے اندر ہاتھ اٹھواؤں۔ اب گورنر کی گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ اس سے پرانی یاری جو ہوئی۔ اپنے بہت کام آتا ہے۔ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کے معاملے ہی کو دیکھ لے۔ گورنر اگر چیمہ کے خلاف انکوائری نہ رکوائے تو چیمہ رشوت کھائے بغیر کیسے الاٹمنٹ کر سکتا ہے۔ سنا ہے اس زمین کے لیے ۵۰ ہزار تک کی رشوت اسے پیش کی جا چکی ہے۔"

"یہ بتا چیمہ کے خلاف گورنر نے انکوائری رکوا دی؟"

"گورنر سے چیمہ کے بارے میں میری گل بات تو ہو چکی ہے۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اور جب اس نے وعدہ کر لیا تو سمجھ لے انکوائری ختم ہو جائے گی۔"

"چیمہ کو بھی اس گل کا پتہ ہے؟"

"ہاں، میں نے اسے بتا دیا ہے۔"

"تو بہت تھکا ہوا نظر آرہا ہے۔ کیا کرتا رہا دن بھر؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہ پوچھ کیا کرتا رہا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ہر روز نیا تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔ صوبائی اسمبلی کے کتنے ہی ممبر ایسے ہیں کہ صبح لیگ میں ہیں تو دوپہر کو ری پبلکن پارٹی میں۔ شام ہوتے ہوئے پھر لیگی بن جاتے ہیں۔ رات کو خبر آتی ہے کہ ری پبلکن پارٹی کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ وعدے ہوتے ہیں۔ قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ حلف اٹھائے جاتے ہیں۔ کلام مجید پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔ پر کسی کا اعتبار نہیں۔ راتوں رات وفاداریاں بدل جاتی ہیں۔ زبردست سودے بازی ہو رہی ہے۔ ہر طرح کی رشوت چل رہی ہے۔ پرمٹ، لائسنس، الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ دھونس اور دھمکی بھی چل رہی ہے۔ نہ پوچھ کیسے کیسے چکر چلائے جا رہے ہیں۔"

اس نے حسبِ معمول بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "پچھلے دنوں سپیکر کا انتخاب کرنے کے لیے اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ مسلم لیگ پارٹی نے میر غلام علی تالپور کو اور ری پبلکن پارٹی نے چوہدری فضل الٰہی کو کھڑا کیا۔ نہ پوچھ کتنا رولا گولا ہوا۔ جسے دیکھو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے۔ ممبروں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ شور شرابہ، کھینچا تانی، ہاتھا پائی، سب ہی کچھ ہوا۔ ووٹ گنے گئے تو برابر برابر نکلے۔ ممتاز علی کزلباش صدارت کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹنگ ووٹ ری پبلکن پارٹی کے امیدوار کو دے دیا۔ لو جی اس طرح چوہدری فضل الٰہی سپیکر بن گیا۔"

"تب تو تیری ہی پارٹی کی جیت ہوئی ناں۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی۔ سکندر مرزا اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے دو روز پہلے ہی لہور آکر بیٹھ گیا تھا۔ ری پبلکن پارٹی کو جتانے آیا تھا۔ اس کی اپنی پارٹی جو ہوئی۔" احسان شاہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر سب سے دلچسپ تماشا اجلاس کے دوسرے دن دیکھنے میں آیا۔ لیگی ممبروں نے اسمبلی کی کارروائی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ حکومت کا دباؤ پڑا تو درخواست مسترد ہو گئی۔ ججوں کو نوکری کرنی تھی۔ ترکی جو لینی تھی۔ اسمبلی کا ایک سندھی ممبر' جو صوبائی وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر بھی رہ چکا ہے' مسلم لیگی امیدوار کی حمایت میں سب سے آگے تھا۔ صبح ہائی کورٹ میں درخواست لگانے میں بھی آگے آگے تھا۔ بہت وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ یہ کر دوں گا وہ کر دوں گا۔ سہ پہر ہوئی تو دیکھا' ری پبلکن پارٹی کے وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھا رہا تھا۔"

"حد ہو گئی جی۔" رحیم داد چند لمحے حیرت زدہ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "مہربان علی اب تک نہیں لوٹا۔ کب تک آجائے گا؟"

"میں تجھے بتانا بھول گیا' وہ کل صبح واپس آرہا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا وہ کل آرہا ہے؟"

"میرا ایک کرندہ بھی پچھلے دنوں لائل پور گیا تھا۔ آج دوپہر کو واپس آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔ چوہدری تو فکر نہ کر۔ مہربان علی پورا کام کر کے ہی آئے گا۔"

دوسرے روز رحیم داد کو مہربان علی کا انتظار رہا' مگر وہ نہ آیا۔ احسان شاہ بھی شام کی ٹرین سے اچانک کراچی چلا گیا۔ روانگی سے قبل رحیم داد سے ملا بھی نہیں۔ احسان شاہ کے ساتھ اس کا بڑا بیٹا' رحمان شاہ بھی کراچی گیا تھا۔

رحیم داد کو یہ اطلاع کوٹھی کے نوکروں سے ملی تو سخت حیرت زدہ ہوا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ رات ہی کو احسان شاہ کے ساتھ اس کی لمبی نشست رہی تھی۔ لیکن کراچی جانے کے بارے میں اس نے اشارہ تک نہ کیا۔ رحیم داد نے کرید کرید کر نوکروں سے پوچھا۔ مگر انھیں اس کے پروگرام کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ بالکل بے خبر تھے۔ احسان شاہ کے اس طرح پر اسرار طور پر چلے جانے سے رحیم داد سخت الجھن میں پڑ گیا۔

☆

کوٹھی پر ہر وقت سناٹا چھایا رہتا۔ احسان علی شاہ ہنوز کراچی میں تھا اور کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کب واپس آئے گا۔

رحیم داد شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے گاؤں ' کوٹلہ ہرکشن واپس جانا نہ چاہتا تھا۔ اسے احسان شاہ کے منیجر مہربان علی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کلیم کے تمام ضروری کاغذات بھی اس کی تحویل میں تھے۔ رحیم داد کلیم کے کاغذات اس کے پاس چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اپنے تمام کاغذات لے کر ہی واپس جانا چاہتا تھا۔

کئی روز گزر گئے۔ مگر مہربان علی نہ آیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ زمین کے الاٹمنٹ کے بارے میں کیا کارروائی ہوئی اور وہ کب واپس آئے گا۔ مہربان علی نے لائل پور سے کوئی اطلاع بھی نہ بھیجی۔ رحیم داد کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ لائل پور میں کیا کر رہا ہے۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا تھا۔ تشویش کا بنیادی سبب یہ تھا کہ الاٹمنٹ کی درخواست پر اس کے دستخط قطعی جعلی تھے۔ وہ چوہدری نور الٰہی نہ تھا رحیم داد تھا۔ کلیم ' چوہدری نور الٰہی کے نام سے منظور ہوا تھا جسے قتل کر کے رحیم داد نے کلیم کی دستاویزات اپنے قبضے میں کر لی تھیں اور رحیم داد سے چوہدری نور الٰہی بن گیا تھا۔ اب وہ نور الٰہی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اس کی جعل سازی کا پردہ نہ فاش ہو جائے۔

گرمی اپنے شباب پر تھی۔ دن بھر لو کے جھکڑ چلتے۔ در و دیوار سے چنگاریاں اڑتیں۔ زمین دھوپ کی تمازت سے تپتی۔ آسمان پر گرد کا غبار چھایا رہتا۔ سورج غبار کی اوٹ میں تانبے کے سرخ تھال کی مانند دہکتا۔ دن ڈھلے جب گرمی کی شدت کا زور قدرے ٹوٹتا تو نوکر کوٹھی کے وسیع لان میں کرسیاں قرینے سے لگا دیتے۔

رحیم داد اس روز بھی معمول کے مطابق دن ڈھلے لان کے ایک پر سکون گوشے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فضا غبار آلود اور بوجھل تھی۔ رحیم داد نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اجلا لباس پہنا تھا مگر جسم پر پسینے کی نمی تھی۔ طبیعت میں اکتاہٹ تھی۔ تنہائی کا احساس رہ رہ کر ستاتا تھا۔

سائے پھیل کر طویل ہو گئے۔ دن کی چمک دمک دھندلی پڑ گئی۔ سورج ڈوب گیا۔ آسمان کی رنگت سرمئی ہو گئی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے فضا میں گھلنے لگا۔ رحیم داد کرسی کی پشت سے سر ٹکائے گم صم بیٹھا تھا۔ ناگاہ کوٹھی کے پھاٹک پر ایک کار آکر ٹھہری۔ ساتھ ہی کسی کی آواز بھی ابھری۔ رحیم داد کو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور جھٹ پہچان لیا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی تھا۔ چوکیدار سے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پھاٹک کی جانب بڑھا۔

مراد خاں شاہانی اسے دیکھتے ہی خوشی سے چیخا۔ "اوئے چوہدری تو ادھر ہے!" وہ تیزی سے آگے

بڑھا۔ قریب پہنچا اور گرم جوشی سے رحیم داد کو دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا۔

"شاہانی، تو کب آیا؟" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں کل صبح آیا۔ تو نے شاہ جی کو کہاں بھیج دیا؟ سنا ہے کراچی گیا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سنا، وہ کراچی گیا ہے۔"

مراد خان شاہانی نے مڑ کر سردار شہ زور خان مزاری کی جانب دیکھا۔ وہ قریب ہی کھڑا تھا۔ شاہانی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "سیں چوہدری، تو نے اسے نہیں پہچانا؟"

"کیوں نہیں پہچانا۔ یہ اپنا شہ زور مزاری ہے نا۔ بھکر میں تیری ہی حویلی میں تو اسے ملا تھا۔" رحیم داد نے آگے بڑھ کر مزاری کو گلے سے لگایا اور آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ تیرا یار ہے تو تیرے ساتھ اپنا بھی یار ہے۔" رحیم داد نے شاہانی کو مخاطب کیا۔ "دونوں اکٹھے ہی آئے ہو؟"

"میں تو ہفتہ بھر سے لہور میں ہوں۔" شاہانی کے بجائے مزاری نے جواب دیا۔

تینوں باتیں کرتے ہوئے لان کی جانب بڑھے۔

رحیم داد نے شہ زور مزاری سے دریافت کیا۔ "تو ہفتہ بھر سے ادھر کیا کر رہا تھا؟"

"کراچی سے ایک کار آنے والی تھی۔ اس کا سودا طے کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"ہو گیا سودا؟" رحیم داد نے مزاری سے پوچھا۔

"ہو گیا۔ کئی روز ہو گئے۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "آج کل وہی کار میرے پاس ہے۔"

"بہت شاندار گاڑی ہے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے ہنس کر کہا۔ "سیں چوہدری، یہ ڈرائیور بھی زبردست ہے۔ ایسی تیز گاڑی دوڑاتا ہے جیسے توپ سے نکلا ہوا گولا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لان کے اس گوشے میں پہنچ گئے جہاں کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ انھوں نے کرسیاں کھسکائیں اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے شہ زور مزاری سے دریافت کیا۔ "شاہ جی سے تیرا میل ملاپ نہیں؟"

"ہے تو، پر زیادہ نہیں۔"

"تو ہفتہ بھر سے ادھر ہے، ایک روز بھی شاہ جی سے ملنے نہیں آیا؟" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"کار کے چکر میں پھنسا رہا۔" سردار مزاری نے صفائی پیش کی۔

رحیم داد نے مڑ کر شاہانی کی طرف دیکھا۔ "تو کل ہی ادھر کیوں نہیں آیا؟"

"کل اور آج سرکاری افسروں سے ملتا رہا۔" شاہانی نے بھی صفائی پیش کی۔ "فرصت ملتے ہی ادھر آیا ہوں۔"

"تیرے علاکے میں تو سخت گڑبڑ تھی۔" رحیم داد نے شاہانی سے کرید کر پوچھا۔ "اب ادھر کا کیا حال احوال ہے؟"

مزاری بیچ میں بول پڑا۔ "گڑبڑ تو اتنی زبردست تھی کہ بیٹ سے نکل کر مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے مزارعوں اور کسانوں تک میں پھیلنے لگی تھی۔"

"اب تو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" شاہانی نے بتایا۔ "پولیس نے سختی سے دبا دیا۔ ویسے ابھی تک کہیں کہیں تھوڑی بہت گڑبڑ ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گڑبڑ پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ دوبارہ بھڑک سکتی ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"ایسا خطرہ تو ہے۔" سردار شہ زور مزاری نے رحیم داد سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بارڈر ملٹری پولیس کمک پر نہ آتی تو ضلع میانوالی کی پولیس سے ابھی تک گڑبڑ نہ دبتی۔"

"میں تو ان دنوں شاہانی کے ساتھ بیٹ ہی میں تھا۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "نہ پوچھ ادھر کیسی زبردست گڑبڑ تھی۔ میں تو سخت پریشان ہو گیا تھا۔ واپسی پر ایسا ہوا کہ ہموں والی سے آگے مزارعوں اور کمیوں کے ایک ہجوم نے میری جیپ کو گھیر لیا۔ جسے دیکھو لال لال آنکھیں نکالے گھورتا تھا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا تھا۔ انھوں نے تو سمجھو ہلا ہی بول دیا تھا۔ پر ڈرائیور بہت ہشیار تھا۔ اس نے منت کی۔ سمجھایا بجھایا' تب جیپ ان کے گھیرے سے کسی نہ کسی طرح نکلی اور آگے بڑھی۔"

"اجڈ اور جانگلی جو ٹھہرے۔" سردار مزاری نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "انھیں کیا پتہ تو کون ہے اور کس لیے آیا ہے؟ ان کے پاس اتنی سمجھ ہی ہوتی تو ایسی گڑبڑ کیوں کرتے۔ اپنے ہاتھوں اپنی خرابی کی۔ گرفتار ہوئے' جیل گئے۔ اب سزا بھگت رہے ہیں۔"

"کئی تو پولیس کی فائرنگ سے مارے بھی گئے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "لاشیں بھی دریا میں بہا دی گئیں۔ مچھلیاں کھا گئیں۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔"

"سنا ہے زخمی بھی بہت ہوئے۔" مزاری بولا۔

رحیم داد نے بات مختصر کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ "پر شاہانی تجھے اور بیٹ کے دوسرے زمین داروں کو اب بہت ہشیار اور چوکس رہنا چاہیے۔"

"سیں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سردار شاہانی نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "یہاں سرکاری افسروں سے گڑبڑ کے بارے میں بات ہوئی تو پتہ چلا وہ بھی اسی انداز سے سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے مزید پولیس فورس بھیجنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ ادھر بھی سخت کھلبلی مچ گئی تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ بہت پریشان تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مجھ سے پہلے سردار ظفر خاں ڈھانڈلہ کی سربراہی میں بیٹ کے زمین داروں کا ایک وفد مری میں وزیر داخلہ سے ملا تھا۔ اس نے شورش اور گڑبڑ دبانے کے لیے ہر طرح کی سرکاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے کہتا تھا فکر کرنے کی کوئی گالہ نہیں۔ اب کی گڑبڑ ہوئی تو زیادہ سختی سے دبا دی جائے گی۔"

رحیم داد نے موضوع بدلتے ہوئے مراد خاں شاہانی سے دریافت کیا۔ "تیرا کب تک ادھر ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ "اور ہاں یہ تو بتا تو ٹھیرا کہاں ہے؟"

"میں مزاری کے ساتھ فلیٹیز میں ٹھیرا ہوں۔"

"فلیٹیز تو ہوٹل ہے ناں؟" رحیم داد بولا۔ "ہوٹل میں کیوں ٹھیرا ہے؟ ادھر شاہ جی کی کوٹھی پر ٹھیرتا۔ تیرے ساتھ بہت مزے سے وکت کٹتا۔ تجھے کیا پتہ، اکیلے میں یہاں کتنا جی گھبراتا ہے۔"

"تو ایسا کیوں نہیں کرتا۔ ہوٹل ہی میں آجا۔ وکت تو وہیں ٹھیک گزرے گا۔" شاہانی نے آنکھ دبا کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھی اب شاہ جی بوڑھا ہو گیا ہے۔ ایک زمانے میں اس کے پاس ایک سے ایک زوردار دانا تھا۔ تو نے تو اس کا کوٹ اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ شاہ جی خود بھی عیش کرتا تھا یاروں کو بھی عیش کراتا تھا۔"

"پر اب تو اس نے سب کچھ ختم کر دیا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"اسے تو اب سیاست لڑانے سے فرصت نہیں۔" شاہانی نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "جب سے اس کا پتر لندن سے بیرسٹر بن کر لوٹا ہے، وہ دوسرے ہی چکروں میں رہتا ہے۔ سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کے ساتھ جوڑ توڑ میں لگا رہتا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، کراچی بھی وہ کسی ایسے ہی چکر میں گیا ہے۔"

"بالکل اسی چکر میں گیا ہے۔" شاہانی نے اس کی تائید کی۔

"سنا ہے اس نے اسمبلی کے لیگی ممبروں کو ری پبلکن پارٹی میں بھرتی کرانے کا دھندا شروع کر دیا ہے۔" وہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "اس کارگزاری کے صلے میں دبا کے الاٹمنٹیں، روٹ

پرمٹیں اور طرح طرح کے لائسنس حاصل کر رہا ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا۔ تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ نظریں بلند کیں اور غبار آلود آسمان کو تکنے لگا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ "سیں چوہدری' اب اس کے ساتھ اپنی یاری نہیں چل سکتی۔"

"پہلے سے وہ اب بدل تو گیا ہے پر اتنا نہیں جتنا تو سمجھتا ہے۔"

شاہانی نے رحیم داد کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "سیں چوہدری' آج پینے پلانے کا ارادہ نہیں؟"

"گرمی بہت ہے۔ شاہ جی بھی آج کل کم ہی پیتا ہے۔ اور جن ٹن پیتا ہے۔ اپنے کو تو بالکل پسند نہیں آتی۔" رحیم داد نے کہا۔ "گرمی میں تو سچ پوچھ ٹھنڈی ٹھنڈی ساوی پینے کو جی کرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تو نے بھکر میں بہت زوردار ساوی پلائی تھی۔"

"ساوی پینے کا مزا تو بھکر ہی میں آتا ہے۔ ادھر ویسی ساوی نہیں ملتی۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "ادھر تو گرمی میں بیئر چلتی ہے۔ برف میں لگی ہوئی ٹھنڈی بیئر۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ البتہ سردار شہ زور خان مزاری نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"سیں ایسا کر ہمارے ساتھ ہوٹل چل۔" سردار شاہانی نے کہا۔ "وہاں دو چار گلاس بیئر کے لگائیں گے۔ فیر ہیرا منڈی چلیں گے۔" اس نے مڑ کر شہ زور کی جانب دیکھا۔ "مزاری نے ادھر ایک پھڑک دار کنجری رکھ چھوڑی ہے۔ ایک دم پوپٹ ہے۔ سوہنٹری ہے اور گاتی بھی بہت عمدہ ہے۔ دیکھے گا تو ایک دم مست ہو جائے گا۔ اس کے پاس ضرور چلنا ہے۔"

"تھوڑی دیر تو یہاں اور بیٹھ۔" رحیم داد بولا۔

"سیں چوہدری اب دیر نہ کر۔" مزاری نے گردن گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "ادھر تو ایسا سناٹا ہے کہ ہول آتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے تیرا ٹائم کٹتا ہے۔"

"بس کٹ ہی جاتا ہے۔" رحیم داد بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سچ پوچھ تو اپنے پنڈ میں بھی ایسے ہی کٹتا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ادھر بھی اپنا دل بہلانے والا کون ہے۔"

مزاری نے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو حیرت سے دیکھا۔ مگر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

شاہانی اس کے استعجاب کو تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا۔ "مزاری تو اسے ٹھیک سے نہیں جانتا۔ عجب بندہ ہے۔ شراب پیتا ہے اور اکیلا بیٹھ کر پیتا ہے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "اور اس سے بھی زیادہ

انوکھی گالہہ یہ ہے کہ وڈا زمیں دار ہے پر رات کو بغیر کسی رن کے سوتا ہے۔ پتہ نہیں اسے نیند کیسے آجاتی ہے۔"

"تیرے مزارے شزارے تو ہوں گے؟" سردار مزاری نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

رحیم داد چپ رہا۔ مگر مراد خاں شاہانی چپ نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ "مزارے شزارے بھی ہیں۔ ان کے جوان گھر والیاں بھی ہیں۔ مجینیں ہیں' کڑیاں ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے ایک آنکھ دبائی۔ "سب ہی کچھ ہے۔ پر یہ اپنے مزارعوں سے ڈرتا ہے۔"

"مزارعوں سے ڈرتا ہے؟" مزاری کو سردار شاہانی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سیں اس طرح تو تیری زمیں داری نہیں چلنے کی۔"

"چلے گی ضرور چلے گی۔" سردار شاہانی مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "سیں چوہدری' تیری زمیں داری تو جیسے تیسے چلتی ہی رہے گی۔ پر اب تو ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔"

سردار شہ زور خاں مزاری بھی کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے انکار کیا۔ "شاہانی مجھے نہ لے جا۔ میں نے کہیں نہیں جانا۔"

مراد خاں شاہانی اڑ گیا۔ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ "خاماخا' نخرا نہ دکھا۔ جب تک میں لہور میں ہوں' تجھے میرے ساتھ فلیٹیز میں ٹھیرنا ہے۔ ادھر اکیلا رہ کر کیا کرے گا۔ شاہ جی' دو تین ہفتے سے پہلے لوٹنے کا نہیں۔ لگتا ہے وہ لے پروگرام پر کراچی گیا ہے۔ تو اب اس اا انتظار نہ کر۔ جب تک مجھے ادھر رکنا ہے تو بھی ہوٹل میں ٹھیر جا۔ بعد میں کوٹلہ ہرکشن واپس چلا جانا۔"

رحیم داد مزید انکار نہ کر سکا۔

تینوں کوٹھی سے باہر نکلے۔ پھاٹک سے کچھ فاصلے پر سردار شہ زور مزاری کی لمبی چوڑی کیسر کو بزلر کھڑی تھی۔ کار دو سال پرانے ماڈل کی تھی۔ لیکن اتنی اچھی حالت میں تھی کہ بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ سردار مزاری کو بھی بڑے جاگیرداروں کی طرح بڑی حویلی اور بڑی کار رکھنے کا شوق تھا۔ کار میں ڈرائیور موجود نہ تھا۔ شہ زور خاں مزاری نے داد طلب نظروں سے کار کی جانب دیکھا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ اور شاہانی کار کے اندر داخل ہو گئے۔

رحیم داد نے کار میں بیٹھنے سے پہلے اپنی جیپ کے ڈرائیور کو بلایا اور اسے کوٹھی میں ٹھیرنے کی ہدایت کی۔

"چوہدری کا سامان بھی اٹھا لا۔" سردار مراد خاں شاہانی نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ڈرائیور نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ ڈرائیور چپ چاپ کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ رحیم داد کا سوٹ کیس دبائے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے مزاری سے کنجی لی۔ کار کی ڈکی کھولی اور سوٹ کیس اس میں رکھ دیا۔ رحیم داد بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سردار مزاری نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

مراد خاں شاہانی نے مزاری کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے کار دوڑا رہا تھا۔ مگر وہ بہت منجھا ہوا اور ہوشیار ڈرائیور بھی تھا۔

☆

کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ کسی موڑ پر مڑتی تو پہیے پختہ سڑک سے اس طرح رگڑتے کہ ان سے نہایت تیز اور خوفناک آوازیں ابھرتیں۔ آس پاس سنسنی پھیل جاتی۔ راہ گیر بدکتے' اور سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگتے۔ لیکن مزاری کو اس قدر خطرناک انداز سے کار دوڑانے میں مزا آرہا تھا۔ وہ بے نیازی سے بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

رحیم داد خوف زدہ اور سہا ہوا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا رہا۔ کار مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی مال پر پہنچی۔ مزاری نے رفتار اور تیز کر دی۔ کار ہوٹل کی جانب مڑی۔ آگے بڑھی۔ یکایک مزاری نے بریک لگائے۔ کار شور مچاتی ہوئی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ رحیم داد پھسلا اور مراد خاں شاہانی کے کندھے سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

تینوں نے آگے کی بتیوں کی تیز روشنی میں دیکھا۔ دو لمبے تڑنگے بلوچ ایک گھنے درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ مزاری نے انھیں تیز اور تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سردار مزاری نے بتیاں بجھا دیں۔ روشنی اتنی کم رہ گئی کہ دونوں بلوچ سایوں کی مانند دھندلے اور پر اسرار نظر آنے لگے۔

سردار مزاری خاموش بیٹھا' نظریں اٹھائے ان کی جانب دیکھتا رہا۔ قریب پہنچ کر ایک بلوچ آگے بڑھا۔ وہ لمبی قمیص اور خوب گھیردار شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ململی سفید پگڑی تھی۔ پگڑی کے نیچے گردن پر بالوں کے گھنے پٹے لہرا رہے تھے۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی گھنے اور سخت تھے۔ چہرہ تیز دھوپ سے جھلسا ہوا تھا۔ آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ اونچی چٹان کی مانند پر شکوہ اور ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ گردن پر لہراتے ہوئے سر کے بالوں کے گلا یک دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کوہستانی علاقے کا رہنے والا بلوچ ہے۔ اس نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار شہ زور خاں مزاری کو سلام کیا۔

مزاری نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے ہوئے بلوچ کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ رعب دار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"داؤد خاں! میں نے تجھ سے حوال نہیں لینا۔ یہ بتا کیا خبر لایا ہے؟"

"سردار، خبر تو چنگی ہی ہے۔" داؤد خاں نے مڑ کر پشت کی جانب دیکھا۔ دوسرا بلوچ اس کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ وضع قطع سے وہ داؤد خاں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کی گردن پر بالوں کے پٹے نہیں تھے۔ عمر بھی داؤد سے کم تھی۔ وہ بائیس برس سے زیادہ کا نہ لگتا تھا۔ قد بھی ذرا دبتا ہوا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سخت اور گھنے نہ تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ وہ شلوار کے بجائے منجھلا باندھے ہوئے تھا۔ داؤد نے اسے قریب آنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا۔ آہستہ سے بولا۔

"بدھیل خاں، تجھے ٹھیک سے پتہ ہے، سردار کو بتا دے۔"

بدھیل خاں آگے بڑھا، جھکا اور سردار شہ زور مزاری کے پیروں کو چھو کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر مزاری کی آواز ابھری۔ وہ بدھیل سے دریافت کر رہا تھا۔ "بدھیل، یہ بتا سہراب لہور پہنچ گیا؟"

"نا سیں!" بدھیل خاں نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "وہ آج صبح اوچ پہنچ گیا۔"

"سہراب اوچ پہنچ گیا؟" مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "وہ اوچ کیسے پہنچا؟ وہ تو بلوکی میں تھا۔ اس نے تو لہور پہنچنا تھا۔ تو نے شاہ میر میں مجھے یہی بتایا تھا ناں؟"

"ہا سیں!" بدھیل نے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "سہراب، بلوکی میں ہی ٹھیرا تھا۔ پر وہ لہور نہیں آیا۔"

"وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟" مزاری کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔

"سیں سردار گالہہ یہ ہے، لہور میں اس نے ممدوٹوں کے پاس ٹھیرنا تھا۔ پر ممدوٹوں کی کوٹھی میں آج کل کوئی نہیں۔ سب مری چلے گئے۔" بدھیل ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔ "سہراب کو پتہ چلا تو اس نے لہور کا ارادہ چھوڑ دیا۔ بلوکی سے صادک آباد کی طرف لوٹا۔ پر ادھر نہ گیا۔ احمد پور شرکی سے اس نے گڈی بدلی اور اوچ پہنچ گیا۔"

"تجھے پتہ ہے، وہ صادک آباد کیوں نہیں گیا؟"

"سیں سردار! میں نے تو یہ سنا ہے، وہ مخدوموں کے پاس جمال دین والی میں زیادہ دیر ٹھیرنا نہیں چاہتا۔ تب ہی اس نے صادک آباد جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔" بدھیل نے داؤد خاں کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اور اپنے بیان کی تائید میں اس سے تصدیق کرانا چاہی۔ "رادھو ایسا ہی بتاتا تھا ناں؟"

مزاری نے داؤد کو نظرانداز کرتے ہوئے بدھیل خاں سے دریافت کیا۔ ”یہ بتا رادھو کہاں ہے؟“

”سئیں، وہ تو اوچ ہی میں ہے۔“ بدھیل نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”ہجر خاں کھوسہ بھی ادھر ہی ہے۔“

”اور کیا بتاتا تھا رادھو؟ اسے تو سہراب کے ارادوں کا ٹھیک طرح پتہ ہونا چاہیے۔“

”رادھو کہتا تھا، سہراب دوبارہ لغاریوں کے پاس واپس جانا چاہتا ہے“ بدھیل نے سردار مزاری کو بتایا۔ ”اوچ میں سہراب کا ایک چاچا ہے۔ سہراب اس کے ساتھ ہی ٹھیرا ہے۔ اس نے چاچا کے پتر، زردار، کو لغاریوں کے پاس چوٹی بھیجا تھا۔“

”زردار ابھی ادھر ہی ہے یا واپس آگیا؟“

”سئیں وہ واپس آگیا ہے۔“ بدھیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”رادھو یہ خبر لایا تھا۔ اس نے تو یہ بھی پتہ چلا لیا ہے کہ سہراب اوچ میں ابھی دو روز اور ٹھیرے گا۔ بعد میں کینجھر جائے گا۔ دن بھر ادھر ٹھیرے گا۔ وہاں سے غازی گھاٹ کی طرف جائے گا۔ اور دریا پار کر کے رات ہی کو ڈیرہ غازی کے رستے لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچ جائے گا۔“

”اور تو اسے چوٹی پہنچ جانے دے گا؟“ سردار مزاری نے قہر آلود نظروں سے بدھیل کو دیکھا۔ حکم دینے کے انداز میں ڈپٹ کر اونچی آواز سے بولا۔ ”اسے کسی بھی طرح چوٹی نہیں پہنچنا چاہیے۔ وہ اب ادھر نہیں جائے گا۔ ہرگز نہیں جائے گا۔“

بدھیل خاں نے ہاتھ باندھ کر شہ زور خاں مزاری کو یقین دلایا۔ ”سئیں سردار، تو فکر نہ کر، سہراب کسی طرح چوٹی دوبارہ نہیں پہنچ سکے گا۔ تیرا حکم پورا ہو گا۔“ وہ سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر ادب سے جھکا۔ مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ ”سئیں تو بالکل فکر نہ کر۔“

سردار مزاری نے کچھ نہ کہا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔ ”اوچ میں سہراب اکیلا ہے؟“

”نا سئیں!“ اس دفعہ بدھیل خاں کے بجائے داؤد نے جواب دیا جو دیر سے خاموش کھڑا تھا۔ ”ملوک زادی اس کے ساتھ ہی ہے۔“

شہ زور خاں مزاری نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مگر اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں۔ وہ چپ چاپ کار سے باہر نکلا۔ داؤد اور بدھیل خاں کے قریب پہنچا۔ دونوں کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ بدھیل اور داؤد سر جھکائے اس

کے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

☆

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کار کے اندر خاموش بیٹھے تھے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ سردار شہ زور خاں مزاری واپس نہیں آیا۔

رحیم داد نے اکتا کر سکوت توڑا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "شاہانی یہ چکر کیا ہے؟"

"اسی چکر میں تو مزاری لہور آیا ہے۔ ہفتہ بھر سے یہاں ٹھیرا ہے۔ کار کے سودے کا تو صرف بہانہ تھا۔" مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر بتایا۔

رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لمحہ بھر تک ہونق کی طرح مراد خاں کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے اٹکتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ ملوک زادی کون ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" مراد خاں شاہانی نے ٹالنا چاہا۔ "یہ مزاری کا گھریلو معاملہ ہے۔" اس نے آنکھ دبا کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یاری آشنائی کا چکر ہے۔"

رحیم داد کو معاً حمیدہ یاد آگئی۔ حمیدہ بھی ملوک زادی تھی۔ وہ مراد خاں شاہانی کی بہن تھی اور ہنوز غیر شادی شدہ تھی۔ سال سوا سال پہلے جب رحیم داد بھکر میں تھا اور مہمان کی حیثیت سے شاہانی کی شاندار حویلی کے مہمان خانے میں ٹھیرا تھا تو ایک رات حمیدہ اچانک اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ رات بھر اس کے پاس رہی تھی۔

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ "مزاری کی بھین کا تو کوئی معاملہ نہیں ہے۔" اس نے شاہانی سے نظریں نہ ملائیں۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "وہ اس کی بھین نہیں ماں ہے۔"

"وہ اس کی ماں ہے؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ "نہیں یار، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سہراب اس کی ماں کو اٹھا کر کیسے لے جا سکتا ہے؟"

"وہ شہ زور کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا نام مرجان ہے۔" شاہانی نے کھل کر بتایا۔ "سہراب اسے اٹھا کر نہیں لے گیا۔ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بھاگ گئی۔"

"سہراب سے اس کی یاری کیسے ہو گئی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"بس ہو گئی یاری۔ مجھے کیا پتہ۔" شاہانی کے لہجے سے بیزاری آشکارہ تھی۔

"برا نہ منا۔ میں نے تو ایسے ہی ایک گل پوچھی تھی۔" رحیم داد نے معذرت کرنے کے انداز

میں آہستہ سے کہا۔

"برا منانے کی گالھ نہیں۔" مراد خاں کا لہجہ اس دفعہ نرم تھا۔ "مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ شہ زور کی سگی ماں کا تو مدت ہوئی مرن ہو گیا۔ اس کے پیو سردار نجیب خاں مزاری کی تین گھر والیاں تھیں۔ مرجان سب سے چھوٹی تھی۔ شہ زور کے پیو کا مرن ہوا تو وہ بالکل جوان تھی۔ اب بھی بھرپور جوان ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں پر سنا ہے، بہت سوہنڑی ہے۔"

"سہراب بھی وڈا زمین دار ہو گا؟"

"نہیں!" شاہانی نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "وہ شہ زور کے ڈیرے کا ماشیا تھا۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ کئی بار اس نے میرے بدن کی مالش بھی کی ہے۔ اچھا تکڑا اور ڈاڈھا جوان ہے۔"

"سہراب حویلی کے اندر بھی آتا جاتا ہو گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"ماشیا حویلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے۔ کوئی رن اس کے سامنے نہیں آ سکتی، کسی بھی نامحرم کے سامنے نہیں آ سکتی۔" شاہانی نے جھٹ تردید کی۔ "تجھے پتہ نہیں بلوچ سرداروں کی ذال تو روچ موجیر ہوتی ہے۔ روچ موجیر کا مطلب سمجھتا ہے؟" اس نے رحیم داد کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ "روچ موجیر کا مطلب ہے، سورج سے بھی پردہ کرنے والی رن۔ تو خود ہی سوچ سہراب یا کوئی اور غیر بندہ حویلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے۔"

"جب ایسی گل بات ہے تو وہ مرجان کو کیسے لے اڑا؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔" شاہانی نے کہا۔ "صرف اتنا سنا ہے کہ حویلی سے ایک رات دونوں چھپتے چھپاتے کسی طرح نکل گئے۔ دن بھر تمن مزاری کے چک سلیم میں روپوش رہے۔ فیر کسی نہ کسی طرح لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچ گئے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "وہ ملوک زادی ہے۔ اسے سہراب کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ اس نے بہت برا کیا۔ شہ زور مزاری دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"شہ زور نے دونوں کو لغاریوں سے واپس نہیں مانگا؟"

"نہیں!" مراد خاں نے ہولے ہولے گردن ہلائی۔ "مانگتا بھی تو نہ دیتے۔ سہراب اور مرجان نے چوٹی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی لغاری تمن دار کی پناہ حاصل کر لی تھی۔ اس طرح دونوں اس کے باہوٹ بن گئے۔"

"باہوٹ بن جانے سے کیا ہوتا ہے؟" رحیم داد نے وضاحت چاہی۔

"ایک بار جب کوئی کسی کی پناہ میں آجاتا ہے یا باہوٹ بن جاتا ہے تو پناہ دینے والا اس کا میاردار بن جاتا ہے۔ اگر میاردار ایک بار پناہ دے کر منحرف ہو جائے تو بلوچ اسے ذلیل اور بے غیرت سمجھتے ہیں۔ اس کی ساری دھج وج' ساری عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ اسے بے میار کہتے ہیں۔ یہ بلوچوں کا بہت پرانا دستور ہے۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔"

"پر سوال یہ ہے لغاریوں نے سہراب اور مرجان کو پناہ ہی کیوں دی؟ کیوں انھیں باہوٹ بنایا؟" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے لحہ بھر کو الجھا۔ "تو نے میاردار ہی تو کہا تھا نا؟"

"ہاں' پناہ دینے والے کو بلوچ میاردار ہی کہتے ہیں۔"

"لغاری تمن دار بھی تو سردار ہی ہو گا۔" رحیم داد بات پوری طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ "اسے دوسرے بلوچ سردار کی عزت اور آن کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"تو عزت اور آن کی گالہ کرتا ہے۔" شاہانی مسکرا کر بولا۔ "لغاری یہی تو چاہتے تھے۔ وہ سہراب اور مرجان کو باہوٹ بنا کر مزاریوں کے متھے پر بدنامی اور خواری کا داغ لگانا چاہتے تھے۔ اسے ٹک کرنا کہتے ہیں۔ لغاریوں نے تو جان بوجھ کر سہراب اور مرجان کو باہوٹ بنایا۔ میں تو سمجھتا ہوں دونوں کو چوٹی میں خود لغاریوں ہی نے بلایا تھا۔"

"یہ تو انھوں نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"چوہدری اصلی بات یہ ہے" شاہانی نے وضاحت کی۔ "مزاریوں سے لغاریوں کی بہت پرانی دشمنی ہے۔ دونوں کے درمیان روز ہی جھگڑے ٹنٹے ہوتے ہیں۔ اندھا دھند گولیاں چلتی ہیں۔ سچ پوچھ مزاریوں کو موکع ملتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔ لغاریوں کو ٹک کرنے میں ذرا بھی نرمی یا رعایت سے کام نہ لیتے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ شاہانی نے بے تکلفی سے رحیم داد کی ران پر ہاتھ مارا۔ ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چوہدری' اب تو مزاریوں اور لغاریوں کی دشمنی اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ڈیرہ غازی خاں کے تمن دار دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔"

"کتنے تمن دار ہیں؟" رحیم داد نے اپنی معلومات کے لیے شاہانی سے دریافت کیا۔

"ویسے تو نو تمن دار ہوتے ہیں۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "پر آٹھ ایسے ہیں جو دو گروہوں میں بٹے ہیں۔ ایک گروہ کی سرداری یا سربراہی مزاری کرتے ہیں اور دوسرے کی لغاری۔ مزاریوں کے ساتھ دریشک' گورچانی' اور کھوسہ تمن ہیں۔ اور لغاریوں کے ساتھ لنڈ' کیسرانی اور کھتروان ہیں۔ صرف تمن بزدار کسی ایک کے ساتھ نہیں۔ ویسے بزدار اب زیادہ طاکت ور بھی نہیں

رہے۔"

"یہ بتا شاہانی، تیرے خیال میں مزاریوں اور لغاریوں میں زیادہ زور آور اور طاقت ور کون ہے؟"

"پہلے تو مزاری بہت طاقت ور ہوتے تھے۔" شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "تو نے سر امام بخش مزاری کا نام تو سنا ہی ہو گا۔ وہ بہت وڈا بلوچ سردار تھا۔ سچ پوچھ تو مزاریوں کو اسی نے آگے بڑھایا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں اس نے انگریزوں کی زبردست مدد کی۔ بلوائیوں کو کچلنے میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ویسے تو ان دنوں مزاریوں کا سردار، دوست محمد خاں تھا۔ پر وہ تو نام کا سردار تھا۔ سرداری تو اصل میں اس کا چاچا، امام بخش خان کرتا تھا۔ انگریز اس سے بہت خوش تھے۔ اسی کو مزاریوں کا سردار مانتے تھے۔" شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "سیں چوہدری، انگریزوں میں یہ زبردست خوبی تھی۔ جو ان کی مدد کرتا، ان کے ساتھ وفا داری کرتا اسے آگے لاتے تھے۔ بہت عزت دیتے تھے۔ منصب اور جگیر انعام میں دیتے تھے۔"

"جمیلہ بتاتی تھی اپنے شاہ جی کے بزرگوں اور وڈیروں نے بھی غدر میں بلوائیوں کے خلاف انگریزوں کی بہت مدد کی تھی۔"

"ضرور کی تھی۔ تبھی تو اس کے پاس اتنی وڈی جگیر ہے۔ اس کے پتر اونچے اونچے عہدوں پر لگے ہیں۔ انگریزوں ہی نے لگائے تھے۔" شاہانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تو سر امام بخش خان مزاری کے بارے میں سن۔ ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب ڈیرہ غازی خان کو اپنی عمل داری میں شامل کیا تو امام بخش خاں نے ان کی ہر طرح مدد کی۔ اس کی وفاداری سے خوش ہو کر انھوں نے اسے آنریری مجسٹریٹ بنایا۔ نواب بنایا، سر بنایا، اور فیر صوبائی درباری بنایا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "صوبائی درباری کا عہدہ بہت اونچا ہوتا تھا۔ اسے گورنر کے دربار میں کرسی ملتی تھی۔"

"تب تو وہ زبردست سردار تھا۔" رحیم داد نے مرعوب ہو کر کہا۔

"ہا سیں، وہ مزاریوں کا زبردست سردار تھا۔" شاہانی نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ "سچ پوچھ تو اسے آگے بڑھانے میں سر رابرٹ سنڈیمن کا ہاتھ تھا۔ وہ بہت بہادر اور وڈا انگریز افسر تھا۔ جب اس نے بلوچستان کی ریاست کلات پر چڑھائی کی تو امام بخش اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ بلوچوں کے خلاف ہر طرح سنڈیمن کی مدد کرتا تھا۔ سنڈیمن اس خدمت اور وفاداری سے اتنا خوش ہوا کہ اسے آگے اور آگے ہی بڑھاتا گیا۔ تب سے مزاری بھی آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ سر امام بخش خاں کے بعد سردار بہرام خاں نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ وہ بھی نواب بنا۔ سر بنا۔ پنجاب اسمبلی کا

ممبر رہا۔ وہ بھی انگریزوں کا زبردست وفادار تھا۔ بلوچوں کی بغاوتوں اور سرکشی کو دبانے میں اس نے بھی انگریزوں کی زبردست مدد کی تھی۔ انگریزوں نے ان خدمات سے خوش ہو کر مزاریوں کو خطابات دیے۔ وڈی وڈی بگیریں دیں۔ عہدے اور منصب دیے۔ کیا نہیں دیا۔"

"مزاری تو ہمیشہ سے ڈیرہ غازی خاں میں ہوتے تھے۔"

"سنا ہے پہلے سیستان میں ہوتے تھے۔ ان کا کیلہ ایک چشمے کے کنارے آباد تھا جس کا نام مزار تھا۔ بلوچی میں مزار شیر کو کہتے ہیں۔" شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "مزاری بلوچوں کا بہت زور آور کیلہ ہوتا تھا۔ انھیں سردار جمال خاں ادھر لایا تھا۔ مزاری اپنے بارے میں یہی بتاتے ہیں۔"

"لغاری بلوچ، انگریزوں کے وفادار نہیں رہے ہوں گے۔ انگریزوں سے ان کی لگتی ہو گی۔"

رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مزاریوں کی طرح لغاریوں نے بھی بلوچوں کی سرکشی اور بغاوت دبانے میں بہت خدمت کی۔ زبردست وفاداری دکھائی۔ سردار جلال خاں لغاری تو انگریزوں کا بہت وفادار ہوتا تھا۔ اس نے انگریزوں کی حمایت میں بلوچ باغیوں کے خلاف زبردست جنگیں لڑیں۔ اس کارگزاری کے صلے میں نواب کا خطاب پایا۔ چوٹی کی اتنی وڈی بگیر ملی جو آج تک لغاریوں کے پاس ہے۔ سردار جلال خاں لغاری کو بھی مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے۔"

"تب تو انگریزوں نے لغاریوں کو بھی آگے بڑھایا ہو گا۔"

"انگریزوں نے تو لغاریوں کو آگے بڑھانے کی ہر طرح کوشش کی پر نواب جلال خاں لغاری کے مرن کے بعد اس کے وارثوں کے درمیان ایسا جھگڑا کھڑا ہوا کہ بگیر برباد ہو گئی۔ اس برے زمانے میں سردار بہرام خاں مزاری نے لغاریوں کی بہت مدد کی۔ ان کے بہت کام آیا۔"

"کیا کیا اس نے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سردار سر بہرام خاں مزاری نے انگریز ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں لغاریوں کا بہت وڈا جرگہ بلایا۔ اس جرگے میں سردار بہرام کے علاوہ سردار جلاب خاں اور سردار جن وڈا خاں نے بھی شرکت کی تھی۔" مراد خاں شاہانی ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "اسی جرگے میں سردار دین محمد کو تمن لغاری کا تمن دار بنایا گیا۔ اس طرح لغاریوں کا جھگڑا ختم ہوا اور ان کی بگیر تباہ ہونے سے بچ گئی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مزاریوں نے لغاریوں کو تباہ ہونے سے بچایا۔ یہ تو لغاریوں پر

مزاریوں کا زبردست احسان ہوا۔"

"پر لغاری کہتے ہیں' بہرام خاں مزاری نے یہ ساری کارروائی انگریز ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر کی تھی۔ وہ انگریزوں کے بہت اعتماد کا بندہ تھا۔" شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری' بات یہ ہے انگریزوں کے راج میں مزاریوں کے سامنے لغاریوں کی زیادہ نہ چلتی تھی۔ ویسے دونوں تمن کے درمیان انگریزوں کے ساتھ وفاداری دکھانے کے لیے زبردست مکابلہ رہتا تھا۔ دونوں ہی انگریزوں کی سرپرستی حاصل کر کے طاقت پکڑنا چاہتے تھے۔"

"پر اب تو لغاری ہی زیادہ طاقت ور لگتے ہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" مراد خاں شاہانی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل تو وہ بہت طاقت پکڑ گئے ہیں۔ بات یہ ہے لغاری پہلے یونینسٹ ہوتے تھے۔ اور یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ یونینسٹ سیاسی طور پر انگریزوں کے بندے ہوتے تھے۔ بزدار پاکستان کے حامی تھے اور مسلم لیگی تھے۔ لغاری تمن دار نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لیگی بزدار امیدوار کے خلاف الیکشن لڑا اور بری طرح ہارا۔"

"تب تو لغاریوں کو کمزور پڑ جانا چاہیے تھا۔"

"پر لغاری تمن دار بہت ہشیار تھا۔" مراد خاں نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اس نے مسلم لیگ میں گھسنے کے لیے اپنی ایک دھی ممدوٹوں کو ویاہ دی۔ ممدوٹوں کا ان دنوں بہت زور زورہ تھا۔ نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ' پنجاب کا وزیر اعلیٰ اور صوبائی مسلم لیگ کا صدر ہوتا تھا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دوسری دھی بھاول پور کے مخدوموں کو ویاہ دی اور اپنی ایک پوتی' کالا باغ کے نوابوں کے گھر میں دے دی۔ اس طرح لغاریوں نے رشتہ داریوں کے ذریعے ہر طرف میل جول بڑھا رکھا ہے۔ ان کا اثر رسوخ ڈیرہ غازی سے نکل کر پورے پنجاب میں پھیل گیا۔" اس نے ایک بار پھر قہقہہ بلند کیا۔ "اور ون یونٹ بننے کے بعد توری پبلکن پارٹی کے روپ میں یونینسٹ دوبارہ پنجاب میں طاقت پکڑنے لگے ہیں۔ لغاری ادھر بھی ہیں اور ادھر بھی۔ اس لیے سیاسی طور پر بہت زیادہ طاقت ور ہو گئے ہیں۔"

"یہ تمن دار بھی اپنی طرح زمیں دار ہوتے ہیں نا؟"

"زمیں دار تو ہوتے ہی ہیں۔ پر تمن دار اپنے کیبلہ کا سردار ہوتا ہے۔ پورے تمن پر اس کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ کچہری اور عدالت لگاتا ہے۔ مکدموں کے فیصلے سناتا ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "تمن داروں کی اپنی جیلیں ہوتی ہیں۔ اب سے نہیں انگریزوں کے زمانے سے

ہیں۔ بلکہ انگریزوں کی تو مدت تک جیلیں بھی نہ تھیں۔ اپنے کیدی وہ تمن داروں ہی کی جیلوں میں بند کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔"

"کچہری عدالت تو تو بھی لگاتا ہے۔ مکدموں کے فیصلے بھی سناتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ جرمانے لگاتا ہے۔ ٹیکس لگاتا ہے۔ تو تمن دار کیوں نہیں بن سکا؟" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"میں تمن دار ہو بھی نہیں سکتا۔ نہ میں اتنا وڈا بگیر دار ہوں اور نہ میرے علاکے میں تمن داری کا دستور ہے۔" مراد خاں شاہانی نے وضاحت کی۔ "تمن داروں کو تو وہ عدالتی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو مجسٹریٹوں کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ ان کے فیصلے کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اختیارات انھیں انگریزوں کے زمانے سے حاصل ہیں اور ابھی تک ان کے پاس ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے ہنس کر رحیم داد کو دیکھا۔ "ویسے میں اور بیٹ کے دوسرے بلوچ سردار اور وڈے زمیں دار کچہری بھی لگاتے ہیں۔ فیصلے بھی کرتے ہیں۔ سزائیں بھی دیتے ہیں۔ حکومت کو سب پتہ ہے۔ پر حکومت ہمارے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتی۔ تو نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"شہ زور بھی تمن دار ہو گا؟"

"نہ وہ تمن دار ہے نہ سردار۔" شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "ویسے اب تو سارے ہی بلوچ بگیر دار اور وڈے زمین دار اپنے کو سردار کہتے ہیں۔ شہ زور کے بارے میں مجھے اتنا پتہ ہے کہ وہ تمن دار کا رشتے میں بھائی ہے۔ وہ سردار نہیں بن سکتا۔ مکدم بھی نہیں بن سکتا۔ ویسے مکدم بھی کچہری لگاتا ہے۔ فیصلے سناتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ جرمانے لگاتا ہے۔ میں تجھے ساری گل بات سمجھا دوں، لیکن شہ زور مزاری ٹھیک طرح سمجھا سکتا ہے۔"

"مکدم کیا ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"پہلے یہ سمجھ لے تمن کسے کہتے ہیں۔ تمن، بگیر اور زمین داری کو بھی کہتے ہیں۔ پر تمن کا مطلب ہے کبیلہ۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ اور سردار اور مقدم کا فرق سمجھانے لگا۔

درختوں کے نیچے اندھیرے میں آہٹ ہوئی۔ مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ صرف آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ آوازیں اتنی دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر درختوں کی جانب دیکھا۔ لیکن شاہانی درختوں کے نیچے سرسراتی ہوئی سرگوشیوں سے بے نیاز بیٹھا رہا۔ اس نے ادھر دیکھا بھی نہیں۔ نہایت اطمینان سے بلوچ قبائل کی سماجی درجہ

بندی پر روشنی ڈالتا رہا۔

"ہر بلوچ کیبلہ کا سردار ادھر ڈیرہ غازی خاں میں تمن دار کہلاتا ہے۔ ہر کیبلہ کئی حصوں میں بٹا ہوتا ہے جو پھلّی کہلاتا ہے۔ ہر پھلّی کا سربراہ مکدّم ہوتا ہے۔ تمن دار کی طرح مکدّم کا منصب بھی موروثی ہوتا ہے۔ مکدّم بھی بہت بااثر اور طاکت ور ہوتا ہے۔ تمن دار یا سردار' اہم معاملات میں مکدّم کے مشورے کے بغیر فیصلے نہیں کرتے۔"

"تب تو شہ زور خاں کچہری عدالت نہیں لگا سکتا۔ نہ وہ سردار ہے نہ مکدّم۔"

"اس سے کیا فرک پڑتا ہے۔" شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ "اپنی بگیر میں تو وہ سردار ہی سمجھا جاتا ہے۔ ادھر کچہری لگاتا ہے۔ فیصلے بھی سناتا ہے۔ اور سزائیں بھی دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب تو بہت کچھ بدل گیا۔ جس کے پاس بگیر یا وڈی زمین داری ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اپنی بگیر میں تو اسی کی سرداری اور حکمرانی چلتی ہے۔"

"اس طرح تو مزاریوں کے بہت سے حصے اور ٹکڑے بن گئے ہوں گے۔"

"ایک طرح تو تیری گالہ ٹھیک ہی ہے۔" شاہانی نے تردید نہیں کی۔ "شروع میں تو مزاری کیبلہ کے چار مشہور ٹکڑے ہوتے تھے۔ ان کے نام تھے۔ رستمانی' بلچانی' مصدانی اور سرگانی' پر اب تو بہت سے ہیں۔ ایک نہیں' جانے کتنی تو مزاری کیبلہ میں پھلّیاں بن گئی ہیں۔ تب ہی تو مکدّموں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بلوچوں کے دوسرے کیبلوں کا بھی ایسا ہی حال ہے۔"

"شہ زور خاں تو پرانے والوں ہی میں سے ہوگا؟"

"ہاں اس کا تعلک بلچانیوں سے ہے۔ ایک بار شہ زور ہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ میں نے مزاری کیبلہ کے بارے میں جو کچھ بتایا' اسی سے سنا تھا۔ کبھی کبھی تو نشے کی ترنگ میں وہ مزاریوں کے بارے میں بہت باتیں بتاتا ہے۔ اور بہت عجیب و غریب باتیں بتاتا ہے۔"

☆

سردار شہ زور خان مزاری درختوں کے نیچے سے نمودار ہوا اور سڑک پر آ گیا۔ داؤد اور بدھیل خان بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ مگر چند ہی قدم اس کے ہم راہ چلنے کے بعد اجازت لے کر رخصت ہو گئے اور جس سمت سے آئے تھے اسی سمت خاموشی سے واپس چلے گئے۔

شہ زور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا اور اسٹیئرنگ وھیل سنبھال کر چپ چاپ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی۔ ذرا دیر بعد وہ سڑک پر دوڑتی ہوئی ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مزاری گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے نہ کوئی بات

کی نہ کسی کی جانب متوجہ ہوا۔
کار ہوٹل کے اندر داخل ہوئی۔ تینوں باہر آئے۔ کمرے میں پہنچے۔ سردار مراد خاں شاہانی نے ہوٹل کے بیرے سے نصف درجن بیئر کی بوتلیں منگوائیں۔ ذرا دیر بعد بوتلیں آگئیں۔ گلاس بھی آگئے۔ تینوں کرسیاں کھسکا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بیرے نے بوتلیں کھولیں اور بیئر سے تینوں کے گلاس بھر دیے۔ گلاس اٹھائے گئے اور ہونٹوں سے لگائے گئے۔ بیئر بہت ٹھنڈی تھی۔ شاہانی نے گھونٹ بھرتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "پسند آئی۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "گرمی میں تو ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر ہی مزا دیتی ہے۔"
رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "چنگی ہے۔"
مزاری نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ ہنوز گم صم تھا۔ کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ شاہانی نے اسے چھیڑا۔ "شہ زور تو چپ چپ دکھائی پڑ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟"
"کوئی خاص گالہہ نہیں۔" شہ زور مزاری نے ٹالنا چاہا۔
شاہانی نے شہ زور کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "ایسے کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتا۔ کوئی نیا چکر تو نہیں چل گیا؟"
"چکر تو چل ہی رہا ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔" شہ زور مزاری کا لہجہ بوجھل تھا۔ "لغاریوں نے تنگ کرنا تھا کر چکے۔ اب میں بدنامی کے اس سیاہ داغ کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کر سکتا۔"
اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور نفرت کے سائے منڈلانے لگے۔ اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں نصف کے لگ بھگ خالی کر دیا۔ بیئر سے بھیگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ مڑ کر شاہانی کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو مٹر اداری کرنی ہے۔ اپنی عزت اور آن کے لیے سب ہی کچھ کرنا ہے۔" اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ "اس بار لغاریوں سے کھل کر جنگ ہو گی۔"
"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" شاہانی نے خبردار کیا۔ "لغاری اب بہت زور پکڑ گئے ہیں۔"
"مجھے پتہ ہے۔" شہ زور خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پر مزاری بھی بدلہ لینا جانتے ہیں۔ انھیں اتنا کمزور نہ سمجھ۔"
"سوچ لے۔" شاہانی کا رویہ ہنوز ناصحانہ تھا۔
"سوچ لیا' سب کچھ سوچ لیا۔ تو فکر نہ کر۔" مزاری نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور اس دفعہ پورا گلاس خالی کر دیا۔
شاہانی نے بوتل اٹھا کر شہ زور مزاری کا گلاس دوبارہ بیئر سے بھر دیا۔ اس کی جانب دیکھے بغیر

پوچھا۔ "آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔"

"تو نے تو ہیرا منڈی چلنے کا پروگرام بنایا تھا۔" شاہانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"ٹرین ساڑھے گیارہ بجے چھوٹتی ہے۔" مزاری نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔ "ابھی دس بجے ہیں۔ میں ٹرین ہی سے جاؤں گا۔ کار سے سفر کرنا آج کل ٹھیک نہیں۔"

"ایسی جلدی کیا ہے۔ کل دن کی ٹرین سے چلا جانا۔" شاہانی نے اسے رات بھر کے لیے روکنا چاہا۔ وہ ہیرا منڈی جانے اور رقص و سرود کی محفل سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے چین تھا۔

"نہیں، میں نے آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔" شہ زور خاں مزاری آمادہ نہ ہوا۔ اس نے شاہانی کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ "تو بھی میرے ساتھ چل۔"

"مجھے تو ادھر کئی ضروری کام کرنے ہیں۔" شاہانی نے انکار کر دیا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "ایسا کر چوہدری کو لے جا۔ اسے ادھر کوئی کام شام بھی نہیں کرنا۔"

رحیم داد، جو دیر سے خاموش بیٹھا تھا، گھبرا کر بولا۔ "تو نے کیسے سوچا، مجھے یہاں کوئی کام شام نہیں۔ میں نے لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ لینی ہے۔"

"تو اس کی پرواہ نہ کر۔ وہ تو شاہ جی کرا لے گا۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "تجھے پتہ نہیں، وہ آج کل بہت اونچا جا رہا ہے۔ زمین کی الاٹمنٹ تو سمجھ لے اس نے کرا ہی لی۔ ویسے بھی اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔ "وہ تو ان دنوں وزارتوں کی الاٹمنٹ کرا سکتا ہے۔"

شہ زور مزاری نے بھی زور دیا۔ "چوہدری، تو زمیں کی الاٹمنٹ ہی کے چکر میں ادھر ٹھیرا ہے تو میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں چل۔ وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی بہت متروکہ اراضی ہے۔ میری اپنی تحصیل راجن پور میں ابھی تک کتنی ایسی متروکہ اراضی ہے جو کسی کے نام الاٹ نہیں ہوئی۔ تحصیل دار تو اپنا ہی بندہ ہے۔ ڈپٹی کمشنر سے بھی یاری ہے۔ محکمہ بحالیات میں بھی اپنے کئی بندے لگے ہیں۔ جتنی چاہے زمین الاٹ کرا لے۔"

"میرے کلیم کے کاغذات تو شاہ جی کے منیجر، مہربان علی کے پاس ہیں۔" رحیم داد نے عذر پیش کیا۔ "ان کے بغیر کیسے الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔"

"ایسا کر۔ پہلے چل کر اراضی دیکھ لے۔ الاٹمنٹ کی درخواست بعد میں لگانا۔" شہ زور خاں مزاری نے مشورہ دیا۔

رحیم داد کو ڈیرہ غازی خاں کی متروکہ جائیداد سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ مزاری کے ساتھ جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔ "صاف بات یہ ہے جی' تیرے ضلعے کی زمین کے بارے میں سنا ہے بارانی ہے یا دریا کے کنارے کی ہے۔ اور دریا کے کنارے کی زمین ہر سال برسات میں ڈوب جاتی ہے۔ سیلاب کھڑی فصلوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ویسے بھی اس پر صرف ربیع کی فصل ہوتی ہے۔ میں نے ایسی زمین سے کیا لینا۔"

"تجھے یہ گالہ کس نے بتائی۔؟" مزاری نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تجھے یہ پتہ نہیں۔ ادھر نہری زمین بھی ہے اور بہت زرخیز بھی ہے۔ تبھی تو ادھر زرعی اراضی کی الاٹمنٹ نہیں ملتی۔ تو اس بھول میں نہ رہنا۔ بات یہ ہے کہ ساری ہی متروکہ اراضی وڈے سرداروں اور زمین داروں نے اپنے مزارعوں اور کرندوں کے ذریعے دبا رکھی ہے۔ کئی مہاجر الاٹمنٹ کے آرڈر لے کر پہنچے۔ سرداروں اور زمین داروں نے مار پیٹ کر انھیں بھگا دیا۔ جنھوں نے افسروں کی مدد سے جمنے اور ٹھیرنے کی کوشش کی ان کا اس طرح صفایا کروا دیا گیا کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلا۔"

"تب تو میں نے ادھر ہرگز زمین کی الاٹمنٹ نہیں لینی۔" رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔

"تو نے تو اسے ڈرا دیا۔" شابانی نے ہنس کر مزاری کو مخاطب کیا۔ "ذرا اس کا چہرہ تو دیکھ۔ کتنا خوف زدہ نظر آرہا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ہولے ہولے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ "سیں چوہدری' پرواہ نہ کر۔ شہ زور مزاری کے ہوتے ہوئے تیرے لیے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی گالہ نہیں۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تجھے پتہ نہیں ادھر اس کی بہت دھاک دھم ہے۔"

"شابانی ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری۔" مزاری نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ گردن اٹھائی اور مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ "میرے ادھر ہوتے ہوئے تجھے کس سے ڈرنا شرنا۔ میں بلوچ سردار ہوں۔ اور میار دار بھی ہوں۔" اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "تو مہمان بن کر میرے علاکے میں آئے گا۔ تیری حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ جان دے دوں گا تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ گالہ تو پوری طرح سمجھ لے۔" اس نے گلاس اٹھا کر بیئر کا بڑا گھونٹ بھرا۔

"زمیں داری کا مزا اٹھانا ہے تو میری طرف آ۔ منٹگمری میں کیا زمین داری کرنی۔ وہ تو آباد کاروں کا ضلع ہے۔ ادھر کے وڈے زمیں داروں کا تو یہ حال ہے کہ گھر والیاں جانگلیوں اور کمیوں سے بھی یاری لگالیں تو چپ کر جاتے ہیں۔ کالی اور کالے کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ زمین داری کی شان

دیکھنا ہے تو ڈیرہ غازی خان چل۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کی بعد میں سوچنا۔ پہلے کچھ دن چل کر میرے ساتھ ٹھیر۔ فیر فیصلہ کرنا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" شاہانی نے مزاری کی تائید کی۔ "مزاری کے ساتھ چلا جا۔ بہت آرام سے وکت گزرے گا۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے تک واپس آجانا۔ تب تک شاہ جی بھی کراچی سے واپس آجائے گا۔ میں اسے تیرے بارے میں بتادوں گا۔"

شہ زور مزاری نے اصرار کیا۔ "سیں چوہدری' اب انکار نہ کرنا۔ بس اب تو میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔" اس نے اپنا گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاہانی نے اسے روکنا چاہا۔ "ڈیڑھ بوتل بیئر میں تیرا کیا بنے گا۔ ایک اور لگا لے۔ ویسے بیئر میں ہوتا ہی کیا ہے۔ پانی ہی پانی۔ پیشاب کرو' سب نکل جاتا ہے۔"

مزاری آمادہ نہ ہوا۔ "مجھے ابھی کئی کام کرنے ہیں۔" وہ آگے بڑھا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

رحیم داد اور شاہانی خاموش بیٹھے بیئر کے گھونٹ بھرتے رہے۔ رحیم داد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہانی نے اسے گم صم دیکھ کر کہا۔ "سیں چوہدری' تو کچھ پریشان لگ رہا ہے۔ نہیں جانا چاہتا تو نہ جا۔"

"نہیں' مجھے مزاری کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "سوچ رہا تھا کہ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ تک مجھے ادھر ہی رکنا چاہیے۔ شاہ جی بھی نہیں ہے۔ وہ واپس آجائے تو تیرے ساتھ ہی مزاری کے پنڈ چلوں گا۔"

"پر میں نے ادھر نہیں جانا۔" شاہانی نے اپنے پروگرام سے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "میں تو لہور سے واپسی پر سیدھا بھکر جاؤں گا۔ تجھے ادھر جانا ہے تو آج ہی چلا جا۔ نہ گیا تو مزاری برا منائے گا۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا' تو الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کی فکر نہ کر۔ مہربان علی بہت ہشیار بندہ ہے۔ سارا کام کرلے گا۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسے کاموں کا زبردست ماہر ہے۔ یوں سمجھ لے' شاہ جی کی زمین داری تو وہی چلاتا ہے۔" اس نے حسب معمول ہلکا قہقہہ لگایا۔ "شاہ جی تو سچ پوچھ' چھانٹ چھانٹ کر سوہنڑی زنانیاں رکھتا ہے۔ وہسکی کی چسکی لگاتا ہے اور سیاست لڑاتا ہے۔ اس نے کوئی اور کام نہیں کرنا۔ مہربان علی کے ہوتے ہوئے اسے کوئی اور کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ الاٹمنٹ کے لیے تیرے یہاں ہونے نہ ہونے سے کوئی فرک نہیں پڑتا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔

مراد خاں شاہانی نے گلاس اٹھا کر بیئر کے کئی گھونٹ بھرے۔ "میرا کہا مان' تو مزاری کے ساتھ چلا جا۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ بہت عیش کرائے گا۔ وہ یاروں کا یار ہے۔ ادھر ٹھیر کر اپنے مطلب کی متروکہ اراضی بھی دیکھ لینا۔ پسند آئے تو بعد میں الاٹمنٹ کے لیے درخواست لگا دینا۔ ویسے زمین تو جہاں بھی ملے ضرور لے لے۔ اور ادھر کی زمین تو بہت عمدہ ہے۔ دیکھنے کے بعد تجھے خود اندازہ ہو جائے گا۔"

"تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔" رحیم داد نے شاہانی کے مسلسل اصرار پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ویسے بھی ہر زمین دار کی طرح زمین اس کی بھی کمزوری تھی۔ جتنی زیادہ ہو اتنی ہی ہوس بڑھتی ہے۔

شاہانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں چپ چاپ بیئر پیتے رہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ کچھ دیر بعد شہ زور خاں مزاری واپس آگیا۔ وہ سفر کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"اپنا گلاس ختم کر۔ چلنے کے لیے کھڑا ہو جا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس نے اپنا گلاس ختم نہ کیا۔ شاہانی کے اصرار کرنے پر بھی نہ کیا۔ وہ پہلے ہی لگ بھگ دو بوتلیں چڑھا چکا تھا۔ مزید پینا نہ چاہتا تھا۔

رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر تر و تازہ ہوا۔ واپس آیا تو اس عرصے میں شاہانی بیرے کے ذریعے اس کا سوٹ کیس کار کی ڈکی میں رکھوا چکا تھا۔

تینوں کار کے پاس پہنچے۔ شاہانی ان کے ہم راہ اسٹیشن جانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے دونوں کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ شہ زور اور رحیم داد کار میں داخل ہوئے اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کار اسٹیشن کی سمت روانہ ہو گئی۔ اب اسے مزاری کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اسٹیشن پہنچ کر شہ زور مزاری نے اپنا اور رحیم داد کا ٹکٹ خریدا اور دونوں ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ٹرین روانہ ہوئی اور رات کی تاریکی میں شور مچاتی ہوئی لوہے کی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

☆

رحیم داد اور شہ زور مزاری شیخو پورہ اور چک جھمرہ کے راستے سرگودھا پہنچے۔ سرگودھا میں انھوں نے ایک روز قیام کیا۔ دونوں صغیر احمد سیال کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ وہ بڑا زمین دار تھا۔ مزاری کا پرانا اور بے تکلف یار تھا۔ ان کی دوستی کا آغاز ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے بالاخانے سے ہوا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں اس قدر گھل مل گئے کہ شہ زور جب لاہور آتا تو سرگودھا

سے گزرتے ہوئے اس کے پاس ضرور قیام کرتا۔ اکثر دونوں سرگودھا سے اکٹھے ہی لاہور جاتے۔ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتے۔ ہر شام داد عیش دینے ہیرا منڈی ضرور جاتے۔ لاہور سے واپسی پر بھی مزاری سرگودھا ضرور ٹھیرتا۔ مگر اس دفعہ صغیر احمد سیال کے اصرار کے باوجود مزاری نے ایک روز سے زیادہ سرگودھا میں قیام نہیں کیا۔

مزاری اور رحیم داد ایک بار پھر ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین شاہ پور صدر پہنچی۔ دو ایسے مسافر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے جو وضع قطع سے بلوچ نظر آتے تھے۔ مسلح تھے اور مشتبہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ رات کا سفر تھا۔ ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی پٹڑیوں پر دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد مسلح بلوچوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے جب بھی نظریں اٹھا کر دیکھا' دونوں کو اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا۔ وہ عین اس کے مقابل کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔

مزاری دونوں بلوچوں سے بے نیاز اپنی نشست پر اطمینان سے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ رحیم داد کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ وہ سہما ہوا تھا اور چوکنا بھی تھا۔ وہ شہ زور مزاری سے مشتبہ بلوچوں کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

کچھ دیر بعد سردار مزاری کے خراٹے ابھرنے لگے۔ لیکن دونوں بلوچ جاگ رہے تھے۔ رحیم داد بھی جاگ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر مزاری پر غصہ آرہا تھا جو ٹانگیں پسارے بے خبر سو رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں گہری خاموشی تھی۔ روشنی بہت مدھم تھی۔ باہر ہوا کا شور تھا۔ بستیاں آتیں اور پلک جھپکتے گزر جاتیں۔ مکانوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ' جگنوؤں کی مانند جھلملا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ ٹرین پٹڑی پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ ایک بلوچ اونگھنے لگا۔ رحیم داد بھی تھک کر اونگھنے لگا۔ نیند کا غلبہ بڑھا تو آنکھ لگ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ یکایک ہلکا ہلکا شور بلند ہوا۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شہ زور مزاری ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ رحیم داد نے چوکنا نظروں سے سامنے کی نشست پر نظر ڈالی۔ دونوں بلوچ غائب تھے۔ نہ جانے وہ کب اور کہاں اتر گئے تھے۔ ٹرین کچھ دیر ٹھہر کر آگے روانہ ہوئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات گزری' صبح ہوئی۔ سفر جاری رہا۔ مزاری اور رحیم داد کندیاں سے گزرتے ہوئے محمود

کوٹ پہنچے۔ مزاری کے ایک دوست علی محمد جسکانی کی حویلی میں قیام کیا۔ جسکانی سے رحیم داد پہلی بار ملا تھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں اسے اندازہ ہو گیا کہ جسکانی نہ صرف مزاری کا گہرا یار ہے بلکہ اس کا رازدار بھی ہے۔

سورج غروب ہوتے ہی محفل جمی۔ بادہ و ساغر کا دور چلا۔ مزاری اور جسکانی کی گفتگو سے رحیم داد جلدی تاڑ گیا کہ انھیں بدمیل اور داؤد خاں کا انتظار ہے۔ پینے پلانے کا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔ لیکن رحیم داد جلد ہی اٹھ گیا۔ اس نے کھانا کھایا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ سفر کی تکان سے چور چور تھا۔ لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

بدمیل اور داؤد دوسرے روز بھی محمود کوٹ نہ پہنچے۔

شہ زور کے رویے سے رحیم داد کو یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ فوری طور پر اس کا ڈیرہ غازی خاں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ وہ لاہور سے محمود کوٹ ہی کے لیے آیا تھا۔ یہاں ٹھہر کر اسے بدمیل اور داؤد خاں کا انتظار کرنا تھا۔ ان سے ملنے اور صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی آئندہ کا پروگرام تیار کرنا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر مزاری نے باتوں باتوں میں علی محمد جسکانی کو رحیم داد کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کا ساڑھے چار ہزار ایکڑ اراضی کا کلیم منظور ہو چکا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں میں متروکہ اراضی الاٹ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے اور اسی مقصد سے اس کے ہمراہ روجھان شرقی جا رہا ہے۔

جسکانی نے یہ سنا تو مسکرا کر بولا۔ "متروکہ اراضی تو ادھر مظفر گڑھ میں بھی کافی ہے اور ابھی اس کی الاٹمنٹ بھی نہیں ہوئی۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں چوہدری، ادھر کی زمین بھی بہت عمدہ ہے۔ سچ پوچھو تو ساری عمدہ زمینیں ہندوؤں اور سکھوں کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ تو چاہے تو ادھر بھی الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔ بہت سی متروکہ جائیداد زمین داروں اور کسانوں نے دبا رکھی ہے۔ کوشش کی جائے تو آسانی سے ان کی الاٹمنٹ مل جائے گی۔ محکمہ بحالیات کے افسروں اور ڈپٹی کمشنر سے اپنی بہت جان پہچان ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ لیکن مزاری نے کہا۔ "چوہدری زمین تو جدھر بھی ملے الاٹ کرا لے۔ ویسے بھی زیادہ تر متروکہ جائیداد اب الاٹ ہو چکی ہے۔ اب تو ایسی چھپی ہوئی اراضی رہ گئی ہے جو زمینداروں نے اپنے کرندوں اور مزارعوں کے ذریعے زبردستی دبا رکھی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو ادھر بھی الاٹمنٹ کرا لوں گا۔" رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔

"سیں چوہدری، تیرے پاس کلیم کے کاغذات تو ہوں گے؟" جسکانی نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

"وہ تو جی لہور میں ہیں۔ شہ زور مزاری کے ساتھ تو میں صرف اپنے مطلب کی زمین دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"ایسا کر لہور سے کاغذات لے کر میرے پاس آجانا۔" علی محمد جسکانی نے کہا۔ "فکر نہ کر۔ دو اڑھائی سو ایکڑ زمین تو آسانی سے ادھر الاٹ ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ تو ایک جگہ کلیم میں زمین الاٹ ہوتی بھی نہیں۔"

"کنون تو یہی ہے۔" مزاری نے ہنس کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پر میں تو کئی ایسے مہاجروں کو جانتا ہوں جنھوں نے ایک ہی جگہ اڑھائی سو سے بھی زیادہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہے۔ جان پہچان ہو اور مٹھی گرم کی جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ سارا کنون شنون دھرا رہ جاتا ہے۔ افسر چاہیں تو کیا نہیں کر سکتے۔"

"چوہدری برا نہ منانا۔" جسکانی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "متروکہ جائیداد کے معاملے میں تو ایسی دھاندلی ہو رہی ہے کہ تجھ سے کیا کہوں۔ ایسے بھی مہاجر ہیں، اور بہت ہیں، جو ایک جگہ متروکہ جائیداد الاٹ کراتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے بیچ کر اسی کلیم پر دوسری جگہ الاٹمنٹ لے لیتے ہیں۔ ان کا کلیم ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔" اس نے کچھ سوچ کر فوراً اپنا لہجہ بدلا۔ "پر تیرا کلیم تو بہت وڈا ہے تجھے ایسا دھندا کرنے کی کیا ضرورت۔"

"اپنا چوہدری نور الٰہی ایسے مہاجروں میں نہیں ہے۔" شہ زور خاں مزاری نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کی۔ "یہ تو الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کو تیار ہی نہ تھا۔ میں بہت زور دے کر اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔" جسکانی نے خفیف ہو کر معذرت پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو ان مہاجروں کی بدنیتی بتائی تھی جنھوں نے الاٹمنٹوں کا باقاعدہ کاروبار کر رکھا ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "ویسے جب چوہدری کے پاس پکا کلیم ہے تو اسے ضرور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خیرات تو نہیں مانگ رہا۔ ادھر اتنی ہی اراضی چھوڑ کر آیا ہے۔ اس نے کربانی دی ہے۔ گھربار لٹوایا ہے۔" جسکانی نے رحیم داد کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ "لٹ پٹ کر ادھر آیا ہے۔ سچ پوچھ تو ایسے ہی مہاجروں کی کربانی سے پاکستان بنا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" مزاری نے اس کی تائید کی اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"بدمیل اور داؤد آج بھی نہیں پہنچے۔"

"پہنچ جائیں گے۔ تو پریشان کیوں ہوتا ہے؟ کام بن جائے گا تب ہی آئیں گے۔" جسکانی نے مزاری کو تسلی دی۔

مزاری کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا نظر آرہا تھا۔ تینوں کھانے سے فارغ ہوئے اور اٹھ کر اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ گئے۔

سردار شہ زور خان مزاری رات کو بھی بدمیل اور داؤد خان کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ کئی روز گزر گئے۔

مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ آیا۔

☆

بدمیل خاں سویرے ہی سویرے آگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ کندھے پر دو تاج لٹک رہی تھی۔ یہ پرانی وضع کی بلوچی بندوق تھی۔ اور دیسی ساخت کی تھی۔ پستول سے ذرا بڑی تھی۔ بدمیل بہت تھکا ہارا نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ لمبا سفر طے کر کے پہنچا ہے۔

شہ زور خاں مزاری اس وقت رحیم داد کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ علی محمد جسکانی بھی موجود تھا۔ سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ بدمیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب دستور جھک کر مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اور سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

مزاری نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "بدمیل، تجھے تو پہلے آنا تھا۔ اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"دیر تو ہو گئی سیں پر مجبوری تھی۔" بدمیل نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

مزاری نے دریافت کیا۔ "داؤد کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"وہ ہجر خاں کے ساتھ ہے۔ داؤد کا اس کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب تو حوال سنا۔" مزاری نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

"سیں سردارا!" بدمیل خاں اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ "لہور سے واپسی پر میں اور داؤد اوچ پہنچے۔ سہراب اور ملوک زادی تب تک اوچ ہی میں تھے۔ ہم دونوں جام بیلا میں ہجر خاں کے پاس ٹھہر گئے۔ سیں، تجھے تو پتہ ہی ہے، رادھو بھی اوچ میں ہے اور سہراب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس نے سہراب سے اتنا میل ملاپ بڑھا لیا ہے کہ اس کے بارے میں اسے ذرا بھی شبہ نہیں۔"

"تو نے رادھو کو کچھ دیا بھی؟" مزاری نے پوچھا۔

"پنجا پہلے دیے تھے پنجا لہور سے لوٹنے کے بعد دیے۔ وہ بہت خوش ہوا۔" بدھیل نے بتایا۔

"اب تک اس کے پاس سو روپے پہنچ گئے۔"

"یہ تو نے ٹھیک کیا۔ پر وہ کام بھی ٹھیک ٹھاک کر رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔" بدھیل نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "شام کا اندھارا ہوتے ہی ہر روز میں اور داؤد چھپ کر اس کے پاس اوچ پہنچ جاتے۔ سہراب کے بارے میں پوچھتے۔ اس کا ارادہ تو اوچ میں دو روز ٹھیرنے کا تھا۔ پر اس کے چاچے کا پتر' زردار' چوٹی سے دیر میں لوٹا۔ اس کی واپسی کے بعد ہی سہراب اوچ سے نکلا اور ضلع مظفر گڑھ کی طرف چلا۔"

"اس کے ساتھ اور کون کون تھا؟"

"ملوک زادی تھی۔" بدھیل نے مزاری کی جانب نظریں اٹھائے بغیر بتایا۔ "زردار اور رادھو بھی تھے۔ اوچ سے علی پور کے رستے وہ جتوئی کلاں پہنچے۔ اور وہیں ٹھیر گئے۔ میں' داؤد اور ہجر خاں کے ساتھ ان کے پیچھے لگا رہا۔ پر ہم جتوئی کلاں نہیں گئے۔ سید والا میں ٹھیر گئے۔ سید والا کا فاصلہ جتوئی کلاں سے زیادہ نہیں۔ دو اڑھائی میل ہو گا۔"

"تم نے راستے میں انھیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟" مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

"سئیں سردارا! رستے میں انھیں اٹھانا بہت مشکل ہے۔" بدھیل نے صفائی پیش کی۔ "وہ اونٹھ پر سفر کر رہے تھے۔ سویرے سورج نکلنے کے بعد سفر کرتے اور جب سورج ڈوبنے لگتا تو کسی وستی میں ٹھیر جاتے۔ پکی سڑک ہے۔ دن میں اس پر بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ سڑک کے کنارے وستیاں بھی وڈی ہیں۔ دن میں انھیں اٹھانا خطرناک تھا۔ ہاں' جتوئی کلاں میں ایک رات ہم نے سہراب اور ملوک زادی کو اٹھانے کا پروگرام بنایا۔"

"کیا بنا اس پروگرام کا؟" مزاری نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہم منہ پر منڈا سے باندھ کر اونٹھوں پر بیٹھے اور پچھلی رات کو اس جا پہنچے جہاں سہراب اور اس کے سنگی ٹھیرے تھے۔ میں نے اپنا اونٹھ مکان کی دیوار سے لگایا۔ آرام سے دیوار پر پہنچ گیا۔ سامنے ویہڑے میں سہراب اور ملوک زادی سو رہے تھے۔ زردار اور رادھو مکان کے باہر گہری نیند میں پڑے تھے۔ میں دیوار سے نیچے اترنے ہی والا تھا کہ جاگ ہو گئی۔ کتوں نے بھونک بھونک کر کام خراب کر دیا۔ پر ہم کسی نہ کسی طرح جتوئی کلاں سے صاف بچ نکلے۔ کام بن جاتا تو ہم نے

دونوں کو اٹھانے اور دریا پار کر کے جام پور پہنچنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ دریا پار کرنے کے لیے بیڑی کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔"

"سہراب' ابھی تک جتوئی کلاں میں ہے؟"

"نا سیں! جتوئی کلاں میں تو وہ صرف دو رات اور ایک دن ٹھیرا۔" بدھیل نے مطلع کیا۔ "جتوئی کلاں سے آگے انھیں کینجھر رکنا تھا۔ پر انھوں نے ارادہ بدل دیا۔ سیدھے رحمان والی پہنچے۔ اب تک وہیں ہیں۔"

"آگے کے بارے میں پتہ ہے؟" مزاری نے استفسار کیا۔

"رادھو بتاتا تھا۔ کل سویرے وہ رحمان والی سے نکلیں گے۔ دوپہر تک غازی گھاٹ پہنچیں گے اور دریا پار کر کے سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے چوٹی پہنچ جائیں گے۔ وہاں لغاریوں کے کرندے ان کے لیے موجود ہوں گے۔ وہ بھی شام تک چوٹی پہنچیں گے۔" بدھیل خان سنبھل سنبھل کر بیان کرتا رہا۔ "لغاریوں کے پاس جیپ ہوگی اور وہ سب پوری طرح مسلح ہوں گے۔ وہ سہراب اور ملوک زادی کو اپنی حفاظت میں چوٹی لے جائیں گے۔ رادھو ان کے ساتھ غازی گھاٹ سے آگے نہیں جائے گا۔ واپس اپنے جھوک چلا جائے گا۔ ہاں' زردار ان کے ساتھ چوٹی تک جائے گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر مزاری کی جانب دیکھا۔ "سیں سردارا' میں نے تجھے ساری گالھ بتا دی۔ آگے جیسا تیرا حکم ہو ویسا کیا جائے۔"

علی محمد جسکانی اب تک خاموش بیٹھا تھا اور بدھیل کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور! تو نے جو حوال لینا تھا لے لیا۔ اب آگے کی سوچ۔ دونوں اس بار بھی بچ کر نکل گئے اور چوٹی پہنچ گئے تو دوبارہ تیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ چوٹی سے انھیں اٹھوانا آسان کام نہیں۔ بہت خون خرابہ ہوگا۔ تب بھی کامیابی کی امید بہت کم ہے۔"

"انھیں چوٹی سے پہلے ہی اٹھانا ہوگا۔" مزاری نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ "انھیں ہرگز چوٹی نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"لیکن تجھے بھی ادھر موجود رہنا ہوگا۔" جسکانی نے مشورہ دیا۔

"میرا وہاں موجود ہونا مناسب ہوگا؟"

"مناسب اور نامناسب تو میں جانتا نہیں۔ یہ تیرے طے کرنے کی بات ہے۔" جسکانی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ بدھیل' داؤد اور ہجرا ایسے خطرناک کام کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ مان لے لغاریوں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی تو یہ ان کے سامنے کتنی دیر ٹھیر سکیں

گے۔"

"نا سئیں' ایسا نہ سوچ۔" بدھیل خان نے سینہ تان کر علی محمد جسکانی کی جانب دیکھا۔ "ہم تینوں میں سے بھاگنے والا کوئی نہیں۔ جان دے دیں گے پر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

"جسکانی تجھے پتہ نہیں' تینوں ہی بہت حوصلے والے اور زور آور ہیں۔" مزاری نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "تو انھیں نہیں جانتا بہت مضبوط اور جیالے ہیں۔"

"پر یہ تو سوچ وہ تعداد میں ان سے زیادہ ہوں گے۔ پوری طرح مسلح بھی ہوں گے۔" اس نے نظریں اٹھا کر بدھیل کی طرف دیکھا۔ "میں تو سمجھتا ہوں سراب اور زردار بھی مسلح ہوں گے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"سئیں' تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ مسلح تو سراب اور زردار بھی ہیں۔ وہ تو ہر وقت مسلح رہتے ہیں۔" بدھیل نے جسکانی کو بتایا۔ "ان کے پاس کار بینیں ہیں اور بھری ہوئی رہتی ہیں۔"

جسکانی نے اس دفعہ مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور سن لیا تو نے۔ میرا کہا مان' تو سراب کے پہنچنے سے پہلے ہی غازی گھاٹ کے اس پار پہنچ جا۔ میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔ جتنے مسلح بندے درکار ہوں گے' ساتھ لے لوں گا۔ تجھے تو پتہ ہے' میرے پاس کیسے کیسے زور آور کم دار اور کراوے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "مزارعوں کی ذال اور ڈھور ڈنگر تو اٹھاتے ہی رہتے ہیں' لڑائی ہو تو جم کر لڑتے بھی ہیں۔"

"تیری گالہہ سمجھ آتی ہے۔" شہ زور مزاری رضامند ہو گیا۔ "مجھے بھی وہاں موجود رہنا ہو گا۔" اس نے توقف کیا۔ "پر ایک جیپ کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"ایک نہیں دو جیپیں درکار ہوں گی' تاکہ دونوں کو اٹھا کر فوافٹ نکل جائیں۔" جسکانی نے شہ زور مزاری کو اطمینان دلایا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں جیپوں کا بندوبست کر لوں گا۔" ادھر ڈیرہ غازی خاں میں میرے وڈے سالے سردار ظفر اللہ خاں کھوسہ کی حویلی ہے۔ وہ شکاری بھی ہے۔ اس کے پاس دو جیپیں ہیں۔ ویسے بھی کھوسے تو لغاریوں کے خلاف مزاریوں کے ساتھ ہیں۔ تو کہہ تو اسے بھی بلوا لوں۔"

"نہیں' اسے بلانے کی ضرورت نہیں۔" مزاری نے جسکانی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "تو صرف اس کی دونوں جیپیں منگوا لے۔ آج ہی کسی کو اس کے پاس بھیج دے۔"

"کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی حویلی میں ٹیلی فون بھی ہے۔" جسکانی نے بتایا۔ "میں اسے فون کے ذریعے اطلاع پہنچا دوں گا۔ جیپیں کل صبح تک در اہمہ پہنچ جائیں گی۔ ہم کو آج ہی

رات دراہمہ پہنچنا ہو گا۔ دراہمہ میں اپنا ایک پرانا یار ہے' احمد بخش۔ رات اس کے پاس ٹھہریں گے۔ سویرے جیپوں کے پہنچنے پر آگے نکل جائیں گے۔ سرور والی نزدیک ہی ہے۔ سیم و تھور کا مارا ہوا غیر آباد اور ویران علاقہ ہے۔ وہیں درختوں کی اوٹ میں کہیں گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے اور سہراب کا انتظار کریں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں سرور والی سے گیدڑ والا زیادہ ٹھیک رہے گا۔" مزاری نے تجویز پیش کی۔ "ویسے میں گیدڑ والا گیا نہیں۔ پر اتنا ضرور سنا ہے' ادھر درخت اور جھاڑیاں بہت ہیں۔ چھپ کر گھات لگانے کے لیے بہت ٹھیک جگہ ہے۔ ویسے جو تیری مرضی۔"

"یہ تو وہاں پہنچ کر ہی طے کرنا ہو گا۔" جسکانی نے کہا۔ "بات یہ ہے ادھر کے درخت کاٹ کاٹ کر بہت کچھ صاف کر دیا گیا ہے۔ روز ہی درخت کٹتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "ایسے ہی تیزی سے درخت اور بوٹے کٹتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب دریا کے اس پار چٹیل پدھر رہ جائے گا۔"

مزاری نے قدرے تامل کیا پھر بدھیل کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو نے سارا پروگرام سن ہی لیا۔ اب تو واپس جا۔ داؤد اور ہجر کو ساری گالہہ سنا دے۔ سہراب کی طرف سے پوری طرح چوکس رہنا۔ تو داؤد اور ہجر کے ساتھ کل دوپہر تک پہنچ جانا۔ میں تجھے سرور والی اور گیدڑ والا کے آس پاس ملوں گا۔" اس نے تنبیہہ کی۔ "دیکھ بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ سہراب یا زردار کو ذرا بھی شبہ نہ ہو۔ ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"سئیں سردارا' جیسا تو حکم کرے گا ویسا ہی ہو گا۔" بدھیل نے نہایت مستعدی سے مزاری کو یقین دلایا۔

"اب تو جا۔ میں تیرا' داؤد اور ہجر خاں کا دراہمہ سے آگے بیلے میں انتظار کروں گا۔"

بدھیل خاں نے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا۔ جھک کر مزاری کے قدموں کو چھوا اور خاموشی سے چلا گیا۔

جسکانی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ "دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد ہمیں غازی گھاٹ کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ چار کراوے بھی ساتھ چلیں گے۔"

"دو کافی ہوں گے۔" مزاری نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "زیادہ بندے ہوں گے تو ایک کار سے کام نہیں چلے گا۔ غازی گھاٹ کے اس پار بھی دو سے زیادہ جیپیں درکار ہوں گی۔ تو نے یہ نہیں سوچا' بدھیل' ہجر اور داؤد بھی موجود ہوں گے۔ چوہدری بھی اپنے ساتھ ہی چلے گا۔"

"میں نے تیرے ساتھ جا کر کیا لینا۔" رحیم داد نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"تجھے ڈیرہ غازی خاں نہیں چلنا؟"

"مجھے تو اب لہور واپس جانے دے۔" رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "بعد میں مراد خاں شاہانی کے ساتھ تیرے پاس آجاؤں گا۔"

"سئیں چوہدری، فکر نہ کر۔" جسکانی نے ہنس کر کہا۔ "میرے اور شہ زور کے ہوتے ہوئے تجھے ڈرنے شرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے بڑے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ مارا۔ "گولی پہلے مجھے لگے گی۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہ بتا بندوق چلانی تو آتی ہی ہو گی۔"

"برسوں شکار کھیلتا رہا ہوں۔" رحیم داد نے گردن کو خم دے کر پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "نشانہ بھی سچا ہے۔"

"تب تو گھبرا کیوں رہا ہے؟" جسکانی بدستور مسکراتا رہا۔ "دیکھنے میں بھی تکڑا لگتا ہے۔ حوصلے سے کام لے۔"

جسکانی نے رحیم داد کی مردانگی کو للکارا تھا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ رحیم داد جھٹ تیار ہو گیا۔ "تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو ضرور چلوں گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔"

"شاہانی تیرے بارے میں یہی کہتا تھا۔" مزاری مسکرا کر بولا۔

جسکانی اٹھ کر چلا گیا۔

مزاری نے پہلو بدلا۔ چند لمحے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کسی قدر بے قرار نظر آرہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

تینوں کمرے سے باہر نکلے۔

حویلی کے صدر دروازے پر جسکانی کی فورڈ کھڑی تھی۔ کار تھی تو پرانی مگر بڑی تھی اور کشادہ بھی تھی۔

جسکانی کے دو کارندے بندوقیں زانو پر رکھے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جسکانی کو دیکھتے ہی سب کار سے نیچے اترے۔ پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے سلام کیا۔ اور ایک طرف مودب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

ڈرائیور نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ جسکانی' مزاری اور رحیم داد پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کار کی ڈکی میں مزاری اور رحیم داد کا سامان بھی رکھ دیا گیا۔ اس کے علاوہ کار میں پانی سے بھرا ہوا تھرماس تھا۔ تین رائفلیں بھی تھیں۔

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی اور وہ غازی گھاٹ کی جانب دوڑنے لگی۔

۳۹

حد نظر تک بنجر اور ریگستانی میدان پھیلا تھا۔ کہیں کہیں جال، کریل اور کیکر کے اکا دکا درخت نظر آتے۔ سڑک کچی تھی۔ علی محمد جسکانی کی پرانی فورڈ ہچکولے کھاتی، گرد کے بادل اڑاتی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ گرمی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔ سورج انگارے کی مانند دہکتا تھا۔ لو کے جھکڑ شور مچاتے ہوئے چل رہے تھے۔ بگولے، دائروں میں چکر کاٹتے اور اوپر اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو جاتے۔

جون کا مہینہ اور تپتے ہوئے لق و دق صحرا کا سفر، کار میں بیٹھے ہوئے سب ہی افراد کی حالت گرمی سے ابتر تھی۔ مگر رحیم داد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی پریشان تھا۔ جسکانی اس کے برابر ہی بیٹھا تھا۔ ریگستانی علاقے کے ایسے تکلیف دہ سفر کا عادی بھی تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر رحیم داد کو تسلی دیتا۔ شہ زور مزاری بھی رحیم داد کی دل جوئی کر رہا تھا۔ مگر رحیم داد بالکل خاموش تھا۔ لو سے بچنے کے لیے چہرے کے گرد ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا۔ بار بار تھرماس سے پانی نکال کر پیتا۔ خشک حلق کو تر کرتا۔

کار ریگ زار کا طویل اور صبر آزما سفر طے کرنے کے بعد غازی گھاٹ پہنچی۔ اب دن کا الاؤ سرد پڑ چکا تھا۔ لو کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ سامنے دریائے سندھ تھا۔ پانی کی اونچی نیچی لہریں گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھیں۔ سورج درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ مغرب میں آسمان نارنجی ہو گیا تھا۔ دریا کی سمت سے آتے ہوئے جھونکوں میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ فرحت اور تازگی تھی۔

اس مقام پر دریائے سندھ کی سطح موسم سرما میں بہت گھٹ جاتی تو کشتیوں کے پل بنا دیے

جاتے جن کو بسوں، ٹرکوں اور ایسی ہی دوسری گاڑیوں کے واسطے استعمال کیا جاتا۔ بلکہ کہیں کہیں تو دریا اس قدر خشک پڑ جاتا کہ اس پار جانے کے لیے درمیان سے راستے بن جاتے جن پر ہر طرح کی آمد و رفت رہتی۔ مگر ان دنوں گرمی اپنے شباب پر تھی۔ قراقرم کے فلک بوس پہاڑوں کی برف پگھل رہی تھی۔ پانی کے تیز ریلے سے دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کا پاٹ پھیل کر دس میل سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حد نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ راستے اٹھتی لہروں میں ڈوب کر اوجھل ہو گئے تھے۔ ان دنوں دریا کو اسٹیمر کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ غازی گھاٹ کی چہل پہل رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

ساحل پر اسٹیمر تیار کھڑا تھا۔ برطانوی دور حکومت کی یادگار، یہ پرانا اور بوسیدہ اسٹیمر موسم گرما میں دریا پر آمد و رفت کے لیے اب تک استعمال میں آتا تھا۔ اس کی چمنی سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکل کر شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو رہا تھا۔

ڈرائیور کار کا دروازہ کھول کر سب سے پہلے باہر آیا۔ اس کی ساتھ ہی علی محمد جسکانی کے دونوں مسلح کارندے بھی باہر آ گئے۔ جسکانی، مزاری اور رحیم داد بھی کار سے اتر کر باہر آ گئے۔ سب نے چہروں پر سے ڈھاٹے اتار دیے تھے۔ کچھ دیر کھلی فضا میں کھڑے سورج کی نارنجی کرنوں کو لہروں پر جھلملاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر اسٹیمر کی جانب بڑھے اور سوار ہو گئے۔ صرف کار کا ڈرائیور کنارے پر کھڑا رہا۔

اسٹیمر مسافروں سے بھر گیا۔ آگے بڑھا اور سرکش موجوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ غازی گھاٹ پیچھے رہ گیا۔ مظفر گڑھ کی سرحد ختم ہو گئی۔ اب وہ ضلع ڈیرہ غازی خان کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اسٹیمر سے اتر کر وہ دراہمہ کی جانب روانہ ہوئے جو دریا کے کنارے ہی واقع ہے۔

دراہمہ کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی زمانے میں ڈیرہ غازی خان کا شہر یہیں آباد تھا۔ مگر جب دریائے سندھ نے اپنا راستہ بدلا تو دراہمہ اس کی تند اور تیز لہروں کی زد میں آ گیا۔ برسات میں ہر سال جب دریا چڑھتا تو سیلاب کا ریلا شہر کے ساحلی علاقے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ دراہمہ ٹوٹ پھوٹ کر رفتہ رفتہ اجڑنے لگا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا تھا جس میں ماضی کی یادگار، شکستہ اور اجڑی ہوئی عمارتیں کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔

احمد بخش نے علی محمد جسکانی کو دیکھا تو بڑے تپاک سے پیش آیا۔ شہ زور مزاری اور رحیم داد سے بھی بہت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ جسکانی نے اپنے منصوبے کے بارے میں احمد بخش کو

اعتماد میں نہیں لیا۔ اسے کچھ نہ بتایا۔ سب نے رات کا کھانا کھایا اور جلد ہی بستروں پر لیٹ گئے۔ سفر کی تکان سے چور چور تھے۔ لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ مگر بہت تڑکے بیدار ہو گئے۔ انھوں نے ناشتا کیا اور بے چینی سے جیپوں کا انتظار کرنے لگے۔

پہر دن چڑھے جسکانی کے بڑے سالے' ظفر اللہ خاں کھوسہ' کی دونوں جیپیں ڈیرہ غازی خان سے دراہمہ پہنچ گئیں۔ ایک جیپ میں جسکانی' مزاری اور رحیم داد بیٹھے۔ دوسری میں جسکانی کے دونون مسلح کارندے تھے۔ احمد بخش نے دوپہر کے کھانے تک ٹھہرنے کے لیے اصرار بھی کیا مگر جسکانی نے جلد سے جلد ڈیرہ غازی خاں پہنچنے کا عذر پیش کیا۔ مزید قیام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ احمد بخش نے دو بڑے بڑے ناشتے دانوں میں کھانا بند کر کے ساتھ کر دیا۔ جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور وہ دھول اڑاتی ہوئی روانہ ہو گئیں۔

سڑک پختہ تھی' لیکن آمد و رفت زیادہ نہ تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ لاریوں کا کوئی مستقل اڈا نہ تھا۔ وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ ان دنوں اڈا' دراہمہ کے بجائے سان میں تھا۔ اب لاریاں سان سے گیدڑوالا کے راستے ڈیرہ غازی شہر اور اس سے بھی آگے جاتی تھیں۔

دونوں جیپیں پختہ سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی دوڑتی رہیں۔ سرور والی جلد ہی آ گیا۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ علی محمد جسکانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سیم اور تھور نے پورے علاقے کو اجاڑ بنا دیا تھا۔ مگر سرور والی سے آگے بڑھتے ہی ہریالی نظر آنے لگی۔ سڑک کے دونوں جانب گھنی جھاڑیاں تھیں۔ کیکر' شرینہ اور ٹاہلی کے ساتھ ساتھ جنگلی درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ جگہ جگہ لکڑی کے حصول کی خاطر درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ درختوں کے کٹنے کے باعث اجاڑ میدان بن گئے تھے۔ ان کا سلسلہ دور تک پھیلتا جا رہا تھا۔

جیپیں گیدڑوالا نہ گئیں۔ راستے ہی میں ایک ایسی جگہ ٹھہر گئیں جہاں جھاڑیاں کثرت سے تھیں۔ جسکانی اور شہ زور مزاری جیپ سے اتر کر باہر آئے۔ دونوں نے گردنیں اٹھائیں' ادھر ادھر نظریں دوڑا کر گرد و پیش کا چوکنا نظروں سے جائزہ لیا۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے اور گنجان درخت تھے۔ لمبی لمبی شاخیں پھیل کر اس طرح مل گئی تھیں کہ ان کے سائے میں سڑک کا یہ حصہ روپوش ہو گیا تھا۔ سڑک کے ایک جانب مٹی کے اونچے نیچے تودے بھی تھے۔

جسکانی اور مزاری آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک گھنے درخت کے نیچے چلے گئے۔ اس جگہ ٹھنڈک تھی۔ ہوا کے جھونکے نرم اور فرحت افزا تھے۔ دونوں کچھ دیر صلاح مشورہ کرنے کے بعد واپس سڑک پر آ گئے۔ جیپوں کی سمت بڑھے اور اپنی اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

جسکانی کی ہدایت پر ڈرائیوروں نے جیپوں کو نشیب میں اتار دیا۔ جیپیں ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی، جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی، دھیرے دھیرے آگے بڑھیں اور سڑک سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر مٹی کے ایک بڑے اور اونچے تودے کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں۔ ایک جیپ میں کلہاڑیاں موجود تھیں۔ کارندوں اور ڈرائیوروں نے درختوں کی شاخیں کاٹ کر جیپوں پر ڈال دیں۔ اب وہ اس طرح چھپ گئیں تھیں کہ سڑک پر گزرنے والے انھیں مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔

جسکانی جیپوں کے ڈرائیوروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے دونوں کو اعتماد میں لے کر اپنے منصوبے سے پوری طرح آگاہ کر دیا۔ وہ بالکل ہراساں نہ ہوئے۔ تھے بھی قوی ہیکل، بات چیت اور طور طریق سے بھی بلند حوصلہ نظر آتے تھے۔

☆

دھوپ کی تمازت بڑھنے لگی۔ سورج دہکنے لگا۔ دوپہر ہو گئی۔ جسکانی کے نوکروں نے درختوں کے گھنے سائے تلے چادر بچھائی اور ناشتے دانوں سے کھانا نکال کر لگا دیا۔ مزاری، جسکانی اور رحیم داد کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ مزاری کو بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کا انتظار تھا۔ اس کی بے چین نظریں بار بار سڑک کی جانب اٹھ جاتیں۔ مگر بدھیل، داؤد اور ہجر خاں نظر نہ آئے۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے۔ شہ زور مزاری اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ مگر سڑک پر نہ گیا۔ کچھ فاصلے پر جال کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اب انھیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

مگر اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سرور والی کی سمت سے آنے والے اونٹوں کے عقب میں اسے داؤد خاں دکھائی دیا۔ بدھیل اور ہجر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ مزاری نے فوراً ایک ڈرائیور کو بلایا اور اسے بدھیل اور ہجر خاں کی جانب دوڑایا۔ ذرا دیر بعد وہ تینوں کو اپنے ہم راہ لایا۔ تینوں پسینے سے شرابور تھے۔ تھکے ہوئے تھے اور بھوکے بھی تھے۔

مزاری نے دریافت کیا۔ ”سہراب کے بارے میں کیا خبر ہے؟“ اس کے لہجے سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

”سب خیر اے سیں سردارا!“ بدھیل خاں نے جواب دیا۔ ”تو خوش ہو۔ راضی ہو۔ خیر سلا اے۔“

”پہلے کام کی گالہہ سنا۔“ شہ زور خاں مزاری نے تیوری پر بل ڈال کر اسے ڈانٹا۔

بدھیل اس کے خفا ہونے پر سہم کر رہ گیا۔ ہجر خاں آگے بڑھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے بتایا۔ "سہراب اور زردار دن ڈھلے غازی گھاٹ پہنچ جائیں گے۔ ملوک زادی ان کے ساتھ ہی ہو گی۔ وہ دریا پار کر کے دراہمہ پہنچیں گے۔ کچھ دیر ادھر ٹھہریں گے اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے چورٹہ پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "رادھو نے یہ خبر پہنچائی ہے۔ وہ غازی گھاٹ تک ان کے ساتھ رہے گا۔"

سردار مزاری نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کسی قدر نرم لہجے میں تینوں سے مخاطب ہوا۔ "اب تم جا کر روٹی کھاؤ۔ تھوڑا آرام کرو۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

تینوں خاموشی سے آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ مزاری آگے آگے چل رہا تھا۔ داؤد خاں اور ہجر خان بھی مسلح تھے۔ ان کے پاس دیسی ساخت کا اسلحہ تھا۔

ڈرائیور اور کارندے کھانا کھا رہے تھے۔ بدھیل، داؤد اور ہجر خاں بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ شہ زور مزاری اس طرف نہ گیا۔ وہ علی محمد جسکانی اور رحیم داد کے پاس چلا گیا۔ دونوں کچھ فاصلے پر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ قریب ہی مٹی کے تودے کی اوٹ میں دونوں جیپیں موجود تھیں۔ ان کی چھتوں پر تازہ کٹی ہوئی درختوں کی شاخیں اس طرح جھول رہی تھیں کہ وہ ان میں روپوش ہو گئی تھیں۔

شہ زور مزاری اور جسکانی اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ انھوں نے ہر ایک کی ڈیوٹی کی نوعیت اور ایک ایک تفصیل طے کی۔ صلاح مشورے میں رحیم داد بھی شریک تھا۔ مگر وہ بیشتر وقت خاموش رہا۔ اس نے سرگرمی اور جوش و خروش کا اظہار نہ کیا۔ رحیم داد کے لیے یہ قطعی نیا تجربہ تھا۔ مگر زیادہ ہنگامہ خیز اور حیرت انگیز نہ تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہنگاموں سے دوچار ہو چکا تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب کی جانب جھکتا گیا۔ درختوں تلے ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اب ہر شخص کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے اور چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اکا دکا راہ گیر سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

علی محمد جسکانی انچارج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا مشہور رسہ گیر تھا۔ اس وقت وہ بہت سرگرم نظر آ رہا تھا۔ مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ ڈیوٹیاں مقرر کر رہا تھا۔ اس نے

داؤد، ہجر خاں اور اپنے دونوں کارندوں کو سڑک کی دوسری جانب روانہ کیا۔ داؤد کے ایک کندھے پر بھری ہوئی پلیسنگی لٹک رہی تھی۔ یہ دیسی ساخت کی بھدی اور بدوضع بلوچی بندوق تھی۔ اس کے دوسرے کندھے پر لچھوں کی صورت میں لپٹی ہوئی ایسی مضبوط اور لمبی رسی جھول رہی تھی جو کنواں صاف کرنے والے غوطہ خور ٹوبھوں کے پاس ہوتی ہے۔ رسی کے ایک سرے میں بڑا سا پھندا لگا تھا۔

چاروں، سڑک کے اس پار پہنچے۔ داؤد خاں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر درختوں کا جائزہ لیا۔ سڑک کے بالکل کنارے شیشم کا ایک پرانا اور گھنا درخت تھا۔ داؤد نے اسے اپنے مقصد کے لیے موزوں پایا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے درخت پر چڑھا اور گھنی شاخوں میں اس طرح دبک کر بیٹھ گیا کہ نظر نہ آتا تھا۔

ہجر خاں اور جسکانی کے دونوں مسلح کارندے جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے مٹی کے تودوں کی آڑ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ہجر خاں سب سے شروع میں تھا۔ اس کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ سراب، مرجان اور زردار جیسے ہی گھیرے کے اندر داخل ہوں وہ چوکس ہو جائے، مگر خاموش رہے اور جب تینوں بیچ میں پہنچ جائیں تو سیٹی بجا کر سگنل دے۔

بدھیل خاں، جسکانی کی ہدایت کے مطابق داؤد کے عین مقابل ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ درخت خوب گھنا اور گنجان تھا۔ اس کی موٹی موٹی شاخیں سڑک پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ سامنے کے درختوں کی شاخوں سے مل گئی تھیں۔ اس درخت کے آس پاس جسکانی، مزاری اور رحیم داد جھاڑیوں اور درختوں کے تنوں کی اوٹ میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاس بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ وہ پوری طرح چوکس تھے۔ بدھیل خاں کی زبانی انھیں یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی کہ سراب اور زردار، دونوں ہی مسلح ہیں۔ ان کے پاس بارہ بور کی دیسی قرابین تھیں۔ یہ چوڑے منہ کی چھوٹی چھوٹی بندوقیں تھیں جن سے پستول کی مانند بیک وقت کئی گولیاں چلائی جا سکتی تھیں۔ ڈرائیوروں کے پاس صرف کلہاڑیاں تھیں۔ لہٰذا انہیں عقب میں رکھا گیا تھا اور صرف ضرورت پڑنے پر کمک کے لیے طلب کیا جا سکتا تھا۔

سورج کی روشنی دھیرے دھیرے مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ درختوں تلے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سب اپنے اپنے مورچوں پر چوکنا اور چوکس تھے۔ متجسس نظروں سے سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ وقت اور گزرا۔ دھوپ گہری زرد ہو گئی اور سمٹ کر درختوں کی پھنگیوں پر جھلملانے لگی۔

سرور والی کی سمت سے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ نمودار ہوا۔ بھیڑیں اور بکریاں رک رک کر منہ

سے آوازیں نکال رہی تھیں۔ آگے اور آگے بڑھ رہی تھیں۔ اونچے قد کا ایک نوجوان چرواہا انھیں لمبی چھڑی سے ہنکاتا ہوا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ریوڑ بڑھ کر سامنے پہنچ گیا۔ عین اس وقت دور سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ایک ٹرک قریب پہنچ گیا۔ اب وہ ریوڑ کے عقب میں تھا۔ سڑک پر بھیڑ بکریاں اس طرح بکھری ہوئی تھیں کہ راستہ بند ہو گیا۔

ڈرائیور نے ریوڑ کو راستے سے ہٹانے کے لیے زور زور سے ہارن بجایا۔ بھیڑیں اور بکریاں بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ کچھ نشیب میں اتر کر ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ جسکانی یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ دوسرے بھی گھبرا گئے۔ بھیڑ بکریاں شور مچاتی ہوئی ان کے آس پاس منڈلا رہی تھیں۔ چرواہا چھڑی سنبھالے ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے سڑک خالی پائی تو رفتار تیز کر دی اور گرد و غبار کے بادل اڑاتا آن کی آن میں دور نکل گیا۔

چرواہے نے جسکانی کے دونوں کارندوں اور ہجر خاں کو دیکھ لیا۔ ان کے ڈھاٹوں سے چھپے ہوئے چہروں، چمکتی آنکھوں اور ہاتھوں میں دبی ہوئی بندوقوں پر نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے کسی سے نظر نہ ملائی، نہ ہی منہ سے آواز نکالی۔ جلدی جلدی بھیڑ بکریوں کو اکٹھا کیا اور سڑک پر لے گیا۔ جب پورا ریوڑ اکٹھا ہو کر سڑک پر پہنچ گیا تو اسے ہنکاتا ہوا وہ گیدڑ والا کی سمت بڑھا۔ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ چرواہا اور اس کا ریوڑ جلد ہی اڑتی ہوئی دھول میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سڑک پر اب ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ بھیڑ بکریوں کے پیروں اور ٹرک کے پہیوں سے جو خاک دھول اڑی تھی، رفتہ رفتہ شام کی جھٹپٹے میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ سورج اونچے اونچے درختوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ درختوں کے نیچے تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ رادھو کی اطلاع کے مطابق سراب، مرجان اور زردار کو اب تک گزر جانا چاہیے تھا۔ انھیں شام ہونے سے پہلے پہلے چورٹہ پہنچنا تھا جہاں لغاریوں کے مسلح کارندے ان کے منتظر تھے۔

مزاری چند منٹ تک خاموش کھڑا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جسکانی کے قریب پہنچا۔ اسے مخاطب کیا۔ "جسکانی، تو نے ٹرک کو غور سے دیکھا تھا؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"دیکھا تو تھا۔" علی محمد جسکانی نے بتایا۔ "پر دھول مٹی اتنی اڑ رہی تھی کہ کچھ نظر نہ آیا۔ نہ ڈرائیور دکھائی دیا اور نہ ہی یہ نظر آیا کہ اس کے ساتھ کون بیٹھا تھا۔" اس نے تامل کیا۔ "بھیڑ بکریوں نے الگ تنگ کر رکھا تھا۔ پر خیریت ہوئی کہ چرواہا ادھر نہ آیا۔"

"وہ ادھر تو نہیں آیا پر جس طرح مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس نے دوسری طرف درختوں تلے ہجر خاں اور تیرے کراووں کو دیکھ لیا تھا۔"

"لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔" جسکانی نے بھی اس کے وسوسے کی تائید کی۔

"دیکھ لیا تو دیکھ لینے دے۔ مجھے اس کی اتنی فکر نہیں۔" مزاری نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "بار بار یہ خیال تنگ کر رہا ہے کہ سہراب کو اب تک یہاں سے گزر جانا چاہیے تھا۔" اس نے بے چین نگاہوں سے جسکانی کے چہرے کو دیکھا۔ "تینوں ٹرک میں تو نہیں بیٹھے تھے؟"

"ہو سکتا ہے وہ اسی میں بیٹھے ہوں۔" جسکانی نے دبی زبان سے اپنے شبے کا اظہار کیا۔

"ایسا ہے تو سمجھ لے' تینوں صاف بچ کر نکل گئے۔" شہ زور مزاری کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" جسکانی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اب تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" شہ زور نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ ان کا پیچھا کیا جائے۔" جسکانی نے تجویز پیش کی۔ "ٹرک زیادہ دور نہ گیا ہو گا۔ ڈرائیور بھی اپنے پاس بہت ہوشیار ہیں۔ دونوں جیپیں دوڑا کر رستے ہی میں ٹرک کو گھیر لیں گے۔"

مزاری خاموش رہا۔ مگر علی محمد جسکانی خاموش نہ رہا۔ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ "بول کیا کہتا ہے۔ جو فیصلہ کرنا ہے فٹافٹ کر۔"

مگر شہ زور خاں مزاری کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مشرق سے امڈتا ہوا شام کا دھندلکا ہر سو یلغار کر رہا تھا۔ ناگاہ دور سے اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں ابھریں۔

گھنٹیوں کی آوازیں شام کے سناٹے میں گونجتی رہیں۔ رفتہ رفتہ قریب' اور قریب آتی گئیں۔ ان آوازوں سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ دراہمہ سے اونٹوں کا کوئی قافلہ آ رہا ہے۔ سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ پوری طرح چوکنا اور چوکس ہو گئے۔ ان کے کان گھنٹیوں کی آوازوں پر لگے تھے۔

سردار شہ زور مزاری کے ذہن میں مسلسل یہ وسوسہ کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا کہ سہراب' مرجان اور زردار ٹرک میں موجود تھے' اور صاف بچ کر نکل گئے۔ وہ ان کا تعاقب بھی نہ کر سکا۔ اتنی

مہلت ہی نہ ملی۔ وہ دل شکستہ اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔

رحیم داد بھی قریب کی ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں دبکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ مستعدی سے اپنی رائفل سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے مڑ کر شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔ چاہا کہ نزدیک جا کر اس کی دل جوئی کرے۔ اس کا حوصلہ بڑھائے۔ مگر وہ اس کے پاس نہ جا سکا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں جما ہوا کھڑا رہا اور چوکنا نظروں سے اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھنٹیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

☆

گھنٹیوں کی آوازیں بہت قریب آ گئیں۔ اونٹ اب درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئے تھے۔ وہ ایک قطار میں چل رہے تھے۔ ان پر لکڑیوں کے گٹھے اور سرکنڈوں کے پولے لدے ہوئے تھے۔ اونٹ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

سات اونٹ ایک ایک کر کے سامنے سے گزر گئے۔

سب دم بخود تھے اور نظریں اٹھائے گزرتے ہوئے اونٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں تجسس تھا۔ جستجو تھی۔ ہر آنکھ بے چینی سے سہراب، مرجان اور زردار کو تلاش کر رہی تھی۔ اونٹ ان کی بے چینی سے بے نیاز سڑک پر چلتے رہے۔ ان کی گردنوں میں پڑی ہوئی بڑی بڑی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ ناگاہ گھنٹیوں کے شور میں سیٹی بجنے کی تیز آواز ابھری۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھیں سگنل مل چکا تھا۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔

ساربان اونٹوں پر بیٹھے تھے یا نکیل پکڑ کر آگے آگے چل رہے تھے۔ شام کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ داؤد خاں درخت کی گھنی شاخوں میں دبکا ہوا چوکس بیٹھا تھا۔ سیٹی سنتے ہی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر اونٹ کو دیکھنے لگا۔ اونٹ اس کے سامنے سڑک پر گزر رہے تھے۔ قطار کے دو آخری اونٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ ایک پر زردار سوار تھا۔ دوسرے پر مرجان، سہراب کے پہلو سے لگی ہوئی کجاوے میں بیٹھی تھی۔

زردار کا اونٹ آگے تھا۔ جب وہ عین اس درخت کے قریب سے گزرا جس پر داؤد خاں بیٹھا تھا تو زردار کا چہرہ صاف نظر آیا۔ داؤد نے جھٹ کندھے پر پڑی ہوئی رسی اتاری۔ اسے گھما کر زور سے زردار کی جانب پھینکا۔ مگر نشانہ چوک گیا۔ رسی کا پھندا زردار کے بجائے اونٹ کی گردن میں پڑا۔ داؤد نے فوراً جھٹکا دیا۔ پھندا تنگ ہو گیا۔ اونٹ بدکا۔ جھنجلا کر زور سے بلبلایا۔ اس کے قدم ڈگمگائے لیکن گرا نہیں۔ جلد ہی سنبھل گیا۔

زردار نے اونٹ کے گلے میں رسی کا پھندا دیکھا تو جھٹ پلٹا۔ درخت کی جانب دیکھا۔ اپنی قرابین اٹھائی۔ تابڑتوڑ دو گولیاں چلائیں۔ ایک گولی داؤد خاں کے کان کے برابر سے سنسناتی ہوئی گزری۔ وہ گھبرا گیا۔ اور گھبراہٹ میں رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اونٹ خوف زدہ ہو کر سرپٹ بھاگا۔ داؤد نے اپنی بلیسٹگی سے زردار پر گولی چلائی۔ وہ دوسری گولی چلا نہ سکا۔ زردار کا اونٹ دور جا چکا تھا۔ دھندلی روشنی میں وہ پرچھائیں کی مانند نظر آرہا تھا۔ گولیوں کی آوازوں سے دوسرے اونٹ بھی بدکے۔ بلبلاتے چیختے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے غول کی صورت میں تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگے۔

ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ مگر بدھیل خان نے خود کو قابو میں رکھا۔ سہراب کا اونٹ جیسے ہی درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کے نیچے پہنچا بدھیل چھلانگ لگا کر کجاوے میں کود گیا۔ مرجان نے اسے دیکھ کر زور سے چیخ ماری۔ بدھیل نے اس کی جانب توجہ نہ دی۔ آگے جھکا اور سہراب کے اس ہاتھ پر تھپکی دی جس میں بھری ہوئی قرابین دبی تھی۔ قرابین سہراب کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ بدھیل نے جھپٹ کر سہراب کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اونٹ کی مہار سہراب کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اونٹ بے قابو ہو کر سڑک سے نشیب میں اتر گیا۔ لیکن زیادہ دور نہ جا سکا۔ جھاڑیوں سے الجھ کر رک گیا۔ مرجان کجاوے میں بیٹھی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بدھیل اور سہراب گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے کجاوے سے لڑھک کر نیچے گر گئے۔ سہراب نے زمین پر پہنچتے ہی خود کو بدھیل کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ مگر بدھیل نے اسے نکل بھاگنے کا موقع نہ دیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پھر سہراب سے لپٹ گیا۔ سہراب ماشیارہ چکا تھا۔ اس کا بدن مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں زبردست کس بل تھا۔ اس نے پلٹ کر بدھیل کے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ رسید کیا۔ چوٹ کراری آئی۔ بدھیل چکرا گیا۔ ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سہراب نے دوبارہ آزاد ہونے کی کوشش کی۔ بدھیل اونچی آواز سے چیخا۔

"سیں سردار، میں نے سہراب کو پکڑ رکھا ہے۔"

بدھیل کی آواز سنتے ہی سردار شہ زور خان مزاری تیزی سے اس سمت لپکا۔ علی محمد جسکانی اور رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑے۔

مزاری کو دیکھتے ہی سہراب سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا۔ لیکن مزاری اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے سہراب کے کندھے پر رائفل کا بٹ زور سے مارا۔ ہاتھ تلا ہوا پڑا۔ سہراب کی

آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لڑکھڑا کر گرا۔ مگر جاندار اور توانا تھا' جھٹ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔

مزاری غصے سے دھاڑا۔ "نمک حرام' اٹھنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔"

سہراب نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جس طرح گرا تھا ویسے ہی زمین پر پڑا رہا۔ آن کی آن میں جسکانی اور رحیم داد بھی پہنچ گئے۔ ہجر خان' داؤد اور دونوں کارندے بھی ان کے پیچھے پیچھے نمودار ہوئے۔ ڈرائیور بھی کلہاڑیاں سنبھالے ہوئے پہنچ گئے۔ سہراب سب کے نرغے میں خاموش پڑا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

سڑک اب بالکل سنسان تھی۔ اونٹوں کا غول سرپٹ بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھ زردار بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ داؤد خان اس کے نکل بھاگنے پر نادم اور شرمندہ تھا۔ مزاری نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"داؤد' تو بتا۔ زردار کا کیا بنا؟"

داؤد نظریں جھکا کر بولا۔ "سیں وہ جتوالوں کے ساتھ ہی نکل گیا۔"

"تو نے اسے نکل جانے دیا۔" مزاری نے غصے سے ڈانٹا۔

داؤد گڑگڑا کر عاجزی سے بولا۔ "سیں' میں نے رسے کا پھندا اس پر پھینکا تھا۔ پر وہ اونٹھ کی گردن میں پڑا۔ زردار نے جھٹ میری طرف گولی چلا دی۔ رسہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔"

مزاری قہر آلود نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ بدھیل جھٹ داؤد کے آڑے آگیا۔ اس نے ہونٹوں سے رستا ہوا خون پونچھا۔ اور ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "سیں سردارا' سہراب کا اونٹھ ادھر جھنگر میں کھڑا ہے۔ ملوک زادی اس کے کجاوے میں بیٹھی ہے۔"

مزاری نے بدھیل اور داؤد خاں کو اس طرف روانہ کیا۔ فوراً اونٹ لانے کی ہدایت کی۔

ہجر خان اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ "سیں سردارا' اس نے زبردست دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔" اس نے سہراب کی جانب ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ اور زردار جتوالوں کے اونٹھوں کے پیچھے پیچھے اپنے اونٹھ لگائے ہوئے تھے۔ ان کی اوٹ میں چھپ کر نکل جانا چاہتے تھے۔ پر میں نے جھٹ پہچان لیا۔ فوراً سیٹی مار کر سب کو خبردار کر دیا۔"

"تو نے بہت ہوشیاری دکھائی۔" شہ زور خان مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر داؤد سے چوک ہو گئی۔ زردار بچ کر صاف نکل گیا۔"

جسکانی بولا۔ "بدھیل نے زبردست کام دکھایا۔ لگتا بھی پھرتیلا اور زور آور ہے۔"

"کام تو سچ پوچھ' بدھیل ہی نے دکھایا۔" مزاری نے علی محمد جسکانی کی تائید کی۔ "وہ ہمت اور

پھرتی سے کام نہ لیتا تو زردار کی طرح یہ بھی نکل جاتا۔" اس نے زمین پر پڑے ہوئے سہراب کو حقارت سے دیکھا۔

بدھیل اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے واپس آگیا۔ داؤد خان اس کے ہم راہ تھا۔ مرجان کجاوے میں سر جھکائے زخمی فاختہ کی مانند سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دھندلی روشنی میں وہ ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مزاری کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکلنے لگیں۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ صرف خونخوار نظروں سے مرجان کو گھورتا رہا جس نے بکل مار کر چادر کے پلو سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

علی محمد جسکانی نے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ محسوس کیا۔ وہ مزاری کو ایک طرف لے گیا۔ اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر بولا۔ "شہ زور' اب فی الفور یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ زردار بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ سیدھا چورٹہ پہنچے گا۔ لغاریوں کو فوراً سب کچھ بتا دے گا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ سہراب اور مرجان مدت سے لغاریوں کے باہوٹ ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ ان کی آن اور مزاواری کا سوال ہے۔ وہ فوراً یہاں پہنچنے اور سہراب اور ملوک زادی کو چھڑا کر لے جانے کی کوشش کریں گے۔"

"تو کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔" شہ زور خان مزاری نے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "آگے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دراہمہ واپس چلتے ہیں۔ رات احمد بخش کے پاس گزاریں گے۔ تڑکے ہی تڑکے نکل کھڑے ہوں گے۔ تو ڈیرہ غازی خاں شہر تک ہمارے ساتھ چلنا۔ میں وہاں سے اپنی وستی' شاہ میر' چلا جاؤں گا۔ تو واپس محمود کوٹ چلا جانا۔" اس نے جسکانی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

مگر جسکانی نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "سب سے مشکل سوال یہ ہے کہ یہاں سے نکلنے کے لیے کون سا راستہ پکڑا جائے۔ دراہمہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ احمد بخش اتنا وڈا زمیں دار نہیں ہے کہ لغاریوں کے خلاف ہماری پوری طرح حفاظت کر سکے۔ اور یہ تو تجھے بھی پتہ ہونا چاہیے کہ لغاری دراہمہ ضرور پہنچیں گے۔ ان کے ساتھ بندے بھی زیادہ ہی ہوں گے۔ ہر طرح کا اسلحہ بھی ہوگا۔ پوری تیاری کر کے آئے ہوں گے۔"

"گالہہ تو تیری سمجھ آتی ہے۔" مزاری کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا' پھر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے جوش سے بولا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ چورٹہ ہی چلتے ہیں۔ شہر جانے کا اور دوسرا تو کوئی رستہ نہیں' چورٹہ میں لغاریوں نے روکا تو کیا ہوگا۔

گولی ہی تو چلے گی، چلنے دے۔ میں سہراب اور مرجان کو پہلے ہی گولی مار دوں گا۔ ان کی لاشیں لغاریوں کے سامنے پھینک دوں گا۔ یہ میری عزت اور مڑاواری کا سوال ہے۔ آگے جو ہونا ہے دیکھ لیں گے۔"

"ایسا ہی کرنا ہے تو چورٹہ کیوں جانا چاہتا ہے۔ ٹھیر کر لغاریوں کا انتظار کر۔ یہیں فیصلہ ہو جائے گا۔" جسکانی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ لہجہ بھی تیز اور تیکھا تھا جسے شہ زور مزاری نے بھی محسوس کیا۔

"نراض نہ ہو۔" مزاری نے سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بتا، اب کیا کیا جائے۔ تو نے تو اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہو گا۔"

"تجھے پتہ نہیں۔ دراہمہ کے نزدیک سے بھی ایک رستہ شہر کی طرف جاتا ہے۔" علی محمد جسکانی نے بتایا۔ "اسے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا ہے۔ میں نے تو یہاں سے نکلنے کے لیے وہی رستہ سوچ رکھا تھا۔ یہ رستہ چورٹہ سے اڑھائی میل نیچے سے گزرتا ہے۔ اس رستے کو پکڑنے میں لغاریوں سے مڈ بھیڑ ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔"

" یار تو نے تو کمال کر دیا۔" مزاری نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "مجھے تو ادھر کے رستوں کا کچھ اتا پتا نہیں۔ تو نے یہ گالہ پہلے ہی بتا دی ہوتی۔"

"پہلے ہی بتا دیتا۔ پر تو نے اس بارے میں مجھ سے پوچھا ہی کب۔ میں تو سمجھتا تھا تجھے ادھر کے رستوں کا ٹھیک طرح پتہ ہو گا۔" جسکانی نے وضاحت کی۔ "آگے جو کچھ کرنا ہے وہ فٹافٹ کر۔ چورٹہ زیادہ دور نہیں۔ زرداد اب تک وہاں پہنچ چکا ہو گا۔"

مزاری نے مزید بات چیت نہ کی۔ بڑھ کر بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کے پاس پہنچا۔ انھیں ضروری ہدایات دیں۔ فوراً ہی جیپوں پر سے کٹی ہوئی شاخیں ہٹائی گئیں۔ بدھیل اور داؤد نے پگڑیوں سے سہراب کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ مگر مرجان کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ ملوک زادی تھی۔ ان کی نظروں میں ابھی تک اس کی عزت تھی۔ وہ اسے چھونے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

☆

سردار شہ زور مزاری نے مرجان کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ سہراب کے ساتھ فرار ہونے کے بعد سیاہ کار بن چکی تھی۔ شہ زور مزاری غصے سے دھاڑا۔ "کالی۔" اس نے مرجان کے لانبے لانبے سیاہ بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ مرجان کے حلق سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔ وہ کجاوے سے نکل کر زمین پر آ گئی۔

مزاری اسے کھینچتا ہوا ایک جیپ تک لے گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ جیپ کی پچھلی نشست پر دھڑام سے گری۔

داؤد اور بدھیل نے سہراب کو بھی مرجان کے ساتھ ہی بٹھا دیا۔ بدھیل اپنی بھری ہوئی دیسی ساخت کی بلوچی بندوق و تاج کے ساتھ دونوں کے قریب بیٹھ گیا۔ مزاری کی ہدایت پر داؤد اور بجر خاں بھی ڈرائیور کے برابر اسی جیپ میں سوار ہو گئے۔

مزاری دوسری جیپ میں جسکانی اور رحیم داد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جسکانی کے دونوں کارندے ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ سب پوری طرح مسلح اور چوکس تھے۔

جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہوئے۔ جیپیں آگے بڑھیں اور جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی نشیب سے نکل کر سڑک پر آگئیں۔ جیپیں اب دراہمہ کی جانب دوڑ رہی تھیں۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔

سرور والی سے گزر کر جیپیں آگے بڑھیں۔ اور رفتہ رفتہ دراہمہ سے قریب ہوتی گئیں۔ مگر دراہمہ ابھی میل سوا میل کے فاصلے پر تھا کہ عقب میں درختوں کی آڑ سے تیز روشنی ابھری۔ جسکانی کی ہدایت پر دونوں جیپوں کی بتیاں فوراً بجھا دی گئیں۔

علی محمد جسکانی نے مزاری کو خبردار کیا۔ ”لگتا ہے لغاری آگئے۔“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ شہ زور خاں مزاری نے بھی اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”اب کیا کیا جائے؟“

جسکانی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیوروں کو حکم دیا کہ جیپیں سڑک کے نشیب میں اتار دی جائیں۔ سڑک کے ایک جانب اجاڑ میدان تھا۔ مگر دوسری طرف جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ دونوں جیپیں اس طرف نشیب میں اتار دی گئیں اور کچھ دور جانے کے بعد جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں۔

سب جلدی جلدی جیپوں سے باہر نکلے اور درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ مگر بدھیل جیپ سے نیچے نہ اترا۔ وہ سہراب اور مرجان کی جانب اپنی بھری ہوئی وتاج تانے نہایت چوکنا بیٹھا تھا۔ سہراب اور مرجان کے منہ میں اس طرح کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا کہ اگر وہ کوشش بھی کرتے تو آواز نہ نکلتی۔

روشنی رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی سڑک پر پہیوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ سب زمین پر لیٹ گئے۔ ان کے ہاتھوں یں بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ اور ان

کی نالیوں کا رخ سڑک کی جانب تھا۔

شہ زور خان مزاری دم سادھے جسکانی کے برابر ہی زمین پر لیٹا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں جسکانی سے کہا۔ "میرا تو جی کرتا ہے کہ کالے اور کالی کو گولی ماردوں۔" اس کا اشارہ سہراب اور مرجان کی طرف تھا جو بلوچوں کے قبائلی قانون کی رو سے زانی اور سیاہ کار تھے۔ لہٰذا واجب القتل تھے۔ "دونوں کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ لغاریوں کو اگر ملیں تو صرف ان کی خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں ملیں۔"

"فضول باتیں نہ کر۔" جسکانی نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تو کالے اور کالی کو بعد میں بھی سزا دے سکتا ہے۔ تو نے یہ بھی سوچا، گولی کی آواز سے لغاریوں کو صاف پتہ چل جائے گا کہ ادھر ہم چھپے ہوئے ہیں۔ تو چپ کر کے دیکھتا جا۔"

عین اس وقت ایک موڑ سے تین جیپیں نکل کر سامنے آ گئیں۔ ان کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ سب دم سادھے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں چورٹہ کی سمت سے آنے والی جیپوں پر جمی تھیں اور ہاتھ بندوقوں کی لبلبی پر تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ کر جیپوں کی رفتار سست پڑ گئی۔ ان میں درجن بھر سے بھی زیادہ افراد بیٹھے تھے۔ سب بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ ان کی نظریں درختوں اور جھاڑیوں کی جانب اٹھی تھیں۔

مگر دونوں جیپیں رکی نہیں۔ ان کی رفتار میں اضافہ ہوا اور تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ وہ دراہمہ کی سمت جا رہی تھیں۔ جب ان کی پچھلی بتیوں کی سرخ روشنی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو جسکانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مزاری نے جسکانی سے دریافت کیا۔ "جیپوں میں لغاری ہی بیٹھے تھے نا؟ مجھے تو لغاری ہی لگتے تھے۔"

"ہاں وہی تھے اور کون ہو سکتا ہے۔"

"دراہمہ کی طرف گئے ہیں۔" مزاری نے کہا۔ "رستہ صاف ہے۔ کیوں نہ اب ہم چورٹہ کے رستے نکل جائیں۔ اب ادھر اپنا رستہ روکنے والا کوئی نہ ہو گا۔"

"نہیں، ادھر جانا خطرے سے خالی نہیں۔" جسکانی نے شہ زور خاں مزاری کی تجویز رد کر دی۔ "ادھر سے ایک کچا رستہ جاتا ہے۔ کچھ دور جا کر ٹھنڈی سڑک سے مل جاتا ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ویسے یہ رستہ خراب اور اونچا نیچا ہے۔ کہیں کہیں گڑھے اور کھنڈ ہیں۔ پر رستہ زیادہ لمبا نہیں۔ اب تو سب سے محفوظ یہی رستہ ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔ مجھے تو ادھر کے رستوں کا کچھ اتا پتا نہیں۔" مزاری نے علی محمد جسکانی سے اختلاف رائے نہیں کیا۔ اس کا مشورہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

ایک بار پھر سب جلدی جلدی جیپوں میں بیٹھ گئے۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ لغاری کسی بھی وقت دراہمہ سے واپس آسکتے تھے۔ دونوں جیپیں سڑک پر آگئیں۔ مگر فرلانگ بھر راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ جسکانی کی ہدایت پر نشیب میں اتر گئیں۔ اور ایک کچے راستے پر اندھیرے میں ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ ڈرائیور محتاط اور چوکنا تھے۔ جیپوں کو سنبھال سنبھال کر چلا رہے تھے۔

علی محمد جسکانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستہ سخت ناہموار تھا۔ بار بار جیپوں کا توازن بگڑ جاتا۔ الٹنے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ اب ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گرمیوں کی بوجھل اور بے کیف رات تھی۔ آسمان پر غبار چھایا تھا۔

کچا اور ناہموار راستہ زیادہ طویل نہ تھا۔ ڈیڑھ دو میل جنوب کی سمت جانے کے بعد ٹھنڈی سڑک آگئی۔ یہ بہت قدیم سڑک تھی۔ کنکروں کی بنی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کنکر جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھی۔ اور ان کے اکھڑنے سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ بلندی پر پھیلی ہوئی دونوں طرف کی شاخیں اس طرح ایک دوسرے سے مل گئیں تھیں کہ سڑک پر چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا گویا کسی محراب کے نیچے سے گزر رہے ہوں۔ موسم گرما میں راہ گیروں کے لیے یہ سڑک بہت ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی۔ مگر اس وقت ہوا بند تھی۔ فضا میں امس اور گھٹن تھی۔

دونوں جیپیں ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ان کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ دو ڈھائی میل فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ جیپیں بھی اسی جانب مڑ گئیں۔ آگے اور آگے بڑھتی گئیں۔

ٹھنڈی سڑک ختم ہو گئی۔ جام پور روڈ آگئی۔ دونوں سڑکیں ایک پل پر ملتی تھیں۔ پل کے نیچے نہر تھی جو عرصہ دراز سے خشک پڑی تھی۔ پل پر پہنچ کر دونوں جیپیں ٹھہر گئیں۔ جسکانی، مزاری اور رحیم داد اتر کر باہر آئے۔ بجر خان، داؤد، جسکانی کے کارندے اور دونوں ڈرائیور بھی باہر آگئے۔ صرف بدھیل اپنی رائفل سنبھالے سہراب اور مرجان کی نگرانی کے لیے ایک جیپ کی پچھلی نشست پر چوکس بیٹھا رہا۔

جسکانی نے کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں بھریں۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ جسکانی نے مسکرا کر سردار شہ زور خاں مزاری سے کہا۔ "آگے رستہ بالکل صاف ہے۔ اب تو بے

کھسکے چلا جا۔"

"روجھان تک تو ساتھ چل۔" مزاری نے اصرار کیا۔

مگر علی محمد جسکانی رضامند نہ ہوا۔ "مجھے اب ڈیرہ غازی خاں جانا ہے۔ رات شہر میں ظفراللہ خاں کھوسہ کی حویلی میں ٹھیروں گا۔ سویرے محمود کوٹ چلا جاؤں گا۔ تو راجن پور جا کر ٹھیر جانا۔ اکیلا شاہ میر تک کیسے جیپ چلائے گا۔"

"ارادہ تو یہی ہے۔ مگر میں تیرے ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں راستے میں کہیں ٹھیروں گا نہیں۔ سیدھا شاہ میر جاؤں گا۔" مزاری نے جسکانی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ "راجن پور میں جیپ ڈرائیور کو دے دوں گا۔ آگے وہی چلائے گا' وہی جیپ کو واپس ڈیرہ غازی خان شہر لے جائے گا۔ البتہ تو داؤد اور ہجر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔ میری جیپ میں ان کے لیے جگہ نہیں نکلے گی۔ سویرے دونوں کو واپس روانہ کر دینا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" جسکانی نے پس و پیش نہ کی۔ "میں داؤد اور ہجر خاں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"تو نے بہت کام دکھایا۔" مزاری نے کھل کر جسکانی کی تعریف کی۔ "تو نہ ہوتا تو یہ دونوں میرے ہاتھ نہ آتے۔" اس نے سہراب اور مرجان کی طرف اشارہ کیا۔ "صاف نکل جاتے یا لغاری ان کو نکال لے جاتے۔ تو نے بہت مدد کی۔ ہر کام آرام سے ہو گیا۔ نہ گولی چلی نہ خون خرابہ ہوا۔"

"ایسی گالہ نہ کر۔" جسکانی نے ہنس کر کہا۔ "مدد شدد کیا کرنی' یہ تو میرا اپنا کام تھا۔ تجھ سے یاری جو ٹھیری۔ میں اور تو الگ تو نہیں ہیں۔" جسکانی نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ "اب تو جا' دیری نہ کر۔ ابھی تجھے لمبے سفر پر جانا ہے۔"

جسکانی آگے بڑھ کر مزاری سے بغل گیر ہوا۔ رحیم داد کو بھی گلے سے لگایا۔ دونوں سے رخصت ہو کر جیپ کی جانب بڑھا اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کارندے بھی ہجر خاں اور داؤد کے ساتھ پچھلی نشست پر کسی نہ کسی طرح بیٹھ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوا۔ ڈرائیور نے جیپ موڑی اور ڈیرہ غازی خاں شہر کی جانب روانہ ہو گئی۔

مزاری خاموش کھڑا اسے دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ اپنی جیپ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ ڈرائیور بھی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ جیپ نہیں چلا رہا تھا۔

مزاری اسٹرینگ وھیل سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کیا۔ کلچ دبا کر گیئر بدلا

ایکسی لیٹر ایک پیر سے دبایا۔ جیپ سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ جیپ دوڑتی رہی۔ جام پور سے گزر کر کوٹلہ دیوان پہنچی۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ مزاری بہت تھک گیا تھا۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ اس کا ہاتھ بہک جاتا۔ ایسے عالم میں جیپ چلانا خطرناک تھا۔ اس نے ایک سنسان مقام پر جیپ روک لی۔ ایک بار پھر باہر آیا۔

ڈرائیور نے اس کی ہدایت پر جیپ کے پچھلے حصے کے گرد چادر باندھ دی۔ آسمان کی رنگت اب بدلنے لگی تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی آگئی تھی۔ صبح کی آمد کے آثار ہویدا ہونے لگے تھے۔

سراب اور مرجان کا کھلی جیپ میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ویسے بھی بلوچ سرداروں اور بڑے زمین داروں کی مستورات کا کھلی جیپ میں سفر کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جاگیردار گھرانوں کی وہ خواتین جو پڑھ لکھ کر ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن بن گئی تھیں اور یورپ اور امریکہ میں دھڑلے سے بے پردہ گھومتی تھیں، اپنے علاقے میں پہنچتیں تو چادر سے خود کو اس طرح چھپا لیتیں کہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آتا۔ کھلی جیپوں میں بیٹھتیں تو ان پر چادر کا پردہ پڑا ہوتا۔

شہ زور مزاری نے جیپ کا اسٹیرنگ وہیل ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔ خود بندوق سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اس کی پشت پر سراب تھا۔ مرجان تھی۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے منہ میں ٹھسے ہوئے کپڑے نکال دیے گئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مطلق نیند کا گزر نہ تھا۔ وہ جاگ رہے تھے۔ بدھیل بھی جاگ رہا تھا۔ اور اپنی وتاج سنبھالے چوکس بیٹھا دونوں کی کڑی نگرانی کر رہا تھا۔

جیپ تیز رفتار سے سنسان سڑک پر دوڑتی رہی۔ راجن پور پہنچی۔ مگر مزاری وہاں نہ رکا۔ جیپ روجھان شرقی کی سمت دوڑتی رہی۔ مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ دن کی آمد آمد تھی۔

جیپ دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ دھوپ پھیلنے لگی۔ جیپ مزاریوں کے علاقے، روجھان شرقی، کی حدود میں داخل ہوئی۔ آگے بڑھی۔ شہ زور کے آبائی گاؤں شاہ میر میں پہنچی اور مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی کوٹ کے بڑے دروازے پر رک گئی۔ تمازت اب بڑھ گئی تھی۔ موسم گرما کا سورج آگ کے گولے کی مانند دہکنے لگا تھا۔

☆

کوٹ سے ملحق نیم پختہ اور پرانی عمارت تھی۔ اس میں بہت بڑا تہہ خانہ تھا۔ تہہ خانہ تاریک

تھا۔ فرش کچا تھا۔ ہر طرف سیلن اور نمی تھی۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف چھت کے قریب دو مختصر روشن دان تھے جن پر لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔

یہ تہہ خانہ، جس سے سڑاند اور بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے، سردار شہ زور خاں مزاری کی ذاتی جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مردوں اور عورتوں کی علیحدہ علیحدہ جیل تھی۔ ان کے دروازے بھی علیحدہ تھے۔ قیدیوں کو کھانے میں عام طور پر ڈوڈھا دیا جاتا تھا۔ اس میں جوار کی روٹی کے ساتھ شلجم کے پتوں کا ساگ ہوتا۔ گندم کی روٹی ہفتے میں ایک بار دی جاتی۔ اس کے ساتھ پتلی دال ہوتی۔ مگر کھانے پر جو خرچ آتا قیدیوں کے عزیز و اقارب سے وصول کیا جاتا۔ اور جتنا خرچ آتا اس سے زیادہ وصول کیا جاتا۔ خرچ نہ پہنچتا تو قیدیوں کو فاقے کرنے پڑتے۔

تہہ خانے کی چھت پر اونچی فصیل نما چار دیواری تھی۔ چار دیواری کے اندر کسی کو بلا اجازت داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک سلسلے سے کوٹھریاں بنی تھیں۔ ان کے آگے طویل بر آمدہ تھا۔ بر آمدے کے آگے کھلا صحن تھا۔ کوٹھریوں میں جیل کے چوکیدار اور کارندے رہتے تھے۔ چار دیواری میں داخل ہونے کے لیے لوہے کا مضبوط پھاٹک تھا جو ہر وقت بند رہتا تھا۔ پھاٹک پر سخت پہرہ تھا۔ چوکی دار بندوقیں سنبھالے نہایت مستعدی سے پہرہ دیتے تھے۔ قیدیوں سے ملاقات کرنا بہت دشوار تھا۔ صرف سردار کی اجازت سے ملاقات کی جا سکتی تھی۔ لیکن ملاقات کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں تھا۔

ایسی نجی جیلیں دوسرے قبائلی سرداروں اور بڑے زمین داروں کی بھی تھیں۔ بلکہ ہر حویلی یا کوٹ کے ساتھ نجی جیل بڑائی اور شان و شوکت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ضلع بھر میں کوئی سرکاری جیل نہ تھی۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنروں اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں سے سزا پانے والے قیدی بھی سرداروں کی نجی جیلوں میں بند کیے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے ایک مقررہ رقم دی جاتی تھی۔

ضلع میں پہلی باقاعدہ جیل سیاسی قیدیوں کے لیے انگریزوں کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی۔ لیکن سرکاری جیل کے قیام کے بعد بھی سرداروں کی نجی جیلوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح اپنی جیلیں رکھتے۔ عدالت لگا کر اپنی مرضی اور اپنے قوانین کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے۔ جنھیں مجرم قرار دیتے انھیں اپنی جیلوں میں سزا بھگتنے کے لیے قید کرتے۔

تمن دار اور مقدم کی ذاتی جیل، اس کی حویلی اور کوٹ کی طرح زیادہ بڑی ہوتی۔ ان میں قیدی بھی زیادہ بڑی تعداد میں رکھے جاتے۔ ڈیرہ غازی خاں کی طرح بلوچستان کے قبائلی سرداروں اور

جاگیرداروں کی بھی ایسی ہی نجی جیلیں تھیں جو زمین دوز تہہ خانوں میں قائم تھیں۔ ان میں دن رات برابر تھے۔ ہوا اور روشنی کا گزر نہ تھا۔

قیدیوں کو عام طور پر زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا یا لکڑی کے وزنی تختوں میں سوراخ کر کے اس طرح پیر ڈال دیے جاتے کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہتے۔ لمبی قید کاٹنے والے قیدیوں کے پیر تختوں کے شکنجے میں پڑے پڑے اس طرح ناکارہ ہو جاتے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے۔

نجی جیلوں میں قیدیوں کو طرح طرح سے اذیت پہنچائی جاتی' جسموں کو لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخوں سے داغا جاتا۔ کئی کئی روز تک الٹا لٹکایا جاتا۔ سر کے نیچے آگ سلگا کر مرچوں کی دھونی دی جاتی۔ برہنہ جسموں پر کوڑے مارے جاتے۔ اس قدر سفاکی اور بے رحمی سے زدو کوب کیا جاتا کہ اکثر قیدیوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے۔ بینائی جاتی رہتی' قوت سماعت ختم ہو جاتی۔ دماغ میں خلل پیدا ہو جاتا۔ ایسے قیدی رہائی کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لولے' لنگڑے' اندھے' بہرے' پاگل اور اپاہج ہو جاتے۔ ان اذیت ناک سزاؤں کے باعث سرداروں اور جاگیرداروں کی نجی جیلیں' عقوبت خانوں کے نام سے یاد کی جاتیں۔

یہ نجی قید خانے یا عقوبت خانے' جن میں قیدیوں کے لیے علاج معالجے کا کوئی بندوبست نہیں تھا' صدیوں پرانے اس عہد کی یادگار تھے جب غلاموں کو نافرمانی اور حکم عدولی کی پاداش میں مویشیوں کی طرح تاریک تہہ خانوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے دور حکمرانی میں بھی یہ عقوبت خانے اپنی تمام انسانیت سوزی کے ساتھ برقرار رہے۔ انگریزوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ پاکستان بن گیا۔ مگر نجی قید خانے اور عقوبت خانے رکھنے کا رواج ختم نہ ہوا۔ عقوبت خانے بدستور قائم رہے اور قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

شہ زور خان مزاری کی نجی جیل بھی ایک ایسی ہی جیل تھی۔ اس کے حکم پر سہراب اور مرجان کو قیدی بنا کر عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔ ان کے پیروں میں لوہے کی بھاری بھاری زنجیریں ڈال دی گئیں۔ ان کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ کسی کو ان سے ملنے اور بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

سردار شہ زور مزاری قیدیوں کے بارے میں ضروری احکامات جاری کرنے کے بعد کوٹ کے زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کا قیام مہمان خانے میں تھا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سفر کی تکان سے جسم چور چور تھا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ بستر پر جا کر ایسا سویا کہ دن ڈھلے

تک بے خبر سوتا رہا۔

شام کو مہمان خانے کے وسیع صحن کے پختہ چبوترے پر محفل جمی۔ رحیم داد کی فرمائش پر مزاری نے نہایت اہتمام سے بھنگ گھٹوائی جسے سرائیکی میں ساوی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ شہ زور مزاری کو بھنگ سے خاص رغبت نہ تھی۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر شیشے کے جگ میں دودھ کی مانند سفید بھنگ تھی۔ مزاری اور رحیم داد کے گلاسوں میں بھی تھی۔ دونوں گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ شام درو دیوار سے نیچے اتر کر پھیل گئی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

جب رحیم داد نے اپنا گلاس ختم کر دیا تو خالی گلاس میں جگ سے بھنگ انڈیلتے ہوئے شہ زور مزاری نے مسکرا کر پوچھا۔ "سیں چوہدری، سچ سچ بتا میرے ڈیرے کی ساوی تجھے پسند آئی؟"

بھنگ پتلی تھی اور اتنی خوش ذائقہ بھی نہ تھی جو رحیم داد نے بھکر میں مراد خاں شاہانی کی حویلی میں قیام کے دوران پی تھی۔ مگر مزاری کی دل جوئی کے خیال سے اس نے گردن ہلا کر بھنگ کی تعریف کی۔ "چنگی ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا۔ "مزے دار ہے۔"

"تجھے پسند آئی۔" شہ زور مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے میں ساوی بہت کم پیتا ہوں۔ اسے پی کر مجھے نشہ ہی نہیں ہوتا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "نشہ تو سچ پوچھ اسکاچ وسکی پی کر چڑھتا ہے۔"

"شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔"

"ضرور کہتا ہوگا۔ پرانا پینے والا ہے۔" شہ زور نے کہا۔ "میرا تو اس کے ساتھ زیادہ میل ملاپ نہیں۔ سنا ہے وہ اچھی شراب پیتا ہے اور اچھی رن رکھتا ہے۔" مزاری نے بھنگ کا گھونٹ بھرا۔ "سنا ہے ان کے لیے اس نے علیحدہ کوٹ بنا رکھا ہے۔ جس میں ایک سے ایک سوہنڑی رن رکھ چھوڑی ہے۔"

"پر اب تو اس نے کوٹ ختم کر دیا۔ سیاست کے چکر میں پڑ گیا ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "ویسے میں نے اس کا کوٹ دیکھا ہے۔ کئی بار ادھر ٹھیر بھی چکا ہوں۔"

"تب تو تجھے اس کے کوٹ کے بارے میں سب پتہ ہوگا۔ کیسا ہوتا تھا اس کا کوٹ؟" مزاری نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "مراد خاں شاہانی بہت تعریف کرتا تھا۔"

رحیم داد اسے احسان شاہ کے کوٹ اور اس میں قید رکھی جانے والی مزارعوں اور کسانوں کی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ شہ زور مزاری توجہ اور دلچسپی سے اس کی باتیں

سنتا رہا۔ اسی اثنا میں ایک کوتی دو کتوں کی زنجیر سنبھالے ہوئے نمودار ہوا۔ لبراڈر نسل کے کتوں کی یہ جوڑی، شہ زور خان مزاری نے پچھلے سال خریدی تھی۔ ان سے اسے خاص لگاؤ تھا۔

مزاری نے مسکرا کر پوچھا۔ "انھیں سیر کرانے لے گیا تھا؟"

"ہا سیں!" کوتی نے ادب سے جواب دیا۔ "روز صبح شام سیر کرانے لے جاتا ہوں۔"

شہ زور خاں دونوں کتوں کو پیار بھری نظروں سے تکتا رہا۔ وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ نہ اس نے کتوں کو قریب بلایا نہ اٹھ کر ان کے قریب گیا۔ چند لمحے تک انھیں دیکھتا رہا، پھر کوتی کی جانب متوجہ ہوا۔ "ویسے تو چنگے بھلے لگتے ہیں۔ کوئی پریشانی کی گالہہ تو نہیں؟"

"تا سیں نا۔ سب خیر سلا ہے۔ فکر کی کوئی گالہہ نہیں۔" اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ جھک کر ایک کتے کی گردن پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

"اب تو جا۔ میں سویرے ڈاگ ہاؤس دیکھنے آؤں گا۔"

کوتی خاموشی سے مڑا اور کتوں کی زنجیر سنبھالے ہوئے چلا گیا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو نے بھی ڈاگ ہاؤس بنا رکھا ہے۔؟"

"بنا تو رکھا ہے۔" شہ زور خان مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "کتے بھی میرے پاس اچھی نسل کے ہیں۔"

"میں نے شاہانی کا ڈاگ ہاؤس دیکھا ہے۔" رحیم داد بولا۔ "بہت شان دار ہے۔ تیرا ڈاگ ہاؤس بھی شان دار ہی ہو گا۔"

"شان دار وان دار کیا، بس ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ ویسے تو سارے ہی سرداروں اور وڈے زمین داروں نے، جنھیں شکار کھیلنے اور کتے پالنے کا چسکا ہے، اپنے اپنے ڈاگ ہاؤس رکھ چھوڑے ہیں۔ کئی کے پاس تو بہت وڈے وڈے ہیں۔" مزاری نے بتایا۔ "شان دار ڈاگ ہاؤس تو سچ پوچھ، نواب جوناگڑھ کا ہوتا تھا۔ بہت شہرت تھی اس کی۔"

"بہت ہی زیادہ شاندار ہو گا۔"

"نہ پوچھ کتنا شاندار تھا۔ کتے بھی ایک سے ایک عمدہ اور اعلیٰ نسل کے رکھتا تھا۔ ان سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ ان کے لیے بہت شاندار محل بنا رکھا تھا۔" مزاری نے گلاس اٹھا کر بھنگ کا گھونٹ بھرا۔ "کتوں کے رہنے کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ ہر کمرے میں قالین بچھے ہوتے۔ بجلی ہوتی۔ یہاں تک کہ ٹیلی فون بھی لگے ہوتے۔"

"ٹیلی فون ہوتے تھے؟" رحیم داد نے سخت تعجب سے پوچھا۔

"کیا نہیں ہوتا تھا۔" مزاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کتوں کی دیکھ بھال کے لیے سینکڑوں نوکر تھے' ڈاکٹر تھے۔ نرسیں تھیں۔ راتب تیار کرنے کے لیے باورچی لگے تھے۔ ان کے سونے کے لیے مسہریاں تھیں۔ نرم نرم گدے تھے۔" مزاری کھل کر مسکرایا۔ "نہ پوچھ کیسے کیسے ان کے ناز نخرے اٹھائے جاتے تھے۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "کوئی کتا مرجاتا تو اس کا زبردست سیاپا ہوتا۔ نہایت شان سے اسے کبرستان پہنچایا جاتا۔ کبر کھودی جاتی۔ دفن کیا جاتا۔ کتنے ہی مرنے والے کتوں کے تو سنگ مرمر کے کبرے تیار کیے گئے تھے۔ ان کا کبرستان بھی علیحدہ ہی تھا۔"

"تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد منہ پھاڑ کر ہونق کی طرح مزاری کا چہرہ تکنے لگا۔

"تجھے یہ سن کر اور تعجب ہوگا کہ ایک کتے کا تو بہت دھوم دھام سے پرنا بھی ہوا تھا۔" مزاری بدستور مسکراتا رہا۔

"تیرا مطلب ہے کتے کا ویاہ ہوا تھا۔" رحیم داد واقعی اور زیادہ حیرت زدہ نظر آنے لگا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" مزاری نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "نواب کے پاس ایک لبراڈر ہوتا تھا۔ یہ اسی نسل کا کتا تھا جو تھوڑی دیر پہلے میرا کوتی لے کر آیا تھا۔ اس کا نام تھا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے الجھا۔ چند لمحے خاموش رہا' پھر مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "یاد آگیا۔ بوبی نام تھا اس کا۔ کتی کا نام روشنا تھا۔ ان کا پرنا ہوا تو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا۔ دعوت نامے چھپے۔ سارے راجے' مہاراجے' نواب اور وڈے سرکاری افسروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ وائسرائے کو بھی بلایا گیا تھا۔"

"وائسرائے کو بھی بلایا گیا تھا؟" رحیم داد نے تجسس انگیز نظروں سے شہ زور مزاری کو دیکھا۔

"ہاسیں' وائسرائے کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ پر اس نے انکار کردیا۔" سردار شہ زور خاں مزاری اب سنجیدہ ہوگیا تھا اور سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "ویسے سارے ہی راجے' نواب' سرکاری افسر مہمان بن کر دور دور سے جوناگڑھ آئے تھے۔ بوبی کی جنج بہت دھوم دھام سے روانہ ہوئی۔ لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ بندے شریک ہوئے۔ جنج کے آگے آگے باڈی گارڈ کا دستہ مارچ کرتا تھا' نواب اپنے شاہی ہاتھی پر سوار تھا۔ بوبی سہرا باندھے شاندار گھوڑے پر بہت سج دھج کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا خاص کوتی بھی گھوڑے پر بیٹھا تھا اور اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ فوجی بینڈ بجتا تھا۔ آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔"

رحیم داد حیرت سے بت بنا بیٹھا تھا۔ مزاری بتا تا رہا۔ "بوبی جب روشنا کو دیاہ کر محل میں لایا تو زبردست دعوت ہوئی۔ عمدہ عمدہ کھانے اور پکوان مہمانوں کو کھلائے گئے۔ بوبی اپنی بنری کے ساتھ بہت شان سے مسند پر بیٹھا تھا۔"

رحیم داد نے خمار آلود نظروں سے سردار مزاری کو دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھنگ کے نشے میں بہک رہا ہے۔ بے چین ہو کر بولا۔ "تو سچ کہہ رہا ہے۔" وہ ہولے ہولے لہرایا۔ "یقین نہیں آتا۔"

"مجھے جھوٹ بول کر تجھ سے کیا لینا۔" مزاری کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "میں تو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ پر بوبی اور اس کے پرنے کے بارے میں تو اخباروں میں خبریں اور تصویریں بھی چھپی تھیں۔"

"خرچہ بھی بہت آیا ہو گا۔"

"لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔" مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ "بمبئی کے ایک اخبار نے سخت اعتراض کیا تھا۔ لکھا تھا کہ ریاست کی سوا چھ لاکھ ننگی بھوکی رعایا میں سے بارہ ہزار غریب غربا کی اتنے روپے سے پورے ایک سال تک آرام سے گزر بسر ہو سکتی تھی۔" مزاری نے نشے کی جھونک میں زور کا قہقہہ بلند کیا۔ "پر ایسی باتوں سے کیا بنتا ہے۔ نواب کو اپنی ٹور اور شان دکھانی تھی، سو اس نے ایسی دکھائی کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔"

"نواب اب کدھر ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ادھر کراچی میں ہوتا ہے۔" مزاری نے مطلع کیا۔ "اس نے ریاست جونا گڑھ پاکستان میں شامل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ سردار پٹیل، ہندوستان کی حکومت میں ریاستوں کے معاملات کا مرکزی وزیر ہوتا تھا۔ اسے پتہ چلا تو سخت ناراض ہوا۔ ریاست کی ہندو رعایا کو بہکا کر زبردست گڑبڑ کرائی۔ اور ریاست پر زبردستی کبضہ کر لیا۔ نواب بے چارہ کسی نہ کسی طرح چھپتا لکتا پاکستان پہنچا۔"

"تب تو ہندوؤں نے نواب کو بدنام کرنے کے لیے اخباروں میں ایسی خبریں چھاپی ہوں گی۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ایسا ہی ہو گا۔" سردار مزاری نے اختلاف رائے نہ کیا۔ "پر بوبی اور روشنا کے پرنے کی بات تو پاکستان بننے سے بہت پہلے کی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مزاری بھی نہ بولا۔ دونوں اب خاصی تعداد میں بھنگ چڑھا چکے تھے۔ رات اجلی اور خوشگوار تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چلتے تھے۔ دونوں نشے سے جھوم رہے تھے۔

انھوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆

سویرے سردار مزاری نے رحیم داد کے ساتھ ناشتا کیا۔ اس نے حویلی میں مزید قیام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ گیراج سے اپنی پرانی پیکارڈ نکالی۔ اس کا ڈرائیور کیسر کو بزلر کار لے کر ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں پیکارڈ میں بیٹھ گئے۔ کار شمشیر والی کی جانب دوڑنے لگی۔

پہر دن چڑھے کار شمشیر والی میں داخل ہوئی۔ یہ مزاری کی جاگیر میں دریائے سندھ کے کنارے چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ربیع کی فصل کٹ چکی تھی۔ کھیت اجاڑ تھے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصلوں کے ٹرنڈے نظر آتے تھے۔ مگر کھیتوں کے آس پاس خوب ہریالی تھی۔ سایہ دار درخت زیادہ ہی گھنے اور گنجان تھے۔ اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

درختوں کے دامن میں کثرت سے گھنی جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ جھنگر تھے۔

شمشیر والی پر فضا اور ہری بھری بستی تھی۔ مگر آبادی کم تھی۔ سردار مزاری یہاں عام طور پر شکار کھیلنے آتا تھا۔ اس کے قیام کے لیے ایک بڑا اور کشادہ مکان تھا۔ گاؤں کے دوسرے مکانات عام طور پر دریائی گھاس اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے تھے۔ چند مکانوں کی دیواریں مٹی میں بھوسا ملا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ان پر شہتیر ڈال کر اور بالائی حصے پر گیلی مٹی کا گارا پھیلا کر چھتیں ڈالی گئی تھیں۔ دیواریں سیدھی نہ تھیں۔ بلندی پر پہنچ کر اندر کی جانب جھک گئی تھیں۔

مزاری کے مکان کی دیواریں کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چھت بھی مٹی کی تھی۔ مگر دیواریں سیدھی تھیں۔ اس میں چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمروں کے آگے طویل دالان تھا۔ اس کی چھت آگے جھکی ہوئی تھی تاکہ بارش کا پانی جمع نہ ہو۔ دالان کی چھت، کمروں سے قدرے نیچی بھی تھی۔ دالان کے سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں کئی کوٹھریاں تھیں جن میں چوکیدار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ اناج اور بھوسا رکھا جاتا تھا۔ احاطے میں جگہ جگہ گھنے اور سائے دار درخت تھے۔ احاطے کی چار دیواری مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے اونچا دروازہ تھا۔

گاؤں بلندی پر تھا۔ نشیب میں دریا بہتا تھا۔ گرمی کے دن تھے مگر ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی اور دریا کی سمت سے آنے والے ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکوں نے گرمی کی شدت کم کر دی تھی۔ درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

رحیم داد کو گاؤں پسند آیا۔ پر فضا تھا اور پر سکون بھی تھا۔ سورج ڈوبا' اندھیرا پھیلا دریا کی سمت سے نرم اور ٹھنڈے جھونکے آنے لگے۔ شام بڑی فرحت افزا اور سہانی تھی۔ رحیم داد اور مزاری نے دن ڈھلے غسل کیا تھا۔ اجلا لباس پہنا تھا۔ دونوں احاطے میں دالان کے سامنے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ پھر بوتل کھلی۔ شراب کا دورہ چلا اور اس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ شراب دیسی تھی اور خاصی تند و تیز تھی۔

دونوں نے کھانا کھایا اور جھومتے جھامتے جا کر بستروں پر دراز ہو گئے۔ ان کے پلنگ احاطے کے ایک گوشے میں بچھے تھے۔

☆

رحیم داد سردار شہ زور خان مزاری کے ہم راہ اس بڑے کمرے میں چلا گیا جس میں کچہری لگائی جاتی تھی۔ کمرے میں دیوار کے قریب خوب چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اس کے پائے اونچے اونچے تھے۔ ان پر رنگ و روغن سے خوش نما نقش و نگار بنے تھے۔

پلنگ پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ پائینتی دو تہی تھی۔ اس پر رنگین دھاگوں سے خوش نما کشیدہ کاری کی گئی تھی اور حاشیہ گہرا سرخ تھا۔ سرہانے بڑے بڑے دبیز تکیے تھے۔ مزاری آگے بڑھا۔ پلنگ کے اوپر پہنچا اور پاؤں پھیلا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں پیروں کے پنجوں کو جوڑ کر ایک دوسرے سے ملایا اور گھٹنے سمیٹ کر اونچے کر لیے۔ سردار مزاری کا کاردار چاکر خاں سرگانی' جو شاہ میر سے اس کے ساتھ آیا تھا' کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ سرگانی کے اشارے پر ایک ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خیری تھی۔ یہ سفید لٹھے کا ڈھائی گز لمبا ٹکڑا تھا۔ وہ سردار مزاری کے قریب پہنچا۔ جھکا اور نہایت احتیاط سے خیری اس کی کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بغل بندی کی۔ پھر خیری کے دونوں سروں کا اس طرح دموکا لگایا کہ آنکھوں کے سوا چہرے کا تمام حصہ ڈھک گیا۔

سردار شہ زور خان مزاری' جب قبائلی روایت کے مطابق اس طرح ڈ-لٹھ مار کر بیٹھ گیا تو ملازم نے حقہ تازہ کر کے پلنگ کے نزدیک اسٹول پر رکھ دیا۔ سردار اجلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس پر عطر لگا تھا جس کی تیز خوشبو کمرے کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مزاری نے حقے کی نے سنبھالی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔

کمرے کے باہر دالان اور احاطے میں درختوں کے نیچے مزارعے اور کمی بیٹھے تھے۔ ان میں بزگر بھی تھے۔ یہ بھی مزارعے تھے۔ مگران کا حق کاشت موروثی تھا۔ موروثی مزارعوں کو بلوچستان میں

لٹ بستہ کہا جاتا ہے۔ مگر ڈیرہ غازی خان میں بھی پنجاب کے دوسرے اضلاع کی طرح وہ مزارعے یا راہک کہلاتے ہیں۔

مزارعے، بزگر اور کمی سرائیکی میں بات چیت کر رہے تھے جس میں بلوچی اور پنجابی کی آمیزش تھی۔ ان میں شمشیر والی کے علاوہ آس پاس کے ایسے گاؤں اور چکوں کے رہنے والے بھی شامل تھے جو سردار مزاری کی جاگیر میں شامل تھے۔ وہ اپنے مقدمے لے کر سردار کے پاس فیصلے کے لیے آئے تھے۔ چاکر خان سرگانی باری باری ہر مقدمہ پیش کرتا۔ کسی مقدمے میں مدعی اور مدعالیہ دونوں موجود ہوتے کسی میں صرف مدعی حاضر ہوتا۔

کمرے میں جو بھی داخل ہوتا پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار شہ زور خان مزاری کو سلام کرتا اونچی آواز میں کہتا۔ "سیں، سدا جیویں۔ سکھی صحت ہوے۔ خیر خیریت ہوے۔ رب راضی باضی ہووے۔" یہ دعائیہ جملے ادا کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا، جھکتا، سردار کے قدموں کو چھو کر پیرن پوون کرتا۔ اور ادب سے گردن جھکا کر مزاری کے روبرو کھڑا ہو جاتا۔

مزاری کے چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر بھاری بھرکم لہجے میں مقدمہ پیش کرنے کے لیے کہتا۔ "اپنا دعویٰ بیان کر۔" مقدمہ پیش کیا جاتا۔ وہ پوری توجہ سے اسے سنتا۔

مقدمات مختلف قسم کے تھے اور بڑی تعداد میں فوجداری نوعیت کے تھے۔ ان میں زمین کی وٹ بندی اور پانی کے تنازعات تھے۔ قبائل کے پرانی دشمنی کے تضیئے تھے۔ میاں بیوی، سسر اور داماد کے خانگی جھگڑے تھے۔ سردار شہ زور مزاری پہلے مدعی کا بیان سنتا، پھر مدعاعلیہ کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیتا۔ فریقین اپنے اپنے گواہ پیش کرتے۔ بیانات اور شہادتیں سننے کے بعد سردار شہ زور مزاری جرح کرتا۔ ہر نکتہ اور ہر دلیل سمجھنے کی کوشش کرتا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہتا، پھر اپنا فیصلہ سناتا۔ بعض مقدمات میں وہ چاکر خاں سرگانی سے بھی مشورہ کرتا۔ اس کی رائے معلوم کرتا، اگر مشورہ قابل قبول ہوتا تو اس کی روشنی میں فیصلہ کرتا۔

مقدمات کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک ساربان داخل ہوا۔ اس نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی دہائی دی۔ "سیں سردار، سدا جیویں۔ سیں میں لٹ گیا۔ سیں میں تباہ ہو گیا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھا اور مزاری کے پیر پکڑ کر زار و قطار رونے لگا۔

مزاری نے رعب دار لہجے میں اسے ڈانٹا۔ "سدھا کھڑا ہو۔ رونا پیٹنا چھوڑ۔ اپنا دعویٰ بیان کر۔"

"سیں میرا نام ہاتو ہے۔ جتوال ہوں۔ پاس کی وستی میں رہتا ہوں۔ سیں، میرا اونٹھ چوری ہو گیا۔" ساربان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ گڑگڑا کر کہتا رہا۔ "سیں سردار! میں اونٹھ کے بنا کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو تباہ ہو گیا۔ میرے بالیں بچیں بھوکے مر رہے ہیں۔ سیں میرا اونٹھ مجھے واپس دلا دے۔ توں سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے۔"

"تیرا اونٹھ کس نے چوری کیا؟" مزاری نے اونچی آواز میں دریافت کیا۔ "تجھے کسی پر شبہ ہے؟"

"ہا سیں! شبہ ہے بالکل شبہ ہے۔" ساربان ہاتو نے جلدی جلدی گردن ہلائی۔

سردار نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"وہ وستی بنی شاہ میں رہتا ہے۔ اس کا نام لنگر ہے۔" ہاتو نے مستعدی سے بتایا۔ "سیں اسی نے میرا اونٹھ چوری کیا ہے۔ مجھے پتہ ہے اسی نے چوری کیا ہے۔ ویسے تو وہ ماچھی ہے پر چوری چکاری اس کا دھندا ہے۔ بالکل ملی مچھی ہے۔ دیکھنے میں بھی' اندر سے سانپ۔"

"چاکر تو لنگر کو جانتا ہے؟" سردار مزاری نے مڑ کر اپنے کاردار کو دیکھا جو اس کی پشت پر باادب بلاحظہ کھڑا تھا۔

اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ "ہا سیں' میں لنگر کو جانتا ہوں۔ باہر کھڑا ہے۔ میں نے اسے پہلے ہی بلوا لیا تھا۔"

"لنگر کو حاضر کیا جائے۔" مزاری نے حکم دیا۔ "اسے اپنی صفائی پیش کرنے دی جائے۔"

چاکر خاں سرگانی نے فوراً لنگر کو بلوایا۔

ذرا دیر بعد ایک قوی ہیکل مچھیرا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی لمبی قمیص کے نیچے گہرے نیلے رنگ کا منجھلا باندھے ہوئے تھا۔ سر پر ململی پگڑی تھی۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سخت اور گھنے تھے۔ گردن تک بالوں کے لمبے لمبے سیاہ پٹھے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سرخی مائل تھیں۔ رنگت سیاہ تھی۔ اس نے جھک کر مزاری کو ادب سے سلام کیا۔ دعائیہ جملے کہے۔ قدم بوسی کی اور گردن جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

سردار شہ زور خاں نے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ جتوال کہتا ہے' تو نے اس کا اونٹھ چوری کیا ہے۔ تجھے اپنی صفائی میں کیا کہنا ہے۔"

لنگر نے ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑا' پھر دونوں گالوں کو ہاتھ سے چھو کر انکار میں گردن ہلائی۔ "نا سیں نا۔ میں چوری رسہ گیری کا دھندا نہیں کرتا۔ میں نیک اور بھلا بندا ہوں۔ وستی بنی شاہ میں

مجھے سب جانتے ہیں۔" اس نے مڑ کر ساربان کی طرف دیکھا۔ "سئیں سردار! یہ جتوال بالکل جھوٹا ہے۔ میرے ماتھے پر بدنامی کی کالک لگانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کا اونٹھ ہرگز ہرگز چوری نہیں کیا۔ سئیں یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے تو اس کا اونٹھ دیکھا بھی نہیں۔"

وہ اپنے ساتھ دو گواہ بھی لایا تھا۔ مزاری کے حکم پر دونوں گواہ پیش کیے گئے۔ انھوں نے قسم کھا کر لنگر کے بیان کی پوری پوری تائید کی۔ ساربان ہاتو کے الزام کو جھوٹا اور گمراہ کن قرار دیا۔

لنگر اور اس کے گواہوں کے بیانات سننے کے بعد سردار مزاری ہاتو کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاتو تجھے کسی اور پر تو اونٹھ کی چوری کا شبہ نہیں۔"

"نا سئیں نا۔" ہاتو نے پورے اعتماد سے کہا۔ "مجھے کسی اور پر شبہ نہیں۔ میرا اونٹھ تو اسی نے چوری کیا ہے۔" اس نے لنگر کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہی رات کے اندھیرے میں میرا اونٹھ کھول کر لے گیا۔"

سردار نے کہا۔ "اس کے تو گواہ ہیں۔ تیرا بھی کوئی گواہ ہے؟"

"سئیں سردار! میرا کوئی گواہ نہیں۔" ساربان نے عاجزی سے کہا۔ "میرا گواہ تو خدا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر آسمان کی سمت بلند کیا۔ "میں نے اپنا اونٹھ بنی شاہ میں لنگر کے باڑے میں بندھا دیکھا تھا۔ سئیں، میں پہلے کھوجی ہوتا تھا۔ اونٹھ کے پاؤں کے نشانات سے کھرا نکالتا وستی بنی شاہ پہنچا تھا۔ نشانات اس کے گھر تک جاتے تھے۔ وہاں اونٹھ موجود تھا۔ میں نے اسے جھٹ پہچان لیا۔ وہ میرا ہی اونٹھ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"لنگر وہاں موجود تھا؟" سردار مزاری نے دریافت کیا۔

"نا سئیں، لنگر وہاں نہیں تھا۔ دریا کے کنارے اپنی بیڑی میں بیٹھا تھا۔" ہاتو نے جواب دیا۔ "میں اس کے پاس پہنچا۔ اپنے اونٹھ کے بارے میں اسے بتایا۔"

"لنگر نے تجھ سے کیا کہا؟" مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں پوچھا۔

"اس نے جھوٹ بولا۔ صاف انکار کر دیا۔"

"تو نے اس کے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرایا تھا؟" سردار نے استفسار کیا۔

"نا سئیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔ پرچہ چاک کرانے کے لیے پولیس کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ میں غریب جتوال ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "غریب کی فریاد پولسئے کہاں سنتے ہیں۔ سئیں سردارا، میرا اونٹھ تو ہی دلوائے گا۔ تو سردار ہے۔ انصاف کرنے والا ہے۔ میرا فیصلہ تو ہی کرے گا۔ میں نے کسی اور کے پاس نہیں جانا۔"

"جب تو نے لنگر کے باڑے میں اپنا اونٹھ دیکھ لیا تھا تو کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟" مزاری نے کرید کر پوچھا۔ "میرا مطلب ہے' تو اپنا اونٹھ کھول کر کیوں نہیں لے آیا؟"

"سیں' میں بالکل اکیلا تھا۔ لنگر مجھ سے تگڑا اور زور آور ہے۔" ہاتو نے وضاحت کی۔ "میں نے پہلے لنگر سے پوچھ تاچھ کی۔ جب اس نے صاف انکار کر دیا تو واپس اپنی وستی گیا۔ رات کو اپنے ماما کے پتر اور دو جتوالوں کو لے کر دوبارہ بنی شاہ پہنچا۔ تب لنگر اپنے گھر پر موجود تھا۔ پر اونٹھ غائب تھا۔"

"تو نے آگے کیا کیا؟" مزاری نے دریافت کیا۔

"میں نے پتہ چلایا۔ معلوم ہوا لنگر نے شام کا اندھیرا ہوتے ہیں اونٹھ کوٹلی جعفر پہنچا دیا۔" ہاتو نے مزاری کو بتایا۔ "میں کوٹلی جعفر پہنچا۔ پر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اونٹھ بیڑی میں بٹھا کر دریا پار پہنچا دیا۔"

لنگر تلملا کر بولا۔ "سیں سردار' یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔"

"چپ کر۔ خاماخا ٹرٹر نہ کر۔" سردار مزاری نے لنگر کو غصے سے ڈانٹا۔ "جب تجھے کہا جائے تب بولنا۔" وہ ساربان کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاتو! بعد میں تو نے اپنے اونٹھ کا کھوج نہیں نکالا۔ تجھے پتہ ہے' تیرا اونٹھ اب کہاں ہے؟"

"سیں سردار! مجھے صرف اتنا پتہ ہے۔ میرا اونٹھ رحیم یار خاں میں ہے۔" ساربان عاجزی سے بولا۔ "کس وستی میں ہے' کہاں ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تو سردار ہے' تو جم شیر ہے۔ تجھ سے میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔"

سردار مزاری' چند لمحے خاموش رہ کر لنگر سے مخاطب ہوا۔ "لنگر' اب تو بتا۔ تو نے ہاتو کا اونٹھ اگر چوری نہیں کیا' تو یہ تجھ پر چوری کا الزام کیوں لگا رہا ہے؟ تیرے سوا اسے کسی اور پر شبہ بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"سیں سردار! گالہ اصلی یہ ہے۔" لنگر نے مزاری کو بتایا۔ "اس کی چاچی میری چھٹیل ہے۔ میں نے اسے طلاک دی اور جب وہ چھٹیل ہو گئی تو اس کے چاچا سے اس نے نکاح کر لیا۔ میری وہی چھٹیل اب اسے اور اس کے چاچا کو میرے خلاف بھڑکاتی ہے۔ میری اس کی یہی دشمنی ہے اور پچھلے ایک سال سے ہے۔" اس نے مڑ کر ہاتو کو دیکھا۔ "اس سے پوچھ لے سردار۔ میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"لنگر ٹھیک کہہ رہا ہے؟" سردار مزاری نے ہاتو سے پوچھا۔

"میری چاچی پہلے اس کی ذال ہوتی تھی۔ یہ تو اس نے ٹھیک ہی بتایا۔ پر اوٹھ کی چوری سے اس معاملے کا کیا میل۔" ہاتو نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں تو اپنے چاچا کے گھر بہت کم جاتا ہوں۔ میری چاچی' جواب اس کی ہٹیل ہے' مجھے ذرا پسند نہیں۔ وہ زبردست جھگڑالو رن ہے۔ مجھ سے بھی کئی بار جھگڑا ٹنٹا کر چکی ہے۔ میں تو پچھلے چھے سات مہینے سے اس کے گھر گیا ہی نہیں۔" اس نے لنگر کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "سیں' یہ بکواس کر رہا ہے۔ میرا اوٹھ اسی نے چوری کیا ہے۔ میں کسم کھا کر کہہ سکتا ہوں' میرا اوٹھ اس نے رحیم یار خان میں کہیں چھپا دیا ہے یا کسی کی ہاتھ بیچ دیا۔" وہ گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔ "سیں سردار! میرا اوٹھ مجھے دلا دے۔ میں تباہ ہو گیا۔ میں لٹ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

لنگر نے ہاتو کو اس طرح زار و قطار روتے دیکھا تو نرم لہجے میں بولا۔ "سیں سردار' میں یہ نہیں کہتا اس کا اوٹھ چوری نہیں ہوا۔ پر میں نے اسے نہیں چرایا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے گواہوں سے پوچھ لے۔"

سردار مزاری نے لنگر کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتو سے پوچھا۔ "تیرا ملیر اور دونوں جتوال جو تیرے ساتھ دستی بنی شاہ اور کوٹلی جعفر گئے تھے اور جنھوں نے تیرے اوٹھ کے بارے میں سنا بھی تھا' ان کی تو نے گواہی کیوں نہیں پیش کی؟"

"سیں' انھوں نے اوٹھ دیکھا نہیں۔ اسے تو لنگر نے پہلے ہی بیڑی میں بٹھا کر دریا پار پہنچا دیا تھا۔" ہاتو نے وضاحت کی۔ "ایسے میں وہ کیا گواہی دے سکتے ہیں۔ ہاں وہ اس کی ضرور گواہی دے سکتے ہیں کہ میرے ساتھ دستی بنی شاہ اور کوٹلی جعفر گئے تھے۔ سیں تو حکم کر تو میں ان سے اس کی گواہی دلوا دوں۔"

"نہیں ایسی گواہی سے کام نہیں چلے گا۔" سردار مزاری نے اختلاف رائے کیا۔ "ہاں' کسی نے لنگر کو تیرا اوٹھ چوری کرتے دیکھا ہو' اس کی گواہی تو پیش کر سکتا ہے۔"

"نا سیں' میرا ایسا کوئی گواہ نہیں۔ تب ہی تو میں نے تجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا' میرا کوئی گواہ نہیں۔" ہاتو نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "سیں سردار' میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ نہ تیرے سامنے جھوٹے گواہ پیش کروں گا۔"

مزاری نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد بھی سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے پر بت بنا خاموش بیٹھا تھا اور مقدمے کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مقدمہ خاصا پیچیدہ تھا۔ رحیم داد یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سردار شہ زور خان مزاری نے چاکر خان سرگانی کو مخاطب کیا۔
"چاکر! مکدمہ تو کچھ الجھا ہوا ہے۔ تو کچھ کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔"
"سیں سردار! اوٹھ کی چوری کا ہاتو کے پاس کوئی پکا ثبوت نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی گواہ ہے نہ شہادت۔ لہٰذا ہاتو کا دعویٰ خارج کیا جا سکتا ہے۔" چاکر خاں سرگانی نے نہایت ادب سے اپنا موقف پیش کیا۔ "ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جرگہ بلایا جائے اور معتبروں کے سامنے مکدمہ پیش کر دیا جائے۔ جرگہ جو فیصلہ کرے گا' وہی آخری فیصلہ ہو گا۔"

ہاتو تڑپ کر بولا۔ "نا سیں' جرگہ نہیں' میرا فیصلہ تو سردار ہی کرے گا۔" وہ بچوں کی طرح مچل کر ضد کرنے لگا۔ "سیں' تو ہی اوٹھ دلوا سکتا ہے۔ میرا فیصلہ تو ہی کرے گا۔"

"میں ہی فیصلہ کروں گا۔ پر آج نہیں' چار روز بعد۔" سردار مزاری نے مڑ کر چاکر خان کو دیکھا۔ "چاکر' یہ مکدمہ اتنا اہم نہیں کہ اس کے لیے جرگہ بلایا جائے۔" وہ ہاتو اور لنگر کی طرف متوجہ ہوا۔ "کچہری برخاست کی جاتی ہے۔ تم سب کو چار روز بعد فیصلے کے لیے حاضر ہونا ہو گا۔ چاکر خاں تم کو اس کے بارے میں بتا دے گا۔"

عدالت برخاست ہوتے ہی کمرہ خالی ہو گیا۔ چاکر خاں نے بڑھ کر مزاری کی کمر اور ٹانگوں سے لپٹی ہوئی خیری کی گرہ کھول دی۔ مزاری پلنگ سے نیچے اترا اور رحیم داد کے ہم راہ باہر چلا گیا۔

☆

جون کی سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف تیز اور چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا گرم تھی۔ مگر کچی اینٹوں سے بنی ہوئی اونچی اونچی دیواروں والے کمرے میں قدرے ٹھنڈک تھی۔ رحیم داد اور شہ زور خان مزاری کھانا کھا رہے تھے۔ رحیم داد بالکل خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بشرے سے الجھن جھلکتی تھی۔

سردار مزاری نے اس کے چہرے کو کئی بار نظر بھر کر دیکھا۔ لیکن وہ زیادہ دیر رحیم داد کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکا۔ مسکرا کر بولا۔
"سیں چوہدری' تو کس سوچ میں پڑ گیا۔ خیر خیریت تو ہے؟"

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر شہ زور خاں کی جانب دیکھا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ گردن جھکا کر بدستور کھانا کھاتا رہا۔

مزاری نے کرید کر پوچھا۔ "تو اس طرح چپ کر کے کیوں بیٹھا ہے؟" وہ کھل کر مسکرایا۔ "لگتا ہے' تو اب یہاں سے اکتا گیا۔ واپس جانا چاہتا ہے چلا جانا۔ مجھے بھی ادھر زیادہ دن نہیں ٹھہرنا۔"

"واپس تو میں نے جانا ہی ہے۔ تجھے پتہ ہے ادھر لہور میں شاہ جی کا منیجر مہربان علی میرا انتظار کرتا ہو گا۔ شاہ جی بھی اب تک کراچی سے آگیا ہو گا۔ اسے ملنا بھی ہے۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔

"پر ابھی تو میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔" اس نے سوالیہ نظروں سے سردار مزاری کے چہرے کو دیکھا۔ "تجھے کل صبح اوٹھ کی چوری کے مکدمے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟"

"وہ تو میں نے کرنا ہی ہے۔ پر تو اتنا پریشان کیوں ہے؟"

"پریشانی کی گل بات نہیں۔" اس بار رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "سوچ رہا تھا، تو فیصلہ کس طرح کرے گا؟ چوری کا نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ شہادت۔" اس نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ بھرا۔ "ہاتو کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا اوٹھ تو چوری ہوا ہے۔ اور اسے صرف لنگر ہی پر شبہ ہے۔"

"لنگر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟" سردار شہ زور مزاری نے اس کا عندیہ لینا چاہا۔

"اس کے تو دو گواہ بھی ہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "بیان بھی اس کا ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ بات بھی کڑک کر کرتا ہے۔" اس کے چہرے پر ایک بار پھر الجھن نظر آنے لگی۔ "مان لے اس نے ہاتو کا اوٹھ چوری بھی کیا ہے۔ تب بھی تو اس کے خلاف ثبوت کہاں سے لائے گا؟"

"کل سویرے تو خود ہی دیکھ لینا۔" سردار مزاری نے بے نیازی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "لنگر نے چوری کی ہے تو اس کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ جانے تو نے کیا سوچا ہے۔"

"چوہدری، سچ پوچھ، سوچا تو میں نے بھی کچھ نہیں۔ پر مکدمے کا فیصلہ تو کرنا ہی ہے۔" سردار مزاری نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "ایسے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مکدموں کا ہمارے وڈیرے اور بزرگ بہت ٹھیک طرح فیصلہ کرتے رہے ہیں۔ ہم بلوچوں کا اپنا کانون ہے اور سالہا سال سے رائج ہے۔ ہر بلوچ اسے مانتا ہے، تسلیم کرتا ہے۔ کل صبح میں بلوچوں کے اسی روایتی کانون کی رو سے فیصلہ کروں گا۔"

"کیا فیصلہ کرے گا اور کیسے کرے گا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے سردار مزاری کو دیکھا۔

وہ زیر لب مسکرایا۔ بے نیازی سے بولا۔ "تو موجود ہی ہو گا۔ دیکھ لینا، کتنا ٹھیک اور صحیح فیصلہ ہو گا۔ سارا جھوٹ سچ کھل کر سامنے آجائے گا۔ لنگر نے چوری کی ہو گی تو اسے اپنے جرم کی پوری

پوری سزا ملے گی۔ ورنہ صاف بری ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ چہرے سے بے چینی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں دبا دبا تجسس تھا۔ سردار مزاری نے اس کی ذہنی کیفیت پر توجہ نہ دی' کھانے سے فارغ ہوا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی کچھ دیر بعد قیلولہ کرنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔

دن ڈھلے رحیم داد بیدار ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھا احاطے کے ایک گوشے میں گھنے درختوں تلے دو نوکر ایک بوسیدہ تیر و کمان رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے ہیں۔ کمان بانس کی ڈھائی انچ چوڑی اور مضبوط کھپچی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس میں بندھی ہوئی تانت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نوکر چربی مل کر کمان کو چمکا رہے تھے۔ تانت پر بھی انھوں نے اس طرح چربی ملی تھی کہ اب اس میں تناؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ تیر' خدنگ کی مضبوط لکڑی تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کی تیز نوک لوہے کی تھی۔ مگر اس کی چمک دمک بھی ماند پڑ چکی تھی۔ اسے سرسوں کے تیل میں بھیگی ہوئی ریت سے آہستہ آہستہ رگڑ کر چمکایا جا رہا تھا۔ قریب ہی چاکر خان سرگانی کھڑا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرگانی کے قریب پہنچ گیا۔ سرگانی نے اونچی آواز سے اسے سلام کیا۔ رحیم داد نے تیر و کمان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "چاکر خان یہ کہاں سے لایا؟"

"سیں' میں سردار کے حکم پر شاہ میر گیا تھا۔ اسے کوٹ سے لایا ہوں۔" چاکر خاں سرگانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "کل مکدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔"

"مکدمے سے تیر کمان کو کیا لینا؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

سرگانی کھل کر مسکرایا۔ "سیں' کل صبح تو خود دیکھ لینا۔"

سردار شہ زور خاں مزاری بھی ٹہلتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے تیر و کمان کو دیکھا۔ چاکر خاں سے پوچھا۔ "تو اسے لے آیا؟"

"ہا سردار۔" سرگانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "اب اسے ٹھیک ٹھاک کروا رہا ہوں۔ تو نے اسے پہلے نہیں دیکھا۔ بہت خراب اور ردی حالت تھی اس کی۔"

مزاری نے چاکر خاں سرگانی سے مزید بات چیت نہ کی۔ چند لمحے خاموش کھڑا تیر و کمان دیکھتا رہا جسے دونوں نوکر اب زیادہ تندہی سے رگڑ رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سردار مزاری آگے بڑھا اور رحیم داد کے ہم راہ ایک طرف چلا گیا۔

رحیم داد کی الجھن میں اور اضافہ ہو گیا۔ مگر اس نے شہ زور خاں مزاری کے سامنے اپنی الجھن کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے مقدمے کے بارے میں مزید گفتگو ہی نہ کی۔ مگر رات تجسس اور بے چینی کے عالم میں کٹی۔

☆

مزاری نے خلاف توقع اپنی قیام گاہ کے بجائے دریا کے ساحل پر کچہری لگائی۔ کچہری کے لیے ایک اونچے ریتلے تودے کو منتخب کیا گیا۔ جس پر ایک گھنے درخت کا سایہ تھا۔ بلندی پر تودے کی سطح ہموار تھی۔ اسے صاف کر کے غالیچہ بچھایا گیا۔ سردار مزاری اس پر دو۔لتھ مار کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ مگر وہ تودے کے اوپر نہ گیا۔ وہاں صرف سردار شہ زور خاں مزاری تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا حقے پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔

تودے کے نشیب میں جا کر خاں سرگانی ایک طرف ادب سے گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ سردار مزاری کے عین سامنے ہاتو تھا۔ ذرا ہٹ کر لنگر خاں اپنے دونوں گواہوں کے ساتھ نظریں نیچی کیے سہما ہوا کھڑا تھا۔ گاؤں کے تمام بڑے بوڑھے اور جوان بھی موجود تھے۔ وہ نیم دائرے میں ریتلی زمین پر بیٹھے تھے۔ ہر شخص گم صم تھا اور سردار مزاری کے دبدبے سے مرعوب نظر آتا تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر دریائے سندھ بہہ رہا تھا۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ دریا کی تیز اور تند لہریں امڈ رہی تھیں۔ مچل رہی تھیں۔ دھوپ سے جھلملا رہی تھیں۔

شہ زور خاں مزاری نے حقے کی نے ایک طرف کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ لنگر خاں کی جانب نظریں اٹھا کر گویا ہوا۔ ”لنگر، تو نے اپنی صفائی میں کچھ اور کہنا ہے۔“ اس کے لہجے میں رعب اور دبدبہ تھا۔

لنگر نے نظریں بلند کیں۔ ہاتھ باندھ کر عاجزی سے بولا۔ ”سئیں سردار! مجھے اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا تھا پہلے ہی کہہ چکا۔ میں نے اب اور کچھ نہیں کہنا۔“

”تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے ہاتو جتوال کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔ تو نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا نا؟“

”ہا سئیں، میں نے یہی کہا تھا۔ ایک بار فیر کہتا ہوں، میں نے ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے کان پکڑے اور انکار میں ہولے ہولے گردن ہلانے لگا۔ ”سئیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ تو مالک ہے۔ میں تیرا غلام ہوں، بانھا ہوں۔ میں تیرے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔“

"تو نے اگر ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا تو تیرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟" سردار شہ زور خاں مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

"سیں' ثبوت تو اسے پیش کرنا چاہیے۔" اس نے ہاتو کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے اس کا اونٹھ چوری کیا؟"

"سیں سردارا' توں راضی باضی ہووی۔ سکھی' صحت ہووی۔ تیرے بالیں بچیں' ڈیڈھی پردے سب کی خیر ہووی۔" ہاتو گڑگڑا کر فریادی ہوا۔ "سیں میرا اونٹھ لنگر ہی نے چوری کیا ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اپنا اونٹھ اس کے گھر کے آگے اپنی آنکھوں سے بندھا ہوا دیکھا تھا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"بکواس نہ کر۔ ثبوت پیش کر۔" لنگر خاں نے ڈپٹ کر کہا۔

سردار مزاری کو اس کا رویہ سخت ناگوار گزرا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ کڑک کر بولا۔ "لنگر!" اس کے لہجے سے برہمی ٹپک رہی تھی۔ "اس کا اونٹھ بھی چوری ہوا اور یہی ثبوت بھی پیش کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا تو کوئی گواہ بھی نہیں۔" لنگر نے نرم لہجے میں میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میرے تو دو گواہ موجود ہیں۔"

سردار مزاری نے اس کی دلیل رد کر دی۔ "تو نے جو گواہ پیش کیے' ان کے بیانات سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ تو نے ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔" مزاری نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تجھے دریا میں غوطہ لگا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دینا ہو گا۔ یہ بلوچوں کی بہت پرانی ریت ہے۔ یہ ان کا اپنا کانون ہے۔ اس مکدمے کا فیصلہ اسی کانون کی رو سے ہو گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تجھے بلوچوں کے اس کانون کا پتہ ہے؟"

"ہاں سردار! مجھے پتہ ہے۔ بالکل پتہ ہے۔" لنگر خاں نے نظریں اٹھا کر سردار مزاری کو دیکھا۔ مگر اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑگڑانے لگا۔ "سیں سردارا' میں نے ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تو سچا ہے تو ڈرتا کیوں ہے؟" شہ زور خاں مزاری نے ڈپٹ کر کہا۔ "تیری سچائی کا ابھی امتحان ہو جائے گا۔ سارا جھوٹ سچ سامنے آجائے گا۔"

"سیں' تجھے میرے بیان پر یکین نہیں تو میرے گواہوں سے پوچھ لے۔" لنگر خاں نے عاجزی

سے کہا۔ ”تو ان پر جیسی چاہے جرح کرلے۔“

”بکواس بند کر۔“ سردار مزاری نے اسے جھڑک دیا۔ ”یا تو یہ مان کہ او ٹھ تو نے چوری کیا ہے‘ ورنہ پکا ثبوت دینے کے لیے تیار ہو جا۔ تو اگر سچا ہے تو ہنستا مسکراتا پانی سے باہر آجائے گا۔“ اس نے گہری نظروں سے لنگر خاں کو دیکھا۔ ”بول کیا کہتا ہے؟“

”سئیں سردار! میں تیار ہوں۔“ لنگر خاں آمادہ ہو گیا۔ ”میں دریا میں غوطہ لگا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کروں گا۔“

”شاباش! ہے تو ماچھی پر کھرا بلوچ لگتا ہے۔“ سردار مزاری خوش ہو کر بولا۔

”سئیں‘ میرے پرکھے اور وڈیرے ماچھی نہیں تھے۔“ لنگر نے اپنے بلوچ ہونے کے بارے میں مزاری کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”وہ آجڑی ہوتے تھے۔ ان کے پاس شاندار گھوڑے تھے۔ بہت وڈا کلگ ہوتا تھا۔“

”یہ بتا‘ تیرا مددگار کون ہو گا؟“

لنگر نے اپنے ایک گواہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”سئیں یہ جلاوت میرا مددگار بنے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ مزاری مڑ کر چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چاکر! تیر کون چھوڑے گا؟“

”نوگیر!“ سرگانی نے اونچی آواز سے پکارا۔ ریت پر بیٹھے ہوئے افراد نے نظریں گھما پھرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چھاتی کشادہ تھی۔ بازو مضبوط تھے۔ سرگانی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سردار شہ زور خاں مزاری کو مطلع کیا۔ ”سئیں سردار! میں نے اسے تیر چھوڑنے کے لیے تیار کیا ہے۔“

مزاری نے نوگیر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”نوگیر! آگے آجا۔“

نوگیر خاں بڑھ کر آگے آگیا اور سردار مزاری کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ مزاری نے چاکر خاں سرگانی کو حکم دیا۔ ”چاکر اسے تیر کمان دے دے۔“ اس نے گردن موڑ کر لنگر خاں کی جانب دیکھا۔ ”لنگر اب تو دریا میں اتر جا۔ جب میں ہاتھ اٹھاؤں تو ٹھیر جانا۔ نوگیر کے تیر چھوڑتے ہی پانی کے اندر غوطہ مارنا۔“

لنگر خاں نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے پگڑی اور قمیص اتار کر ایک طرف ریت پر رکھی۔ پیروں سے جوتے اتارے اور کپڑوں کے قریب ہی رکھ دیے۔ اس کے چہرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ دریا کی جانب بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پانی میں اتر گیا۔ وہ ٹھہرا نہیں۔ آگے اور آگے بڑھتا

گیا۔ پانی جب اس کے سینے سے بھی اوپر پہنچ گیا تو مزاری نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اونچی آواز سے کہا۔ "ٹھیر جا لنگر۔" لنگر خاں رک گیا۔ دریا کی متلاطم موجوں کے درمیان اس کا سر ابھرا ہوا تھا۔ بقیہ جسم پانی کے اندر تھا۔ وہ کنارے سے خاصے فاصلے پر تھا اور گردن موڑے سردار شہ زور خاں مزاری کی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

سردار مزاری نے نوگیر خاں کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ کمان چاکر خاں سرگانی سے لے کر کندھے پر لٹکائی۔ تیر ہاتھ میں سنبھالا اور کھلے میدان میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانولا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی نظریں بھی شہ زور مزاری کی جانب اٹھی تھیں۔

لنگر خاں کے مددگار جلاوت نے جھٹ اپنی پگڑی اور قمیص اتاری۔ پیروں سے جوتے علیحدہ کیے۔ شلوار کے پائینچے گھٹنوں سے اوپر کیے اور اس کا گھیر ٹینٹے میں اڑس لیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نوگیر کے نزدیک پہنچ گیا۔ اب وہ نہایت مستعد اور چاق چوبند نظر آرہا تھا۔

نوگیر نے تیر چلّے پر چڑھایا۔ سب کی نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں۔ نوگیر گردن کو خم دے کر چوکنا نگاہوں سے سردار مزاری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے اشارے کا منتظر تھا۔ جلاوت دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے چوکس کھڑا تھا۔ دریا کی مچلتی لہروں کے اوپر لنگر خاں کا سر صاف نظر آ رہا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے چہرے پر جھلملا رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کبھی سردار مزاری کی جانب دیکھتا کبھی نوگیر کے ہاتھوں میں دبی کمان کو۔

ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ سردار مزاری مسند پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ تودے کے نشیب میں گاؤں کے بڑے بوڑھے اور جوان بیٹھے تھے۔ سب دم بخود تھے۔

رحیم داد حیران اور پریشان نظروں سے مزاری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سردار شہ زور مزاری نے ہاتھ اٹھا کر نیچے کیا۔ نوگیر خاں کو سگنل ملا۔ اس نے کمان کو پوری قوت سے کھینچا اور چھوڑ دیا۔ تیر، چلّے سے نکلا اور تیزی سے فضا میں سنسناتا ہوا چلا۔ لنگر خاں نے اپنی ناک انگلیوں سے دبائی اور جھٹ ڈبکی لگائی۔ وہ پانی کے اندر چلا گیا۔ جلاوت تیر پر نظریں جمائے سرپٹ دوڑا۔

تیر درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ اس کے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا جلاوت بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سب کی نظریں اسی سمت اٹھی تھیں جدھر جلاوت گیا تھا۔ دریا گنگناتا

ہوا بہتا رہا۔ ہوا کے تھپیڑوں سے پانی میں ہلچل پیدا ہوتی۔ بار بار لہریں اٹھتیں اور کناروں سے ٹکرا کر بکھر جاتیں۔

آخر جلاوت درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ تیر اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا قریب آیا اور ریتیلے تودے پر چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ اس نے تیر مزاری کے سامنے ڈال دیا۔ لڑکھڑایا اور مزاری کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

سردار شہ زور خاں مزاری نے تیر مٹھی میں دبا کر ہاتھ بلند کیا۔ اونچی آواز سے کہا۔ "لنگر' اپنا سر پانی سے باہر نکال۔ جلاوت تیر لے کر آگیا۔ تیرا امتحان ختم ہو گیا۔"

مگر لنگر خاں کا سر پانی سے باہر نہ نکلا۔ ہر نگاہ دریا کی جانب اٹھی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ سردار مزاری نے زیادہ اونچی آواز سے لنگر کو پکارا۔ اس بار بھی نہ پانی میں ہلچل ہوئی نہ لنگر خاں کا سر لہروں کے درمیان ابھرا۔ شہ زور خاں مزاری نے تیسری بار لنگر خاں کو پکارا۔ اس کی آواز زیادہ اونچی اور گرج دار تھی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کوئی نہ بولا' سب خاموش تھے۔ دم بخود تھے۔ مڑ مڑ کر دریا کی جانب دیکھتے تھے۔ انھیں لنگر خان کی تلاش تھی۔ مگر اس کا سر پانی سے نہ ابھرا۔

مزاری کے حکم پر غوطہ خور پانی میں اترے۔ دور دور تک تیرتے ہوئے گئے۔ جگہ جگہ غوطے لگائے۔ لیکن لنگر خان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

سردار مزاری دم سادھے بیٹھا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کے گرد خیری لپٹی ہوئی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ حقے کی نے ہونٹوں سے لگائے آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

دریائے سندھ پر سکون تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ مگر درختوں کے نیچے ابھی تک ٹھنڈک تھی۔ دریا کی جانب سے آتے ہوئے بھیگے بھیگے جھونکے خوش گوار اور فرحت بخش تھے۔

ذرا دیر بعد سردار مزاری نے حقے کی نے ہاتھ سے ایک طرف کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ حاضرین کو مخاطب کیا۔ "لنگر' اگر ڈوب کر مر گیا تو اس کی لاش اب تک ابھر کر پانی کے اوپر آجانا چاہیے تھی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

سامنے نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بوڑھے نے اس کی تائید کی۔ "ہا سیں'

اب تک اس کی لاش پانی پر آجانا چاہیے تھی۔"

ایک اور آواز ابھری۔ "سیں سردار' تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔"

مزاری نے اس بار کھل کر اپنے شک کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے وہ پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔ وہ ماچھی ہے۔ زبردست تارا اور تیراک ہے۔ وہ بالکل ایسا کر سکتا ہے۔" اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ "پر وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا۔" اس نے مڑ کر چاکر خان سرگانی کی جانب دیکھا۔ "چاکر! بیڑیاں لنگر کو ڈھونڈنے کے لیے روانہ کر۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ "لنگر کو گرفتار کیا جائے اور فوراً پیش کیا جائے۔"

حکم ملتے ہی چاکر خان سرگانی نے ملاحوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ لنگر خاں کو تلاش کریں اور جیسے بھی ممکن ہو پکڑ کر سردار مزاری کے روبرو پیش کریں۔ فوراً پانچ کشتیاں لنگر خاں کی تلاش میں مختلف سمتوں کو روانہ ہو گئیں۔

دیکھتے دیکھتے کشتیاں دریا کی سطح پر دھبوں کی مانند نظر آنے لگیں۔ پھر وہ لہروں پر ڈولتی' ہچکولے کھاتی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

☆

کشتیوں پر بیٹھے ہوئے ملاح چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ لنگر خاں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ چپواروں پر تیزی سے چل رہے تھے۔ سانولے جسم دھوپ سے چمک رہے تھے۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر پیشانیوں پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو پونچھتے اور زیادہ مستعدی سے کشتیوں کو آگے اور آگے بڑھاتے۔

نشیب میں' لگ بھگ تین میل آگے جہاں دریا نیم دائرہ بناتا ہوا مغرب کی جانب مڑتا تھا ایک کشتی کے ملاحوں کو دور سے جھاڑیوں سے الجھا ہوا گہرا نیلا منجھلا نظر آیا۔ جھاڑیاں دریا کے کنارے تھیں اور پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ منجھلا شاخوں سے الجھا ہوا تھا اور ہوا کے تھپیڑوں سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ ملاحوں نے فوراً کشتی موڑی اور جھاڑیوں کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے دیکھا نیلے منجھلے کے ساتھ ہی ایک گھنی شاخ میں لنگر خاں کی لاش پھنسی ہوئی تھی اور پانی پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔ لاش بالکل برہنہ تھی۔

ملاح جھٹ کشتی سے پانی میں اترے۔ تیرتے ہوئے لاش کے قریب پہنچے۔ اسے گھنی شاخ سے علیحدہ کیا اور کشتی میں ڈال دیا۔ نیلا منجھلا' جسے پانی میں ڈبکی لگاتے وقت لنگر خاں باندھے ہوئے تھا' اب ملاحوں کے ہاتھ میں دبا تھا۔ انھوں نے منجھلا' لنگر خان کی برہنہ لاش پر ڈال دیا اور کشتی تیزی

سے کھیتے ہوئے شمشیر والی کی سمت بڑھے۔

کشتی منزل مقصود پر پہنچی۔ کنارے لگائی گئی۔ لنگر خاں کی لاش اتاری گئی۔ اور سردار شہ زور خاں مزاری کے روبرو ریتلی زمین پر رکھ دی گئی۔ منجھلا ہٹا کر اس پر ایک ملگجی سفید چادر ڈال دی گئی۔

سردار مزاری نے لنگر کی لاش غور سے دیکھی مگر خاموش بیٹھا رہا۔ کچہری ابھی برخاست نہیں ہوئی تھی۔ تودے کے نشیب میں ہاتو کھڑا تھا۔ ذرا ہٹ کر جلادت اور لنگر خاں کا دوسرا گواہ نمیسو خاں کھڑا تھا۔ ان کے نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سہمے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں سے خوف اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

رحیم داد' ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ریت پر بچھی ہوئی چٹائی پر گم صم بیٹھا تھا۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے بار بار لنگر خاں کی لاش دیکھتا جو ریت پر پڑی تھی۔ جس چادر سے لاش ڈھکی تھی وہ ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے تھر تھرا رہی تھی۔ لنگر خاں کی موت سے رحیم داد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشات کلبلا رہے تھے۔

لیکن سردار مزاری کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ لاش کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد مقدمے کی کارروائی' جو معطل ہو گئی تھی' دوبارہ شروع ہو گئی۔ مزاری نے لنگر خاں کی لاش کی جانب ہاتھ اٹھا کر اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اونچی آواز سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔

"سب کو پتہ ہے کہ لنگر ماچھی تھا۔ ماچھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھا تیراک بھی تھا۔ سچا اور بے گناہ ہوتا تو میری پہلی ہی پکار پر پانی سے باہر نکل کر ہنستا مسکراتا سب کے سامنے آجاتا۔ پر وہ جھوٹا اور چور تھا۔ تب ہی ڈوب کر مرگیا۔ اسے مرنا ہی تھا۔ اس نے ہاتو کا اونٹھ چوری کیا تھا۔ اسے چوری کی سزا مل گئی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ "سچ پوچھو تو اس کا فیصلہ اوپر والے نے کیا۔"

ایک بوڑھے نے جو وضع قطع سے گاؤں کی مسجد کا ملا نظر آتا تھا' اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اونچی آواز سے کہا۔ "سیں سردار' تو نے بالکل سچ کہا۔ اصلی فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کی نظروں سے کوئی گناہ گار بندہ نہیں بچ سکتا۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملتی ہے۔ لنگر کو بھی اللہ نے چوری کی سزا دی۔"

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ مگر ہاتو زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے دہائی دی۔ "سیں سردار' توں سکھی صحت ہووی۔ مال جان' سب کی خیر ہووی۔" اس نے قدرے

توقف کیا۔ "سیں، لنگر کو تو چوری کی سزا مل گئی۔ پر میرا کیا بنے گا؟" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "سیں، میں مصیبت دا ماریا غریب جتوال ہوں۔ میں تباہ ہو گیا۔ مجھے میرا اوٹھ دلوا دے۔ توں سدا جیویں، رب راضی ہووی۔"

"تجھے، تیرا اوٹھ ملے گا، ضرور ملے گا۔ پر تو چپ کر کے کھڑا رہ۔" سردار مزاری نے اسے تسلی دی۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ جلاوت اور نمیسو خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ انھیں قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ تند اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "لنگر نے چوری کی تھی، اسے اپنے جرم کی سزا مل گئی۔ تم دونوں نے جھوٹی گواہی دی تھی، تم کو کیا سزا ملنی چاہیے؟"

جلاوت اور نمیسو نظریں نیچی کیے دم بخود کھڑے رہے۔ انھوں نے کچھ نہ کہا۔ ان کے چہروں پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

سردار شہ زور خاں مزاری نے سامنے بیٹھے ہوئے گاؤں کے بڑے بوڑھوں پر نظر ڈالی۔ ان میں جو سب سے زیادہ معمر بلوچ نظر آتا تھا اسے مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بابے، تو عمر میں سب سے وڈا نظر آتا ہے۔ تو نے تو ایسے بہت مکدمے دیکھے ہوں گے۔ تو بتا جھوٹی گواہی دینے کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ تو بلوچوں کی ریتاں رسماں ٹھیک طرح جانتا ہے۔ ان کے کانون کو بھی سمجھتا ہے۔ میں تیری رائے اور تیری صلاح معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

بوڑھا لاٹھی کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال روئی کے گالوں کی مانند سفید تھے۔ کمر بھی جھکی ہوئی تھی۔ دانت گر گئے تھے۔ وہ پوپلے منہ سے لڑکھڑاتی آواز میں گویا ہوا۔ "سردار! تو نے ٹھیک سوچا۔ میری عمراں بہت ہے۔ تو نے اپنے ماپیو سے سنا ہو گا۔ جب لاٹ سنڈمن نے کلات پر چڑھائی کی تو مزاریوں کا سردار امام بکش بھی اپنا لشکر لے کر اس کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے لشکر میں میرا پیو بھی تھا۔ تب میں جوان تو نہیں تھا پر اتا وڈا ضرور تھا کہ اس کی بھیڑ وکریوں کے گلے کی پوری طرح دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اس کا بہت وڈا ریوڑ ہوتا تھا۔ پنجاہ سے اوپر تو وکریاں رہی ہوں گی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر میرا پیو لڑائی سے نہ لوٹا۔ میں نے اسے فیر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بہت بہادر اور زور آور تھا۔"

سردار مزاری نے اکتا کر بوڑھے کو ٹوکا۔ "بابے، میں نے تیرے پیو کے بارے میں نہیں پوچھا۔ تو میرے سوال کا جواب دے۔"

بوڑھا بلوچ، جو بات کہتے کہتے پٹڑی سے اتر گیا تھا، فوراً سنبھلا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔ "سیں سردارا، میں نے ان بوڑھی آنکھوں سے نہ جانے کتنے ایسے مکدمے دیکھے ہیں۔"

اس نے آنکھوں پر لگی ہوئی موٹے موٹے شیشوں کی بوسیدہ عینک درست کی۔ ”قاعدہ کنون تو یہ ہے کہ چور اگر اپنا جرم نہ مانے تو اسے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے جلتی آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے یا پانی میں غوطہ لگانا ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے لنگر کو کرنا پڑا تھا۔“ بوڑھے نے لنگر خاں کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔ ”لنگر نے چوری کی تھی۔ اسے اپنے جرم کی سزا مل گئی۔ اس کے دونوں گواہ جھوٹے ٹھیرے۔“ اس نے نظر بھر کر جلاوت اور نمیسو کو دیکھا۔ ”جھوٹے گواہوں کی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں تاکہ آگے جھوٹی گواہی نہ دیں۔ اور انھیں دیکھ کر دوسرے توبہ کریں۔ عبرت پکڑیں۔“

اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ ایک اور بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ”سئیں سردار، میری عمراں ویسے تو دین دار سے کم ہے۔“ اس نے بوڑھے کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”پر میں نے بھی ایسے مکدمے بہت دیکھے ہیں۔ مجھے پتہ ہے جھوٹی گواہی دینے کی یہ سزا مدت ہوئی بند کر دی گئی۔“

”ایسا نہ کہہ۔ مجھے بھی پتہ ہے یہ سزا بند نہیں کی گئی۔“ بوڑھے دین دار نے وضاحت کی۔ ”ہاں، اتنا ضرور ہے کہ اب ایسی سزا نہیں دی جاتی۔ پر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اب چور کے لیے جلتی آگ میں سے گزر کر یا گہرے پانی میں غوطہ لگا کر اپنی تئیں بے گناہ ثابت کرنے کا پہلا جیسا چلن بھی نہیں رہا۔“ اس نے گردن اونچی کی اور شہ زور مزاری کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بلوچوں کا پرانا کنون ختم ہو گیا۔ بلوچستان میں اب تک یہی کنون چلتا ہے۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”یہ تو سردار کی مرضی ہے جیسے چاہے مکدمے کا فیصلہ کرے۔“ اس کا لہجہ اونچا ہو گیا۔ ”سردار نے بالکل صحیح فیصلہ دیا۔ اور بلوچوں کے کنون کی رو سے ٹھیک دیا۔“

حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

جلاوت اور نمیسو گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ اور سر جھکا کر گڑگڑانے لگے۔ ”سئیں، توں سدا جیویں۔ تیرے بالیں بچیں جیویں۔ تو سکھی صحت ہووی۔ سئیں سردار ہم سے بھل ہو گئی۔ ہماری غلطی معاف کر دے۔ سئیں، آگے ایسی بھل نہیں ہو گی، کبھی نہیں ہو گی۔“ وہ جھک کر ناک اور پیشانی ریتلی زمین پر رگڑنے لگے۔

”سر اوپر کرو۔“ سردار مزاری نے دونوں کو ڈانٹا۔ انھوں نے اپنے سر اٹھائے اور عاجزی سے مزاری کی جانب دیکھنے لگے۔ مزاری نے پوچھا۔ ”بتاؤ، چوری کا اونٹھ کہاں ہے؟ سچ سچ بتانا۔“

نمیسو خاموش رہا۔ جلاوت بولا۔ "سردار، ہم نے اونٹھ نہیں دیکھا۔ سئیں کسم لے لے۔ ہم نے ہاتو کا اونٹھ بالکل نہیں دیکھا۔ سئیں معافی دے دے۔ ہم سے بھل ہو گئی۔"

"ایسے کام نہیں چلے گا۔" مزاری نے گرج کر اونچی آواز سے کہا۔ "تم دونوں کی سزا صرف اسی صورت میں معاف ہو سکتی ہے کہ اونٹھ کا فوراً کھوج لگاؤ اور اسے پیش کرو۔"

دونوں نے ایک زبان ہو کر التجا کی۔ "سردار، ہم اونٹھ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں، اونٹھ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس کے پاس ہے؟"

"جب تم کو کچھ پتہ نہیں تو گواہی دینے کیوں آ گئے؟"

"بھل ہو گئی۔ سئیں معافی دے دے۔ توں سدا جیویں۔"

سردار شہ زور خاں مزاری نے حقے کی نے سنبھالی۔ منہ سے لگائی۔ چپ چاپ بیٹھا حقے پر کش لگاتا رہا۔ سامنے بیٹھا ہوا ہر شخص دم بخود تھا۔ خاموش تھا۔ پھر اس خاموشی میں مزاری کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جلاوت اور نمیسو نے جھوٹی گواہی دی ہے۔ دونوں نے اپنے جرم کو مان بھی لیا ہے۔" سردار کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

"جلاوت اور نمیسو پر چار سو روپے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے جسے چاکر خاں کے پاس جمع کرانا ہو گا۔ ہاتو جتوال کا اونٹھ چوری ہوا ہے، اسے اونٹھ ملنا چاہیے۔ جلاوت اور نمیسو اسے اونٹھ واپس کریں گے۔ دونوں کو پندرہ روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ تب تک ضمانت کے طور پر دونوں کے بال بچے کید میں رکھے جائیں گے۔ اگر انھوں نے اس مدت میں ہاتو کا اونٹھ اور جرمانہ پیش نہیں کیا تو دونوں کے ہل بیل اور گھر بار ضبط کر لیا جائے گا۔ انھیں زمین سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ فیصلے پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔ چاکر خان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جلاوت اور نمیسو کے بال بچوں کو گرفتار کر لے۔ کچہری اب برخاست کی جاتی ہے۔"

چاکر خان سرگانی آگے بڑھا۔ تودے کے اوپر پہنچا۔ اس نے شہ زور مزاری کی ٹانگوں اور کمر کے گرد لپٹی ہوئی خیری کی گرہ کھول دی۔ مزاری نے ٹانگیں پھیلا کر سیدھی کیں۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ تودے سے نیچے اترا اور رحیم داد کے ہم راہ بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے بلندی سے نیچے اترنے لگا۔ سردار مزاری اور رحیم داد احاطے کے ایک گوشے میں کھلے آسمان تلے مونڈھوں پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ شراب ببول کی چھال سے کشید کی گئی تھی۔ بہت تلخ تھی۔ تند اور تیز بھی تھی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ دونوں دیسی

شراب کے گھونٹ آہستہ آہستہ بھرتے رہے۔

قدموں کی آہٹ سن کر انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ چاکر خان سرگانی اندھیرے سے نکل کر ان کی جانب بڑھا۔ اس کے ہم راہ دو عورتیں بھی تھیں۔ انھوں نے بوچھن کے آنچل سے بکل مار کر اپنے چہروں کو اس طرح چھپا رکھا تھا کہ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔ وہ نگاہیں نیچی کیے سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

سردار مزاری نے دونوں کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ اس کے بشرے سے استجاب ہویدا تھا۔

چاکر خاں سرگانی پرانا مزاج شناس تھا۔ فوراً اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ گیا۔ آگے بڑھ کر بولا۔ ”سئیں سردار، یہ جلاوت اور نمیسو کی رن ہیں۔ ان کے بچے بھی حراست میں لے لیے گئے ہیں۔“ اس نے نوکروں کی کوٹھریوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”ادھر ایک کوٹھڑی میں بند ہیں۔“

مزاری کا چہرہ دمکنے لگا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھری۔ جھوم کر بولا۔ ”انھیں نہلا دھلا۔ اجلے کپڑے پہنا۔ روٹی کھلا اور کمروں میں پہنچا دے۔“

چاکر خاں کورنش بجا لانے کے انداز میں ذرا سا جھکا۔ اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ دونوں عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ دالان کے ستون سے لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی میں وہ سکڑی سکڑائی آگے بڑھ رہی تھیں۔ مزاری نظریں اٹھائے دونوں کو تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ان کے جسموں کے پیچ و خم کا جائزہ لیتا رہا۔

جلاوت اور نمیسو کی بیویاں چاکر خان سرگانی کے ساتھ اندھیرے میں اوجھل ہو گئیں۔ سردار مزاری نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ وہ خاموش تھا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ احاطے میں خاموشی چھائی تھی۔

مگر گاؤں کے کسی گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں آواز سے آواز ملا کر گا رہی تھیں۔ انھوں نے ایک شوخ سرائیکی گیت چھیڑا۔ یہ بہاکہ تھا۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لہک لہک کر بہاکے کے بول الاپ رہی تھیں۔

سوہنی چلی اے بزار
مارے اکھ، اٹھاوے یار
تیڈے جوبن تے بہار!
تیڈا من کرے دھک دھک

بہا کے کا آخری بول انھوں نے موقع کی مناسبت سے بگاڑ دیا تھا۔ اور ڈھولک کی تیز تھاپ پر اسے بار بار دہرا رہی تھیں۔ بول کے ساتھ ساتھ قہقہے بھی بلند ہو رہے تھے۔

رحیم داد نے اپنا گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس کی نگاہیں اس سمت اٹھی تھیں جدھر سرگانی کے ہمراہ جلاوت اور نمیسو کی نوجوان بیویاں گئیں تھیں۔

"کیا دیکھ رہا ہے چوہدری؟" مزاری نے ایک آنکھ دبا کر شوخی سے کہا۔ "ادھر بھی زمین الاٹ کرا لے۔ ابھی بہت متروکہ اراضی پڑی ہے۔ زمین داری کا مزا آجائے گا۔ عیش کرے گا عیش۔"

"تو کہتا ہے تو الاٹ کرا لوں گا۔" رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مجھے ایک بات بتا۔"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

رحیم داد کے ذہن میں لنگر خاں کی موت کے بارے میں جو وسوسے اور خدشات کلبلا رہے تھے' زبان پر آگئے۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لنگر دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس نے تیرے ہی حکم پر پانی میں غوطہ لگایا تھا۔ اس کے اس طرح مرنے پر تیری خلاف قتل کا کیس بن سکتا ہے۔"

"چوہدری تو کس چکر میں پڑ گیا۔" شہ زور خان مزاری نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ "بہا کہ سن۔ بہت پھڑک دار ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ لمحہ بھر تک اسے تکتا رہا' پھر ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ نشے سے لہرا کر بولا۔ "سئیں چوہدری' ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"

رحیم داد کو سردار مزاری کی بے نیازی پر سخت تعجب ہوا۔ لیکن اس کا اظہار نہ کر سکا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رات کے سناٹے میں ڈھولک ٹھنکتی رہی۔ بہا کے کے بول گونجتے رہے۔

تیڈا یار اے سنار

تیڈا یار اے منہیار

کچھ دیر بعد ڈھولک کی ٹک ٹک رک گئی۔ قہقہوں کا ایک طوفان امڈا۔ جل ترنگ کی مانند دیر تک فضا میں کھنکتا رہا۔ قہقہے تھمے تو ایک بار پھر ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ تیز اور تیز ہوتی گئی۔ نوجوان سہاگنوں اور چنچل دوشیزاؤں کی دوسری ٹولی نے بہا کے کے جوابی بول چھیڑے۔ وہ جھوم جھوم کر اونچی آواز سے گانے لگیں۔

سنار ڈیوی جھانجھر اں

منہیار ڈیوی ہار!
توں چل تاں بزار

رات گزرتی گئی۔ کاجل کی طرح کالی ہوتی گئی۔ سردار شہ زور مزاری نے گلاس ختم کیا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھے۔ سیڑھیاں طے کیں۔ اوپر پہنچے۔ برآمدے میں کچھ دور چلنے کے بعد اپنے اپنے کمروں کی سمت بڑھے۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں سامنے پلنگ پر ایک نوجوان عورت پیر لٹکائے گم صم بیٹھی تھی۔ وہ سرخ گوٹ کا گھگرا پہنے ہوئے تھی۔ چولا زرد رنگ کا تھا۔ اس کے گریبان پر سیاہ دھاگے سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سر کے بال سیاہ اور چمک دار تھے۔ چہرہ تیز دھوپ میں کام کاج کرنے سے تپ کر تانبے کی مانند سرخ پڑ گیا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال سے زائد نہ تھی۔ مگر سخت مشقت اور غذائیت کی کمی کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتی تھی۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہو کر آگے بڑھا اور اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ کسمسائی اور اپنا بدن سکیڑ لیا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو جلاوت کی گھر والی ہے یا خمیسو کی؟"

"میں خمیسو کی ذال ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ترا نام کیا ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" وہ بے رخی سے بولی۔

"اتا نکھرا نہ دکھا۔ آرام نال گل بات کر۔" رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی۔ "مسکرا کر بول۔ یوں روٹھی روٹھی تو چنگی نہیں لگتی۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ "چپ کر کے کیوں بیٹھی ہے۔ گل بات کر۔" اس نے نشے میں جھوم کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تجھے پتہ نہیں۔ میں چاہوں تو خمیسو کو معافی دلا سکتا ہوں۔"

خمیسو کی بیوی نے چونک کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو ایسا کر سکتا ہے؟" اس کے انداز میں حیرت اور استعجاب تھا۔

"ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر اونچی کی۔ "تو فکر نہ کر۔ خمیسو کو معافی مل جائے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس دفعہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ بے زاری اور جھنجلاہٹ کم ہو گئی تھی۔ "سردار اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ وہ کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔"

"یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔" رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس نے احتجاج نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔ "سردار میرا یار ہے۔ میرے کہنے پر وہ اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے۔ تو کل ہی دیکھ لینا۔"

"سیں، تو سچ کہہ رہا ہے۔" اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دبی دبی مسرت سے دمکنے لگا۔ "سیں توں سکھی صحت ہووی۔ رب راضی ہووی۔" اس کے لہجے سے خوشامد صاف عیاں تھی۔ "خمیسو کو معافی مل گئی تو میں اپنے گھر چلی جاؤں گی ناں؟"

"بالکل چلی جائے گی۔" رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا۔ عین اس وقت سنسان رات میں کسی بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز ابھری۔ خمیسو کی بیوی تڑپ کر اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آگے نہ بڑھنے دیا۔ "تو کدھر چلی؟"

"سیں، میرا نکا رو رہا ہے۔" وہ بے قرار ہو کر بولی۔ "میں نے اسے دودھ پلانا ہے۔ وہ بھوکا ہے۔"

"بیٹھ جا۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ "تو ابھی نہیں جا سکتی۔"

خمیسو کی بیوی نے بے بسی سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ مگر رحیم داد اس کی بے قراری کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "چلی جانا۔ چلی جانا۔ پر ابھی نہیں۔" وہ نشے کی جھونک میں کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

بچہ بھوک سے بلکتا رہا۔ اپنی ماں کے لیے روتا رہا۔ اس کے رونے کی آواز رک رک کر سناٹے میں ابھرتی رہی۔

☆

رحیم داد ناشتا کرنے پہنچا تو شہ زور مزاری موجود نہ تھا۔ ملازم نے خلاف توقع مزاری کے پہنچے بغیر ہی ناشتا لگا دیا۔ رحیم داد نے ملازم سے پوچھا۔ "نوشیر! آج سردار کدھر ہے۔ وہ ناشتا نہیں کرے گا؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"سیں، وہ تو سویرے سویرے چلا گیا۔" نوشیر نے جواب دیا۔

"کہاں گیا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" نوشیر نے بتایا۔ "اتنا ضرور ملوم ہے، سویرے سویرے بہت تڑکے

تھانیدار آیا تھا۔ سردار اسی کے ساتھ چلا گیا۔"

"تھانیدار کے ساتھ گیا ہے؟" رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں" نوشیر نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ نوشیر چلا گیا۔ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر خدشات ابھرنے لگے۔ سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ تھانیدار لنگر خان کی موت کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے شہ زور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا تھا۔ شہ زور مزاری کے اس طرح تھانیدار کے ہم راہ جانے پر اور سوا ہو گیا۔

وہ تمام دن پریشان رہا۔ مزاری شام کو بھی نہ لوٹا۔ چاکر خان سرگانی بھی، بھروسہ آیا۔ نوشیر کو سرگانی کے بارے میں بھی کوئی علم نہ تھا۔ دو روز گزر گئے۔ سردار مزاری واپس نہ آیا۔

رحیم داد دوپہر کے کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ باہر لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا۔ جلاوت اندر داخل ہوا۔ وہ چادر سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً دروازہ بند کیا۔ چہرے سے لپٹی ہوئی چادر ہٹائی اور رحیم داد کی جانب بڑھا۔

رحیم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر جلاوت کو دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے لپکا اور رحیم داد کے پیر پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"سئیں، توں سدا جیوی۔ سکھی صحت ہووی۔"

رحیم داد کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اس نے اپنے پیروں کو جلاوت کی گرفت سے چھڑایا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "سیدھا کھڑا ہو کر گل بات کر۔ یہ بتا تو ادھر کیسے آیا؟"

جلاوت نے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد کے پیروں پر سے ہاتھ ہٹائے اور سر جھکا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

"سئیں، میں تیرے پاس اس لیے آیا ہوں کہ توں مجھے سردار سے معافی دلوا دے۔" اس نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "سئیں، وہ تیرا کہا ضرور مان لے گا۔"

"یہ بات تجھ سے نمیسو کی گھر والی نے کہی ہے؟"

"نا سئیں، ایسی کوئی گالہہ نہیں۔" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "سئیں، نمیسو کی ڈال تو کید میں ہے۔ میں اسے کیسے مل سکتا ہوں؟" اس نے ملتجی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "سئیں، مجھے

پتہ ہے' تو مجھے معافی دلوا سکتا ہے۔"

رحیم داد سر جھکا کر سوچنے لگا۔ جلاوت منت سماجت کرتا رہا۔ "سیں' رب راضی ہووی۔ توں سکھی صحت ہووی۔ مجھے معافی دلوا دے۔" وہ ایک بار پھر رحیم داد کے پیر پکڑنے کے لیے جھکا۔ رحیم داد نے جھٹ اپنے پیر سمیٹ لیے۔ معاملے کی نزاکت اور پیچیدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں سردار سے تیری معافی کے لیے سفارش تو کر سکتا ہوں پر سوال یہ ہے کہ ماتو کے اونٹ کا کیا بنے گا۔ اس کا تو اونٹ چوری ہوا ہے۔ وہ اپنا اونٹ چاہتا ہے۔ جب تک اسے اونٹ نہیں ملے گا۔ وہ دہائی دیتا رہے گا۔ تو خود سوچ' وہ جتوال ہے۔ اونٹ کے بغیر وہ کیا کرے گا۔ کیسے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے گا۔"

"سیں' میں اس کا اونٹھ کدھر سے لاؤں۔ مجھے تو اس کا کچھ پتہ نہیں۔" جلاوت نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "اونٹھ خرید بھی نہیں سکتا۔ غریب راہک ہوں۔ زمین جوتنے کے لیے میرے پاس صرف ایک جوڑی ہے۔ اسے بھی بیچ دوں۔ مویشی بھی بیچ دوں' تب بھی اونٹھ نہیں خرید سکتا۔" اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "سیں' یہ بھی تو سوچ۔ جوڑی بیچ دوں تو کروں گا کیا۔ میرے بال بچے بھوکے مر جائیں گے۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ سیں' میں بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ تو مجھے تباہ ہونے سے بچا لے۔"

"تو اکیلا تو نہیں ہے۔" رحیم داد نے اسے یاد دلایا۔ "نمیسو بھی تو ہے۔ دونوں مل کر اونٹ خرید سکتے ہیں۔ جرمانہ ادا کر سکتے ہیں۔ سردار نے اپنے فیصلے میں بھی یہی حکم دیا ہے۔"

"سیں' تجھے پتہ نہیں۔ نمیسو کے پاس نہ زمین ہے نہ جوڑی۔ وہ تو آجری ہے۔ گلہ بانی کرتا ہے۔ تھوڑے سے مویشی رکھتا ہے۔ انھی سے کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتا ہے۔" جلاوت کے لہجے میں نمیسو کے لیے جذبہ ہمدردی تھا۔ "سیں' وہ تو مجھ سے بھی زیادہ غریب مسکین ہے۔"

"تب تو اکیلے تجھے ہی اونٹھ دینا ہو گا۔ جرمانہ بھی پورا تجھے ہی ادا کرنا ہو گا۔"

"نا سیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" جلاوت نے جھٹ وضاحت کی۔ "میں اپنا ہی تاوان ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔"

"مان لے نمیسو روپے اکٹھا نہ کر سکا' تب کیا ہو گا؟" رحیم داد نے نمیسو کے بارے میں پریشان ہو کر پوچھا۔

"پندرھاں روز گزرنے کے بعد وہ تاوان کا بندوبست نہ کر سکا تو سردار اس کے مال مویشی سب

ضبط کر لے گا۔" جلاوت نے مطلع کیا۔

"تمیسو کی گھر والی اور بچوں کا کیا بنے گا؟"

"وہ کید میں رہیں گے۔" جلاوت نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تک وہ کید میں رہیں گے' ان کی روٹی کا خرچہ تمیسو کو دینا پڑے گا۔ جب ان کی روٹی کا خرچہ نہیں پہنچے گا تو سردار ان کو شاہ میر بھیج دے گا۔ تمیسو کی رن حویلی میں ویگار پر لگا دی جائے گی۔ وہ اکیلی ذال نہیں' حویلی میں ایسی اور بھی کئی ہیں۔"

"کب تک وہ حویلی میں ویگار پر رہے گی؟" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو سردار کی مرضی پر ہے۔" جلاوت نے رحیم داد کو بتایا۔ "اگر تمیسو نے ادھار لے کر تاوان ادا کر دیا تب تو وہ اپنی رن اور بچوں کو لے جائے گا۔ ایسا نہ کر سکا تو سردار جب تک چاہے گا اس کے بال بچوں کو ویگار پر لگائے رکھے گا۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ سردار ہے۔" وہ ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔ "سیں تو سردار سے کہے گا تو وہ معافی دے دے گا۔"

"پر ہاتو کے اوٹھ کا کیا بنے گا۔؟ اسے تو اپنا اوٹھ چاہیے۔" رحیم داد نے اسے مسئلے کی نزاکت کا احساس دلایا۔ "سردار تو اسے اوٹھ خرید کر دینے سے رہا۔"

"ایسا تو وہ ہرگز نہیں کرے گا۔" جلاوت پریشان ہو کر بولا۔

"جب ایسا ہے تو وہ تجھے کیسے معافی دے سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔ "میرا کہنا مان' جا کر کسی نہ کسی طرح روپے کا بندوبست کر۔ اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔"

"سیں' میں نے بہت کوشش کی۔" جلاوت نے عاجزی سے کہا۔ "ادھار بھی لینے کی کوشش کی' پر کام نہیں بنا۔ میں غریب راہک ہوں۔ اتا وڈا تاوان کیسے ادا کر سکتا ہوں۔"

"جب تو روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا تو میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" رحیم داد نے بے رخی سے کہا۔ "میں زیادہ سے زیادہ یہ کرا سکتا ہوں کہ جرمانے کی رکم معاف کروا دوں۔ پر ہاتو کے اوٹھ کا کیا بنے گا۔ اسے تو اوٹھ چاہیے۔ وہ بھی غریب جتوال ہے۔ اسے اٹھ نہ ملا تو اس کے بال بچے بھوکے مر جائیں گے۔"

جلاوت سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ چند لمحے بعد جلاوت نے نظریں بلند کیں۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی چمک تھی۔

رحیم داد نے اس سے نظریں نہ ملائیں۔ بدستور خاموش بیٹھا رہا۔

"لنگر کی بیڑی بیچ کر ہاتو کے لیے اونٹھ خریدا جا سکتا ہے۔" جلاوت نے تجویز پیش کی۔ "سردار چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ سئیں، ویسے بھی لنگر کی بیڑی اب کون چلائے گا۔ رن اس کی بیمار ہے۔ کچھ نہیں کر سکتی۔ بچے بھی بہت چھوٹے ہیں۔ وہ بیڑی دریا میں نہیں چلا سکتے۔ وہ تو چپوار بھی نہیں اٹھا سکتے۔"

رحیم داد کو اس کی خود غرضی پر کسی قدر تعجب ہوا۔ مگر نظر انداز کر گیا۔ کہنے لگا۔ "ایسا ہو تو سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ بتا کیا یہ سچ ہے کہ ہاتو کا اونٹھ لنگر ہی نے چوری کیا تھا؟"

"سئیں، کسم لے لے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" جلاوت نے اپنی صفائی پیش کی۔ "پر اتنا ضرور ہے۔ جب لنگر پانی میں ڈوب کر مر گیا تو یہ ثابت ہو گیا کہ اونٹھ اسی نے چوری کیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ لنگر نے جھوٹ بولا تھا۔"

"لنگر نے چوری کی ہو تو حیرانگی کی گالہہ نہیں۔" جلاوت نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ ماچھی تھا۔ اور ماچھی تو چوری چکاری کے لیے بدنام ہی ہیں۔"

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تو اس کا یار تھا۔ تو بھی ماچھی رہا ہوگا۔"

"نا سئیں، میں تو راہک ہوں۔ تجھے بتا بھی چکا ہوں۔" جلاوت نے صفائی پیش کی۔ "میں تو مزاری بلوچ ہوں۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سئیں، تجھ سے کیا چھپانا، مزاریوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے پرکھے اور وڈیرے بھی چوری ڈکیتی کرتے تھے۔ جب وہ پچھاں کے پہاڑوں میں رہتے تھے تو نیچے اتر کر مویشی اٹھا لے جاتے تھے۔" اس نے مغرب کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "ادھر دریا کنارے آکر بسے تو راتوں کو چھپ چھپ کر ٹولیوں میں نکلتے۔ دریا کے کنارے کھڑی ہوئی بیڑیوں اور کشتیوں میں لدا ہوا سارا مال اسباب لوٹ کر لے جاتے۔ تب ہی تو لغاری اور دوسرے تمن، مزاریوں کو دریائی لٹیرے کہتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "سئیں، سچ پوچھ تو پرانے زمانے میں سارے ہی بلوچ تمن لٹیرے ہوتے تھے۔ پہاڑوں میں رہتے تھے۔ جب کھانے پینے کو کم پڑ جاتا تو نیچے اترتے۔ جو مکابلے پر آتا اسے مار دیتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ بلوچوں کی ایسی لوٹ مار کرنے والی ٹولیوں کو چاپاؤ کہا جاتا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مزاری بھی پہلے چور ڈکیت ہوتے تھے۔"

"اب بھی ہوتے ہیں۔ چور ڈکیت تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" جلاوت کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"تیری باتوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ لنگر نے ہاتو کا اونٹھ چوری کیا تھا یا نہیں۔" رحیم داد اصل

موضوع پر آگیا۔ "مجھے صاف صاف بتا۔"

"سئیں، سچ پوچھ تو مجھے اونٹھ کی چوری کا کچھ پتہ نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ گھگیا کر بولا۔ "میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"جب تجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا تو گواہی دینے کیوں چلا آیا؟"

"سئیں، گالہہ اصلی یہ ہے کہ لنگر میرا پرانا یار تھا۔" جلاوت نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "اس نے منت سماجت کی تو میں گواہی کے لیے تیار ہو گیا۔ ویسے سچی گالہہ پوچھ تو وہ یہ ہے کہ میں نے لنگر کے پاس ہاتو کا اونٹھ نہیں دیکھا۔ یہ بات میں کسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔"

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "اب تو جا۔ مجھے سونا ہے۔"

جلاوت نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا۔ "سئیں، تو سردار سے مجھے معافی دلا دے گا ناں؟"

"سردار کو واپس آنے دے۔ میں تیرے بارے میں اس سے ضرور گل بات کروں گا۔" اس نے جلاوت کو اطمینان دلایا۔

جلاوت نے بڑھ کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ مڑا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

☆

دن ڈھلے سردار شہ زور مزاری اچانک رحیم داد کے کمرے میں آگیا۔ وہ اس وقت بے خبر سو رہا تھا۔ شہ زور مزاری نے اسے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر مزاری کو دیکھا، گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

سردار مزاری قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تو مجھے دیکھ کر اتنا گھبرایا گھبرایا کیوں نظر آرہا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"تو تھانیدار کے ساتھ گیا تھا نا؟" رحیم داد ابھی تک حیران و پریشان تھا۔ "کوئی گڑ بڑ کی گل تو نہیں؟"

"ایسی تو کوئی گالہہ نہیں۔" مزاری بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ "پر تو یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"لنگر کی موت کے بارے میں تو پولیس پوچھ تاچھ نہیں کر رہی؟" رحیم داد نے اپنے خدشے کا کھل کر اظہار کیا۔ "میں سمجھا پولیس تجھے تفتیش کے سلسلے میں لے گئی تھی۔"

"پولیس کیوں تفتیش کرنے لگی۔ تو خاماخا ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے۔" شہ زور مزاری کے لہجے میں اس بار تلخی تھی۔ "میں اپنی زمین داری میں بسنے والے بلوچوں کا سردار ہوں۔ مجھے کچہری لگانے اور مکدموں کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ان معاملات میں نہ حکومت مداخلت کرتی

ہے نہ پولیس۔ تجھے پتہ ہے یہ بلوچ تمن داروں کا علاکہ ہے۔ یہاں ان کا ہی کانون چلتا ہے۔"

"تو ایسا گیا کہ مجھ سے مل کر بھی نہ گیا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "میں سمجھا' نہ جانے تو اس طرح اچانک کیوں تھانیدار کے ساتھ چلا گیا؟ تجھے پتہ نہیں' میں تیرے بارے میں ادھر کتنا پریشان رہا۔"

"تو خاما خا پریشان رہا۔" اس نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ "میں تجھ سے مل کر نہ گیا یہ غلطی مجھ سے ضرور ہوئی۔ پر تجھ سے مل بھی تو نہ سکتا تھا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔ چاکر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ تیرے کمرے میں بھی گیا تھا۔"

"چاکر خان بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ وہ بھی تیرے ساتھ گیا تھا؟"

"وہ میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ پر وہ ادھر بھی نہیں رہا۔ روجھان گیا تھا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "مگر اسے تو کل شام کو واپس آجانا چاہیے تھا۔"

"پتہ نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "مجھے تو وہ اب تک نظر نہیں آیا۔"

"میں واپس آگیا ہوں تو وہ اب ضرور آجائے گا۔"

"یہ تو بتا تو گیا کہاں تھا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"راجن پور گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ادھر موجود تھا۔ اسی نے بلوایا تھا۔"

"کوئی خاص گل بات تھی؟" رحیم داد نے جھٹ پوچھا۔ وہ جلد سے جلد بات کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

"وہی سیاست کا چکر ہے۔" شہ زور خاں نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "اسمبلی میں مزاریوں کے دو ووٹ ہیں۔ حکومت دونوں ووٹ ری پبلکن پارٹی کی حمایت میں دلوانا چاہتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس اوپر سے حکم آیا ہے۔ تب ہی وہ اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ مزاری سرداروں سے مل رہا ہے۔ حکم کی تعمیل کرنی جو ہوئی۔"

رحیم داد کی پریشانی اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ مسکرا کر بولا۔ "لگتا ہے تو بھی اسی چکر میں پڑ گیا جس میں آج کل شاہ جی الجھا ہوا ہے۔"

"میں تو پڑنا نہیں چاہتا تھا پر ڈپٹی کمشنر کی بات بھی تو ٹالی نہیں جا سکتی۔" مزاری نے صفائی پیش کی۔ "ویسے اس سے یاری بھی ہے۔ کام کا بندہ ہے۔"

کمرے کا دروازہ کھلا۔ اونچے قد کا ایک نوجوان داخل ہوا۔ وہ نائیلون کی ہلکی بش شرٹ اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ رنگ اجلا تھا۔ وضع قطع اور صورت شکل سے تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔

مزاری نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ رحیم داد سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا لیلر ہے۔ آج کل وڈا سرکاری افسر لگا ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ اپنا چوہدری نور الٰہی ہے۔ اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

رحیم داد فوراً بستر سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا اور شہ زور مزاری کے ماموں زاد بھائی سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"یہ بھی لہور سے مزاریوں کے ووٹوں کے چکر میں ادھر بھیجا گیا ہے۔" سردار مزاری نے اس کے آنے کا مقصد بیان کیا۔ "پر ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔"

شہ زور خاں کا ماموں زاد بھائی ایک مونڈھا سرکا کر بیٹھ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تک کچھ طے کیوں نہیں ہوا؟" اس نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"جھگڑا یہ کھڑا ہو گیا ہے کہ وزارت تو لغاریوں کو مل رہی ہے۔" شہ زور مزاری نے مسئلے کی پیچیدگی پر روشنی ڈالی۔ "وہ لیگی جو ٹھیرے اور اوپر والوں کو ری پبلکن پارٹی کے لیے لیگ کے ووٹ کاٹنے ہیں۔ پر سوال یہ ہے کہ مزاری سرکاری پارٹی کو کیوں ووٹ دیں؟ وہ کہتے ہیں وزارت ہم کو دو۔ ورنہ دونوں میں سے کسی کو نہ دو۔ اسی میں معاملہ الجھا ہوا ہے۔ مجھے دوبارہ جانا پڑے گا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ماموں زاد بھائی کے کندھے کو ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "یہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر جائے گا۔ اسی لیے شمشیر والی آیا ہے۔"

"تو جا رہا ہے تو مجھے بھی لہور واپس جانے دے۔"

"ادھر تو جی سخت گرمی ہے۔" شہ زور کے ماموں زاد بھائی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "زبردست لو چل رہی ہے۔ اس بار ٹمپریچر ۱۱۸ فارن ہائٹ سے بھی اوپر پہنچ چکا ہے۔"

"سن لیا تو نے۔" سردار شہ زور خان مزاری نے ہنس کر کہا۔ "اتنی سخت گرمی میں لہور جا کر کیا کرے گا۔؟ آج کل شمشیر والی بہت پر سکون جگہ ہے۔ دریا کا کنارہ ہے۔ ہوا بھی زیادہ گرم نہیں۔ اور شام کو تو ادھر ٹھنڈ ہی رہتی ہے۔ جب تک گرمی زیادہ ہے تو ادھر ہی ٹھیر۔"

"تو یہاں سے کب جائے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"رات کو تو ادھر ہی رہوں گا۔ صبح ہوتے چلا جاؤں گا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "پرسوں دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔ دوپہر کو نہ آ سکا تو رات کو ضرور پہنچ جاؤں گا۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموش رہا۔

"تجھے ادھر کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟" مزاری نے پوچھا۔ "میں نے نوشیر کو کہہ دیا ہے۔ وہ تیری ٹھیک طرح دیکھ بھال کرے گا۔" سردار مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب مجھے چلنا ہے۔ تجھے شام کو ملوں گا۔"

شہ زور مزاری اپنے ماموں زاد بھائی کے ہم راہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مزاری اپنے ساتھ اسکاچ کی بوتل لایا تھا۔ رحیم داد اور مزاری وہسکی کی چسکی لگاتے رہے۔ مزاری کا ماموں زاد بھائی سرِ شام ہی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ گہری نیند سو رہا تھا۔ دریا کی سمت سے آتے ہوئے جھونکے بھیگے بھیگے تھے۔ آسمان صاف اور اجلا تھا۔ ستارے جگنوؤں کی مانند جگمگا رہے تھے۔ فضا میں رعنائی تھی۔ شگفتگی اور فرحت تھی۔

سردار مزاری اور رحیم داد سرخوشی کے عالم میں تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ رحیم داد کو یکایک جلاوت یاد آ گیا۔ اس کی منت سماجت اور مجبوری یاد آ گئی۔ اس کا ذکر چھیڑنے کی غرض سے رحیم داد نے تمہید باندھی۔ "لنگر تو مر گیا۔"

مزاری اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اس نے تو مرنا ہی تھا۔ جیسا کیا تھا اس کی سزا پائی۔ جتوال کا اوٹھ چوری کیا اور جھوٹ بھی بولا۔" اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے دیکھا' میں نے مکدے کا کتنا ٹھیک فیصلہ کیا۔ ہمارے وڈوں اور وڈیروں نے سوچ سمجھ کر ہی بلوچوں کے لیے کانون بنائے تھے۔ اور ایسے زبردست بنائے تھے کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی عدالتیں اور ان کے کانون آج تک ادھر رائج نہیں ہو سکے۔ کانون تو بلوچ سرداروں کا ہی چلتا ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تو خود سوچ کتنا سستا انصاف ہے۔ نہ وکیل کھڑا کرنے کی ضرورت نہ ضمانت کی اور نہ مہینوں عدالتوں کی پیشیاں بھگتنے کی۔ بلکہ کبھی کبھی تو برسوں عدالت اور کچہری کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض سے ہاں میں ہاں ملائی۔ "لنگر کو تو اس کے جرم کی ٹھیک ٹھیک سزا مل گئی۔ اب جلاوت اور نمیسو کا کیا بنے گا؟"

"دونوں نے جھوٹی گواہی دی تھی' اس کی انھیں سزا ملے گی۔"

"لگتا ہے وہ تو لنگر کی یاری میں گواہی دینے چلے آئے تھے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "اوٹھ

کی چوری کے بارے میں ان کو کچھ پتہ نہیں تھا۔"

"تو نے کیسے اندازہ لگایا؟" مزاری کا لہجہ تیکھا تھا۔ "دونوں میں سے کوئی تیرے پاس سفارش کرانے تو نہیں آیا؟"

رحیم داد قدرے سٹ پٹایا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اور کھل کر بات کرنا چاہی۔ مگر وہ اپنی بات کہہ نہ سکا۔ چاکر خان سرگانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ سردار مزاری اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "چاکر، تجھے تو کل رات یہاں پہنچنا تھا۔"

"سئیں، میں کل رات نہیں پہنچ سکا۔" چاکر خاں سرگانی نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ "میں آج صبح یہاں پہنچا۔"

"پر اب تک تو رہا کہاں؟" شہ زور مزاری نے تیوری پر بل ڈال کر سوال کیا۔

"سئیں، میں صبح سے ہاتو جتوال کو ڈھونڈ رہا تھا۔"

"اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟" مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہاں پہنچتے ہی مجھے پتہ چلا کہ ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا ہے۔" سرگانی نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

"ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا!" سردار مزاری نے حیران و پریشان ہو کر چاکر خان کو دیکھا۔ "کہاں ملا اسے اپنا اوٹھ؟ کیسے ملا، کیوں کر ملا؟"

"سئیں سردار، یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" سرگانی کے چہرے پر لالٹین کی مدھم روشنی میں پریشانی اور گھبراہٹ صاف نظر آرہی تھی۔ "ٹھیک ٹھیک گالہ تو ہاتو ہی بتا سکتا ہے۔ میں یہی جاننے کے لیے صبح سے اب تک اسے تلاش کراتا رہا۔"

اب مزاری بھی پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ سرگانی سے پوچھا۔ "پہلے یہ تو بتا اوٹھ کہاں سے ملا اور کیسے ملا؟ تو نے اس کے بارے میں کیا سنا؟"

"میں نے سنا ہے، اوٹھ اس کے پیئو کے پاس تھا۔ وہ ادھر اکبر والی میں رہتا ہے۔" سرگانی کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہاتو نے لنگر کے خلاف جھوٹا مکدمہ بنایا تھا۔" مزاری نے اپنے شبے کا اظہار کیا۔ "لنگر بے گناہ تھا۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" چاکر خان سرگانی نے دبی زبان سے اس کی تائید کی۔ "تب ہی تو وہ بھگوڑا ہو گیا۔ پرسوں رات چپکے سے بھاگ گیا۔"

"کہاں گیا، بھاگ کر؟" مزاری نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجھے پتہ چلا ہے' وہ فرار ہو کر کیسرانیوں کے علاکے کی طرف گیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔" سردار مزاری اور پریشان ہو گیا۔ "کیسرانی اسے پناہ دے کر اپنا باہوٹ بنا لیں گے۔ کیسرانیوں کے ساتھ ہم مزاریوں کی پرانی دشمنی ہے۔ وہ لغاری تمن کے ساتھ ہیں۔ وہ تو اسے پناہ دے کر بہت خوش ہوں گے۔"

چاکر خان سرگانی نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ سر جھکائے سہما ہوا کھڑا رہا۔ سردار مزاری نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ چھا رہی تھی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مزاری نے چاکر خاں سے دریافت کیا۔ "وہ اکیلا گیا ہے یا اپنی ذال اور بچوں کو بھی لے گیا ہے؟"

"سیں سردار وہ اکیلا ہی گیا ہے۔ اس کے بال بچے ادھر ہی ہیں۔" چاکر خاں نے بتایا۔

"اب تو جا۔" سردار مزاری نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "صبح ہاتو کی ذال کو اس کے بچوں کے ساتھ پیش کر۔ کراووں کو اس کی نگرانی پر لگا دے تاکہ وہ بھاگ کر ہاتو کے پاس نہ پہنچ سکے۔"

"سیں سردار' میں صبح ہاتو کے بال بچوں کو تیرے سامنے پیش کر دوں گا۔" سرگانی نے مزاری کو یقین دلایا۔ "ان کی کڑی نگرانی بھی ابھی جا کر شروع کرائے دیتا ہوں۔"

شہ زور خان مزاری کچھ نہ بولا۔ چاکر خان سرگانی خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

مزاری گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ مزاری کا گلاس اٹھا کر بڑھایا۔ "لے تھوڑی سی لگا لے۔" مزاری نے گلاس سنبھالا اور وہسکی کا گھونٹ بھرا۔

رحیم داد نے کہا۔ "برا نہ مان تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" مزاری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے' ہاتو نے لنگر کے خلاف جھوٹا مکدمہ پیش نہیں کیا تھا۔"

"اگر ایسا تھا تو وہ بھاگا کیوں؟" مزاری نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

"وہ تیری ناراضی کے ڈر سے بھاگ گیا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"اسے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سچا تھا تو اپنا سچ ثابت کر سکتا تھا۔" شہ زور خان مزاری نے اس کی دلیل رد کر دی۔

"یہی تو وہ چاہتا نہ تھا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "سچ ثابت کرنے کے لیے اسے بھی گہرے پانی میں غوطہ لگانا پڑتا۔ لنگر کا انجام دیکھ کر وہ کیسے ایسا کر سکتا تھا۔"

سردار مزاری کو اس کی بات پسند نہ آئی۔ مگر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموشی سے اسکاچ کا گھونٹ بھرا۔ اور گلاس خالی کئے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ "کہاں چلا؟"

"مجھے اب سونا ہے۔" سردار مزاری نے بے زاری سے کہا۔ "بہت تھک گیا ہوں۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اب تجھ سے صبح گل بات ہو گی۔"

وہ آگے بڑھا اور اس طرف چلا گیا جہاں اس کا ماموں زاد بھائی کھلے آسمان کے نیچے اجلے بستر پر سو رہا تھا۔ رحیم داد بھی اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔

☆

صبح کی دھوپ درودیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سردار مزاری اپنے کمرے میں اونچی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے روبرو فرش پر ایک عورت میلے کچیلے لباس میں سر جھکائے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی دو نیم برہنہ بچے تھے۔ ان کے لباس بھی گندے اور بہت بوسیدہ تھے۔

رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ ہاتو ساربان کی بیوی ہے۔ اور بچے بھی اسی کے ہیں۔

ہاتو کی بیوی کا چہرہ اجڑا ہوا تھا۔ وہ عاجزی سے گڑگڑا رہی تھی۔ "سئیں، سردار!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "اونٹھ ہاتو کے پیو کو کوٹلہ رحمان کے رستے میں ملا تھا۔ اس نے اونٹھ کو پہچان لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہ یہی بتاتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں۔ سئیں، میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"تو یہ گالہہ کتنی بار بتائے گی۔ میں نے اسے سن لیا۔" مزاری نے بے رخی سے کہا۔ "اب تو اپنی بکواس بند کر۔"

رحیم داد خاموشی سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ ہاتو کی بیوی نے گھگیا کر سردار مزاری کو رام کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "سئیں معافی دے دے۔ توں سکھی صحت ہووی۔ رب راضی ہووی۔"

مزاری کا ماموں زاد بھائی اسی اثنا میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا۔ اس نے مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور تجھے چلنا نہیں۔ دھوپ تیز ہو گئی تو سفر میں

تکلیف ہوگی۔ گرمی بڑھ جائے گی۔"

"میں تو بالکل تیار بیٹھا ہوں۔" مزاری کے چہرے سے خشونت غائب ہو گئی۔ مسکرا کر بولا۔ "میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

مزاری پلنگ سے نیچے اترا۔ قریب کھڑے ہوئے چاکر خاں سرگانی کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر ہاتو کی بیوی اور بچوں کی جانب اشارہ کیا۔ "انھیں شاہ میر لے جا اور جیل میں بند کر دے۔"

ہاتو کی بیوی تڑپ کر بولی۔ "سئیں سردارا! میری گالھ سن لے۔"

مگر مزاری نے اس کی ایک نہ سنی۔ مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ بے نیازی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کا ماموں زاد بھائی ساتھ ساتھ چلا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر ان کے ساتھ چلا۔

تینوں کمرے سے نکل کر چار دیواری کے پھاٹک پر پہنچے۔ سامنے مزاری کی نئی کار موجود تھی۔ رحیم داد نے سردار مزاری کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔ اس کے بھائی سے بھی گلے ملا۔ ڈرائیور نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شہ زور خاں مزاری اور اس کا ماموں زاد بھائی آگے بڑھے اور کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

کار گاؤں کے کچے راستے پر گرد کے بادل اڑاتی آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رحیم داد واپس ہوا۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی اسے چاکر خاں نظر آیا۔ وہ پھاٹک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ہاتو کی بیوی سر جھکائے چل رہی تھی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوف سے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

رحیم داد خاموشی سے ان کے قریب سے گزرا۔ کمرے میں پہنچا۔ ناشتا کیا۔ مگر اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دن بھر وہ مضمحل رہا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ ہوا گرم ہو گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نہ نکلا۔ دن ڈھلے اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ گرمی کی شدت اب کم ہو گئی تھی۔ رحیم داد بھی اب کسی قدر بشاش نظر آ رہا تھا۔

۳۰

پہر رات گزر چکی تھی۔ احاطے میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد برآمدے میں آنکھیں بند کیے مونڈھے پر خاموش بیٹھا تھا۔ یکایک قدموں کی آہٹ ابھری۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ ڈیرے کے ملازم نوشیر کی نوجوان بیوی نوری' اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب بڑھی اور قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "تمیسو کی گھر والی کدھر ہے؟"

"اس کی طبیعت گڑبڑ ہے۔" نوری نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "وہ آج تیرے پاس نہیں آسکتی۔"

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "اس کی بجائے آج تو آئی ہے؟"

وہ شرما گئی۔ دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھکتے ہوئے رسان سے بولی۔ "نا سئیں' ایسی کوئی گالہہ نہیں۔" اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"فیر تو یہاں کیوں آئی ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "نوشیر کہاں ہے؟"

"سئیں' وہ ادھر ہے۔" اس نے نوکروں کو کوٹھریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اس لیے آئی تھی۔" بات کہتے کہتے وہ جھجکی۔ اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ "تجھ سے ایک گالہہ کہنی ہے' مان لے گا۔"

"کہہ' کیا کہنا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "کوئی خاص گل بات

کہنی ہے؟"

"خاص ہی سمجھ لے۔" وہ دبی زبان سے بولی۔

"صاف صاف بات کر۔" رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہی ہے؟"

"تجھے پتہ ہے سردار کل ملوک زادی اور سہراب کو ادھر پہنچا گیا ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"ملوک زادی اور سہراب ادھر ہیں!" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "شہ زور نے تو اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کہاں ہیں دونوں؟"

"آہستہ بول۔" اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سرگوشی کے انداز میں دھیرے سے بولی۔ "ملوک زادی تو سردار کے ساتھ والے کمرے میں بند ہے۔ سہراب کو ادھر نوکروں کی ایک کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے۔"

"وہ دونوں کو یہاں کیوں لایا ہے؟"

"دو تین روز میں جرگہ بیٹھے گا۔ دونوں پر مکدمہ چلایا جائے گا۔" نوری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ وہ رحیم داد کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئی۔ "لگتا ہے سردار نے تجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"ہاں اس نے مجھے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔"

نوری نے جھک کر اپنا منہ رحیم داد کے قریب کیا۔ رسان سے بولی۔ "ملوک زادی تجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے تجھے اپنے پاس بلایا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رحیم داد سراسیمہ ہو کر بولا۔ "مرجان کے کمرے پر تو پہرہ ہو گا۔ اس کی اور سہراب کی توکڑی نگرانی کی جا رہی ہو گی۔"

"وہ تو کی جا رہی ہے۔ پر کمرے کے دروازے پر کوئی نہیں ہے۔" نوری نے رازدارانہ لہجے میں مطلع کیا۔ "راکھے بندوکیں سنبھالے باہر پھاٹک پر بیٹھے ہیں۔"

"میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟ کمرے کے دروازے پر تو تالا پڑا ہو گا۔"

"تالا تو ضرور پڑا ہے۔ پر اس کی چابی میرے پاس ہے۔" نوری آہستہ سے بولی۔ "میں روٹی پہنچانے ملوک زادی کے کمرے میں گئی تو اس نے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ یہ جاننے کی کوشش کی، یہاں کون کون ٹھیرا ہے۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ تو ادھر ہے تو اس نے مجھے تیرے پاس بھیجا۔ وہ تجھ سے کچھ ضروری گالہہ کہنا چاہتی ہے۔"

"نوشیر کو پتہ ہے کہ تو ادھر میرے پاس آئی ہے؟"

"ہا سئیں' اسے بالکل پتہ ہے۔" نوری نے بلا جھجک کہا۔ "اس سے صلاح کر کے ہی تو تیرے پاس آئی ہوں۔ تو اس کی فکر نہ کر۔"

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ مرجان کے بارے میں اس کے ذہن میں بہت دنوں سے تجسس تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ بات کرنا بھی چاہتا تھا۔ مگر مزاری کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا۔ اور یہ بات اسے گوارہ نہ تھی۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

"سئیں' توں کس سوچ میں پڑ گیا؟" نوری نے دریافت کیا۔

"یہ خطرناک کام ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا کھل کر اظہار کیا۔ "شہ زور کو پتہ چل گیا کہ میں مرجان سے چھپ کر ملا تھا تو وہ بہت برا منائے گا۔ میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔"

"سئیں' تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھے پتہ ہے سردار تجھ سے نراض نہیں ہو گا۔" نوری نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "وہ تیرا گہرا یار ہے۔ تجھے بہت پیار کرتا ہے۔ تیری تعریف کرتا ہے۔ نوشیر سے چلتے چلتے کہہ گیا ہے کہ چوہدری کو ذرا تکلیف نہ ہو۔ اسے ہر طرح آرام پہنچانا' خوش رکھنا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ پر مرجان کا معاملہ اور ہی طرح کا ہے۔ شہ زور کے نراض ہونے کا خطرہ ہے۔" رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔

"سئیں' تو بالکل نہ گھبرا۔" نوری نے رحیم داد کی ہمت بڑھائی۔ "نوشیر کہتا تھا' سردار تجھ سے نراض نہیں ہو سکتا۔ وہ بچپن سے اس کی نوکری کر رہا ہے۔ وہ اس کا پرانا بانہا ہے۔ اسے ٹھیک طرح جانتا ہے' سمجھتا ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پر سئیں' تو سردار سے میرے اور نوشیر کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ تیری گالہہ اور ہے' تو اس کا یار ہے۔ اور مہمان بھی ہے۔ ہم دونوں تو اس کے ممولی بانہے ہیں۔ ہم سے تو وہ سخت نراض ہو گا۔ چمڑی ادھیڑ ڈالے گا۔ کید میں ڈال دے گا۔"

"جب سردار کا اتنا ہی ڈر ہے تو اس چکر میں تو پڑی ہی کیوں؟"

"سئیں' سچی بات یہ ہے' ملوک زادی میرے سامنے روئی' گڑ گڑائی۔ منت کی۔" نوری نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "ہے تو وہ ملوک زادی ہی۔ میں اس کی منت اور زاری پر کیسے ? سن نہ ہوتی۔ کیسے چپ کر کے بیٹھی رہتی۔ نوشیر بھی اسی لیے مان گیا۔" اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر کڑے کی شکل کا ایک زیور دکھایا۔ "سئیں' اس نے مجھے یہ منگی بھی دی ہے۔ سئیں' تو اس سے

ضرور مل لے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"صاف' صاف بتا تو چاہتی کیا ہے؟" رحیم داد نے صورت حال پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی۔

"سئیں' میں ملوک زادی کے کمرے کا پچھلا دروازہ چپکے سے کھول دوں گی۔" نوری نے جھک کر مدھم لہجے میں کہا۔ "ادھر درخت بہت ہیں۔ اندھیرا بھی زیادہ ہی رہتا ہے۔ تو آدھی رات کو آجانا۔ میں تجھے وہیں ملوں گی۔ تو پچھلے دروازے سے اندر چلا جانا۔ میں باہر کھڑی چوکیداری کرتی رہوں گی۔"

رحیم داد چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر تجسس' خوف پر غالب آگیا۔ وہ مرجان سے ملنے اور بات کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "نوری' اب تو تُو جا۔ میں آدھی رات کو ادھر پہنچ جاؤں گا۔ تو میرا انتظار کرنا۔"

نوری نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی برآمدے سے نیچے اتری اور احاطے میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

☆

رات کا کارواں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا گزر نہ تھا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ مرجان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اسے اب تک دیکھ نہ سکا تھا۔ مزاری جب اسے سہراب کے ساتھ گرفتار کر کے شاہ میرلایا تو تمام وقت اس نے اپنا چہرہ دوپٹے کے آنچل سے چھپائے رکھا۔ اب وہ اس مرجان کو دیکھ سکتا تھا' جو بلوچ ملوک زادی تھی' جو کبھی سورج سے بھی پردہ کرتی تھی اور روچ موجر کہلاتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی کرنا چاہتا تھا اور اس راز کا سراغ لگانا بھی چاہتا تھا کہ اس نے کسی بلوچ سردار یا امیر زادے کے بجائے حویلی کے ایک ادنا خدمت گار' سہراب کو کیوں پسند کیا؟ کیوں اس کے ساتھ فرار ہونے کا خطرہ مول لیا؟

رحیم داد مسلسل مرجان کے متعلق غور کرتا رہا۔ بہت دیر بعد وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا۔ کمرے کے اندر گیا۔ گھڑی دیکھی۔ پونے بارہ بجے تھے۔ رات نصف سفر طے کر چکی تھی۔

وہ آئینے کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے گھوم پھر کر مختلف زاویوں سے اپنا عکس دیکھا۔ کنگھی اٹھا کر سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سنوارا۔ مونچھوں کو انگلیوں

سے آہستہ آہستہ مروڑ کر نوکیلا بنایا۔ کپڑے اس کے صاف ستھرے تھے۔ شام ہی کو نہا کر بدلے تھے۔ اس نے سوٹ کیس سے عطر کی شیشی نکالی۔ لباس اور ڈاڑھی پر ہلکا ہلکا عطر لگایا۔

ایک بار پھر آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ زیر لب مسکرایا۔ مڑا' کمرے سے باہر نکلا۔ دروازہ ہولے سے بند کیا۔ برآمدے سے اتر کر سنسان احاطے میں گیا اور ادھر ادھر دیکھتا بھالتا' دبے دبے قدموں چلتا ہوا پچھواڑے کے گھنے درختوں کی جانب بڑھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ رات آدھی ہو چکی تھی۔

وہ درختوں تلے پہنچا۔ اندھیرے میں ایک سایہ اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا۔ سایہ اس کے قریب آگیا۔ رحیم داد نے غور سے دیکھا' وہ نوشیر کی بیوی' نوری ہی تھی۔

وہ مدھم لہجے میں بولی۔ "سیں' توں آگیا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نوری بھی خاموش رہی۔ آگے بڑھی۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ پھاٹک پر بیٹھے ہوئے مسلح پہریداروں میں سے کوئی زور سے کھنکارا۔ خوف سے نوری کے قدم ڈگمگائے۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا بازو تھام لیا۔ وہ سمٹ کر رحیم داد کے بہت قریب آگئی۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں زور زور سے سانس بھر رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر پھاٹک کی سمت دیکھ رہی تھی۔

نوری کا ہاتھ سخت اور کھردرا تھا۔ اس کے ملگجے لباس سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے کسمسا کر سرگوشی کی۔ "سیں' ملوک زادی تیرا انتظار کر رہی ہے۔" اس نے قریب کے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ اس کے پیچھے ہے۔"

رحیم داد چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

نوری نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے علیحدہ کیا۔ آگے بڑھی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ منہ آگے بڑھا کر بہت دھیرے سے بولی۔ "سیں' تو اندر چلا جا۔ مجھے باہر ٹھیر کر چوکیداری کرنی ہے۔" وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

رحیم داد اندر داخل ہوا۔ باہر سے نوری نے دروازہ بند کر دیا۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مرجان دیوار کے قریب بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی پلنگ سے نیچے اتری اور نظریں جھکا کر اس کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد نے مرجان کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھرا بھرا میانہ قد' بیضوی چہرہ' سیاہ اور روشن آنکھیں' سبک خدوخال' کھلتا ہوا چمپئی رنگ۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی جوان اور خوبصورت عورت تھی۔

مگر اب اس کی آنکھوں سے ویرانی جھلکتی تھی۔ چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ بلوچی ساخت کی قمیص 'پشک' پہنے ہوئے تھی۔ پشک کا رنگ گلابی تھا۔ اور اس کے جیک پر ہفت رنگی ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ جیک گریبان سے سینے تک پھیلا تھا جس کی کڑھائی میں چھوٹے چھوٹے شیشے بھی ٹکے تھے۔ کلائیوں پر چاندی کے منقش تمل بندھے تھے۔ کانوں میں سونے کے در تھے۔ سر کے بالوں پر جگمگاتی کید تھی۔ یہ سونے کی نازک زنجیر تھی جو کانوں کے دونوں دروں سے جڑی ہوئی تھی۔ ناک میں جھلملاتا پلوہ جھول رہا تھا اس میں چونی کے برابر فیروزہ آویزاں تھا۔ مرجان بڑی طرح دار بلوچ ملوک زادی تھی۔

مرجان نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اس کی جانب جھجکتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "سن چوہدری' تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟"

"دھیرے بول۔" وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا ہوئی۔ "میں نے شہ زور کو ایک گالہ کہلوانی ہے' توں ہی میری گالہ اسے پہنچا سکتا ہے۔" وہ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ "ادھر اور کوئی ایسا نہیں جو اس سے بات کر سکے۔ میں نے اس رات گیدڑ والا سے شاہ میر جاتے ہوئے جیپ میں اندازہ کر لیا تھا کہ تیرے ساتھ اس کی کتنی گہری یاری ہے۔"

"تو نے شاہ میر میں کسی اور کے ذریعے ایسی کوشش کیوں نہیں کی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"میں نے کوشش کی تھی۔ شہ زور کی رن کو بلوایا تھا۔ اس کی ماں اور بھین کو بھی بلوایا تھا۔" مرجان نے بتایا۔ "پر کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔ صاف انکار کر دیا۔ وہ سب شہ زور سے بہت ڈرتی ہیں۔"

"مجھے بتا' تجھے شہ زور سے کیا کہنا ہے؟" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"تجھے پتہ نہیں' سارا جھگڑا جائیداد کا ہے۔" مرجان نے کھل کر بات کی۔ "شہ زور جائیداد کی خاطر میری جان لینا چاہتا ہے۔ اس نے دو بار میرا خون کرنے کی کوشش کی۔ پر میں کسی نہ کسی طرح بچ گئی۔"

"میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آیا۔" رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

"میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔ کچھ نہیں چھپاؤں گی۔" مرجان نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "تجھے یہ تو پتہ ہو گا' میں شہ زور کی سوتیلی ماں ہوں۔ میرا پیو رند بلوچ تھا۔ وہ صادق آباد کا معمولی زمین دار تھا۔ میں پندراں سال کی تھی جب اس نے شہ زور کے پیو' سردار نجیب خان مزاری کے

ساتھ میرا پرنا کر دیا۔ لیکن پرنا کرنے سے پہلے اس نے میرے نام سردار نجیب خاں کی جگیر کا ایک حصہ لکھوا لیا تھا۔ پنج سال بعد سردار نجیب سے میرا ایک پتر پیدا ہوا۔ جب وہ تین سال کا تھا تو اچانک بیمار پڑا اور مر گیا۔"

"کیا بیماری ہوئی تھی اسے؟"

"بیماری شیماری تو ایسی خاص نہیں تھی۔" مرجان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس کے مرن کے بعد مجھے پتہ چلا کہ شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی نے میرے پتر کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔" مرجان کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "شہ زور نے دو سال بعد اپنے بھائی کو بھی مار ڈالا۔ سردار نجیب کا پہلے ہی مرن ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے پوری جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے کیا۔"

"تیرے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی؟"

"نہیں!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب شہ زور جائیداد کا وہ حصہ جو میرے نام ہے اپنے پاس رکھنے کے لیے مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔"

"تیرا پیو اب کہاں ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"دو سال ہوئے اس کا بھی مرن ہو گیا۔"

"بھائی بھین نہیں ہیں؟"

"بھین کوئی نہیں۔" مرجان نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "دو بھائی تھے۔ چھوٹا تین سال ہوئے چلتی ٹرین سے گر کر مر گیا۔ وڈا ہے۔ وہ صادک آباد میں زمینداری کرتا ہے۔"

"تو اپنے بھرا کے پاس کیوں نہیں گئی؟" رحیم داد نے کہا۔ "لغاریوں کے پاس چوئی کیوں پہنچی؟"

"میں صادک آباد اسی کے پاس گئی تھی۔" مرجان کا چہرہ اور افسردہ ہو گیا۔ "پر اس نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اپنے گھر میں گھسنے بھی نہ دیا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ نراض ہے۔"

"وہ تجھ سے اتنا نراض کیوں ہے؟"

"وہ مجھ سے تب ہی سے نراض ہے جب میرا سردار نجیب خان کے ساتھ پرنا ہوا تھا۔" مرجان نے جواب دیا۔ "وہ اس رشتے کے سخت خلاف تھا۔ اس نے پیو سے اتنا جھگڑا کیا کہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے پرنے میں بھی شریک نہیں ہوا۔ اب مجھ سے اور بھی زیادہ نراض ہے۔ اور اس لیے نراض ہے کہ میں سہراب کے ساتھ کیوں نکلی۔"

"نراض ہونے کی تو گل ہی ہے۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "تو نے یہ نہیں سوچا

کہ سہراب کی ہے۔ وہ تیری ہی حویلی کا ماشیا تھا۔ تو نے یہ بہت برا کیا۔ یہ تو بہت ہی بد نامی کی گل ہے۔ تو نے سب کے منہ پر کالک لگا دی۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں سہراب کے ساتھ نہ نکل بھاگتی تو شہ زور مجھے قتل کر دیتا۔" مرجان نے صفائی پیش کی۔ "شہ زور میرے خون کا پیاسا ہے۔ وہ اسی روز سے خار رکھتا ہے جب میں حویلی میں سردار نجیب کی رن بن کر داخل ہوئی۔"

"جب تجھے پتہ ہے کہ شہ زور تیرے خون کا پیاسا ہے تو اب تو اس سے کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"وہ جائیداد ہی کے لیے تو میرے خون کا پیاسا ہے ناں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "مجھے ایسی جائیداد نہیں چاہیے۔ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں خوشی سے ساری جائیداد اس کے نام لکھ کر دے دوں گی۔ مجھے اس سے اب کچھ نہیں لینا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تو میری یہ بات شہ زور تک پہنچا دے۔" اس نے رحیم داد کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری مجھے بچا لے۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے جائیداد نہیں زندگی چاہیے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "سن چوہدری، مجھے زندگی دلا دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

مرجان نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کا سر آہستہ آہستہ تھپک کر تسلی دینے لگا۔ "تو اطمینان رکھ، میں شہ زور سے ضرور بات کروں گا۔ اسے سمجھاؤں گا۔ اسے ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ تو آنسو پونچھ۔ آرام سے سو۔ مجھے بھروسہ ہے وہ میری بات ضرور مان لے گا۔"

مرجان نے کچھ نہ کہا۔ اس کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔

دروازہ چرچراتا ہوا ذرا سا کھلا۔ رحیم داد اور مرجان نے سراسیمہ ہو کر اس طرف دیکھا۔ دروازے کی آڑ سے نوری کا چہرہ نظر آیا۔ رحیم داد نے مرجان کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ فکر نہ کر مرجان، جیسا تو چاہتی ہی ویسا ہی ہو گا۔" وہ آگے بڑھا اور باہر چلا گیا۔

نوری نے دروازہ بند کیا اور اس میں تالا ڈالنے لگی۔ رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ درختوں کے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چلا۔ برآمدے میں پہنچا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔

☆

سردار شہ زور خان مزاری واپس آیا تو سردار مراد خاں شاہانی بھی اس کے ہم راہ تھا۔ رحیم داد

نے اسے حیرت سے دیکھا۔ خوش بھی ہوا۔ بڑھ کر نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ ”شاہانی‘ تو کیسے ادھر آگیا؟“

شاہانی نے علیحدہ ہوتے ہوئے بتایا۔ ”شاہ جی تو ابھی کراچی سے لوٹا نہیں۔ البتہ اس کا منیجر مہربان علی‘ لائل پور سے واپس آگیا ہے۔ میں ایک روز شاہ جی کی کوٹھی پر گیا اور مہربان علی مجھے مل گیا۔ میں نے تیرے کلیم کے کاغذات اس سے لے لیے۔ مجھے پتہ تھا تو ابھی ادھر ہی ہے۔ سوچا تجھ سے مل لوں گا۔ کاغذات تیرے حوالے کر دوں گا۔“

”یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔“ رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی پتہ چلا کہ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کا کیا بنا؟“

”مہربان کہتا تھا‘ الاٹمنٹ میں کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ زمین پہلے ہی دو کلیم ہولڈروں کو الاٹ ہو چکی ہے۔ مکدے بازی چل رہی ہے۔ معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔“

”یہ تو نے چنگی خبر نہیں سنائی۔“ رحیم داد بجھ کر رہ گیا۔

”فکر نہ کر چوہدری۔“ شہ زور مزاری نے اسے تسلی دی۔ ”میں نے ڈپٹی کمشنر اور محکمہ بحالیات کے افسروں سے تیرے بارے میں بات کر رکھی ہے۔ تحصیل راجن پور میں تیرے لیے متروکہ اراضی بھی دیکھ لی ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہے۔“

”کیسی زمین ہے؟“ رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تو نہری زمین کو کہتا تھا۔ یہ نہری ہی زمین ہے۔“ مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ ”بہت زیادہ زمین ہے۔ تیرے لیے اڑھائی سو ایکڑ تو آسانی سے الاٹ ہو جائے گی۔“

شام کا جھٹ پٹا تھا۔ اندھیرا فضا میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔ تینوں برآمدے کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ نوکروں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے لا کر رکھ دیے۔ وہ اطمینان سے ان پر بیٹھ گئے۔

”چوہدری یہ تو بہت ٹھیک ہوا۔“ شاہانی نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”تجھے ادھر زمین الاٹ ہو گئی تو شہ زور کے ساتھ اچھا وکت گزرے گا۔ یہ یاروں کا یار ہے۔ اور کام آنے والا بندہ ہے۔“

مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”شاہانی آج صبح شاہ میر پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے تیرے کلیم کے کاغذات لے کر درخواست بھی تیار کروالی۔ چاکر خان کے پاس ہے۔ دستخط کر دینا۔ دو چار روز میں وہ درخواست لگا دے گا۔ الاٹمنٹ کی پرواہ نہ کر۔ کام فٹافٹ بن جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو ادھر میرے پاس آجا۔“

"الاٹمنٹ مل جائے تو ادھر بھی آتا رہوں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "پر میری اصلی زمین داری تو کوٹلہ ہر کشن ہی میں ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کون کہتا ہے تو اسے چھوڑ دے۔" شاہانی نے اتفاق رائے کیا۔ "پر تیرا ادھر رہنا کون سا ضروری ہے۔ تجھے خود تو زمیں داری چلانی نہیں۔ تیرا کاردار نادر خاں کام کا بندہ لگتا ہے۔ وہ زمیں داری کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ زمیں داری تو کاردار اور کم دار ہی چلاتے ہیں۔"

"سارے ہی وڈے زمین داروں کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔ ذرا ہشیار رہنا پڑتا ہے۔ کاردار، کم دار اور مزارعوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔" مزاری نے مراد خاں شاہانی کی تائید کی۔

چاکر خان سرگانی بھی پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں الاٹمنٹ کی درخواست تھی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ کمرے کے اندر گیا۔ لیمپ کی روشنی میں اس نے درخواست پر ایک نظر ڈالی اور دستخط کر دیے۔

سرگانی چلا گیا۔

رحیم داد احاطے میں واپس پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ گھروں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ باورچی خانہ نوکروں کی کوٹھریوں کے قریب ہی تھا۔ ادھر گوشت بھونا جا رہا تھا۔ اس کی تیز خوش بو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مزاری اور شاہانی کے سامنے اسکاچ کی بوتل رکھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے پیگ بنا کر رحیم داد کو دیا۔ اپنا گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کے گلاس سے ٹکرایا اور وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بولا۔ "مزاری نے تیرا دل بہلانے کا بھی کوئی انتظام کیا؟"

"کیا تو ہے۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا۔ "لگتا ہے، تجھے ادھر پسند کی ذال نہیں ملی۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "چوہدری، پسند ناپسند کے چکر میں نہ پڑ۔ ہر ذال چنگی ہوتی ہے۔ بس نئی ہونی چاہیے اور ہر رات ملنی چاہیے۔"

"شاہانی تو ذال کے معاملے میں بالکل سندھی وڈیرا ہے۔" مزاری نے قہقہہ بلند کیا۔ "میری ایک بھین سانگھڑ میں ویاھی ہے۔ اس کا خاوند سندھی بلوچ ہے۔ جانے کب سے اس کا خاندان ادھر آباد ہے۔ وہ سندھی کی ایک مثال سناتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے کہ بھوک میں تو کواڑ بھی پاپڑ لگتے ہیں۔ کہتا تھا رن کے معاملے میں تو سندھی وڈیروں کا حال یہ ہے کہ کسی جھاڑی پر بوچھن پڑا لہراتا ہو تو وڈیرے دونوں بازو پھیلا کر اسے بھی بھینچ لیتے ہیں۔"

سردار شہ زور خاں مزاری نے بات ختم کی تو زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ تینوں نشے کی جھونک میں دیر

تک ہنستے رہے۔

نوکر نے پلیٹ میں گرم گرم تلا ہوا مرغ لا کر میز پر رکھ دیا۔ تینوں اسکاچ وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ نوچ نوچ کر مرغ کا گوشت کھاتے رہے۔ رات کی تاریکی بڑھتی گئی۔ سناٹا سوا ہو گیا۔ شہ زور مزاری کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ پہر رات گزرتے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ شاہانی اور رحیم داد وہسکی سے شغل کرتے رہے۔

☆

سردار مزاری کے اچانک اٹھ کر چلے جانے پر رحیم داد پریشان ہو گیا۔ وہ مرجان کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر شہ زور اکیلا نہ تھا۔ مراد خاں شاہانی بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایسی بات چھیڑنا مناسب نہ معلوم ہوا۔

مگر مزاری جا چکا تھا۔ صبح جرگہ تھا۔ اسکے شروع ہونے سے پہلے ہی رحیم داد کو مرجان کا عندیہ نہ صرف مزاری کو پہنچانا تھا بلکہ اس پر اسے رضا مند کرنے کی بھی اپنے طور پوری پوری کوشش کرنا تھی۔ رحیم داد آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا اور خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ مرجان کے معاملے پر کس طرح سردار مزاری سے بات کرے۔

مراد خاں شاہانی نے اسے خاموش پایا تو اکتا کر بولا۔ ”سیں چوہدری' تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

رحیم داد لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے اس کا چہرہ تکتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے شہ زور سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔“

”وہ اتنی دیر تیرے ساتھ بیٹھا رہا' تو نے تب گالہہ کر لی ہوتی۔“ شاہانی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”لگتا ہے تو میرے سامنے بات کرنی نہیں چاہتا تھا۔“

”ہاں!“ رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ ”بات ہی کچھ ایسی ہے۔“

”مجھے بتانے کی نہیں؟“ شاہانی نے پوچھا۔

”اب تجھے ہی بتانی ہو گی۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”شہ زور مزاری تو اب اپنے کمرے میں ہو گا۔ اس کے ساتھ جلاوت کی گھر والی یا کوئی اور زنانی ہو گی۔“

”ہاں' اب اسے ملنا مشکل ہو گا۔“ شاہانی نے قدرے توقف کیا۔ ”کوئی خاص گالہہ نہ ہو تو مجھے بتا دے۔ ویسے تیری مرضی۔“

رحیم داد اپنا مونڈھا کھسکا کر مراد خاں شاہانی سے اور قریب ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد کے چہرے سے

سراسیمگی عیاں تھی۔

مراد خاں شاہانی نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو آہستہ سے پوچھا۔ "سئیں چوہدری' تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"گل ہی ایسی ہے۔" رحیم داد نے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے کہا۔ "تجھے پتہ ہے' مرجان ادھر ہی ہے۔"

"ہوگی۔ تجھے اس سے کیا لینا۔" مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

"پہلے میری گل تو سن لے۔" رحیم داد نے سرگوشی کی۔ "اس نے ایک رات مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔"

"مرجان نے تجھے اپنے پاس بلایا تھا!" شاہانی نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو اس کے پاس گیا تھا؟"

"ہاں میں اس کے پاس گیا تھا۔"

"تو نے اسے دیکھا ہے؟" شاہانی بدستور حیرت زدہ تھا۔

"ویسے دیکھا تو میں نے اسے ایک بار پہلے بھی تھا۔ تب وہ چدر سے منہ چھپائے ہوئی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ شہ زور مزاری بھی ساتھ تھا۔ میں دیکھ کر بھی اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔" رحیم داد نے شاہانی کو بتایا۔ "پر اس رات جب اس نے اپنے کمرے میں بلوایا تب میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا۔"

"سنا ہے بہت سوہنڑی رن ہے۔ تو بتا کیسی ہے؟" شاہانی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"ہے تو جی وہ بہت سوہنی اور جوان بھی ہے۔ بالکل نمیار لگتی ہے۔" رحیم داد نے رک رک کر بیان کیا۔ "پر اب تو سمجھو اجڑ کر رہ گئی ہے۔ موت کے ڈر نے اسے ایک دم پیلا کر دیا ہے۔" اس نے شاہانی کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "تجھے پتہ ہے' اصل جھگڑا کیا ہے؟" پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی دے دیا۔ "سارا جھگڑا تو جائیداد کا ہے۔"

"اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے۔ یہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔" شاہانی نے بتایا۔ "یہ جھگڑا تو شہ زور کے پیو' سردار نجیب خاں کی زندگی ہی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے مرن کے بعد بہت بڑھ گیا۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "پر جائیداد کا جھگڑا تو بہت پیچھے رہ گیا۔ اب تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ وہ سہراب کی ساتھ بھاگ کر لغاریوں کے پاس چلی گئی۔ تجھے پتہ ہے۔ لغاریوں سے مزاریوں کی کتنی زبردست دشمنی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "مرجان نے یہ بہت برا کیا۔ اس

نے شہ زور مزاری اور اس کے خاندان کی پیشانی پر تمک لگا دیا۔ اسے اپنی ہی حویلی کے کسی سراب کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔" شاہانی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "بھاگنے کے لیے سراب کے سوا اسے اور کوئی نہیں ملا۔"

"مرجان کہتی تھی، شہ زور جائیداد حاصل کرنے کے لیے اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔" رحیم داد نے مرجان کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "شاید تجھے پتہ نہیں، شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی نے مرجان کو دوبار زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی۔ جائیداد کے لیے تو اس نے اپنے بھائی کو بھی کتل کرا دیا۔"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔" شاہانی کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے اس کی لاش جیپ میں پائی گئی تھی۔ وہ اکیلا اپنی جیپ چلا رہا تھا۔ لغاریوں نے چھپ کر اس پر حملہ کیا اور رات کے اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ شہ زور نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تو بالکل نئی گالہ سنا رہا ہے۔"

"پتہ نہیں کون سچا ہے۔ مرجان تو مجھے یہی بتاتی تھی کہ اسے شہ زور نے کتل کرایا تھا۔"

"چوہدری، سچ پوچھ تو یہ جائیداد ہوتی ہی ایسی ظالم ہے۔ اندھا بنا دیتی ہے اندھا۔" شاہانی نے اس دفعہ اپنے شبے کا اظہار کیا۔ "اب یہ بتا۔ مرجان نے تجھے کس لیے رات کو اپنے پاس بلایا تھا۔" اس نے نشے کی جھونک میں ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یاری لگانے کے لیے تو تجھے بلایا نہیں ہو گا۔"

"ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے کھل کر بتایا۔ "وہ چاہتی ہے، شہ زور اسے معافی دے دے۔ اسے چھوڑ دے۔ جرگے میں اس کا معاملہ پیش نہ کرے تو وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد شہ زور کے نام لکھ دے گی۔ اسے زندگی چاہیے ہے جائیداد نہیں۔ شہ زور سے یہی بات کہنے کے لیے اس نے مجھے بلایا تھا۔"

"یہ بات تو وہ شہ زور سے خود بھی کہہ سکتی ہے۔" شاہانی نے کہا۔ "تیرے ذریعے کیوں کہلوانا چاہتی ہے؟"

"اس نے شہ زور سے گل بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے، اسے کامیابی نہیں ہوئی۔" رحیم داد نے توجیہہ پیش کی۔ "میں نے تو اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ سمجھتی ہو کہ میرے سمجھانے بجھانے پر شہ زور راضی ہو جائے اور جائیداد لے کر اسے چھوڑ دے معافی دے دے۔"

مراد خاں شاہانی کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا۔ وہ سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر رحیم داد

کی جانب دیکھا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سئیں چوہدری' ویسے تو شہ زور مزاری کو مرجان کی تجویز مان لینی چاہیے۔ پر اب ایسا ہو نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" رحیم داد نے مراد خاں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "اسے جائیداد چاہیے' وہ مل جائے گی۔ مرجان کا خون وہ کیوں اپنی گردن پر لینا چاہتا ہے۔ جب آسانی سے کام بن جائے تو خون خرابہ کرنے سے کیا فائدہ۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "مجھے کنون کا ٹھیک سے پتہ نہیں۔ پر ایسے ہی ایک مکدمے میں مجھے گواہ بننا پڑا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک رانڈ تھی۔ اس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ مرنے کے بعد سوتیلے پتروں نے زمین پر کبضہ کر لیا۔ لیکن مرنے والی کے بھائی بھینوں نے ان کے خلاف مکدمہ کر دیا۔ اور جیت بھی گئے۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" شاہانی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مرجان کے مرنے کے بعد اس کا بھائی بھی جائیداد حاصل کرنے کے لیے شہ زور کے خلاف مکدمہ کر سکتا ہے۔ اسے جیت بھی جانا چاہیے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے اختلاف رائے نہ کیا۔ "شہ زور مزاری کو بھی اس کا پتہ ہو گا۔ تب ہی وہ جرگے کے سامنے مکدمہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگر مرجان پر سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا۔ اور جرگے نے اسے کالی اور سہراب کو کالا کرار دے دیا تو جائیداد پر مرجان کا حک ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری جائیداد خود بخود مزاری کو مل جائے گی۔"

"تب تو شہ زور نہیں مانے گا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے شاہانی کی جانب دیکھا۔ "کیا جرگے کے فیصلے کے خلاف عدالت میں معاملہ نہیں پیش کیا جا سکتا؟"

"پیش تو کیا جا سکتا ہے اور اکثر ایسے مکدمے عدالت میں پیش بھی کیے گئے۔" شاہانی نے بتایا۔ "پر بلوچ جرگے کے فیصلے کے خلاف عام طور پر سرکاری عدالتوں میں نہیں جاتے۔ اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے مرجان کا بھائی ایسا کرے۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو یہاں رہتا بھی نہیں۔ ممکن ہے وہ جرگے کا فیصلہ نہ مانے۔"

"ایسا وہ کر تو سکتا ہے۔" شاہانی نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

"میں تو کہتا ہوں' شہ زور کے لیے یہ ٹھیک رہے گا کہ وہ مرجان کی تجویز مان لے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر مراد خاں شاہانی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "خاما خاہ وہ کیوں جھگڑے میں

پھنسا چاہتا ہے۔ اسے تو جائیداد ہی چاہیے ناں وہ مل جائے گی۔ مرجان کی جان لے کر اسے کیا ملے گا؟"

"مان لے وہ مرجان کی شرط منظور کر لے۔" شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "جائیداد اپنے نام لکھوا کر اسے چھوڑ دے۔ پر شہ زور یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ وہ سہراب کے ساتھ رہے۔" شاہانی نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سہراب کو تو وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کمی ہے۔ ملوک زادی کو بھگا کر لے گیا۔ اس کا یہ جرم کیسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ اسے اتنے سنگین جرم کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔ تو خود ہی بتا سہراب کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں؟"

"ضرور ملنی چاہیے۔" رحیم داد کے اندر چھپا ہوا زمین دار فوراً جاگ اٹھا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سہراب کمی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں لینا۔ جتنا وڈا اس نے جرم کیا اتنی ہی سخت اسے سزا ملنی چاہیے۔" رحیم داد نے تامل کیا۔ "میرا خیال ہے مرجان بھی سہراب کو بچانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ تو اپنی جان بچانا چاہتی ہے۔ اسے اب یہ پتہ چل گیا ہے کہ اس نے سہراب ایسے کمی کے ساتھ فرار ہو کر غلطی کی۔"

"مرجان نے ایک اور زبردست غلطی یہ کی کہ لغاریوں کی پناہ میں چلی گئی۔ ان کی یا ہوٹ بن گئی۔" شاہانی نے نشے سے لہرا کر کہا۔ "اس نے بہت برا کیا۔ بہت برا کیا۔ اپنے بھائی کے پاس چلی جاتی تو بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟" اس نے رحیم داد کی طرف خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ "سنا ہے اور تجھ سے ہی سنا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سنا۔" رحیم داد نے اس کی اطلاع کی تصدیق کی۔ "مرجان کا اب ایک ہی بھائی ہے۔ صادک آباد میں زمین داری کرتا ہے۔ مرجان نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کے پاس گئی تھی پر وہ اس سے اتنا زیادہ ناراض ہے کہ نہ بات کی اور نہ ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیا۔ وہ روتی پیٹتی واپس آگئی۔ اس کا کوئی ایسا شریکا بھی نہیں جس کے پاس جا کر وہ ٹھیر جاتی۔ لغاریوں کے پاس پناہ لینے نہ جاتی تو کس کے پاس جاتی۔"

رحیم داد نے مرجان کی اس طرح وکالت کی کہ مراد خاں شاہانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آہستہ سے بولا۔

"مجھے ان باتوں کا بالکل پتہ نہ تھا۔"

"پر تجھے یہ تو پتہ ہے کہ مرجان ایک بار تو لغاریوں کے پاس سے چلی آئی تھی۔" رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "جب اسے کہیں بھی پناہ نہ ملی، کوئی اسے اپنے ساتھ

رکھنے پر تیار نہ ہوا تو مجبور ہو کر دوبارہ لغاریوں کے پاس جا رہی تھی۔ کرتی بھی کیا۔ اسے پتہ تھا کہ شہ زور نے اپنے بندے اسے اور سہراب کو پکڑنے یا کتل کرنے کے لیے لگا رکھے ہیں۔ وہ تو لغاریوں کے پاس پہنچ بھی جاتی پر رستے میں شہ زور مزاری نے اسے اور سہراب کو پکڑ لیا۔ میں تو شہ زور کے ساتھ ہی تھا۔ گیدڑ والا کے نزدیک اس نے دونوں کو پکڑا تھا۔"

"یہ تو مجھے پتہ ہے۔ شہ زور نے مجھے شاہ میر میں بتا دیا تھا۔" شاہانی نے بات مختصر کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتا آگے کیا کرنا ہے؟"

"میں نے تجھے بتایا نہیں کہ تو شہ زور مزاری کو سمجھا بجھا کر راضی کرنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے کہا۔ "تو اس کا پرانا یار ہے۔ تیری گل وہ مان لے گا۔ مرجان زندہ بچ گئی تو تجھے دعا ہی دے گی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ منت اور زاری کرتی تھی۔"

"مرجان کو نہیں مرنا چاہیے۔ تو ٹھیک کہہ رہا ہے' ابھی تو وہ جوان ہے۔" شاہانی نے مرجان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ "میں مرجان کے بارے میں مزاری سے بات تو کر سکتا ہوں۔ جب وہ لغاریوں کے پاس چوٹی میں تھی تو شہ زور نے مرجان کے بارے میں بات کی تھی۔ اور اپنا پرانا یار سمجھ کر کی تھی۔ ایسی بات ہر ایک سے تو نہیں کی جا سکتی۔"

"تب تو مزاری سے تو مرجان کے بارے میں نڈر ہو کر گل بات کر سکتا ہے۔ اسے سمجھا بجھا کر راضی بھی کر سکتا ہے۔"

"مزاری نے جب مرجان کے بارے میں بات کی تھی تب حالات اور تھے۔ تب وہ مجبور تھا۔ سخت پریشان تھا۔" شاہانی رک رک کر بول رہا تھا۔ "اب وہ مزاری کی کید میں ہے۔ ایسے میں مرجان کے بارے میں اس سے بات کروں گا تو وہ پوری طرح جرح کرے گا۔"

"شاہانی تو بھی عجب بندہ ہے۔" رحیم داد تیکھے لہجے میں بولا۔ "کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ صاف صاف گل بات کر۔"

"صاف ہی صاف گل بات کر رہا ہوں۔ نراض کیوں ہوتا ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کو منانے کی کوشش کی۔

"تیری باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مرجان کو بچانے کی کوئی صورت نہیں رہی۔" رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

شاہانی وہسکی کا بڑا سا گھونٹ بھر کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کی بعد اس نے گردن اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "یہ بتا' شہ زور نے اگر مجھ سے یہ پوچھا کہ مرجان کو اس

نے چھوڑ دیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ لغاریوں کی باہوٹ نہ بن جائے۔ بتا میں اسے کیا جواب دوں گا۔ تو نے خود ہی بتایا تھا کہ لغاریوں کے علاوہ کوئی اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں۔ یہ تو سوچ وہ جائے گی تو کہاں جائے گی؟ کس کے پاس جائے گی؟"

"یہ سوال مزاری کر تو سکتا ہے۔" رحیم داد نے شاہانی سے اتفاق رائے کیا۔

"ایک اور تجویز سمجھ آتی ہے۔" شاہانی نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اگر مرجان کسی سردار یا اونچی ذات برادری والے زمیں دار سے نکاح کرلے تو اس کے لیے کہیں جانے اور پناہ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔" شاہانی نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ "تب تو مزاری کو بھی رضا مند کیا جا سکتا ہے۔ پر سوال یہ ہے کہ ایسا بندہ کہاں ملے گا جو مرجان سے پرنا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"میں تو کہتا ہوں تو مرجان کو اپنی گھر والی بنالے۔ وہ جوان ہے۔ سوہنی ہے اور ملوک زادی بھی ہے۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "تو بھی بلوچ سردار ہے۔ شہ زور مزاری بھی مان جائے گا۔"

"تو کیسی گالہہ کر رہا ہے۔" شاہانی جھنجلا کر بولا۔ "تو اسے اپنی گھر والی کیوں نہیں بنا لیتا۔ تو اکیلا ہے۔ تجھے اپنے لیے ایک رن کی ضرورت بھی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو میں مرجان سے ویاہ کرلوں گا۔ سچ پوچھ تو مرجان مجھے پسند بھی ہے۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"سیں چوہدری' تو مرجان کو اپنی رن بنالے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مراد خاں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تو سوچ وہ سہراب کے ساتھ یاری لگا چکی ہے۔ مدت تک اس کے ساتھ رہی ہے۔ سب کو اس کے بارے میں پتہ ہے۔ وہ بہت بدنام ہو چکی ہے۔ ایسی بدچلن اور بے معیار رذال کو تو کیسے اپنی گھر والی بنا سکتا ہے؟"

"میں تیری طرح بلوچ سردار نہیں ہوں۔" رحیم داد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ شاہانی کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "مجھے بدنامی شدنامی کی فکر نہیں۔ جمیلہ بھی تو کئی کمیوں اور مزارعوں کے پاس فسادات کے زمانے میں رہ چکی تھی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ میں تو اسے ہر طرح اپنی گھر والی بنانے پر تیار تھا۔ پر وہ راضی ہی نہیں ہوئی۔ واپس اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئی۔"

"تو مرجان ہی سے کیوں پرنا کرنا چاہتا ہے؟" شاہانی نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "تجھے تو بہت عزت دار خاندان کی کڑی مل سکتی ہے۔"

"میں نے مرجان سے وعدہ کر لیا ہے۔" رحیم داد نے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ اسے بچانے کے لیے پوری پوری کوشش کروں گا۔" اس نے پر اعتماد نظروں سے مراد خاں شاہانی کو دیکھا۔ "میں تو تیار ہوں۔ پر شہ زور مزاری بھی مان جائے گا کہ میں مرجان کو اپنی گھروالی بنا لوں؟ تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ میں بلوچ سردار نہیں ہوں۔"

"تو بلوچ سردار نہیں ہے' اس سے کیا فرک پڑتا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے کہا۔ "لغاریوں نے اپنی ایک دھی مخدوموں کو اور دوسری ممدوٹوں کو دیا ہی ہے۔ وہ کون سے بلوچ سردار ہیں۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "تو بھی وڈا زمین دار ہے۔ شہ زور مزاری کو تجھے کبول کر لینے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔"

"وہ تیار ہو سکتا ہے تو میں نکاح پڑھا کر مرجان کو اپنے ساتھ لے جانے پر بالکل تیار ہوں۔ میں مرجان کو موت کے منہ سے نکالنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں جوش و خروش سے زیادہ عاجزی تھی۔ "شاہانی اسے بچانے میں میری مدد کر۔ تو مزاری سے بات کر۔ تو کہے گا تو وہ ضرور مان جائے گا۔"

"سیں چوہدری' تو بہت نیک بندہ ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کے جذبے کو سراہا اور یقین دلایا۔ "میں مزاری سے ضرور بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ اس شرط پر مان جائے کہ مرجان کے ساتھ تیرا پرنا ہو جائے اور مرجان اپنے حصے کی بگیر اور جائیداد سے دست بردار ہو جائے۔"

"تجھے کل سویرے ناشتے پر جرگہ شروع ہونے سے پہلے پہلے شہ زور سے اس معاملے میں گل بات کرنی ہو گی۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "میں ناشتا اپنے کمرے میں ہی کر لوں گا۔ تو اکیلے میں شہ زور سے کھل کر بات کر سکے گا۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔"

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو ایک بار پھر یقین دلایا۔ "اطمینان رکھ میں شہ زور مزاری سے ضرور گل بات کروں گا۔ جیسا تو کہتا ہے ویسے ہی کروں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور جھومتا جھامتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کا کمرہ بالکل نکڑ پر تھا۔

☆

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ صرف نوکروں کی ایک کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔ اس کی دھندلی روشنی تاریکی میں روشن دھبے کی مانند جگمگا رہی تھی۔

رحیم داد نے قمیص اور شلوار اتار کر دھوتی باندھی اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے بوجھل تھیں۔ لیٹتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کا غلبہ بڑھنے لگا۔

اس نے ذرا جھپکی ہی لی تھی کہ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا' نوری پلنگ کے قریب کھڑی ہے۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا اور نوری کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ سر کے بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ اس کا سانولا چہرہ کمرے میں روشن لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں تازہ اور بشاش نظر آ رہا تھا۔

نوری نے بستر پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ "تو نے ملوک زادی کے بارے میں سردار سے بات کی؟"

"شام ہی کو بات کی تھی۔ جیسے مرجان نے کہا ویسے ہی کی تھی۔" رحیم داد صاف جھوٹ بول گیا۔

"سیں' یہ تو نے بہت ٹھیک کیا۔ توں سدا جیوی۔ سکھی صحت ہووی۔" وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ اس کے انداز میں خوشامد تھی۔ "ملوک زادی بہت دکھ میں ہے۔ بار بار روتی ہے۔" اس کا لہجہ اور دھیما ہو گیا۔ "اس نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔"

"نوشیر کو پتہ ہے تو ادھر ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بالکل پتہ ہے؟" نوری نے مسکرا کر بتایا۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ "اسے یہ بھی پتہ ہے ملوک زادی نے آج اپنے کئی اور گہنے بھی مجھے دے دیے ہیں۔" اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "ان میں سونے کی باڑی بھی ہے۔ بہت سوہنڑی ہے۔ میں اسے یہاں پہنوں گی۔" اس نے اپنے کان کے درمیانی حصے کو انگلیوں سے پکڑ کر دکھایا۔ "یہ بتا' سردار تیری گالہہ سن کر کیا بولا۔"

"تو اس وقت مرجان کے پاس جا سکتی ہے؟"

"اب تو مشکل ہے۔ سردار بھی ادھر موجود ہے۔" اس کے چہرے سے سراسیمگی جھلکنے لگی۔ "تو نے ملوک زادی سے کچھ کہلوانا ہے؟"

"بہت ضروری گل بات کہلوانی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

"نوشیر سے گالہہ کرنی ہو گی۔" وہ رسان سے بولی۔ "یہ بتا' سیں' تو نے ملوک زادی سے کیا کہلوانا ہے؟"

"اسے جا کر بتا دے کہ جائیداد کے ساتھ اسے سہراب کو بھی چھوڑنا ہو گا اور مجھ سے ویاہ کرنا ہو گا۔"

"تو اسے اپنی رن بنا لے گا؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد سے دریافت کیا۔ "سوچ لے۔"

"سوچ لیا' بالکل سوچ لیا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "میں مرجان کو بچانے کے لیے سب

کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تو جا کر اسے بتا دے۔ اگر اس نے یہ شرط مان لی تو سردار اسے معاف کر دے گا۔ جرگے میں اس کا مکدمہ بھی پیش نہیں کرے گا۔"

"پتہ نہیں ملوک زادی تیری شرطاں مانتی ہے کہ نہیں۔" نوری نے آہستہ سے کہا۔ "میں نوشیر کے پاس جاتی ہوں۔ اس سے صلاح کرنے کے بعد ملوک زادی کو تیری گالہ بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے ٹوکا۔ "دیر نہ لگانا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔"

وہ ہولے ہولے گردن ہلاتی' دبے قدموں چلتی ہوئی دور چلی گئی۔ رحیم داد پھر بستر پر لیٹ گیا۔ بے چینی سے نوری کا انتظار کرنے لگا۔

نوری جلد ہی واپس آگئی۔

"تو مرجان کے پاس گئی تھی؟" رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ "میں نے تجھے جو کہا تھا اسے بتا دیا نا؟ کیا کہا اس نے؟" وہ سوال پر سوال کرتا چلا گیا۔

"نئیں' میں اس کے پاس نہیں گئی۔ جا بھی نہیں سکتی تھی۔"

"کیوں؟" رحیم داد نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"جب میں تیرے پاس تھی تو سردار نے نوشیر کو بلایا۔ ملوک زادی کے کمرے پر جو تالا پڑا ہے اس کی چابی نوشیر سے لے کر اپنے پاس رکھ لی۔" اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ "سردار ابھی جاگ رہا ہے۔ جلاوت کی رن بھی اس کے کمرے میں ہے۔"

"یہ تو بری خبر سنائی۔" رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ "سردار کو کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا۔"

"پتہ نہیں۔" نوری نے کہا۔ "ویسے ایسا لگتا نہیں۔ سردار جب ادھر ہوتا ہے تو ملوک زادی کے کمرے کی چابی رات کو کبھی کبھی اپنے پاس رکھتا ہے۔"

"سردار اس سے ملنے تو نہیں گیا؟"

"اس کی مرضی ہے۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ مرجان سے میری بات کہنی بہت ضروری تھی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

نوری نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے روکنا چاہا۔ مگر وہ اس کے پاس مزید نہ ٹھہری۔ آگے بڑھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ رحیم داد دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ کہہ بھی نہ سکا۔

سویرے اس نے ناشتا اپنے کمرے ہی میں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ شاہانی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ پھر دن گزرا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ گیارہ بجے سے چند منٹ پہلے سردار مراد خاں شاہانی اس کے پاس آیا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "شہ زور سے مرجان کے بارے میں تو نے گل بات کی؟" اس کے لہجے سے بے قراری آشکارہ تھی۔

"میں نے اس سے گالہ کرلی۔" مراد خاں شاہانی مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "اس نے کیا سوچا اور کیا طے کیا؟ وہ تجھے خود بتادے گا۔ ویسے جرگہ آج نہیں ہو رہا۔"

"یہ تو نے زبردست خبر سنائی" رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار مٹنے لگا۔ "یہ بتا' شہ زور سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟"

"میں نے بتایا نہیں' وہ تجھ سے خود بات کرے گا۔ تجھے سب کچھ بتادے گا۔"

"تو نے اس کی باتوں سے کیا اندازہ لگایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "وہ مان جائے گا ناں؟"

"مان تو جانا چاہیے۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"آگے تیرا کیا ارادہ ہے۔ ابھی تو یہاں ٹھیرے گا نہیں؟" رحیم داد نے مراد خاں کا پروگرام معلوم کرنا چاہا۔ "میں چاہتا ہوں' تیرے یہاں رہتے ہوئے سب کچھ آرام سے طے ہو جائے۔"

"لیکن مجھے تو ابھی واپس جانا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "میں تو تیرے کلیم کے کاغذات پہنچانے آیا تھا۔ مجھے بھکر جانا ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے ادھر گڑبڑ ہے اور ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔"

"ٹھیر جاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد نے شاہانی کو روکنا چاہا۔

شاہانی مزید قیام کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا اور باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب مڑا۔ رحیم داد بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ پھاٹک پر پہنچ کر بھی وہ خاموش رہے۔ پھاٹک کے سامنے مزاری کی کار کھڑی تھی۔ مزاری بھی موجود تھا۔ شاہانی باری باری دونوں سے بغل گیر ہوا۔ چاکر خاں سرگانی نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ مراد خاں اندر داخل ہوا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھی' گرد و غبار کے بادل اٹھنے لگے۔ کار تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رحیم داد واپس ہوا۔ مگر مزاری اس کے ہمراہ نہ گیا۔ چاکر خاں سرگانی کے ساتھ بستی کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد سے اس کی کوئی بات چیت نہ ہوئی۔

رحیم داد اپنے کمرے میں پہنچا۔ مونڈھا سرکایا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اسے توقع تھی کہ مزاری اس کے پاس آئے گا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سردار شہ زور مزاری کمرے میں داخل ہوا۔ وہ تیز دھوپ میں چل کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ تھکا ہوا سا اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری، کلیم داخل کر دیا گیا۔ سرگانی بتاتا تھا چند روز میں الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔"

رحیم داد کو اس وقت متروکہ اراضی کے الاٹمنٹ سے زیادہ مرجان کے معاملے میں دلچسپی تھی۔ وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔ "تو کوشش کرے گا تو الاٹمنٹ ضرور مل جائے گی۔"

"سیں، تجھے الاٹمنٹ ملنے کی خوشی نہیں ہوگی؟" شہ زور خاں مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہوگی، کیوں نہیں ہوگی۔ اراضی ملنی کسے بری لگتی ہے۔" اس نے تامل کیا۔ پھر دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ "مراد خاں شاہانی سے صبح تیری کچھ گل بات ہوئی تھی؟"

"ہوئی تو تھی۔" مزاری نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ وہ رحیم داد سے نظریں ملانے سے کترا رہا تھا۔ دبی زبان سے بولا۔ "اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ جو کچھ تو نے اسے کہا اس نے مجھ سے کہہ دیا۔"

"تو نے کیا طے کیا؟" رحیم داد بے قرار ہو کر مجسم سوال بن گیا۔

"تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے کچھ چھپا نہیں۔" اس نے رک رک کر رحیم داد سے کہا۔

"اب تو تجھ سے یاری بھی ہو گئی۔ تو بتا مجھے کیا طے کرنا چاہیے؟"

"شاہانی نے تجھے نہیں بتایا؟"

"اسے چھوڑ، اپنی گالہ کر۔" سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ مرجان کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تیری صلاح لینا چاہتا ہوں۔"

"میری صلاح پوچھتا ہے تو میں تجھے یہی کہوں گا، مرجان اگر بگیر میں اپنا حصہ چھوڑنا چاہتی ہے اور تیرے نام کرنے پر تیار ہے تو اسے معافی دے دے۔"

"یہ شرط اس نے خود تجھے بتائی تھی؟" سردار مزاری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

پوچھا۔

"ہاں!" رحیم داد نے بہت مختصر جواب دیا۔ اسے دھڑکا تھا۔ کہیں مزاری یہ نہ پوچھ لے کہ وہ مرجان کے پاس پہنچا کیسے۔

مگر مزاری نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔ "اپنی جائیداد تو وہ چھوڑ دے گی' پر وہ سہراب کو بھی چھوڑنے پر تیار ہے کہ نہیں؟" سردار مزاری کے تیوری پر بل پڑ گئے۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ "وہ اسے چھوڑے نہ چھوڑے پر میں اس نمک حرام کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بالکل بھول بیٹھا کہ وہ کمی ہے اور مرجان ملوک زادی۔ اس سنگین جرم کی اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔" اس نے گہری نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ "تو بتا مجھے سہراب کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسے سہراب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مرجان کو بچانا چاہتا تھا جو خوبصورت تھی' جوان تھی' ملوک زادی تھی اور اسے پسند بھی تھی۔ اس نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "مجھے سہراب سے کیا لینا۔ تو اسے جو سزا دینی چاہے خوشی سے دے۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "پر مرجان کو معافی دے دے۔"

"تو کہتا ہے تو اسے معافی دے دوں گا۔" مزاری نے اس کی بات مان لی۔ "شاہانی کہتا تھا تو اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں' میں اس کے لیے تیار ہوں۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "اگر تجھے کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے اب کیا لینا۔" مزاری نے اپنی رضامندی دے دی۔ "تو وڈا زمیں دار ہے' عزت دار بھی ہے۔ تیرے گھر میں رہے گی تو عزت ہی سے رہے گی میرے لیے اور میرے خاندان کے لیے بدنامی کا سبب تو نہیں بنے گی۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "پر سوال یہ ہے کہ وہ بھی اس کے لیے تیار ہے۔ تو نے اس بارے میں اس سے معلوم کر لیا ہے؟"

"نہیں' میں نے اس بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی۔" رحیم داد نے مزاری سے کہا۔ "تیری مرضی ہو تو میں آج ہی اس سے مل کر اس بارے میں پوچھ لیتا ہوں۔"

"ابھی نہیں۔" سردار مزاری آمادہ نہ ہوا۔ "پہلے میں اپنے نام جائیداد کے ٹرانسفر کی اسٹامپ پیپر پر دستاویز تیار کروا لوں۔ تو اسے لے کر مرجان کے پاس جانا۔ دستاویز پر اس کے دستخط لینا۔ وہ

دستخط کرنا جانتی ہے۔ انگوٹھے کا نشان نہ لگواتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "دستخط کروانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا کہ وہ تیرے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہے اور تیری ذال بن کر رہنا چاہتی ہے کہ نہیں؟"

"ایسا کیوں نہیں کرتا' تو خود دستاویز لے کر اس کے پاس چلا جا۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "اس سے میرے بارے میں بھی پوچھ لینا۔"

"نہیں' میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔" سردار مزاری نے رحیم داد کی تجویز مسترد کر دی۔ "تجھے ہی اس کے پاس جانا ہو گا۔ اپنے بارے میں تجھے اس سے گالہ کرنی ہو گی۔ وہ تیار ہو جائے تو دستاویز پر تجھے دستخط کرنے ہوں گے۔ دوسرا گواہ چاکر خاں ہو گا۔ وہ بھی دستخط کرے گا۔"

"تو کہتا ہے تو میں اس کے پاس چلا جاؤں گا۔" رحیم داد آمادہ ہو گیا۔ "دستاویز تو کب تیار کرائے گا؟"

"میں ابھی اس کام کے لیے چاکر خاں کو روانہ کیے دیتا ہوں۔ جیپ تو موجود ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کر وکیل کے پاس چلا جائے گا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ دستاویز تیار کروا کے کل شام تک واپس آجائے گا۔" سردار مزاری نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے بلکہ چاکر خاں سرگانی سے صلاح مشورہ بھی کر چکا ہے۔

مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلا؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں نے چاکر کو دستاویز تیار کروانے کے لیے روانہ کرنا ہے۔ میں دوپہر کی روٹی کھانے تیرے پاس آؤں گا۔ اب مجھے جانے دے۔" مزاری آگے بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مزاری کے جانے کے بعد وہ کمرے ہی میں بیٹھا رہا۔ وہ خوش اور مطمئن تھا کہ سردار مزاری نے بغیر کسی حیل و حجت کے اس کی بات مان لی۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا اس آسانی سے ہو جائے گا اسے یقین نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہ زور خاں سرکش اور ضدی ہے لہٰذا طرح طرح کے سوال اٹھائے گا۔ رضامند بھی ہو گا تو مشکل ہی سے ہو گا۔

دوپہر کے کھانے پر سردار مزاری وعدہ کرنے کے باوجود اس کے پاس نہ آیا۔ وہ دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اس نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ مزاری کے نہ آنے پر رحیم داد کو تعجب بھی ہوا۔

مگر نہ اس نے کسی نوکر چاکر سے مزاری کے بارے میں بات کی اور نہ ہی اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی۔ کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو سردار شہ زور خان مزاری سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد نے مرجان کا ذکر چھیڑا۔ "تو نے چاکر خاں کو دستاویز تیار کرنے کے لیے بھیج دیا؟"

"ہاں' وہ چلا گیا۔" مزاری نے مختصر جواب دیا۔

"چاکر کب تک لوٹے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کل وکیل سے دستاویز تیار کرانے کے بعد آئے گا۔"

"مرجان کو بھی اس بارے میں پتہ ہے؟" رحیم داد نے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" سردار مزاری نے آہستہ سے انکار میں سرہلایا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "چاکر تیرے کلیم کے بارے میں بھی متعلقہ افسروں سے بات کرے گا۔ تجھے ادھر اراضی کی الاٹمنٹ مل جائے تو بہت مناسب ہو گا۔"

رحیم داد نے بھی مرجان کے بارے میں مزید بات چیت کرنے سے گریز کیا۔ مزاری کے رویے سے اس نے بھانپ لیا تھا کہ وہ مرجان کے مسئلے پر اس وقت گفتگو کرنے سے اجتناب برت رہا ہے۔ وہ رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اس نے شراب سے بھی شغل نہ کیا' کھانا کھایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مزاری چلا گیا۔ رحیم داد برآمدے میں پہنچا۔ کچھ دیر مونڈھے پر خاموش بیٹھا رہا اور مرجان کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

صبح ناشتے پر بھی مرجان کے متعلق مزاری سے کوئی بات نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی مزاری نے۔ دوپہر کا کھانا دونوں نے حسب معمول ساتھ ہی بیٹھ کر کھایا۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوئیں' مگر مرجان کا مسئلہ زیر بحث نہ آیا۔

دن ڈھلے سردار مزاری نے رحیم داد کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اس وقت صاف ستھرا لباس پہنے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے اونچی آواز سے کہا۔ "سیں' تو سو تو نہیں رہا تھا؟" اس نے جواب کا انتظار نہ کیا۔ اپنی بات جاری رکھی۔ "چاکر خاں واپس آگیا ہے؟"

"کدھر ہے وہ؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"باہر ہے۔" سردار مزاری پلنگ سے نیچے اترا۔ "وہ دستاویز تیار کروا لایا ہے۔ تیرے پاس اسے لے کر آئے گا۔ تو مرجان کے پاس چلا جانا۔ چاکر جہاں بتائے وہاں اس سے دستخط لگوا لینا۔"

"تو بھی تو موجود ہو گا نا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہیں، مجھے بہت ضروری کام سے روجھان جانا ہے۔" مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"تجھے کب جانا ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ابھی جا رہا ہوں۔" سردار مزاری آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ چلا۔ دونوں دروازے سے گزرے۔ برآمدے میں پہنچے۔ مزاری نے رحیم داد سے کہا۔ "چاکر کو سب پتہ ہے۔ میرا موجود ہونا ضروری نہیں۔"

دونوں ساتھ ساتھ برآمدے میں چلتے رہے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو کب تک لوٹے گا؟"

"سویرے واپس آجاؤں گا۔" مزاری نے بتایا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے کے سامنے پہنچے۔ مزاری ٹھہر گیا۔ "تو اب آرام کر۔ باہر دھوپ بہت تیز ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مزاری آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر نہیں لیٹا۔ مونڈھے پر بیٹھا چاکر خاں سرگانی کا انتظار کرتا رہا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سائے طویل ہو گئے مگر سرگانی نہیں آیا۔

☆

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چاکر خاں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر دبا تھا۔

رحیم داد نے اسٹامپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "یہ دستاویز ہے نا؟"

"ہاسیں!" اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ "تجھے اس پر ملوک زادی سے دستخط کرادنے ہیں۔" وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ جیب سے ماچس نکال کر لیمپ روشن کیا۔ اسے ایک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے باہر آیا۔ اسٹامپ رحیم داد کے سپرد کیا۔ "اسے پڑھ لے۔"

رحیم داد نے دیکھا دستاویز اردو میں لکھی تھی اور مرجان کی جانب سے تھی۔ تحریر کی رو سے مرجان نے بہ قائم ہوش و حواس اور بہ رضا و رغبت اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ املاک اپنے سوتیلے بیٹے، سردار شہ زور خاں مزاری کے نام منتقل کر دی تھی۔ دستاویز ہرچند کہ عدالتی زبان میں تھی مگر سیدھی سادی تھی۔ کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ تھا۔ رحیم داد نے اسے آسانی سے پڑھ لیا۔

جب وہ دستاویز کا مطالعہ کر چکا تو چاکر خاں سرگانی نے جھک کر انگلی کے اشارے سے بتایا۔

"سیں چوہدری، تجھے اس جگہ ملوک زادی سے دستخط لینے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں یہیں اس کے دستخط لگوالوں گا۔" رحیم داد نے ہامی بھرلی۔ "مجھے اس کے پاس اکیلے جانا ہو گا یا تو بھی میرے ساتھ چلے گا؟"

"نا سیں، میں نے ملوک زادی کے پاس جا کر کیا لینا۔" چاکر خاں سرگانی نے کہا۔ "تو اکیلا ہی اس کے پاس جائے گا۔ تجھے اس سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ مجھے سب پتہ ہے۔ سردار نے مجھے پوری طرح سمجھا دیا ہے۔"

چاکر خاں سرگانی واپس کمرے میں گیا۔ لیمپ طاق میں رکھا۔ لوٹ کر رحیم داد کے پاس آیا۔ جیب سے فونٹین پین نکال کر رحیم داد کے حوالے کیا۔ "سیں، اسے رکھ لے۔ تجھے اس سے ملوک زادی کے دستاویز پر دستخط کرانے ہیں۔"

رحیم داد نے قلم لے لیا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے کلبلا رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ کہیں مرجان دستخط کرنے سے انکار نہ کردے۔ اپنے ساتھ نکاح پڑھانے کا اظہار کرے تو بھڑک نہ اٹھے۔ وہ ادھیڑبن میں مبتلا تھا اور گم صم بیٹھا تھا۔

چاکر خاں سرگانی جہاں دیدہ اور گھاگ تھا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے رحیم داد کی ذہنی الجھن بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "سیں، تو کس سوچ میں پڑ گیا۔؟"

رحیم داد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، خود کو سنبھالا۔ جھٹ سوال کیا۔ "مجھے مرجان سے دستخط لینے کب جانا ہو گا؟"

"ابھی چلنا ہو گا۔" سرگانی نے رحیم داد کو بتایا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چاکر خاں سرگانی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "سیں، میرے ساتھ آ۔" وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔

دونوں شام کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اس کمرے کے دروازے پر پہنچے جس میں مرجان کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ دروازے پر قفل پڑا تھا۔ چاکر خاں سرگانی نے کنجی نکال کر قفل کھولا اور دروازے کا ایک پٹ سرکا کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد اندر چلا گیا۔ چاکر خاں سرگانی باہر ہی ٹھہر گیا۔

☆

مرجان گم صم بیٹھی تھی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ لباس ملگجا پڑ گیا تھا۔ اب وہ اور بھی زیادہ اجڑ گئی تھی۔ اس نے رحیم داد کو دیکھا تو

ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولی۔

"سیں، تو یہاں کیسے آگیا؟"

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "گھبرا نہیں، میں چوری سے نہیں آیا ہوں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "شہ زور کی اجازت سے آیا ہوں۔"

"اس نے تجھے ادھر آنے کی اجازت دے دی؟" وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

"تو نے ہی تو شہ زور سے گل بات کرنے کو کہا تھا۔ میں نے تیرے بارے میں اس سے صاف صاف گل کی۔" رحیم داد نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیوار کے قریب ایک مونڈھا پڑا تھا۔ بوسیدہ اور کمزور تھا۔ رحیم داد اس پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں حبس تھا۔ گھٹن تھی۔ سخت گرمی تھی۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف ایک روشندان تھا۔ جو چھت کے قریب بلندی پر تھا۔ رحیم داد گرمی سے پریشان ہو کر بولا۔ "یہاں تو بہت گرمی ہے۔ تو یہاں کیسے رہتی ہے؟"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گرمی بہت ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گرمی شرمی کی فکر نہ کر۔ یہ بتا شہ زور نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ "پر وہ خود فیصلہ کب کرے گا۔ وہ تو جرگے سے فیصلہ کرائے گا۔ میں نے یہی سنا ہے۔"

"جرگے سے فیصلہ کراتا تو مجھے تیرے پاس کیوں آنے کی اجازت دیتا؟"

"تیرا مطلب ہے جرگہ نہیں ہو رہا؟"

"جرگہ تو کل صبح ہونے والا تھا۔ تجھے بھی پتہ ہو گا۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر اب جرگہ نہیں ہو گا۔"

مرجان کے چہرے پر چھائے ہوئے سائے رفتہ رفتہ مٹنے لگے۔ وہ سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ پریشانی اور قید میں بھی حسین نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد بے قرار نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ مرجان نے نگاہیں اٹھائیں، دونوں کی نظریں ملیں۔ مرجان نے جھٹ نظریں نیچی کر لیں۔ دبی زبان سے پوچھا۔

"شہ زور نے کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ اسے نہیں اب تو تجھے کرنا ہے۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

"میں، میں کیا فیصلہ کر سکتی ہوں۔ تو کیسی گالہ کر رہا ہے؟" اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور حیرت کا امتزاج تھا۔

"ہاں، تجھے ہی فیصلہ کرنا ہو گا۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "تو نے مجھے جو کچھ کہا تھا، میں نے شہ زور سے کہہ دیا۔" اس نے اپنی اہمیت جتائی۔ "پہلے تو وہ تیار نہیں ہوا۔ تجھ سے سخت ناراض ہے۔ پر جب میں نے اسے سمجھایا بجھایا تو وہ تیار ہو گیا۔"

"اب وہ کیا چاہتا ہے؟" مرجان نے دریافت کیا۔

"وہی جو تو چاہتی تھی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "تو ساری جائیداد اس کے نام کر دے گی تو وہ تجھے معافی دے دے گا۔ تو یہی تو چاہتی تھی ناں؟"

"تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں یہی چاہتی تھی۔" مرجان نے اعتراف میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "اب وہ کیا چاہتا ہے؟"

"اس نے وکیل کے مشورے سے جائیداد اپنے نام کرنے کی دستاویز بنوائی ہے۔" رحیم داد نے ہاتھ میں دبا ہوا اشامپ پیپر مرجان کو دکھایا۔ اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "پڑھ سکتی ہے تو اسے پڑھ لے۔"

"میں اتنا پڑھنا نہیں جانتی۔ ہاں دستخط بنا لیتی ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو نے صرف اپنے دستخط ہی لگانے ہوں گے۔ میں نے دستاویز اچھی طرح پڑھ لی ہے۔" رحیم داد نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ "مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگی۔ پتہ نہیں تجھے مجھ پر بھروسہ ہے کہ نہیں۔"

"میرے لیے تجھ پر بھروسہ کرنے کے سوا اور رستہ ہی کون سا ہے۔" اس کا لہجہ صاف اور تیکھا تھا۔ رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی ذہین اور سمجھ دار ہے۔ مرجان نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر رحیم داد سے دریافت کیا۔ "شہ زور کی اور بھی شرطاں ہوں تو صاف صاف بتا دے۔"

"تجھے سہراب کو چھوڑنا ہو گا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "ویسے تو اسے چھوڑنے کو نہ بھی تیار ہو تب بھی شہ زور اسے معافی نہیں دے گا۔"

مرجان نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر افسردہ ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا لی اور خاموش بیٹھی رہی۔

"تو کس سوچ میں پڑ گئی؟" رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔

"سوچ رہی تھی، قصور جتنا میرا ہے اتنا ہی سہراب کا بھی ہے۔" مرجان نے رحیم داد کی جانب پُر اعتماد نظروں سے دیکھا۔ "جب وہ جائیداد لے کر مجھے معافی دے سکتا ہے تو اسے سہراب کو بھی

معافی دینی چاہیے۔ اسے تو جائیداد چاہیے' وہ اسے مل جائے گی۔ اس کے بعد اسے مجھ سے اور سہراب سے کیا لینا۔"

"یہ تو سوچ سہراب ماشیا ہے۔ حویلی کا پرانا نوکر رہ چکا ہے۔" رحیم داد نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "اس نے اپنے مالک سے نمک حرامی کی ہے۔"

"ٹھیک ہے سہراب حویلی کا ماشیا ہوتا تھا۔ شہ زور اور اس کے پیئو کا پاندارہ چکا ہے۔" اس کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ "مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھاگئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ "سہراب نے زیادہ سے زیادہ نمک حرامی ہی تو کی ہے۔ شہ زور کی طرح خونی تو نہیں ہے۔ جائیداد کے لیے اس نے اپنی سگے بھائی کو قتل تو نہیں کروایا۔"

"لگتا ہے تو سہراب کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔" رحیم داد نے زچ ہو کر کہا۔

"سیں تو خود ہی سوچ۔ سہراب نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچانے کی کوشش کی۔" مرجان نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ "وہ مجھے کوٹ سے نکال کر نہ لے جاتا تو شہ زور جائیداد لینے کے لیے کب کا میرا خون کر چکا ہوتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "شہ زور کے ساتھ اگر اس نے نمک حرامی کی ہے تو میرے ساتھ تو وفاداری کی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ یہ تو خود غرضی اور کمینگی ہوگی۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔"

اس کے لہجے کے اعتماد سے رحیم داد کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ پہلی سی مرجان نہیں رہی تھی جس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے رو رو کر اس سے التجا کی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے موت کو اس قدر قریب پایا کہ اس کا ڈر اور خوف کم ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ مرجان خود سر اور دبنگ عورت ہے۔ وہ زندگی سے بیزار اور اکتائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

رحیم داد نے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ "تو بھی ٹھیک کہہ رہی ہے۔" وہ اس سے الجھنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے پینترا بدلا اور عزت اور خاندانی وجاہت کا واسطہ دیا۔ "مرجان' یہ تو سوچ' تو ملوک زادی ہے اور سہراب کمی ہے۔ شہ زور یہ کیسے دیکھ سکے گا تو سہراب سے یاری لگائے۔ اس کے ساتھ رہے۔ وہ بلوچ سردار ہے۔ یہ اس کی شان اور آن کا سوال ہے۔"

"سیں' شان اور آن کی گالہہ نہ کر۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "مجھے اس کی شان اور آن کا سب پتہ ہے۔ وہ ہر رات کسی ذال کے ساتھ حرام کاری کرتا ہے۔ اسے گندہ کرتا ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ اور تیکھا ہو گیا۔ "پر اپنی مونچھ اونچی کیے عزت والا بنا پھرتا ہے۔ سردار کہلاتا ہے۔ اسی عزت اور آن کے لیے اپنی بھینوں اور رن کو حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر بند رکھتا ہے۔ ان کی کڑی

چوکیداری کرواتا ہے۔" اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ "پر چوکیداری شوکیداری سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے پتہ ہے کس نے کس کی اور کس باشے اور نوکر سے یاری لگا رکھی ہے۔ کیسے راتوں کو چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مجھے کیا نہیں معلوم؟ میں نے ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔" مرجان کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ "شہ زور کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ وہ کسی باشے کا پتر ہے یا سردار نجیب خان کا۔"

"ایسی الٹی سیدھی گلاں نہ کر۔" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا جس کے دوسری طرف چاکر خان سرگانی کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ "لگتا ہے تو معافی شعافی نہیں چاہتی۔" اس کے لہجے میں شکوہ کرنے کا انداز صاف نمایاں تھا۔ "ایسا ہی تھا تو اس رات تو نے نوری کے ذریعے مجھے کیوں بلایا تھا؟ کیوں مجھے رو رو کر کہا تھا کہ تجھے معافی دلانے کے لیے شہ زور سے گل بات کروں۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "اپنی زندگی بچانے کے لیے تو جائیداد تک چھوڑنے کو تیار تھی۔ تو ایسا نہ کہتی تو میں کیوں شہ زور کو معافی دینے پر راضی کرتا؟" اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے اشٹامپ پیپر کو سامنے کر دیا۔ "یہ دستاویز کیوں تیار کرواتا؟"

مرجان خاموش بیٹھی رہی۔ گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجلاہٹ رفتہ رفتہ مٹتی جا رہی تھی۔

"تو مرنا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے اسے زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔

"کون خوشی سے مرنا چاہتا ہے؟" مرجان نے دل گرفتہ ہو کر جواب دیا۔ موت پر زندہ رہنے کی خواہش غالب آ گئی۔ "مرنا ہی ہوتا تو تجھے کیوں اپنے پاس بلاتی؟" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہی، پھر اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتی کہ سہراب کو شہ زور مار ڈالے۔"

"سہراب کو بھی معافی دلانے کی ایک صورت ہو سکتی ہے؟"

"وہ کیا؟" مرجان نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"تو کسی اور سے نکاح پڑھا لے۔" رحیم داد نے ریا کاری سے کام لیا۔ نہایت نرمی سے گویا ہوا۔ "اگر تو ایسا کرنے پر تیار ہو جائے تو میں کسی نہ کسی طرح شہ زور کو راضی کر لوں گا کہ وہ سہراب کو بھی معافی دے دے۔" اس نے نظر بھر کر مرجان کو دیکھا۔ "ضد کرنے سے کام نہیں چلے گا' اس طرح تیرے ساتھ سہراب کی بھی جان بچ جائے گی۔ میں تو کہتا ہوں تو میری صلاح مان لے۔ ایک بار دونوں کی جان بچ جائے تو آگے کے لیے جو تیرا جی کرے کرنا پر شہ زور کو راضی کرنے کے لیے ابھی تو تیرے لیے یہی ٹھیک رہے گا کہ سہراب کے علاوہ تو کسی اور سے نکاح پڑھوا لے۔"

رحیم داد نے کچھ اس ڈھب سے بات کی کہ مرجان رضا مند ہو گئی۔ رسان سے بولی۔ ''تیری صلاح ویسے تو ٹھیک ہی لگتی ہے' پر اتنی بدنامی کے بعد کون مجھے اپنی رن بنانے کے لیے تیار ہو جائے گا؟ شہ زور تو یہی چاہے گا کہ وہ کوئی وڈا زمیں دار ہو اور عزت دار بندہ ہو۔ ایسا بندہ کون ہو سکتا ہے؟''

''میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔'' رحیم داد نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ''یہ تو تجھے ہی سوچنا ہو گا۔ اس میں دیری بھی نہیں ہونی چاہیے۔''

''میں تو یہاں بند ہوں۔ میں اس بارے میں کیا کر سکتی ہوں۔'' اس نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ ''تو نے جب میری اتنی مدد کی ہے تو اس معاملے میں بھی تو ہی میری مدد کر سکتا ہے۔''

''تجھے تو پتہ ہی ہے میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی سے میل ملاپ بھی نہیں۔'' رحیم داد نے احتیاط سے کام لیا۔ دل کی بات زبان پر نہ آنے دی۔ صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا۔

مرجان نے ایک بار پھر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ عاجزی سے بولی۔ ''سیں چوہدری' اس بارے میں تجھے ہی مدد کرنی ہو گی۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔''

''میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں کہ خود تجھ سے نکاح کر لوں۔'' رحیم داد ڈرتے ڈرتے حرف مطلب زبان پر لایا۔ ''برا نہ منانا۔ یہ تیری مرضی پر ہے کہ مانے یا نہ مانے' فیصلہ تجھے ہی کرنا ہے۔''

''میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''سیں' تو بہت نیک بندہ ہے۔ سمجھ نہیں آتی' تو ایسا کیوں چاہتا ہے؟''

رحیم داد نے اپنی اہمیت جتائی۔ ''میں نے تو تجھے بچانے کے لیے ایسا سوچا ہے۔'' اس نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ ''مرجان' تجھے پتہ نہیں' میں بھی تیری طرح مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔ گورداسپور کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں گھر بار لٹ گیا۔ وڈا پتر میری آنکھوں کے سامنے بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ جوان دھی کو بھی وہ اٹھا کر لے گئے۔ میں بیڑی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی طرح راوی پار کر کے اکیلا ہی پاکستان پہنچ سکا۔ گھر والی اور بچوں کا پتہ نہیں کیا بنا۔ زندہ ہیں یا سب ختم ہو گئے۔ بہت تلاش کیا۔ پر کسی کا پتہ نہ چلا۔'' اس نے گہری سانس بھری ''تب سے میں اکیلا ہوں۔'' اس نے مرجان کی جانب دیکھا۔ ''میں نے اپنے بارے میں تجھے سب کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔''

''نہ بھی بتاتا تو کیا فرق پڑتا۔'' مرجان نے کہا۔ ''مجھے تو اتنا پتہ تھا کہ تو بھی وڈا زمیں دار ہے اور

شہ زور کا گھرایا رہے۔"

"تونے کیا طے کیا؟" اس بار رحیم داد اپنی بے قراری پر قابو نہ رکھ سکا۔

"طے کیا کرنا ہے۔ تیار ہوں۔" مرجان نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔ "پر چوہدری تجھے سہراب کو بھی معافی دلانا ہوگی۔ تو نے مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔"

"تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروں گا۔" رحیم داد نے نہایت جوش و خروش سے کہا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر مرجان کو یقین دلایا۔ "یہ مرد کا وعدہ ہے۔"

مرجان خاموش رہی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مرجان کے قریب گیا۔ اسٹامپ اس کے ہاتھوں میں دیا۔ مڑا اور لیمپ اٹھا کر واپس مرجان کی پاس پہنچا۔ فونٹین پین نکالا۔ مرجان کی جانب بڑھایا۔ "لے، اب دستاویز پر اپنے دستخط لگا دے۔"

رحیم داد نے انگلی رکھ کر جس جگہ بتایا مرجان نے اسی جگہ دستخط کر دیے۔

رحیم داد نے دستاویز مرجان سے واپس لی۔ لیمپ جہاں رکھا تھا وہیں رکھا۔ مرجان سے مخاطب ہوا۔ "مرجان، مجھے اب جانا ہے۔ چاکر خان باہر میرا انتظار کرتا ہوگا۔"

مرجان نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں!" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے اس کے جھکے ہوئے سر کو ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ "پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو گا۔"

مرجان کی سسکیاں رک رک کر کمرے کی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔

رحیم داد آگے بڑھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

☆

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات کی آمد آمد تھی۔ چاکر خان سرگانی دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا رحیم داد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی قریب آیا۔ "سئیں، تو نے بہت دیر لگا دی۔" رحیم داد خاموش رہا۔

چاکر خاں نے دروازے میں تالا ڈال کر کنجی سے بند کر دیا۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچے جس میں رحیم داد کا قیام تھا۔ برآمدے میں پلنگ بچھا کر رحیم داد کا بستر لگا دیا گیا تھا۔

رحیم داد تھکا ہوا سا بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاکر خان سرگانی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

چاکر خاں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "سیں' تو چپ چپ نظر آرہا ہے۔ کوئی فکر کی گالہ تو نہیں؟" اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ "کیا ملوک زادی نے دستخط نہیں لگائے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اس نے دستخط لگا دیے ہیں۔" رحیم داد نے ہاتھ میں دبا ہوا اسٹامپ چاکر خاں سرگانی کی جانب بڑھایا۔ "یہ رہی دستاویز۔ اسے اندر جاکر لیمپ کی روشنی میں ٹھیک سے دیکھ لے۔"

چاکر خاں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ابھری۔ اس نے دستاویز رحیم داد کے ہاتھ سے لے لی۔ مسکرا کر بولا۔ "کام بن گیا۔ اب تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

رحیم داد نے صاف گوئی سے کام نہ لیا۔ بات بنانے کی کوشش کی۔ "اس نے آسانی سے دستخط نہیں لگائے۔ دیر تک مغز ماری کرنی پڑی۔ تب وہ تیار ہوئی۔"

"وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔" سرگانی کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔ "تو دیر تک اس کے پاس رہا' اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ وہ تجھ سے سخت حجت کر رہی تھی۔ میں نے پتہ ہے وہ کتنی ضدی اور سر پھری رن ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔

چاکر اٹھ کر کمرے کے اندر گیا۔ لیمپ کی روشنی میں دستاویز پر مرجان کے دستخط دیکھے۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا تو لیمپ اٹھا کر رحیم داد کے پاس آیا۔ دستاویز اس کے سامنے رکھی۔ "سیں' اب تو بھی گواہ کے طور پر دستخط کر دے۔" اس نے انگلی رکھ کر دستخط کرنے کی جگہ بتائی۔

رحیم داد نے قلم لے کر دستخط کر دیے۔ چاکر خاں نے دستاویز واپس لے لی۔ رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "سردار کل صبح واپس آجائے گا نا؟"

"ضرور آجائے گا سیں۔" چاکر خاں نے اسے یقین دلایا۔ "وہ یہی کہہ کر گیا ہے۔"

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ چاکر خان سرگانی بھی زیادہ دیر نہ رکا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سیں' اب تو روٹی کھا کر آرام کر۔ میں نے کئی اور کام کرنے ہیں۔" وہ مڑا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ شہ زور مزاری کسی صورت میں سہراب کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ مرجان کو اس کا علم ہو گا تو اسے نہ صرف شدید دکھ ہو گا بلکہ اس کی طرف سے بھی بدگمان ہو جائے گی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ

سراب کو معافی مل جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ سراب کا کانٹا راستے سے صاف ہو جائے اور مرجان نکاح کے بعد پوری طرح اس کے قبضے میں آجائے۔

مگر اسے زیادہ دیر اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع نہ ملا۔ ملازم کھانا لے کر آگیا۔ لیکن وہ نوشیر نہیں تھا۔ رحیم داد نے اسے بغور دیکھا۔ دریافت کیا۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سئیں، میرا ناں سانجھی ہے۔"

"نوشیر کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"سئیں، مجھے پتہ نہیں وہ کدھر ہے؟" اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔ سانجھی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کھانا کھا چکا تو وہ برتن اٹھا کر لے گیا۔ رحیم داد بستر پر نہ لیٹا۔ مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ احاطے میں سناٹا چھا گیا۔

بہت دیر بعد وہ اٹھا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

سردار مزاری صبح واپس نہ آیا۔ چاکر خان سرگانی بھی نظر نہ آیا۔ رحیم داد تمام دن شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا۔ شام ہو گئی مگر مزاری کے واپس پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ نوشیر بھی اس کے پاس نہ آیا۔ رات کا کھانا بھی سانجھی ہی لے کر آیا۔

رحیم داد نے اس سے پوچھا۔ "سردار آج صبح آنے کو کہہ گیا تھا اب تک نہیں آیا۔ تجھے پتہ ہے وہ کب آئے گا؟"

"سئیں، مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"چاکر خان بھی صبح سے نظر نہیں آیا۔ نوشیر بھی نہیں آیا۔ دونوں کہاں ہیں؟" رحیم داد نے سانجھی سے پوچھا۔

"سئیں، مجھے پتہ نہیں۔" سانجھی نے مختصر جواب دیا۔ اس کے رویئے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی اسے محسوس کیا۔ مگر چپ رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھا برآمدے کے سامنے ٹہلنے لگا۔ سانجھی جا چکا تھا۔ احاطے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھاٹک پر مسلح پہرے دار بیٹھے تھے۔ ان کی کھنکار رات کے سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔

رحیم داد واپس برآمدے میں گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ نوری رات گئے اس

کے پاس آئے گی۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پہر رات گزر گئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات کالی ہو کر کاجل بن گئی۔ سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے برآمدے میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر کروٹ بدلی۔ اس جانب دیکھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ نظر آیا۔ چاپ قریب اور قریب آتی گئی۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ توقع تھی کہ وہ نوری ہو گی۔ مگر وہ نوری نہیں نمیسو کی بیوی تھی۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "اب تو تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"سیں، ٹھیک ہی ہوں۔" وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پر نکے کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ ہر دم روتا رہتا ہے۔ بہت مشکل سے اسے سلا کر آئی ہوں۔"

"کیا ہو گیا نکے کو؟" رحیم داد نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

"سیں، اسے تپ چڑھی ہے۔" اس نے بتایا۔ "تو نے نمیسو کو معافی دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ لگتا ہے تو نے اس کے بارے میں سردار سے گالہہ نہیں کی۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "سیں، اسے معافی دلوا دے۔ میرا بھی ادھر جی گھبراتا ہے۔ گھر بہت یاد آتا۔ نمیسو بھی برے حال میں ہو گا۔"

رحیم داد نے اسے اطمینان دلایا۔ "گھبرا نہیں، سردار کل واپس آجائے گا۔ میں اس سے نمیسو کو معافی دلانے کے بارے میں ضرور گل بات کروں گا۔"

"پہلے بھی تو نے یہی کہا تھا۔" اس نے شکوہ کیا۔ "اب تو نمیسو کو ویسے بھی معافی مل جانی چاہیے۔ سنا ہے ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا۔ اس نے جھوٹی شکایت لگائی تھی۔ تب ہی تو اوٹھ لے کر بھاگ گیا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اب نمیسو کو ضرور معافی مل جائے گی۔"

"سیں، تو سردار سے کل ضرور گالہہ کرے گا ناں؟" اس نے اصرار کیا۔

"کروں گا، ضرور کروں گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "یہ بتا نوشیر کدھر ہے؟ کل سے بالکل نظر نہیں آیا۔ اس کی گھروالی 'نوری' بھی نہیں آئی۔ دونوں کہاں ہیں؟"

"سیں، میں نے بھی نوشیر اور نوری کو نہیں دیکھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"ساجھی کی رن بتاتی تھی' سردار نے دونوں کو شاہ میر بھیج دیا۔ بہت ناراض ہے ان سے۔"

"سردار ان سے کیوں ناراض ہے؟" رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر نمیسو کی بیوی کو دیکھا۔ بے چینی سے پوچھا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا؟"

"سئیں، مجھے ان کے بارے میں اتنا ہی پتہ ہے۔" وہ گڑگڑا کر بولی۔ "میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیل گئے۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات منڈلانے لگے۔ نمیسو کی بیوی نے اس کے ذہنی خلفشار کی جانب توجہ نہ دی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

سناٹا بڑھ گیا تھا۔ رات اور کالی ہو گئی۔ برآمدے کے قریب ہی شیشم کا گھنا درخت تھا۔ اس کی الجھی ہوئی شاخوں میں کوئی پرندہ پھڑپھڑایا۔ گہری خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا اور پھر سکوت طاری ہو گیا۔

☆

صبح بھی ناشتا رحیم داد نے اکیلے ہی کیا۔ اور اپنے کمرے میں کیا۔ ناشتا بھی ساجھی لے کر آیا تھا۔ مگر رحیم داد نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی خاموش رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو ساجھی چپ چاپ اندر آیا اور برتن اٹھا کر چلا گیا۔

ساجھی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد چاکر خان سرگانی کمرے میں آیا۔ مسکرا کر یہ خوش خبری سنائی۔ "سردار نے بتایا ہے۔ سئیں تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ فکر نہ کر الاٹمنٹ بھی چند روز میں مل جائے گی۔"

"کیا سردار واپس آگیا؟" رحیم داد نے جھٹ سوال کیا۔

"سئیں' وہ تو سویرے ہی سویرے ادھر پہنچ گیا تھا۔"

"کدھر ہے وہ' میرے پاس کیوں نہیں آیا؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"سئیں آج ادھر جرگہ ہے ناں۔" سرگانی نے بتایا۔

"آج جرگہ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "جرگہ کیوں بلایا گیا ہے؟"

"جرگے کے سامنے ملوک زادی اور سہراب کا مکدمہ پیش ہو گا۔"

رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "جرگہ

کب شروع ہو گا؟"

"سیں، دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شروع ہو گا۔" چاکر خان سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سردار ادھر اپنے کمرے میں معتبروں کے ساتھ بیٹھا بات چیت کر رہا ہے۔ جرگے میں شرکت کرنے کے لیے گیارہ معتبر آئے ہیں۔"

"میں جرگے کی کارروائی نہیں دیکھ سکتا؟"

"مشکل ہی ہے سیں۔" چاکر خاں نے جواب دیا۔ "جرگہ تو بند کمرے میں ہو گا۔ وہاں تو سردار ہو گا۔ معتبر ہوں گے۔ ان کے علاوہ سراب ہو گا۔ ملوک زادی ہو گی۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھی ہو گی۔"

"تو جرگے میں موجود نہیں رہے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں بھی رہوں گا۔ سیں، میرا کام پیش کار کی طرح ہو گا۔" سرگانی سنبھل سنبھل کرتا رہا۔ "بدمیل، ہجر خاں اور داؤد بھی رہیں گے۔ تینوں گواہ ہیں۔ سردار کے ساتھ ہی ادھر پہنچے ہیں۔"

"سردار سے کہنا، چوہدری تجھے اپنے کمرے میں بلا رہا ہے۔" رحیم داد نے چاکر خان سرگانی کے ذریعے شہ زور خان مزاری کو پیغام بھجوایا۔

"سیں، تو اطمینان رکھ، میں سردار سے ضرور کہہ دوں گا۔" چاکر خان سرگانی نے یقین دلایا۔

چاکر خاں چلا گیا۔ رحیم داد کمرے میں بیٹھا سردار شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی، مگر وہ نہ آیا۔ البتہ ساجھی کھانا لے کر آگیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ اسے توقع تھی کہ شہ زور خان مزاری اس کے پاس ضرور آئے گا۔ کمرے کے باہر چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا دبا دبا شور ابھر رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سردار مزاری اس کے پاس نہ آیا۔ رحیم داد تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد نیند سے بیدار ہوا۔ کمرے کے باہر سناٹا تھا۔ جرگہ اب ختم ہو چکا تھا۔ سناٹے سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور برآمدے میں جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ شام در و دیوار سے نیچے اتر کر پھیل چکی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر رات ہو گئی۔ سردار مزاری آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحیم داد کے پاس آیا۔ وہ تھکا ہوا نظر آرہا

تھا۔ آتے ہی موںڈھا کھسکا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بیزار اور روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"طبیعت تو تیری ٹھیک ہے ناں؟" سردار شہ زور مزاری نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے بے رخی سے جواب دیا۔ "مجھے کل لہور واپس جانا ہے۔"

"چلا جانا۔" مزاری نے بے تکلفی سے کہا۔ "مجھے بھی جانا ہے۔ اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"نہیں، مجھے کل ہی جانا ہے۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "مجھے اب یہاں ہرگز نہیں ٹھیرنا۔"

"اوہو تو، تو سخت ناراض لگتا ہے۔ مجھے پتہ ہے تو کیوں ناراض ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ رحیم داد کو منانے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"میں نے تجھے بلایا تھا۔ تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟"

"میں معتبروں کے ساتھ جرگے میں بیٹھا تھا۔ تیرے پاس کیسے آتا؟ جرگہ ختم ہوتے ہی سیدھا ادھر آیا۔" سردار شہ زور مزاری نے صفائی پیش کی۔

"تو نے تو پکا وعدہ کیا تھا کہ جرگہ نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔

"میں نے تجھے یار کہا ہے تو ہمیشہ یار ہی رہے گا۔" شہ زور مزاری نے دل جوئی کرنے کے انداز میں کہا۔ "تجھے کئی باتوں کا پتہ نہیں۔ جب تجھے پتہ چلے گا تب سب کچھ تیری سمجھ میں آ جائے گا۔"

رحیم داد نے گلہ کیا۔ "تو نے مجھے بتایا ہی کب۔"

"سیں چوہدری تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔" مزاری نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو بلوچوں اور ان کی کبائلی روایات اور رسم و رواج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کا اپنا کانون ہے۔ تجھے پتہ ہے سرداری کیا ہوتا ہے؟ سرداری کیسے چلتی ہے؟" اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تجھے کیا پتہ مجھے جرگہ کیوں بلانا پڑا؟"

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "یہ بتا، جرگے نے کیا فیصلہ کیا؟" عین اسی وقت نوکروں کی کوٹھری کی جانب سے تیز زنانی چیخ ابھری۔ رحیم داد تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مزاری بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ "چوہدری، میرے ساتھ آ۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا جرگے نے کیا فیصلہ کیا۔"

"مجھے ادھر نہ لے جا۔" رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر انکار میں گردن ہلائی۔

مزاری نے بے تکلفی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ "ادھر زمین داری کرنی ہے تو تجھے سب کچھ دیکھنا پڑے گا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ تھکے تھکے قدموں سے شہ زور خاں مزاری کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں برآمدے سے اتر کر احاطے میں پہنچے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ دونوں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ درختوں کے نیچے پہنچے۔ خشک پتے ان کے جوتوں کے نیچے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔

سردار مزاری اور رحیم داد ایک کوٹھری کے سامنے پہنچ گئے۔ چاکر خان سرگانی باہر کھڑا تھا۔ اس نے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ شہ زور مزاری آگے تھا۔ رحیم داد اس کے عقب میں پریشان اور سہما ہوا کھڑا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔

کوٹھری میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی ملگجی زرد روشنی میں دیوار کے نزدیک سراب کی لاش پڑی تھی۔ اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ مگر اس کی گھنی سیاہ ڈاڑھی اور چہرے کا کچھ حصہ چادر کا کونا سرک جانے کے باعث نظر آرہا تھا۔ اسے بہت پہلے پھانسی دی جا چکی تھی۔

چھت کے بیچوں بیچ مضبوط شہتیر تھا۔ اس میں لوہے کا کڑا تھا۔ کڑے سے رسی بندھی تھی۔ اس کا پھندا مرجان کی گردن میں پڑا تھا۔ مرجان کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔ گردن ایک طرف جھول رہی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ لاش کے نیچے ایک اسٹول الٹا ہوا تھا۔ اسی اسٹول پر چڑھ کر اس نے رسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا تھا۔

دروازے کے قریب دو بلوچ معتبر کھڑے تھے۔ ان کی ڈاڑھیاں سفید تھیں اور خوب گھنی تھیں۔ مونچھیں بھی سفید تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے۔ چہروں پر سختی اور گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے مرجان کی لاش کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ زبان منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ گردن کھنچ کر لمبی ہو گئی تھی۔ اس کا خوبصورت اور دل آویز چہرہ مسخ ہو کر نیلا پڑ گیا تھا۔

رحیم داد یہ لرزہ خیز منظر زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ اسے کوٹھری میں سخت گھٹن محسوس ہوئی۔ جی متلانے لگا۔ اس نے حواس باختہ ہو کر کوٹھری کی دھندلی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا اور چپ چاپ نکل کر باہر کھلی فضا میں آگیا۔ مزاری کوٹھری کے اندر ہی رہا۔

دریا کی سمت سے آنے والے تیکھے جھونکے درختوں کے پتوں میں اس طرح سرسراتے ہوئے گزر رہے تھے گویا سسکیاں بھر رہے ہوں۔ احاطے پر سناٹا چھایا تھا۔ کوٹھریوں کے دروازے بند تھے۔ نوکر چاکر ان کے پیچھے ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سردار شہ زور خاں مزاری باہر نکلا۔ دونوں معتبر اس کے ہمراہ تھے۔ چاکر خان سرگانی گردن جھکائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی بکھری ہوئی تھی۔

سردار مزاری نے مڑ کر چاکر خان سرگانی کی جانب دیکھا۔ "چاکر' مسجد کے ملا کو بلوا لے۔ وہ لاشوں کو غسل دے کر کفن ڈال دے گا۔ تو نے کفن تو تیار کرا ہی لیا ہو گا؟"

"ہا سئیں' میں نے کفن دفن کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔" چاکر خان سرگانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "تو بالکل فکر نہ کر۔"

"اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو سورج نکلنے سے پہلے پہلے دبا دیا جائے۔" سردار مزاری نے حکم دیا۔

"چاکر تجھے پتہ ہونا چاہیے' کالے اور کالی کو رات کے اندھیرے میں ہی دفن کیا جاتا ہے۔" ایک معتبر نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خبردار کیا۔ "ان بدکاروں پر دن کی پاک صاف روشنی نہیں پڑنی چاہیے۔ ان کی تو نماز جنازہ بھی نہیں ہوتی۔ نہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے نہ نذر نیاز ہوتی ہے۔"

"سئیں' مجھے سب پتہ ہے۔" چاکر خان سرگانی نے یقین دلایا۔ "سارا ہی کام ٹھیک ٹھاک طرح ہو جائے گا۔"

سردار مزاری نے گردن گھما کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "سئیں چوہدری' تو بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔ تھوڑا آرام کر۔ میں تیرے پاس چند منٹ بعد پہنچ جاؤں گا۔ سونا نہیں' میرا انتظار کرنا۔"

مزاری آگے بڑھا اور معتبروں کے ہم راہ احاطے کے پھاٹک کی جانب چل دیا۔ چاکر خان سرگانی مڑا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد گم صم تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی جانب بڑھا اور ایک مونڈھے پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور شکستہ نظر آ رہا تھا۔ قریب ہی اس کا پلنگ تھا مگر وہ بستر پر جا کر لیٹا نہیں۔ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے جذبات میں ہلچل برپا تھی۔

رحیم داد کو سردار شہ زور مزاری کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ آیا اور اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بے نیازی سے پوچھا۔ "چوہدری' تو کب تک ایسے چپ کر کے بیٹھا رہے گا؟" وہ زیر لب مسکرایا۔ "روٹی شوٹی بھی کھائی؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" رحیم داد نے بے زاری سے جواب دیا۔

"ایسا کر تھوڑی سی وہسکی لگا لے۔ مراد خاں شاہانی لہور سے لایا تھا۔ میرے کمرے میں پڑی ہے۔" وہ بدستور غیر سنجیدہ تھا۔ "ایک دم کھلاوڑا بن جائے گا۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

"نہیں، میں نے آج نہیں پینی۔" رحیم داد نے بے رخی سے انکار کر دیا۔ "تیرا جی کرے تو ضرور لگا۔ میری فکر نہ کر۔"

"تو نے نہیں پینی تو میں بھی نہیں لگاؤں گا۔ پر یہ بتا تو اتنا روٹھا روٹھا کیوں ہے؟"

"تو بھی عجب بندہ ہے۔" رحیم داد اس کی ڈھٹائی پر بلبلا اٹھا۔ جل کر بولا۔ "پوچھتا ہے، میں ناراض کیوں ہوں؟ ایک طرف یاری کا دم بھرتا ہے دوسری طرف تو نے نوشیر اور نوری کو میرے پاس آنے سے روک دیا۔"

"نوری اور نوشیر کا میرے سامنے نام نہ لے۔" مزاری کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ برسنے لگی۔ "زیور اور کھنڑوں کے لالچ میں دونوں نے نمک حرامی کی۔ مرجان سے مل کر سازباز کی۔ میں نے انھیں جیل میں ڈال دیا ہے تاکہ انھیں اور دوسرے کراووں اور باتھوں کو پتہ چل جائے کہ میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

"نوری اور نوشیر کے بارے میں تجھے شاہانی نے بتایا تھا؟"

"نہیں!" مزاری نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس نے ان کے بارے میں کوئی گالہہ نہیں کی۔ پر مجھے سب کچھ پتہ چل گیا۔" اس کا رویہ اور سخت ہو گیا۔ "میں اتنا چوکنا نہ رہوں تو فیر چل چکی سرداری۔"

"تب تو یہ بھی تجھے پتہ ہو گا کہ میں اپنی مرضی سے مرجان سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اس نے ہی مجھے اپنے پاس بلوایا تھا۔" رحیم داد کا انداز اب مدافعانہ تھا۔

"تو بھول رہا ہے۔ یہ گالہہ تو نے پہلے بھی مجھے بتائی تھی۔" سردار شہ زور خان مزاری نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "تجھے مجھ سے گلہ ہے اور تو مجھ سے ناراض بھی ہے۔ پر مجھے بھی تجھ سے گلہ ہے۔ تو چھپ کر مرجان سے ملنے کیوں گیا؟ تو میرا یار ہے۔ تجھے اس سے کیا لینا تھا۔ تجھے پتہ تھا کہ اس نے مجھ تک کیا، بدنام کیا۔ میری ناک پر کالک لگا دی۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اس نے اظہار ندامت کے بجائے دفاعی حربہ آزمایا۔ "تو نے میری حرکت پر برا منایا تھا تو پہلے اس کا گلہ کیوں نہ کیا؟ تب تو چپ کر کے رہ گیا۔" اس نے سردار مزاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تو نے تو برا منانے کی بجائے

جائیداد اپنے نام کرانے کے لیے جھٹ دستاویز تیار کروائی۔ اس پر دستخط لینے کے لیے مجھے مرجان کے پاس بھیجا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تجھے کیا پتہ دستاویز پر دستخط لینے کے لیے میں نے کس طرح مرجان کو راضی کیا۔ وہ آسانی سے دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔" شہ زور کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"تو وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو نے بہت برا کیا۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تجھے ایسا کرنا بھی تھا تو کسی اور کو اس کام پر لگایا ہوتا۔ مجھ سے یہ کام نہ لیا ہوتا۔ تجھے پتہ نہیں مجھے کتنا دکھ پہنچا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے' مجھے تجھ سے ایسا کام نہیں کرانا چاہیے تھا۔" سردار مزاری نے معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو خود کو اب پریشان نہ کر۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔"

"کیا ٹھیک ہوا؟" رحیم داد تڑپ کر بولا۔ "تو اسے معافی دے دیتا' اس کا خون نہ کرتا تو تیرا کچھ نہ جاتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔ آنکھوں میں جھلملاتے چراغ دھندلے پڑ گئے۔ "وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔"

"لگتا ہے تجھے اس سے بہت ہمدردی ہے۔" سردار مزاری نے کہا۔ "تو اس سے پرنا کرنا چاہتا تھا۔ اپنی رن بنانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔ ساتھ ہی صفائی بھی پیش کی۔ "تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے پیار شیار تھا' تو یہ ٹھیک نہیں۔ میں تو اسے صرف اس لیے اپنی گھر والی بنانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی بچ جائے اور اس کی جائیداد تجھے مل جائے۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تو بالکل سچ کہہ رہا ہے۔" سردر مزاری نے اس کی نیک نیتی کے بارے میں کسی شک کا اظہار نہ کیا۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے تو بہت نیک بندہ ہے۔ دل بھی تیرا بہت نرم ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "پر تجھے یہ پتہ نہیں وہ کتنی مکار اور فریبی تھی۔ تو اس کی چترائی اور چالاکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "وہ تجھے اور مجھے' دونوں کو دھوکا دینا چاہتی تھی۔ تیرے سامنے خوب ٹسوے بہائے۔ منت اور زاری کی۔ تیرا دل پگھل گیا۔ تو نے اس کی باتوں کو سچ مان لیا۔"

"یہ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ وہ میرے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ منت سماجت بھی کی۔" رحیم

داد نے سردار مزاری کی تائید کی۔

"سیں چوہدری، جھگڑا صرف جائیداد کا نہیں۔ مرجان نے مجھے تنگ کیا۔ میری ناک پر سیاہی مل دی۔" سردار مزاری نے وضاحت کی۔ "میں اپنی ناک صاف کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے مجھے یہ معاملہ جرگے کے سامنے پیش کرنا پڑا۔"

رحیم داد نے مداخلت نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مزاری بتاتا رہا۔ "میں چاہتا تو دونوں کو تب ہی ختم کر دیتا جب میں نے گیدڑوالا میں ان کو پکڑ لیا تھا۔ میں ان کا خون کر دیتا تو بلوچوں کے کانون کی رو سے یہ ہرگز جرم نہ ہوتا۔ پر میں چاہتا تھا کہ دونوں کو ان کے جرم کی سزا جرگے کی جانب سے ملے۔ صرف اسی طرح میں اس بدنامی اور رسوائی کی کالک صاف کر سکتا تھا جو اس نے میری پیشانی پر لگائی تھی۔ جرگے کے فیصلے کے بعد اب کوئی میرے خلاف یہ توالزام نہیں لگائے گا کہ میں نے جائیداد ہتھیانے کے لیے اس کا اور سہراب کا خون کیا۔"

"جرگے نے کیا فیصلہ دیا تھا؟" رحیم داد کے انداز میں تجسس تھا۔

"وہ تو سیں تو نے دیکھ ہی لیا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "جرگے میں دونوں کے خلاف سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ جرگے نے مرجان کو کالی اور سہراب کو کالا مان لیا۔ بلوچ کانون کی رو سے کالی کی سزا یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ کالے کو کوئی بھی پھانسی پر چڑھا سکتا ہے۔ دونوں کے بارے میں جو فیصلہ ہوا وہ سارے معتبروں کا فیصلہ ہے۔ معتبر اپنے اپنے کیلوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کا فیصلہ سب کو ماننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کے خلاف نہیں بول سکتا۔"

"جو بھی تو نے کیا، اپنے تئیں ٹھیک ہی کیا۔" رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ ایسا نہ ہوتا تو بہت ٹھیک تھا۔"

"تو سمجھتا ہے کہ مرجان سے نکاح پڑھانے کے بعد تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور کوٹلہ ہرکشن میں اپنی رن بنا کر رکھتا اور وہ تیرے ساتھ آرام سے رہتی؟"

"کیوں نہیں رہتی؟ کس کے پاس جاتی؟ کہیں بھی تو اس کا ٹھکانا نہیں تھا۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "ویسے میں نے اس کی مرضی ملوم کر لی تھی۔ وہ مجھ سے ویاہ کرنے اور میری گھر والی بننے کے لیے بالکل رضامند تھی۔"

"ہرگز رضامند نہ تھی۔ بالکل جھوٹ بول رہی تھی۔" سردار مزاری نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے پتہ ہے وہ تیرے ساتھ نکاح پڑھا لیتی۔ تیرے ساتھ گھر والی بن کر کوٹلہ ہرکشن بھی چلی

جاتی۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہویدا ہوا۔ "پر ایک روز چپکے سے تیری حویلی سے نکلتی اور سیدھی ممدوٹوں کے پاس لہور پہنچتی۔ وہ اسے پوری حفاظت کے ساتھ لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچا دیتے۔"

"ایسا کر کے اسے کیا ملتا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "ویسے بھی وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ دستاویز پر دستخط کرنے اور مجھ سے نکاح کرنے کے بعد وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔"

"وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔" سردار مزاری نے ہنس کر کہا۔ "سیں چوہدری' تجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہ لغاریوں کی مدد سے میرے اور تیرے دونوں کے خلاف پولیس میں پرچہ چاک کراتی۔ یہ الزام لگاتی کہ میں نے ڈرا دھمکا کر زبردستی دستاویز پر دستخط کرائے اور جائیداد ہتھیالی۔ تجھ پر وہ میرے ساتھ سازباز کرنے اور جبری نکاح کرنے کا الزام لگاتی۔"

"کیا وہ ایسا بھی کر سکتی تھی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

"وہ بالکل ایسا کر سکتی تھی۔" مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اور ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ راز کسی اور نے نہیں بتایا خود مرجان نے بتایا اور پھانسی پر لٹکنے سے پہلے بتایا۔"

"کیا کہتی تھی وہ؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

سردار مزاری نے تفصیل سے بتایا۔ "پھانسی کا پھندا گردن میں ڈالنے سے پہلے وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ چیخ چیخ کر معتبروں سے کہنے لگی۔ جرگے کے سامنے مکدمہ پیش نہ ہوتا اور مجھے معاف کر دیا جاتا تو میں شہ زور اور اس کے یار چوہدری' دونوں کو عدالت میں بلاتی۔ سہراب کا خون کرنے اور جائیداد پر کبضہ کرنے کے لیے اسٹامپ پر زبردستی دستخط کرانے کا الزام لگاتی۔ پورا پورا بدلہ لیتی۔ پر میں ہار گئی۔ میں اپنا بدلہ نہ لے سکی۔" سردار شہ زور مزاری نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "فیر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"

رحیم داد پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ حیران و پریشان نظر آرہا تھا۔ مزاری بھی خاموش رہا۔ رات اور سنسان ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سردار مزاری نے پہلو بدلا۔ مسکرا کر بولا۔ "تو پریشان نظر آرہا ہے۔ اب تو آرام کر۔ نمیسو کی رن تیرے پاس آجائے گی۔ تیری ساری پریشانی جاتی رہے گی۔"

اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر رحیم داد نے روک دیا۔ "شہ زور' تو میری اک بات مان لے گا؟"

"بتا' کیا کہنا چاہتا ہے۔؟" مزاری نے مستعدی سے کہا۔

"ہاتو کا اونٹھ مل جانے کی بعد یہ تو ثابت ہو گیا کہ لنگر نے چوری نہیں کی تھی۔"

"ہاتو کا اونٹھ مل جانے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ لنگر نے چوری نہیں کی تھی۔" شہ زور نے

رحیم داد کی دلیل مسترد کر دی۔ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ چوری کرنے کے بعد لنگر نے جس کے پاس اونٹھ چھپا کر رکھا تھا اس نے سزا کے ڈر سے اسے چھوڑ دیا ہو اور وہ ہاتو کے پیئو کو مل گیا۔ جب تک پوری تفتیش نہ کی جائے' تب تک ٹھیک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "لنگر کی گالہہ چھوڑ' صاف' صاف بتا تو چاہتا کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں تو نمیسو اور جلاوت کو معافی دے دے۔ ان کے بال بچوں کو چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے گھر چلے جائیں۔" رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

"تو کہتا ہے تو دونوں کو معافی دے دوں گا۔" سردار مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو خوش ہو جا۔ تجھے یار کہا ہے تو تیری بات بھی ماننی پڑے گی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "مجھے جانا ہے۔ جلاوت کی رن میرا انتظار کرتی ہو گی۔"

سردار مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مزید روکنے کی کوشش نہ کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اٹھ کر بستر پر نہ گیا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔

☆

تاریکی میں ایک پرچھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ نمیسو کی بیوی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ پریشان اور گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سیں تو نے اپنی کھٹ یہاں کیوں ڈلوائی؟" نمیسو کی بیوی نے ایک ہاتھ اٹھایا اور درختوں کے جھنڈ کی جانب اشارہ کیا۔ "ادھر ملوک زادی اور سہراب کے مردوں کو نہلایا جا رہا ہے۔"

رحیم داد نے گردن موڑ کر اس سمت نظر دوڑائی۔ درختوں تلے لالٹین کی دھندلی روشنی میں انسانی سائے ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ پانی گرنے کی آواز ابھری رہی تھی۔ رحیم داد نے نمیسو کی بیوی کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "سیں' تو نے نمیسو کو معافی دلانے کو کہا تھا۔ تو نے سردار سے بات کی تھی؟" اس کی نظروں میں التجا تھی۔ "سیں تو اسے معافی دلوا دے۔ بھلی ہو گی۔ سیں توں سدا جیودی۔ سکھی صحت ہووی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"نمیسو اور جلاوت کو معافی مل جائے گی۔ کل تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ جلاوت کی گھروالی بھی چلی جائے گی۔ سردار نے معافی دینے کا مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"سیں' تو سچ کہہ رہا ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ رحیم داد کو اس طرح

دیکھنے لگی جیسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ بے قرار ہو کر بولی۔ "سئیں ٹھیک ٹھیک بتا۔ سردار نے وعدہ کرلیا ہے؟"

"میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔" رحیم داد نے اسے باور کرایا۔ "تمیسو اور جلاوت کو اب نہ ہاتو کے لیے اوٹھ کا بندوبست کرنا پڑے گا نہ سردار کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "سئیں تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ ویران آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس میں عشوہ تھا۔ لگاوٹ تھی۔ "سئیں تو کمرے کے اندر چل۔ میں کھٹ اندر ڈال دوں گی۔ تیرے ہی پاس رہوں گی۔"

"مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔" رحیم داد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو اپنے نکے کے پاس جا۔ وہ بھوکا ہوگا۔ جلاوت کی گھر والی کو بھی بتا دینا۔"

"وہ تو سردار کے کمرے میں ہے۔ سویرے اسے بتا دوں گی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر وہ خاموش نہ رہی۔ "سئیں تو ناراض تو نہیں ہے؟" اس نے عاجزی سے کہا۔ "میں اب جاؤں؟"

"ہاں، اب تو ٹر جا۔" رحیم داد نے بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

تمیسو کی بیوی آگے بڑھی۔ برآمدے سے نیچے اتری اور نوکروں کی کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داد بت بنا چپ بیٹھا رہا۔ ہوا میں تیزی تھی۔ خشک پتے ہولے ہولے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ فضا میں کافور کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مڑ کر درختوں کی جانب دیکھا۔ اندھیرے میں لالٹین کی روشنی زرد دھبے کی مانند نظر آرہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے بار بار لالٹین کی لو بھڑکتی۔ درختوں کے نیچے رکھے ہوئے جنازوں کا اجلا اجلا کفن کبھی نمایاں ہو جاتا کبھی دھندلا پڑ جاتا۔ ان میں ایک مرجان کا جنازہ تھا اور دوسرا سہراب کا۔ مرجان کالی قرار دی گئی تھی اور سہراب کالا۔ دونوں کو سیاہ کاری کے جرم میں جرگے کے حکم پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کفن میں لپٹی ہوئی ان کی لاشیں لالٹین کی دھندلی روشنی میں دور سے نظر آرہی تھیں۔

رحیم داد اس طرح زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ پریشان ہو کر اٹھا۔ کمرے کے اندر گیا۔ اس نے لباس تبدیل کیا۔ دھوتی باندھی اور برآمدے کی جانب بڑھا۔ مگر دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ جنازے اب چارپائیوں پر رکھے تھے۔ مزاری کے کارندے اور نوکر چاکر چارپائیوں کو کاندھوں پر اٹھائے

آہستہ آہستہ پھاٹک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک کارندہ ہاتھ میں لالٹین سنبھالے جنازوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ بستر کی جانب بڑھا اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

رات سخت ذہنی کرب کے عالم میں کٹی۔ صبح اس نے حسب معمول سردار مزاری کے ساتھ ناشتا کیا اور دھوپ کی تمازت بڑھنے سے پہلے ہی مزاری کے ہم راہ جیپ میں بیٹھ کر شاہ میر کی جانب روانہ ہو گیا۔

۳۱

رحیم داد بے زار اور اکتایا ہوا نظر آرہا تھا۔ شاہ میر پہنچنے کے چند ہی روز بعد سویرے ہی سویرے اس نے سردار شہ زور خان مزاری سے صاف صاف کہہ دیا۔ "مزاری' میں نے لہور جانا ہے۔ اب تیرے ساتھ نہیں ٹھیر سکتا۔"

سردار مزاری نے اس بار بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی' مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "لہور جانا ہے تو ضرور جا۔ میں کب کہتا ہوں نہ جا' پر میں نے بھی لہور جانا ہے۔ دونوں اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"تو بعد میں پہنچ جانا۔ مجھے جانے دے۔"

"میں نے ادھر شاہ میر میں کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ ان سے فارغ ہوتے ہی چل دوں گا۔" شہ زور مزاری نے اسے روکنے کے لیے عذر پیش کیا۔ "چند روز میں سارے کام نمٹ جائیں گے۔ تو چند روز بھی انتظار نہیں کر سکتا؟"

"میں لہور میں تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "میں نے شاہ جی سے مل کر لائل پور کی الاٹمنٹ کا فیصلہ کرانا ہے۔ تجھے پتہ نہیں ادھر کی زمین کتنی کام کی ہے۔ میں نے اسے اپنے نام الاٹ کرانا ہے اور فوری طور پر کرانا ہے۔"

"شاہانی بتاتا تھا' وہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ اس کے تو کئی دعویدار ہیں۔ اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔" سردار مزاری نے کہا۔ "جب تک ادھر کا فیصلہ ہو ادھر تجھے الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔ تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ اب تو الاٹمنٹ ملنے کا انتظار ہے۔ اس میں

زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ محکمہ بحالیات میں اوپر سے نیچے تک سارے ہی اپنے بندے لگے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر اور افسر مال سے بھی یاری ہے۔ کبضہ بھی جلد مل جائے گا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "ادھر کی الاٹمنٹ کا کام تو دیکھ لے گا۔ لائل پور کا معاملہ الجھا ہوا ہے۔ اس کے لیے مجھے خود جا کر کوشش کرانی ہو گی۔"

"ضرور کرانا۔ پر ادھر کی اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے تیرا یہاں موجود ہونا بھی ضروری ہے۔" سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں آج ہی چاکر خاں کو روانہ کرتا ہوں کہ وہ افسروں سے مل جل کر کم سے کم مدت میں الاٹمنٹ حاصل کر لے۔ تو چند روز ادھر آرام کر۔ اپنی اراضی کی الاٹمنٹ لے اور چلا جا۔ بعد میں چاکر تیری اراضی کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔" اس کے لہجے میں نرمی اور محبت کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔ "میری خوشی ہے تو ابھی نہ جا۔ دونوں اکٹھے چلیں گے۔ کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے۔"

رحیم داد نے مزاری کے مسلسل اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سردار مزاری نے خوش ہو کر فوراً چاکر خاں سرگانی کو بلایا اور اسے ڈیرہ غازی خاں شہر کی جانب روانہ کر دیا۔

رحیم داد کوٹ کے ڈیرے میں ٹھہرا رہا۔ شاہ میر پہنچتے ہی سردار شہ زور خاں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ روزانہ ہی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد کچہری لگاتا۔ کچہری کا بندوبست عام طور پر مہمان خانے کے اس وسیع اور کشادہ کمرے میں کیا جاتا جو روشن اور ہوادار بھی تھا۔ اس کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ زیادہ گرمی اور حبس ہوتا تو کچہری درختوں تلے لگتی۔ سردار مزاری اونچے اور چوڑے چھلکے پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ کوئی بانھایا کراوا اس کے پیروں اور کمر کے گرد خیری لپیٹ کر زانو بندی کر دیتا۔

کچہری میں طرح طرح کے مقدمات پیش کیے جاتے۔ سردار مزاری مقدمے کی کارروائی کے دوران حسب معمول سنجیدہ رہتا۔ اس کے چہرے پر رعب و دبدبہ چھایا ہوتا۔ وہ فریقین کے بیانات پوری توجہ سے سنتا۔ گواہوں پر جرح کرتا۔ مقدمہ سمجھنے اور اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی حتی الوسع کوشش کرتا۔ فیصلہ سنانے سے قبل کچھ دیر مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا۔ اس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ ہر فریق کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کوئی فریق اس کے فیصلے کے خلاف سرکاری عدالت سے رجوع کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اگر کوئی ایسی جرات کرتا تو حکم عدولی اور نافرمانی کے الزام میں اس کے خلاف قبائلی قوانین کے مطابق مقدمہ چلایا جاتا اور کڑی سزا دی جاتی۔

کچہری، سردار شہ زور مزاری کی آمدنی کا نہایت اچھا اور معقول وسیلہ تھی۔ وہ مقدمات کی باقاعدہ فیس وصول کرتا اور جرمانے کی رقم بھی۔ سردار مزاری دوپہر تک کچہری لگاتا۔ پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے حویلی کے اندر چلا جاتا۔ شام کو پینے پلانے کا شغل ہوتا۔ دوست احباب اور سرکاری افسر آجاتے تو جوا بھی ہوتا۔ رات گئے تک اس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ہزاروں روپے ادھر سے ادھر ہو جاتے۔

رحیم داد، دل بہلانے کے لیے کچہری میں جا کر بیٹھ جاتا۔ مقدمات کی کارروائی دلچسپی سے سنتا۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپی سے فیصلے سنتا۔ مقدمات کی طرح فیصلے بھی عجیب وغریب ہوتے۔ ان کے ذریعے رحیم داد کو بلوچوں کے روایتی قوانین اور ان کے قبائلی رسم و رواج سمجھنے کا موقع ملتا۔

چاکر خان سرگانی، ڈیرہ غازی خاں شہر سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ رحیم داد کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی کا الاٹ منٹ حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ حکام اور سرکاری اہل کاروں سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ فائلوں کو ایک شعبے سے دوسرے شعبے تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش میں لگا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں کچہری کا انتظام و انصرام، کمدار وحدت خاں گورچانی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ پیش کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ مقدمات کی فیس اور جرمانوں کی رقم وصول کرتا تھا۔ رجسٹر میں باقاعدہ اس کا اندراج کرتا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن پرانا ملازم تھا۔ کمدار کی حیثیت سے کام کرتے کرتے زمین داری کے امور کے ساتھ کچہری کے معاملات بھی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگا تھا۔ وہ سردار شہ زور مزاری کا مزاج بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کی نظریں پہچانتا تھا۔

ایک صبح کچہری لگی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے میں موجود تھا۔ سردار مزاری، پلنگ پر و۔لٹھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی طبیعت قدرے مکدر تھی۔ رات اس نے کچھ زیادہ ہی شراب نوشی کی تھی۔ اور قمار بازی میں ہارا بھی زیادہ تھا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور شب بیداری کے اثرات ہویدا تھے۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ ہونٹ خشک تھے۔ مقدمات کی کارروائی کے دوران بار بار پانی پیتا۔ ایک ملازم پشت پر کھڑا نہایت مستعدی سے پنکھا جھل رہا تھا۔ قریب ہی کمدار وحدت خاں ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دو ماتحت کراوے دروازے کے دائیں بائیں چاق چوبند کھڑے تھے۔

مقدمات کی سماعت جاری تھی۔ سردار شہ زور خاں مزاری، فریقین کے بیانات سن رہا تھا۔ گواہوں پر جرح کر رہا تھا۔ اور بیانات اور جرح کی روشنی میں قبائلی قوانین اور ضابطوں کے

مطابق فیصلے کر رہا تھا۔ عام طور پر وہ فریقین کے مابین صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا۔ جرم سنگین نوعیت کا ہوتا تو جرمانہ عائد کرتا۔ زیادہ سنگین ہوتا تو جرمانے کے ساتھ ساتھ قید کی سزا بھی دیتا۔

کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ خلاف معمول خاموشی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک بوڑھی بلوچ عورت اپنا مقدمہ پیش کرنے کی غرض سے داخل ہوئی۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ سر کے بال بھی میلے چیکٹ تھے۔ جسم سے پسینے کی بو کے تیز بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھی اور سردار مزاری کے روبرو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

سردار مزاری نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ بوڑھی عورت نے گڑگڑا کر فریاد کی۔ "سیں سردار سدا جیویں۔ سکھی صحت ہوویں۔ سیں! میں لٹ گئی۔ تباہ ہو گئی۔ میں فریادی ہوں۔ تیرے پاس نروار کے لیے آئی ہوں۔ مجھے پکا یقین ہے' تو میرے ساتھ نیائے کرے گا۔ توں ضرور نیائے کرے گا۔"

"تیرے ساتھ پورا پورا نروار اور انصاف ہو گا۔" سردار مزاری نے بوڑھی بلوچ عورت کو یقین دلایا۔ "پروانہ کر۔ صاف صاف بتا' تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا۔ کس نے ظلم کیا؟ بے دھڑک اپنا بیان پیش کر۔"

"سیں! میرے گھر والے کا مدت ہوئی مرن ہو گیا۔ تب سے میں رنڈیوہ ہوں۔" بوڑھی عورت نے گلوگیر لہجے میں اپنا بیان شروع کیا۔ "میری صرف ایک ینگر دھی ہے۔ اس کا ابھی پرنا نہیں ہوا۔ کنواری ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ "سیں! میری دھی کو اغوا کر لیا گیا۔ اٹھا لیا گیا۔ چار روز سے وہ اسی کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تنگ کر دیا۔ بے عزتا کر دیا۔ توں اسے سزا دے کر میری تنک صاف کر دے' کالک کا داغ مٹا دے۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ "سیں سردار! میرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں مصیبت کی ماری ہوں۔ غریب ہوں۔ حلیم ہوں۔ سیں میرا کوئی بھی نہیں۔"

بوڑھی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سردار مزاری اس کی آہ و زاری سے بہت متاثر ہوا۔ نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔ "صبر کر' صبر کر۔ تجھے پتہ ہے' اسے کون اغوا کر کے لے گیا؟"

"سیں' میں نے پتہ ہے۔ اچھی ناں رح پتہ ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

سردار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے؟"

"سیں سردار! وہ چک رحمان کا بدھیل خاں ہے۔" بوڑھی بلوچ عورت نے بتایا۔ "میرے گھر والے کا ہتریجا ہے۔ اس طرح وہ میرا ایک شلوار ہوتا ہے۔ بہت نزدیک کا رشتہ سانگا ہے۔"

بدھیل' کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ وہ بدھیل کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس حقیقت سے بخوبی واقف

تھا کہ وہ شہ زور خان مزاری کا بہت وفادار اور جانثار تھا۔ قابل اعتماد تھا۔ رازدار تھا۔ سہراب اور مرجان کی گرفتاری میں اس نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ایسا زبردست کارنامہ انجام دیا تھا کہ شہ زور مزاری کا بدنامی اور خجالت سے جھکا سر اونچا ہو گیا۔ اس کا دبدبہ اور وقار بحال ہو گیا۔

رحیم داد نے غور کیا' سردار مزاری کا چہرہ بھی دم بھر کے لیے متغیر ہو گیا۔ مگر بوڑھی بلوچ عورت رحیم داد کے ذہنی خلفشار اور سردار مزاری کے چہرے کے تاثرات سے بے نیاز' بدھیل خاں کے خلاف بولتی رہی۔ "سیں! سب کو پتہ ہے۔ 'میری دھی اب تک اس کے گھر میں ہے۔"

"تو نے اپنی دھی کو واپس لانے کی کوشش کی؟" سردار مزاری نے دریافت کیا۔ "تو بدھیل کے گھر گئی تھی۔"

"سردار! میں اس کے گھر گئی تھی۔" عورت نے جواب دیا۔ "پر اس نے ساوَنی کو واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "سیں' میری دھی کا ناں ساوَنی ہے۔ بدھیل کے لیے تو وہ رشتے کے اعتبار سے نیاڑی ہے۔ تجھے پتہ ہے' نیاڑی کے ساتھ لک چھپ کے یاری لگانا بلوچوں میں حرام سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے ورغلا کر لے جانا کتنا وڈا جرم ہوتا ہے۔ تو بلوچ سردار ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے ناں؟"

"یہ بتا' جب تو بدھیل کے گھر ساوَنی کو لینے گئی تو اس نے تجھے کیا کہا؟" سردار مزاری نے سوال کیا۔

"سیں' وہ بہت ناراض ہوا۔" بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ "چیخ کر بولا' ساوَنی یہاں سے نہیں جائے گی۔ کوئی اسے نہیں لے جا سکتا۔" بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکی۔ "سیں! اس نے تو یہ بھی کہا۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں سردار کا لاڑلا ہوں۔ میں اس کا..."

"بکواس نہ کر۔" سردار شہ زور مزاری نے جھنجلا کر ڈانٹا۔ "وہ ہرگز ایسی گالہ نہیں کہہ سکتا۔" اس کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ "کوئی میرا لاڑلا شاڑلا نہیں۔"

بوڑھی عورت خوف سے زرد پڑ گئی۔ گھگیا کر بولی۔ "سیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔" اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "میں نے تو اپنی ساوَنی واپس لینی ہے۔ میں نے بدھیل سے کیا لینا۔ توں نیائے کر۔ میرے ساتھ انصاف کر۔" وہ گڑگڑا کر دعائیں دینے لگی۔ "سیں سردار سدا جیویں' رب راضی ہووے۔ میں صدکے ونجاں۔"

"تیرے ساتھ انصاف ہو گا۔ پورا انصاف ہو گا۔" مزاری نے ایک بار پھر اسے یقین دلایا۔ عورت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموش کھڑی رہی۔ سردار مزاری نے مڑ کر وحدت خاں

گورچانی کی جانب دیکھا۔ "وحدت' کل صبح بدھیل کو ساوَنی کے ساتھ پکڑ کر کچہری میں پیش کیا جائے۔" وہ بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب تو جا۔ کل بدھیل اور ساوَنی کے ساتھ تیری بھی پیشی ہوگی۔"

بوڑھی عورت دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

سورج اب آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ گرمی اس روز کچھ زیادہ ہی تھی اور سردار مزاری کی طبیعت بھی مضمحل تھی۔ لہٰذا کچہری' معمول سے کچھ پہلے ہی برخاست کر دی گئی۔

دوسرے روز کچہری لگی۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ وحدت خان گورچانی نے بدھیل کو سردار مزاری کے روبرو پیش کیا۔ ساوَنی کی بوڑھی ماں بھی موجود تھی۔ شہ زور مزاری کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سنجیدگی چھائی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بدھیل خان جب سامنے آیا تو اس نے نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کو دیکھا اور گردن اٹھا کر دیوار کو تکنے لگا۔ وہ انگلیوں سے آہستہ آہستہ مونچھیں مروڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سردار مزاری کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ "بدھیل۔" اس نے بوڑھی عورت کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس ڈال کو جانتا ہے؟"

بدھیل نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔ مگر ساوَنی کی ماں خاموش نہ رہی۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ "کیوں نہیں جانتا؟ بالکل جانتا ہے۔ سیں سردار' یہ تو۔"

سردار مزاری نے اسے آگے نہ بولنے دیا۔ غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ "بڈھڑی' چپ کر کے کھڑی رہ۔ جب تجھ سے پوچھا جائے تب بول۔" ساوَنی کی ماں ڈانٹ سن کر سہم گئی۔ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگی۔

مزاری نے مڑ کر بدھیل کی جانب دیکھا۔ "اس ڈال نے تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام لگایا ہے۔ اپنے بیان میں کہا ہے تو اس کی دھی' ساوَنی' کو اٹھا کر لے گیا۔ وہ ابھی تک تیرے پاس ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تو اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"سیں سردار' میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔" بدھیل نے اپنی صفائی میں کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ساوَنی سے میں پیار کرتا ہوں۔ اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ پرنا کرنا چاہتا تھا۔" اس نے نظریں موڑ کر بوڑھی کو دیکھا۔ "میری ماں اس کے پاس بازو منگن کے لیے گئی۔ میں بھی گیا۔ ایک بار نہیں بار بار گیا۔ اس کی منت کی۔ زاری کی پر اس نے

ہر باری میری منت کو ٹھکرا دیا۔ میرے ساتھ ساوَنی کا پرنا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

ساوَنی کی ماں نے تیکھی نظروں سے بدھیل کو دیکھا۔ مگر خاموش رہی۔ بدھیل خان سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "سئیں، سچی گالہہ یہ ہے کہ یہ ایک بڈھے سے ساوَنی کا پرنا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا ناں، تاج محمد ہے۔ وہ میران پور کا سنارا ہے۔ اس کے پاس بہت مال متال ہے۔ یہ ساوَنی کے لیے اس سے دو ہزار روپے لے رہی تھی۔"

بوڑھی عورت کے لیے اب غصے پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ تلملا کر بولی۔ "سئیں، اس سے پوچھ، یہ میرا کیا لگتا ہے؟ ساوَنی، میری دھی ہے۔ میری جس سے مرضی ہو گی اس کے ساتھ ساوَنی کا پرنا کروں گی۔ یہ کون ہوتا ہے؟ یہ ساوَنی کو اٹھا کر کیوں لے گیا؟"

"سئیں سردارا، یہ بالکل غلط کہہ رہی ہے۔ میں ساوَنی کو اٹھا کر نہیں لے گیا۔" بدھیل نے فوراً تردید کی۔ "ساوَنی اپنی مرضی سے چل کر میرے گھر آئی تھی۔"

"سئیں، یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔" بوڑھی عورت کے لہجے میں تلخی اور جھنجلاہٹ تھی۔ "یہ ادوھ پر بیٹھ کر اندھیرے میں میرے گھر آیا۔ اور ساوَنی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ ساوَنی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔" سردار مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں ساوَنی کی ماں سے دریافت کیا۔ "کیا ساوَنی نے تجھے ایسا کہا ہے؟"

"نا سئیں۔" بوڑھی عورت نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میں اس کے گھر گئی تھی۔ پر اس نے مجھے ساوَنی سے ملنے ہی نہیں دیا۔ اس کی ماں نے اسے گھر کے اندر بند کر رکھا ہے۔ کسی سے اسے ملنے نہیں دیتی۔"

"سئیں سردار، یہ بالکل جھوٹ بول رہی ہے۔" بدھیل خاں نے صفائی پیش کی۔ "ساوَنی کو میری اماں نے کہیں چھپا کر نہیں رکھا۔ جب یہ میرے پاس آئی تو ساوَنی میرے گھر میں تھی ہی نہیں۔"

"کہاں ہے وہ؟" سردار مزاری نے بدھیل سے سوال کیا۔

"سئیں سردار، مجھے کچھ پتہ نہیں، وہ کہاں ہے۔" بدھیل نے بتایا۔

ساوَنی کی ماں تڑپ کر بولی۔ "سئیں، یہ فریبی ہے۔ بالکل جھوٹا ہے۔ اسے سب پتہ ہے، ساوَنی کہاں ہے۔ وہ اس کے گھر ہی میں ہے۔"

سردار شہ زور خاں مزاری نے بوڑھی عورت کو نظرانداز کرتے ہوئے مڑ کر وحدت خاں گورچانی کی طرف دیکھا۔ "وحدت! کل تجھے حکم دیا گیا تھا کہ بدھیل کے ساتھ ساوَنی کو بھی پیش کیا جائے۔ تو اسے کیوں نہیں لایا؟" اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔ "وہ کیوں نہیں آئی؟ کدھر ہے وہ؟"

"سیں سردار' میں بدھیل کے گھر خود گیا تھا۔" وحدت خان نے وضاحت کی۔ "پر ساوَنی وہاں نہیں تھی۔"

"تو نے گھر کی تلاشی لی تھی؟" سردار مزاری نے سوال کیا۔

"میں نے گھر کی پوری تلاشی لی تھی۔ جب ساوَنی وہاں نہیں ملی تو اسے ڈھونڈنے کی ہر جگہ کوشش کی۔ پر اس کا کچھ سراغ نہیں ملا۔"

"سیں' اس نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔" ساوَنی کی ماں نے بدھیل کی طرف غصے اور نفرت سے دیکھا۔ "اسے پتہ ہے وہ کہاں ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ گڑگڑانے لگی۔ "سیں' مجھے میری ساوَنی دلوا دے۔ میں غریب ہوں۔ حلیم ہوں۔ رنڈیوہ ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ میرے ساتھ نیائے کیا جائے۔ توں سردار ہے۔ مالک ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر کر۔ تسلی رکھ۔" سردار مزاری نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تیرے ساتھ نیائے ہوگا۔ پورا پورا انصاف ہوگا۔"

بدھیل کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے منڈلانے لگے۔ ساوَنی کی ماں دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ پھر سردار مزاری کی آواز ابھری۔ اس نے وحدت کو مخاطب کیا۔

"وحدت! ساوَنی کو پوری طرح تلاش کر۔ جہاں بھی ملے پکڑ کر پیش کیا جائے۔ جب تک وہ برآمد نہ ہو' تب تک بدھیل کیدی رہے گا۔ اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔"

یہ حکم صادر کرنے کے بعد مقدمے کی کارروائی آئندہ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔

☆

ساوَنی کچہری میں حاضر تھی۔ اس کی ماں بھی موجود تھی۔ بدھیل بھی تھا۔ ساوَنی جوان تھی اور خوش شکل بھی تھی۔ قد نکلتا ہوا تھا' جسم چھریرا تھا۔ رنگ اجلا تھا۔ مگر غذائیت کی کمی اور سخت مشقت کے باعث زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور ملگجا تھا۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے چہرے کا نصف سے زائد حصہ چھپائے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

مقدمے کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے وحدت خان گورچانی نے ساوَنی کو پیش کیا۔ ہاتھ کے اشارے سے سردار شہ زور مزاری کو آگاہ کیا۔ "سیں سردار' یہ ساوَنی حاضر ہے۔"

"تو نے اسے کہاں سے برآمد کیا؟" مزاری نے دریافت کیا۔

وحدت نے بتایا۔ ”آج صبح یہ خود ہی حاضر ہو گئی۔“

مزاری نے نظر بھر کر ساوَنی کو دیکھا' پوچھا۔ ”تیرا ناں' ساوَنی ہے؟“

”ہا سیں!“ ساوَنی نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

”تو اب تک کہاں تھی؟“ مزاری نے سوال کیا۔

”میں اپنی سوتر کے پاس تھی۔“ ساوَنی نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”وہ چک سلیم میں رہتی ہے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کا گھر والا بھی نیک بندہ ہے۔ دونوں نے مجھے بہت آرام سے رکھا۔“

”تو اس کے پاس کیوں گئی؟“

”ماں کے ڈر سے گئی تھی۔ وہ ناراض ہوتی۔ مجھے مارتی پیٹتی۔“ ساوَنی نے سردار مزاری کو مطلع کیا۔

”بدھیل کو پتہ تھا تو اپنی سوتر کے گھر میں ہے؟“

”نا سیں!“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”میں کسی کو بتائے بنا' ایک شام چپ چپاتے اس کے پاس چلی گئی تھی۔“

”سیں سردار' یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ ساوَنی کی ماں نے مداخلت کی۔ ”اسے بدھیل نے ادھر پہنچایا ہوگا۔ ایسے ہی وہ اسے اٹھا کر بھی لے گیا تھا۔“

سردار مزاری نے اس کی مداخلت کو پسند نہ کیا۔ قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ساوَنی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ساوَنی' تیری ماں کہتی ہے بدھیل تجھے زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“

ساوَنی کچھ نہ بولی۔ گردن جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ کچہری میں موجود ہر شخص کی نظریں ساوَنی کی جانب اٹھی تھیں۔ چہروں پر تجسس کے تاثرات ہویدا تھے۔

جب ساوَنی نے دیر تک سوال کا جواب نہ دیا تو سردار شہ زور نے نرمی سے اصرار کیا۔ ”ڈر نہیں' سچ' سچ بتا۔“

ماں نے بھی پچکار کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ساوَنی' توں سردار سے صاف صاف بتا دے' بدھیل تجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اپنے گھر میں بند رکھا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا ناں؟“

ساوَنی نے ماں کی جانب توجہ نہ دی۔ نظریں اٹھا کر مزاری کی جانب دیکھا اور انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔

”خالی گردن نہ ہلا۔“ مزاری نے ڈپٹ کر کہا۔ ”جو کچھ کہنا ہے' زبان سے کہہ اور ٹھیک ٹھیک

بیان کر۔"

"میں اپنی مرضی سے بدھیل کے گھر گئی تھی۔" ساوَنی کی آواز کپکپا رہی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "سَیں' اس نے مجھے اٹھایا نہیں۔"

"سردار' یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ صاف صاف جھوٹ بول رہی ہے۔" ماں نے گلوگیر لہجے میں احتجاج کیا۔ "بدھیل نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے۔"

مزاری نے ساوَنی سے سوال کیا۔ "کیا تیری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے؟ بدھیل نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے؟"

"نا سَیں!" اس بار ساوَنی کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ "بدھیل نے مجھے بالکل ڈرایا دھمکایا نہیں۔ میں اس کے ساتھ راضی باضی تھی۔" بات کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے چھلکتی آنکھوں سے سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ "سَیں' میں تاج محمد سے پرنا کرنا نہیں چاہتی۔ ماں اس کے ہاتھ مجھے بیچ دینا چاہتی ہے۔ وہ بڈھا کھوسٹ ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے۔"

ماں غصے سے دانت پیستی ہوئی ساوَنی پر جھپٹی' اس کی پیٹھ پر زور سے دوہتڑ مارا اور سر کے بال نوچنے کھسوٹنے لگی۔ چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔ شہ زور خان مزاری کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے خونخوار نظروں سے بوڑھی عورت کو دیکھا۔ جھنجلا کر ڈانٹا۔ "الگ ہٹ۔ چپ کر کے کھڑی ہو۔ آگے تو نے ایسی حرکت کی تو کچہری سے باہر نکال دوں گا۔ جرمانہ ڈال دوں گا۔"

ساوَنی کی ماں' سردار مزاری کو غصے کے عالم میں دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے ساوَنی کے بالوں کو چھوڑ دیا۔ اور روتے ہوئے بولی۔ "سَیں' میں لٹ گئی۔ میں برباد ہو گئی۔ بدھیل نے اس پر جادو ٹونا کر دیا ہے۔" اس نے ہاتھ سے ساوَنی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے اسے جنا ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا ہے۔"

"بہت بول چکی۔ بند کر اپنی بکواس۔" سردار مزاری نے ایک بار پھر برہم ہو کر اسے جھڑکا۔ "تو چپ کر کے کھڑی نہیں رہ سکتی؟ تجھے پتہ ہے' یہ کچہری ہے۔"

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ سردار مزاری نے گردن جھکائی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے پر چھائے ہوئے غصے اور جھنجلاہٹ کا غبار رفتہ رفتہ چھٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر ساوَنی کو دیکھا۔ اسے مخاطب کیا۔ "ساوَنی' یہ بتا تو بدھیل کے پاس

کتنے روز رہی تھی۔؟"

"دو روز۔" ساوَنی نے سردار مزاری سے نظریں ملائے بغیر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی۔

ساوَنی کی ماں ڈانٹ پھٹکار کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ "سَیں سردار' یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بوڑھی عورت نے نفرت سے ساوَنی کو دیکھا۔ "پر دو روز میں اس نے اپنی پت بگاڑلی۔" اس نے بدھیل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ساوَنی کو خراب کردیا۔ سَیں سردار یہ کالا ہے۔ اسے کڑی سزا ملنی چاہیے۔"

"اگر یہ کالا ہے تو ساوَنی بھی کالی ہوئی۔" سردار مزاری نے تیکھی نظروں سے ساوَنی کی ماں کو دیکھا۔ "تجھے پتہ ہے کالے اور کالی کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

ساوَنی کی ماں دم بخود رہ گئی۔ جھنجلاہٹ اور برہمی کے بجائے اس کے چہرے پر خوف اور سراسیمگی کے سائے پھیل گئے۔

رحیم داد کچہری میں موجود تھا۔ کالا اور کالی کے الفاظ سن کر وہ بھی پریشان ہوگیا۔ اسے اب اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ کالے کالی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ وہ سہراب اور مرجان کا ہولناک انجام دیکھ چکا تھا جن پر سیاہ کاری کے الزام میں مقدمہ چلا تھا اور جرگے نے کالا اور کالی قرار دے کر دونوں کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ رحیم داد نے بدھیل اور ساوَنی کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر اسے موت کے سائے منڈلاتے نظر آئے۔

سردار مزاری نے ساوَنی سے دریافت کیا۔ "سچ' سچ بتا' بدھیل نے تجھے خراب تو نہیں کیا؟"

"نا سَیں۔" ساوَنی نے شرما کر اٹکتے ہوئے بتایا۔ "میں بالکل ستھری ہوں۔ نیک مئی ہوں۔"

"کیا ثبوت ہے کہ بدھیل نے تجھے خراب نہیں کیا۔ تو کالی نہیں ہوئی؟" مزاری نے جرح کی۔

ساوَنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔ مزاری کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نظریں جھکائے فرش کو تکتی رہی۔ سردار مزاری گردن جھکا کر ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر ساوَنی کو دیکھا۔ لحہ بھر تک اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ مگر اس پر مزید جرح نہ کی۔ مڑ کر وحدت خاں گورچانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "وحدت!" اس نے ساوَنی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کوٹ میں رہے گی۔ اسے پرسوں کچہری میں پیش کرنا۔ فیصلہ بھی اسی روز سنایا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے سیں!" وحدت خاں گورچانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر دبی زبان سے دریافت کیا۔ "بدھیل کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

"اسے چھوڑ دیا جائے۔ اب یہ اپنے گھر جا سکتا ہے۔ اسے اگلی پیشی پر کچہری میں حاضر ہونا ہو گا۔" مزاری نے بدھیل کی رہائی کے لیے حکم جاری کیا۔

مقدمے کی کارروائی دو روز کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

☆

دوپہر کو رحیم داد نے شہ زور مزاری کے ساتھ کھانا کھایا۔ مگر مقدمے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ رات کو بھی نہیں ہوئی۔ دوسرے روز سردار مزاری نے کچہری نہ لگائی۔ رحیم داد سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔

دن ڈھلے رحیم داد نے معمول کے مطابق غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔

مہمان خانے کے وسیع صحن میں نوکروں نے مونڈھے ڈال دیئے تھے۔ چھڑکاؤ بھی کیا تھا۔ زمین سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

رحیم داد ایک مونڈھے پر جا کر بیٹھ گیا۔ شام کے سرمئی سائے در و بام پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمروں اور کوٹھریوں میں لیمپ اور چراغ روشن کر دیئے گئے تھے۔ مہمان خانے کے ایک گوشے میں باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے سے کھانوں کی خوشبو نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ موسم گرما کی یہ شام بوجھل اور بے کیف تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ رحیم داد بدن پر پسینے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سردار مزاری کا انتظار تھا۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ مگر شہ زور مزاری نہ آیا۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں بدھیل خاں آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ "بدھیل، تو ادھر کیسے آگیا؟"

"سیں، میں نے سردار سے ملنا تھا۔" بدھیل نے جواب دیا۔

"سردار، تجھے ملا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہا سیں۔ پر اس سے کوئی گالھ نہیں ہوئی۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے مجھے دیکھا پر کچھ بولا نہیں۔" بدھیل خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اپنے ماماں کے پاس روجھان گیا ہے۔ اس کا ماماں بیمار ہے۔"

"تو سردار سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟"

"سئیں، میں نے اسے یہ بتانا تھا کہ ساوُنی بالکل ستھری ہے۔ بے گناہ ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" بدھیل نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پر تو نے اسے گھر میں رکھا ہی کیوں؟"

"سئیں، میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ جب ساوُنی چھپ کر میرے گھر آئی تو میں گھبرا گیا۔ ماں نے بھی برا منایا۔ میں نے ساوُنی کو کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی جائے۔ پر وہ رونے لگی۔ بولی، میں نے ماں کے پاس واپس نہیں جانا۔ وہ مجھے تاج کے ہاتھ بیچ دے گی۔ سئیں، میں اسے اپنے گھر سے تو نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ میرے گھر میں پناہ مگن آئی تھی۔" بدھیل رک رک کر بولتا رہا۔ "ویسے سئیں، میں اس سے بہت پیار بھی کرتا ہوں۔"

"وہ بھی تجھ سے پیار کرتی ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"پیار نہ کرتی تو میرے گھر کیوں آتی۔ میں تو اس سے پرنا کرنا چاہتا تھا۔ پر اس کی ماں مجھ سے بھی دو ہزار روپے مانگتی تھی۔" بدھیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "میں غریب راہک ہوں۔ اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔"

"تو سردار کا مزارع ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "میں تو سمجھتا تھا تو اس کا کرندہ ہے۔ کرندہ نہ ہوتا تو سردار تجھے سہراب اور مرجان کو پکڑنے پر داؤد اور ہجر خاں کے ساتھ کیوں لگاتا۔"

"سئیں، یہ اس کی مرضی ہے۔ جب چاہے وہ کسی بھی راہک یا مزارعے کو باندھایا کرا دا بنا کر ویگار پر لگا دے۔ جو کام چاہے لے۔ وہ سردار ہے، مالک ہے۔ اس کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے۔" بدھیل نے اپنی مجبوری بیان کی۔

"مان لے سردار نے تجھے کالا اور ساوُنی کو کالی سمجھا، تب تو وہ تجھے اور ساوُنی کو پھانسی پر بھی لٹکا سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"کنون تو یہی ہے۔" بدھیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے سردار کی مرضی ہے۔ جیسا چاہے فیصلہ دے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مگر بدھیل نے اسے زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "سئیں، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے اس کے سوال کا براہ راست جواب نہ دیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے مشورہ دیا۔ "موت تیرے سر پر کھڑی ہے، تو یہاں سے بھاگ

کیوں نہیں جاتا؟"

"تا سیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔" بدھیل کے چہرے پر سراسیمگی چھا گئی۔ "میں نے بھاگنے کی کوشش کی، تب تو سردار بالکل یہ سمجھے گا، میں گناہ گار ہوں۔ وہ مجھے کالا بنا کر ایک دم پھانسی پر لٹکا دے گا۔ ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ لگتا ہے توں نے اس کا غصہ نہیں دیکھا۔ ایسا گرم ہو جاتا ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "ویسے میں بھاگنا بھی چاہوں تو بھاگ نہیں سکتا۔ تجھے پتہ نہیں کم دار وحدت خان نے میرے پیچھے دو کراوے لگا دیے ہیں۔ وہ میری کڑی پہریداری کرتے ہیں۔ ہردم ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔"

"یہاں تو مجھے کوئی ایسا کراوایا کرندہ نظر نہیں آتا۔" رحیم داد نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"دونوں کوٹ کے باہر بیٹھے ہیں۔" بدھیل نے مڑ کر سہمی ہوئی نظروں سے حویلی کے صدر دروازے کی جانب دیکھا۔ "دونوں ہی مسلح ہیں۔ ہردم چوکس رہتے ہیں۔"

"یہ بتا، تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

"سیں، میں سردار سے جو کچھ بتانا چاہتا ہوں، توں اسے بتا دے۔" بدھیل خان نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔ "سیں توں سدا جیویں، رب راضی ہووی۔ سردار تیرا یار ہے۔ تجھ پر بھروسہ کرتا ہے۔ توں جو کہے گا مان لے گا۔"

رحیم داد نے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تو کہتا ہے تو میں سردار سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔ پر یہ اس کی مرضی ہے، مانے نہ مانے۔"

"میں نے پتہ ہے، وہ ضرور مان لے گا۔" بدھیل عاجزی سے بولا۔

"اب تو یہاں سے جا۔ سردار آتا ہی ہو گا۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔ "تجھے میرے پاس دیکھ کر ہو سکتا ہے وہ ناراض ہو جائے۔"

بدھیل نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

شام اور گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رات ہو گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا، شہ زور خان مزاری کا انتظار کرتا رہا۔

رات گئے سردار مزاری واپس آیا۔ وہ اس وقت سرخوشی کے عالم میں تھا۔ قدم بہکے ہوئے، آنکھیں چڑھی ہوئیں۔ اس نے ایک موڑھا کھینچا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا

چوہدری، مجھے لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ جاتے ہوئے تجھ سے مل بھی نہ سکا۔"

"مجھے پتہ ہے، تیرا ماما بیمار ہے۔ تو اسی کے پاس گیا تھا نا؟" رحیم داد نے کہا۔ "اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"صبح کچھ زیادہ گڑبڑ ہو گئی تھی پر اب پہلے سے ٹھیک ہے۔"

"بیماری کیا ہے اسے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ایک بیماری ہو تو بتاؤں۔ سب سے وڈی بیماری تو خود بڑھاپا ہے۔ بہت عمر ہو گئی ہے اس کی۔ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ دن رات بستر ہی پر پڑا رہتا ہے۔ اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میں زیادہ دیر اس کے پاس ٹھیر نہ سکا۔"

"جب تو اس کے پاس زیادہ دیر نہیں رہا تو اب تک کہاں تھا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"راجن پور سے تحصیل دار آیا ہے۔ اسے بھی ملنا تھا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "اس نے پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور بھی سرکاری افسر موجود تھے۔ بوتل کھلی تھی۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ روٹی بھی ان کے ساتھ ہی کھائی۔" اس نے تامل کیا۔ "تو نے روٹی کھا لی ہو گی؟"

"نہیں!" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"حد کر دی تو نے، اب تک بھوکا بیٹھا ہے۔"

"جب تو آگیا ہے تو کھا لوں گا۔ ویسے مجھے زیادہ بھوک بھی نہیں ہے۔" رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

سردار مزاری خاموش رہا۔ رحیم داد بھی نہیں بولا۔ مگر زیادہ دیر چپ نہ رہا، حرف مطلب پر آگیا۔ "تو نے کل صبح بدھیل اور ساوئی کے مکدمے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟"

"کرنا تو ہے، پر تجھے اس سے کیا لینا۔" مزاری کے لہجے میں بیزاری جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی مخمور آنکھوں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "بدھیل تو تیرے پاس نہیں آیا تھا؟" نشے کی لہر سے اس کا سر ہولے ہولے جھومنے لگا۔ "ضرور آیا ہو گا۔ مجھے ملا تھا۔ تجھے بھی ملا ہو گا۔ ملا تھا نا؟"

"ہاں، وہ مجھے ملا تھا۔" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔

"کیا کہتا تھا؟" سردار مزاری نے کرید کر پوچھا۔

"کہتا تھا، میں نے تو ساوئی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ پاک دامن ہے۔ بالکل بے گناہ ہے۔"

رحیم داد نے مزاری کو آگاہ کیا۔

"اس نے جو کچھ کہا تو نے مان بھی لیا۔ لگتا ایسا ہی ہے۔" مزاری نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سئیں چوہدری، تو بہت نیک بندہ ہے۔ یہ تو سوچ، دونوں ہی بھرپور جوان ہیں۔ یاری بھی لگا رکھی ہے۔ دو راتوں تک اکٹھے بھی رہے۔" اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔ "جوانی تو اندھی ہوتی ہے نا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تجھے یا مجھے کیا پتہ؟"

"مجھے تو دونوں ہی بے گناہ لگتے ہیں۔" رحیم داد نے بدھیل اور ساوَنی کی حمایت میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ دونوں بے گناہ ہیں؟" سردار مزاری نے جرح شروع کر دی۔

رحیم داد کے پاس کوئی مناسب جواب نہ تھا۔ اس نے پینترا بدلا اور مزاری کے ذہن میں بدھیل کے حق میں ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تجھے یہ تو پتہ ہے، بدھیل تیرا کتنا وفادار بندہ ہے۔ سہراب اور مرجان کو پکڑنے میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ تیری پگ اونچی کرنے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔"

"وفاداری اپنی جگہ، پر وفاداری سے اس کا جرم تو ختم نہیں ہو جاتا۔" مزاری متاثر نہ ہوا۔ "مجھے انصاف کرنا ہے اور جرم کو سامنے رکھ کر ہی کرنا ہے۔"

"مان لے بدھیل نے ساوَنی کو خراب کر دیا، تب تو کیا کرے گا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"سزا تو وہی دینی ہو گی جو کالے اور کالی کو بلوچوں کے کانون کے رو سے دی جانی چاہیے۔"

سردار مزاری کے لہجے میں تذبذب کا عنصر غالب تھا۔ رحیم داد نے بھی اسے محسوس کیا۔ اور اسی تذبذب کا سہارا لے کر اس نے زیادہ کھل کر بات کی۔ "یہ بتا تجھے کل کیا فیصلہ دینا ہے؟"

"میں نے اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ جو بھی فیصلہ دوں گا، کل صبح تو سن لینا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھا کر سو جا۔"

رحیم داد اس سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ جھومتا جھومتا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد صرف اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆

رات جاگ رہی تھی۔ رحیم داد بھی جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسے بدھیل اور ساوَنی کے بارے میں

تشویش تھی۔ دونوں ہی نوجوان تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور اس کی نظروں میں بے قصور بھی تھے۔ اسے دھڑکا تھا کہ سردار شہ زور خاں مزاری انھیں کالا اور کالی قرار دے کر کہیں پھانسی پر نہ چڑھا دے۔ وہ سردار تھا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی بازپرس کرنے والا نہ تھا۔ لنگر خاں کو اس کے حکم پر دریا میں ڈوب کر مرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ سہراب اور مرجان کی موت کا لرزہ خیز منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آجاتا۔ وہ بدھیل اور ساوَنی کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھنا نہ چاہتا تھا۔

صبح ہوئی۔ رحیم داد کی بے کلی ختم نہ ہوئی۔ وہ شہ زور مزاری سے مقدمے کے بارے میں ایک بار پھر بات کرنا چاہتا تھا۔ بدھیل اور ساوَنی کو بچانے کی یہ آخری کوشش تھی، مگر سردار مزاری خلاف معمول ناشتے پر نہ آیا۔ زنان خانے سے نکل کر سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جس میں کچہری لگتی تھی۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔

سردار مزاری نے اسے کچہری میں بلوایا بھی نہیں۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ مزاری نے اسے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ رحیم داد ایک مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ سردار مزاری حسب دستور و۔لٹھ مارے پلنگ پر بیٹھا تھا۔

کچہری پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ہر شخص چپ تھا۔ کچھ دیر بعد سردار شہ زور مزاری نے نظریں اٹھا کر بدھیل اور ساوَنی کو دیکھا۔ دونوں دم بخود تھے۔ ان کے چہرے خوف سے مٹیالے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں ویران اور افسردہ تھیں۔

ان کے قریب ہی ساوَنی کی ماں ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ بھی خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ حویلی کا ماشیا پشت پر کھڑا مزاری کے کندھے اور بازوؤں کے پٹھے ہولے ہولے دبا رہا تھا۔

سردار مزاری نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔ "میں نے سب کے بیانات سنے۔ ان کی جانچ پڑتال بھی کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ساوَنی کی ماں نے بدھیل کے خلاف جو الزام لگایا ہے، وہ ٹھیک اور درست ہے۔"

رحیم داد نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ پریشان ہو کر سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ نہایت یکسوئی کے ساتھ بول رہا تھا۔ "بدھیل نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہے، اس کی تائید ساوَنی کے بیان سے تو ہوتی ہے۔ پر ساوَنی کیوں کہ برابر سے شریک جرم ہے، اس واسطے اس کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔ بدھیل نے خود بھی مانا ہے، تسلیم کیا ہے کہ ساوَنی اس کے

گھر میں دو روز تک رہی۔ پر اس الزام سے انکاری ہے کہ وہ ساوَنی کو اٹھا کر نہیں لایا۔ اپنے اس بیان کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے نہ کوئی گواہی پیش کی نہ شہادت۔"

"سیں سردار! گواہی اور شہادت تو ساوَنی کی ماں نے بھی پیش نہیں کی۔ اس طرح تو اس کے الزام کی سچائی بھی ثابت نہیں ہوتی۔" بدمیل خان نے دلیل پیش کی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ خشک تھے۔ آنکھوں کے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ چہرے پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ نڈھال اور شکستہ نظر آرہا تھا۔

"اس کی دھی اٹھالی جائے اور وہی گواہ اور شہادت بھی پیش کرے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر تو بے گناہ ہے، تو اپنی بے گناہی کا تجھے ثبوت دینا ہوگا۔ تیرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں۔" سردار مزاری نے اس کی دلیل سختی سے مسترد کردی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"سیں سردار! میں سچ کہہ رہی ہوں بدمیل مجھے اٹھا کر نہیں لایا۔" ساوَنی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔ "بدمیل بے گناہ ہے۔"

"سیں، یہ جھوٹی ہے۔ ایک دم کوڑی ہے۔ جھوٹے ہنج بہا کر بدمیل کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتی ہے۔" ماں نے قہر آلود نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ "تیرے رودن پٹن سے بدمیل بے گناہ نہیں بن سکتا۔" اس نے مڑ کر شہ زور خاں مزاری کو مخاطب کیا۔ "سیں سردار، یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ بدمیل نے اسے خراب کر دیا۔ یہ کالی ہو گئی۔"

"تیرا یہ الزام درست نہیں ہے۔" سردار مزاری نے تیکھی نظروں سے ساوَنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ "ساوَنی کو بدمیل نے خراب نہیں کیا تھا۔ وہ کالی نہیں کہی جا سکتی۔"

رحیم داد نے سردار مزاری کا بدلا ہوا رویہ دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ یہ اچانک تبدیلی قطعی خلاف توقع تھی۔ وہ ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ بدمیل اور ساوَنی نے بھی حیرت زدہ نظروں سے سردار شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی مردنی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جارہی تھی۔ سب گم صم تھے۔ مہر بہ لب تھے۔

مگر ساوَنی کی ماں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے مزاری کے رویے کے خلاف احتجاج کیا۔

"سیں سردار! مجھے پتہ ہے۔"

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" سردار مزاری نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ درشت لہجے میں بولا۔

"بدھیل کے پاس دو روز ساوَنی رہی تھی یا تو؟" اس نے ساوَنی کی ماں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "تجھے کیا پتہ کہ ساوَنی کالی ہے۔ مجھے پتہ ہے اور ٹھیک طرح پتہ ہے کہ وہ کالی نہیں ہے۔" ساوَنی نے چونک کر سردار مزاری کے چہرے پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی گردن جھک گئی۔ رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔ مزاری اونچی آواز سے بولتا رہا۔ "جب ساوَنی کالی نہیں ہے تو بدھیل کیسے کالا ہو سکتا ہے۔" وہ ساوَنی کی ماں کی جانب متوجہ ہوا۔ زور سے دھاڑا۔ "میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نا سئیں، توں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سردار مزاری کو غضب ناک دیکھ کر ساوَنی کی ماں کا چہرہ خوف سے فق ہو گیا۔ گڑگڑا کر معذرت کرنے لگی۔ "سئیں، توں سردار ہے۔ توں مالک ہے۔ توں غلط نہیں بول سکتا۔ ہرگز غلط نہیں بول سکتا۔ میں نے ہی غلط سوچا۔ بھل ہو گئی۔ میکوں معافی دیدے۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔ "سئیں، میں فریادی ہوں۔ تیرے پاس نیائے کے لیے آئی ہوں۔"

"ہنج نہ بہا۔ چپ کر کے کھڑی رہ۔ تیرے ساتھ نیائے کیا جائے گا۔ پورا پورا انصاف ہو گا۔" سردار مزاری کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجلاہٹ کا غبار چھٹنے لگا۔ لہجہ نرم پڑ گیا، اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اپنا فیصلہ سنایا۔ "بدھیل کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ساوَنی کو اٹھا کر لے گیا۔ دو روز اسے اپنے گھر میں رکھا۔ اس لیے وہ کانون کی نظروں میں مجرم ہے۔ اس جرم کی سزا کے طور پر اسے چٹّی ادا کرنی ہو گی۔"

رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر سردار مزاری کو دیکھا۔ وہ چٹّی کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ "بدھیل کو پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ جرمانے کی رکم میں سے اڑھائی سو ساوَنی کی ماں کو تاوان کے طور پر دیا جائے گا۔ چٹّی کے کانون کی رو سے بدھیل کو ساوَنی کی طرح کی دو عدد جوان نینگر رن بھی پیش کرنی ہوں گی۔"

"سئیں سردار، میں دو نینگر کہاں سے لاؤں گا۔" بدھیل نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا۔ "میری تو صرف ایک بھین ہے۔ وہ بھی پندرھاں برس سے کم ہی ہو گی۔ اس کے علاوہ ماں ہے۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "سئیں، میرا اور کوئی نہیں۔"

"بھین اور ماں ہی کو لے آ۔" سردار مزاری نے مطلق مروت سے کام نہ لیا۔ مڑ کر ساوَنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ "تیرا کوئی پتر ہے؟ بچہ ہو یا جوان۔ پرنیا ہو یا بن پرنیا۔ کوئی فرک نہیں پڑتا۔ بدھیل کی بھین سے اس کا پرنا کر دیا جائے گا۔ وہ اسے اپنی ذال بنا کر رکھ سکتا ہے۔"

"نا سئیں، میرا کوئی پتر نہیں۔" ساوَنی کی ماں نے بتایا۔ "میں تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں، ساوَنی کے

سوا میرا کوئی نہیں۔"

"ساوَنی کا کوئی بھائی نہیں اس لیے بدھیل کی بہن اور ماں کو کوٹ میں رکھا جائے گا۔" سردار مزاری نے اعلان کیا۔ "جب تک بدھیل جرمانہ اور مکدمے کی پوری فیس جمع نہیں کرائے گا' اپنی ماں اور بھین کو نہیں پہنچائے گا' تب تک ساوَنی کو حویلی ہی میں رہنا ہو گا۔ بدھیل اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو اسے چٹی کو پورا کرنا ہو گا۔"

مقدمے کا فیصلہ سن کر ساوَنی کی ماں اور بدھیل خاموش رہے۔ مگر ساوَنی بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی دبی دبی سسکیاں کمرے کے گہرے سکوت میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ بدھیل سر جھکائے کچہری سے باہر چلا گیا۔ ساوَنی کی ماں بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ساوَنی کو دوبارہ زنان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

دن گزرا' رات ہوئی۔ مگر مزاری سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ صبح ناشتے پر وہ اس کے پاس آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رحیم داد نے بدھیل کے مقدمے کا ذکر چھیڑا۔ کھل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "مزاری' یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ساوَنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا؟ تو نے ساوَنی کی ماں کو تو چپ کرا دیا پر تیرے پاس کیا ثبوت کہ ساوَنی کالی نہیں ہوئی؟ بدھیل کے ساتھ دو روز رہنے کے بعد بے گناہ اور پاک صاف رہی۔"

"سیں چوہدری' تو نے تو حد کر دی۔ بالکل بھولا بادشاہ ہے۔" شہ زور خاں ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "تجھے پتہ نہیں ساوَنی کل اور پرسوں ساری رات میرے کمرے میں رہی تھی۔" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "جب مکدمے کا فیصلہ مجھے کرنا تھا تو ثبوت بھی میں نے ہی لینا تھا نا؟"

رحیم داد کو دل لگی سوجھی۔ "تب تو وہ کالی ہو گئی اور تو کالا۔" اس نے مسکرا کر مزاری کو چھیڑا۔

"تو نے کچہری لگا رکھی ہے؟" سردار مزاری کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ لہجہ درشت ہو گیا۔ "سردار کے ساتھ سونے پر کوئی رن کیوں کر کالی ہو سکتی ہے؟" اس نے قہر آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے یہ سوچا کیسے؟ لگتا ہے تو خاندانی زمین دار نہیں ہے۔"

رحیم داد کی سٹی گم ہو گئی۔ معذرت کرنے کے انداز میں بولا۔ "ناراض نہ ہو۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ میرا مطلب تجھ پر الزام لگانا ہرگز نہیں تھا۔"

"تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔" مزاری کی جھنجلاہٹ کم نہ ہوئی۔ "اگر تیری ایسی ہی سوچ ہے تو ادھر

زمین الاٹ کرانے کا دھیان چھوڑ دے۔ تجھے کچھ پتہ نہیں کہ سرداری اور زمیں داری کیا ہوتی ہے۔"

"میں تو مخول کر رہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا تو اتنا برا منائے گا۔" رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "یہ بتا' لہور چلنے کا کب تک ارادہ ہے؟ میں اب زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔"

"چاکر کو تو آجانے دے۔" مزاری کا غصہ اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ لہجہ بھی سنبھلا ہوا تھا۔ "لگتا ہے الاٹمنٹ میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی' ورنہ چاکر کو اب تک الاٹمنٹ کا آرڈر لے کر آجانا چاہیے تھا۔"

"ایسا کر۔ کسی کو شہر بھیج کر چاکر خاں سے میرے کاغذات واپس منگوا لے۔" رحیم داد نے کہا۔ "الاٹمنٹ شلاٹمنٹ ہوتی رہے گی۔ مجھے لہور جانے دے۔ تو بعد میں میں آجانا۔ میں کچھ روز شاہ جی کی کوٹھی میں ٹھیروں گا۔ اسے ملنے کے بعد ہی واپس کوٹلہ ہر کشن جاؤں گا۔"

"میرا کہا مان' تو چاکر کے لیے تم کا ایک دو روز انتظار کر لے۔" مزاری نے مشورہ دیا۔ "ورنہ جیسا تو کہتا ہے وہی کروں گا۔"

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ سردار مزاری اٹھ کر چلا گیا۔

☆

چاکر خاں سرگانی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چند ہی روز بعد کا ذکر ہے۔ رحیم داد اور شہ زور خاں مزاری دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں چاکر خاں آگیا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ چہرے پر سفر کی تکان کے آثار نمایاں تھے۔ مگر ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ بغل میں کاغذات کی مسل دبی تھی۔

چاکر خاں نے جھک کر سردار مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور سر جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے خیر و عافیت دریافت کی۔ "خیر اے سیں' خوش ہو' راضی ہو' خیر سلا اے۔"

"شکر اے' تساں اپنا حوال سنا۔" مزاری نے جواب دیا۔ "اتنی دیر کیوں لگا دی۔ الاٹمنٹ میں کوئی چکر تو نہیں پڑ گیا؟"

"سیں' وہ ایسا ہوا کہ ڈپٹی کمشنر لہور گیا تھا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔" چاکر خان سرگانی نے صفائی پیش کی۔

"بہت زیادہ دیر لگا دی تو نے۔" مزاری نے کہا۔ "چوہدری پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے لہور جانا

ہے۔ ادھر ضروری کام ہے اس کا۔"

"سیں سردار، دیر تو لگ گئی پر کام پکا ہو گیا۔" چاکر خاں سرگانی نے مسل، سردار مزاری کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا، زمین کی الاٹمنٹ کا آرڈر۔" اس نے مسل کھول کر حکم نامہ دکھایا۔

شہ زور نے حکم نامہ ہاتھ میں لے کر پڑھا، مسکرایا۔ اور مسل رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سیں چوہدری، مبارک ہو۔ تجھے اڑھائی سو ایکڑ متروکہ اراضی، دلاور والا میں الاٹ ہو گئی ہے۔"

رحیم داد نے مسل ہاتھ میں سنبھالی۔ الاٹمنٹ آرڈر پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر خوشی سے سرخی پھیل گئی۔ آنکھوں میں چراغ جگمگانے لگے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ الاٹمنٹ اتنی آسانی سے مل جائے گا اور اس قدر کم مدت میں مل جائے گا۔ نہ سرکاری دفتروں کے چکر کاٹنا پڑے۔ نہ افسروں سے ملنے کے لیے صبر آزما انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ نہ کسی قسم کی سفارش پہنچانے کی ضرورت پیش آئی۔ ہر کارروائی اطمینان بخش طور پر مکمل ہو گئی۔

چاکر خاں سرگانی اپنی کارکردگی سنانے لگا۔ "سیں! الاٹمنٹ لینے کے لیے میں بحالیات والوں کے پاس پہنچا۔ صدر دفتر کے اہل کاروں سے ملا۔ افسر مال اور تحصیل دار سے ملا۔ پٹواری سے ملا۔ فٹافٹ فائل آگے بڑھوائی۔ کام نکلوانے کے لیے کئیوں کی مٹھی گرم کی۔ سیں، تجھے پتہ ہے، اس کے بغیر فائل آگے نہیں بڑھتی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "دلاور والا بھی گیا۔ اراضی کا معائنہ کیا۔ بہت عمدہ زمین ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہی ہے۔ فاضل پور موضع ہے۔ وڈی وستی ہے۔"

"مجھے پتہ ہے تو بہت ہوشیار ہے۔ افسروں اور اہل کاروں سے کام نکلوانے کا ہر گر جانتا ہے۔" شہ زور مزاری نے خوش ہو کر داد دی۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری، اپنا چاکر بہت کام کا بندہ ہے۔ سچ پوچھ تو میری زمینداری اسی نے سنبھال رکھی ہے۔"

"پر سیں، کبضہ ملنے میں مشکل پیش آئے گی۔" چاکر خاں نے دبی زبان میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر سردار مزاری نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"زمین، راہکوں اور مزارعوں نے دبا رکھی ہے۔" چاکر خاں سرگانی نے مطلع کیا۔ "پہلے بھی کئی بار مہاجروں کو الاٹ ہو چکی ہے پر راہکوں نے کبضہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت گڑبڑ مچائی۔ ابھی تک جمے بیٹھے ہیں۔"

"ایسا ہے، تب تو الاٹمنٹ ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" شہ زور خاں مزاری نے بجھے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”تو نے الاٹمنٹ لینے سے پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا؟ کچھ تو سوچا ہوتا۔“

”سوچا تھا‘ سئیں بالکل سوچا تھا۔“ چاکر خاں سرگانی نے وضاحت کی۔ ”صدر دفتر کے ایک اہل کار نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔“

”اس کے خبردار کرنے پر بھی تو نے الاٹمنٹ آرڈر نکلوا لیا۔ تیری گالھ سمجھ نہیں آئی۔“ مزاری کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

”سئیں فکر نہ کر۔“ سرگانی نے مزاری کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تمن دریشک کا علاکہ ہے۔ دریشکوں سے مدد مل جائے تو کبضہ آسانی سے مل جائے گا۔“ اس نے مزاری کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر چھائی ہوئی خشونت زائل ہوتی جا رہی تھی۔ ”سردار عظمت اللہ خاں دریشک سے تیری گہری یاری ہے۔ توں کہے گا تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ ادھر اس کی زمیں داری ہے۔ تھانیدار سے اس کا بہت زیادہ میل ملاپ ہے۔ کبضہ حاصل کرنے کے لیے اپنا کام تو پولیس ہی سے پڑے گا۔ پولیس پیچھے ہو تو کبضہ لینے سے کون روک سکتا ہے۔ پولسے تو راکھوں کی ساری زورا زوری اور اکڑا ایسے نکال دیں گے کہ آگے انھیں سر اٹھانے اور گڑبڑ کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوگی۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”سئیں‘ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ سردار عظمت اللہ خاں دریشک اپنا پرانا یار ہے۔“ مزاری کے لہجے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ”اس کی تو تھانیدار ہی سے نہیں‘ سارے ہی وڈے افسروں سے یاری دوستی ہے۔ عظمت سے زمین کا کبضہ لینے میں پوری پوری مدد مل سکتی ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سئیں چوہدری‘ پروا نہ کر۔ زمین کی الاٹمنٹ مل گئی تو کبضہ بھی مل جائے گا۔“

”تو نے زمین کی الاٹمنٹ دلا دی کبضہ بھی دلا دے گا۔ پر اس کی دیکھ بھال بھی تو نے ہی کرنی ہو گی۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے تو کوٹلہ ہرکشن ہی میں رہنا ہے۔ ویسے ادھر آتا جاتا رہوں گا۔“

”تو فکر نہ کر۔ دیکھ بھال کرنے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔“ مزاری نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”ویسے تجھے کرنا بھی کیا ہے۔ زمین داری تو کاروار اور کم دار ہی چلاتے ہیں۔ تو اپنے کاروار کو ادھر بھیج دینا۔“

”میں اسے ضرور بھیج دوں گا۔ پر وہ یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا۔ کوٹلہ ہرکشن کی ساری زمین داری وہی چلاتا ہے۔“ رحیم داد نے مجبوری کا اظہار کیا۔ ”میں تو ادھر کسی کو تیرے علاوہ جانتا بھی نہیں۔ جب تو نے اتنا احسان کیا ہے تو زمین داری چلانے کے لیے کسی بھروسے کے بندے کا انتظام

بھی تجھے ہی کرنا ہو گا۔"

"احسان کی گالہ نہ کر۔" مزاری نے کہا۔ "تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی بندوبست ہو جائے گا۔" وہ چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر! تجھے چوہدری کے لیے ایک بندہ تلاش کرنا ہو گا۔ زمین داری کے کام کا تجربہ رکھتا ہو۔ محنتی ہو اور ایماندار بھی ہو۔ تیری نظر میں ایسا کوئی بندہ ہے؟"

"عزیز خاں گٹھوال ٹھیک رہے گا۔"

"کون عزیز خاں گٹھوال؟ میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔" شہ زور خاں مزاری نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"سیں تو نے اسے دیکھا تو ہے، پر زیادہ نہیں جانتا۔" چاکر خاں نے مسکرا کر کہا۔ "میں جن دنوں مظفر گڑھ میں خاکوانیوں کے پاس ہوتا تھا، گٹھوال بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ میں ادھر آگیا تو اس نے بھی خاکوانیوں کی نوکری چھوڑ دی۔ آڑھت کا کام شروع کر دیا، پر چلا نہیں۔ آج کل وہ خالی ہے۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ ہشیار بھی ہے اور بھروسے کا بندہ ہے۔"

"اب کہاں ہوتا ہے وہ؟" مزاری نے دریافت کیا۔

"سیں، وہ راجن پور میں ہوتا ہے۔" چاکر خاں نے بتایا۔ "چوہدری کو جو اراضی الاٹ ہوئی ہے، گٹھوال ہی نے اس کا کھوج نکالا تھا۔ یہ پہلے رائے بہادر ہتو رام کے پوتے، بالا رام کی جگیر میں ہوتی تھی۔ بالا رام پاکستان بنتے ہی سرحد پار چلا گیا۔ اس کی ساری جگیر اور زمین داری ادھر ہی رہ گئی۔" اس نے تامل کیا۔ "سیں سردار، توں تو بالا رام کو تو جانتا ہی ہو گا۔"

"جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہت وڈا زمین دار ہوتا تھا۔" مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "اور اس کے دادا ہتو رام کو کون نہیں جانتا۔ ڈیرہ غازی خاں میں اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ بعد میں رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ کوئٹہ چلا گیا۔ ادھر بھی وڈا افسر لگا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد راجن پور ہی آگیا تھا۔ بہت شاندار حویلی ہے اس کی۔ بالا رام اسی میں رہتا تھا۔"

"بالا رام کی راجن پور والی حویلی بھی ابھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی۔ گٹھوال بتاتا تھا۔ متروکہ اراضی کرار دے کر اسے کسٹوڈین کے حوالے کر دیا گیا۔ آج کل اس میں کلانور کے رانگھڑ مہاجر بسے ہوئے ہیں۔ کوشش کی جائے تو الاٹ ہو جائے گی۔ ڈپٹی کمشنر چاہے تو الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ کبضہ بھی جلد مل جائے گا۔" چاکر خاں نے مشورہ دیا۔ "حویلی بہت عالیشان ہے، کیوں نہ اس کی الاٹمنٹ کے لیے بھی چوہدری کی طرف سے درخواست لگا دی جائے؟"

"لگا دے، ضرور لگا دے۔ چوہدری کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" مزاری نے رحیم داد کی جانب

دیکھا۔ "سئیں چوہدری، میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "تو جو کچھ سوچے گا میری بھلائی کے لیے ہی سوچے گا۔ تیری مرضی سے میری مرضی الگ تو نہیں ہو سکتی۔ حویلی کی الاٹمنٹ کے لیے بھی درخواست لگوا دے۔ مل جائے تو رہنے کو شان دار جگہ ہو جائے گی۔"

سردار مزاری چند لمحے خاموش رہ کر چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر، یہ بتا۔ گٹھوال اتنا ہشیار ہے کہ چوہدری کی زمیں داری کا ٹھیک طرح کام چلا سکے؟"

"سئیں سردار، میں نے بتایا ناں کہ اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ چوہدری کے لیے بہت کار آمد ثابت ہو گا۔" چاکر خاں نے مزاری کو اطمینان دلایا۔ "ویسے چوہدری کی زمیں داری ہی کتنی ہے۔ کل اڑھائی سو ایکڑ اراضی ہے۔ گٹھوال تو وڈی سے وڈی زمیں داری آسانی سے چلا سکتا ہے۔ بہت ہشیار بندہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، اسے فوراً یہاں بلوا لے۔" مزاری نے حکم دیا۔ "اب تو جا۔ نہا کر روٹی شوٹی کھا۔ بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔"

چاکر خاں چلا گیا۔ سردار شہ زور مزاری بھی رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ بھی آرام کرنے چلا گیا۔

☆

رحیم داد کو عزیز گٹھوال کا انتظار تھا۔

عزیز گٹھوال تو نہ آیا نادر خان آگیا۔ اور کچھ اس طرح اچانک آیا کہ اسے دیکھ کر رحیم داد بھونچکا رہ گیا۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ کمرے کے باہر تیز اور چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا میں تمازت بڑھ گئی تھی۔ صحن میں چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ سردار مزاری کچھ ہی دیر پہلے اٹھ کر گیا تھا۔ اور اب کچہری میں بیٹھا مقدمات کے فیصلے کر رہا تھا۔

رحیم داد بھی معمول کے مطابق کچہری میں بیٹھ کر مقدمات کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا مگر نادر خاں کے پہنچنے کے بعد اس نے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی غیر متوقع آمد سے رحیم داد کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے گردش کرنے لگے۔ اس نے نادر خاں کے گرد آلود چہرے پر نظر ڈالی۔ ٹرین اور لاریوں کے تکلیف دہ سفر اور مسلسل شب بیداری کے باعث وہ خستہ حال اور کچھ زیادہ ہی بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی جھریاں نمایاں ہو گئی تھیں۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”نادر، خیر خیریت تو ہے؟ فکر کی تو کوئی گل بات نہیں؟“
اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“

”فکر کی کوئی گل نہیں۔“ نادر خاں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”میں تو جی ایک ضروری مشورے کے لیے آیا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہ تھا کہ تو ادھر ہے۔“ اس نے کندھے پر پڑے ہوئے پرنے سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ ”میں تو سیدھا لہور گیا۔ سوچا تھا تو شاہ جی کی کوٹھی پر ملے گا۔ جاتے ہوئے بتایا بھی یہی تھا۔ میں تجھ سے ملنے شاہ جی کی کوٹھی پہنچا۔ اپنی جیپ باہر ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تو ادھر ہے۔“

”شاہ جی کراچی سے واپس آ گیا؟“

”مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ شاہ جی کب کراچی گیا۔“ نادر خاں نے نہایت معصومیت سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”میں نے ڈرائیور سے اس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ کوٹھی کے اندر بھی نہ گیا۔ وہاں سے سیدھا سٹیشن پہنچا۔ اور یہاں آنے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گیا۔“ اس نے اپنی پریشانی کا اظہار کرنا چاہا۔ ”ادھر کے سفر میں تو جی بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے بارے میں تجھے پتہ ہے کہ ادھر تو ٹرین بھی نہیں چلتی۔“

نادر خاں کی زبانی سفر کی روداد سنتے سنتے رحیم داد اکتا گیا۔ اس نے نادر خاں کو اس سلسلے میں مزید کہنے کا موقع نہ دیا۔ دریافت کیا۔ ”یہ بتا تو کس سلسلے میں مشورہ کرنے میرے پاس آیا ہے۔ کوئی خاص گل بات ہے؟“

”پچھلے دنوں رفیع سمہ دوبار آیا۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”پہلی بار جب وہ آیا اور اسے یہ پتہ چلا کہ تو موجود نہیں ہے تو خاموشی سے چلا گیا۔ پچھلے جمعے کو فیر آیا۔“ بات کہتے کہتے لحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹکا۔ ”اس بار اس نے کھل کر مجھ سے گل بات کی۔“

”کیا کہتا تھا وہ؟“ رحیم داد نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تجھے پتہ ہے وہ غلے کی سمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”کہتا تھا جن دنوں تو اس کا مہمان تھا اس نے اس بارے میں تجھ سے بات بھی کی تھی۔ اور تو راضی بھی ہو گیا تھا۔“

”اتنا تو مجھے یاد ہے کہ سمہ نے غلے کی سمگلنگ کے بارے میں گل بات کی تھی۔“ رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ ”وہ میری فصل بھی سرحد پار سمگل کرنے کو کہتا تھا۔ دام اور مل بھی بہت بتاتا تھا۔ پر میں ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔ سوچا تھا فصل کی واڈھی کے بعد تجھ سے اس معاملے میں بات کروں گا۔ پر

ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے خوف آتا ہے۔ اس میں خطرہ بہت ہے۔"

"خطرہ تو ہے۔" نادر خاں نے کہا۔ "پر فائدہ بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ آڑھتی فصل کی اتنی کیمت نہیں ادا کریں گے جتنی سمگلنگ سے ملے گی۔ سمہ کہتا تھا لگ بھگ دگنی ہو گی۔"

"تو اس بارے میں کیا سوچتا ہے؟"

"میں نے کیا سوچنا ہے جی۔ فیصلہ تو تجھے کرنا ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں کہا۔ "ویسے فصل تو ابھی اپنے ہی پاس ہے۔ آڑھتی چکر کاٹ رہے ہیں۔ نرخ تو تیری واپسی پر طے ہو گا۔ میں نے ان سے یہی کہہ دیا۔"

"سمہ سے تو نے کیا کہا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"میں نے اسے کیا کہنا تھا جی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "صاف صاف بتا دیا کہ زمیں دار کی اجازت کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسا وہ حکم کرے گا' میں نے ویسا ہی کرنا ہو گا۔" اس نے تامل کیا۔ "میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں۔ اس سلسلے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"سمہ کب آنے کو کہہ گیا ہے؟"

"چند روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "جو فیصلہ کرنا ہے اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ فوراً جواب دینا ہو گا۔"

رحیم داد نے نادر خاں کے رویے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ غلے کی اسمگلنگ میں رفیع سمہ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے۔ مگر رحیم داد تیار نہ تھا۔ وہ کسی ایسی مہم جوئی میں شریک ہونے سے ڈرتا تھا جس میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ پولیس کا سامنا کرنے اور عدالت کے روبرو پیش ہونے سے گھبراتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ صرف جیل جانے کا نہیں بلکہ پھانسی پر لٹک جانے کا بھی خطرہ تھا۔

اسے طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔ وہ گردن جھکا کر ممکنہ خطرات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ نادر خاں نے اسے متفکر اور پریشان دیکھا تو کرید کر پوچھا۔ "چوہدری' تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"نادر' بات یہ ہے میں نے کبھی ایسا خطرناک دھندا کیا نہیں۔" رحیم داد نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "میں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سوچ کر بتاؤں گا۔ تو تھکا ہوا ہے' جا کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل بات ہو گی۔"

"جیسی تیری مرضی۔ ویسے میرا ارادہ آج ہی واپس جانے کا تھا۔"

"نہیں، تو ابھی نہیں جا سکتا۔ تجھ سے کئی ضروری باتیں کرنی ہیں۔" رحیم داد نے اسے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے سے روک لیا۔

"میرے لیے یہی حکم ہے جی تو ٹھہرے جاتا ہوں۔" نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ ایک تابع دار اور فرض شناس ملازم کی طرح رحیم داد کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا۔ اسے ہدایت کی کہ مہمان خانے میں نادر خاں کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا مناسب بندوبست کر دیا جائے۔

نادر خاں نوکر کے ہم راہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد بھی کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ کچھ دیر تنہا بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کی جانب روانہ ہو گیا جس میں کچہری لگی تھی۔

دن گزرا، شام ہوئی، رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ مہمان خانے میں جسے دیرہ یا وساخ کہا جاتا ہے، خاصی چہل پہل تھی۔ گرمی کی شدت قدرے کم ہو چکی تھی۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ باورچی خانے کے چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں ملی جلی آوازوں کا شور رچا ہوا تھا۔ زندگی جاگ رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔

رحیم داد تنہا تھا۔ بیزار اور اکتایا ہوا تھا۔ سردار شہ زور خاں مزاری سہ پہر کو روجھان چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہ آیا تھا۔ وہ موجود نہ ہوتا تو رحیم داد کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ مزاری کے بغیر وہ شغل بادہ نوشی بھی نہ کرتا۔ حالانکہ کئی بار اس نے اصرار بھی کیا۔ لیکن اکیلے بیٹھ کر شراب پینا اسے کچھ اچھا نہ لگا۔ ملازم گلاس اور بوتل لے کر آتا بھی تو وہ منع کر دیتا۔ البتہ بھنگ پینے میں اسے عار نہ تھا۔ مگر لسی کو بھنگ پر ترجیح دیتا۔ ان دنوں اس کا یہی معمول تھا۔

اس وقت بھی رحیم داد کے سامنے لسی سے بھرا ہوا کانسی کا لمبا گلاس رکھا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا ٹھنڈی لسی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادر خاں پہنچ گیا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ تمام دن آرام کرنے کے بعد اب وہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "نادر، تو بہت دیر سوتا رہا۔"

"بہت تھک گیا تھا جی۔" نادر نے شکوہ کرنے کے انداز میں سفر کی مشکلات بیان کیں۔ "ادھر تو جی سفر کرنا اور وہ بھی گرمی میں بہت دشوار ہوتا ہے۔ کیا بتاؤں جی مجھ پر کیا بیتی۔ لاریاں ایسی پرانی پھٹارا ہیں کہ چلنے میں ایک ایک پرزہ شور کرتا ہے۔ سڑک بھی کچی ہے۔ جگہ جگہ گڑھے ہیں۔

لاری اس پر دوڑتی ہے تو ایسی گرد اڑاتی ہے' ایسے جھٹکے لگتے ہیں کہ بدن کا جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ اب تک ہڈیاں دکھ رہی ہیں۔ اور خاک تو ایسی جمی کہ بار بار نہانے پر بھی ایسا لگتا ہے کہ خاک ابھی اتری نہیں۔"

"پر لاری تو ادھر آتی نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "سڑک تو بہت دور رہ جاتی ہے۔ تو شاہ میر تک آیا کیسے؟ تانگا شانگا بھی نہیں ملتا۔"

"بس جی' کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچ ہی گیا۔" نادر خاں نے سفر کی مزید دشواریاں بیان کرنے سے احتراز کیا۔ گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "سمہ کے بارے میں کیا سوچا جی؟ میں نے واپس جا کر اسے جواب دینا ہو گا۔"

"سوچتا تو اس کے بارے میں دن بھر رہا۔ پر سمجھ نہیں آتی کیا کیا جائے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "تجھے پتہ ہے' یہ سمگلنگ کا دھندا کتنا خطرناک ہے۔ ویسے روپے کی ابھی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں کہ ایسا خطرناک کام کیا جائے۔"

"روپے کی ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہی ہے۔"

"وہ کس لیے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔

"زمیں داری بڑھانے کے لیے۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے پاس لگ بھگ آٹھ سو ایکڑ اراضی ہے۔ اتنی کم اراضی کے لیے منیجری کرتے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ زمیں داری اور بڑھے تاکہ منیجری کرنے کا کچھ مزا آئے۔ مجھے بھی محنت کرنے اور اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملے۔"

"پر تو زمیں داری بڑھائے گا کیسے؟" رحیم داد اور زیادہ حیرت زدہ ہو گیا۔ "غیر مزروعہ اور پیڑلی زمین پر تو نے باغات لگا لیے۔ زمیں داری بڑھانے کے لیے اور زمین کہاں سے آئے گی؟"

"اس کے بارے میں تو بعد میں بتاؤں گا۔" نادر خاں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ پہلے سمہ کا معاملہ طے ہو جائے۔"

"تو بتا اس معاملے میں کیا' کیا جائے۔ تو نے کیا سوچا؟"

"میں تو جی یہی صلاح دوں گا سمہ کی بات مان لی جائے۔ اس میں جتنا فائدہ ہے خطرہ اتنا زیادہ نہیں۔" نادر خاں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "چوہدری' تجھے شاید پتہ نہیں۔ غلے کی سمگلنگ تو اپنا شاہ جی بھی کرتا ہے اور ساری سمگلنگ رفیع سمہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب سے نہیں برسوں سے ہو رہی ہے۔"

"پر شاہ جی نے کبھی مجھے ایسی گل بات نہیں بتائی۔" رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا شاہ جی اپنی فصلوں کی سرحد پار سمگلنگ کراتا ہے اور سمہ کے ذریعے کراتا ہے؟" وہ لحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "شاہ جی نے سمہ کے بارے میں مجھے یہ تو بتایا تھا کہ وہ سمگلر ہے پر یہ نہیں بتایا کہ سمہ کے ساتھ مل کر وہ بھی سمگلنگ کرتا ہے۔"

"مجھے تو جی یہ گل سمہ ہی نے بتائی تھی۔" نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ تو جی یہ بھی بتاتا تھا کہ شاہ جی کی فصل تو گوداموں اور کھلیانوں سے اٹھ کر سرحد پار جانی بھی شروع ہو گئی۔ اب تک آدھی سے زیادہ فصل سمگل ہو چکی ہے۔"

"یہ تو نے بہت تعجب کی گل سنائی۔"

"سچ تو یہ ہے جی، مجھے اس بارے میں پہلے ہی سے پتہ تھا۔ سمہ کے ساتھ شاہ جی کی یاری کا اصل سبب بھی یہی ہے۔"

"تیری باتوں کا صاف مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ سمہ کے ساتھ معاملہ کر لیا جائے۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا برملا اظہار کیا۔ "پر یہ سوچ لے، ہے یہ کام خطرناک۔" اس نے نادر خاں کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "جو کچھ کرنا ہے، تجھے ہی کرنا ہو گا۔"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر خاں نے ہونٹوں پر بھی ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے تو جی صرف اجازت چاہیے۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دیں۔" اس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "پروا نہ کریں جی سب کام بالکل ٹھیک ہو گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد رضامند ہو گیا۔ "میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔"

"اب جی، یہ بھی سن لیں۔ میں زمیں داری کس طرح بڑھانا چاہتا ہوں۔"

"سنا، ضرور سنا۔" رحیم داد نے خوش ہو کر اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ اپنی زمین داری کے نشیب میں جو چھوٹے زمیندار اور حصے دار ہیں، ان کا پانی باغات لگانے کے بعد ہم نے کم کر دیا ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بتانے لگا۔ "ان کی زمینوں کے لیے تو لگانے کو اتنا کم پانی مل رہا ہے کہ انھوں نے منجی کے بوٹوں کی جو پنیری لگائی تھی، سب سوکھ گئی۔ دوسری فصلوں کو بھی پورا پانی نہ ملا تو وہ بھی خراب ہو گئیں۔"

"ایسی گل بات ہے تو وہ بہت گڑبڑ کر سکتے ہیں۔" رحیم داد نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

"ان کو جو گڑبڑ کرنی تھی کر چکے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ "اوپر تک درخواستیں لگائیں۔ سرکاری دفتروں کے بہت چکر کاٹے۔ پر اپنا کام ایسا پکا تھا کہ کوئی

کارروائی نہیں ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر ہمارے پاس آئے۔ اور اپنی فصلوں کے لیے ہم سے پانی خریدنے لگے۔ تجھے ساری باتوں کا ٹھیک طرح سے پتہ ہے۔"

"وہ تو مجھے ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں سمجھا' وہ کوئی نئی گڑبڑ کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے لسی کا گھونٹ بھرا۔ "کھیتوں کو لگانے کے لیے کافی پانی نہ ملے اور فصلیں سوکھ جائیں تو کوئی زمین دار یا مزارع کیسے چپ کر کے بیٹھ سکتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"انھوں نے یہ کیا کہ سندھ میں بیراجوں کی جو زمینیں نکلی ہیں' وہ الاٹ کرانی شروع کر دیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اب وہ آباد کار بن کر سندھ جا رہے ہیں۔"

"ادھر کی اراضی کا کیا کریں گے؟"

"اسے وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔" نادر خاں نے بتایا۔ "ادھر زمیں داری چلانے کے لیے بھی تو روپے کی ضرورت ہوگی۔ صرف زمین الاٹ کرا لینے سے تو کام نہیں چلتا۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ اپنی زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں؟"

"کئی تو میرے پاس آ چکے ہیں۔ ویسے بھی حق شفعہ کی رو سے سب سے پہلے اپنا ہی حق بنتا ہے۔ اپنی زمینیں جو ان کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کو تو اپنی زمینیں فروخت کرنے سے پہلے ہم سے صلاح مشورہ کرنا ہی ہو گا۔ کنون یہی ہے۔"

"پر وہ تو اپنی زمینوں کی بہت کیمت مانگتے ہوں گے۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ ضرورت کے مطابک پانی نہ ملنے سے وہ بہت پریشان ہیں۔ دوسری طرف یہ سننے میں آیا ہے کہ بیراجوں کی زمین بہت زرخیز ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ وہ جلد سے جلد ادھر جا کر کاشت شروع کرنا چاہتے ہیں۔"

"تیرا مطلب ہے وہ اپنی زمینیں سستے دام فروخت کر دیں گے۔"

"ان کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ضرورت مند ہیں' اس لیے سستے داموں زمینیں فروخت کر دیں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ زمین خریدنے کے لیے اتنا روپیہ کہاں سے آئے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اگر پوری فصل ربیع سمہ کے ذریعے سمگل کرا دی جائے' تب بھی اتنا روپیہ تو نہیں ملے گا کہ ساری زمینیں خریدی جا سکیں۔"

"ساری زمینیں خریدنے کا تو نہ میرا ارادہ ہے اور نہ اتنی گنجائش ہی ہے۔" نادر خاں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میں تو یہ چاہتا ہوں اتنی زمین خرید لی جائے کہ اپنے پاس ۵۰ مربع اراضی ہو

جائے۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے' ساڑھے چار سو کلا زمین خرید لی جائے؟"

"چاہتا تو میں یہی ہوں۔" نادر خاں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اپنے پاس کم سے کم اتنی زمین تو ہو کہ زمین داری کی کچھ شان نظر آئے۔"

"پر اس کے لیے روپے کی بھی تو ضرورت ہو گی۔" رحیم داد کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"کچھ روپیہ اپنے پاس ہے' کچھ شاہ جی سے ادھار لیا جا سکتا ہے۔" نادر خان نے مشورہ دیا۔ "میں تو سمجھتا ہوں جی' وہ اس معاملے میں ضرور مدد کرے گا۔ مجھے پتہ ہے وہ تجھے کتنا مانتا ہے۔ وہ تو تجھے بہت وڈا زمیں دار دیکھنا چاہتا ہے۔ اوروں کی گل بات نہیں کرتا۔ خود مجھ سے وہ ایسا ہی خیال ظاہر کر چکا ہے۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "تو شاہ جی سے بات کر کے تو دیکھ۔ وہ ضرور تیری مدد کرے گا۔"

"تھوڑی بہت رکم تو وہ ادھار دے سکتا ہے۔ پر اتنی نہیں کہ جس سے ساڑھے چار سو کلا زمین خریدی جا سکے۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ "ویسے میں شاہ جی سے ادھار مانگنا نہیں چاہتا۔ مان لے اس نے انکار کر دیا تب کیا ہو گا؟ خوامخواہ شرمندگی اٹھانی ہو گی۔" اس نے گلاس اٹھا کر لسی کے کئی گھونٹ بھرے۔ "جتنا اپنے پاس روپیہ ہے' بس اتنی ہی زمین خریدنے کی سوچ۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "روپیہ ہو گا تو بعد میں بھی زمین خریدی جا سکتی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" نادر خاں نے بددل ہو کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "پر میں ایک گل ضرور کہوں گا ایسا موکع روز' روز نہیں ملتا۔" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے تجھے پتہ ہی ہے' زمین دار کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اپنی زمین کم کرنے کی بجائے ہمیشہ بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے۔"

☆

چاکر خاں سرگانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔ "تو اکیلا ہی آ گیا۔ تیرا سردار کدھر ہے؟"

"سئیں' میں سردار کے ساتھ نہیں گیا تھا۔" چاکر خاں سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"تجھے یہ تو پتہ ہو گا' وہ کب تک واپس آئے گا؟" رحیم داد نے سرگانی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

چاکر خاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سئیں چوہدری' مجھے بالکل پتہ نہیں سردار کب تک لوٹے گا۔

میں تو تجھے یہ بتانے آیا تھا کہ عزیز گھوال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا۔"

"پر اب تک وہ رہا کہاں؟" رحیم داد نے گھوال کے بارے میں استفسار کیا۔

"سئیں، وہ دلاور والا گیا تھا۔ اراضی دیکھ کر اور ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی تیرے پاس آئے گا۔" چاکر خاں سرگانی نے بتایا۔ "وہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو اس سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔ زمیں داری کے کام کا اسے بہت تجربہ ہے۔ سارا کام سنبھال لے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے نادر خاں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ نادر خاں ہے۔ آج ہی کوٹلہ ہرکشن سے ادھر آیا ہے۔ میرا منیجر ہے۔"

"سئیں تو نے اسے مشورے کے لیے بلایا ہے؟" سرگانی نے پوچھا۔

"نہیں، ایک ضروری کام کے بارے میں گل بات کرنے خود ہی آیا ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اسے تو میں نے اب تک یہ بھی نہیں بتایا کہ دلاور والا میں میرے نام اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی الاٹ ہو چکی ہے۔"

چاکر خان سرگانی نے نادر خاں سے پوچھا۔ "سئیں، تو ادھر آرام سے ہے ناں؟ کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟"

"بالکل آرام سے ہوں۔" نادر خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کوٹ کا ڈیرہ بہت شاندار ہے۔ کمرے بھی وڈے اور کھلے ہوئے ہیں۔ پر گرمی ادھر بہت زیادہ ہے۔"

"اس بار کچھ زیادہ ہی گرمی پڑی ہے۔" سرگانی نے بھی گرمی کی شدت کا اعتراف کیا۔ "تو شمشیر والی آتا تو گرمی اتنی نہ لگتی۔ دریا کا کنارہ ہے۔ صبح شام ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ چوہدری بھی پچھلے دنوں سردار کے ساتھ ادھر ہی ہوتا تھا۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے چند ہی روز ہوئے ہیں۔"

نادر خاں خاموش رہا۔ مگر رحیم داد مزید خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے چاکر خاں سرگانی سے دریافت کیا۔ "تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے کہ عزیز گھوال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا؟"

"سئیں، تو فکر نہ کر۔ وہ ضرور پہنچ جائے گا۔" سرگانی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"سئیں، میں نے سردار کے ایک ضروری کام کے لیے جانا ہے۔" سرگانی نے جواب دیا۔ "میں تو صرف گھوال کے کل یہاں آنے کی اطلاع دینے آیا تھا۔"

چاکر خاں سرگانی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور شام کے پھیلتے ہوئے گہرے

اندھیرے میں گم ہو گیا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے کہا۔ "مجھے بھی کل واپس جانا ہے۔ سویرے ہی سویرے نکل جاؤں گا۔ ویسے مجھے اب یہاں ٹھہرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جو صلاح مشورہ کرنا تھا کر لیا۔"

"نہیں' تو ابھی یہیں ٹھہرے گا۔ تجھ سے اور بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"میں تو اس لیے فوراً واپس کوٹلہ ہرکشن جانا چاہتا تھا کہ سمہ چند ہی روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "اب تو اسے ملنا میرے لیے ضروری ہو گیا ہے۔"

"میں نے تجھ سے دلاور والا کی اراضی کے بارے میں صلاح کرنی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں تو بھی دلاور والا کا ایک چکر لگا کر دیکھ لے۔" اس نے مسکرا کر نادر خاں کی جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ "اسی الاٹمنٹ کی خاطر تو میں ادھر آیا تھا۔ اور اب تک ٹھہرا ہوا تھا۔ سچ پوچھ تو مجھے امید نہیں تھی اتنی آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گی۔"

"زمین تو جی جہاں ملے ضرور لے لینی چاہیے۔ پر ادھر زمیں داری چلانے میں بہت دشواریاں ہیں۔ طرح طرح کے جھگڑے بکھیڑے ہیں۔"

"فکر نہ کر۔ تجھے ادھر نہیں لگاؤں گا۔" رحیم داد نے ہنس کر نادر خاں کو اطمینان دلایا جس کے چہرے سے دبی دبی پریشانی جھلک رہی تھی۔ "میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ ادھر کی زمینداری چلانے کے لیے عزیز گٹھوال کو لگایا ہے۔"

"کیسا بندہ ہے؟" نادر خاں نے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا پریشانی اور بے زاری کا ہلکا ہلکا غبار چھٹ چکا تھا۔ اب وہ مطمئن اور بشاش نظر آ رہا تھا۔

"میں نے تو اسے ابھی تک دیکھا بھی نہیں وہ کل صبح آ رہا ہے۔ تو بھی اسے مل کر پتہ چلا لینا کیسا بندہ ہے۔ ویسے تیرے سامنے ہی تو عزیز گٹھوال کے بارے میں مزاری کا کامدار' چاکر خاں گل بات کر رہا تھا۔ تو نے سنا نہیں' وہ اسے بہت ہشیار اور کام کا بندہ بتا رہا تھا۔"

"چاکر خاں اس کے بارے میں ٹھیک ہی بتاتا ہو گا۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی عزیز گٹھوال کی سفارش کی ہو گی۔ پہلے سے اسے ٹھیک طرح جانتا ہو گا۔" نادر خاں نے کوشش کی کہ زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ ادا ہو جس سے عزیز گٹھوال کی مخالفت کا پہلو نکلے۔ اسے ڈر تھا' کہیں ایسا نہ ہو کہ رحیم داد اسے دلاور والا کی زمیں داری کی دیکھ بھال پر مقرر کر دے۔ وہ ادھر آنا نہ چاہتا تھا۔ اگر وہ تیار بھی ہو جاتا تو اس کی بیوی' جنت ہرگز رضامند نہ ہوتی۔ لہٰذا نادر خاں نے ملاقات سے پہلے ہی گٹھوال کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ "زمیں دار' تو نے گٹھوال کو لگا کر بہت ٹھیک فیصلہ

کیا۔ وہ ادھر ہی کا رہنے والا ہے۔ حالات ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔ تجھے ایسے ہی بندے کی ضرورت بھی تھی۔"

"ابھی میں نے گٹھوال کے بارے میں پوری طرح طے نہیں کیا۔" رحیم داد نے نادر خاں کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "وہ کتنا ہشیار اور کام کا بندہ ہے یہ تو اسے ملنے کے بعد ہی اندازہ ہو گا۔ تو بھی اس سے گل بات کرنا۔ پتہ چلانا کام بھی چلا سکتا ہے کہ نہیں۔ یہ سوچ لے' میں نے ادھر روز روز نہیں آنا۔ جس کو بھی ادھر لگایا جائے گا اس پر پورا پورا بھروسہ کرنا ہو گا۔ میں اسی لیے تجھے روک رہا ہوں۔"

"جیسا حکم کریں جی ویسا ہی کروں گا۔ میں گٹھوال سے ملنے کے بعد واپس جاؤں گا۔"

"نادر' اب تو جا کر روٹی کھا۔ آرام کر۔ تو صبح میرے پاس آجانا۔"

نادر خاں خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد تنہا بیٹھا سردار شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا' اندھیرا بڑھتا گیا۔ مہمان خانے کی چہل پہل کم ہوتی گئی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات تاریک ہو گئی۔ مگر سردار شہ زور خاں مزاری واپس نہ آیا۔ نوکروں کو مطلق علم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس کے پاس گیا ہے۔

☆

پہر دن گزر چکا تھا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ عزیز گٹھوال خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ چاکر خاں سرگانی اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خان دونوں کی آمد سے پہلے ہی کمرے میں موجود تھا۔ سردار شہ زور خاں رات کے پچھلے پہر واپس آگیا تھا اور ابھی تک زنان خانے سے مہمان خانے میں نہیں آیا تھا۔

عزیز گٹھوال ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ مگر صحت بہت اچھی تھی۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ قد ذرا چھوٹا تھا۔ طبیعت میں خوشامد کی حد تک انکساری تھی۔ بات نپی تلی کرتا تھا اور سنبھل سنبھل کر بولتا تھا۔

رحیم داد نے اسے پرکھنے والی تیز نظروں سے دیکھا۔ دریافت کیا۔ "عزیز! تو دلاور والا گیا تھا؟"

"ہا سئیں' بالکل گیا تھا۔" عزیز گٹھوال نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "کئی روز سے ادھر ہی تھا۔ سیدھا وہیں سے آرہا ہوں۔"

اس بار نادر خاں نے سوال کیا۔ "زمین کیسی ہے؟ بنجر یا کلر تو نہیں ہے؟"

"نا سئیں۔" عزیز گٹھوال نے انکار میں سر ہلایا۔ "بہت عمدہ زمین ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ ایسی

زرخیز زمین تو پوری تحصیل میں نہیں ہو گی۔"

"اچھی اور زرخیز کیوں نہیں ہو گی۔" چاکر خان مسکرا کر بولا۔ "میں نے الاٹمنٹ لینے سے پہلے ہی زمین کے بارے میں پتہ کر لیا تھا۔" اس نے مڑ کر عزیز گھوال کی جانب دیکھا۔ "چوہدری کو یہ بتا تو ادھر اب تک کیا کرتا رہا؟"

"میں وستی والوں سے ملتا رہا۔ پٹواری سے بھی ملا۔" گھوال نے بتایا۔ "راہکوں کے بارے میں پتہ کیا۔"

"سنا ہے زمین راہکوں اور مزارعوں نے دبا رکھی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "کبضہ بہت مشکل سے ملے گا۔" وہ چاکر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر' تو نے یہی بتایا تھا نا؟"

چاکر خاں کے جواب دینے سے پہلے ہی عزیز گھوال بول پڑا۔ "سیں' تو نے ٹھیک ہی سنا۔" اس کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔ "کئی راہکوں اور مزارعوں نے پٹواری کی مٹھی گرم کر کے اپنا کبضہ پکا کر لیا ہے۔ زمینوں کے انتقالات بھی اپنے نام کرا لیے ہیں۔ پٹواری کے پاس تو رجسٹر خسرہ گرداوری ہوتا ہے ناں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انتقالات دیکھے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو زمیں کی الاٹمنٹ کیسے ملی؟" نادر خاں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

چاکر خاں سرگانی بہت سٹ پٹایا۔ اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ "پر پٹواری نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔" اس نے گھوال کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "تو نے پٹواری سے پوچھا تھا یا اس نے خود بتایا؟"

"پتہ تو پٹواری کو بھی نہ تھا۔" عزیز گھوال نے وضاحت کی۔ "یہ کارروائی تو اس سے پہلے کے کسی پٹواری نے کی تھی۔" اس نے براہ راست چاکر خاں کو مخاطب کیا۔ "سیں چاکر خاں' لگتا ہے پٹواری نے رجسٹر خسرہ گرداوری دیکھے بغیر مسل صدر دفتر بھیج دی۔"

"تب تو گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔" نادر خاں نے کھل کر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "اگر معاملہ عدالت تک گیا تو الاٹمنٹ منسوخ ہو سکتی ہے۔"

"چاکر خاں تو سب سے ملا۔ اہل کاروں سے' افسروں سے' اوپر سے نیچے تک سب کے پاس گیا پر تو نے یہ پتہ نہیں کیا کہ کئی مزارعوں کے نام زمین سرکاری ریکارڈ میں منتقل ہو چکی ہے؟" رحیم داد نے تیکھی نظروں سے چاکر خاں سرگانی کو دیکھا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"سیں چوہدری' فکر نہ کر۔" چاکر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "پٹواری نے اپنی کارروائی ڈالی تو اس کے اوپر تحصیل دار بھی بیٹھا ہے۔ وہ انتقالات خارج کر کے

زمین تیرے نام کر دے گا۔" وہ زیادہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ "تحصیل دار کی سردار سے گہری یاری ہے۔ میری بھی اس سے جان پہچان ہے۔ سئیں تو بالکل پرواہ نہ کر۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔ تجھے اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

عزیز گشوال نے بھی چاکر خاں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ رحیم داد کو مزید مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تحصیل دار بالکل ایسا کر سکتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "انتقالات کیا' گرداوریاں تک منسوخ ہو سکتی ہیں' بدل سکتی ہیں۔ اپنا چاکر خان سب کچھ کرا سکتا ہے۔ اس کی تو صدر دفتر تک پہنچ ہے۔ جیسا چاہے گا آرام سے کرا لے گا۔ سئیں اس معاملے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار چھٹنے لگا۔ وہ سرگانی اور گشوال کی یقین دہانی سے مطمئن ہو گیا' مگر نادر خاں مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے مزارعے آگے چل کر بہت گڑبڑ پیدا کریں گے۔" اس نے سرگانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "مجھے ادھر کے راہکوں اور مزارعوں کے بارے میں پتہ ہے۔ بہت سرکش اور زور آور ہیں۔" نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "چاکر خاں' تو نے بھی سنا ہو گا۔ دو تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ خریف کی فصل پر چوٹی کے لغاری سرداروں نے موضع کمال خاں کے چانڈیہ کھوسہ مزارعوں اور راہکوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے کے لیے نزدیک کے پہاڑوں سے سو سے بھی زیادہ ہدیانی بلوچوں کو بلایا۔ ان کے ذریعے مونجی کی فصل اٹھانے کی بھی کوشش کی۔ ہدیانیوں نے بستی پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا۔ پر کھوسہ مزارعوں نے حملہ آوروں کو گھیرے میں لے لیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ آخر ہدیانی حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"تو نے یہ تو سنا' پر یہ نہیں سنا کہ بعد میں کیا ہوا؟" چاکر خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "لغاریوں نے کھوسہ راہکوں کے خلاف دوسرا حربہ استعمال کیا۔ پولیس اور کنون کا چکر چلایا۔ ان کے خلاف دفعہ ۳۶۵-۱۴۸/۱۴۹ کے تحت مکدمے بنوائے۔ لغاری زمیں داروں کے خلاف کھوسہ راہکوں نے بھی پرچے چاک کرائے۔ پر لغاریوں کے پرچے درج ہو گئے۔ کھوسوں کے پرچے خارج ہو گئے۔" اس نے نادر خاں کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "راہکوں کو پولیس نے بند کر دیا۔ لغاری زمین داروں نے ان کی غیر حاضری میں مونجی کی فصل اٹھوا لی۔ بعد میں سارے سرکش راہکوں کو بے دخل بھی کر دیا۔" اس نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سئیں ادھر سرداروں کا کنون چلتا ہے اور کوئی کنون نہیں چلتا۔ ادھر راہک اور مزارعے سر اٹھائیں تو ان کا سر کچل دیا جاتا ہے۔"

نادر خاں خاموش رہا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کبنہ ملنے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔"

"سیں تو فکر نہ کر' کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ سب کام ٹھیک ٹھاک اور آرام سے ہو جائے گا۔" چاکر خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔

مگر نادر خاں اس کی یقین دہانی سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے' پر مجھے شبہ ہے کبنہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔"

چاکر خاں سرگانی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا' لیکن خاموش رہا۔

۴۲

اس روز کچہری میں سب سے پہلے ایک ایسے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی جو خاصہ پیچیدہ اور سنگین تھا۔ یہ مقدمہ سردار شہ زور خان مزاری کے روبرو پہلی بار پیش نہیں ہوا تھا۔ اس کی سماعت ایک عرصے سے جاری تھی۔ اب تک کئی پیشیاں پڑ چکی تھیں۔ رحیم داد ان میں بھی شرکت کر چکا تھا۔ وہ فریقین اور ان کے گواہوں کے بیانات سن چکا تھا۔ سردار مزاری کے علاوہ وہ چاکر خاں سرگانی سے بھی اس کے بارے میں کئی بار بات چیت کر چکا تھا۔ لہٰذا اس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔

وہ کچہری میں خاموش بیٹھا دلچسپی اور انہماک سے مقدمے کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مگر مقدّمے کے سماعت نے طول کھینچا تو رحیم داد اکتا گیا۔ اس نے سوچا بعد میں چاکر خان سرگانی سے اس روز کی کارروائی کی پوری روداد سن لے گا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کچہری سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو نادر خان موجود تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نادر خان سے دریافت کیا۔ ”نادر، تو صبح سے اب تک ادھر ہی رہا؟“

”نہیں جی، میں تو کچھ ہی دیر پہلے ادھر آیا تھا۔“

”کوئی خاص گل بات تو نہیں؟“

”خاص گل بات تو نہیں۔“ نادر خاں نے دبی زبان سے کہا۔ ”صرف یہ کہنے آیا تھا کہ مجھے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کی اجازت مل جائے۔“

"لگتا ہے، تجھے اپنے بال بچے یاد آرہے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے جی، میں نے ادھر کئی ضروری کام کرنے ہیں۔" نادر خان نے وضاحت کی۔ "رفیع سمہ آنے کو کہہ گیا تھا۔ وہ آیا اور میں نہ ملا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سمگلنگ کا فیصلہ کر کے ہی ادھر آیا تھا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

"ایسی گل بات نہیں ہے جی۔ بغیر اجازت میں کیسے ایسا فیصلہ کر سکتا ہوں۔" نادر خاں نے جھٹ صفائی پیش کی۔ "رفیع سمہ سے پوچھ لیں جی۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ زمیں دار کے حکم کے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ "پر میں یہ گل ایک بار فیر کہوں گا کہ سمہ سمگلنگ کے ذریعے فصل کا جتنا ولا دے گا، آڑھتی ہر گز نہ دیں گے۔ ویسے ادھر روپے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت بھی ہے۔ چھوٹے حصے داروں اور زمین داروں کی زمینیں اس وکت جس مول مل رہی ہیں، بعد میں اتنی سستی زمینیں نہیں ملیں گی جتنی بھی خریدی جائیں خرید لیں۔"

"خریدنے کو تو ان کی ساری ہی زمینیں خرید لی جائیں، پر اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟" رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

"میں تو کہتا ہوں جی ادھر ڈیرہ غازی خان میں جو زمین الاٹ ہوئی ہے اسے بھی فروخت کر دیں۔" نادر خاں نے مشورہ دیا۔ "اس طرف ہم نے کیا لینا۔ اپنی اصل زمین داری تو ادھر ہی ہے۔ اسی کو بڑھانا چاہیے تاکہ پوری طرح اس کی دیکھ بھال بھی ہو سکے۔"

"نادر ایسا نہ سوچ۔" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "شہ زور مزاری نے یہ بات سن لی تو بہت برا منائے گا۔ میں اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ یہ تو سوچ اس نے ادھر زمین الاٹ کرانے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ میری یاری دوستی ہی کے لیے تو اس نے ایسا کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ آگے میں ایسی گل بات نہیں کہوں گا۔" نادر خان نے فوراً اپنی تجویز واپس لے لی۔ "پر اتنا ضرور کہوں گا کہ زمین تو الاٹ ہو گئی، کبضہ کب ملے گا اور کیسے ملے گا؟"

"تو نے سنا نہیں چاکر خان سرگانی اس بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔"

"برا نہ منائیں جی، مجھے تو چاکر خان ہشیار بندہ نہیں لگتا۔ ویسے وہ گلاں وڈی وڈی کرتا ہے۔" نادر خان نے دبی زبان سے چاکر خان سرگانی کی مخالفت کی۔

مگر رحیم داد کو اس کا رویہ پسند نہ آیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو کہتا ہے وہ ہشیار بندہ نہیں ہے۔ پر

تو نے یہ نہیں سوچا زمین کی الاٹمنٹ تو اسی نے کرائی ہے۔ زمین الاٹ کرانا مخول ہے۔ تجھے پتہ نہیں اس کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ الاٹمنٹ ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ اور اب تو ملتی ہی کہاں ہے۔ کتنے ہی کلیم ہولڈر اپنے اپنے کلیم دبائے ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ کہیں نہیں ملتی۔"

"پتہ نہیں جی اس نے کیسے الاٹمنٹ لے لی۔" نادر خاں نے کہا۔ "اپنی سمجھ میں تو آتا نہیں کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں زمین کے مالکانہ حقوق دوسروں کے پاس ہوں اور الاٹمنٹ تیرے نام کر دی جائے۔ پٹواری ایسی غیر کنونی کارروائی کر ہی نہیں سکتا۔ اور جب تک درخواست پر پٹواری کی رپورٹ نہ لگی ہو الاٹمنٹ ہو ہی نہیں سکتی۔"

"ہو سکتی ہو یا نہ ہو سکتی ہو پر چاکر نے الاٹمنٹ کرا ہی لی۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"وہ تو جی بالکل ٹھیک ہے۔" نادر خاں نے تائید کی۔ "الاٹمنٹ بھی سولاں آنے پکی ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "بات یہ ہے جی' ادھر کوئی کاعدہ کنون تو ہے نہیں۔ افسر بھی نااہل اور بدعنوان ہیں۔ یہاں تو وہ افسر لگائے جاتے ہیں جن کو سزا دینی منظور ہوتی ہے۔ تب ہی تو افسروں میں اس ضلع کو کالا پانی کہا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر تو سرداروں کی حکمرانی ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں افسر ویسا ہی کرتے ہیں۔ ملازمت جو کرنی ہوئی۔ سرداروں سے تو حکومت بھی ڈرتی ہے۔ تب ہی تو ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کی جاتی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اب یہی دیکھ لیں جی' سرکاری عدالتیں موجود ہیں۔ پولیس بھی ہے' تھانے بھی ہیں' پر مکدموں کا فیصلہ جرگے میں ہوتا ہے یا سردار اپنی عدالتیں لگا کر کرتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے تو۔" رحیم داد نے نادر خان سے اختلاف رائے نہ کیا۔ "سردار نہ صرف عدالت اور کچہری لگاتے ہیں' بلکہ مکدمے کی فیس بھی لیتے ہیں۔ جرمانے لگاتے ہیں' سزائیں دیتے ہیں' ان کی تو اپنی جیلیں بھی ہیں۔ اپنا سردار شہ زور مزاری روز ہی کچہری لگاتا ہے۔ مکدموں کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کی بھی اپنی جیل ہے جس میں آج بھی نہ جانے کتنے کیدی بند ہیں۔"

"تب ہی تو میں کہتا ہوں ادھر زمین داری چلانی بہت مشکل ہے۔"

"اس کی تو فکر نہ کر۔ یہ بتا' الاٹمنٹ تو مل گئی آگے کیا کرنا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کبضہ کیسے ملے گا؟"

"اس کے لیے سب سے پہلے یہ کرنا ہو گا کہ صدر دفتر جا کر آرڈر نکلوایا جائے۔ اسے لے کر

پٹواری سے ملا جائے۔ اس کی مٹھی گرم کی جائے۔ موجودہ مالکان کے انتقالات منسوخ کرائے جائیں اور اپنے نام کرا لیے جائیں۔" نادر خان نے مشورہ دیا۔ "یہ کام جلد سے جلد ہو جانا چاہیے' اگر موجودہ مالکان کو پتہ چل گیا اور انھوں نے عدالت میں مکدمہ دائر کر دیا تو بہت گڑ بڑ ہو گی۔ عدالت رجسٹر خسرہ گرداوری کی بنیاد پر الاٹمنٹ منسوخ کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک جو کارروائی ہوئی ہے وہ بالکل غیر کنونی ہے۔"

"یہ تو چاکر کو پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"تب ہی تو جی' میں نے کہا تھا چاکر اتنا ہشیار بندہ نہیں جتنا وہ خود کو ظاہر کرتا ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "زمین کا کبضہ لینے کے لیے کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟"

"بالکل ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو کبضہ مل ہی نہیں سکتا۔"

"میں اس کے بارے میں آج ہی شہ زور سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے نادر خان کو اطمینان دلایا۔

"بالکل کریں جی۔ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر خان بھی چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی' پھر رحیم داد کی آواز ابھری۔ اس نے کہا۔ "یہ کام بھی چاکر خان ہی کر سکتا ہے۔ عزیز گٹھوال کو بھی اس کے ساتھ لگا دوں گا۔"

"اسے ضرور لگائیں جی۔" نادر خان نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ "گٹھوال مجھے چاکر سے زیادہ ہشیار اور کام کا بندہ نظر آتا ہے۔"

"ایسا ہی کروں گا۔ دونوں کو لگا دوں گا تاکہ کام فٹافٹ ہو جائے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"چاکر اور گٹھوال کے ساتھ تو بھی چلا جا۔"

"میں نے صدر دفتر جا کر کیا لینا ہے۔" نادر خان نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "میں تو ادھر کے کسی افسر کو جانتا بھی نہیں۔"

"تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "تو ان کے ساتھ آسانی سے شہر پہنچ جائے گا۔ وہاں سے لہور چلا جانا۔ شاہ جی کراچی سے واپس آگیا ہو تو اسے بتا دینا کہ زمین کی الاٹمنٹ کے لیے میں ادھر ٹھیرا ہوا ہوں' کبضہ ملتے ہی اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" اس نے

قدرے تامل کیا۔ "شاہ جی سے ملنے کے بعد تو واپس کوٹلہ ہرکشن چلا جانا۔"

"سمہ آئے تو اس سے بات پکی کر لوں؟"

"بالکل کر لے۔ اس کے لیے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تجھے فصل کی سمگلنگ کرنی ہے تو وہ بھی کر لے۔ پر ساری ذمہ داری تیری ہی ہو گی۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ "اور یہ بھی سن لے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو تجھے ہی نمٹنا ہو گا۔ میں نے اس میں خود کو نہیں پھنسانا۔"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر خان نے رحیم داد کو یقین دہانی کرائی۔ "جیل بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا' پر تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔" اس نے جوش و خروش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "آزمائش کا وکت آیا تو دیکھ لینا میں تیرا کتنا وفادار اور جانثار ہوں۔"

"وہ تو مجھے پتہ ہے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "پر جو کچھ کرنا ہشیاری سے کرنا۔"

"اطمینان رکھیں جی۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔" نادر خان نے اسے ایک بار پھر یقین دلایا۔ "ویسے رفیع سمہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ اس کی اوپر سے نیچے تک سب سے یاری ہے۔ سمگلنگ سے خود کھاتا ہے تو دوسروں کو بھی کھلاتا ہے۔ ہر ایک کا اس نے بھتا باندھ رکھا ہے۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔ "برسوں سے یہ دھندا کر رکھا ہے۔ اب تک تو کسی چکر میں پڑا نہیں۔ تجھے پتہ نہیں' بہت شان سے رہتا ہے۔ میں تو اس کی ماڑی میں ٹھہر چکا ہوں۔"

"سمہ بھی تیری بہت تعریف کرتا ہے۔" نادر خاں لحہ بھر کے لیے رکا۔ "فصل کا روپیہ سمہ سے مل جائے تو زمین کی خریداری کے لیے حصے داروں اور زمین داروں کو بیعانہ دے دوں۔؟"

"تو ٹھیک سمجھتا ہے تو ضرور دے دے۔"

"چوہدری' سودا تو تیری واپسی کے بعد ہی طے ہو گا۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "بیعانہ دینے سے اطمینان ہو جائے گا۔"

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ نادر خاں نے کرسی چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "اجازت ہو تو جی' روٹی کھا لوں؟ جانے سے پہلے اور بھی ضروری باتیں پوچھ لوں گا۔"

"ہاں' اب تو جا۔" رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ "شہ زور مزاری ادھر آ گیا تو اس کے ساتھ روٹی کھا لوں گا۔ ورنہ اکیلے ہی کھاؤں گا۔ مجھے بھی بھوک معلوم ہو رہی ہے۔"

نادر خان کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆

دھوپ تیز ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ کچہری برخاست ہو گئی۔ رحیم داد یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ مقدمے کا کیا فیصلہ ہوا۔ مگر سردار شہ زور مزاری اس کے پاس نہیں آیا۔ وہ کچہری سے اٹھ کر سیدھا زنان خانے میں چلا گیا۔ چاکر خان سرگانی بھی نہ آیا۔

رحیم داد نے ڈیرے کے ملازم کو بلایا۔ کھانا منگوایا اور اکیلے ہی بیٹھ کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو سردار شہ زور خان مزاری سے رحیم داد کی ملاقات ہوئی۔

دونوں مہمان خانے کے پختہ چبوترے پر بیٹھے تھے۔ سامنے شراب کی بوتل رکھی تھی۔ گلاس تھے جن میں شراب تھی۔ دونوں ایک ایک پیگ چڑھا کر سرور کے عالم میں تھے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ چراغ روشن کر دیے گئے تھے۔ باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں کھانوں کی تیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "صبح کے مکدمے کے بارے میں تو نے کیا فیصلہ دیا۔" اس کے لہجے سے تجسس عیاں تھا۔

شہ زور مزاری نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "مکدمہ الجھا ہوا ہے' اگلی پیشی پر فیصلہ سناؤں گا۔ اب کی لمبی تاریخ دی ہے۔ اگلے مہینے سماعت کروں گا۔"

"مکدمہ تو بہت الجھا ہوا ہے۔" رحیم داد نے مقدمے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ "یہ بتا' تو نے فیصلہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"کارروائی پوری ہو جائے تو فیصلہ بھی دے دوں گا۔" سردار مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ "سرگانی بتاتا تھا گھوال آگیا ہے۔ تجھے مل بھی چکا ہے۔ تو نے اسے ملازم رکھنے کے بارے میں کیا سوچا؟"

"اسے لگا تو لوں' پر وہ کرے گا کیا؟"

"تیری زمیں داری کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور کیا کرنا ہے اس نے۔" سردار مزاری کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

"زمین داری کی دیکھ بھال تو وہ تب کرے گا جب زمین کا کبضہ مل جائے۔" رحیم داد نے شہ زور مزاری کو مطلع کیا۔ "ابھی تو الاٹمنٹ بھی پکی نہیں۔"

"پکی کیوں نہیں ہے؟" شہ زور نے حیران ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "میں تو کیسی گالہ کر

رہا ہے؟ میں نے تو اسے خود دیکھا ہے۔ تو نے بھی دیکھا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔ "الاٹمنٹ تو مل گئی پر رجسٹر خسرہ گرداوری میں زمین کے انتقالات تو مزارعوں ہی کے نام ہیں۔ اس طرح تو زمین کے کنونی مالک وہی ہوئے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "رجسٹر خسرہ گرداوری کے اعتبار سے تو اپنی الاٹمنٹ غیر کنونی بن جاتی ہے۔"

"پر چاکر خان نے تو یہ گالہہ مجھے نہیں بتائی۔"

"عزیز گٹھوال بتاتا تھا' وہ دلاور والا بھی گیا تھا۔ صدر دفتر میں کاغذات کی بھی جانچ پڑتال کر چکا ہے۔ اس نے پٹواری کے پاس رجسٹر خسرہ گرداوری بھی دیکھا۔"

"بہت ہشیار بندہ لگتا ہے۔"

"وہ تو یہ بھی بتاتا تھا کہ مزارعے بہت سرکش ہیں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "انتقالات ان کے نام ہیں۔ کبضہ ان کا پکا ہے۔ وہ تو بہت گڑبڑ ڈالیں گے۔ تجھے پتہ نہیں' اس متروکہ اراضی کی پہلے بھی کئی بار الاٹمنٹ ہو چکی ہے۔ پر مزارعوں نے کبضہ نہ دیا۔ بلکہ کئی نے تو پٹواری کی مٹھی گرم کر کے انتقالات اپنے نام کرا لیے۔"

سردار مزاری نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ اس کے چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔ اس نے فوراً چاکر خان سرگانی کو طلب کیا۔

ذرا دیر بعد چاکر خان آگیا۔

"چاکر' یہ تو نے چوہدری کے لیے کیسی الاٹمنٹ کرائی ہے؟" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی' جسے سرگانی نے بھی محسوس کیا۔ اس کے بشرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ اس نے مودب ہو کر جواب دیا۔ "سئیں سردار' تو نے تو الاٹمنٹ کا سرکاری حکم نامہ دیکھا ہے۔ چوہدری نے بھی دیکھا ہے۔ اس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں۔"

"گڑبڑ تو سرکاری ریکارڈ میں ہے۔" سردار مزاری نے سرگانی کو تیکھی نظروں سے دیکھا "تو نے بھی پتہ نہ کیا کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں اراضی کے انتقالات کئی مزارعوں نے اپنے نام کرا رکھے ہیں؟"

رحیم داد بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "اس طرح تو الاٹمنٹ غیر کنونی بن جاتی ہے۔"

"سئیں' چوہدری' تو فکر نہ کر۔" چاکر خان سرگانی نے نرم لہجے میں رحیم داد کو مطمئن کرنے کی

کوشش کی۔ "آج ہی دوپہر کو تیرے کاردار نادر خان سے میری گالہہ ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹھیک طرح سمجھا دیا ہے۔"

"کیا سمجھایا ہے تونے؟" سردار مزاری نے تحکمانہ لہجے میں سرگانی سے دریافت کیا۔

"سئیں سردار' میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں مزارعوں کے انتقالات منسوخ کرا کے چوہدری کے نام کروائے جائیں گے۔"

"پر یہ کام فٹافٹ ہونا چاہیے۔" اس دفعہ رحیم داد بولا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "مزارعوں کو الاٹمنٹ کا پتہ چل گیا تو وہ معاملہ عدالت میں لے جائیں گے۔"

"عدالت میں' تو وہ انتقالات منسوخ ہونے کے بعد بھی جا سکتے ہیں۔ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" چاکر خان سرگانی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "سئیں چوہدری' تو بالکل فکر نہ کر۔ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں چاہتا ہوں اس کام میں دیری نہ ہو۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔

سردار مزاری نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ "چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو کل صبح صدر دفتر کے لیے روانہ ہو جا۔ اور راہکوں کے انتقالات فٹافٹ منسوخ کرا کے چوہدری کے نام کرا دے۔ سرکاری ریکارڈ میں کوئی ایسا اندراج نہیں رہنا چاہیے جس سے آگے چل کر پریشانی اٹھانی پڑے۔"

"عزیز گشوال کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور میرے مینجر نادر خان کو بھی۔" رحیم داد نے چاکر خاں سے کہا۔ "نادر تیرے ساتھ ٹھیرے گا نہیں۔ اس نے لہور جانا ہے۔"

"سئیں جیسا حکم کریں' ویسا ہی ہو گا۔ میں کل ہی صبح گشوال اور نادر کے ہم راہ شہر چلا جاؤں گا۔" سرگانی نے سر جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔

"اب تو جا۔" سردار شہ زور مزاری نے چاکر خاں سرگانی کو حکم دیا۔

سرگانی مڑا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چبوترے کی سیڑھیوں سے نیچے اترا اور شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

صبح صدر دفتر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ رحیم داد کے کمرے میں آیا۔ رحیم داد اسی وقت غسل کر کے آیا تھا اور اپنے بھیگے ہوئے سر کے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہا تھا۔ سرگانی کے ہمراہ عزیز گشوال اور نادر خان بھی تھے۔

سرگانی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "سئیں چوہدری' میں شہر جا رہا ہوں۔" اس نے اپنی بات پر

زور دینے کی کوشش کی۔ ”تیرے ہی کام سے جا رہا ہوں۔ کوئی اور حکم میرے لیے ہو تو بتا دے۔“

”میں نے کیا بتانا ہے۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ ”تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کام فٹافٹ ہو جانا چاہیے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”سیں تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔“ اس بار عزیز گٹھوال نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس کا لہجہ نرم تھا، مگر اس میں مستعدی کی جھلک نمایاں تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سرگانی اور گٹھوال چلے گئے۔ نادر خان ٹھہر گیا۔ رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”نادر تو نے نہیں جانا؟“

”کیوں نہیں جانا؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”فیر تو ٹھیر کیوں گیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

نادر خان نے نہایت ادب سے دریافت کیا۔ ”میرے لیے کوئی اور حکم ہو تو بتا دیں۔“

”کل دن میں تو تجھ سے ساری باتیں ہو چکی ہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”ویسے میں بھی زیادہ دیر ادھر نہیں ٹھیروں گا۔“

نادر خاں چند لمحے ادب سے سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ پھر رحیم داد سے اجازت لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆

کئی روز گزر گئے، مگر نہ چاکر خان سرگانی واپس آیا اور نہ ہی عزیز گٹھوال۔ رحیم داد بے چینی سے ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ایک روز تو اس قدر اکتا گیا کہ اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ دلاور والا کی وہ اراضی، جو اسے الاٹ ہوئی تھی، کسی کے ہاتھ فروخت کر دے۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ ڈیرہ غازی خان کی سماجی زندگی سے، جس پر قبائلی رسم و رواج کی گہری چھاپ تھی، ہنوز مانوس نہیں ہو سکا تھا۔ اسے اجنبیت کا احساس قدم قدم پر ہوتا۔

اس نے طے کیا کہ اس سلسلے میں شہ زور خان مزاری سے اپنا مدعا بیان کرے گا اور اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی مرضی کے بغیر وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا نہ چاہتا تھا۔ ویسے بھی سردار مزاری کی مدد اور تعاون کے بغیر زمین فروخت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ مزاری کے علاوہ کسی کے ساتھ نہ اس کا ربط ضبط تھا نہ میل ملاپ۔ علاقے کی زمین داروں اور سرکاری افسروں سے کبھی ملاقات بھی ہوئی تو ہمیشہ سردار مزاری کے ساتھ ہی ہوئی۔ ان ملاقاتوں کی نوعیت بھی رسمی تھی اور صورت آشنائی تک محدود تھی۔

رحیم داد تمام دن دلاور والا کی اراضی بیچنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن رات کو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ہوا یہ کہ سردار مزاری سہ پہر ہی کو روجھان چلا گیا۔ اس کے بیمار اور ضعیف ماموں کی طبیعت ایک بار پھر بگڑ گئی تھی۔ وہ رات گئے تک واپس نہ آیا۔

رحیم داد نے کھانا کھایا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ فضا میں امس تھی۔ گھٹن تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ آسمان پر غبار چھایا تھا۔ مہمان خانے کا ایک ملازم سرہانے کھڑا آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ کروٹ بدل کر اس کا سرسری جائزہ لیا' پوچھا۔

"تو ادھر نیا نیا لگا ہے؟ میں نے تجھے پہلے نہیں دیکھا۔"

"سیں' تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" ملازم نے جواب دیا۔ "سردار نے پچھلے ہی جمعہ کو مجھے اپنا باٹھا لگایا ہے۔ مجھے ادھر آئے ہوئے آج بتیواں روز ہے۔"

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"اب تو جی سب مجھے دریاما کہتے ہیں۔"

"لگتا ہے پہلے تیرا نام کچھ اور ہوتا تھا۔"

"ہا سیں' میرا نام پہلے منصب ہوتا تھا۔" دریاما نے بتایا۔ "تب میں مظفر گڑھ میں گورمانیوں کے پاس چھمائی دار ہوتا تھا۔"

"تو گورمانیوں کے پاس کیوں نہیں رہا؟"

"سیں' تجھے پتہ ہی ہے۔ چھمائی دار' دونوں ہی فصلیں تیار کرتا ہے پر اسے فصل کی واڈھی پر راہ کی شاہ کی تو ملتی نہیں۔ کوئی تنخواہ بھی نہیں ملتی۔ کپڑا لتا بھی تب ملتا ہے جب بالکل پھٹ جاتا ہے۔ صرف روٹی ملتی ہے۔" دریاما آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "راہک یا مزارع تو را کی لینے کے علاوہ منجی پر بھی بیٹھ سکتا ہے۔ پر چھمائی دار تو صرف زمین پر بیٹھ سکتا ہے اور زمین دار کی اجازت کے بنا پرنا بھی نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "چھمائی دار تو سیں ویگار کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے اور ویگار کرتے کرتے ایک روز ختم ہو جاتا ہے۔"

"یہ بتا تو چھمائی دار کیسے بن گیا؟"

"سیں' گالہہ اس طرح ہے کہ میرے پیؤ نے زمین دار سے ترائے سو روپیہ ادھار لیا تھا۔ اس کی کھڑی فصل چھل اور سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ مویشی بھی بہہ گئے تھے۔ کچھ بھی نہ بچا تھا۔" دریاما نے بتایا۔ "زمین دار نے ادھار بھی دیا تو اس شرط پر کہ جب تک ادھار ادا نہ ہو گا تب تک میں اس کے پاس رہن رہوں گا۔ تب میں چوداں برس کا ہوتا تھا۔"

"تیرے پیو نے زمین دار کے تین سو ادھار کے ادا نہیں کیے؟" رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ قد زیادہ اونچا نہ تھا۔ مونچھیں سیاہی مائل تھیں مگر زیادہ گھنی نہ تھیں۔ "تو ۲۲ سال سے تو کم کا نہیں لگتا۔"

"سئیں، توں نے ٹھیک سوچا۔ ماں بتاتی تھی، جب میں پیدا ہوا تب کوئٹہ میں زلزلہ آیا تھا۔" اس نے رحیم داد کا قیاس درست قرار دیتے ہوئے کہا۔ "میں گرمانیوں کے پاس ست سال سے اوپر ہی رہا۔ میرے پیو کا ادھار ادا کرتے کرتے مرن ہو گیا۔ پر وہ کم نہ ہوا کچھ بڑھ ہی گیا۔"

"وہ کیسے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

"وہ ایسا ہے سئیں۔" دریاما نے وضاحت کی۔ "زمین دار کا کاردار ہر سال سود لگا کر ادھار کی رکم بڑھا دیتا تھا۔ میرا پیو جتنا ادا نہیں کرتا تھا سود اس سے زیادہ لگ جاتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "زمین دار تو سمجھو ادھار کے بدلے ساری ہی فصل اٹھا لے جاتا تھا۔"

"تب تو اس کا ادھار ادا ہو جانا چاہیے تھا۔"

"کیسے ادا ہو جاتا۔" دریاما نے بتایا۔ "سئیں، توں تو زمین دار ہے۔ توں نے پتہ ہے نائی، موچی، لوہار، ترکھان اور ایسے ہی سارے کمیوں کو فصل سے حصے کے طور پر جو روگ دیا جاتا ہے، وہ بھی راہک اور مزارعے کی ڈھیریوں سے دیا جاتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ "آدھا مالیہ بھی راہک کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے ٹیکس ہیں جو زمین دار کو دینے ہوتے ہیں۔ در ٹیکس، کھڑکی ٹیکس، ککڑ ٹیکس، بج ٹیکس، موتذن ٹیکس، پرنا ٹیکس، مرن ٹیکس، کتنے ہی تو ٹیکس ہیں اور سارے ہی فصل کی واڈھی پر زمیں دار کو ادا کیے جاتے ہیں۔ مزارعے یا راہک کے پاس فصل میں سے بچتا کیا ہے۔ بیج اور کھاد خریدنے کے لیے ہر فصل پر ادھار ہی لینا پڑتا ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "مطلب کی گل بات کر۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "یہ بتا تو نے اپنا نام کیوں بدلا؟"

"سئیں، میں یہی بتا رہا تھا۔" اس نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔ "وہ ایسا ہوا جی، مجھے وستی کی ایک رن سے پیار ہو گیا۔"

رحیم داد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے دریاما کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ "کون تھی وہ؟"

"سئیں، اس کا ناں سوجھلا تھا۔" دریاما کی آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ "ویسے تو وہ رنڈ

بیوہ تھی۔ پر دیکھنے میں بالکل کنواری لگتی تھی۔ جوان اور سوہنڑی تھی۔ بال بچہ بھی نہ تھا۔ کوئی بھی اس کا نہ تھا۔ صرف ایک بڈھا چاچا تھا۔"

"تو نے سوجھلا سے ویاہ کر لیا تھا؟"

"سئیں ارادہ تو یہی تھا۔" دریاما نے بتایا۔ "پر زمین دار کی مرضی کے بنا کیسے پرنا یا ویاہ کر سکتا تھا۔ میں نے اجازت مانگی تو وہ ایک دم گرم ہو گیا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔ تو چھمائی دار ہو کر پرنا کرے گا۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ توں اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ ابھی تو وہ ادھار بھی ادا نہیں ہوا جو تیرے پیو نے لیا تھا۔ چل دفع ہو یہاں سے۔ آگے ایسی گالہ سوچنا بھی نہیں۔" اس نے بجھی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں، وہ بہت وڈا زمین دار ہے۔ ہزاروں کلا زمین ہے اس کے پاس۔ وہ اتنا نراض ہوا کہ میں ڈر کر منت اور زاری کرنے لگا۔ پر اس کا کہتا کم نہ ہوا۔ اس نے اپنے کمدار کو بلا کر حکم دیا۔ اس کے سو جوتے لگا تاکہ آگے پرنا کرنے کی نہ سوچے۔ اس نے وہیں ٹھک ٹھک سو جوتے لگائے اور دھکے دے کر باہر نکال دیا۔"

"دریاے!" رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "تیرے زمین دار نے ٹھیک ہی تو کیا تو نے سوجھلا سے یاری لگانے سے پہلے یہ نہیں سوچا اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا، کپڑا لتا کیسے بنائے گا؟ تو چھمائی دار تھا۔ تجھے تنخواہ تو ملتی نہیں تھی۔ فصل سے بٹائی یا را کی بھی نہیں ملتی تھی۔ ویاہ یا پرنا کرتا تو گھر والی کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا۔"

"سئیں، وہ بہت محنتی ذال ہے۔ مونج سے رسیاں بٹتی۔ کھجور کی پتیوں سے پنکھے اور چٹائیاں بناتی۔" دریاما نے بتایا۔ "اور بھی کئی طرح کے کام کرتی تھی۔ اپنی روٹی تو وہ محنت کر کے کھا ہی سکتی تھی اور مجھے بھی کھلا سکتی تھی۔ وہ تو میرا بازو بن سکتی تھی۔"

"جب زمین دار نے پرنا کرنے کی اجازت نہ دی، تو تو نے کیا کیا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سئیں، میں نے یہ کیا۔ ایک رات جب سردی بہت تھی اور اندھیارا بھی تھا، میں نے سوجھلا کو اپنے ساتھ لیا اور چھپتا چھپاتا دستی سے نکل کر خانے وال پہنچا۔ ایک ملاں سے نکاح پڑھوایا اور وہ میری رن بن گئی۔"

"خانے وال میں تو کیا کرتا رہا؟"

"خانے وال تو میں تھوڑے دن رہا۔" دریاما نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں بتایا۔ "میں وہاں سے رحیم یار خان پہنچا اور مخدوموں کے پاس چلا گیا۔ سئیں، میں ریاستی ہوں۔ میرا دادا بھی ادھر ہی کا ہوتا تھا۔ میرا وڈا بھرا وہاں راہک تھا۔ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے مجھے اور

میری رن سوجھلا کو مخدوموں کے پاس لگا دیا۔ وہ حویلی میں کام کرتی تھی اور میں پہریدار لگا دیا گیا۔ وہ حویلی مخدوم کے وڈے پتر' مخدوم زادے کی تھی۔ وہ جی بہت وڈا حاکم ہے' صوبائی وزیر ہے۔ ریس میں گھوڑے دوڑاتا ہے۔ سیاست لڑاتا ہے۔ بینکوں سے ادھار لیتا ہے اور کبھی واپس نہیں کرتا۔ عیش کرتا ہے۔ بہت ٹھاٹھ ہیں جی اس کے۔"

"سنا ہے اس کی تو کئی گھروالیاں ہیں۔ حویلیاں بھی کئی ہوں گی۔"

"سیں یہ تو میں نے پتہ نہیں' اس کی حویلیاں کتنی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ پر ذال کئی ہیں۔" وریاما نے مسکرا کر کہا۔ "ایک کو تو اس نے چھوڑ رکھا ہے۔ وہ کراچی میں ہوتی ہے۔ نائی کا کام کرتی ہے ادھر۔"

رحیم داد نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "نائی کا کام کرتی ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہا سیں' میں نے یہی سنا ہے۔ تجھ سے میں نے جھوٹ نہیں بولنا۔" وریاما نے دبی زبان سے کہا۔ "اس نے یہ کام ولایت جا کر سیکھا ہے۔ پر وہ صرف رناں کے بال کاٹتی ہے۔ اس کے پاس کئی ذال ملازم ہیں۔ وہ بد شکل رن کو سوہنڑی اور بڈھی کو جوان بنا دیتی ہے۔ اس کی بہت آمدنی ہے جی۔ ویسے بھی اسے مخدوم زادے سے مہر میں بہت روپیہ ملا ہے۔ سیں' اس نے تو ایک فلم بھی بنائی ہے۔ بہت زبردست رن ہے۔ مخدوم زادہ اب تک اس سے ڈرتا ہے۔"

"یہ تو نے بہت عجب گالہ سنائی۔" رحیم داد ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

وریاما نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا تو مسکرا کر بولا۔ "سیں' تجھے ایک اور عجب گال سناؤں۔"

"ضرور سنا۔" رحیم داد نے اس کی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

"سیں' وہ ایسا ہوا کہ مخدوم زادے کو ایک وڈے سرکاری افسر کی بیٹی سے پیار ہو گیا۔ دونوں میں بہت دن تک یاری چلتی رہی۔ پر جب مخدوم زادے نے اس سے پرنا کرنا چاہا تو پہلے تو اس کے پیو نے انکار کر دیا۔ فیر اس نے ایک کڑی شرط لگائی۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور خاموشی سے پنکھا جھلنے لگا۔

رحیم داد اس کی خاموشی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "پرنا یا ویاہ کرنے کی کیا شرط لگائی تھی اس نے؟"

"اس نے یہ شرط لگائی کہ پرنا تب ہی ہو سکتا ہے جب مخدوم خود اپنے پتر کا بازو منگن کے لیے

اس کے پاس آئے۔" وریاما نے بتایا۔ "یہ شرط اس لیے لگائی تھی کہ اسے پتہ تھا کہ مخدوم باز و منگن کے لیے نہیں آئے گا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مخدوم اس رشتے کے سخت خلاف ہے۔ اصلی گالہہ یہ ہے سئیں کہ وہ اپنی بیٹی کا مخدوم زادے سے پرنا کرنا ہی نہ چاہتا تھا۔"

"آگے کیا ہوا؟" رحیم داد نے بے توجہی سے پوچھا۔

"مخدوم زادے نے اپنے پیو کی بہت منت کی اور کسی نہ کسی طرح اسے راضی باضی بھی کر لیا۔" وریاما نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "مخدوم باز و منگن کے لیے گیا۔ پر مخدوم زادے کے ساتھ سرکاری افسر کی بیٹی کا پرنا نہ ہو سکا۔"

"کیوں؟" رحیم داد نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"سئیں، میں نے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ مخدوم واپس آیا تو وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔" وریاما نے نہایت سادگی سے بتایا۔ "پر اب وہ مخدوم کی رن تھی۔ اور مخدوم زادے کی سوتیلی ماں بن چکی تھی۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" رحیم داد نے یقین نہ ماننے کے انداز میں پوچھا۔

"ہا سئیں، بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مخدوم زادے کو پتہ چلا ہو گا تو بہت نراض ہوا ہو گا۔"

"نا سئیں، اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ چپ کر کے بیٹھ گیا۔"

"پر مخدوم تو بہت بوڑھا ہے۔" رحیم داد کے بشرے سے تعجب جھلک رہا تھا۔ "کڑی کے پیو نے اس کے ساتھ کیسے ویاہ کر دیا؟"

"پتہ نہیں جی، مخدوم نے کیا چکر چلایا۔" وریاما نے بتایا۔ "مجھے تو یہ ملوم ہے وہ اب مخدوم کی گھر والی ہے۔"

"مخدوم زادے نے اپنے پیو کی اس زیادتی اور حق ماری پر کچھ نہیں کیا؟" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "اس نے کچھ نہ کچھ رولا تو ضرور ڈالا ہو گا۔"

"اس نے صرف اتنا کیا۔" وریاما نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "اس نے چپکے چپکے اس سے یاری لگا رکھی ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "اب تو مخدوم کو بھی اس یاری آشنائی کا پتہ چل گیا ہے۔ پر اس نے کبھی شور شرابہ نہیں کیا۔"

"بدنامی کے ڈر سے چپ کر کے رہ گیا ہو گا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" وریامے نے مختصر جواب دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "وریامے' تو نے یہ نہیں بتایا کہ تیرا نام منصب سے وریاما کیسے پڑ گیا۔ تو نے خود بدلا ہے؟"

"نا سئیں' میں کیوں ایسا کرنے لگا۔" اس نے وضاحت کی۔ "ایک روز مخدوم کا حکم آیا کہ میں اپنا نام بدل کر وریام رکھ لوں۔ یہ حکم اس لیے آیا تھا کہ اس کے ایک پوتے کا نام انھی دنوں منصب رکھا گیا تھا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "مخدوم یہ کیسے سن سکتا تھا کہ اس کے معمولی نوکر کا نام بھی وہی ہو جو ایک مخدوم زادے کا تھا۔ سئیں' اس طرح میں منصب سے وریام بن گیا۔ فیر آگے چل کر وریاما ہو گیا۔"

"تو مخدوموں کے پاس سے ادھر کیسے آ گیا؟"

وریاما نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑا ہولے ہولے پنکھا جھلتا رہا۔

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"سئیں' ڈر لگتا ہے۔" وریاما نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "یوں سمجھ لے میری مت ماری گئی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مخدوم کی ایک بیٹی نے میرے ساتھ کے ایک پہریدار کے ساتھ یاری لگا رکھی تھی۔ وہ تھا بھی من موجی اور سوہنڑا گبھرو۔ سب کو مخدوم زادی کے ساتھ اس کی یاری کا پتہ تھا۔ پر مجھے خیر خواہی سوجھی۔ ایک روز مخدوم کی پاس پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔"

"مخدوم نے تیری گل بات سن کر کیا کیا؟"

"سئیں' وہ تو ایک دم گرم ہو گیا۔" وریاما نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں کہا۔ "اتنا زیادہ ناراض ہوا کہ جھٹ ایک کمدار کو بلایا' اور اسے حکم دیا کہ مجھے جیل میں ڈال دیا جائے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "سئیں اس کی اپنی جیل ہے۔ ایسی ہی جیسے ادھر کے سرداروں کی ہوتی ہے۔"

"تو جیل میں کب تک رہا؟"

"میں جیل گیا ہی نہیں۔" اس نے بتایا۔ "کمدار مجھے جیل کی طرف لے کے چلا تو رستے میں' میں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بہانہ بنایا کہ سخت درد ہو رہا ہے۔ پہلے تو اس نے آنکھیں دکھائیں پر جب میں نے اس کی بہت منت کی تب وہ مجھے ٹٹی کرانے کے لیے کھیتوں کی طرف لے گیا۔ شام کا اندھیارہ تو پھیلا ہی تھا۔ کھیتوں میں گھستے ہی میں اس کی نظروں سے بچتا بچاتا دھیرے دھیرے ایک طرف نکل گیا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی مخدوموں کی وستی سے دور چلا گیا۔"

"تیری گھروالی ادھر ہی رہ گئی؟"

"ہا سئیں' وہ ادھر ہی ہے۔" دریاما نے بتایا۔ "میرے اس طرح فرار ہونے پر میری رن کو سزا ملی۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ میرے بھرا کو بھی سزا دی گئی۔ اسے حکم دیا گیا کہ مجھے پکڑ کر حاضر کرے ورنہ اڑھائی ہزار جرمانہ بھرے۔ جب تک جرمانہ ادا نہ ہو گا جیل میں رکھا جائے گا۔ سئیں' وہ بہت غریب ہے' حلیم ہے۔ معمولی راہک ہے۔ اتنا بھاری جرمانہ کیسے ادا کرتا۔ اس لیے اسے بھی جیل میں بند کر دیا گیا۔"

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ "خود تو صاف بچ کر نکل آیا۔ اپنے بھرا اور گھروالی کو پھنسوا دیا۔ ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔"

"سئیں' توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری ہی وجہ سے دونوں کو جیل جانا پڑا۔" اس نے نظریں جھکا کر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر میں کرتا بھی کیا۔ مخدوم کے پاس چلا جاؤں تو وہ مجھے جیل میں تو ڈال ہی دے گا پتہ نہیں اور جانے کتنی کڑی سزا دے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو اب اڑھائی ہزار روپے اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ بھرجائی کو پہنچا دوں۔ جرمانہ مل جائے تو مخدوم میرے بھرا کو رہا کر دے گا۔ وہ باہر نکلنے کے بعد منت زاری کر کے میری رن سوجھلا کو بھی جیل سے رہائی دلا سکتا ہے۔"

"تو نے اب تک کتنا روپیہ اکٹھا کر لیا؟"

"ابھی تو پورے اڑھائی سو بھی اکٹھے نہیں ہوئے۔" دریاما نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مخدوموں کی دستی سے نکلنے کے بعد پہلے تو میں ملتان میں گیلانیوں کے پاس رہا۔ ادھر میرے چاچا کا ایک پتر ہوتا ہے۔ میرے اس سوتر نے مجھے گیلانیوں کے ڈیرے پر لگوا دیا۔"

"تو نے گیلانیوں کی نوکری کیوں چھوڑ دی؟"

"سئیں' تجھے یہ تو پتہ ہو گا۔ گیلانی بھی گدی نشین اور مخدوم زادے ہوتے ہیں۔ بہت وڈے زمیں دار بھی ہیں۔" دریاما نے بتایا۔ "گیلانیوں کو کسی طرح میرے بارے میں پتہ چل گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر مخدوموں کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ میرے سوتر کو گیلانیوں کے ارادوں کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ اس نے مجھے بتا دیا۔ اب ادھر رہنا خطرناک تھا۔ اس لیے میں بھاگ کر یہاں آگیا۔ پر سئیں' میں نے ادھر بھی زیادہ دن نہیں ٹھیرنا۔" اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "سئیں توں سدا جیویں' رب راضی ہووے' توں سردار سے یہ گالہہ نہ بتانا۔"

"فکر نہ کر۔ میں تیرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔" رحیم داد نے اسے اطمینان دلایا۔

"پر مجھے یہ بتا تو ادھر ٹھیرنا کیوں نہیں چاہتا۔"

"سئیں، ادھر رہ کر میں اڑھائی ہزار روپیہ کبھی اکٹھا نہیں کر سکوں گا۔" دریاما نے وضاحت کی "گیلانیوں کے پاس ہوتا تھا تو ڈیرے پر وڈے زمین دار اور سرکاری افسر روز ہی آکر ٹھیرتے تھے۔ مجھے بخشیش دیتے تھے۔ پر ادھر تو بالکل سُکا معاملہ ہے۔ نہ بخشیش نہ انعام، کچھ بھی ملتا ملاتا نہیں۔"

اس کے انداز میں حسن طلب تھا۔ رحیم داد فوراً بھانپ گیا کہ بن بلائے وہ کیوں اس کے پاس آیا اور پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ اس خدمت گزاری کا مطلب اس پر واضح ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت وہ اسے کچھ دے نہیں سکتا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دریاما سے دریافت کیا۔

"تو ادھر آیا ہی کیوں؟ ملتان کی طرح کسی اور وڈے شہر کی طرف نکل جاتا۔ کسی ایسے زمین دار کی حویلی پر لگ جاتا جس کے ڈیرے پر وڈے افسر اور زمین دار آکر ٹھیرتے ہوں۔"

"ایسا ہی کروں گا جی۔ میرا ارادہ کراچی جانے کا ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کتنا وڈا شہر ہے۔ ادھر کام بھی مل جاتا ہے اور مزدوری بھی ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔" دریاما نے بتایا۔ "ادھر تو سئیں، میں مخدوموں اور گورمانیوں کی سزا سے بچنے کی لیے آگیا تھا۔ میں نے تو کوئی سنگین جرم بھی نہیں کیا۔ وہ جو کتل، ڈکیتی اور ایسے ہی دوسرے وڈے وڈے جرم کرتے ہیں، ادھر سے بھاگ کر اسی طرف آتے ہیں۔ کسی وڈے سردار کے بانھے یا نوکر بن جاتے ہیں۔ سردار کی پناہ مل جائے تو نہ پولیس کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ کنون نہ عدالت۔ ادھر تو سرداروں ہی کا کنون چلتا ہے۔ سئیں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

رحیم داد نے غور کیا، دریاما بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جس طرح دوسرے اضلاع اور علاقوں کے مقابلے میں دریاما یہاں خود کو محفوظ سمجھتا ہے اسی طرح کوٹلہ ہرکشن کی بہ نسبت وہ بھی ڈیرہ غازی خاں میں زیادہ محفوظ ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں کسی بھی وقت اس کا کوئی ایسا قرابت دار یا شناسا مل سکتا ہے جو اسے پہچان لیتا۔ پولیس سے مخبری کر دیتا۔ پھر جیل ہی نہیں اسے پھانسی پر لٹکنا پڑتا۔ نام اور حلیہ تبدیل کرنے کی باوجود خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ڈیرہ غازی خان میں یہ خطرہ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں نہ کسی جان پہچان والے سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ تھا نہ پولیس کا دھڑکا۔ اس نے دلاور والا کی اراضی فروخت کرنے اور اس سلسلے میں سردار شہ زور مزاری سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

☆

شہ زور مزاری روجھان سے واپس آگیا تھا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ وہ کچہری میں بیٹھا مقدمات کے فیصلے سنا رہا تھا۔ رحیم داد بھی کچہری میں حسب معمول دل بہلانے اور وقت گزارنے کی غرض سے چلا گیا۔

اس نے دیکھا چاکر خان سرگانی کچہری میں موجود تھا۔ سردار مزاری بھی پر نہایت آن بان سے بیٹھا تھا۔ اس کے روبرو بدھیل سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا۔ چہرہ ویران اور اجڑا ہوا تھا۔ افلاس اور سخت محنت نے اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا تھا۔ وہ بدھیل کی ماں تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ مگر غذایت کی کمی کے باعث اس کا جسم بڑھنے اور پھیلنے کے بجائے سکڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کم نظر آ رہی تھی۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے بکل مار کر چہرہ کسی قدر چھپائے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے پھیلے تھے۔

سردار شہ زور خان مزاری نے گردن موڑ کر سرگانی کو دیکھا۔ اونچی اور گرج دار آواز سے بولا۔ "چاکر!" اس نے ہاتھ اٹھا کر بدھیل کی جانب اشارہ کیا۔ "اس نے چٹی کی شرائط پوری کر دیں؟"

"ہا سئیں!" چاکر خاں سرگانی نے نہایت ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔ "بدھیل نے جرمانے کی رکم اور مکدمے کی فیس جمع کرا دی ہے۔ ماں اور بھین کو بھی لے آیا ہے۔ دونوں کچہری میں حاضر ہیں۔"

سردار نے بدھیل کی ماں اور بہن کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر حکم دیا۔ "فیصلے کی رو سے ساوَنی کو بدھیل کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ساوَنی کی ماں کو اڑھائی سو روپے تاوان کے دیئے جائیں۔ بدھیل کی ماں اور بھین کو کوٹ میں رکھا جائے۔ وہ اب ادھر ہی رہیں گی۔"

کچہری پر سکوت طاری ہو گیا۔ بدھیل کی ماں نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنسو ٹپ ٹپ کر رخساروں پر گرنے لگے۔ بیٹی، جواب تک حیران و پریشان کھڑی تھی، ماں کو آنسو بہاتے دیکھ کر رونے لگی۔

سردار مزاری نے ساوَنی کو بلوایا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ روپ اب نکھر گیا تھا۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ لباس اجلا تھا۔ جسم بھی اب پہلے کی نسبت سڈول اور کسی قدر بھاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں دوشیزگی کی حیا اور جھجک کے بجائے بے باکی اور شوخی نمایاں تھی۔

سردار مزاری نے ساوَنی کو بدھیل کے حوالے کرتے ہوئے نصیحت کے ساتھ ساتھ تنبیہہ بھی

کی۔ "اسے لے جا۔ ابھی جا کر مسجد کے ملاں کو بلانا اور اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لینا۔ اب میں تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام نہ سنوں' ورنہ کڑی سزا دوں گا۔"

بدھیل گڑگڑا کر دعائیں دینے لگا۔ "سیں سردار سدا جیویں' بالیں بچیں سکھی صحت ہوویں' خیر سلا ہو۔ رب راضی ہو۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ "الایا گلایا معاف۔"

ساوُنی آگے بڑھی اور بدھیل کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

بدھیل نے مڑ کر ماں اور بہن کو دیکھا۔ گہری سانس بھری۔ دونوں سسکیاں بھرنے لگیں۔ وہ ان سے رخصت ہوتے ہوئے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ گردن جھکائی' مڑا اور آستین سے آنسو پونچھتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا۔ ساوُنی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بدھیل کی ماں اور بہن ایک کارندے کی نگرانی میں کچہری کے باہر چلی گئیں۔ دونوں کو کوٹ میں پہنچا دیا گیا۔

☆

کچہری برخاست ہونے کے بعد چاکر خان سرگانی فوراً رحیم داد کے کمرے میں پہنچا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "جس کام کے لیے تو گیا تھا اس کا کیا بنا؟" اس کے لہجے سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

"سیں تیرا حکم چاہیے۔" وہ چہک کر بولا۔ "تیرا کام ہو گیا۔ ایک دم پکا کام ہو گیا۔ رجسٹر خسرہ گرداوری میں اراضی کے انتقالات کا اندراج تیرے نام ہو گیا۔ پچھلے انتقالات خارج کر دیے گئے۔ میں نے اپنے سامنے پٹواری سے کرائے ہیں۔" وہ کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسا۔ "کرتا کیسے نہیں۔ صدر دفتر کا حکم تھا۔ فیر اس کی مٹھی بھی تو ٹھیک طرح گرم کی تھی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اس کے بغیر تو سیں کام چلتا ہی نہیں۔"

"مجھے پتہ تھا تو پکا ہی کام کر کے آئے گا۔ سردار بالکل ٹھیک کہتا ہے' چاکر تو بہت ہشیار بندہ ہے۔" رحیم داد نے خوش ہو کر داد دی۔ "یہ بتا عزیز گھوال کدھر ہے؟ وہ اب تک نظر نہیں آیا۔"

"سیں' چوہدری میں نے اسے ادھر چھوڑ دیا۔" سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ یہ پتہ کر کے آئے گا کہ کبضہ ملنے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی۔ اگر ایسا امکان ہوا تو اس کا پہلے سے بندوبست کر لیا جائے۔"

سرگانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد کی دو روز تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تیسرے روز دن ڈھلے وہ آیا۔ عزیز گٹھوال اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں خاموشی سے سرکنڈوں کے موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ گٹھوال نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی بشرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ سرگانی بھی گم صم تھا۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "گٹھوال! کیا خبر لایا؟ تو پریشان پریشان نظر آرہا ہے۔"

"سیں گالہہ ہی ایسی ہے۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"صاف صاف بتا۔" رحیم داد نے گٹھوال کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"سیں، کبضہ ملنے میں بہت مشکل پڑے گی:" گٹھوال نے بتایا۔ "انکالات خارج ہونے کی اطلاع میرے پہنچنے سے پہلے ہی دلاور والا پہنچ گئی تھی۔ وہ تو جی بہت سرکش اور جھگڑالو بندے ہیں۔ میں نے ان کو نرمی سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو میرے گلے پڑ گئے۔ غصے سے آنکھیں نکال کر زور زور سے چیخنے چلانے لگے۔"

"تو نے کیا کیا؟" رحیم داد کی آواز اونچی ہو گئی۔ چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔

"سیں، میں نے کیا کرنا تھا۔ چپ کر کے چلا آیا۔" عزیز گٹھوال نے مسکین سی صورت بنا کر صفائی پیش کی۔ "ویسے تو وہ تعداد ۱۸ ہیں۔ ان میں سے بھی صرف ۱۰ نے مالکانہ حکوک حاصل کر لیے تھے۔"

"وہی جن کے انکالات خارج کر دیے گئے؟"

"ہا سیں۔" گٹھوال نے بتایا۔ "اٹھ تو ابھی تک راہک اور مزارعے ہیں۔ ان کا کبضہ تو پہلے ہی غیر کنونی تھا۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "پر سیں، وہ سب ایک ہیں۔ انھوں نے آپس میں سنگت کر رکھی ہے۔ سب ہی ایک دوسرے کی پوری طرح مدد کر رہے ہیں۔"

"پنڈ کے دوسرے بندے کیا کہتے ہیں؟" رحیم داد نے صورت حال پوری طرح سمجھنے کی غرض سے کرید کر دریافت کیا۔ "تو ان سے بھی ملا تھا؟"

"پہلے میں انھی سے ملا تھا۔" گٹھوال نے مطلع کیا۔ "ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پوری وستی ہی راہکوں اور مزارعوں کے ساتھ ہے۔"

"وہ تو سیں ہونا ہی چاہیے۔" چاکر خان سرگانی پہلی بار بولا۔ "برسوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں۔ کوم بھی ایک ہے۔ سارے ہی توبوھڑ ہیں۔ آپس میں گہرے رشتے ناتے ہیں۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ عزیز گٹھوال بھی کچھ نہ بولا۔ مگر چاکر خان زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔

اس نے رحیم داد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "سیں، فکر کی کوئی گالھ نہیں۔"

"دلاور والا تو گیا تھا یا گٹھوال؟" رحیم داد نے جھنجلا کر کہا۔ "اسے ادھر کے بارے میں زیادہ پتہ ہے یا تجھے؟"

"سیں، نراض نہ ہو۔" سرگانی نے نرم لہجے میں کہا۔ "گٹھوال سے ساری باتیں میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔ مجھے سب پتہ ہے اور اس کے بارے میں برابر سوچتا بھی رہا ہوں۔"

"کیا سوچا تو نے؟" رحیم داد کے چہرے سے جھنجلاہٹ بدستور عیاں تھی۔

"سیں، تجھے تو پتہ ہی ہے۔ زمیں داری میں تو ایسے چکر چلتے ہی رہتے ہیں۔" اس کا لہجہ بدستور اطمینان بخش تھا۔ "راہکوں کے ساتھ تو ایسے جھگڑے نت نئے روز کی گالھ ہے۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔" رحیم داد نے سرگانی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"سیں، میں سردار کو سب کچھ بتا دوں گا۔ تو بھی اس سے بات کر لینا۔" چاکر خان سرگانی نے وضاحت کی۔ "سردار عظمت اللہ دریشک سے مدد لینی ہو گی۔ وہ اپنے سردار کا گہرا یار ہے۔ دلاور والا اسی کے علاکے میں ہے۔ سردار عظمت اللہ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اور بہت زور آور سردار بھی ہے۔ وہ مدد کرے گا تو کبضہ ایک ہی روز میں مل جائے گا۔ سارے راہکوں اور مزارعوں کی سرکشی اور اکڑ رسی کے بل کی طرح نکال کر رکھ دے گا۔ سیں، تو بالکل فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چاکر خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گٹھوال بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں چلے گئے۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ چاکر خان سرگانی کے اطمینان دلانے کے باوجود اس کی پریشانی رفع نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔

☆

شام نکھری نکھری تھی۔ فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی تھی۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی۔ مگر اب مطلع صاف تھا۔ ہوا کے نرم نرم جھونکوں میں سرسراہٹ تھی، شگفتگی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے دوڑ رہے تھے۔

سردار شہ زور خان مزاری اور رحیم داد مہمان خانے کے وسیع صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

رحیم داد نے دلاور والا کی اراضی کا قضیہ چھیڑ دیا۔ وہ کسی قدر پریشان اور فکرمند نظر آ رہا تھا۔ لیکن سردار مزاری اس کی ذہنی پریشانی سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔ "سیں چوہدری، فکر نہ کر۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے سوچ رکھا ہے آگے کیا کرنا ہو گا۔"

"تو نے کیا سوچا؟" رحیم داد کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"سرکش اور جھگڑالو راہکوں کو بے دخل کر کے اپنے راہک لگانے ہوں گے۔ ان کو بے دخل نہ کیا گیا تو آگے بھی تنگ کرتے رہیں گے۔"

"بے دخل کرنے کی صورت میں تو بہت گڑبڑ ہو گی۔" رحیم داد نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "پرانے مزارے ہیں' آسانی سے بے دخل نہیں ہوں گے۔"

"آسانی سے تو کوئی بھی راہک اور مزارع زمین نہیں چھوڑتا۔" سردار مزاری کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "ان کو تو زبردستی بے دخل کرنا پڑتا ہے۔"

"پر یہ تو سوچ' دلاور والا تیری زمین داری سے دوری پر ہے۔"

"مجھے بھی پتہ ہے کہ دلاور والا میری زمیں داری سے دوری پر ہے۔" شہ زور خان مزاری نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "پر مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ دلاور والا تمن دریشک کے علاقے میں ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں تجھے متروکہ اراضی کی ادھر الاٹمنٹ نہ دلاتا۔"

"دریشکوں کے بارے میں جا کر بھی بتاتا تھا کہ زمین کا کبضہ لینے کے لیے ان سے مدد مل سکتی ہے۔"

"اس نے بالکل ٹھیک سوچا۔ صرف مدد نہیں' پوری پوری مدد مل سکتی ہے۔" سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "عظمت اللہ دریشک ادھر کا سردار ہوتا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ زور آور اور با اثر بھی ہے۔ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ ہزاروں ایکڑ پر اس کی زمیں داری پھیلی ہوئی ہے۔"

"تب تو سب سے پہلے اس سے مشورہ کرنا ہو گا۔"

"خالی مشورہ ہی نہیں' راہکوں کو بے دخل کرنے کے لیے اس سے کچھ بندے بھی لینے ہوں گے۔"

"پولیس کی مدد بھی لینی ہو گی۔"

"بالکل لینی ہو گی۔" شہ زور خان مزاری نے اتفاق رائے کیا۔ "پولیس کی مدد کے بغیر کام آسانی سے نہیں بنے گا۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو اعتماد میں لینا ہو گا۔"

"یہ تو بہت ضروری ہے۔"

"بالکل ضروری ہے۔" مزاری نے وضاحت کی۔ "راہکوں اور مزارعوں کو بے دخل کرنے کے لیے پولیس کی مدد سے ان کے خلاف کئی طرح کے مکدمے بنوانے ہوں گے۔ جو راہک زیادہ اکڑ

دکھائیں گے اور گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ان کو گرفتار کر کے تھانے میں بلوانا ہو گا۔ حوالات میں بند کر کے پٹائی کرانی ہو گی۔" اس نے داد طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "ان میں ڈر اور خوف پیدا کرنے اور دہشت بٹھانے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ تو سمجھ گیا نا میری بات کا مطلب؟"

"سمجھ گیا' بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "یہ بتا اُدھر کے تھانے دار سے بھی تیری یاری ہے؟"

"پتہ نہیں' آج کل اُدھر کون تھانے دار لگا ہے۔" سردار مزاری نے رحیم داد کے سوال کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ "تھانے دار کوئی بھی ہو' اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ عظمت اللہ دریشک کا تو یار ہی ہو گا۔ صرف تھانے دار ہی نہیں سارے ہی سرکاری افسروں سے اس کی یاری ہے۔ ویسے تو تحصیل راجن پور کے سرکاری افسروں سے اپنی بھی گہری یاری ہے۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ "سیں چوہدری' یہ تو تجھے بھی اچھی طرح پتہ ہو گا۔ سرکاری افسروں سے یاری دوستی کے بغیر زمین داری نہیں چل سکتی۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے اپنی ذہنی الجھن کا اظہار کیا۔ "تیری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے یہ معاملہ تو لمبا ہی کھنچے گا۔"

"لمبا بھی ہو سکتا ہے۔" سردار مزاری نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"پر میں تو اب زیادہ روز ادھر نہیں ٹھیر سکتا۔" رحیم داد کے لہجے میں بے زاری اور اکتاہٹ نمایاں تھی۔ "مجھے کوٹلہ ہر کشن جانا ہے۔ اور جلد ہی جانا ہے۔ میں نے ادھر کتنے ہی ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ ادھر آئے ہوئے تجھے کافی دن ہو گئے۔" سردار مزاری نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں کوشش کروں گا تیرا کام جلد سے جلد ہو جائے۔"

"ایسا کر اپنے یار سردار عظمت اللہ دریشک کو مشورے کے لیے یہاں بلوا لے۔" رحیم داد نے تجویز پیش کی۔ "ویسے ٹھیک تو یہی رہے گا کہ خود ہم کو اس کے پاس جانا چاہیے۔"

"تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" سردار شہ زور مزاری نے اس کی تجویز کی تائید کی۔ "اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل ہی صبح اس کی طرف چلتے ہیں۔"

اس نے چاکر خان سرگانی کو طلب کیا۔ وہ آیا تو اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور ضروری ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

صبح، سورج نکلنے سے قبل سردار شہ زور خان مزاری کی کار حویلی کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور کار کے نزدیک ہی موجود تھا۔ چاکر خان سرگانی بھی ایک طرف کھڑا تھا۔

سردار مزاری پھاٹک سے نمودار ہوا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ عزیز گٹھوال دونوں کے پیچھے پیچھے ادب سے سر جھکائے چل رہا تھا۔ چاکر خان نے بڑھ کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ مزاری کار میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو اس نے اپنے ساتھ بٹھایا۔ عزیز گٹھوال کو آگے کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاکر خان سرگانی باہر ہی کھڑا رہا۔ وہ ان کے ہم راہ نہ گیا۔

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی۔ آن کی آن میں آگے بڑھی اور گرد و غبار کے بادل اڑاتی ہوئی کچے راستے پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

دن ڈھلنے سے پہلے پہلے کار راجن پور پہنچ گئی۔

۴۳

راجن پور میں سردار شہ زور خاں مزاری کے قیام کو دوسرا روز تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ مزاری کو پروگرام کے مطابق جانا تو عظمت اللہ دریشک کے پاس تھا مگر راجن پور میں عطاء اللہ خان بزدار مل گیا۔ وہ اس کا پرانا ملنے والا تھا۔ اس نے اصرار کیا تو مزاری ٹھہر گیا۔

سہ پہر کو وہ رحیم داد کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باہر نکلا۔ رحیم داد کو رائے بہادر ہیورام کی حویلی دکھائی۔ حویلی پرانی تھی، لیکن بہت عالیشان تھی۔ رحیم داد کو پسند بھی آئی۔ اس وقت تک کسٹوڈین کی تحویل میں تھی اور کسی کو الاٹ نہ ہوئی تھی۔ شہ زور مزاری نے رحیم داد کا عندیہ معلوم کیا تو اس نے حویلی کے الاٹمنٹ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

سردار مزاری کی بھی خواہش تھی کہ حویلی رحیم داد کو الاٹ ہو جائے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں یہ حویلی دکھانے اسی لیے لایا تھا کہ تجھے پسند ہو تو اس کی الاٹمنٹ کے لیے کوشش کی جائے۔"

"پر اس میں تو کئی مہاجر خاندان ٹھہرے ہوئے ہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "قبضہ لینے کے لیے ان کو بھی بے دخل کرنا ہو گا۔" اس کے لہجے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "دلاور والا کی اراضی کی طرح اس پر بھی جھگڑا کھڑا ہو گا۔"

"اگر دلاور والا کی زمین کا قبضہ مل سکتا ہے تو اس کا بھی مل جائے گا۔" سردار مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ویسے میرا خیال ہے الاٹمنٹ کے لیے درخواست تو لگا ہی دینی چاہیے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے سردار مزاری کی تجویز سے اختلاف نہ کیا۔ "الاٹمنٹ کی

درخواست لگانے میں اپنا کیا جاتا ہے۔"

"میں شام کو اپنے وکیل راشد احمد انصاری کو بلاؤں گا۔" سردار مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ "اس سے الاٹمنٹ کی درخواست تیار کروالوں گا۔ آگے کی کارروائی وکیل کے مشورے سے چاکر اور گنھوال کرتے رہیں گے۔ تجھے الاٹمنٹ کے لیے ادھر ٹھیرنا نہیں پڑے گا۔"

"تیرا وکیل راجن پور ہی میں ہوتا ہے۔"

"ہاں وہ ادھر ہی ہوتا ہے۔ ویسے تو میرے اور بھی کئی وکیل ہیں۔ پر کوئی مکدمہ پیچیدہ ہو تو میری طرف سے راشد انصاری ہی پیروی کرتا ہے۔" شہ زور خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "بہت ہشیار وکیل ہے تو اس سے مل کر خوش ہو گا۔ دلاور والا کی زمین کی الاٹمنٹ کی درخواست بھی اسی نے تیار کی تھی۔ الاٹمنٹ دلانے میں چاکر کی مدد بھی کی تھی۔"

"تب تو دلاور والا کی زمین کے جھگڑے کا بھی اس کو پتہ ہو گا۔"

"بالکل ہو گا۔ پر اس سلسلے میں میری اب تک وکیل سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔"

"شام کو تو وہ آرہا ہے نا؟"

"ضرور آئے گا۔ دلاور والا کی زمین کے بارے میں اس سے مشورہ لینا ہے۔" شہ زور خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "اس سے مشورہ لینے ہی کے لیے تو میں ادھر ٹھیر گیا۔ سوچا عظمت اللہ دریشک سے ملنے سے پہلے کنونی پہلو بھی پوری طرح سمجھ لینا چاہیے۔"

"ویسے تو بھی کسی وکیل سے کم کنون نہیں جانتا۔" رحیم داد نے سردار شہ زور مزاری کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ ویسے قانونی مہارت کے معاملے میں وہ مزاری سے مرعوب بھی تھا۔ "تو روز ہی کچہری لگاتا ہے۔ ایسے الجھے ہوئے اور پے چیدہ مکدموں کے فیصلے کرتا ہے کہ کئی بار تو میں حیران رہ گیا۔"

"پر وکیل، وکیل ہی ہوتا ہے۔" شہ زور خاں مزاری نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ "راشد نے دیوانی اور فوجداری ہر طرح کا کانون پڑھ رکھا ہے۔ بلکہ اکثر اپنی کچہری کے مکدمات کے بارے میں اس سے مشورہ بھی لے لیتا ہوں۔"

"جب سے تیرے ساتھ ٹھیرا ہوں، میں نے تو کبھی راشد انصاری وکیل کو تیرے پاس مشورہ دینے کے لیے آتے نہیں دیکھا۔"

"میں اسے بہت کم مشورے کے لیے بلاتا ہوں۔ پچھلے دنوں اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" شہ زور مزاری نے وضاحت کی۔ "سچ پوچھ تو کانون کے بارے میں جو کچھ میں نے سیکھا۔ وہ اپنے پیؤ

سے سیکھا۔ وہ کچہری میں مقدمات کی کارروائی کے دوران ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ بعد میں بھی ان کے بارے میں بتاتا تھا۔ وہ بہت زبردست بلوچ سردار تھا۔ سرکاری عدالتیں تک اس کے فیصلے کو مانتی تھیں۔"

"فیصلے تو تیرے بھی کم زبردست نہیں ہوتے۔" رحیم داد بدستور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

سردار شہ زور مزاری مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

شام کو وکیل سردار شہ زور مزاری کے پاس آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ چہرے مہرے سے سنجیدہ اور بردبار نظر آتا تھا۔ لباس اور وضع قطع سے استغنا اور بے نیازی جھلکتی تھی۔ وہ سونی پت کا رہنے والا تھا۔ تعلیم دہلی میں حاصل کی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو کسی نہ کسی طرح جان بچا کو بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور مہاجر بن گیا۔ کچھ عرصہ لاہور میں وکالت کی مگر جی نہیں۔ سونی پت میں مکان کے علاوہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا کلیم داخل کیا جو منظور ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کی تو ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل راجن پور میں زرعی اراضی اور ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ گزشتہ پانچ برس سے وہ وہیں مقیم تھا۔ زمین داری کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وکالت بھی کرتا تھا۔

وکیل جب پہنچا تو سردار مزاری کے علاوہ رحیم داد اور عزیز گھوال بھی موجود تھے۔ سردار مزاری نے رحیم داد سے وکیل کا تعارف کرایا۔ دلاور والا کی اراضی کے بارے میں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وکیل نے تمام باتیں توجہ سے سنیں۔ الاٹمنٹ آڈر اور دوسری متعلقہ دستاویزات کا مطالعہ کیا۔

"راشد تو کس نتیجے پر پہنچا؟" شہ زور مزاری نے وکیل کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

"یہ تو جی آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ الاٹمنٹ کی درخواست میں نے ہی تیار کی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ معلوم ہے۔" وکیل نے اظہار خیال کیا۔ "کیس بہت مضبوط ہے۔ الاٹمنٹ بھی پکا ہے۔ رہ گیا زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مسئلہ تو یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں عام طور پر جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔"

"اسی جھگڑے کو نمٹانے کے لیے تو تجھ سے مشورہ کرنا ہے۔" سردار مزاری نے وکیل سے کہا۔ "یہ بتا آگے کیا کارروائی کرنی ہے۔"

"آپ نے اپنے طور پر اس سلسلے میں کیا سوچا؟"

"میرا تو یہ خیال ہے کہ سارے راہکوں کو فوری طور پر بے دخل کر دیا جائے۔" شہ زور مزاری نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "وہ کبنہ دینے میں پہلے ہی تنگ کر رہے ہیں' آگے اور زیادہ کریں گے۔"

"راہکوں اور مزارعوں کو بے دخل کرنے کے تمام حربے اور طریقے آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اب تک کتنے ہی مزارعوں کو بے دخل کر چکے ہیں۔ آپ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔" وکیل نے مسکرا کر شہ زور مزاری کی طرف دیکھا۔ "جہاں تک اس تنازعے کے قانونی پہلو کا تعلق ہے تو یہ سیدھا سیدھا دیوانی کیس ہے۔ لیکن اسے فوجداری بنانا ہو گا۔ تب ہی کام بنے گا۔"

"وہ کیسے ؟" اس دفعہ رحیم داد بولا جو اب تک خاموش بیٹھا تھا۔

"وہ اس طرح کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت' عدالت سے زمین قرق کروائی جائے۔" وکیل نے قانونی چارہ جوئی کا طریقہ کار کسی قدر وضاحت سے بتایا۔ "اس میں زیادہ لمبا چکر بھی نہیں۔ تھانے میں صرف اس مضمون کی رپٹ درج کرانی ہو گی کہ زمین کے قبضے کے سلسلے میں چونکہ مزارعوں کے ساتھ تنازعہ ہے لہٰذا ان کی طرف سے نقص امن کا شدید خطرہ ہے۔ وہ آمادہ فساد ہیں۔ پولیس کیس رجسٹر کرنے کے بعد چالان مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دے گی۔"

"تب تو پولس کے ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کو بھی ملانا ہو گا۔ اس کی مٹھی بھی گرم کرنی ہو گی۔" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"چوہدری صاحب' یہ آپ کی درد سری نہیں۔ اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔" اس نے مسکرا کر شہ زور مزاری کی جانب اشارہ کیا۔ "اس معاملے کو آپ مزاری صاحب پر چھوڑ دیں۔ ان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ پولیس اور مجسٹریٹ سے کس طرح کام لیا جائے۔ کس طور ان کی مدد حاصل کی جائے۔"

"سن چوہدری' یہ تیرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ راشد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھے نہ تھانے جانے کی ضرورت ہے نہ عدالت۔" سردار مزاری نے گردن اکڑا کر رعونت سے مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ "تھانیدار اور مجسٹریٹ خود تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔" وہ وکیل کی جانب متوجہ ہوا۔ "راشد' یہ بتا آگے کیا کارروائی کرنی ہو گی؟"

"کارروائی تو مجسٹریٹ کو کرنی ہو گی۔" وکیل کھل کر مسکرایا۔ "مزاری صاحب' میں اس سلسلے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ قانونی چارہ جوئی کے ذریعے مزارعوں اور

راہکوں کو کس طرح بے دخل کیا جاتا ہے۔ آپ کو تو اس کے علاوہ بھی دوسرے تمام حربوں اور طریقوں کا اچھی طرح پتہ ہے۔"

"میں چاہتا ہوں چوہدری کو بھی پتہ چل جائے آگے کیا کیا کرنا ہوگا۔"

"آپ کو تو اچھی طرح علم ہے کہ مجسٹریٹ ایسے مقدمات میں عام طور پر مزارعے یا راہک کی غیر حاضری میں زمین قرق کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔" وکیل نے قانونی چارہ جوئی کی مزید تفصیل بتائی۔ "اس حکم کے ذریعے مزارعے کو زمین کے نزدیک جانے' ہل چلانے' پانی لگانے اور فصل کاٹنے سے روک دیا جاتا ہے۔"

"ایسی صورت میں تو مکدمہ مہینوں کیا برسوں چل سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"آپ نے جی بالکل ٹھیک سوچا۔" وکیل نے اس کے خیال کی تائید کی۔ "سچ پوچھیے تو ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ بلکہ آپ کی طرف سے تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مقدمہ زیادہ سے زیادہ طول پکڑتا جائے۔"

"وہ کیوں؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

"وہ اس لیے کہ عدالت میں روز روز کی پیشیوں سے مزارع پریشان ہو جاتا ہے۔ مقدمہ بازی کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ قدم قدم پر روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مزارعے کو اس کے لیے قرض ادھار لینا پڑتا ہے۔ مقدمہ جس قدر طول پکڑتا جاتا ہے' قرض کا بوجھ اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔" وکیل کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ "ایک طرف تو وہ مالی پریشانی کا شکار ہوتا ہے دوسری طرف دباؤ ڈالنے کی خاطر قرقی کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے بہانے پولیس کی جانب سے طرح طرح کے چالان کیے جاتے ہیں۔ تھانے میں بلا کر دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ آخر وہ اتنا تنگ آجاتا ہے کہ سمجھوتہ کرنے کے لیے منت سماجت کرتا ہے۔ زمین دار کے پیروں پر پگڑی ڈال دیتا ہے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو بدحواس ہو کر صرف زمین ہی نہیں' اپنی آبائی بستی تک چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔"

"سیں چوہدری' یہ تو تجھے بھی پتہ ہے کہ لمبی مکدمے بازی کے لیے راہک کے پاس نہ روپیہ ہوتا ہے نہ وکت۔ وہ تو کچھ ہی مدت بعد حوصلہ چھوڑ بیٹھتا ہے۔" سردار مزاری نے وکیل کی تائید کرتے ہوئے مزید وضاحت کی۔ "تب ہی تو مالک کی جانب سے پیش کار کو رشوت دے کر پیشیاں بڑھائی جاتی ہیں۔ لمبی لمبی تاریخیں لی جاتی ہیں۔"

"میں تیرا اور وکیل کا مطلب بالکل سمجھ رہا ہوں۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا برملا اظہار کیا۔ "پر میں تو اتنی مدت تک ادھر ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ تو بہت لمبا چکر ہے۔ میں نے کوٹلہ ہر کشن واپس جا کر ادھر کی زمین داری دیکھنی ہے۔ کئی ضروری کام ہیں جن کو نمٹانا ہے۔"

"چوہدری نور الٰہی صاحب' آپ کو ادھر ٹھہرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" وکیل نے اس کی مجبوری محسوس کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ "آپ نے اگر مجھے اپنا وکیل مقرر کیا تو مقدمے کی پیشیوں سے تو میں نمٹ لوں گا۔ ویسے مناسب تو یہ ہو گا کہ آپ مختار نامہ دے کر مقدمے کی پیروی اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے کسی کو اپنا مختار بنا دیں۔"

"سیں چوہدری یہ تو تجھے کرنا ہی پڑے گا۔" شہ زور مزاری نے وکیل کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "گھوال کو تو نے ملازم تو رکھ ہی لیا ہے۔ اسی کو اپنا مختار بنا دے۔ تیری غیر حاضری میں آگے تو اسی نے کام چلانا ہو گا۔"

"تو کہتا ہے تو اسے مختار نامہ دے دوں گا۔" رحیم داد نے بھی اختلاف رائے نہ کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کی۔ "پر ساری ذمہ داری تجھے ہی لینی ہو گی۔ عزیز گھوال جو بھی کارروائی کرے گا تیری اجازت اور مشورے ہی سے کرے گا۔"

"اس بارے میں تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" مزاری نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔

"تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔"

وکیل نے جانے کے لیے اٹھنا چاہا تو سردار مزاری نے اسے ٹوکا۔ "سیں راشد' تجھے دو ضروری کام کرنے ہوں گے۔ ایک تو تجھے گھوال کے لیے مختار نامہ تیار کرنا ہو گا اور دوسرے یہ کہ رائے بہادر ہیتو رام کی حویلی الاٹ کرانے کے لیے چوہدری کی طرف سے درخواست بھی تیار کرنی ہو گی۔"

"مگر اس حویلی کے معاملے میں تو بہت جھگڑے چل رہے ہیں۔"

"چلنے دے۔" شہ زور مزاری نے وکیل سے کہا۔ "درخواست لگانے میں کیا جاتا ہے۔ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے الاٹمنٹ مل جائے۔ کبضہ لینے کے بارے میں بعد میں سوچ لیں گے۔" اس نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا۔ "اپنا وکالت نامہ بھی لیتا آنا۔ چوہدری سے دستخط کرا لینا۔ مکدمہ چلانا پڑا تو پیروی تجھے ہی کرنی ہو گی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "پر یہ سارے کام جلد ہی ہونے چاہئیں۔"

"میں ساری دستاویزات کل دس بجے تک تیار کر کے لے آؤں گا۔" وکیل نے سردار مزاری کو

اطمینان دلایا۔ صبح آنے کا وعدہ کیا اور اٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے روز راشد احمد انصاری وکیل وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ مگر وہ مطلوبہ دستاویزات تیار نہیں کر سکا تھا۔ اس نے معذرت کی تو شہ زور خان مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "فکر کی کوئی گالہہ نہیں، بعد میں تیار کر لینا۔ میں نے تو آج عظمت اللہ دریشک کے پاس جانا ہے۔ اس سے بھی اس سلسلے میں صلاح مشورہ کرنا ہے۔ تجھے ادھر ہی بلا لوں گا۔"

وکیل نے وکالت نامے پر رحیم داد سے دستخط کرائے اور مطمئن ہو کر چلا گیا۔

☆

سردار شہ زور مزاری نے راجن پور کو خیرباد کہا۔ رحیم داد اور عزیز گھوال کے ساتھ کار میں بیٹھ کر فاضل پور کی جانب روانہ ہوا۔ سفر زیادہ لمبا نہ تھا۔ لیکن دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا راہ گیر نظر آتے تھے۔ کار فراٹے بھرتی سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

سردار دریشک کا گاؤں 'کوٹ اکبر' سڑک سے دور تھا۔ مگر خاصا بڑا گاؤں تھا۔ فاضل پور سے نزدیک بھی تھا۔ کوٹ اکبر جانے کے لیے ایک کچی سڑک فاضل پور سے جاتی تھی۔ کار فاضل پور پہنچ کر اسی کچی سڑک پر مڑ گئی۔ کوٹ اکبر میں داخل ہوئی اور سردار دریشک کی حویلی کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔

عظمت اللہ دریشک اس وقت اپنی حویلی میں موجود تھا۔ سردار شہ زور مزاری کے آنے کی اطلاع ملی تو ہنستا مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ نہایت گرم جوشی سے شہ زور مزاری سے بغل گیر ہوا۔ مزاری نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ اس سے بھی گلے ملا۔ خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

اس نے بلوچوں کے روایتی انداز میں حال احوال پوچھنے کے بعد سوال کیا۔ "سیں شہ زور' یہ بتا تو اچانک کیسے آ گیا؟ میں تو دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شہر جانے والا تھا۔ اچھا ہوا تو پہلے ہی آ گیا۔" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"آرام سے بیٹھ کر بات ہو گی۔" شہ زور خان مزاری نے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو سخت گرمی ہے۔ اندر چل۔"

سب مہمان خانے میں پہنچے۔ اطمینان سے بیٹھے تو سردار دریشک نے اپنا سوال دھرایا۔ "اب بتا کیسے آنا ہوا؟"

شہ زور مزاری نے اپنی آمد کی غایت بیان کی۔ عظمت اللہ دریشک نے پوری توجہ سے اس کی

ایک ایک بات سنی۔ اس کے چہرے پر رفتہ رفتہ سنجیدگی طاری ہوتی گئی۔ کچھ دیر وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ ”مجھے دلاور والا کی اس متروکہ اراضی کے بارے میں ٹھیک طرح پتہ ہے۔ یہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ پہلے بھی کئی مہاجروں کو الاٹ ہوئی۔ پر کبضہ کسی کو نہ مل سکا۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تو نے چوہدری کو کہاں پھنسا دیا؟ الاٹمنٹ لینے سے پہلے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔“ اس کے لہجے میں شکوہ کرنے کا انداز تھا۔

”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔“ سردار مزاری نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”اب تو الاٹمنٹ لے ہی لی ہے۔ اور زمین کا کبضہ بھی لینا ہے۔“ اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ ”یہ بتا تو اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہے؟“

”جو مدد تو چاہے گا کروں گا۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ”جان مانگے گا تو تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تیری مدد سے تو تمن دار بھی انکار نہیں کر سکتا۔ آپس کا پرانا اتحاد اور سنگت جو ٹھیرا۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ویسے تو میرا یار بھی ہے۔ تیری مدد نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”وہ تو مجھے پتہ تھا کہ تو پوری پوری مدد کرے گا۔ ورنہ میں چوہدری کے ساتھ تیرے پاس آتا ہی کیوں۔“ سردار مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بتا آگے کیا کرنا ہے؟“

عظمت اللہ دریشک نے اپنے کاردار غوث بخش لاشاری کو بلایا۔ وہ حاضر ہوا تو اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”غوث' میں نے انکار نہیں سننا۔ چوہدری کو کبضہ ملنا چاہیے۔“ اس نے چہرے پر رعب اور دبدبہ طاری کیا۔ ”یہ کام کرنا ہے اور ہر صورت میں کرنا ہے۔“ عظمت اللہ نے مڑ کر سردار شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ”تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے' شہ زور سے میری کتنی گہری یاری ہے۔ یہ خود چل کر میرے پاس مدد کے لیے آیا ہے۔ اس کی مدد تو کرنی ہی کرنی ہے۔“

”سیں سردار! توں جو حکم کرے گا ویسا ہی ہو گا۔“ غوث بخش لاشاری نے نہایت مستعدی سے سردار عظمت اللہ کو یقین دلایا۔

”یہ بتا' آگے کیا کارروائی کرنی ہے؟“ سردار دریشک نے سوال کیا۔

”دلاور والا کے کئی چھوٹے زمین دار اور راہک میرے جاننے والے ہیں۔ ان سے ملوں گا۔ پوچھ تاچھ کروں گا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اس معاملے میں وہ کس انداز سے سوچ رہے ہیں۔“ غوث بخش لاشاری نے جواب دیا۔ ”جب تک پورے طور پر حالات کا پتہ نہ چلے گا تب

تک کوئی کارروائی کیسے کی جا سکتی ہے۔ حالات کو سامنے رکھ کر آگے کے بارے میں سوچنا ہو گا۔"

"ادھر کی زمیں داری کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے چوہدری نے اسے لگایا ہے۔" شہ زور مزاری نے گھٹوال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "اس کا نام عزیز گھٹوال ہے۔ یہ دلاور والا گیا بھی تھا۔ غوث تو اس کی بھی سن لے۔ تجھے حالات کو سمجھنے میں اس سے بھی مدد ملے گی۔"

عزیز گھٹوال نے بتایا۔ "سَیں، تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ ادھر چوہدری کو اڑھائی سو ایکٹر زرعی اراضی الاٹ ہوئی ہے جس پر ۱۸ راہک کاشت کرتے ہیں۔ سب ہی پرانے راہک ہیں۔ ان میں سے اٹھ ایسے ہیں جنھوں نے ہندو مالک کے ہندوستان جانے کے بعد زمین پر ناجائز کبضہ کر رکھا ہے۔ دس کے پاس مالکانہ حکوک ہوتے تھے۔ پر اب نہیں رہے۔"

"وہ کس طرح؟" غوث بخش لاشاری نے عزیز گھٹوال سے کرید کر پوچھا۔

"صدر دفتر کے حکم پر ان کے انتقالات خارج ہو کر چوہدری کے نام ہو چکے ہیں۔" گھٹوال نے مطلع کیا۔ "پٹواری نے رجسٹر خسرہ گرداوری میں ان کا اندراج بھی کر دیا ہے۔"

"تب تو کام آسانی سے بن سکتا ہے۔" عظمت اللہ دریشک نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ "غوث تو ایسا کر۔ پہلے ان اٹھ راہکوں سے ملنے کی کوشش کر، جن کے پاس کبھی مالکانہ حکوک نہیں رہے۔ ان کو اطمینان دلا کہ جیسے وہ پچھلے زمین دار کے راہک تھے ویسے ہی چوہدری کے رہیں گے۔ ان کو بالکل تنگ نہیں کیا جائے گا۔ آرام سے کاشت کرتے رہیں۔" اس نے اپنی تجویز کی کسی قدر وضاحت کی۔ "ٹھیک سے کوشش کی جائے تو ان کو اپنے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ دوسرے راہک تو انتقالات منسوخ ہونے کی وجہ سے سخت نراض ہوں گے۔ وہ تو جھگڑا ڈالیں گے۔ ان کے بارے میں آگے سوچا جائے گا کہ کس طور نمٹا جائے۔"

"سَیں سردار، وہ سب ایک ہیں۔" عزیز گھٹوال نے مداخلت کی۔ "ان کا آپس میں بہت سنگت اور اتحاد ہے۔"

"سب سے پہلے اسی سنگت کو توڑنا ہو گا۔ تب ہی تو کام بنے گا۔" عظمت اللہ دریشک نے گھٹوال سے کہا۔ "یہ بہت ضروری ہے۔" وہ غوث بخش لاشاری کی جانب متوجہ ہوا۔ "غوث تو یہ کوشش کر کہ ان میں کسی نہ کسی طرح پھوٹ پڑ جائے۔" اس نے سردار مزاری کی طرف مسکرا کر داد طلب نظروں سے دیکھا۔ "شہ زور! ایسا کرنا ٹھیک رہے گا؟"

"تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" شہ زور مزاری نے اس کی تجویز سے پورا پورا اتفاق کیا۔ "اٹھ راہک ٹوٹ کر اپنے ساتھ آ گئے تو دوسرے کمزور پڑ جائیں گے۔"

غوث بخش لاشاری نے بھی سردار دریشک کی تائید کی۔ "سیں سردار' جیسا تو نے سوچا ہے ویسے ہی کرنا ہو گا۔"

"پر تو خود دلاور والا نہ جانا۔" عزیز گھوال نے غوث بخش کو خبردار کیا۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے آگے کیا کرنا ہے۔" غوث بخش لاشاری نے عزیز گھوال کی تنبیہہ کو اہمیت نہ دی۔

"غوث اب تو جا۔" سردار دریشک نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "جیسا میں نے کہا ہے تو نے ویسا ہی کرنا ہے۔"

غوث بخش لاشاری نے سردار عظمت اللہ دریشک کو یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا۔ اور اس سلسلے میں جو کوشش کرے گا اس سے جلد ہی مطلع کرے گا۔

☆

غوث بخش لاشاری خلاف توقع شام کو نہ آیا۔ دوسرے روز سہ پہر کو آیا۔ سردار دریشک اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ شہ زور مزاری اور رحیم داد بھی بیٹھے تھے۔ عزیز گھوال بھی موجود تھا۔ وہ تینوں سے ذرا ہٹ کر گردن جھکائے ادب سے بیٹھا تھا۔

سردار دریشک نے غور کیا کہ غوث بخش لاشاری کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے غوث بخش کی جانب دیکھا' دریافت کیا۔ "غوث' تو پریشان پریشان نظر آرہا ہے۔ لگتا ہے کام بنا نہیں۔"

"ہا سیں' معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ آسانی سے کام نہیں بنے گا۔" غوث بخش نے بجھے ہوئے لہجے میں مطلع کیا۔

"تو راکھوں سے ملا تھا۔ کیا کہتے تھے وہ؟"

"سیں سردار' وہ تو بہت لمبی لمبی باتیں کرتے ہیں۔" غوث بخش لاشاری نے عظمت اللہ دریشک کو بتایا۔ "میں نے ان کو بہت سمجھایا۔ اطمینان بھی دلایا۔ پر وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔"

"مجھے پہلے ہی ملوم تھا کہ وہ کسی طرح راضی باضی نہیں ہوں گے۔" عزیز گھوال نے اپنی ناکامی کے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں بھی ان سے ملا تھا۔ ہر طرح سمجھایا بجھایا۔" اس نے مڑ کر شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ "سیں سردار' تجھے پتہ ہے' میں نے تجھے اور چوہدری کو یہی بتایا تھا نا؟"

"تو چپ کر۔" عظمت اللہ دریشک نے غصے سے گھوال کو ڈانٹا۔ دریشک کو اس کی مداخلت

نہایت شاق گزری۔ اس نے غوث بخش کو مخاطب کیا۔ "غوث تو بتا۔ کیا کہتے تھے وہ؟"

"سیں، تیری ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے میں سب سے پہلے اٹھ راکھوں کے وڈوں اور وڈیروں سے ملا۔ آرام سے ان کو سمجھایا۔ پر وہ اپنی ہی کہتے رہے۔ میری کسی گالہہ کو مان نے اور سمجھنے کو تیار ہی نہ ہوئے۔"

"وہ اس طرح کیوں اڑے ہوئے ہیں؟" عظمت اللہ دریشک نے غوث بخش لاشاری سے سوال کیا۔

"ان کی تو سیں، دلیل ہی نرالی ہے۔"

"کیا دلیل ہے ان کی؟ میں بھی تو سنوں۔" سردار دریشک نے غوث بخش لاشاری سے سوال کیا۔

اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔

"سیں، میں ان کے ایک نمائندے کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔" غوث بخش نے مطلع کیا۔ "وہ تجھے اپنی دلیل خود ہی بتا دے گا۔"

"کدھر ہے وہ؟" دریشک نے چونک کو پوچھا۔

"حویلی کے باہر بیٹھا ہے۔" غوث بخش لاشاری نے بتایا۔ "تیری اجازت ہو تو میں اسے بلا لوں۔"

"ضرور بلا۔" دریشک نے اجازت دے دی۔ "اسے پیش کر۔ تو نے یہ ٹھیک کیا کہ اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اس سے صاف صاف گالہہ ہو گی۔"

غوث بخش لاشاری فوراً حویلی سے باہر گیا۔ واپس آیا تو ایک ادھیڑ مزارع اس کے ہم راہ تھا۔ وہ لاشاری کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ مگر مضبوط اور گٹھا ہوا۔ قد نکلتا ہوا تھا۔ گردن قدرے جھکی ہوئی تھی۔ سر پر ملگجی پگڑی تھی۔ بال کھچڑی تھے۔ لباس بھی میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ بار، بار پگڑی کے شملے سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ بدن سے بھی پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔

عظمت اللہ دریشک کے روبرو پہنچتے ہی اس نے حسب دستور دعائیہ کلمات ادا کیے۔ "سیں سردار، سکھی صحت ہوویں، بالیں بچیں، یاریں دوستیں، سب کو خیر سلا ہوویں۔ مال جان، مال ڈھگی کوں خیر ہوویں۔ رب راضی ہویں۔"

عظمت اللہ نے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

"نصیر بوھڑ۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"راہکوں نے تجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے؟"

"نا سیں!" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مجھے کسی نے نمیندا ئمیندا نہیں بنایا۔ نہ مجھے کسی نے بھیجا۔" اس نے مڑ کر غوث بخش لاشاری کی جانب دیکھا۔ "سیں نے بلایا۔ میں چلا آیا۔"

"تو اسے جانتا ہے؟" عظمت نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ تیرا زمیں دار چوہدری نور الٰہی ہے۔ آگے تو نے اسے راہ کی یا بٹائی دینی ہو گی۔ اپنا زمین دار ماننا ہو گا۔ پوری پوری عزت دینی ہو گی۔"

نصیر بوھڑ نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش کھڑا رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ چلچلاتی دھوپ سے جھلسا ہوا تھا جس پر اس وقت گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

"تو نے میری گالہ کا جواب نہیں دیا؟" سردار دریشک نے قدرے بلند آواز سے پوچھا۔

"سیں سردار، تیرے کاردار نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پہلے دیکھا نہیں تھا، اب دیکھ لیا۔"

"یہ میری گالہ کا جواب نہیں ہے۔" عظمت اللہ دریشک کا لہجہ تیکھا تھا۔

"سیں سردار، میں نے جو جواب دینا ہے، تیرے کاردار کو پتہ ہے۔" اس نے مڑ کر غوث بخش لاشاری پر نظر ڈالی۔ "اس نے تو تجھے سب کچھ بتا ہی دیا ہو گا۔ میں نے اب کیا کہنا۔"

"یہ کہتا تھا تو چوہدری کو اپنا زمیں دار ماننے کو تیار نہیں۔"

"سیں، میں ماننے نہ ماننے والا کون ہوتا ہوں۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "اور بھی کئی بندے ہیں۔"

"وہ چوہدری کو زمیں دار اور اپنے تئیں راہک ماننے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" دریشک نے استفسار کیا۔

"سیں، پہلے وہ راہک یا مزارے ہوتے تھے اب نہیں رہے۔"

"زمین دار بن گئے ہیں وہ؟" سردار دریشک کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"اب نہیں بنے۔ پچھلے کئی سال سے زمیں دار ہیں۔" نصیر بوھڑ نے بلا جھجک جواب دیا۔

"کیسے بن گئے زمیں دار؟ کس نے ان کو زمیں دار بنایا؟" سردار دریشک کے لہجے میں استعجاب تھا۔ شہ زور مزاری اور رحیم داد کے چہروں سے بھی حیرت جھلک رہی تھی۔ وہ نظریں اٹھائے

نصیر بوھڑ کو دیکھ رہے تھے جو نہایت سکون سے ان کے روبرو کھڑا تھا۔

"سیں سردار، توں نے ٹھیک طرح پتہ ہے۔ جب پاکستان بننے جا رہا تھا تب مسلم لیگی لیڈر ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ جلسے کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے۔ تجھے یاد ہے نا؟" نصیر بوھڑ نے سردار دریشک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"مجھے یاد ہے، بالکل یاد ہے۔" سردار عظمت اللہ دریشک نے اعتراف کیا۔ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ "صاف صاف گالہہ کر۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"سیں، انھوں نے چیخ چیخ کر اور بار بار کہا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے الیکشن میں پرچی ڈالو تاکہ پاکستان بن جائے۔ اور جب پاکستان بن جائے گا تو زمین وڈے زمین داروں اور جگیر داروں سے چھین کر کسانوں اور راہکوں کو دے دی جائے گی۔ جس زمیں پر ہل چلاتے ہیں، وہ ان کی ہو جائے گی۔ وہ مزارعے اور راہک نہیں رہیں گے زمین دار بن جائیں گے۔" نصیر بوھڑ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "تب ہی تو سیں، سارے راہکوں نے مسلم لیگ کے لیے بکسوں میں پرچیاں ڈالیں۔ اور پاکستان بن گیا۔"

"اور تم نے زمین پر کبضہ کرلیا اور زمین دار بن گئے۔" سردار دریشک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ مڑ کر سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ "شہ زور تو اس کی گالہہ سن رہا ہے۔"

شہ زور مزاری تو خاموش رہا مگر نصیر بوھڑ خاموش نہ رہا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سردار عظمت اللہ دریشک سے کہا۔ "سیں سردار، ہم نے کسی کی زمین نہیں چھینی۔ جو زمین میرے پاس ہے، اس پر میں راہک کے طور پر برسوں ہل چلاتا رہا۔ میرا پیئو بھی چلاتا رہا۔ اس کا پیئو بھی چلاتا رہا۔ یہ زمین پہلے ایک ہندو زمیں دار کی ہوتی تھی۔ وہ بہت وڈا زمین دار تھا۔ اس کے پاس ہزاروں کلا زمین ہوتی تھی۔ پاکستان بنا تو وہ بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔ اس کی زمین کا کوئی مالک نہ رہا۔"

"جب کوئی مالک نہ رہا تو تم نے اس کی زمین دبالی اور زمین دار بن گئے۔" سردار عظمت اللہ دریشک نے نصیر بوھڑ کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "تم سب نے یہ نہیں سوچا۔ ایسے بھلا کوئی زمیں دار بن سکتا ہے۔ کنون بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ لوٹ تو نہیں لگی ہے کہ جس کا جی چاہا زمین پر کبضہ کرلیا اور راہک سے مالک بن بیٹھا۔"

"سیں، یہ اکیلے میرے سوچنے کی گالہہ نہیں۔ سب اسی طرح سوچتے ہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "نہ وہ کسی اور کو زمیں دار ماننے کو راضی ہیں نہ را کی یا بٹائی دینے کو۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری سے پہلے بھی کئی مہاجروں نے اس زمین کی الاٹمنٹ لی پر

کبضہ کسی کو نہ ملا۔ بہت جھگڑا ڈالا پر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے۔" اس دفعہ اس نے براہ راست رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "سیں چوہدری 'توں وڈا زمیں دار ہے۔ سنا ہے تیرے پاس پہلے بھی بہت زمین ہے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "تجھے پتہ نہیں ہم سب غریبی ملیمی میں کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ توں ہم کو کیوں تنگ کرنا چاہتا ہے؟"

"چوہدری کسی کو تنگ کرنا نہیں چاہتا۔" دریشک نے رحیم داد کی وکالت کی۔ "چوہدری تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ تم پہلے کی طرح محنت کرو۔ فصل پیدا کرو۔ اپنی را ہکی لو۔ بٹائی میں زمین دار کے طور پر اس کا جو حصہ بنتا ہوا سے دو۔"

"سیں سردار' برا نہ منانا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی کا مظاہرہ کیا "سیں 'توں جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں ہو گا۔ کوئی اسے نہیں مانے گا۔"

سردار عظمت اللہ دریشک کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بے زاری سے بولا۔ "نصیرے! میں نے تیری بکواس اور نہیں سننی۔ اب تو جا۔" اس کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا۔ "اپنے یاروں اور سنگتیوں سے کہہ دینا' چوہدری دوسرے مہاجروں کی طرح ادھر اکیلا نہیں ہے۔ وہ سردار شہ زور خان مزاری کا یار ہے اور میرا بھی۔" اس نے غصے سے پھڑپھڑاتی ہوئی اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "آگے کے لیے وہ ٹھیک طرح سوچ رکھیں۔ زمین داری کا خناس اپنے دماغ سے نکال دیں۔" یہ سیدھی سادی دھمکی تھی۔

نصیر بوھڑ نہ اس کے غصے سے مرعوب ہوا نہ دھمکی سے۔ اس نے گردن اٹھا کر سردار عظمت اللہ دریشک کی جانب دیکھا اور اطمینان بخش لہجے میں گویا ہوا۔ "سیں سردار! فی امان اللہ۔" وہ مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

سردار عظمت اللہ دریشک کی تیوری پر بل پڑے تھے۔ آنکھوں سے جھنجلاہٹ اور کدورت جھلک رہی تھی۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر شخص خاموش تھا اور جھنجلایا ہوا نظر آتا تھا۔ نصیر بوھڑ کی صاف اور کھری باتوں نے ان کے ذہنوں میں کھلبلی برپا کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد شہ زور مزاری کی آواز ابھری۔ اس نے غوث بخش لاشاری کو مخاطب کیا۔ "نصیر کی باتوں سے پتہ چلتا ہے وہ راہک جن کے انتقالات منسوخ ہو گئے ہیں زیادہ ہی رولا ڈالیں گے۔ ان کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟"

"سیں وہ تو معاملے کو عدالت میں لے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک وکیل بھی کھڑا کر دیا ہے۔" غوث بخش لاشاری نے بتایا۔ "سنا ہے صدر دفتر کے حکم کے خلاف وہ اپیل

دائر کرنے والے ہیں۔"

"ابھی انھوں نے اپیل دائر تو نہیں کی۔" مزاری نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"جہاں تک مجھے پتہ ہے' ابھی تک نہیں کی۔" غوث بخش نے جواب دیا۔

"تب تو آگے کی پیش بندی کے لیے فوری طور پر کانونی کارروائی کرنی ہو گی۔" مزاری نے دریشک کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "عظمت! تیرا کیا خیال ہے؟"

"جیسی تیری مرضی۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے میں تجھے یہ بتا دوں کہ یہ جھگڑا کانونی کارروائیوں سے طے ہونے کا نہیں۔ اسے تو زور آزمائی سے طے کرنا ہو گا۔"

"مجھے بھی پتہ ہے' ہو گا تو ایسے ہی۔ پر کانونی طور پر بھی اپنی پوزیشن زیادہ مضبوط کرنی ہو گی۔ میرے وکیل نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔" شہ زور مزاری نے عظمت اللہ دریشک کو بتایا۔ "ایسا کرتے ہیں' وکیل کو ادھر ہی بلائے لیتے ہیں۔"

"ادھر بلانے کی کیا ضرورت ہے۔" دریشک نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "درخواستیں تو راجن پور ہی میں لگانی ہوں گی۔ وکیل بھی وہیں ملے گا۔ فوری کارروائی کرنی ہے تو کل ہی راجن پور پہنچ جانا چاہیے۔"

سردار شہ زور مزاری نے اس کی تجویز قبول کر لی۔ رحیم داد نے بھی تائید کی۔

☆

سردار شہ زور مزاری اور سردار عظمت اللہ دریشک کے ہم راہ رحیم داد' عزیز گٹھوال اور غوث بخش لاشاری راجن پور پہنچے۔ راشد احمد انصاری وکیل سے ملے۔ اس نے ضروری دستاویزات تیار کر لی تھیں۔ ان میں عزیز گٹھوال کے نام رحیم داد کا مختار نامہ تھا۔ دفعہ ۱۴۵ کے تحت مزارعوں کے خلاف چارہ جوئی کی درخواست تھی۔ اور دوسری رائے بہادر ہیتو رام کی حویلی کے الاٹمنٹ کے لیے تھی۔

رحیم داد نے مختار نامے اور دونوں درخواستوں پر دستخط کر دیے تو وکیل نے مشورہ دیا۔ "ابھی ضابطے کی کارروائی مکمل نہیں ہوئی۔"

"وہ کیسے مکمل کرنی ہو گی؟" سردار عظمت اللہ خان دریشک نے وکیل سے دریافت کیا۔

"دریشک صاحب' پہلے مقدمہ کی نوعیت سمجھ لی جائے تو بہتر ہے۔" وکیل نے عظمت اللہ دریشک سے کہا۔ "اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب ہی راہک یا مزارع چھپر بند ہیں یعنی ان کا حق مزارعت قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ بعد میں جب ہندو زمین دار چلا گیا تو وہ مزارع خود

کاشت کار بن گئے اور دس نے تو مالکانہ حقوق بھی حاصل کر لیے۔"

"مگر جب زمین کو متروکہ اراضی ڈ-کلئر کر دیا گیا اور چوہدری کے نام اس کی الاٹمنٹ ہو گئی تو مزارعوں کی نوعیت بدل گئی۔" سردار دریشک نے وکیل پر اپنی قانونی مہارت کا سکہ جمانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" وکیل نے وضاحت کی۔ "آپ ایک قانونی نکتہ نظر انداز کر گئے۔ اور وہ یہ ہے کہ دس مزارعوں کی نوعیت اس وقت تبدیل ہوئی جب رجسٹر خسرہ گرداوری میں ان کے انتقالات منسوخ ہو گئے اور چوہدری صاحب کی نام منتقل ہو گئے۔"

" سیں ' تو نے ٹھیک بتایا۔" سردار دریشک نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ "اب تو سوچنا یہ ہے کہ اگے ضابطے کی کارروائی کیا کرنی ہے؟"

"اب تو انھیں مزارع تابع مرضی مالک بنانا ہے۔" وکیل نے مطلع کیا۔

"اور سیں ' وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں۔" اس بار شہ زور مزاری نے لقمہ دیا۔ "کل ان کا ایک بندہ آیا تھا۔ وہ تو بہت اونچی اونچی باتیں کرتا تھا۔"

"کرنا بھی چاہیے۔" وکیل مسکرا کر بولا۔ "گزشتہ نو دس سال سے وہ زمین پر قابض ہیں۔ آسانی سے تو دست بردار نہیں ہوں گے۔ اپنا قبضہ جائز ثابت کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کریں گے۔"

"ایسا تو وہ کر ہی رہے ہیں۔" اس بار بھی شہ زور مزاری بولا۔

"ضابطہ فوجداری کے تحت جو کارروائی کی جائے گی' اس کا طریقہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ بلکہ اس کے لیے درخواست بھی تیار کی جا چکی ہے۔ چوہدری صاحب نے اس پر دستخط بھی کر دئے۔ اب تو اسے ضروری کارروائی کے لیے آگے بڑھانا ہے۔" وکیل نے وضاحت سے اپنا موقف بیان کیا۔ "مگر اس کے ساتھ ہی ٹیننسی ایکٹ کے تحت تحصیل دار کو اس مضمون کی درخواست بھی دینی ہو گی کہ مزارعے بٹائی دینے سے انکاری ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کے لیے ان کے خلاف دوسرے ایسے الزامات بھی عائد کرنے ہوں گے جو ٹیننسی ایکٹ کے تحت ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ مزارعے کاشت کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہے ہیں جس کے باعث پیداوار گھٹ رہی ہے۔ زمین خراب ہو رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔" اس نے شہ زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کو نظر بھر کر دیکھا۔ "آپ دونوں تو خاندانی زمیں دار ہیں۔ آپ کو تو بخوبی علم ہو گا کہ مزارعوں کو بے دخل کرنے کے لیے کس کس طرح کی دیوانی اور فوجداری کارروائی کی جاتی

ہے۔"

"سئیں' ایسا ہے تو ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے دوسری درخواست بھی تیار کر لی جائے۔" شہ زور مزاری نے کہا۔ "اس پر چوہدری سے دستخط لگوا لے اور درخواست تحصیل دار کے سامنے پیش کر دے۔"

"پر یہ ساری کارروائی آج ہی پوری ہو جانی چاہیے۔" سردار دریشک نے تاکید سے کہا۔

"آج ہی پوری ہو جائے گی۔ میں درخواست تیار کر کے چوہدری صاحب سے دستخط کروالوں گا اور تحصیل دار کے سامنے پیش کر دوں گا۔" وکیل نے دریشک کو باور کرایا۔

اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ گھنٹہ بھر کے اندر اندر درخواست تیار کی اور رحیم داد سے اس پر دستخط بھی کرا لیے۔

ایک درخواست تحصیل دار کے دفتر میں پیش کر دی گئی' دوسری تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت قانونی چارہ جوئی کے لیے تھانے میں۔ تحصیل دار اور تھانے دار دونوں ہی سردار شہ زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کے نہ صرف جاننے والے تھے بلکہ بے تکلف دوست بھی تھے۔ لہٰذا دونوں درخواستوں پر فوری کارروائی کے احکامات بھی جاری کر دیئے گئے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہ راجن پور سے کوٹ اکبر واپس پہنچ گئے۔

دلاور والا کی زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے رحیم داد سے زیادہ سردار شہ زور مزاری فکر مند تھا۔ اور سردار عظمت اللہ خان دریشک کو شہ زور مزاری سے بھی زیادہ تشویش تھی۔ نصیر بوھڑ سے بات چیت کرنے کے بعد یہ اس کے وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔

دن ہو یا رات' جس وقت بھی تینوں یکجا ہوتے' دلاور والا کی زمین کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار جب یہ ذکر چھڑ جاتا تو گھنٹوں جاری رہتا۔ رحیم داد کی درخواست پر تحصیل دار نے ہنوز کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا۔ اسے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ حالانکہ درپردہ وہ شہ زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کو یقین دلا چکا تھا کہ فیصلہ رحیم داد ہی کے حق میں ہو گا۔

لیکن سردار دریشک تحصیل دار کے فیصلے اور پولیس کی کارروائی سے پہلے اپنے طور پر کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک شام اس نے کھل کر اس کا اظہار بھی کیا۔ اس وقت شہ زور مزاری اور رحیم داد کے علاوہ اس کا کاردار' غوث بخش لاشاری بھی موجود تھا۔ عزیز گٹھوال مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں راجن پور میں مقیم تھا۔

سردار عظمت اللہ دریشک نے شہ زور مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور' پتہ نہیں تحصیل دار کب

فیصلہ سنائے گا۔ ہم نے کب تک اس کا انتظار کرنا ہو گا۔ ابھی تو بیانات لیے جائیں گے۔ گواہ پیش ہوں گے۔ ثبوت مہیا کیے جائیں گے۔"

"تحصیل دار کو عدالتی کارروائی تو پوری کرنی ہی ہو گی۔" شہ زور مزاری نے اپنے رائے کا اظہار کیا۔ "اس کے فیصلے سے پہلے کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟"

سردار عظمت اللہ دریشک اپنی بات پر اڑا رہا۔ "راکھوں کو بے دخل ہی تو کرنا ہے۔" اس نے اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میرے یا تیرے لیے یہ کوئی نئی یا انوکھی گالہہ نہیں۔ پہلے بھی کتنوں ہی کو بے دخل کیا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو نے بالکل ٹھیک کہا۔" سردار مزای نے اس کی تائید کی۔ "پر یہ تو سوچ۔ ایک بار جب تحصیل دار کے سامنے بے دخلی کی درخواست لگا دی گئی تو فیصلے تک تو چپ کر کے بیٹھنا ہی پڑے گا۔"

"تو میری گالہہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"تو سمجھائے گا تب ہی تو سمجھوں گا۔" سردار مزاری نے مسکرا کر دریشک سے کہا۔ "مجھے کیا پتہ تو نے کیا سوچ رکھا ہے اور تو کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ اپنے کچھ مسلح کراوے اور زور آور بندے دلاور والا بھیجوں۔ وہ چوہدری کی طرف سے راکھوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کریں۔ توڑ پھوڑ کریں۔ جو کوئی آکڑ دکھائے' دنگا فساد کرے' اس کی پٹائی کریں۔"

"اس طرح تو اپنا مکدمہ کمزور پڑ جائے گا۔" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"کمزور نہیں اور مضبوط ہو سکتا ہے۔" دریشک نے ہنس کر کہا۔ "راکھ ڈر جائیں گے۔ مکدمے بازی چھوڑ کر صلح صفائی کرنے کی کوششیں کریں گے۔ منت کریں گے۔ زاری کریں گے۔"

"مان لے وہ ڈرانے دھمکانے میں نہ آئے' تب کیا ہو گا؟" رحیم داد اپنی بات پر جما رہا۔

"ہو گا کیا۔ وہ تھانے میں پرچہ چاک کرانے کی کوشش کریں گے۔" دریشک نے رحیم داد کو باور کرایا۔ "تو اطمینان رکھ۔ ان کی رپورٹ درج نہیں ہو گی بلکہ تیری نہ صرف درج ہو جائے گی اس پر فنافٹ کارروائی بھی شروع ہو جائے گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ گہرا یار ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ سردار شہ زور مزاری نے بھی عظمت اللہ دریشک کے ساتھ مزید حجت کرنے سے گریز کیا۔ یہ اس کا علاقہ نہ تھا دریشک کا تھا۔ رحیم داد کو زمین کا قبضہ دلانے کے لیے

اسے عظمت اللہ دریشک کی مدد درکار تھی۔ لہٰذا اس کی مرضی اور منشا کو اہمیت دینا ضروری تھا۔ اسی مقصد کے تحت وہ رحیم داد کے ساتھ کوٹ اکبر آیا تھا۔

☆

سردار عظمت اللہ دریشک نے اپنے کارندوں اور نوجوان مزارعوں کو اکٹھا کیا۔ اور ضروری ہدایت دے کر ایک مضبوط اور قوی ہیکل کمدار کی سربراہی میں انھیں دلاور والا کی جانب روانہ کیا اور سردار شہ زور مزاری اور رحیم داد کے ساتھ بیٹھ کر بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگا۔

وہ واپس آئے۔ مگر ان کی حالت دگرگوں تھی۔ چہروں کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ لباس بے ترتیب اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ نڈھال اور درماندہ نظر آتے تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی ان کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ سردار عظمت اللہ نے ان کی یہ ابتری اور خستہ حالی دیکھی تو خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پوری بستی اٹھارہ مزارعوں کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئی۔ سب ہی بوھڑ تھے۔ تعداد میں بھی بہت زیادہ تھے اور مسلح بھی تھے۔ وہ ہر طرف سے شور مچاتے ہوئے نکلے اور اس طرح یلغار کی کہ سردار دریشک کے آدمی ان کے نرغے میں پھنس گئے۔ جان بچانا مشکل ہو گئی۔ کسی نہ کسی طور گلوخلاصی حاصل کی۔ اس طرح پسپا ہوئے کہ نظریں ہزیمت اور گھبراہٹ سے جھکی ہوئی تھیں اور بوھڑوں کے سر اونچے تھے اور گردنیں تنی ہوئی تھیں۔

سردار دریشک نے چاہا تھا کہ خوف و ہراس پھیلا کر مزارعوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ مگر اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وہ سخت چراغ پا ہوا۔ چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ اس نے غیظ و غضب کے عالم میں نہ صرف اپنے کمدار اور کارندوں کو بلکہ سب ہی کو گالیاں دیں۔ دیر تک چیختا چلاتا رہا، دھاڑتا رہا، پھر دھتکار کر سب کو کمرے سے نکال دیا۔

اس کی آن بان اور عزت و وقار کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ اب وہ اور بھڑک اٹھا تھا۔ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس نے راہکوں یعنی مزارعوں کی سرکشی اور شورش کچلنے کے لیے دوسرے حربے اور ہتھکنڈے آزمانے کا تہیہ کیا جو سرداروں اور بڑے زمیں داروں کا عام وتیرہ ہے۔

اس نے علاقے کے تھانیدار کو بلایا۔ اس کا نام عبدالغنی خاں نیازی تھا۔ تن و توش کے اعتبار سے بڑا دبنگ نظر آتا تھا۔ اس کی سخت دلی اور مزاج کی برہمی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ جب وہ آیا تو سردار شہ زور مزاری اور رحیم داد بھی موجود تھے۔ سردار دریشک نے تھانیدار کو تازہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ بوھڑوں کے خلاف اپنی شدید نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔

مسئلے کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ آخر باہمی صلاح مشورے سے یہ طے پایا کہ ان بوھڑوں

کے خلاف مویشیوں کی چوری اور ایسے ہی دوسرے الزامات کی بنیاد پر جھوٹے مقدمے قائم کیے جائیں جو سرکشی اور محاذ آرائی میں پیش پیش ہیں۔ ان کو گرفتار کیا جائے اور حوالات میں بند کر کے اس طرح زدوکوب کیا جائے کہ نہ صرف ان کا سارا طنطنہ اور کس بل نکل جائے بلکہ دوسرے بوہڑ بھی عبرت حاصل کریں۔ دہشت زدہ ہو کر سردار دریشک کے پیروں پر اپنے سروں کی پگڑیاں ڈال دیں۔

تھانے واپس جا کر عبدالغنی خاں نیازی نے بوہڑوں کے خلاف مقدمات قائم کیے اور ان کی گرفتاری کے لیے پوری تیاری بھی کر لی۔ مگر دلاور والا جانے سے قبل وہ کوٹ اکبر پہنچا۔ پولیس کی ایک جماعت اس کے ساتھ تھی۔ ادھر سردار عظمت اللہ دریشک کی حویلی کے سامنے کھلے میدان میں اس کے کارندے، تگڑے اور مضبوط مزارعے اور کمی سورج غروب ہوتے ہی اکٹھا ہونے شروع ہونے لگے تھے۔ ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

پہر رات گزری تو میدان میں ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ ان کے لیے کھانے کے علاوہ خاص طور پر بھنگ گھونٹ کر تیار کی گئی تھی۔ وہ بھنگ کے گلاس پر گلاس چڑھا رہے تھے۔ بہک رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ پولیس والے بھی شریک ہو کر ان کے رنگ میں رنگتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ہنگامہ ہاؤ ہو برپا تھا۔ ایک نوجوان نے نشے میں جھوم کر دوہڑہ چھیڑا۔ کان پر ایک ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔

عاشق مست مدام جہاں بھر جام شکر دا پیوے
جے دت ہک لنگاں یار ڈکھیو نے
لوں لوں دے وچ ساہ پورے اے رج رنجا بھر جیوے
جے دت ہک لنگاں یار ڈکھیوے

اس کی آواز پاٹ دار اور سریلی تھی۔ دوسرے بھی نشے کی ترنگ میں اس کی آواز سے آواز ملا کر کورس کے انداز میں دوہڑے کے بول الاپنے لگے۔ ان کی آوازیں اونچی اور اونچی ہوتی گئیں۔ وہ جھوم رہے تھے۔ لہرا رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ فضا گنگنا رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ بتا رہی تھی۔

یہ سدا کا مست عاشق شکرانے کے جام بھر کر پیئے
اگر ایک بار بھی اپنے محبوب کو دیکھ لے
میرے روئیں روئیں میں لہر دوڑ جائے' زخمی روح زندہ ہو جائے

اگر ایک بار بھی اپنے محبوب کو دیکھ لے

حویلی کے وسیع صحن میں سردار دریشک ' سردار مزاری ' تھانیدار عبدالغنی نیازی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے ہنسا رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ سنسان اور تاریک ہوتی گئی۔ رات آدھی ہو گئی۔ تھانیدار نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حویلی سے باہر آیا۔ سردار دریشک ' سردار مزاری اور رحیم داد اس کے ہم راہ تھے۔ تھانیدار نے مسکرا کر سردار عظمت اللہ کو مخاطب کیا۔ "سردار! فکر نہ کر۔ صبح سارے بدمعاش اور سرکش بوھڑوں کو باندھ کر تیرے سامنے پیش کر دوں گا۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر مونچھوں پر تاؤ دیا۔ نخوت سے گردن کو اکڑایا۔

سردار دریشک نے ہنس کر کہا۔ "مجھے پتہ ہے تو کامیاب لوٹے گا۔ پہلے بھی کب ناکام ہوا ہے۔ ہر معرکہ سر کیا ہے۔"

تھانیدار نے نشے کی ترنگ میں قہقہہ لگایا۔ سردار دریشک اور سردار شہ زور مزاری سے رخصت ہوا۔ آگے بڑھا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ تینوں ایک جیپ میں بیٹھ گئے۔ کچھ پولیس والے بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک جیپ اور بھی تھی۔ پولیس کے بقیہ سپاہی اس میں بیٹھ گئے۔ سردار دریشک کے کارندے اور گرگے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔

دونوں جیپیں آگے آگے تھیں۔ ان کے عقب میں گھوڑے اور اونٹ تھے۔ تھانیدار کی کمر پر لٹکتے ہوئے ہولسٹر میں بھرا ہوا پستول تھا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری کے پاس بارہ بور کی دو نالی بندوقیں تھیں۔ دو کانسٹیبل بھی پرانی وضع کی رائفلوں سے مسلح تھے۔ سردار دریشک کے کارندوں اور گرگوں کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور اونچی اونچی ڈانگیں تھیں۔ ہر ڈانگ پر تیز دھار کی چمکیلی چھوی چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کچے اور ناہموار راستوں پر دھول کے بادل اڑاتے دلاور والا کی سمت جا رہے تھے۔

تھانیدار عبدالغنی خاں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اندھیرے میں نہایت خاموشی سے بستی کا محاصرہ کر لیا جائے۔ اور رات کے پچھلے پہر اس طرح اچانک گھروں پر چھاپہ مارا جائے کہ سب بے خبر سوتے ہوں۔ کسی ملزم کو فرار ہونے کا موقع نہ ملے۔ سب کو آسانی سے حراست میں لے لیا جائے۔

☆

بوھڑوں کو پولیس کے چھاپے کی سن گن مل گئی تھی۔ وہ نہ صرف چوکس اور چوکنا تھے بلکہ پولیس اور اس کے مددگاروں کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ گاؤں کے اردگرد جھنگر اور گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان کہیں کہیں ٹیلے اور ٹبے تھے۔ بوھڑوں نے ٹیلوں پر مورچے لگا رکھے تھے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں اور ڈانگیں تھیں۔ پتھروں کی ڈھیریاں تھیں۔ گوپھن اور دوسا نگھیاں تھیں جو فصلوں اور باغوں سے پرندوں کو بھگانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت وہ ان سے ایک موثر ہتھیار کا کام لینا چاہتے تھے۔ دوسا نگھیوں یا غلیلوں کے ذریعے دور نشانے پر تاک کر مارنے کے لیے انھوں نے مٹی کی گولیاں تیار کی تھیں جن کو کمہار نے بھٹی میں پکا کر پختہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی چھوٹے بڑے پتھروں کی ڈھیریاں جگہ جگہ بنا رکھی تھیں۔ معذور اور بیماروں کو چھوڑ کر بستی کے تمام بوڑھے بھی مستعد اور سرگرم نظر آ رہے تھے۔ وہ گھروں کے دروازوں پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ کھانس رہے تھے 'کھنکار رہے تھے' باتیں کر رہے تھے۔

سب ہی چوکنا اور چوکس تھے۔ جاگ رہے تھے اور ان طرح طرح کی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر تھے جو خطرے کے وقت ان کو انجام دینا تھیں۔

رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول جگمگا رہے تھے۔ ہوا سرسراتی ہوئی درختوں سے گزر رہی تھی۔ سب چوکنا نظروں سے بار بار گردنیں اٹھا کر ان راستوں کو دیکھ رہے تھے جو مختلف سمتوں سے گاؤں کی طرف آتے تھے۔ یکایک دور شمال میں تیز روشنی ابھری جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آہٹیں اور آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔ بستی پر فوراً گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ عورتیں چھتوں کی منڈیروں کی اوٹ میں دبک گئیں۔ نوجوانوں نے مورچے سنبھال لیے۔ بوڑھوں نے گھروں میں گھس کر دروازے بند کر لیے۔ بستی پر اب ہو کا عالم طاری تھا۔

شمال میں درختوں کی آڑ سے ابھرتی ہوئی تیز روشنی جیپوں کی تھی جن میں رحیم داد اور غوث بخش لاشاری کے علاوہ تھانیدار اور پولیس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ تھانیدار عبدالغنی خان نیازی نے جیپیں گاؤں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رکوائیں۔ جیپوں کے رکتے ہی گھوڑے اور اونٹ بھی ٹھہر گئے۔

جیپوں کی بتیاں بجھادی گئیں۔ سب سے پہلے تھانیدار باہر آیا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری بھی باہر آگئے۔ دوسرے بھی جیپوں، گھوڑوں اور اونٹوں پر سے اتر کر نیچے آگئے۔ سب تھانیدار عبدالغنی خاں نیازی کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ اس نے ایک ڈرائیور کو جیپوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی نگرانی پر مقرر کیا۔ دوسروں کو ساتھ لیا۔ ضروری ہدایات دیں اور آگے بڑھا۔ سب کچے راستوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچے۔

تھانیدار نے کچھ لوگوں کو گردونواح میں جگہ جگہ تعینات کیا۔ گاؤں بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ تھانیدار نے قدم آگے بڑھائے۔ رحیم داد اور غوث بخش بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ ان کے علاوہ پولیس کی جمعیت تھی۔ سردار دریشک کے کارندے اور مزارعے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے اچانک ہر طرف سے زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ عورتوں اور بچوں نے حلق کے اندر سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور اس قدر پر ہول اور خوفناک تھا کہ ان پر سراسیمگی اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ ٹھٹک کر جہاں تھے وہ وہیں رک گئے۔

عبدالغنی خان نیازی دبنگ اور دھاکڑ پولیس افسر تھا۔ ڈاکوؤں اور خطرناک مجرموں کے خلاف کتنے ہی سنگین معرکے سر کرچکا تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ پلٹ کر رائفل بردار کانسٹیبلوں کی جانب دیکھا۔ ہوائی فائر کرنے کا حکم دیا۔ چار پانچ فائروں کے بعد تمام آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

تھانیدار اپنی جمعیت کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس کی گردن اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ چال میں دبدبہ تھا۔ لیکن جب وہ اور اس کے ساتھی آبادی کے درمیان پہنچ گئے تو ایک بار پھر زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ خوفناک آوازیں ابھرنے لگیں اور ان آوازوں کے ساتھ ساتھ ہر سمت سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ وہ اس وقت بالکل کھلی جگہ پر کھڑے تھے اور تاروں کی روشنی میں نمایاں اور صاف نظر آرہے تھے۔

پتھر کھٹا کھٹ جسموں سے ٹکرانے لگے۔ کوئی ان کی زد سے محفوظ نہ رہا۔ پتھر نوکیلے تھے اور ان میں ایسی تیز دھار بھی تھی کہ جسم کے جس حصے پر لگتے اسے زخمی کردیتے۔ ایک بھاری پتھر بھد سے رحیم داد کی پیٹھ پر لگا۔ وہ بے قرار ہو کر پلٹا۔ اسی وقت دوسا تھی سے نکلی ہوئی مٹی کی پختہ گولی، اس کے دائیں کندھے کی ہڈی سے ٹکراتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اور ایک ہاتھ سے کندھا پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

دوسرے بھی پتھروں کی چوٹوں سے بچ نہ سکے۔ ایک نوکیلا پتھر تھانیدار کے سر پر اس طرح لگا کہ اس کی ٹوپی گر گئی۔ سر جھنجھنا اٹھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور سب کو زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ سب جلدی جلدی پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ اور پتھروں اور مٹی کی پختہ گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے سروں کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کی۔

مگر فرش پر لیٹ جانے کے باوجود پتھروں کی بوچھاڑ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پتھر ان کے سروں پر اور کمر پر، گردن پر، ٹانگوں اور ہاتھوں پر، غرضیکہ جسم کے ہر حصے پر کھٹاکھٹ گر رہے تھے، ٹکرا رہے تھے۔ زخم پر زخم لگا رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھر ہوئے تھے۔ جوابی کارروائی کے طور پر انھوں نے کئی بار پتھر اٹھا کر مارنے کی بھی کوشش کی۔ مگر اپنے دشمن انھیں کہیں نظر نہ آئے۔ رات کے اندھیرے میں وہ کمین گاہوں میں مورچے لگائے اس طرح دبکے بیٹھے تھے کہ ان کو دیکھنا اور تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔

تھانیدار عبدالغنی سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ پسپائی کی صورت میں بدنامی کا ڈر تھا۔ وہ بدنامی مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ہوا اکھڑ جاتی۔ علاقے پر جو دھاک بیٹھی تھی ملیامیٹ ہو جاتی۔ فائرنگ سے وہ حتی الوسع گریز اختیار کرنا چاہتا تھا۔ بظاہر اس کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ بوھڑوں نے نیا حربہ آزمایا۔ انھوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق، سیٹیوں، خوفناک آوازوں اور پتھراؤ کے ساتھ ساتھ گھنی جھاڑیوں میں بھیڑیں اور بکریاں دوڑانا شروع کر دیں۔ ان کے کھروں کی آہٹوں سے ایسی آوازیں ابھریں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ نقل و حرکت کر رہے ہیں۔

اس تازہ حربے کا خاطرہ خواہ نفسیاتی رد عمل ہوا۔ تھانیدار کے پاس زیادہ بڑی جمعیت نہ تھی۔ کہیں سے کمک ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ اسے اپنی افرادی قوت کے مقابلے میں بوھڑوں کی تعداد بہت بھاری معلوم ہوئی۔ دوسروں نے بھی یہی محسوس کیا۔ پتھروں کی زبردست بارش سے سب پہلے ہی بدحواس تھے۔ تھانیدار بھی کم پریشان نہ تھا۔ اس اثنا میں ایک بھاری پتھر رحیم داد کے سر پر گرا۔ پگڑی سر پر نہ ہوتی تو بھیجا نکل کر باہر آجاتا۔ مگر چوٹ ایسی کراری آئی تھی کہ رحیم داد تڑپ اٹھا۔ اس نے کروٹ بدلی، اٹھا اور بدحواس ہو کر سرپٹ بھاگا۔

تھانیدار نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا۔ عین اس وقت دوسانگھی سے نکلی ہوئی مٹی کی ایک

ٹھوس گولی اس کی کنپٹی پر اس طرح لگی کہ وہ چکرا گیا۔ خون کی ایک دھار بہتی ہوئی رخسار سے گردن تک پہنچ گئی۔ تھانیدار عبدالغنی نیازی اس چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ رحیم داد کو بھاگتے دیکھ کر دوسرے بھی ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔ تھانیدار نے گھبرا کر فائرنگ کا حکم دیا۔ اپنا پستول نکال کر خود بھی گولی چلائی۔ مگر کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کس پر گولی چلا رہا ہے۔

مگر اس اندھا دھند' فائرنگ کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کر پتھروں کی بوچھاڑ سست پڑ گئی۔ سب کے قدم پہلے ہی اکھڑ چکے تھے۔ تھانیدار نے پسپا ہونے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ رک رک کر پستول سے فائرنگ کرتا ہوا اٹھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ پھر تو ایسی بھگدڑ مچی کہ جس کا جدھر منہ اٹھا' اسی طرف بھد بھد کرتا ہوا بھاگا۔ پتھراؤ ایک بار پھر تیز ہو گیا۔ اور اس میں تیزی پیدا ہوتے ہی بھاگنے والوں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

پتھروں اور مٹی کی گولیوں کی چوٹیں سہتے' تکلیف سے بلبلاتے' وہ کسی نہ کسی طرح گاؤں سے باہر نکلے اور درختوں کے اس جھنڈ کی طرف دوڑنا شروع کر دیا جہاں جیپیں تھیں' گھوڑے اور اونٹ تھے۔ وہ بغیر رکے ہوئے مسلسل دوڑتے رہے۔

درختوں کے جھنڈ کے نیچے پہنچنے پر ہر شخص بدحواس اور پریشان تھا۔ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ زخمی اور گھائل تھا۔ کسی کو ہلکے زخم لگے تھے کسی کو گہرے۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ لباس خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ سروں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ اور بھگدڑ میں کسی کی ٹوپی اور پگڑی چھوٹ گئی تھی اور کسی کے جوتے۔

تھانیدار عبدالغنی خان نیازی بالکل خاموش تھا۔ اس کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر تھی۔ وہ خوب تومند تھا۔ لہٰذا بھاگتے وقت سب سے زیادہ اسے پریشانی اٹھانا پڑی۔ چوٹیں بھی زیادہ آئی تھیں۔ اس کی ٹوپی بھی بھاگتے ہوئے کہیں گر گئی تھی۔ وردی کی ایک آستین پھٹ گئی تھی۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ مگر آنکھوں میں خوف و ہراس کے بجائے شدید غم و غصہ تھا۔

وہ کنپٹی کے گہرے زخم پر ایک ہاتھ سے رومال رکھے ہوئے تھا تاکہ زیادہ خون نہ بہے۔ اسی عالم میں وہ جیپ پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے کسی سے نظریں نہ ملائیں۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ غوث بخش بھی خاموش تھا۔ پولیس والے دونوں جیپوں میں بیٹھ گئے۔ دوسرے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ اور جس راستے سے دلاور والا آئے تھے اسی راستے سے کوٹ اکبر واپس ہوئے۔

☆

سردار عظمت اللہ دریشک اور شہ روز خان مزاری بے قراری سے انتظار کررہے تھے۔ جب وہ واپس پہنچے تو دونوں ان کی ابتر حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ عالم یہ تھا کہ کوئی لنگڑا کر چل رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ کسی کا منہ سوجا ہوا تھا کسی کی آنکھ۔ کسی کی گردن اکڑی ہوئی تھی کسی کے ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ خون زخموں سے رس رس کر جگہ جگہ سیاہ دھبوں کی طرح جم گیا تھا۔

سردار دریشک نے حیران و پریشان ہو کر تھانیدار سے پوچھا۔ "سیں عبدالغنی' یہ کیا ہو گیا؟"

"یہ تو اپنے بندوں سے معلوم کر لینا۔ مجھے فوراً واپس تھانے جانا ہے۔ مرہم پٹی کرانی ہے۔ اپنی اور اپنے جوانوں کی میڈیکل رپورٹ تیار کرانی ہے۔" اس نے رک رک کر کہا۔ "ملزموں کے خلاف مضبوط کیس تیار کرانا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ "سردار' تجھے فوری طور سے مجسٹریٹ سے ملنا ہو گا۔ ملزموں کی زمین قرق کرانے کے لیے دفعہ ۱۴۵ کے تحت عدالت کا حکم جاری کرانا ہو گا۔ میں نے چوہدری کی درخواست پر ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے عدالت میں پہلے ہی چالان پیش کر دیا ہے۔ راشد احمد وکیل کو سب پتہ ہے۔"

"تو جیسا کہتا ہے وہ تو میں کرالونگا' پر یہ تو بتا یہ سب کچھ ہوا کیسے؟" وہ بدستور حیرت زدہ تھا۔

"میں نے کہا نا تو ساری تفصیل لاشاری یا اپنے کسی بھی بندے سے معلوم کر لینا۔" یہ کہتے کہتے اس کے وجود میں چھپا ہوا تھانیدار جاگ اٹھا۔ آنکھوں سے شرارے اڑنے لگے۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ "مجھے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنی ہے۔ پولیس کی زبردست فورس اکٹھی کرنی ہے۔ دلاور والا کے ایک ایک بوھڑ کی مونچھ پیشاب سے نہ منڈوائی تو عبدالسمیع خان نیازی کے نطفے سے نہیں۔" وہ غصے سے دھاڑا۔ "ان کے مکانوں کو مسمار کرانا ہے۔ فصلوں کو آگ لگوانی ہے۔ زنانیوں کے سروں کے بال کٹوانے ہیں۔ ان کو برہنہ کر کے رات بھر نچوانا ہے۔ ان کے مردوں کے سامنے نچوانا ہے۔ ان کے مردوں کو بھی ننگا کر کے نچوانا ہے۔ میں ان کو دکھادوں گا پولیس سے ٹاکرہ لینا مخول نہیں ہے۔ ایسی عبرت ناک سزادوں گا زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

سردار دریشک نے تھانیدار کو روکنے کے لیے اصرار کیا مگر وہ نہ رکا۔ دونوں جیپوں میں زخمی اور خستہ حال کانسٹیبلوں کے ساتھ بیٹھ کر راجن پور واپس چلا گیا۔ سردار دریشک نے اپنے کاردار غوث بخش لاشاری سے کرید کرید کر ایک ایک تفصیل معلوم کی۔ جب تمام باتیں سامنے آگئیں تو وہ بھی سخت برہم ہوا۔ بوھڑوں کی سرکشی کے خلاف جذبہ انتقام سوا ہوا۔

مگر رحیم داد تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بولا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ دیا تھا۔ آنکھیں سلگتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ سردار دریشک کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اپنے کمرے

میں گیا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

دن ڈھلے رحیم داد نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کمرے سے باہر نکل کر ڈیرے کے صحن میں پہنچا تو شام درو دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ سردار شہ زور مزاری صحن میں اکیلا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شہ زور مزاری نے اس کی دل جوئی کی مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

"چوہدری، تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند روز میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو یہ تھانیدار کی ناک کا مسئلہ بن گیا ہے۔ تو نے سنا نہیں وہ کیا کہہ کر گیا ہے۔"

"میں نے سب کچھ سنا ہے۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "پر میں تجھے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نہ میں نے زمین کا قبضہ لینا ہے نہ ادھر زمین داری کرنی ہے۔"

"تو کیا کہہ رہا ہے؟" مزاری نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"میں نے ادھر ہرگز زمین داری نہیں کرنی۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "میں تو پہلے ہی ایسا سوچ رہا تھا۔ کل رات جو کچھ دلاور والا میں ہوا اس کے بعد تو میرے لیے ادھر زمین داری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تجھے زمین داری کون سی چلانی ہے۔" شہ زور مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی۔ "تو نے گھنوال کو اپنا مختار تو بنا ہی دیا ہے۔ وہ زمین داری کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "چوہدری، یہ تو سوچ عظمت اللہ کو پتہ چلا تو وہ تیرے بارے میں کیا سوچے گا۔ کہے گا چوہدری ڈر گیا۔ دوسرے بھی یہی کہیں گے۔"

"اگر وہ ایسا سوچیں گے تو ٹھیک ہی سوچیں گے۔" رحیم داد نے پردہ پوشی کی کوشش نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ رات کے ہولناک واقعے کے بعد وہ بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ "جو کچھ ہو چکا وہی کم نہیں۔ آگے جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بارے میں تو میں سننا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے پتہ ہے تھانیدار نے جو کچھ کہا ہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور ضرور کرے گا۔ تو بھی یہی چاہتا ہے۔ عظمت اللہ دریشک تو بالکل ایسا ہی چاہتا ہے۔ پر میں کسی طور اس خطرناک جھگڑے میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ تو چاہے مجھے بزدل کہہ یا ڈرپوک۔ میں نے تجھے اپنے دل کی بات صاف صاف بتا دی۔"

"پر یہ تو سوچ مکدمے کا کیا بنے گا۔ زمین کا کیا ہو گا؟" سردار شہ زور مزاری نے پریشان ہو کر کہا۔

"تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟"

"کیا مدد چاہتا ہے؟" سردار مزاری نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"میں دلاور والا کی زمین فروخت کرنا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ "تو نے میری اب تک بہت مدد کی ہے ایک مدد اور کردے۔ مجھے اس زمین کا کوئی گاہک مہیا کردے اور اگر تو لینا چاہے تو میں خوشی سے تجھے بیچ کردوں گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھ سے تو کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین تو سچ پوچھ تیری ہی ہے۔ تو نے ہی الاٹ کرائی ہے۔"

"میرے لیے تو ادھر زمین لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" سردار مزاری نے صاف انکار کردیا۔ "یہ تمن دریشک کا علاکہ ہے۔ اس کے لیے تو عظمت اللہ سے بات کرنی ہوگی۔ وہ تیری مدد کرسکتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ویسے میری مرضی ہے کہ تو ایسا نہ سوچ۔ کل رات جو کچھ ہوا' لگتا ہے اس سے تو بہت گھبرا گیا۔ چند روز میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "زمین داری میں تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اس سے گھبرانا اور پریشان ہونا نہیں چاہیے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "سچ پوچھ تو میرا مینیجر نادر خان بھی یہی چاہتا ہے۔ تجھے پتہ ہے وہ پچھلے دنوں ادھر آیا تھا۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "بات دراصل یہ ہے ادھر کوٹلہ ہرکشن میں چھوٹے زمین داروں اور حصہ داروں کی زمین بہت سستے مول مل رہی ہے۔ اور اس لیے مل رہی ہے کہ چھوٹے زمین داروں کو سندھ میں بیراجوں کی زمین الاٹ ہوگئی ہے۔ وہ ادھر کی زمین بیچ کر جلد سے جلد ادھر جانا چاہتے ہیں۔"

سردار شہ زور مزاری نے اس کی بات کاٹ کر مداخلت کی۔ "وہ جو کچھ چاہتے ہیں' مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔ یہ بتا تو کیا چاہتا ہے؟"

"مجھے ان کی زمین خریدنے کے لیے روپے کی سخت ضرورت ہے۔" رحیم داد نے کھل کر اپنا مقصد بیان کیا۔

"یہ بات تو نے پہلے بتانی تھی۔" شہ زور نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اگر تو نے پہلے بتایا دیا ہوتا تو معاملہ اتنا آگے کیوں جاتا۔"

"میں نے سوچا تو ناراض ہوگا۔ اس لیے صرف سوچتا ہی رہ گیا۔" اس بار اس نے صاف گوئی سے کام نہیں لیا۔ رحیم داد مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی اثنا میں سردار عظمت اللہ دریشک پہنچ گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو بہت چپ چپ نظر آرہا ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا مگر شہ زور مزاری خاموش نہ رہا۔ اس نے کہا۔ "چوہدری' ادھر زمین داری کرنا نہیں چاہتا۔ دلاور والا کی زمین فروخت کرنا چاہتا ہے۔"

"لگتا ہے کل رات کی گڑ بڑ نے اسے بہت تنگ کیا۔" عظمت اللہ دریشک نے بے تکلفی سے کہا۔ "فکر نہ کر۔ چند روز کی گالہہ ہے فیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رحیم داد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شہ زور مزاری بول پڑا۔ "یہ ٹھہرا مہاجر' ادھر کی زمین داری اس کے لیے بالکل نیا تجربہ ہے۔" اس نے مسکرا کر عظمت اللہ کو دیکھا۔ "ویسے اس نے ادھر کوٹلہ ہرکشن میں زمین بھی خریدنی ہے۔ سستی مل رہی ہے اور اس کی زمینوں سے ملی ہوئی ہے۔ اس کی خریداری کے لیے اسے روپے کی ضرورت ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔" سردار دریشک ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "اس مرحلے پر ایسا کرنے سے تو بہت گڑ بڑ ہو جائے گی۔" اس نے گردن اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری اب تو میری آن کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔"

"ایسا کر تو دلاور والا کی زمین خرید لے۔"

"میری پاس تو ویسے ہی بہت زمین ہے۔" سردار دریشک رضامند نہ ہوا۔

"پر یہ زمین تو تیری آن کا مسئلہ بن گئی ہے۔ اسے تو تجھے ہی خریدنا چاہیے۔" مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "اپنی آن کی خاطر تجھے خریدنا چاہیے۔"

"تو کہتا ہے تو خرید لوں گا۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "بول چوہدری' کیا لے گا زمین کا؟"

"جو تو دے دے۔ میں نے تجھ سے مول تول تو کرنا نہیں۔" رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

سردار مزاری شے نے مداخلت کی۔ "زمین کا مول تو بعد میں طے ہو جائے گا' پر یہ بات پکی ہو گئی کہ دلاور والا کی زمین اب تیری ہو گی۔" اس نے بات کو طول دینے کے بجائے اختصار سے کام لیا۔ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری' تو جانے کو کہتا تھا تو واپس جا۔ میں اور دریشک زمین کے مکدمے سے نمٹنے کے بعد کوٹلہ ہرکشن پہنچ جائیں گے۔" وہ مسکرایا۔ "کچھ دن تیرے مہمان رہیں گے۔ وہیں بیع نامہ تیار ہو گا اور زمین کی کیمت بھی ادا کر دی جائے گی۔" اور اس نے عظمت اللہ دریشک کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "میں نے ٹھیک ہی کہا نا؟"

"تو جیسا کہے گا ویسا ہی ہو گا۔" سردار دریشک نے شہ زور مزاری کی تجویز مان لی۔

زمین کا معاملہ خلوص اور محبت کی فضا میں طے ہو گیا۔ وکیل کے مشورے پر رحیم داد نے عزیز گھوال کا مختار نامہ منسوخ کر کے سردار عظمت اللہ کو اپنا مختار عام مقرر کر دیا۔ اب وہ جلد سے جلد ڈیرہ غازی خان چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

سردار عظمت اللہ دریشک نے گلے لگا کر رحیم داد کو رخصت کیا۔ سردار شہ زور مزاری اس کے ساتھ غازی گھاٹ تک گیا۔ ولاور والا کی زمین کا تنازعہ حائل نہ ہوتا تو وہ حسب وعدہ اس کے ساتھ لاہور جاتا۔

رحیم داد ایک بار پھر اسٹیمر پر سوار ہوا۔ دریائے سندھ عبور کیا۔ مظفر گڑھ پہنچا اور ٹرین میں بیٹھ کر لاہور کی جانب روانہ ہو گیا۔

۴۴

بھری دوپہر تھی اور چلچلاتی گرمی۔ ریل گاڑی شور مچاتی، کھٹ کھٹ کرتی، لوہے کی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد سکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کئی اور مسافر بھی تھے۔ وقت گزارنے کے لیے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کوئی اخبار، کوئی اونگھ رہا تھا۔ کچھ ہنس بول رہے تھے۔ ایک مسافر اوپر کی نشست پر لیٹا اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس نے چھت میں لگے ہوئے پنکھے کا رخ موڑ کر اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس کا ایک پیر نشست سے باہر نکلا ہوا تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دراز قد ہے۔

رحیم داد گرمی اور تپش سے بے زار اور اکتایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ نشست پر جو مسافر بیٹھا تھا وہ اخبار کے مطالعے میں اس قدر غرق تھا کہ جب رحیم داد ڈبے میں داخل ہوا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تو اس نے صرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے میں محو ہو گیا۔ رحیم داد نے بھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اخبار سے اسے کبھی دلچسپی نہ رہی۔ اس وقت بھی اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ نہ خبروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی نہ تصاویر پر۔

وہ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا پھر گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادلوں کے ہلکے ہلکے سرمئی لکے منڈلا رہے تھے۔ سورج ان کی اوٹ میں چھپ جاتا تو دور تک سائے پھیل جاتے۔ فضا دم بھر کے لیے سہانی ہو جاتی۔ مگر جب سورج دوبارہ نمودار ہوتا تو منظر اچانک بدل جاتا۔ دھوپ اتنی تیز اور چمکیلی ہوتی کہ آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی۔

ریل گاڑی سرپٹ دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ سورج بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ سائے

گھنٹے بڑھتے رہے۔ ریل گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ پٹڑیاں بدلنے لگیں۔ ریل گاڑی ٹھہر گئی۔ سامنے اسٹیشن کی مختصر اور پرانی عمارت تھی۔ اسٹیشن کے عقب میں شریںہ کے ایک گھنے اور تن آور درخت کے نیچے دو تانگے کھڑے تھے۔ سامنے کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی جس پر دوڑتا ہوا ایک تانگا تیزی سے اسٹیشن کی عمارت کی سمت بڑھ رہا تھا۔ کچھ مسافر ریل گاڑی کے مختلف ڈبوں سے اترے اور اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھے۔ کچھ سوار ہونے کے لیے افراتفری کے عالم میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔

ایک شخص جو وضع قطع سے ریلوے کا ملازم نظر آتا تھا' ایک ہاتھ میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور دوسرے میں المونیم کا گلاس تھامے کھڑکی کے پاس سے گزرا۔ رحیم داد نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیاسا تھا اور پانی پینا چاہتا تھا۔ یکایک قریب سے آواز ابھری۔

"آپ کو پیاس محسوس ہو رہی ہے تو میرے پاس پانی موجود ہے۔ اسے جانے دیجیے۔"

رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ بیٹھا ہوا مسافر اس کی جانب نگاہیں اٹھائے بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ سر پر بال بہت کم تھے اور ان میں بھی سیاہ کم اور سفید زیادہ تھے۔ وہ ململ کا باریک کرتا اور کھلی موری کا اجلا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ جسم قدرے بھاری تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں پر چوڑے فریم کی عینک تھی۔ چہرا بھرا بھرا تھا۔ بانسے پر کسی پرانی چوٹ کا نشان تھا۔ جس سے ناک تکونی ہو کر بدوضع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ خاصا سفری سازو سامان تھا۔ چوڑا چکلا اور اونچا ناشتے دان تھا۔ پانی سے بھری ہوئی صراحی تھی۔ تھرماس تھا۔ دو ٹوکریاں تھیں۔ ایک میں تولیا' کنگھا' صابن دانی اور ضرورت کی ایسی ہی دیگر اشیاء تھیں۔ دوسری آموں سے بھری ہوئی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور آن بان سے وہ کھاتا پیتا اور باوقار نظر آتا تھا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر وہ خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ "یہ کنویں کا پانی ہے۔ اسے پی کر معدہ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ گرمی کے موسم میں ویسے بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا اخبار ایک طرف رکھا۔ جھکا صراحی پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس اٹھایا اس میں صراحی سے پانی انڈیلا۔ عین اس وقت انجن زور سے چنگھاڑا۔ گارڈ کی سیٹی چیخی۔ ریل گاڑی ایک جھٹکے سے کھسکی اور لوہے کی پٹڑیوں پر آگے بڑھنے لگی۔

گلاس میں بھرا ہوا پانی چھلکا اس نے فوراً گلاس مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لحہ بھر توقف کیا۔ پھر گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ رحیم داد نے اسے ہاتھ میں لے لیا۔ ہونٹوں سے لگانا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ تھرماس اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا۔ برف کی ایک ڈلی نکالی اور گلاس میں

ڈالتے ہوئے بولا۔ "اب آپ شوق سے پئیں۔" اس نے نظریں موڑیں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سورج انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت اور چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بے قرار ہو کر اس نے پہلو بدلا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک کہا جی آپ نے' آج تو بہت گرمی ہے۔" رحیم داد نے پانی کا ٹھنڈا گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی تائید کی۔

"ایسی ویسی گرمی ہے۔ در دیوار سے چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔" اس نے تولیا اٹھا کر چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا۔ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔ "نام پوچھ سکتا ہوں آپ کا؟"

"چوہدری نور الٰہی۔" رحیم داد نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

"تو گویا آپ چودھری صاحب ہیں۔ خوب۔ بہت خوب۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے مسکرا کر اظہار خوش نودی کیا۔ "مجھے مرزا اسرار بیگ کہتے ہیں۔ مظفر گڑھ میں کچھ زمین داری ہے۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔" اس نے کسی قدر تفصیل سے اپنا تعارف کرایا۔ "چودھری صاحب' آپ کا شغل کیا ہے؟" اسرار بیگ نے قیاس آرائی کی۔ "بظاہر تو آپ بھی مجھے زمین دار معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں جی زمین دار ہی ہوں" رحیم داد نے جواب دیا۔ "ادھر دیپال پور میں اپنی زمیں داری ہے۔"

"ادھر کیسے آنا ہوا؟" مرزا اسرار بیگ نے بات آگے بڑھائی۔

"میں تو جی ڈیرہ غازی خاں سے آ رہا ہوں۔" رحیم داد نے مطلع کیا۔ "ادھر بھی تحصیل راجن پور میں مجھے کچھ زمین الاٹ ہوئی ہے۔"

"متروکہ آراضی ہے؟" مرزا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ہاں جی متروکہ اراضی ہے۔"

"تو گویا آپ بھی مہاجر ہیں۔ بھئی بہت خوب۔" مرزا اسرار بیگ نے بے تکلفی سے اظہار مسرت کیا۔ "چودھری صاحب' مہاجر تو میں بھی ہوں۔ مظفر گڑھ میں میری جو آراضی ہے وہ بھی میرے کلیم کی بنیاد پر الاٹ ہوئی ہے۔"

رحیم داد نے کچھ کہنا چاہا مگر مرزا نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "آپ سے تو اب تفصیل سے

بات چیت ہوگی۔ کیوں نہ پہلے کھانا کھالیا جائے؟" اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ "فی الحال تو کوئی اسٹیشن نزدیک نظر نہیں آتا۔ گاڑی تو دیر ہی میں رکے گی۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "بات یہ ہے چودھری صاحب۔ میرا ملازم آگے کے کسی تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کررہا ہے۔ مگر اس کا انتظار کرنا فضول ہے۔ بھوک بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے مجھے بھوک زیادہ نہیں لگ رہی" رحیم داد نے تکلف سے کام لیا۔ سامنے کی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے مداخلت کی۔ "میں نے کہا جی' آگے کوٹ ادو ہے۔ وڈا سٹیشن ہے۔ وہاں ٹرین دیر تک ٹھیرے گی۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ البتہ مرزا اسرار بیگ نے مڑکر اس مسافر کی جانب دیکھا۔ "بالکل درست فرمایا آپ نے۔ مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ کوٹ ادو پر گاڑی خاصی دیر ٹھہرے گی۔ زیادہ دیر انتظار بھی نہ کرنا پڑے گا۔" وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "چودھری صاحب' کھانا تو اب وہیں کھانا مناسب رہے گا۔ میرا ملازم آکر کھانا لگا دے گا۔ بڑا مستعد اور فرمانبردار ہے۔ میں ہمیشہ سفر میں اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جی' کوٹ ادو ہی پر روٹی کھالیں گے۔" رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو سٹیشن پر مل جائے گی۔"

مرزا اسرار بیگ نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں تو آج کل سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ سنا ہے ڈیرہ غازی میں تو اور بھی زیادہ گرمی ہے۔ ویسے بھی وہاں کچھ زیادہ ہی گرمی پڑتی ہے۔ علاقہ بھی نہایت پس ماندہ ہے۔ نہ ریل گاڑی ہے نہ کوئی ڈھنگ کی سڑک۔ آمدورفت کے معاملے میں تو ادھر بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔"

"ہاں جی' وہاں کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اور جی گرمی تو ادھر بہت ہی زیادہ ہے" اس نے گرمی کی شدت کا سبب بتانے کی کوشش کی۔ "دور دور تک خشک اور بنجر پہاڑ پھیلے ہیں۔ گرمی تو فیر پڑنی ہی چاہیے۔"

"مجھے بھی ڈیرہ غازی خان میں متروکہ آراضی الاٹ ہو رہی تھی۔ مگر جب وہاں جاکر خود اپنی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لیا تو ارادہ ترک کردیا۔ زمیں داری کے لیے تو نہایت ناموزوں جگہ ہے سنا ہے مزارعے بھی بہت سرکش اور اکھڑ ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ بے تکلفی سے گویا ہوا۔ "بھئی چودھری صاحب' آپ ادھر کہاں پھنس گئے؟"

"بس جی پھنس ہی گیا۔" رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ "دلاور والا میں اڑھائی سو ایکڑ زمین الاٹ ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ تو جی آپ کو پتہ ہی ہے الاٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ پر اب میں نے سوچا ہے اسے فروخت کردوں۔ یوں سمجھئے جی، سودا بھی طے ہو چکا ہے۔"

"بہت مناسب فیصلہ کیا آپ نے۔" مرزا نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ ادھر زمیں داری کرنا ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ وہاں تو صرف بلوچ سردار ہی زمیں داری کرسکتے ہیں۔"

"ادھر تو جی، حکومت ہی سرداروں کی ہے۔ جیلیں ان کی، کچہری عدالت ان کی۔" رحیم داد نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "سرکاری افسر بھی جیسے ان کے اپنے بندے ہیں۔ جو چاہتے ہیں ان سے کرالیتے ہیں۔ نہ کریں تو تبادلہ کرادیتے ہیں۔ ان کی تو جی اوپر تک پہنچ ہے۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے۔ حالانکہ میرا وہاں بہت مختصر قیام رہا۔ مگر چند ہی روز میں صورت حال واضح ہوگئی۔" مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر گویا ہوا۔ "چودھری صاحب یہ متروکہ آراضی کے معاملے میں ڈھائی سو ایکڑ کی قید لگانے کی تک اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔"

"ہاں جی پریشانی تو بہت ہوتی ہے۔"

"اب یہی دیکھیے، خوشاب میں بھی مجھے اتنی ہی زرعی آراضی الاٹ ہوئی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔" مرزا اسرار بیگ کے لہجے سے بے زاری ہویدا تھی۔ "یہ ادھر ادھر بکھری ہوئی زمیں داری بڑی دردسری کا باعث بنتی ہے۔ ایک ہی جگہ ساری زمین داری ہو تو یکسوئی اور اطمینان سے اس کی دیکھ بھال ہو سکتی ہے۔ میری اس رائے سے آپ بھی اتفاق کریں گے۔"

"ہاں جی، بات تو آپ نے ٹھیک ہی کہی۔ پر کیا کریں حکومت نے پالیسی ہی ایسی بنا رکھی ہے۔" رحیم داد نے فوراً تائید کی۔ "ویسے جی، میری اصلی زمین داری تو ضلع منٹگمری ہی میں ہے۔"

"کیا میں معلوم کرسکتا ہوں وہاں کتنی آراضی ہے آپ کے پاس؟" مرزا اسرار بیگ نے نہایت شائستگی سے سوال کیا۔

"لگ بھگ ۳۲ مربعے ہوں گے۔" رحیم داد نے بڑے فخر سے مرزا اسرار بیگ کو مطلع کیا۔

"تب تو چودھری صاحب آپ خاصے بڑے زمیں دار ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے مسکرا کر کہا۔

"میرے پاس بھی بس اتنی ہی آراضی ہوگی۔" اس نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ "کچھ زیادہ ہوگی۔ یہی کوئی ساڑھے گیارہ بارہ سو ایکڑ۔ مگر صاحب یہ بھی کیا زمین داری ہوئی۔ ادھر پنجاب اور ادھر

سندھ میں تو ایسے بھی زمین دار ہیں' جن کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرحد اور بلوچستان کا حال تو صحیح طور پر معلوم نہیں۔ سنا ہے' وہاں بھی بعض خوانین اور سرداروں کے پاس اتنی ہی بڑی زرعی آراضی ہے۔"

"ضرور ہو گی جی۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "ان کے سامنے تو جی ہم بہت چھوٹے زمیں دار ہوئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" مرزا نے اتفاق رائے کیا۔ "ویسے میری بھی اصلی زمیں داری سندھ میں ہے۔ میرپور خاص کا نام تو آپ نے سنا ہی ہو گا۔ وہیں میری زمین ہے۔ کچھ الاٹمنٹ کے ذریعے ملی ہے۔ کچھ خریدی ہے۔"

"دوسری جگہ کی زمینیں فروخت کر کے خریدی ہو گی۔" رحیم داد نے نہایت بھونڈے پن سے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"نہیں جناب' ایسی کوئی بات نہیں۔" مرزا اسرار بیگ کو رحیم داد کا رویہ شاق گزرا۔ مگر اس نے درگزر کیا۔ وضاحت کے طور پر بتایا۔ "چودھری صاحب' میرا معاملہ دوسرے مہاجرین سے بہت مختلف ہے۔ میں نے ہجرت کرنے سے پہلے ہی اپنا کچھ روپیہ یہاں منتقل کرا دیا تھا۔ زمین کا بیشتر حصہ میں نے اسی روپے سے خریدا۔"

"برا نہ منائیں جی' بہت سے مہاجرین نے اپنی زمیں داری اسی طرح بڑھائی ہے۔" رحیم داد نے اپنے موقف کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا اور اس میں معذرت کا بھی پہلو تھا۔

"ایسا ہوا ہے اور بہت ہوا ہے۔" مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "اور ہونا بھی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا' ادھر ادھر بکھری ہوئی زمیں داری میں بڑی دردسری اٹھانا پڑتی ہے۔ ایک جگہ زمیں داری ہو تو اطمینان سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔"

"ویسے جی' متروکہ جائیداد کے معاملے میں بہت گڑبڑ ہوئی۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" مرزا اسرار نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب' آپ سے کیا بتاؤں' متروکہ جائیداد کے سلسلے میں کیسی لوٹ مار مچی ہے۔ بعض لوگوں نے تو اسے باقاعدہ کاروبار بنا لیا ہے۔ جگہ جگہ الاٹمنٹ حاصل کرتے ہیں اور جوں ہی موقع ملتا ہے متروکہ مکانات اور دکانیں پگڑی پر دے کر یا بیچ کر کسی دوسرے شہر کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس دھندے میں لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے۔"

"ضرور ہو گئے ہوں گے جی۔"

"جعلی فردِ حقیت اور جعلی کلیم فارموں کی بنیاد پر متروکہ آراضی کا الاٹمنٹ ایک علیحدہ ہی چکر ہے۔ میں آپ سے کیا کیا بتاؤں۔" مرزا اسرار بیگ نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "چودھری صاحب' اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بھائی' ایک دن مر کر اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اس وقت نہ دولت کام آئے گی نہ جائیداد۔" مرزا اسرار نے ران پر ہاتھ مارا اور گردن ہلا کر گنگنانے لگا۔

سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

رحیم داد متاثر ہو کر بولا۔ "ہاں جی' اصلی گل تو یہی ہے۔" اس کے لہجے سے خفت اور پشیمانی عیاں تھی۔

مرزا اسرار بیگ نے مزید بات چیت نہ کی۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے چٹیل میدان تھا جس میں بگولے منڈلا رہے تھے۔ کہیں کہیں کیکر کی جھاڑیاں تھیں' جو سایوں کی مانند دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ ریل گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی لوہے کی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

کوٹ ادو آ گیا۔ ریل گاڑی اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئی۔ پلیٹ فارم پر بھاگ دوڑ مچی تھی۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ڈبے کے چند مسافر دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے۔ کچھ نئے مسافر سوار ہوئے اور اپنا سامان ادھر ادھر رکھنے لگے۔ مرزا اسرار بیگ کا ملازم بھی ڈبے میں داخل ہوا۔ وہ بھی ادھیڑ تھا۔ ملگجا لباس' چہرے پر چھدری ڈاڑھی۔ سر پر دوپلی سفید ٹوپی۔ کندھے پر چار خانے کا رومال۔ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مرزا نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "تم آ گئے۔"

"سرکار! آپ نے کھانا تو ابھی نہیں کھایا۔" ملازم نے ناشتے دان پر نظر ڈالی۔

"میاں عبدل' تم بھی کمال کرتے ہو۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا کہ تم آؤ' کھانا لگاؤ۔ مگر تم نے تو پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ نہ آتے تو خود ہی کھانا نکالنا پڑتا۔"

"ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔" عبدل نے عاجزی سے صفائی پیش کی۔ "میں تو ہر اسٹیشن پر حاضری دیتا۔ مگر کیا کروں' جگہ دور کے ڈبے میں ملی ہے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر تو گھڑی بھر کے لیے گاڑی ٹھہرتی ہے۔ ڈرتا ہوں بھاگ دوڑ میں کہیں ٹرین نہ چھوٹ جائے۔ مجھے اپنی نہیں آپ کی تکلیف کی فکر تھی۔"

"اچھا اب تم باتیں کم کرو۔" مرزا اسرار بیگ نے اسے جھڑکا۔ "کھانا لگاؤ۔ سخت بھوک لگی

ہے۔"

عبدل نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ ٹوکری سے زرد رنگ کا چھپا ہوا چھوٹا سا دسترخوان نکالا' مرزا اسرار اور رحیم داد کے درمیان نشست پر بچھایا۔ فرش پر بیٹھ کر ناشتے دان کھولا۔ اور دسترخوان پر کھانا چن دیا۔ کھانے میں پراٹھے تھے۔ بھنا ہوا مرغ تھا۔ کباب تھے۔ آلو کا سالن تھا۔ بھنڈی کی بھجیا تھی۔ آم کا اچار تھا۔

عبدل نے گلاس میں ہاتھ دھونے کا پانی دیا۔ مرزا اسرار بیگ اور رحیم داد نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پانی سے دھوئے اور کھانے کی جانب رجوع ہو گئے۔ کھانا وافر تھا۔ مرغن تھا اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ دونوں رغبت سے کھانا کھانے لگے۔ عبدل نے ٹوکری سے آم نکالے اور ایک پلیٹ میں کاٹ کاٹ کران کی قاشیں رکھنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ اصرار کر کے رحیم داد کو کھانا کھلانے لگا۔ ہر پلیٹ اس کی جانب سرکاتا۔ بار بار کھانے کے لیے کہتا۔ رحیم داد نے بھی تکلف سے کام نہ لیا۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

دونوں کھانے سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ گارڈ کی سیٹی ابھری۔ عبدل نے جانا چاہا تو مرزا اسرار بیگ نے اسے روک لیا۔ "اب کھانا کھلا کر ہی جانا۔ اگلے اسٹیشن پر اتر کر اپنے کمپارٹمنٹ میں چلے جانا۔"

"جو حکم سرکار کا۔" عبدل نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

ریل گاڑی شور مچاتی آگے بڑھی۔ رفتہ رفتہ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ کوٹ ادو کا اسٹیشن' مکانات اور کوچہ و بازار پیچھے رہ گئے۔ رحیم داد اور مرزا اسرار بیگ کھانے سے فارغ ہوئے تو عبدل نے بچا ہوا کھانا اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ آم کی قاشوں سے بھری ہوئی پلیٹ دسترخوان پر رکھ دی۔

مرزا نے پلیٹ اٹھائی اور رحیم داد کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ "چودھری صاحب' یہ آم ملاحظہ فرمایئے۔ میرے اپنے باغ کے ہیں۔ میں نے باغپت اور ملیح آباد سے خاص طور پر آم کے پودے منگوا کر لگائے ہیں۔ آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔"

رحیم داد کو آم پسند بھی آئے' عمدہ اور خوش ذائقہ تھے۔ حالانکہ اس نے کچھ زیادہ ہی کھانا کھایا تھا۔ مگر آم اس قدر لذیذ تھے کہ وہ ہاتھ نہ روک سکا۔ ایک کے بعد دوسری قاش اٹھاتا رہا۔ مرزا اسرار بیگ خوش خوراک تھا۔ وہ بھی رغبت اور ذوق و شوق سے آم کھاتا رہا۔ پلیٹ خالی ہو گئی تو عبدل نے اور آم نکالے۔ مگر رحیم داد نے منع کر دیا۔ مرزا اسرار کے اصرار کرنے کے باوجود آم کھانے پر آمادہ نہ ہوا۔

دونوں نے ایک بار پھر کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر دھوئے۔ برف کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا اور ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ عبدل نے دستر خوان اٹھایا۔ جھاڑا اور تہہ کر کے ٹوکری میں رکھ دیا۔ جھوٹے برتن اٹھا کر دھونے کی غرض سے غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آکر اس نے برتنوں کو بھی ٹوکری میں رکھا اور بچا کھچا کھانا لے کر ایک گوشہ میں بیٹھ کر کھانے لگا۔

مرزا اسرار بیگ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحیم داد بھی اونگھ رہا تھا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی لوہے کی پٹریوں پر سرپٹ دوڑتی رہی۔ ایک چھوٹا اسٹیشن آیا۔ گاڑی رکی۔ عبدل اترا اور اپنے ڈبے کی جانب چلا گیا۔ مرزا اسرار نے کھڑکی سے گردن نکال کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

ریل گاڑی آگے بڑھی۔ اور تیزی سے دوڑنے لگی۔ گرمی اب اور بڑھ گئی تھی۔ مرزا نے پانوں کی ڈبیا اٹھائی۔ کھولی اور رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ مسکرا کر کہا۔ "لیجئے پان سے شوق فرمایئے۔" رحیم داد نے انکار کر دیا۔ "نہیں جی' میں پان نہیں کھاتا۔" مرزا نے مزید اصرار نہیں کیا۔ ڈبیا سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا۔ بٹوہ کھولا۔ چھالیا اور تمباکو نکالی۔ چٹکی بھر کر منہ میں ڈالی۔

چند لمحے تک وہ پان چباتا رہا۔ پھر کھڑکی سے منہ باہر نکال کر پیک تھوکی۔ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چودھری صاحب' آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"میں نے جی لہور جانا ہے۔"

"آپ کا تو خاصا لمبا سفر ہے۔" مرزا نے مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "کبھی آپ کا کراچی آنا نہیں ہوتا؟؟"

"نہیں جی' میں اب تک کراچی نہیں گیا۔" رحیم داد نے سادگی سے جواب دیا۔

"میرا مستقل قیام کراچی ہی میں رہتا ہے۔" مرزا اسرار بیگ نے بتایا۔ "پہلے جمشید روڈ پر رہتا تھا۔ وہاں مجھے ایک کوٹھی الاٹ ہوئی تھی۔ کئی سال اس میں مقیم رہا۔ پھر اسے فروخت کر دیا۔" باتوں کی رو میں اسے بالکل یاد نہ رہا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہ متروکہ مکانات اور دکانیں الاٹ کرانے اور انھیں فروخت کر کے نئے الاٹمنٹ حاصل کرنے کے رجحان کی شدید مذمت کر چکا تھا۔

"اب آپ کہاں رہتے ہیں جی؟"

"اب تو میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتا ہوں۔" مرزا نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ سرکاری افسر ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس نے پچھلے ہی سال اپنا بنگلہ تعمیر کرایا ہے۔ نہایت خوبصورت اور عالیشان ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔" اس نے ایک بار پھر پان کی پیک تھوکی۔

"ویسے ہندوستان میں میری جو کوٹھی تھی، وہ بھی کم شاندار نہ تھی۔ زمین داری بھی بہت بڑی تھی۔ پورے تین گاؤں تھے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "سب کچھ چھوٹ گیا۔ خواب و خیال ہو گیا۔"

"ہاں جی، سب ہی کچھ چھوٹ گیا۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

"کراچی آیئے تو غریب خانے پر ضرور تشریف لایئے۔ بلکہ میرے ساتھ ہی قیام کیجئے۔" مرزا نے کہا۔ "میں رخصت ہونے سے پہلے آپ کو اپنا پتہ اور ٹیلی فون نمبر دے دوں گا۔ کراچی آنے کا جب بھی ارادہ ہو تو ٹیلی فون کر دیجئے گا یا تار سے مطلع کر دیجئے گا۔ اسٹیشن پر اپنی کار بھیج دوں گا۔ آپ کو مطلق زحمت اٹھانا نہ پڑے گی۔"

"کراچی آؤں گا تو جی آپ کو ضرور تار بھیج دوں گا۔"

"ضرور آیئے۔ اب آپ سے ملاقات ہو گئی ہے تو اسے برقرار بھی رہنا چاہیے۔" مرزا نے اصرار کیا۔ "یہ بھی محض اتفاق ہے۔ ورنہ میں عام طور پر فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتا ہوں۔ اس ٹرین میں صرف ایک ہی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ ہے۔ اور اس کی بھی تمام سیٹیں پہلے ہی سے ریزرو تھیں۔ مجبوراً سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا پڑا۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ وہ اس کی گفتگو سے اتنا مرعوب ہو گیا تھا کہ مزید بات چیت نہ کر سکا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر مرزا اسرار بیگ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ "میرا مشورہ مانیں تو ہمیشہ فرسٹ کلاس ہی میں سفر کریں۔ کرایہ تو زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مگر سفر آرام و سکون سے گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور مراسم بڑھانے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔"

رحیم داد کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ مرزا اسرار بیگ فوراً تاڑ گیا۔ مسکرایا اور کھل کر بتانے لگا۔ "چودھری صاحب، یہ تو آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ زندگی میں اثر و رسوخ پیدا کیے بغیر کام نہیں چلتا۔" اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "فرسٹ کلاس میں اعلیٰ سرکاری حکام کے علاوہ اسمبلیوں کے ممبروں اور کبھی کبھی تو وزیروں سے بھی مراسم پیدا کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے سفر وسیلہ ظفر۔ میں نے تو بھائی بزرگوں کے اس قول کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر مرزا اسرار بیگ کی آواز ابھری۔ اس نے بات چھیڑی۔ "چودھری صاحب، ہندوستان کے کس علاقے سے آپ کا تعلق رہا ہے؟"

"میں جی گورداسپور میں ہوتا تھا۔"

"وہاں تو بڑا خون خرابا ہوا۔ مسلمانوں کا زبردست قتل عام ہوا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے بڑے مظالم ڈھائے۔" اس نے اظہار ہمدردی کیا۔ "بھائی، آپ نے تو بہت دکھ اٹھائے ہوں گے۔ بڑی تباہی و بربادی دیکھی ہو گی۔ نہ جانے کیسی کیسی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھا کر پاکستان پہنچے ہوں گے۔"

"نہ پوچھئے جی کیا کیا دکھ نہ اٹھانے پڑے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "بس کسی نہ کسی طرح ادھر پہنچ ہی گیا۔" رحیم داد نے چوہدری نور الٰہی مرحوم کی اس الم ناک روداد کو سنانے سے اجتناب برتا جسے وہ اپنی ذات سے منسوب کر کے اکثر سناتا تھا اور اس کی بنیاد پر سننے والوں کی ہمدردی حاصل کرتا تھا۔ مگر اب وہ احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اور تفصیل میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ مرزا اسرار بیگ کو تو وہ قصداً کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ مرزا کی گفتگو سے یہ تو واضح ہی ہو چکا تھا کہ وہ مہاجر ہے۔ ممکن ہے گورداسپور میں بھی رہ چکا ہو یا وہاں کے کسی ایسے مہاجر خاندان سے واقف ہو، جو چوہدری نور الٰہی مرحوم کا عزیز یا رشتہ دار ہو۔ تفصیلات بتانے میں خطرے کا امکان تھا۔ اور وہ کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا کیے۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "اب تو جی ساری باتیں پرانی ہو گئیں۔ کبھی یاد آجاتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں، چودھری صاحب، وہ ایک ڈراؤنا خواب ہی تھا۔" مرزا اسرار بیگ نے آہ سرد کھینچی۔ "گھربار، مال دولت، عزت و ناموس سب کچھ لٹا اور اسے لٹتے ہوئے ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھنا بھی پڑا۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ "کاش، یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے عینک اتاری۔ رومال سے آنسو پونچھے۔ "چودھری صاحب، ایک بار جب یہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں تو کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ ایسی ٹیس اٹھتی ہے کہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ بے اختیار دل بھر آتا ہے۔"

رحیم داد اس کا حزن و ملال دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ "صبر کریں جی، جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔ اب تو صبر ہی کرنا پڑے گا۔"

مرزا اسرار بیگ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی تھی۔

☆

اوپر کی نشست پر لیٹا ہوا مسافر اتر کر نیچے آگیا۔ وہ چھریرے بدن کا قد آور جوان تھا۔ وہ سامنے کی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ بش شرٹ کی جیب سے کنگھا نکالا اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو

درست کرنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ نظریں جھکائے خیالات میں غرق تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے گردن اٹھائی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اور دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "چودھری صاحب سچ پوچھیے تو پاکستان ہمارے اور آپ کے ایسے لٹے پٹے اور ستم رسیدہ مہاجرین کی قربانیوں سے حاصل ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں اچانک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "ہم نے سب کچھ لٹا کر اور اپنے پیاروں کے خون کا نذرانہ دے کر یہ نیا وطن بنایا ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر اس بار سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز ابھری۔ وہ الجھے ہوئے بالوں کو کنگھے سے سنوارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مرزا صاحب، آپ نے بالکل درست فرمایا۔ واقعی آپ نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں زبردست قربانیاں دی ہیں۔ میں تو اس کا عینی شاہد ہوں۔"

مرزا اسرار بیگ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ "آپ کی تعریف؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ "معاف کیجیے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"خاکسار کو صغیر احمد کہتے ہیں۔" اس نے کنگھا جیب میں رکھا۔ "مرزا صاحب، آپ تو شاید مجھے نہ جانتے ہوں۔ مگر میں آپ کی ذات گرامی سے بخوبی واقف ہوں۔ دہرہ دون کا رہنے والا کون آپ سے واقف نہ ہو گا۔ آپ تو بڑی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میں تو آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں، جب آپ ضلع کچہری میں عرائض نویس تھے۔ اور پھر آپ کا وہ دور بھی دیکھا، جب آپ کانگریسی نیتا بن گئے۔ ان دنوں آپ کھادی کا کرتا اور پاجامہ اور بنا چام کی چپٹی ہوئی چپل پہنتے تھے۔ گاندھی ٹوپی لگاتے تھے۔ پنڈت گوبند ولبھ پنت، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم اور ایسے ہی دوسرے بڑے کانگریسی نیتاؤں کی آمد پر پیش پیش ہوتے تھے۔ ان کا سواگت کرتے تھے۔ گلے میں ہار پھول ڈالتے تھے۔ زندہ باد اور جے ہند کے نعرے لگاتے تھے۔"

"میاں اب بس بھی کیجیے۔" مرزا اسرار بیگ نے صغیر احمد کو ٹوکا۔ "خدا معلوم آپ کس کا ذکر لے بیٹھے۔ میرا تو کبھی کانگریس سے تعلق نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو میرے بارے میں مغالطہ ہوا۔"

"مرزا صاحب، آپ کے بارے میں تو ہرگز مغالطہ نہیں ہو سکتا۔" صغیر احمد نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اوپر لیٹا بہت دیر سے آپ کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے تو آپ کی وہ عالیشان کوٹھی بھی دیکھی ہے جو رام گلی کے نکڑ پر واقع تھی۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "ممکن ہے وہ کبھی کوٹھی رہی ہو مگر میں نے جسے دیکھا، وہ ایک بوسیدہ مکان تھا۔ جس کی دیواریں کائی سے کالی پڑ چکی تھیں۔

دروازے پر کواڑوں کے بجائے پھٹا پرانا پردہ پڑا رہتا تھا۔ اور اس کا مالک بھی ماتادین حلوائی تھا۔ وہی ماتادین حلوائی جس کی صدر بازار میں بہت بڑی مٹھائی کی دکان تھی۔"

"آپ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے اس بار تلخ لہجے میں مداخلت کی۔ "خدا معلوم آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ میرے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ رام گلی کہاں ہے۔"

"آپ کو پتہ نہیں، مگر مجھے پتہ ہے۔" صغیر احمد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ہاں یہ پتہ نہیں کہ آپ کی زمیں داری کے وہ پورے تین گاؤں کہاں واقع تھے۔ جن کا آپ ذکر فرما رہے تھے۔ معاف کیجیے میں نے تو آپ کو ہمیشہ پھٹے حال دیکھا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا۔ "البتہ الیکشن کا زمانہ آپ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت آپ کا لباس بھی اجلا ہوتا۔ ہر وقت کلے میں پان کا بیڑا دبا ہوتا۔ اور بیڑی کے بجائے سگریٹ سے شوق فرمانے لگے تھے۔ اور جب آپ ضلع کانگریس کمیٹی کے جوائنٹ سیکریٹری بن گئے تب تو آپ کے ٹھاٹھ باٹ اور بھی بڑھ گئے تھے۔ سنا ہے ان دنوں رائے صاحب کنور کنہیالال کی جانب سے آپ کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ آپ کنور صاحب کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہی جن کے دہرہ دون میں چائے کے باغات تھے۔"

"دیکھیے میاں صاحبزادے، آپ بہت زیادتی فرما رہے ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے خفا ہو کر کہا۔

"مرزا صاحب میں تو کوئی زیادتی نہیں کر رہا ہوں۔" وہ نہایت اطمینان سے بولتا رہا۔ "زیادتی تو آپ نے صرف مجھ سے نہیں بلکہ دہرہ دون کے سارے ہی مسلمانوں کے ساتھ اس وقت فرمائی تھی جب آپ مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ میں ان دنوں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں تھا اور دوسرے مسلمان طلباء کے ساتھ میں نے آپ کے گھر کے سامنے بھوک ہڑتال بھی کی تھی تاکہ آپ اس ارادے سے باز آجائیں۔"

"بھئی آپ کہاں کی ہانک رہے ہیں؟" اس دفعہ مرزا اسرار بیگ نے درشت لہجے میں کہا۔ "معلوم نہیں آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ استغفراللہ، کیسا الیکشن، کس کا الیکشن؟ میں نے تو کبھی اسمبلی وسمبلی کا الیکشن نہیں لڑا۔"

"لڑتے تو آپ ضرور۔ کوشش بھی پوری پوری کی تھی۔ مگر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے ٹکٹ ہی نہیں دیا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "سنا ہے، آپ نے تو بورڈ کے فیصلے کے خلاف کانگریس ہائی کمان سے اپیل بھی کی تھی لیکن وہ بھی مسترد ہو گئی۔ اس کے باوجود آپ کی وفاداری میں فرق نہ آیا۔ ان دنوں نیشنلسٹ مسلم کی اصطلاح وضع ہوئی تھی۔ آپ بھی نیشنلسٹ مسلم بن گئے تھے اور کانگریسی امیدوار کے لیے دن رات بھاگ دوڑ کرتے تھے۔" وہ کھلکھلا کے ہنسا۔ "یہ خاکسار اس زمانے

میں طلباء کے اس گروہ میں شامل تھا جس کا کام نیشنلسٹ مسلمانوں کے جلسوں کو درہم برہم کرنا اور ناکام بنانا ہوتا تھا۔" اس نے مرزا اسرار بیگ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "آپ کو تو اچھی طرح یاد ہو گا۔ ایک بار انتخابی جلسے میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ لاٹھیاں اور ڈنڈے چلے۔ کرسیاں اٹھا اٹھا کر پھینکی گئیں۔ ایک کرسی آپ کے چہرہ انور پر لگی۔ آپ شاید جلسے کی صدارت فرما رہے تھے۔ کرسی آپ کے چہرے پر ایسی لگی کہ ناک زخمی ہو گئی۔ آپ کو اسپتال جانا پڑا تھا۔"

رحیم داد نے جھٹ مرزا اسرار بیگ کی نکوتی اور بد وضع ناک کی جانب دیکھا۔ اور یک لخت دیکھتا رہا۔ غور کرتا رہا کہ ناک پر چوٹ کا نشان بھی ہے۔

صغیر احمد نے رحیم داد کی جانب توجہ نہ دی۔ نہایت اطمینان سے بولتا رہا۔ "مرزا صاحب' آپ اسپتال سے نکلے تو لونڈے لپاڑے آپ کی ناک دیکھتے تھے' اور شرارت سے مرزا سنگھاڑا کا نعرہ لگاتے تھے۔ تب سے آپ کا نام مرزا سنگھاڑا پڑ گیا۔ جدھر نظر اٹھتی دیواروں پر مرزا سنگھاڑا لکھا ہوا نظر آتا۔ آپ کے عجیب و غریب کارٹون بنے ہوتے۔"

"زبان سنبھال کر بات کریں۔" مرزا اسرار بیگ ایک دم پھٹ پڑا۔ غصے سے چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ غیظ و غضب کے عالم میں ہانپنے لگے۔ "آپ حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں۔"

مرزا اسرار کی اونچی آواز سن کر ڈبے میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ صغیر احمد کے چہرے سے بھی اب مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے تیکھی نظروں سے دیکھا اور تڑپ کر بولا۔ "مرزا صاحب' ان زخموں کو بھی تو یاد کیجئے جو آپ نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو محض سیاسی اختلافات کی بنا پر لگائے تھے۔ یاد کیجئے وہ دن جب دہرہ دون میں فسادات کی آگ بھڑکی۔ ہردوار سے شرنارتھیوں کے غول کے غول دہرہ دون پہنچنے لگے اور مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملے کرنے لگے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے والنٹیر خنجر اور بلم اٹھائے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا اشتعال انگیز نعرے لگاتے تھے۔"

ریل گاڑی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ ڈبے کے تمام مسافر صغیر احمد کی جانب دیکھ رہے تھے اور وہ تیکھے لہجے میں بول رہا تھا۔ "مرزا صاحب' آپ کو وہ رات تو یاد ہو گی جب متاثرہ محلوں کے مسلمان کسی نہ کسی طور وائسرے روڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ مسلمانوں کا مضبوط گڑھ تھا۔ مگر بلوائیوں کی اس پر نگاہ تھی۔ انھوں نے اس رات حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔"

"پر حملہ تو جی ہندوؤں اور سکھوں نے کرنا تھا۔" رحیم داد نے مرزا اسرار بیگ کی حمایت میں مداخلت کی۔ "مرزا صاحب کو ان کے حملے سے کیا لینا تھا۔"

"سنتے جایئے۔" صغیر احمد نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "جب حملے کی اطلاع مسلمانوں کو پہنچی تو ان کا ایک وفد چھپتا چھپاتا کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب کے پاس پہنچا۔ درخواست کی کہ مسلمانوں کی جان و مال بچانے کے لیے اعلیٰ حکام سے مدد دلوائی جائے۔ میں اس وفد میں شامل تھا۔ مجھے یاد ہے۔" اس نے مرزا اسرار بیگ کو مخاطب کیا۔ "مرزا صاحب، آپ کو بھی اچھی طرح یاد ہو گا کہ آپ نے کسی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جب بار بار گڑگڑا کر فریاد کی۔ دہائی دی تو آپ نے دھتکار دیا تھا۔ اور طنزیہ فرمایا تھا، میرے پاس کیوں آئے ہو؟ پاکستان جاؤ۔ تم نے اپنا پاکستان بنا لیا۔ اب تم کو وہیں اماں ملے گی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یاد ہے نا آپ کو؟ آپ کو شاید اب یاد نہ رہا ہو۔ مگر مجھے اب تک ایک ایک بات یاد ہے۔ آپ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں نہایت آن بان سے کرسی پر بیٹھے تھے اور نہایت اطمینان سے پان چبا رہے تھے۔"

"کیوں مرزا صاحب، یہ سچ کہہ رہے ہیں؟" صغیر احمد کے برابر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے دریافت کیا۔

"بھائی مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ انھی سے پوچھو۔" مرزا اسرار بیگ نے صغیر احمد کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ "یہ جو کچھ کہیں ٹھیک ہے، میں بوڑھا یہ جوان۔ میں ان کے ساتھ دھینگا مشتی تو کرنے سے رہا۔"

"آگے کیا ہوا جی؟ ہندوؤں اور سکھوں کے حملے کا کیا بنا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ تو مہاویر تیاگی کو دعا دیجئے کہ انھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو اس رات قتل و غارت گری سے بچا لیا۔"

"وہ کون تھے جی؟"

"اس وقت وہ یوپی اسمبلی کے ممبر تھے۔" صغیر احمد نے بتایا۔ "مرزا صاحب کی طرف سے نا امید ہونے کے بعد مسلمانوں کا وفد ان کے پاس پہنچا۔"

"پر وہ تو ہندو تھا۔ وہ کیا مدد کرتا۔" صغیر احمد کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔

"وہ نہ صرف ہندو ہیں بلکہ کٹر کانگریسی بھی ہیں۔" صغیر احمد نے جواب دیا۔ "انھوں نے وفد کی

باتیں پوری توجہ سے سنیں اور صورت حال کی نزاکت کو بھی محسوس کیا۔ اسی وقت ایس پی کو فون کیا۔ وہ سکھ تھا اور نہایت متعصب سکھ تھا۔ اس نے پولیس کی امداد مہیا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مگر تیاگی جی نے حوصلہ نہ ہارا۔ ڈپٹی کمشنر سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی متعصب ہندو تھا۔ اس نے کسی قسم کی مدد دینے کے بجائے الٹا تیاگی کو طعنہ دیا۔ کہنے لگا۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کا جو قتل عام ہو رہا ہے ان کی آپ کو کوئی فکر نہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کا بڑا غم ہے۔"

"تب تو تیاگی بھی کچھ نہ کر سکا ہو گا۔" ایک مسافر نے تبصرہ کیا۔

"نہیں جناب' تیاگی جی نے تب بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ بڑی جرات کا مظاہرہ کیا۔" صغیر احمد نے بتایا۔ "انھوں نے غصے سے ڈپٹی کمشنر کو ڈانٹا۔ چیخ کر کہا۔ میں تم کو معطل کرتا ہوں اور شہر کا انتظام اسی وقت سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ انھوں نے کیا بھی ایسا ہی۔ فوراً اپنی جیپ نکالی۔ کانگریس کے کچھ والنٹیر اپنے ساتھ لیے۔ وفد کے ممبروں کو دوسری جیپ میں بٹھایا۔ ایس پی کو بھی معطل کیا۔ جس تھانے دار نے انکار کیا اسے بھی فوراً معطل کیا۔ پولیس کی ایک مسلح جمعیت اپنے ساتھ لی۔ جیپ پر لاؤڈ اسپیکر نصب کرایا۔ وائسرے روڈ پہنچے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلایا۔ وہاں سے اس علاقے میں گئے جہاں حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر ان کو خبردار کیا کہ اگر کسی نے گڑ بڑ کی تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ ضرورت پڑی تو فائرنگ بھی کی جائے گی۔ ذرا بھی کسی بلوائی کے ساتھ رعایت نہیں ہو گی۔"

"اس کا کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ہوا یہ کہ بلوائی ڈر گئے۔ اور ایسے ڈرے کہ دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔" صغیر احمد نے بتایا۔ "مگر بعد میں مسلمانوں کے لیے حالات خراب ہی ہوتے گئے۔" اس نے مسکرا کر مرزا اسرار بیگ کی جانب دیکھا۔ "یہاں تک کہ مرزا صاحب کو بھی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ ان کے بڑے صاحبزادے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ سنا ہے وہ کلیم افسر ہیں۔ کیوں مرزا صاحب میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"میں تو یہی کہوں گا کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ "اچھا اب اس قصّے کو چھوڑیے' یہ بتایئے آپ کا شغل کیا ہے؟"

مرزا اسرار بیگ نے جھینپ مٹانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر صغیر احمد مطلق متاثر نہ

ہوا' اس کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔ "آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ نہ میں سی آئی ڈی میں ہوں نہ میرا پولیس سے تعلق ہے۔ میں محکمہ زراعت سے وابستہ ہوں۔ سیکنڈ کلاس میں دیکھ کر آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں معمولی سرکاری ملازم ہوں۔ تھل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے سلسلے میں ریگ زار کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ عام طور سے تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں یا کبھی کبھار انٹر میں۔ آج تھرڈ اور انٹر کلاس میں جگہ نہ مل سکی تو سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "بہرحال آپ کو کسی طور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ مار اتنی عام ہے کہ کس کس کو جعلی فردِ حقیت' جعلی کلیم اور جعلی الاٹمنٹ حاصل کرنے کا الزام دیا جائے۔ جس کا موقع لگتا ہے مطلق نہیں چوکتا۔ کیا مہاجر کیا مقامی' اس حمام میں سب ننگے ہیں۔"

اس کی باتیں سن کر رحیم داد کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ وہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مرزا اسرار بیگ نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔ خاموشی سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ صغیر احمد اٹھا اور دروازہ کھول کر غسل خانے میں چلا گیا۔

رحیم داد نے آنکھیں بند کرلیں اور ٹانگیں کسی قدر پھیلا دیں۔ نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ ریل گاڑی کے جھٹکوں کے ساتھ آہستہ آہستہ جھومنے لگا۔ ایک بار نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ اس کا سر کھڑکی سے ٹکرا گیا۔ رحیم داد نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

مرزا اسرار بیگ اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد خفیف ہو کر آنکھیں ملنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ نے مشورہ دیا۔ "چودھری صاحب' آپ کو نیند معلوم ہو رہی ہے۔ اوپر جا کر اطمینان سے سو جائیے۔ یہاں آپ بے چین رہیں گے۔"

رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ جوتے اتارے اور اوپر کی نشست پر چلا گیا۔ قمیص اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی۔ مرزا اسرار بیگ سے تکیہ لے کر سرہانے رکھا اور ٹانگیں پسار کر اطمینان سے لیٹ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھت سے لگے ہوئے پنکھے کا رخ بھی اپنی طرف کر لیا۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے خاموش پڑا رہا' پھر سو گیا۔

☆

ریل گاڑی شور مچاتی کھٹ کھٹ کرتی دوڑتی رہی۔ اسٹیشن آتے رہے' جاتے رہے۔ ریل گاڑی ٹھہرتی' اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ مسافر اترتے رہے' سوار ہوتے رہے۔ لیہ کا اسٹیشن آیا تو صغیر احمد نے اپنا اٹیچی کیس سنبھالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مرزا اسرار بیگ خاموش بیٹھا تھا۔ صغیر احمد نے اس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر ایک بار پھر اسے چھیڑا۔ کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "مرزا سنگھاڑا!" وہ کھل کر مسکرایا۔ "معاف کیجئے' مرزا اسرار بیگ صاحب اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔"

مرزا اسرار بیگ نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ صغیر احمد آگے بڑھا اور ڈبے سے نکل کر باہر پلیٹ فارم پر آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔ مرزا اسرار بیگ اسے دور تک دیکھتا رہا۔

ریل گاڑی آگے بڑھ گئی۔ مرزا اسرار بیگ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھائی تھی۔ اس نے نہ کسی مسافر کی جانب دیکھا نہ کسی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ صغیر احمد نے اس کے ذہن میں کھلبلی برپا کر دی تھی۔

رحیم داد اوپر کی نشست پر بے خبر سوتا رہا۔

دن ڈوبا رات ہو گئی۔ ہر سو اندھیرا پھیل گیا۔ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کو آہستہ آہستہ جھنجوڑا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "چودھری صاحب' بہت سو چکے ہیں۔ رات ہو گئی۔ اٹھئے کھانا کھا لیجئے۔ رحیم داد آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نشست سے نیچے اترا۔ قمیص کھونٹی سے اتار کر پہنی اور غسل خانے میں چلا گیا۔

رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا اور مرزا اسرار بیگ کے برابر بیٹھ گیا۔ اس کا ملازم عبدل موجود تھا۔ اس نے کھانا لگا دیا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے ہوئے ڈبے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مسافروں میں اب نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ پرانے غائب تھے۔ صغیر احمد بھی اسے دکھائی نہ دیا۔

رحیم داد نے مرزا اسرار بیگ سے دریافت کیا۔ "وہ بندہ چلا گیا؟ میرا مطلب ہے صغیر احمد چلا گیا؟"

"جی ہاں' وہ مردود دفان ہو گیا۔" مرزا نے جل کر کہا۔ "لیہ پر اتر گیا۔ عجب نامعقول شخص تھا۔"

"ہاں جی' چنگا بندہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"سخت واہیات شخص تھا۔ نہایت لپاڑیا۔" مرزا اسرار بیگ غصے سے بل کھاتے رہے اور صغیر احمد کو برا بھلا کہتے رہے۔ "خدا معلوم یہ خبیث کہاں سے نازل ہو گیا۔"

"آپ کی جی اس کے ساتھ کب کی جان پہچان ہے؟"

"توبہ کیجئے چودھری صاحب' میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ خدا دوبارہ نہ دکھائے۔" اسرار بیگ نے صفائی پیش کی۔ "مجھے تو حیرت اس کی ڈھٹائی پر ہے۔ کس دھڑلّے سے جھوٹ پر جھوٹ

بول رہا تھا۔ طرح طرح کے الزام لگا رہا تھا۔ نہ میں کبھی دہرہ دون میں رہا نہ کبھی میرا کانگریس سے تعلق رہا۔ میں تو پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ وہیں سے لٹ پٹ کر پاکستان آیا۔"

"آپ نے جی اسے صاف صاف یہ گل بات بتائی کیوں نہیں؟" رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے دریافت کیا۔

"چودھری صاحب' اس نامعقول نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا۔ برابر اپنی ہی ہانکتا رہا۔" اسرار بیگ نے جھنجلا کر کہا۔ "اس کے جھوٹے الزامات کا تو صرف ایک ہی جواب تھا اور وہ یہ تھا کہ جوتا اٹھا کر اس کی چندیا پر تڑاتڑ لگائے جاتے۔ ساری شخصول بازی نکل جاتی۔ مگر رہا تھا پائی میں نقصان کس کا ہوتا۔ مجھے تو وہ کوئی اوباش اور چرڑ قناتیا لگتا تھا۔ اس کا کچھ نہ جاتا۔ اس کی عزت ہی کیا ہے جو جاتی۔ شریف آدمی تو شرافت میں مارا جاتا ہے۔ اسی لیے خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔"

"اس نے تو جی بہت بکواس کی۔"

"طبیعت ایسی مکدر کر دی کہ کھانا کیا کھا رہا ہوں' زہر مار کر رہا ہوں۔" مرزا اسرار بیگ نے اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ "غضب خدا کا' کیسے کیسے نازیبا الزامات لگائے۔ اور کس ڈھٹائی سے لگائے جن کا نہ سر نہ پیر۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ صغیر احمد کے بارے میں جلی کٹی سناتا رہا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ رحیم داد بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مرزا کے ملازم' عبدل نے جھوٹے برتن دھو کر صاف کیے۔ ٹوکری میں حفاظت سے رکھے۔ ناشتا دان بند کیا۔ اسٹیشن آیا تو وہ اپنے ڈبے کی سمت چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ رات تاریک ہوتی گئی۔ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چودھری صاحب' خوشاب تک تو آپ کا ساتھ رہے گا۔ آپ سرگودھا کے راستے لاہور جائیں گے نا؟"

"نہیں جی' میں اس راستے سے نہیں جاؤں گا۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔ حالانکہ وہ سردار شہ زور مزاری کے ہم راہ اسی راستے سے آیا تھا۔ واپس بھی اسی راستے سے جانا چاہتا تھا۔ مگر روانگی سے قبل اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کہنے لگا۔ "میں تو جی پنڈی جاؤں گا۔ وہاں سے لہور کے لیے ٹرین پکڑوں گا۔"

"بہرحال کندیاں تک تو ساتھ رہے گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ بلاشبہ مرزا اسرار بیگ کے ساتھ اس کا سفر نہ صرف اچھا گزرا تھا

بلکہ بڑے آرام سے گزرا تھا۔ کھانے پینے کے علاوہ اسے مرزا سے ہر طرح کی سہولت ملی تھی۔
کندیاں آگیا۔ عبدل ڈبے میں قلی کے ہم راہ داخل ہوا۔ اس نے تمام سامان باہر نکالا۔ مرزا اسرار بیگ رخصت ہوتے ہوئے رحیم داد سے بغل گیر ہوا۔ مگر نہ اس نے اپنا کراچی کا پتہ دیا اور نہ ہی رحیم داد نے طلب کیا۔ مرزا اسرار بیگ ڈبے سے نکل کر باہر گیا تو رحیم داد بھی اس کے ساتھ پلیٹ فارم پر گیا۔

☆

ریل گاڑی آگے روانہ ہوئی تو ڈبے میں صرف دو مسافر رہ گئے۔ مگر داؤد خیل پر وہ بھی اتر گئے۔ ڈبا اب بالکل خالی رہ گیا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ مگر رحیم داد کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ سہ پہر کو بہت دیر تک گہری نیند سو چکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ڈبے میں اندھیرا تھا۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹنے سے قبل تمام بتیاں بجھا دی تھیں۔ صرف غسل خانے کی بتی روشن تھی۔ جس کی مدھم روشنی دروازے میں لگے ہوئے شیشے سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ مگر یہ روشنی اتنی کم تھی کہ ایک زرد دھبے کی مانند نظر آتی تھی۔
رحیم داد کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ریل گاڑی اندھیرے میں دوڑتی رہی۔ کسی بستی کے نزدیک سے گزرتی تو دور سے چراغوں کی روشنی جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی معلوم ہوتی۔ بستی قریب آتی تو روشنیوں کی جگمگاہٹ تیز ہوجاتی اور آن کی آن میں گزر کر پیچھے رہ جاتی۔
گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ رحیم داد اتر کر پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ ریل گاڑی کچھ دیر وہاں رکتی تھی۔ رحیم داد ٹہلتا ہوا انجن تک چلا گیا۔ گارڈ کی سیٹی چیخی تو وہ چونکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے ڈبے کی طرف چلا۔ اس کا ڈبا بہت پیچھے تھا۔ رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ گاڑی میں حرکت پیدا ہوئی تو وہ اور زیادہ پریشان ہوا۔ اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اب گاڑی کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ مگر رحیم داد اچھل کر پائیدان پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہینڈل سنبھالا دوسرے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ڈبے میں اندھیرا چھایا تھا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ چٹخنی چڑھائی اور دروازے سے پیٹھ لگا کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی سانس ہنوز پھولی ہوئی تھی۔ اوسان بجا نہ تھے۔
جب ذرا قرار آیا اور آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اسے اپنے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ وہ حیران و پریشان

دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ یکایک دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر کوئی کھڑا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ نہ وہ بولا نہ رحیم داد۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بت بنے کھڑے تھے۔

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ ہمت سے کام لیا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا۔ سوئچ ٹٹولا اور چھت پر لگا ہوا بلب روشن کر دیا۔ ڈبے میں روشنی پھیل گئی۔ رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ جمال دین' ایک نشست کا سہارا لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ پگڑی گلے میں پڑی تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور خاک دھول سے اٹے تھے۔ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا' اور مٹیالا مٹیالا نظر آ رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے۔ جمال دین کو دیکھ کر رحیم داد سخت سراسیمہ ہو گیا تھا۔ اس کا خدشہ بیجا بھی نہ تھا۔ جمال دین اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ لنگوٹیا یار تھا۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ جوان ہو کر بھی ان کی یاری دوستی قائم رہی۔ وہ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے۔ ایک دوسرے کی ہر طرح مدد بھی کرتے۔ زمین کی وٹ بندی پر جب رحیم داد کا سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ساتھ مسلح تصادم ہوا تو یہ جمال دین ہی تھا جس نے کلہاڑی سنبھال کر رحیم داد کا ساتھ دیا تھا۔ جم کر مقابلہ کیا تھا۔ زخمی ہوا تھا اور رحیم داد کے ساتھ ہی جیل بھی گیا تھا۔ بعد میں وہ ضمانت پر رہا ہو گیا اور اقدام قتل کے مقدمے میں بری بھی ہو گیا تھا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔ وہ جیل ہی میں رہا۔

اب ایک طویل مدت کے بعد وہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ جمال دین نے اسے پہچان تو نہیں لیا۔ اس نے اجنبیت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے تو؟"

جمال دین نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں اٹھائے رحیم داد کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

رحیم داد نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ "تجھے پتہ نہیں یہ سیکنڈ کلاس ہے۔ اس کا کرایہ بہت زیادہ ادا کرنا ہو گا۔" اس نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ "اگلے سٹیشن پر اتر جانا۔"

"میں نے جہاں اترنا ہو گا اپنی مرضی سے اتروں گا۔" جمال دین نے تلخ لہجے میں کہا۔ "توں مجھے روکنا والا کون؟ تو کوئی ٹکٹ بابو لگا ہے؟ جیسے تو مسافر ویسے میں۔"

رحیم داد نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ مگر وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا

کہ وہ موجود رہے اور خطرہ بن کر اس کے سر پر مسلسل منڈلاتا رہے۔ اس دفعہ اس نے دھمکی سے کام لیا۔ "تجھے اترنا پڑے گا۔ تو اس ڈبے میں نہیں سفر کر سکتا۔ میں زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوا لوں گا۔" اس نے زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

جمال دین نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا اور اسے کھول کر زور سے چیخا۔ "ٹھہر جا۔"

رحیم داد کھلا ہوا چاقو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

رحیم داد نے سہمی ہوئی نظروں سے جمال دین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ ہاتھ میں چاقو دبائے ڈراؤنا اور خوف ناک نظر آرہا تھا۔ رحیم داد سنبھلا بھی نہ تھا کہ جمال دین اچھل کر تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اس نے چاقو سے وار کیا۔ رحیم داد جھپاک سے ایک طرف ہٹ گیا۔ جمال دین اپنے ہی حملے کے زور میں لڑکھڑا کر آگے نکل گیا۔ چاقو کا پھل دروازے سے ٹکرا کر لکڑی میں اتر گیا۔

جمال دین لکڑی میں پھنسے ہوئے چاقو کو جھٹکا دے کر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد اس اثناء میں سنبھل چکا تھا۔ وہ پلٹا اور جھپٹ کر پشت کی جانب سے جمال دین کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ جمال دین گھبرا گیا۔ چاقو پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ مڑا اور رحیم داد کے ہاتھوں کے شکنجے سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ دیکھنے میں وہ دبلا پتلا تھا، مگر ہاتھ پیروں میں کس بل تھا۔ رحیم داد کے لیے اسے قابو میں رکھنا آسان نہ رہا۔ اس نے بھی پوری قوت صرف کر دی۔ دیر تک کشمکش جاری رہی۔ آخر جمال دین اس کی پکڑ سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر رحیم داد نے اس سے قبل کہ جمال دین سنبھلے نہایت چابک دستی سے چاقو کے دستے کو تھام لیا۔ زور لگا کر اسے کھینچا۔ چاقو اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ جمال دین جھپٹنے کے لیے پلٹا تو رحیم داد چاقو ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ دونوں ہانپ رہے تھے۔ لیکن جمال دین اب کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ نہتا تھا اور رحیم داد کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپتا رہا اور قہر آلود نظروں سے رحیم داد کو گھور رہا تھا۔

"تو ڈکیتی کے ارادے سے آیا تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں۔" جمال دین نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے چوری ڈکیتی کبھی نہیں کی، میں ایسا گندا کام نہیں کرتا۔"

"کسی کا خون کر کے بھاگا ہے؟" رحیم داد نے سوال کیا۔

جمال دین کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجلاہٹ غائب ہو گئی۔ آنکھوں سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ وہ

خاموش کھڑا رہا۔ اس دفعہ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”صاف صاف بتا۔“ اس نے ایک بار پھر دھمکی دی۔ ”ورنہ میں زنجیر کھینچ کر گڈی روک لوں گا۔ تجھے فرار ہونے بھی نہیں دوں گا۔ گرفتار کرادوں گا۔“ اس نے جمال دین کو خائف کرنے کی غرض سے زنجیر کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

”زنجیر نہ کھینچ۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے‘ تو ادھر بیٹھ جا۔“ رحیم داد نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ ”تجھ سے آرام سے گل بات ہوگی۔“

جمال دین آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور رحیم داد کی ہدایت کے مطابق خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اپنی نشست پر پہنچا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر کیں اور تکیے سے کمر ٹکا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ رحیم داد نے جمال دین کی جانب دیکھا اور لہجے میں بھاری بھرکم پن پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں‘ اب بتا تو کیا واردات کر کے آیا ہے؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ جمال دین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے کوئی واردات کی بھی ہے تو تجھے اس سے کیا لینا۔“ اس کی آواز کا تیکھا پن پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب اس میں التجا کا پہلو نمایاں تھا۔ ”تو پریشان نہ ہو۔ میں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ اگلے ٹیشن پر اتر جاؤں گا۔“

”تجھے کہاں جانا ہے؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”مجھے خود پتہ نہیں کہاں جانا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کہیں بھی چلا جاؤں گا۔“

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ جمال دین جلد سے جلد ڈبے سے باہر چلا جائے۔ وہ بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوا تھا اور اس کے لیے مسلسل پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ رحیم داد کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چاقو پر گرفت کمزور پڑ جاتی۔ چاقو اس کے لیے مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرے کا باعث بھی تھا۔ اگر جمال دین دوبارہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے قتل کرنے سے نہ چوکتا۔ اس کی نیت ایسی ہی معلوم ہوتی تھی۔

رحیم داد نے سوچا چاقو تکیے کے نیچے رکھ کر سو جائے۔ مگر خطرہ پھر بھی موجود تھا۔ جمال دین نیند کی غفلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آخر اس نے چاقو سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہا۔ ساتھ ہی جمال دین پر احسان بھی جتایا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ جمال دین کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تو آرام سے سیٹ پر لیٹ جا۔ میں نے تجھے تنگ کر کے کیا لینا۔“ اس نے چاقو سامنے کر دیا۔ ”تو اس سے ڈر رہا ہے تو میں اسے پھینکے دیتا ہوں۔“ اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر چاقو ایک گھنی جھاڑی کی طرف

اچھال دیا۔

جمال دین پر رحیم داد کے اس اقدام کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تو مجھے برا بندہ نہیں لگتا۔" وہ معذرت کرنے لگا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے بہت برا کیا۔ مجھے تجھ پر حملہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "تو اجازت دے تو میں یہیں بیٹھا رہوں۔ صبح ہوتے چلا جاؤں گا۔"

"تو نے تو اگلے سٹیشن پر اترنے کو کہا تھا۔" رحیم داد نے اسے چوکنا ہو کر دیکھا۔ "کسی دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھ جا۔"

"چلا تو جاؤں پر ادھر خطرہ ہے۔ کوئی مجھے پہچان لے گا تو گرفتار کرا دے گا۔ تیرا ڈبا خالی تھا تبھی تو اس میں آ گیا۔" جمال دین نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔ "پیدل بھی اب چلنے کی ہمت نہیں۔ کل رات میں حجری میں تھا۔ تب سے برابر پیدل چل رہا ہوں۔ روٹی شوٹی بھی نہیں کھائی۔"

"خون کیا ہے کسی کا؟" رحیم داد نے نرمی سے پوچھا۔ "مجھے صاف صاف بتا دے۔ شاید میں تیری کچھ مدد ہی کر سکوں۔"

"ہاں جی' میں نے خون ہی کیا ہے؟" جمال دین نے دبی زبان سے کہا۔

"کس کا خون کیا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میں جی جھنگ میں سید زادوں کے پاس لگا ہوا تھا۔ گھر والی بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کا نام بلّو تھا۔ میں اسے اکال گڑھ سے ویاہ کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ پہلے سے میری یاری بھی رہ چکی تھی۔ پر اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میں زمین دار کے کام سے شہر جاتا تو کئی کئی روز ادھر رہتا۔" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میرے پیچھے وہ چھپ چھپ کر باری سے ملتی۔ وہ بھی سید زادوں کا نوکر تھا۔ ایک بار جب میں کئی روز بعد شہر سے لوٹا تو بلّو غائب تھی۔"

"باری کے ساتھ بھاگ گئی تھی؟" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں جی' وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔" جمال دین نے اعتراف کیا۔ "میں نے بہت تلاش کیا' پر کوئی پتہ نہ چلا۔ یہ کئی مہینے ادھر کی گل ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک لاری ڈرائیور نے بتایا۔ اس نے باری کو حجری میں دیکھا تھا۔ بلّو بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ مجھے بہت غصہ چڑھا۔ فوراً حجری پہنچا۔ پتہ چلا کہ ڈرائیور نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔"

"تو بلّو کو واپس لینے تھا نے نہیں گیا؟"

"نہیں جی' اسے واپس لے کر کیا کرتا۔ وہ میرے کام کی کہاں رہی تھی۔" اس نے رحیم داد

سے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ایسا تھا تو حجری گیا ہی کیوں؟'' رحیم داد نے جرح کرنے کے انداز میں سوال کیا۔

''غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے جی۔ میں دونوں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے گیا تھا۔'' جمال دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ ''آدھی رات تک میں حجری کے نزدیک ایک جھنگر میں چھپا رہا۔ جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پنڈ میں داخل ہوا۔ باری کے گھر پر پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر حملہ کیا۔ پورا چاقو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ میں نے دوسرا وار کیا تو اس کی ساری انتڑیاں پیٹ سے نکل کر باہر آگئیں۔''

''بلّو کا کیا بنا؟'' رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''باری نے زخمی ہونے کے بعد شور مچایا تو وہ بھی باہر آگئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ اس نے بہت منت کی۔ پر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ زمین پر گرا کر اس کا گلا کاٹ ڈالا۔'' اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ''اسی چاقو سے دونوں کا خون کر دیا جو تو نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔''

''شور شرابے سے پنڈ میں جاگ ہو گئی ہوگی۔''

''ہاں جی بالکل ہو گئی تھی۔'' جمال دین نے رحیم داد کو بتایا۔ ''کئی بندوں نے تو مجھے پکڑنے کی بھی کوشش کی۔ دور تک میرا پیچھا کیا۔ پر میں کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا۔ ان کے ہاتھ نہ لگا۔''

''تو نے ادھر ہی کے کسی سٹیشن سے ٹرین کیوں نہ پکڑی؟'' رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یہاں تک پیدل کیوں آیا؟''

''ادھر سے ٹرین پکڑنا خطرناک تھا۔'' جمال دین نے جواب دیا۔ ''واردات کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے آس پاس کے ٹیشنوں کی نگرانی شروع کر دی ہوگی۔ میں نوں پتہ ہے پولیس ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔''

''تو بہت ہشیار بندہ لگتا ہے۔'' رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ''حوصلے والا بھی ہے۔ صاف بچ کر نکل آیا۔''

''ہاں جی، چھپتا لکتا کسی طرح ادھر پہنچ ہی گیا۔ آگے کیا ہوگا، کچھ پتہ نہیں۔'' جمال دین نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ ''میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ تجھے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔''

جمال دین اب مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت اور پریشانی مٹتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کی سرخی بھی کم ہو گئی تھی۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر

اطمینان سے بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "اب تو سو جا۔ بہت تھکا ہوا ہے۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔"

جمال دین خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد نے قمیص اتار کو کھونٹی پر ٹانگی۔ سوٹ کیس کھول کر دھوتی نکالی۔ اور شلوار اتار کر دھوتی باندھنے لگا۔

☆

جمال دین کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں۔ ان میں حیرانی تھی۔ تجسس تھا۔ وہ نظریں اٹھائے رحیم داد کی برہنہ کمر کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کے چہرے کا رخ دوسری جانب تھا۔ اس نے مڑ کر جمال دین کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دھوتی باندھ کر اس نے شلوار بھی کھونٹی پر لٹکا دی۔

مگر جب وہ پلٹا تو جمال دین نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے میں نے تجھے کہیں دیکھا ہے۔ آواز بھی کچھ پہچانی پہچانی لگتی ہے۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ لہجے میں بے نیازی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھا ہو گا۔ پر میں نے تو تجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تیرا نام کیا ہے۔"

"میرا ناں جمال دین ہے۔" اس کی آنکھوں سے تجسس بدستور عیاں تھا۔ "تو کبھی احمد کوٹ میں تو نہیں رہا۔ پہلے میں بھی ادھر ہی ہوتا تھا۔"

"میں نے تو احمد کوٹ کا نام ہی پہلی بار سنا ہے۔" رحیم داد نے جمال دین سے نظریں نہ ملائیں۔ بے زاری سے بولا۔ "بے کار باتیں کر کے اپنا مغز خراب نہ کر' اب تو سو جا۔"

رحیم داد اب اس کے سامنے موجود رہنا نہ چاہتا تھا۔ روشنی بھی نہ چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھونٹی پر سے قمیص اتار کر پہنی اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دیا۔ چھت میں لگا ہوا روشن بلب بجھ گیا۔ ڈبے میں اندھیرا پھیل گیا۔ رحیم داد نے اپنی نشست کی جانب بڑھتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"میں نے بتی اس لیے بجھا دی کہ اگلے سٹیشن پر ٹرین رکی اور کوئی سیکنڈ کلاس کا مسافر ہوا تو بتی جلتے دیکھ کر اندر آنے کی کوشش کرے گا۔ دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ اندھیرا ہوا تو سمجھے گا اندر کے سارے مسافر سو رہے ہیں۔ رات کو سیکنڈ کلاس کے سوتے ہوئے مسافروں کو جگایا نہیں جاتا۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے۔" رحیم داد اپنی نشست پر بچھا ہوا بستر درست کرنے لگا۔ تکیہ اپنی جگہ رکھا۔ جمال دین کی جانب دیکھا۔ "اب تو بیٹھا کیوں ہے؟ سو جا۔"

جمال دین خاموش رہا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر کیں۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور اطمینان سے لیٹ گیا۔

رحیم داد بھی بستر پر لیٹ گیا۔ ریل گاڑی ہچکولے کھاتی' فراٹے بھرتی تیزی سے دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ رات اور ڈھل گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور جمال دین کی جانب سے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر غنودگی اس قدر بڑھی کہ آنکھ لگ گئی۔

یکایک رحیم داد کو کھٹکا معلوم ہوا۔ آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنی کمر پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ کوئی اس پر جھکا ہوا رک رک کر سانس لے رہا تھا۔

وہ چند لمحے تو سہما ہوا دم بخود پڑا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا' دھندلی دھندلی روشنی میں جمال دین اس کے قریب کھڑا ہے۔ اس وقت وہ بہت پر اسرار نظر آرہا تھا۔

"تو یہاں کھڑا کیا کر رہا تھا؟" رحیم داد نے ڈپٹ کر پوچھا۔

جمال دین نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو رحیما ہے نا؟" اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"کون رحیما' کیسا رحیما؟" رحیم داد نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ "میں کسی رحیما شحیما کو نہیں جانتا۔"

مگر جمال دین اس کی برہمی سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ مسکرا کر بولا۔ "مجھے پتہ ہے تو رحیما ہے۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تو رحیما ہی ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہو گیا۔ "رحیمے' تو مجھے صاف صاف بتا دے۔ میں تیرا پرانا یار ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو مجھ پر بھروسہ رکھ۔" وہ نہایت اطمینان سے سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔

رحیم داد سخت حواس باختہ ہوا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ مگر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ "تیرا مغز تو نہیں فر گیا۔" اس نے جمال دین کو ڈانٹا۔ ہاتھ بڑھا کر بجلی کا سوئچ دبایا۔ ڈبے میں روشنی پھیل گئی۔ رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے جمال دین کو گھورا۔

"ناراض نہ ہو۔" جمال دین گڑگڑانے لگا۔ "سچ بتا تو کبھی احمد کوٹ میں تو نہیں رہا؟"

"بکواس نہ کر۔ جا اپنی جگہ جا کر بیٹھ۔" رحیم داد نے اونچی آواز سے کہا۔

"تو رحیما نہیں ہے؟" جمال دین اپنی جگہ پر جما کھڑا رہا۔

"نہیں۔" رحیم داد نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ "بیکار کی بکواس نہ کر۔ یہاں سے دُر جا۔"

جمال دین پلٹا اور اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے رحیم داد کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "اگر تو رحیما نہیں تو فیر کون ہے؟"

"میں چوہدری نور الٰہی ہوں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پہلے گورداسپور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ فسادات میں لٹ پٹ کر پاکستان آگیا۔ اب کوٹلہ ہر کشن میں ہوتا ہوں۔ ادھر میری زمیں داری ہے۔ متروکہ اراضی سے کلیم کی بنا پر الاٹ ہوئی ہے۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا۔" اس کے رویے سے تذبذب آشکارہ تھا۔

"یہ بتا۔ تو میرے سرہانے کھڑا کیا کر رہا تھا؟"

"وہ جی ایسا ہے نوراں نے ایک گل بتائی تھی۔"

"کون نوراں؟" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"وہ رحیما کی گھروالی ہوتی تھی۔" جمال دین نے بتایا۔ "جب رحیما جیل میں تھا تو میری اس سے یاری ہو گئی۔ میں اسے اکال گڑھ لے گیا۔"

"تو نے کس کس سے یاری لگائی؟ ایسا تو تو گبھرو بھی نظر نہیں آتا کہ ہر مٹیار ہر زنانی تجھ پر مرمٹے۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں تو نے مجھے نہیں دیکھا۔" جمال دین نے سادگی سے کہا۔ "تب میں بہت تکڑا اور زور آور ہوتا تھا۔"

"تو نے بلّو کی طرح نوراں کو بھی کتل کر دیا ہو گا۔"

"نہیں جی' وہ تو مجھ سے لڑ جھگڑ کر چک بیدی چلی گئی تھی۔" جمال دین نے بتایا۔ "بلّو سے میری پہلے سے یاری چل رہی تھی۔ میں نے اس سے ویاہ کیا اور جھنگ کی طرف ایک یار بیلی کے ساتھ چلا گیا۔ اگے تجھے پتہ ہے کیا ہوا۔"

"رحیمے کا کیا بنا؟" رحیم داد نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ جیل سے فرار ہو گیا۔" جمال دین نے بتایا۔ "پر سیف اللہ کے بھائیوں نے اسے نہر یاری دو آب کے ٹبوں پر کتل کر دیا۔"

"جب رحیما کتل ہو گیا تو میں یا اور کوئی کیسے رحیما ہو سکتا ہے۔" رحیم داد ہنسنے لگا۔ "تو بھی

عجب بندہ ہے۔ تیرے دماغ میں کچھ گڑ بڑ تو نہیں؟"

"نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں۔" جمال دین نے صفائی پیش کی۔ "پتہ تو یہی چلا تھا کہ رحیما کتل کر دیا گیا۔ احمد کوٹ میں اس کی لاش لا کر دفن کی گئی۔ ادھر اس کی کبر بھی ہے۔ پر نوراں کہتی تھی رحیما مرا نہیں زندہ ہے۔"

"اس کو کیسے پتہ چلا رحیما زندہ ہے؟"

"وہ ایسا ہوا جی' جب میں نوراں کے ساتھ اکال گڑھ میں تھا تو ایک رات نوراں نے مجھے جگا کر بتایا کہ اس نے رحیمے کو گھر میں دیکھا ہے۔ میں نے تلاش کیا۔ پر وہ کہیں نظر نہ آیا۔"

"نظر کیسے آتا وہ تو مر چکا تھا۔"

"پر صبح اٹھ کر میں نے اور نوراں نے دیکھا۔ گھر کے اندر اور باہر گلی میں جگہ جگہ پیروں کے نشان صاف نظر آئے۔"

"کسی چور ڈکیت کے ہوں گے۔"

"میں نے بھی نوراں سے یہی کہا تھا۔ پر وہ نہ مانی۔ بار بار یہی کہتی تھی وہ رحیما ہی تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔"

"نوراں نے ایسے ہی کہا ہو گا۔" رحیم داد نے اس کے مغالطے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ "یہ بتا تو اندھیرے میں میرے نزدیک کھڑا کیا کر رہا تھا؟"

"وہی تو جی میں بتا رہا تھا۔" جمال دین نے وضاحت کی۔ "نوراں اپنی بات پر اڑی رہی۔ کہتی تھی رات گھر میں رحیما ہی آیا تھا۔ میں اسے پہچان سکتی ہوں۔ برسوں اس کے ساتھ رہی ہوں۔ اس کے تین بچوں کو پیدا کیا ہے۔ میں اس کی گھر والی ہوں۔ میں اسے جتنا جانتی ہوں' کوئی نہیں جانتا۔ میرے سوا اسے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ اس کے بدن پر کئی ایسی نشانیاں ہیں جنھیں صرف میں جانتی ہوں۔ کہتی تھی سب سے وڈی پہچان اس کی کمر سے تھوڑا نیچے ایک لال لال پیسہ برابر نشان ہے۔ وہ کیسے لگا' کب لگا؟ یہ مینوں پتہ اے۔"

رحیم داد خوف سے دم بخود رہ گیا۔ واقعی اس کی کمر پر ایک گہرا سرخ نشان موجود تھا۔ اس نشان کے بارے میں اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

☆

کئی سال پہلے کا ذکر ہے۔ اس وقت رحیم داد کا پہلوٹی کا بیٹا کریم داد عرف کریما چھے مہینے کا تھا۔ ایک روز کھیتوں میں پانی دیتے ہوئے اس کا پیر پھسل کر آڈ میں چلا گیا۔ وہ دھڑام سے گرا۔ کمر میں

زور کا جھٹکا آیا۔ ایسا شدید درد اٹھا کہ کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ کسی پہلو قرار نہ آتا۔ کروٹ بدلنے پر ٹیس اٹھتی۔ بہت علاج معالجہ کرایا مگر درد کم نہ ہوا۔ آخر گاؤں کی ایک بوڑھی عورت 'مائی شیداں کے مشورے پر نوراں ایک پیر کے پاس گئی۔ اس نے کمر پر باندھنے کے لیے تعویز دیا۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اسی پیر نے ایک ٹوٹکا بتایا۔ دو روپے نذرانے کے لیے اور تانبے کا ایک پیسہ دیا۔ کوئی دعا پڑھ کر اس پر دم کی۔ ہدایت کی کہ پیسے کو انگاروں پر رکھ کر گرم کیا جائے اور جب انگاروں ہی کی طرح سرخ پڑ جائے تو اس سے کمر کو داغا جائے۔

ماگھ کی اندھیری رات تھی۔ مہاوٹوں کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ شام کو بارش بھی ہوئی تھی۔ مگر اب بارش بند ہو چکی تھی۔ البتہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد کی کمر کا درد کچھ اور شدید ہو گیا تھا۔ وہ چٹائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ قریب ہی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے۔

نوراں انگیٹھی کے ایک طرف اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ وہ گردن جھکائے انگیٹھی میں بھرے ہوئے انگاروں کو تک رہی تھی جن کے درمیان پیر کا دم کیا ہوا تانبے کا پیسہ رکھا تھا۔ وہ چمٹے سے بار بار پیسے کو الٹ پلٹ رہی تھی تاکہ وہ پوری طرح گرم ہو جائے۔

رحیم داد کے چہرے کا رخ نوراں کی جانب تھا۔ مگر وہ پوری توجہ سے انگاروں کو دیکھ رہی تھی جن کی گہری سرخ روشنی سے اس کے رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ رحیم داد کو اس روپ میں وہ اس قدر خوبصورت اور دل ربا نظر آ رہی تھی کہ کمر کی تکلیف کے باوجود وہ ٹکٹکی باندھے اس کے شعلہ گوں چہرے کو تک رہا تھا۔

نوراں نے دہکتے انگاروں کو دیکھتے دیکھتے ایک بار گردن کو خم دے کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ شوخی سے مسکرائی۔ رحیم داد کی کمر پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا۔ پلٹ کر انگاروں کو دیکھا۔ تانبے کا پیسہ اب انگاروں ہی کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے چمٹے سے دہکتا ہوا پیسہ اٹھایا۔

رحیم داد نے گھبرا کر اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دانت سختی سے بھینچ لیے۔

نوراں نے چمٹے میں دبا ہوا سرخ سرخ پیسہ رحیم داد کی برہنہ کمر پر رکھا اور پیر کی ہدایت کے مطابق زور سے دبا دیا۔ رحیم داد تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ بلبلا کر اس بری طرح چیخا کہ نوراں اس کی پیٹھ پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔

داغنے سے کمر کی کھال جل کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ رحیم داد ساری رات تڑپتا رہا۔ تکلیف سے کراہتا رہا۔ ہائے ہائے کرتا رہا۔ نوراں بھی رات بھر جاگتی رہی۔ بے قرار ہو کر آنسو بہاتی رہی۔ زخم ایسا گہرا آیا کہ مہینوں دوا دارو کرنا پڑا۔ نوراں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھی دل جوئی کرتی رہتی تھی۔

زخم پکنے سڑنے کے بعد ٹھیک تو ہو گیا۔ مگر اس کا نشان نہ مٹا۔ اب تک باقی تھا اور کمر سے ذرا نیچے دائیں طرف صاف۔ نظر آتا تھا۔ نوراں اسے دیکھ کر ایک مدت تک اظہار پشیمانی کرتی رہی۔ بار بار خود کو برا بھلا کہتی۔ رحیم داد سمجھاتا تو رونے لگتی۔

☆

رحیم داد یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ جمال دین اس کے خیالات اور احساسات سے بے نیاز ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ ”مجھے جب یہ شبہ ہوا کہ تو رحیما ہے تو میں نے یہ نشان تیری کمر پر دیکھنے کی کوشش کی۔“

رحیم داد نے چونک کر جمال کی جانب دیکھا۔ ”تو اندھیرے میں کھڑا میری کمر پر وہی نشان دیکھ رہا تھا۔“ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

”ہن جی‘ سچی گل بات تو یہی ہے۔“ جمال دین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”جب تو کپڑے بدل رہا تھا تو میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی بھی تھی۔“

”تو مخول تو نہیں کر رہا؟“ رحیم داد نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں نے مخول کر کے تجھ سے کیا لینا۔“ اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ ”سچ پوچھ تو تیری آنکھیں‘ تیری ناک‘ تیری آواز سب رحیمے کی طرح ہیں۔“ اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔

”تو نے فیر وہی بکواس شروع کر دی۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔ ”تو گھاس تو نہیں کھا گیا۔“

”ناراض نہ ہو۔“ جمال دین نے نرمی سے کہا۔ ”اگر تو رحیما نہیں ہے تو کمیص ہٹا کر مجھے اپنی کمر دکھا دے۔ میرا شک جاتا رہے گا۔“

رحیم داد غصے سے تڑپ کر اٹھا اور جھپٹ کر جمال دین کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر نشست سے نیچے گر گیا۔ رحیم داد تلملا کر دھاڑا۔ ”میں ابھی ٹرین رکوا کر تجھے گرفتار کرواتا ہوں۔ تو خونی ہے‘ ایک نمبر کمینہ ہے۔ میں نے تجھے ہرگز نہیں چھوڑنا۔“ وہ چیختا چلاتا آگے بڑھا اور

زنجیر کا دستا پکڑ لیا۔

جمال دین فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دہائی دیتا ہوا رحیم داد کی جانب بڑھا۔ "ایسا نہ کر۔ میری گل تو سن۔" اس نے جھپاک سے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رحیم داد زنجیر کھینچنا چاہتا بھی نہ تھا۔ جمال دین کو گرفتار کرانے کی کوشش میں وہ خود بھی گرفتار ہو جاتا۔ رحیم داد نے تھوڑی سی کشمکش کے بعد زنجیر کا دستا چھوڑ دیا۔

وہ چند لمحے خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا۔

جمال دین نے ٹوکا۔ "تو کدھر چلا؟"

رحیم داد نے بڑھ کر غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ آنکھیں نکال کر جمال دین کو دیکھا۔ خوف زدہ کرنے کی غرض سے دھمکی دی۔ "اندر بھی ٹرین روکنے کی زنجیر ہے۔" وہ غسل خانے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مگر اس نے زنجیر نہ کھینچی۔ ایسا ارادہ بھی نہ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر کمر کے سرخ نشان کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ پشت کی جانب نشیب میں ایسا دبا ہوا تھا کہ مڑ مڑ کر دیکھنے کے باوجود نظر نہ آیا۔

اس نے انگلیوں سے کمر کے نچلے حصے کی کھال آہستہ آہستہ ٹٹولی۔ ایک جگہ گول دائرے میں کھال ناہموار اور کچھ کھردری تھی۔ یہی زخم کا نشان تھا۔ وہ سخت پریشان ہوا۔

جمال دین اس کے لیے اب سنگین خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ اس کے بارے میں اسے پہلے ہی شبہ تھا۔ کمر کے نشان سے وہ اسے پہچان بھی سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیا کرے؟ کس طرح جمال دین سے چھٹکارا حاصل کرے؟

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ غسل خانے سے باہر نکلا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ جمال دین اپنی نشست پر موجود نہ تھا۔ رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر اسے ادھر ادھر تلاش کیا۔ لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ رحیم داد حیرت میں ڈوبا ہوا اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ جمال دین کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی نظر دروازے کے اوپر گئی۔ دیکھا، چٹخنی کھلی ہے۔

وہ گومگو کے عالم میں بیٹھا جمال دین کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ریل گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد گاڑی ٹھہر گئی۔ رحیم داد نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا، ریل گاڑی ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔ پٹڑی کے دونوں طرف جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں اکا دکا درخت تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ رات کا چل چلاؤ

تھا۔ صبح کاذب اندھیرے سے جھانک رہی تھی۔

رحیم داد نے بولنے اور باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں سنیں۔ دیکھا، کئی مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے اترے اور ٹرین کے اس سرے کی طرف چلے جدھر گارڈ کا ڈبا تھا۔ رحیم داد کو تجسس پیدا ہوا۔ وہ بھی دروازہ کھول کر باہر آیا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ریل گاڑی سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہلکی ہلکی سرمئی روشنی میں گارڈ، ٹکٹ چیکر اور ریلوے کے دوسرے ملازم، چند مسافروں کے ساتھ ہجوم کی صورت میں کھڑے نظر آئے۔ رحیم داد قریب پہنچا۔ دیکھا، لوہے کی پٹڑیوں کی دونوں جانب انسانی جسم کے کٹے پھٹے حصے گوشت کے لوتھڑوں کی شکل میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف تازہ تازہ خون پھیلا تھا۔ ریل گاڑی کے پہیوں سے کٹ کر کوئی مسافر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ غائب تھا۔ صرف گردن اور سینے کا کچھ حصہ باقی تھا۔ یہ جمال دین تھا جو خاک و خون میں لتھڑا ہوا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کب کا دم توڑ چکا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں رحیم داد کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

رحیم داد یہ دل خراش منظر دیکھ کر لرز گیا۔ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی اس کے لیے خطرناک تھا۔ وہ خاموشی سے مڑا اور سر جھکا کر تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوا۔ اپنے ڈبے کے پاس پہنچا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

۴۵

رحیم داد لاہور پہنچا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ تانگے پر بیٹھا اور سیدھا احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ پھاٹک پر رحیم داد کا ڈرائیور 'عابد' مل گیا۔ وہ اس کی ہدایت پر ہنوز وہاں مقیم تھا۔ عابد کی زبانی رحیم داد کو معلوم ہوا کہ احسان شاہ دو روز قبل کراچی سے واپس آگیا ہے۔ مگر وہ کوٹھی میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس کا مینجر 'مہربان علی' بھی غائب تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ صبح بارش بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب بارش کے ساتھ ساتھ ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ شدید حبس تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت بادل ٹوٹ کر برسیں گے اور ہر طرف جل تھل ہو جائے گا۔

طویل سفر کی ماندگی سے رحیم داد نڈھال ہو رہا تھا۔ لباس اور سر کے بالوں پر گرد جمی تھی۔ جسم سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ وہ فوراً غسل خانے میں گھس گیا اور دیر تک نہاتا رہا۔ باہر آیا۔ اجلا لباس پہنا۔ قدرے تازگی محسوس ہوئی۔ وہ کوٹھی کے وسیع لان میں بید کی بنی ہوئی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ شام کا گمان ہوتا تھا۔

مگر رحیم داد زیادہ دیر لان میں نہ بیٹھ سکا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ بادل زور سے گرجے اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ نوکروں نے جھپاک جھپاک کرسیاں اٹھائیں اور برآمدے میں ڈال دیں۔ رحیم داد بارش کے تیز ہوتے ہی اٹھ کر برآمدے میں چلا گیا۔ اس نے ایک کرسی کھسکائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ ایک نوکر نے گرم گرم چائے لا کر میز پر رکھ دی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ رحیم داد بسکٹ کھاتا رہا۔ چائے کے

گھونٹ حلق سے اتارتا رہا اور بارش سے لطف اٹھاتا رہا۔

فضا اب سہانی ہو گئی تھی۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ گھاس پر، درختوں پر ہر طرف رم جھم، رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ نوکروں نے کوٹھی کی بتیاں روشن کر دی تھیں۔ روشنی دریچوں سے پھوٹ کر باہر بکھر رہی تھی۔ بارش کے قطرے روشنی میں جھلملاتی جھالر کی مانند ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ احسان علی شاہ واپس نہ آیا تھا۔ رحیم داد برامدے میں خاموش بیٹھا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رات کے آٹھ بجے سے کچھ دیر قبل ایک لمبی چوڑی کار کوٹھی کے پھاٹک پر آکر رکی۔ احسان شاہ کار سے باہر نکلا اور بارش سے بچتا بچاتا کوٹھی میں داخل ہوا۔ ایک نوکر نے بڑھ کر رحیم داد کی آمد کی اطلاع دی۔ احسان شاہ فوراً برآمدے میں پہنچا۔ رحیم داد اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ مسکراتا ہو آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہو گیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”شاہ جی، تو کراچی ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ اتنی دیر ادھر کیا کرتا رہا؟“

”میں تو کراچی میں طرح طرح کے چکروں میں پھنسا رہا۔ روز ہی واپس آنے کی سوچتا، پر کوئی نہ کوئی ایسا کام نکل آتا کہ رکنا پڑتا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کے برابر کرسی پر بیٹھتے ہوئے صفائی پیش کی۔ ”پر تو ادھر ڈیرہ غازی خان میں اب تک کیا کرتا رہا؟ سنا ہے سردار شہ زور خان مزاری کے ساتھ تھا۔ شاہانی نے تجھے اس سے ملوایا ہو گا۔“

”ہاں جی، اسی نے شہ زور سے ملوایا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”ویسے بہت پہلے بھکر میں بھی اس سے ملا تھا۔ مراد خاں شاہانی ہی کی حویلی میں ملا تھا۔“

”مہربان علی بتاتا تھا، شاہانی تیرے کلیم کے کاغذات بھی ادھر لے گیا تھا۔ مل گئے نا؟“

”مل گئے، بالکل مل گئے۔ اب تو میرے ہی پاس ہوتے ہیں۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔

”کلیم کے کاغذات تو نے کیوں منگوائے تھے؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”میں نے تو نہیں منگوائے تھے شاہانی خود ہی لایا تھا۔ پر ان کے ملنے سے ادھر دلاور والا میں اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی میں نے اپنے نام الاٹ کروالی ہے۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔

”یہ دلاور والا کدھر ہوا؟“

"تحصیل راجن پور میں ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "ویسے راجن پور میں ایک حویلی کی الاٹمنٹ کے لیے بھی درخواست لگا دی ہے۔ بڑی شاندار حویلی ہے۔ پہلے ایک ہندو کی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا۔ ادھر کا بہت مشہور زمین دار ہوتا تھا۔ پاکستان بنا تو وہ بھی ہندوستان چلا گیا۔"

"چوہدری، تو بھی کہاں جا کر پھنس گیا۔" احسان شاہ کے لہجے سے بے زاری آشکارہ تھی۔ "سرکاری افسر تو اسے کالا پانی کہتے ہیں۔ تو نے الاٹمنٹ نکلوانے سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لیا ہوتا۔"

"میں نے تو بار بار تیرے پاس آنے کا ارادہ کیا۔ پر شہ زور نے آنے ہی نہیں دیا۔ کہتا تھا میں بھی تیرے ساتھ لہور چلوں گا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے تو لہور رہا ہی کب۔ شاہانی آیا تو اس نے یہی بتایا کہ تو کراچی سے واپس نہیں آیا۔ نادر خان ادھر سے ہوتا ہوا میرے پاس گیا تھا۔ اس نے بھی یہی بتایا تھا۔ یہاں آ بھی جاتا تو مشورہ کیسے کرتا؟ تو ادھر رہا ہی کب۔"

"زمیں تو الاٹ کرا لی۔ شہ زور کوشش کرے گا تو حویلی کی الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔ اس کا ادھر کے سرکاری افسروں میں بہت اثر ورسوخ ہے۔ اس کا اپنا چچیرا وڈا افسر لگا ہے۔ پر تو ادھر رہ بھی سکے گا؟ زمین داری چلا سکے گا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ کوٹلہ ہر کشن کی زمین داری کا کیا بنے گا؟"

"شاہ جی، تجھے تو پتہ ہی ہے۔ میری اصلی زمین داری تو کوٹلہ ہر کشن ہی میں ہوتی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو اپنے موقف سے آگاہ کیا۔ "ویسے جی ادھر زمیں داری کرنی بہت مشکل ہے۔ مزارعے ایسے سرکش اور خراب ہیں تجھ سے کیا بتاؤں۔ انھوں نے تو ساری ہی زمین دبا رکھی ہے۔ کبضہ دینے کو تو بالکل تیار نہیں۔"

"اس کی تو فکر نہ کر۔ شہ زور دلا دے گا۔"

"وہی کوشش کر رہا ہے۔ پر دلاور والا، تمن دریشک کے علاکے میں ہے۔ شہ زور مزاری مجھے ادھر کے ایک سردار کے پاس لے گیا تھا۔ اس کا نام عظمت اللہ دریشک ہے۔ کوٹ اکبر میں رہتا ہے۔"

"تب تو زمین کا کبضہ مل جانا چاہیے۔" احسان علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میں عظمت اللہ خان دریشک کو بھی جانتا ہوں۔ لہور آتا رہتا ہے۔"

"زمین کا کبضہ دلانے کے لیے دوبار اس نے اپنے بندے بھیجے۔ ایک بار تو تھانیدار بھی پولیس

پارٹی کے ساتھ گیا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "دلاور والا میں سارے ہی بوھڑ آباد ہیں۔ ایسے سرکش اور جھگڑالو ہیں کہ زنانیوں اور بچوں تک نے رات کے اندھیرے میں مورچے لگا کر ایسا شور شرابہ کیا۔ ایسے پتھر برسائے کہ سب ہی زخمی ہوئے۔ میرے بھی بہت چوٹ آئی۔ تھانیدار تو سب سے زیادہ زخمی ہوا۔ نہ جانے کس طرح جان بچا کر نکل پائے۔"

"حد ہو گئی۔" احسان شاہ کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی تھی۔ "لگتا ہے مزارعے بہت ہی زیادہ بدمعاش ہیں۔ پر دلاور والا جانے کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ان کے خلاف جگہ جگہ سے مکدمے بنوانے تھے۔ جو زیادہ سرکش اور آگے آگے تھے ان کو بلا کر تنگ کیا جاتا۔ حوالاتوں اور جیلوں میں بند کیا جاتا۔ مکدمے بازی میں تو ان کے مال مویشی تک بک جاتے۔ پریشان ہو کر خود آتے اور پیروں پر پگڑیاں ڈال دیتے۔"

"اب عظمت اللہ نے یہی سوچا ہے۔ تھانیدار تو بہت غصے میں تھا۔ وہ تو بوھڑوں کے خلاف بہت سخت کاروائی کرنے کو کہتا تھا۔" رحیم داد کے لہجے میں تشویش تھی۔ "پر شاہ جی، میں تو گھبرا گیا۔ میں نے شہ زور مزاری سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے ادھر زمین داری نہیں کرنی۔ میرا تو ارادہ ہے کہ اراضی عظمت اللہ کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ وہ تیار بھی ہو گیا۔ وہ سارے مزارعوں کو بے دخل کر کے کبضہ بھی لے سکتا ہے۔ ان سے نمٹ بھی سکتا ہے۔ میں نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا؟"

"تو نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا۔ میں بھی تجھے یہی مشورہ دینا چاہتا تھا۔" احسان شاہ نے اتفاق رائے کیا۔ "تو نے بہت ٹھیک کیا۔ پر یہ تو بتا کتنے میں سودا طے کیا؟"

"میں نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ شہ زور پر چھوڑ دیا وہ جیسا مناسب سمجھے طے کر دے۔ وہ عظمت اللہ دریشک کو لے کر میرے پاس آنے کو کہتا تھا۔ وہیں بیع ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو ان کو تیرے پاس لے آؤں گا۔ تیرے ہی سامنے سب کچھ طے ہو گا۔ جیسا تو کہے گا میں نے تو وہی کرنا ہے۔"

"پر ادھر کی زمین کا مول کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بارانی یا چاہی ہے تو کسی کام کی نہیں۔"

رحیم داد نے فوراً وضاحت کی۔ "زمین تو نہری ہے۔ پانی پورا پورا ملتا ہے۔ زرخیز بھی ہے۔ میں نے عزیز گھوال کو زمین داری کی دیکھ بھال کے لیے لگایا تھا۔ بہت ہشیار بندہ ہے۔ اس نے ساری معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔"

"تب تو زمین کے ڈیڑھ لاکھ تک مل جانے چاہئیں۔" احسان شاہ نے قیاس آرائی کی۔ "پر

جھگڑے کی زمین ہے۔ عظمت اللہ دریشک قبضہ دلانے میں بھی مدد کرے گا۔ ایسی صورت میں لاکھ روپے بھی دے دے تو برے نہیں۔"

"میں نے اسے مختار نامہ بھی دے دیا ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "ویسے مجھے ادھر روپے کی ضرورت بھی تھی۔ میری زمین داری کے نیچے کے چھوٹے زمین دار اور حصے دار اپنی زمینیں بیچ رہے ہیں اور سستی بیچ رہے ہیں۔ نادر ان سے بات بھی کر چکا ہے۔ بلکہ وہ خود چل کر اس کے پاس آئے تھے۔ نادر اس بارے میں مجھ سے بات کرنے ڈیرہ غازی خان آیا تھا۔"

نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو اس نے مخاطب کیا۔ "چوہدری، روٹی کھا لے۔ وہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔" رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کھانے کے کمرے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میز پر کھانا موجود تھا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ "چھوٹے حصے دار اپنی زمینیں کیوں فروخت کرنا چاہتے ہیں؟"

"انھیں اپنی فصلوں کے لیے پانی کم مل رہا ہے۔ دوسرے ان کو سندھ کے بیراجوں میں سستے داموں زمیں الاٹ ہو رہی ہے۔ وہ ادھر کی زمینیں بیچ کر ادھر جانا چاہتے ہیں۔"

"ابھی تو غلام محمد بیراج مکمل بھی نہیں ہوا۔ زمینوں کی الاٹمنٹ کیسے شروع ہو گئی؟" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "جب میں کراچی میں تھا تو میں نے بھی سنا تھا کہ آبادکاروں میں یہ افواہ گرم ہے کہ بیراج کی زمینوں کی الاٹمنٹ شروع ہونے والی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نے اونچا چکر چلایا ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ نادر نے جو مجھے بتایا وہ میں نے تجھے بتا دیا۔ سچی گل کیا ہے؟ یہ مجھے بالکل پتہ نہیں۔"

"نہ نادر کو اصلی گل کا پتہ ہے نہ حصے داروں کو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔ اس کے لیے تو پوری طرح معلومات کرنی ہوں گی۔" احسان شاہ نے کہا۔ "پر اس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ پانی کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو بیچنے والے بھی سستے داموں زمین نہیں بیچیں گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ابھی تو زمین خریدنے کا خیال چھوڑ دے۔"

"کہتا تو شاہ جی تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "جب نہر میں پانی کی کمی ہو جائے گی تو میں اپنے موگھوں سے زیادہ پانی لینے لگوں گا۔ نیچے پانی کم ہو گا۔ فصلیں سوکھنے لگیں گی تو

حصے دار زمینیں فروخت بھی کریں گے تو کم سے کم ہی دام مانگیں گے۔ ابھی تو ان سے سودے کی بات ہی کرنی ٹھیک نہیں۔"

"میں تجھ سے یہی کہنا چاہتا تھا۔" احسان علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو تجھے کئی ضروری باتیں بتانی ہیں۔ دلاور والا کی زمین فروخت ہونے کے بعد جو روپیہ آئے اسے زیادہ ضروری کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ تجھے کیا خبر، میں کراچی میں اتنے عرصے رہا تو کیا کیا کرتا رہا؟"

"تو بتائے تو پتہ چلے گا۔" رحیم داد نے گلہ کیا۔ "ویسے تو مجھے ملے بنا اچانک کراچی چلا گیا۔ یہ بھی نہ بتایا کہ کیوں جا رہا ہے؟ مہربان علی بھی لائل پور جا چکا تھا۔ کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔"

"ہاں چوہدری تیری شکایت بالکل ٹھیک ہے۔" احسان شاہ نے اظہار پشیمانی کیا۔ "مجھے بالکل اچانک کراچی جانا پڑا۔ سویرے ہی سویرے جانا تھا۔ سوچا تجھے گہری نیند سے جگا کر بات کروں گا تو تیرے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ کام اتنا ضروری تھی کہ رک بھی نہ سکتا تھا۔"

رحیم داد بہت دیر سے یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ لائل پور کی زمین کے الاٹمنٹ کا کیا فیصلہ ہوا۔ وہ فوراً حرف مطلب پر آ گیا۔ "شاہ جی، تو نے اب تک یہ نہیں بتایا لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کا کیا بنا؟"

"یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ زمین کا جھگڑا چل رہا ہے۔ دو دعویداروں کو وہ اراضی پہلے ہی الاٹ ہو چکی ہے۔ انھوں نے عدالت میں مکدمہ بھی دائر کر رکھا ہے۔"

"شاہانی نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ زمین میرے نام الاٹ نہیں ہو سکتی۔ چیمہ نے کچھ نہیں کیا۔"

"چیمہ نے تو تیرے نام الاٹمنٹ کر دی۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "اب تو سوال کبضہ ملنے کا ہے۔ جب تک معاملہ عدالت کے سامنے ہے اور اس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کبضہ کیسے مل سکتا ہے؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پر میں نے اس کا بھی ایک حل نکالا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"میں نے کراچی سے واپس آتے ہی اس سلسلے میں کوشش شروع کر دی ہے۔" اس نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "محکمہ بحالیات کے اعلیٰ حکام کو ایک وزیر کی سفارش پہنچائی کہ دونوں ہی دعویداروں پر اس طرح دباؤ ڈالیں کہ عدالت سے اپنے مکدمے واپس لے لیں اور اپنی اپنی الاٹمنٹوں سے دست بردار ہو جائیں۔"

"تو سمجھتا ہے' وہ آسانی سے مان جائیں گے۔؟"

"آسانی سے تو کوئی بھی نہیں مانتا۔" احسان شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ان کو یہ پیشکش کی گئی ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ لے لیں اور لائل پور کی زمین سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔"

"ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک ہے۔ شاہ جی تو نے حل تو بہت ٹھیک نکالا ہے۔" رحیم داد نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ اس کے بشرے سے خوشی آشکارہ تھی۔ "میں تو کہتا ہوں جی ان کو رضامند ہو جانا چاہیے۔ مکدمے بازی کے چکر سے بھی بچ جائیں گے اور اراضی بھی مل جائے گی۔"

"مشکل یہ ہے کہ زمین بہت عمدہ ہے۔ اس پر تو نہ جانے کتنوں کی آنکھ لگی ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "لاکھوں روپے کی اراضی ہے۔"

"کیا اسے بھی دلاور والا کی زمین کی طرح فروخت کرنے کا ارادہ ہے؟" رحیم داد نے احسان شاہ کی بات سے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

"کیسی عجب گل کر رہا ہے چوہدری۔" احسان شاہ نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "تجھے پتہ ہے اس زمین پر تو میں نے ٹیکسٹائل مل لگانی ہے۔ جلد ہی اس کا پرمٹ بھی مل جائے گا۔ مشینری امپورٹ کرنے کا لائسنس بھی نکلوالوں گا۔ بینک سے کرضہ لینے کا بندوبست ہو چکا ہے۔ میں نے تو ساری تیاری کر رکھی ہے۔" اس کی آنکھوں میں مسرت جھلکنے لگی۔ "میں کراچی میں ٹھیر کر صرف سیاست ہی نہیں لڑاتا رہا۔ اپنا کام بھی کرتا رہا۔ ایک دن بھی آرام سے نہ بیٹھا۔ کبھی اس کے پاس جاتا کبھی اس کے پاس۔ اپنا کام جو نکلوانا ہوا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ بولتا رہا۔ "میں نے جلد ہی ایک لیمٹڈ کمپنی کا اعلان کرنا ہے۔ اس کی کاغذی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ اب تو اسے رجسٹر کرانا ہے۔ پر کمپنی کے کنٹرولنگ شیئرز اپنے پاس رکھنے ہیں۔ دلاور والا کی زمین کے روپے سے تو بھی کمپنی کے شیئر خرید لینا۔ میں تجھے کمپنی کا ڈائریکٹر لگا دوں گا۔"

رحیم داد کی سمجھ میں احسان شاہ کا منصوبہ مطلق نہ آیا۔ پریشان ہو کر گویا ہوا۔ "شاہ جی' مجھے تو زمین داری ہی کرنے دے۔" اس کے لہجے سے بے زاری عیاں تھی۔ "مجھے ڈائرکٹری شائرکٹری نہیں کرنی۔ مجھے اس چکر میں نہ ڈال۔"

"تو گبرا کیوں گیا؟" احسان علی شاہ نے ہنس کر کہا۔ "عیش کرے گا۔ کمپنی کے منافع میں سے تجھے ڈیویڈنڈ تو ملے گا ہی' اس کے علاوہ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کئی الاؤنس بھی ملیں گے۔ تو اکیلا

ڈائریکٹر نہیں ہو گا کئی اور بھی ہوں گے۔ منیجنگ ڈائریکٹر تو میرا وڈا پتر رحمان علی شاہ ہو گا۔"

"نہیں' شاہ جی' مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔" رحیم داد ہنوز گھبرایا ہوا تھا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔ تو نے ڈائریکٹر لگا دیا تو کیسے کام چلاؤں گا۔"

"تجھے تو صرف بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگوں میں حاضری لگانی ہو گی۔ چپ کر کے بیٹھا رہنا۔ دوسروں کی سنتا رہنا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "دوسروں نے بھی صرف باتیں ہی کرنی ہوں گی۔ کام تو منیجر اور دوسرے بندے چلاتے ہیں۔ جہاں تک انگریزی جاننے کا سوال ہے تو کراچی میں کئی مل مالک اور وڈے وڈے سیٹھ تو ایسے ہیں کہ انگریزی میں اپنے ٹھیک سے دستخط بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ کمپنیوں کے صرف ڈائریکٹر ہی نہیں منیجنگ ڈائریکٹر اور چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔"

"پر مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔"

"سب پتہ چل جائے گا۔ شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ "کچھ عرصے بعد تو سب کچھ سمجھنے لگے گا۔" احسان شاہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "ویسے چوہدری' تجھے انگریزی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔ مہربان علی سے کہوں گا وہ تیرے لیے ٹیوٹر کا بندوبست کر دے گا۔"

"وہ کیا کرے گا؟" رحیم داد نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔

"وہ تجھے انگریزی پڑھائے گا۔ تو اسے اپنے ساتھ کوٹلہ ہرکشن لے جانا۔ تجھے ادھر کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔ آرام سے انگریزی پڑھنا۔ آگے تجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "ویسے تو اخبار ضرور پڑھا کر تاکہ تجھے یہ تو پتہ چلے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ سیاست کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟"

"تو کہتا ہے تو اخبار بھی پڑھ لیا کروں گا۔" رحیم داد نے اس بار انکار نہ کیا۔ "پر میں نے تیری طرح سیاست میں حصہ نہیں لینا۔"

"سیاست میں حصہ نہ لے پر اس کے بارے میں جاننا تو چاہیے۔" احسان شاہ کا انداز سرپرستانہ تھا۔ "ویسے وڈا زمین دار بننا ہے تو سیاست میں بھی تجھے دلچسپی لینی ہو گی۔ زمین داری تو تیرا منیجر اور منشی چلاتے رہیں گے۔ تو خالی رہ کر کیا کرے گا۔ خود بخود سیاست سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تیری زمین داری بڑھ جائے تو دیکھوں گا تو سیاست سے خود کو کیسے الگ رکھتا ہے۔ اسمبلیوں کی ممبری حاصل کرنے کی سوچے گا۔ وزیر بننے کے خواب دیکھے گا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "چوہدری' میں تجھے ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر وڈے زمین دار کے دماغ میں ایک

وزیر چھپا ہوتا ہے۔ وہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ حالات اسے پیدا کر دیتے ہیں۔"
رحیم داد اس کی باتوں سے متاثر نہ ہوا۔ گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "اور تو سب کچھ تو کرتا ہی رہتا پر سب سے پہلے لائل پور کی زمین کا کبضہ ملنا چاہیے۔" رحیم داد کو بنیادی طور پر اسی سے دلچسپی تھی۔ اور جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ زمین کی مالیت لاکھوں روپے ہے تو اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔
احسان علی شاہ نے بھی اس کی بات کی اہمیت محسوس کی۔ "تجھے پتہ نہیں، آج کل میں اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میری تو یہی کوشش ہے کہ جلد سے جلد زمین مل جائے۔ کل بھی کئی سرکاری افسروں سے اسی سلسلے میں ملنا ہے۔ دونوں دعویدار راضی ہو جائیں تو فوراً زمین اپنے کبضے میں آجائے گی۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پھیل گئی۔ "زرعی اراضی حاصل کرنا مشکل نہیں پر شہری اراضی حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا تجھے کچھ اندازہ نہیں۔"
رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔
بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا میں نمی تھی۔ خنکی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ رحیم داد بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔
صبح ناشتے پر احسان علی شاہ سے رحیم داد کی پھر ملاقات ہوئی۔ رحیم داد کوٹلہ ہر کشن واپس جانے کے لیے بے چین تھا۔ مگر احسان شاہ نے اسے روک لیا۔ اس کا خیال تھا کہ لائل پور کی زمین کا تصفیہ ہونے تک وہ لاہور ہی میں ٹھہرا رہے۔ عین ممکن ہے کسی مرحلے پر اس کی ضرورت پڑے۔ عذر داری کرنا ہو یا نئی درخواست پیش کرنا پڑے، ایسی صورت میں رحیم داد کے دستخط ضروری تھے۔ وہ کوٹلہ ہر کشن چلا جاتا تو بروقت چارہ جوئی کرنے میں مشکل پیش آتی۔
احسان شاہ کے زور دینے پر رحیم داد نے کوٹلہ ہر کشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔
احسان شاہ زمین حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ مگر معاملہ بہت الجھا ہوا تھا۔ دو دعویدار پہلے ہی موجود تھے۔ ان کے کلیم تصدیق شدہ تھے۔ فردِ حقیت اور دوسری دستاویزات بھی مکمل تھیں۔ الاٹمنٹ بھی ان کے پاس تھے۔ حکام میں دونوں کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ ایک دعویدار کی پشت پناہی در پردہ ایک مرکزی وزیر کر رہا تھا دوسرے کی محکمہ بحالیات کے ایک اعلیٰ افسر سے قریبی رشتے داری تھی۔ تنازعہ طول کھینچتا جا رہا تھا۔ لیکن احسان علی شاہ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بھی اپنی

کوشش میں لگا رہا۔ رحیم داد سے ملاقات ہوتی تو اسے صورت حال سے آگاہ بھی کرتا رہتا۔ مگر احسان شاہ نے اس کے سامنے کسی مایوسی یا نا امیدی کا اظہار نہ کیا۔ بار بار یقین دلاتا کہ قضیہ جلد ہی طے ہو جائے گا اور زمین کا قبضہ مل جائے گا۔

رحیم داد لائل پور کی زمین ملنے کی خوش خبری سن نے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اس کا بیشتر وقت احسان شاہ کی کوٹھی ہی پر گزرتا۔

☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ مہربان علی خاموشی سے رحیم داد کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ اس کے بال خشک تھے۔ آنکھوں پر بوسیدہ عینک تھی۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ بش شرٹ پر سلوٹیں تھیں۔ پتلون بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اور اس کی موریاں کثرت استعمال سے گھس گئی تھیں۔ جوتے پر گرد کی تہہ تھی۔ وہ ہر پہلو سے پریشان حال اور ضرورت مند نظر آتا تھا۔

مہربان علی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری' تیرے لیے یہ ماسٹر لایا ہوں۔ شاہ جی نے کہا تھا چوہدری کو کسی ایسے بندے کی ضرورت ہے جو اسے انگریزی پڑھا سکے۔"

اس نے آگے بڑھ کر رحیم داد کو نہایت ادب سے سلام کیا۔

مہربان علی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری' اب تو اس سے گل بات کرلے۔ میں نے شاہ جی کے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے اصرار بھی نہ کیا۔

رحیم داد نے اس شخص کو نظر بھر کر دیکھا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا' تیرا نام کیا ہے؟"

"مجھے عبدالطیف کہتے ہیں۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نہایت ادب سے بتایا۔

رحیم داد تکیے کا سہارا لیے بستر پر بیٹھا تھا۔ عبدالطیف نے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کیا تو رحیم داد کی گردن اکڑ گئی۔ قدو قامت کچھ اونچا ہو گیا۔ سامنے بیٹھا ہوا عبدالطیف اسے کم تر اور مسکین نظر آیا۔ اس نے آواز میں بھاری بھر کم پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انٹرویو لینے کے انداز میں سوال کیا۔

"لطیف! تو نے کتنا پڑھا ہے؟"

"جناب میں انٹر میڈیٹ پاس ہوں۔" عبدالطیف نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ "ایک بار بی اے کا پرائیویٹ امتحان بھی دیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں بھی امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کی' لیکن حالات کچھ ایسے ناسازگار پیدا ہوئے کہ امتحان نہ دے سکا۔"

عبدالطیف نے رحیم داد کو متاثر کرنے غرض سے اپنی تعلیمی استعداد کے بارے میں کسی قدر

وضاحت سے بتایا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر متاثر بھی ہوا۔ اسے معا جمیلہ یاد آ گئی۔ وہ بھی بی اے فائنل کی طالبہ تھی۔ اسی اثناء میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لاہور سے دیپال پور واپس جانا پڑا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ ایسا منقطع ہوا کہ دوبارہ جاری نہ ہو سکا۔ رحیم داد اس کی علمیت اور دانائی سے بہت زیادہ مرعوب تھا۔ اس نے چونک کر عبدالطیف کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

"تو نے تو بہت پڑھ رکھا ہے۔"

"جی ہاں، اتنی تعلیمی استعداد تو رکھتا ہوں کہ آپ کو ہر مضمون پڑھا سکتا ہوں۔" عبدالطیف نے اسے اطمینان دلایا۔

"میں نے تو صرف انگریزی پڑھنی ہے۔"

"میں آپ کو انگریزی پڑھا دوں گا۔" عبدالطیف نے رحیم داد سے کہا۔ "لیکن آپ کو اردو اور فارسی پڑھنا ہو تو وہ بھی پڑھا سکتا ہوں۔"

"فارسی پڑھنے کی تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "اردو تھوڑی بہت جانتا ہوں۔ پر انگریزی بالکل نہیں جانتا۔"

"تب تو انگریزی کے ساتھ ساتھ آپ کو اردو کی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا۔ "یہ میری اپنی رائے ہے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔"

"دونوں ہی پڑھ لوں گا۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔

"شام کے علاوہ آپ جو بھی وقت مقرر کریں گے، میں پڑھانے کے لیے آ جاؤں گا۔" اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گفتگو کا موضوع بھی بدلا۔ رحیم داد سے دریافت کیا۔ "آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"

"چھ بجنے میں دس منٹ رہتے ہیں۔" رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔

"مجھے اپنے ایک ٹیوشن کے لیے جانا ہے۔" اس نے گردن بڑھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ "بادل بھی گھر آئے ہیں اور مجھے جانا بھی دور ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کل میں کس وقت آ جاؤں؟"

"نو بجے تک آ جانا۔ کل آرام سے گل بات ہو گی۔" رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بے چینی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر رحیم داد روکنا بھی چاہتا تو وہ نہ رکتا۔ معذرت کر کے چلا جاتا۔

عبداللطیف نے سلام کیا۔ آگے بڑھا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا۔ پہلی نظر میں اس نے رحیم داد کو بالکل متاثر نہ کیا تھا۔ وضع قطع اور شکل و صورت سے وہ نہایت پھٹیچر نظر آتا تھا۔ مگر گفتگو کے بعد رحیم داد کو اندازہ ہوا کہ وہ آداب مجلس سے واقف تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور بات کرنے کا اسے سلیقہ بھی تھا۔

دوسرے روز رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آیا۔ تیسرے روز وہ آیا اور ٹھیک نو بجے آیا۔ آتے ہی اس نے معذرت کی۔ "معاف کیجئے چوہدری صاحب' میں کل حاضر نہ ہو سکا۔ ایک ضروری کام میں ایسا پھنسا کہ دوپہر تک فرصت نہ مل سکی۔"

رحیم داد نے نہ خفگی کا اظہار کیا نہ شکوہ' مسکرا کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ بہت ضروری کام رہا ہو گا۔" اس نے ایک نوکر کو بلایا۔ چائے لانے کی ہدایت کی۔ اس وقت تک عبداللطیف کمرے کے ماحول سے مانوس ہو چکا تھا۔ وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھا تھا۔ لباس اس کا وہی تھا جو پہلے روز تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی ملگجا ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی زیادہ مرجھایا اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد اس روز بستر کے بجائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے عبداللطیف کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "لطیف' تو آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"فی الحال تو ایک عرصے سے بے روزگار ہوں۔" عبداللطیف نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"بے روزگار ہے تو کام کیسے چلتا ہے؟"

"ایک صاحب کے بچوں کو شام کے وقت پڑھاتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اس سے کسی نہ کسی طرح کام چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"لگتا تو تو بھی اپنی طرح مہاجر ہی ہے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ "میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا؟"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" عبداللطیف نے مسکرا کر اعتراف کیا۔ "رہنے والا تو میں بجنور کا ہوں۔ مگر ملازمت کے سلسلے میں کئی برس سے دہلی میں مقیم تھا۔" اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ "دہلی میں فسادات ہوئے تو مجھے بھی گھربار چھوڑنا پڑا۔ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ پھر دوسرے مصیبت زدہ مسلمانوں کے ایک قافلے کے ساتھ میں بھی کسی نہ کسی طرح بیوی بچوں کے ہم راہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔"

"پاکستان پہنچ کر کیا کرتا رہا؟" رحیم داد نے عبداللطیف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"کچھ مدت تک یہیں لاہور کے ایک مہاجر ریلیف کیمپ میں بیوی بچوں کے ساتھ رہا۔ کیمپ ہی کے قیام کے دوران ہمارے کارڈ وغیرہ بنے۔ مگر جب حکومت نے مہاجرین کو دوسرے شہروں میں منتقل کیا تو مجھے ٹرین میں بٹھا کر شیخوپورہ پہنچا دیا گیا۔ کئی مہینے بے روزگار رہا۔ بھاگ دوڑ کی تو ایک اسکول میں ٹیچر مقرر ہو گیا۔ تنخواہ قلیل تھی۔ مگر کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔" عبداللطیف اپنی پریشان حالی کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔

"سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ مگر وہ اس طرح حل ہو گیا کہ ایک ہندو نے مشکل کشائی کی۔ وہ بھی اسکول ٹیچر رہ چکا تھا۔ اس کے بال بچے سرحد پار جا چکے تھے۔ ان دنوں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔"

"پر وہ کیوں نہ گیا؟" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"اس کی کچھ زرعی آراضی تھی۔ ذاتی مکان بھی تھا۔ وہ اپنی جائیداد فروخت کر کے ہندوستان جانا چاہتا تھا۔" عبداللطیف نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ بوڑھا آدمی تھا۔ نیک دل تھا اور خوش اخلاق بھی تھا۔ پاس پڑوس والوں سے اس کے بہت خوش گوار تعلقات تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹھیرا ہوا تھا۔" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "چوہدری صاحب' واقعی وہ بہت بھلا مانس تھا۔ میری پریشانی کا حال سن کر بہت متاثر ہوا۔ مجھے اپنے ساتھ ٹھیرانے پر رضامند ہو گیا۔ مکان تھا تو چھوٹا اور پرانا بھی تھا مگر سر چھپانے کے لیے بہت کافی تھا۔"

"تیرے رہنے سے اس کو بھی تو مدد ملی ہو گی۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔ "اکیلے میں تو ہر دم جان سے مارے جانے کا خطرہ لگا رہتا ہو گا۔"

"جی ہاں' اس حیثیت سے دیکھا جائے تو میرے ساتھ رہنے سے اسے ایک طرح کا تحفظ مل گیا۔ مگر چوہدری صاحب' وہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ پرانے رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ وضع داری ختم ہو چکی تھی۔ آپس میں بھائی چارہ نہ رہا تھا۔ ایک دوسرے کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔" عبداللطیف نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ مجھے بھی شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا وہ تجھ پر بھی شک کرتا تھا؟" رحیم داد کی آنکھوں سے حیرت آشکارہ تھی۔

"سخت گرمی میں بھی وہ کمرے میں سوتا تھا اور ہمیشہ اندر سے دروازہ بند کر لیتا تھا۔ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چائے کی طلب نے ستایا۔ میں نے چائے بنانے کے لیے بیوی کو جگایا۔ مگر گھر میں ماچس نہ تھی۔" عبداللطیف اب رحیم داد کی شخصیت اور اس کے رعب و دبدبے کے حصار سے باہر نکل چکا تھا اور نہایت اطمینان سے بول رہا تھا۔ "ماچس لینے کے لیے میں نے کیدار ناتھ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں یہ بتانا تو بھول ہی

گیا کہ اس کا نام کیدار ناتھ ساہنی تھا۔"

"دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ کیا بولا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"میں یہی بتا رہا تھا کہ میں نے کیدار ناتھ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ پہلے تو اس نے دیر تک دروازہ ہی نہ کھولا۔ جب میں مسلسل کھٹکھٹاتا رہا تو اس نے دروازہ کھولا۔ ہاتھ جوڑ کر گھگیانے لگا۔ "مجھے قتل نہ کرنا۔ تم کو جو چاہیے ہو لے لو۔" عبداللطیف زیر لب مسکرایا۔ "وہ اس طرح سکڑا سکڑایا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا کہ پہلے تو میں حیران و پریشان کھڑا گھورتا رہا۔ پھر اس کی مضحکہ خیز حالت دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔"

"جان کا ایسا ہی خوف تھا تو وہ ادھر ٹھیرا ہی کیوں؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "بال بچوں کے کے ساتھ ہی سرحد پار چلا جاتا۔"

"چوہدری صاحب' یہ جائیداد اور املاک کی محبت بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ نہ جان کو پرواہ رہتی ہے نہ موت کا خوف۔" کہنے کو تو عبداللطیف باتوں کی رو میں کہہ گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ رحیم داد بھی صاحب جائیداد ہے۔ اس کی بات ناگوار گزر سکتی ہے۔ اس نے فوراً پیترا بدلا۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی غرض سے صفائی پیش کی۔ "لیکن یہ بھی تو غور کرنے کی بات ہے کہ وہ معمولی اسکول ٹیچر تھا۔ نہ جانے کس طرح اپنی خواہشات مار کر اور پیٹ کاٹ کر پیسہ پیسہ جوڑا ہو گا۔ تب مکان بنایا ہو گا۔"

"ہاں جی مکان اسی طرح بنتا ہے۔" رحیم داد نے تائید کی۔ "پر اسے مکان کی اچھی کیمت نہیں ملی ہو گی۔"

"اچھی اور بری قیمت تو اس وقت ملتی جب مکان فروخت ہو جاتا۔" عبداللطیف نے بتایا۔ "کیدار ناتھ نے بہت کوشس کی۔ مگر نہ مکان بک سکا نہ زرعی آراضی۔ کوئی خریدار ہی نہ ملا۔ لوگ تو مفت حاصل کرنے کی تاک میں لگے تھے۔ وقت جتنا گزرتا گیا حالات اور خراب ہوتے گئے۔ پڑوسیوں نے اسے خبردار کیا۔ مجھے بھی بڑھتے ہوئے خطرہ سے آگاہ کیا۔"

"کیدار ناتھ کا کیا بنا؟" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

"وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ ایک روز مکان میرے سپرد کر کے اپنے بال بچوں کے پاس ہندوستان چلا گیا۔ معلوم نہیں پہنچا بھی کہ نہیں۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ جاتے وقت مڑ مڑ کر اپنے گھر کو دیکھتا تھا۔ اور بار بار آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسو پونچھتا تھا۔" عبداللطیف نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔"

"ہاں جی' بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔" رحیم داد نے اپنی جمانے کی کوشش کی۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "جب میں نے نصیر پور چھوڑا تو اپنے گھر کو اسی طرح مڑ مڑ کر تکتا تھا۔ گھر والی تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔"

"درست فرمایا آپ نے۔" عبدالطیف نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اس دکھ کا اندازہ تو وہی بخوبی لگا سکتا ہے جس پر ایسا کڑا وقت پڑا ہو۔ اپنا گھر بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا ہو۔"

"پر کیدار ناتھ کے جانے سے تجھے تو رہنے کا پکا ٹھکانا مل گیا۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "تو نے تو کبضہ کی بنیاد پر آسانی سے اسے اپنے نام الاٹ کرالیا ہو گا۔"

"چوہدری صاحب ایسی اپنی قسمت کہاں۔ کیدار ناتھ ساہنی کے چلے جانے سے سر چھپانے کا سہارا بھی جاتا رہا۔" عبدالطیف نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "نہ معلوم کتنی ہی نظریں پہلے ہی سے اس مکان پر لگی تھیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مکان حاصل کرنے ہی کی غرض سے کیدار ناتھ کو طرح طرح سے ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ عجب نہیں کہ کسی روز اسے قتل بھی کر دیا جاتا۔"

"ایسا بھی خطرہ تھا؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"بالکل تھا۔ بوڑھے کیدار ناتھ کو اس خطرے کا بخوبی اندازہ بھی ہو گیا تھا۔" عبدالطیف نے رحیم داد کو بتایا "تب ہی تو وہ اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔"

"اس کے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"کچھ ہی دنوں بعد گوالیار کے ایک مہاجر نے کلیم کی بنیاد پر مکان اپنے نام الاٹ کرا لیا۔"

"تو نے کیا کارروائی کی؟"

"میں سوچ ہی رہا تھا کیا کروں۔" عبدالطیف نے بجھے ہوئے لہجے میں رحیم داد کو بتایا۔ "ایک روز وہ پولیس لے کر آیا اور مکان پر قبضہ کر لیا۔ میں اس وقت اسکول میں طلباء کو پڑھا رہا تھا۔ واپس آکر دیکھا' میرا سامان گھر کے باہر پڑا تھا۔ بیوی ایک ٹرنک پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں چھوٹی بچی تھی۔ اسے بخار تھا۔ بیوی نے مجھے دیکھا تو بلک بلک کر رونے لگی۔ گھر کے اندر قہقہے گونج رہے تھے۔ مکان ملنے پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چوہدری صاحب' کسی نے سچ کہا ہے۔ کہیں بجتے ہیں نقارے' کہیں ماتم بھی ہوتے ہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے۔"

"تیرے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔

"نہ پوچھیے کیسے کیسے ظلم ہوئے۔ آپ سے کیا کیا بتاؤں۔" عبدالطیف کے چہرے پر افسردگی چھا

گئی۔ "ایک بار پھر رہائش کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میں اکیلا بے گھر نہ تھا۔ میری طرح نہ جانے کتنے اور سر چھپانے کے لیے چھت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔"

"تیرا کلیم شلیم نہیں تھا؟"

"جناب کلیم تو تب ہوتا جب ہندوستان میں میری کوئی جائیداد یا املاک ہوتی۔ وہاں بھی کرائے کے مکان میں رہتا تھا' یہاں بھی کرائے کے مکان کی تلاش تھی۔" عبد الطیف نے صاف گوئی سے رحیم داد کو اپنے بارے میں بتایا۔ "حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ بنوانے والوں نے دھڑلے سے بوگس کلیم بنوائے اور ان کی بنیاد پر الاٹمنٹ بھی حاصل کیے۔ راتوں رات دولت مند اور صاحب جائیداد بن گئے۔ مگر میرے پاس نہ رشوت دینے کے لیے رقم تھی نہ وسائل تھے' نہ اعلیٰ حکام تک رسائی تھی۔ اور سچ پوچھیے تو نہ مجھ میں جعل سازی کی ہمت ہی تھی۔"

وہ باتوں کی دھن میں ایک بار پھر بہک گیا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مہربان علی کی زبانی وہ رحیم داد کے بارے میں سن چکا تھا کہ وہ مہاجر ہے اور اپنے بہت بڑے کلیم کی بنیاد پر متروکہ جائیداد الاٹ کرا چکا ہے۔ بہت بڑا زمین دار بن چکا ہے۔ اس نے جھٹ تلافی کی۔ معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ "مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے ایسے مہاجر ہیں جو ہندوستان میں لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آئے مگر ان کا اتنا بڑا کلیم منظور نہ ہوا۔ اور متروکہ جائیداد میں سے الاٹمنٹ کے ذریعے کچھ ملا بھی تو ہزار طرح کی مشکلات برداشت کرنے کے بعد۔ بات یہ ہے چوہدری صاحب' چند برے اور بد دیانت افراد کی مجرمانہ حرکتوں کے باعث سارے ہی مہاجر بدنام ہوئے۔ ایک گندی مچھلی سارے ہی تالاب کو گندہ کرتی ہے۔" عبد الطیف اب خود اپنی تردید کر رہا تھا۔

رحیم داد نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "بعد میں تو کہیں نہ کہیں رہنے کو ٹھکانا مل گیا ہو گا؟"

"کرائے کا مکان بہت تلاش کیا' لیکن کہیں ملا نہیں۔" عبد الطیف نے بتایا۔ "بہت عرصے تک یہ عالم رہا کہ چند ہفتے کسی ایک ملنے والے کے ساتھ ٹھہر جاتا چند مہینے کسی دوسرے کے ساتھ۔ کوئی مستقل ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔ سامان اٹھائے ادھر ادھر پھرتا تھا۔ جہاں موقع ملتا پڑاؤ ڈال دیتا۔ آخر مرگھٹ میں جگہ ملی۔ وہیں رہنے لگا۔"

"مرگھٹ میں!" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر عبد الطیف کو دیکھا' جس کے چہرے پر خزاں چھائی ہوئی تھی۔ "وہاں تو ہندو اپنے مردے جلاتے ہیں۔"

"مگر اب تو نہ ہندو رہے تھے نہ ان کے مردے اور ارتھیاں۔ ان کو جلانے وہاں کون آتا۔"
عبداللطیف نے بے نیازی سے کہا۔ "مرگھٹ بہت پرانا تھا اور ایک مدت سے بالکل ویران پڑا تھا۔
مردوں کا کریا کرم کرنے والے، لکڑیوں پر ارتھی رکھ کر چتا بنانے والے، اس پر تیل یا گھی ڈال کر
آگ لگانے والے اور ایسے ہی دوسرے کام کرنے والے سارے ہی ہندو، فسادات کے بعد بھاگ
گئے تھے۔ صرف ایک ہندو مرگھٹ کی دیکھ بھال کے لیے ٹھیرا رہا۔ پھر وہ بھی اپنے بال بچوں کو لے
کر چلا گیا۔ بلکہ سننے میں تو یہ بھی آیا کہ اس کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے صحیح طور پر علم نہیں اس کا
کیا حشر ہوا۔ میں نے تو جب مرگھٹ دیکھا تو وہاں کسی انسان کا نام و نشان تک نہ تھا۔"
"کیسی جگہ تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

☆

عبداللطیف جب پہلی بار گیا تو مرگھٹ پر ہو کا عالم طاری تھا۔ شیشم اور نیم کے درختوں کے ایک جھنڈ کے آس پاس کئی کچے مکانات تھے۔ ایک مکان کسی قدر بڑا تھا۔ اس میں دو کمرے تھے۔ ایک کوٹھری تھی۔

کھانا پکانے کے لیے چھوٹی سی رسوئی بھی تھی۔

صحن میں مٹی کی ٹوٹے ہوئے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف دو بوسیدہ چارپائیاں پڑی تھیں۔ قریب ہی ایک گوشے میں پھٹے پرانے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ صحن میں گھاس اور جنگلی پودے کثرت سے تھے۔ کمروں میں مکڑیوں کے جگہ جگہ جالے تھے۔ دوسرے گھروں کا حال بھی ایسا ہی تھا۔

خالی اور اجڑے ہوئے مکانات سے کچھ فاصلے پر ایک سمادھی تھی۔ مگر وہ پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ سمادھی میں گیدڑوں نے گہرے گہرے بھٹ بنا رکھے تھے۔ سمادھی سے متصل دو کوٹھریاں تھیں جن میں مردوں کو نذر آتش کرنے کے لیے کبھی تیل اور گھی کے کنستر رکھے جاتے تھے۔ مگر اب ان میں چند ٹوٹے پھوٹے زنگ آلود ٹین کے ڈبے اور کنستر ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

کوٹھریوں کے آگے چھپر تھا۔ چھپر کے سامنے ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ ایک اونچی بلی میں لکڑیاں تولنے کے لیے ترازو لٹک رہی تھی جس کا ایک پلڑا ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا تھا۔

مرگھٹ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پیپل کا ایک گھنا درخت ملتا تھا۔ اس کے نیچے پختہ چبوترہ تھا۔ ارتھیاں کریا کرم سے پہلے اسی پختہ چبوترے پر لا کر رکھی جاتی تھیں۔ چبوترے سے ذرا

ہٹ کر ہینڈ پمپ تھا جس کا ہینڈل زنگ آلود ہو چکا تھا۔

مرگھٹ میل سوا میل کے رقبے میں پھیلا تھا۔ جگہ جگہ راکھ کی مٹی مٹی ڈھیریاں تھیں جن کے اردگرد کوئلے اور جلی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مردوں کی اکادکا ہڈیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ہر طرف خاک اڑتی تھی اور ویرانی برستی تھی۔

☆

عبدالطیف نے مرگھٹ کے بارے میں رحیم داد کو تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا۔ "چوہدری صاحب، نہ پوچھئے کیسی جگہ تھی۔ بالکل اجاڑ اور ویران۔ ایسی ہی جیسے اجاڑ اور ویران مرگھٹ ہوتے ہیں۔"

"یہ تو بتا، تو ادھر پہنچا کیسے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میرے ساتھ اسکول میں ایک ٹیچر تھا۔ اس کا نام جبار خان تھا۔ وہ بھی میری ہی طرح بے گھر بے در تھا۔ اسی نے اس جگہ کا سراغ نکالا۔" عبدالطیف نے مطلع کیا۔ "وہی مجھے مرگھٹ لے گیا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار وہاں جا چکا تھا اور گھوم پھر کر اچھی طرح جائزہ بھی لے چکا تھا۔ مرگھٹ کے بارے میں ہر طرح کی واقفیت بھی رکھتا تھا۔"

"پر تو ایسی ویران جگہ رہنے کو تیار کیسے ہو گیا؟"

"مجبوری جو تھی۔" عبدالطیف نے مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے جواب دیا۔ "اکیلا تو شاید میں وہاں رہنے پر تیار نہ ہوتا مگر جبار خان نے ہمت بندھائی تو میں رضامند ہو گیا۔ کرتا بھی کیا۔ رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جس کے گھر میں عارضی قیام تھا وہ سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ آخر ہم دونوں نے ایک روز اپنا اپنا سامان اٹھایا اور بیوی بچوں کے ساتھ مرگھٹ میں رہنے کے لیے پہنچ گئے۔ بڑا مکان اس نے مجھے رہنے کے لیے دے دیا۔ اس لیے کہ اس کا چھوٹا کنبہ تھا۔ اس کا صرف ایک بچہ تھا۔ اور میرے تین تھے۔"

"مرگھٹ تو بہت ڈراؤنی جگہ ہوتی ہے۔ تجھے ادھر ڈر اور خوف نہیں لگا؟" رحیم داد نے مسکرا کر قیاس آرائی کی۔ "ضرور لگا ہوگا۔"

☆

عبدالطیف مرگھٹ پر رہنے کے لیے پہنچا تو اتوار کا دن تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی۔ اس نے بیوی

کے ساتھ مل کر کمروں سے مکڑیوں کے جالے ہٹائے۔ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے اور پھٹے پرانے کپڑے اٹھا کر گھر سے دور پھینکے۔ صحن کو گھاس اور جنگلی پودوں سے صاف کیا۔ کمروں کی صفائی کی اور رات کا کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دن بھر گھر کی صفائی کرنے کے بعد اس قدر تھک گیا تھا کہ فوراً ہی گہری نیند سو گیا۔

جاڑے کی رات تھی۔ عبداللطیف بیوی بچوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سو رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ باہر صحن میں کوئی چل رہا ہے۔ قدموں کی دبی دبی آہٹ ابھر رہی تھی۔ کمرے میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی تھی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دیکھا بیوی پہلے ہی بیدار ہو چکی ہے۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

عبداللطیف کھنکارتا ہوا بستر سے نیچے اترا۔ لالٹین کی لو اونچی کی۔ اسے ہاتھ میں لٹکایا۔ جی کڑا کیا اور دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ بیوی بھی اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ دہلیز پر دم بخود کھڑی رہی۔ عبداللطیف نے لالٹین اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف کہر کا ہلکا سرمئی دھندلکا پھیلا تھا۔ اس نے جبار خان کو آواز دی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ڈنڈا سنبھالے فوراً گھر سے باہر نکلا اور سردی سے کپکپاتا ہوا عبداللطیف کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ خوف اور سراسیمگی کا احساس زائل کرنے کے لیے ہنستے رہے' قہقہے لگاتے رہے۔ بھوت پریت کے وجود کو واہمہ قرار دے کر ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جبار خان چلا گیا۔ مگر عبداللطیف آدھی رات تک جاگتا رہا۔ بیوی بھی جاگتی رہی۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی' چونک کر دروازہ کی جانب دیکھتی۔

پہلی رات سخت بے چینی میں کٹی۔ دوسری رات آئی' تیسری آئی۔ جاڑے کی یہ راتیں ڈر اور خوف کے عالم میں گزرتی رہیں۔ بار بار آنکھ کھل جاتی۔ کبھی رات کے پر ہول سناٹے میں رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں ابھرتیں کبھی تیز تیز قدموں سے دوڑنے کی۔ ہوا تیز ہوتی تو ایسا گمان ہوتا جیسے پیپل کے پیڑ پر بیٹھا کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ سب سے زیادہ خوف و ہراس گیدڑ پھیلاتے۔ سرشام ہی ان کے غول کے غول مرگھٹ میں منڈلانے لگتے۔ ایسی خوف ناک آوازیں نکالتے تھے کہ بچے نیند سے بیدار ہو جاتے اور ڈر کر زور زور سے رونے لگتے۔

ملنے جلنے والوں سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔ کسی نے چڑیل کا ذکر کیا کسی نے چھلل پیری کا واقعہ سنایا۔ کسی نے سرکٹے کے بارے میں بتایا کہ اس کا چہرہ

غائب ہو تا ہے۔ صرف گردن ہوتی ہے اور وہ نرخرے سے ایسی خوف ناک آواز نکالتا ہے کہ سننے والا ڈر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کسی نے اگیا بیتال کا قصہ چھیڑ دیا کہ وہ چھلاوا ہو تا ہے۔ مرگھٹ اس کا مسکن ہو تا ہے۔ آگ کی مانند دہکتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ ان باتوں کو سن کر خوف اور سوا ہوا۔

عبداللطیف اور جبار خان عام طور پر سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھروں کو واپس پہنچ جاتے۔ کسی وجہ سے کبھی دیر ہو جاتی تو واپسی پر کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ مرگھٹ کے اندھیرے میں اچانک شعلہ بھڑکا۔ آن کی آن میں قریب آیا اور دور جا کر غائب ہو گیا۔ مگر پلک جھپکتے ہی پھر نمودار ہو تا۔ معاً اگیا بیتال کا خیال آتا اور خوف سے دل دہل جاتا۔ قدم ڈگمگا جاتے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ مردوں کی ہڈیوں سے خارج ہونے والا ایک کیمیائی عنصر' فاسفورس ہو تا ہے جو آگ کی طرح دہکتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر فضا میں تحلیل ہو جا تا ہے۔

ڈر اور خوف سے پریشان ہو کر عبداللطیف نے کئی بار مرگھٹ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا نہ ملا۔ اسی عالم میں جاڑا گزر گیا۔ گرمی کا موسم شروع ہوا تو راتوں کا پر ہول سناٹا کچھ کم ہو گیا۔ مرگھٹ کی ویرانی بھی زیادہ محسوس نہ ہوتی۔ اب راتیں مختصر ہو گئی تھیں اور دن طویل ہو گئے تھے۔ سورج جلد طلوع ہو تا اور دیر سے غروب ہو تا۔

عبداللطیف اور جبار خان رفتہ رفتہ مرگھٹ کے کے ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ خوف اور دہشت میں اس قدر کمی آگئی کہ چاندنی راتوں میں دونوں گھر کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ چائے پیتے' سگریٹوں پر کش لگاتے اور رات گئے تک اطمینان سے باتیں کرتے رہتے۔

بچے دن بھر مرگھٹ میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے۔ بے دھڑک اس چبوترے پر لیٹ جاتے جس پر کبھی ارتھیاں رکھی جاتی تھیں۔ کبھی کھیل کود میں کسی چتا کی بچی کھچی راکھ اڑاتے' ہنستے' قہقہے لگاتے۔ اکثر مردوں کی ہڈیاں اٹھا کر گھروں میں لے آتے۔ ابتدا میں تو ان کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مردوں کی ہڈیوں کا خوف بھی جاتا رہا۔ مرگھٹ مرگھٹ نہ رہا عام میدان بن گیا۔ زندگی کے ہنگامے موت کے خوف پر غالب آگئے۔

☆

رحیم داد نے مرگھٹ کے بارے میں ڈر اور خوف کا اظہار کیا تو عبداللطیف نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "شروع شروع میں تو واقعی بہت ڈر معلوم ہوتا تھا۔ خاص طور پر راتیں بہت ڈراونی ہوتیں۔ اکثر جاگتے ہوئے گزر جاتیں۔ مگر بعد میں تو یہ عالم ہوا کہ مرگھٹ مرگھٹ ہی نہ

معلوم ہوتا۔ نہ کبھی ڈر محسوس ہوتا نہ خوف۔ میں لگ بھگ تین سال تک مرگھٹ میں رہا۔"

"لطیف، تو تین سال تک مرگھٹ میں رہا؟ حد ہو گئی۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"صرف میں اور جبار خان ہی وہاں نہیں رہے۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ دوسرے خالی مکان بھی آباد ہو گئے۔" عبدالطیف نے بتایا۔ "پھر تو ایسا بھی ہوا کہ میری طرح کے دوسرے بے گھر لوگوں نے بھی رہنے کے لیے مرگھٹ میں اپنے گھر خود بنانے شروع کر دیے۔ بعض نے اینٹوں کی پختہ دیواریں کھڑی کیں اور ان پر چھپریا ٹین کے سائبان ڈال کر رہنے لگے۔"

"کسی نے روک ٹوک تو نہیں کی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"روک ٹوک کون کرتا۔ مرگھٹ کی زمین تھی۔ نہ کوئی مالک تھا نہ کوئی دعویدار۔ نہ کرایہ نہ کسی قسم کا ٹیکس۔" عبدالطیف نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "ہر شخص اپنے مکان کو ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ دل ہی دل میں کہتا' چلو زندگی میں اپنا بھی ایک عدد مکان ہو گیا۔ تھا تو شہر سے دور لیکن اطمینان اور سکون حاصل تھا۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔"

"تو نے وہ مکان بعد میں فروخت کر دیا یا کرائے پر چڑھا دیا؟"

"نہ میں نے اسے فروخت کیا نہ ہی کسی کو کرائے پر دیا۔" عبدالطیف کے چہرے پر ایک بار پھر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ "جب اجاڑ اور ڈراؤنے مرگھٹ پر اچھی خاصی آبادی ہو گئی' ویرانی کے بجائے زندگی کی چہل پہل اور رونق نظر آنے لگی تو ہوشیار پور کے ایک مہاجر وکیل نے ہوشیاری دکھائی۔ مہاجرین کی آباد کاری کے نام پر ایک کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی۔ ایک ریٹائرڈ سیشن جج کو اس کا سرپرست بنایا۔ سوسائٹی کو باقاعدہ رجسٹر کرایا اور سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے سازباز کر کے اور تگڑی رشوت دے کر مرگھٹ کی زمیں سوسائٹی کے نام پر الاٹ کرالی۔"

"مرگھٹ کو الاٹ کرالیا' یہ کیسے ہو گیا؟" رحیم داد نے تعجب سے عبدالطیف کو دیکھا۔

"اس کا علم تو ان سرکاری افسروں کو ہو گا' جنھوں نے الاٹمنٹ کا حکم جاری کیا۔" عبدالطیف کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ "کس قانون اور کس ضابطے کے تحت ایسا کیا گیا یہ مجھے نہیں معلوم۔ کوشش بھی نہ کی۔"

"پر جب الاٹمنٹ کا حکم دیا ہو گا تو تجھے بھی پتہ چل گیا ہو گا۔"

"تمام کارروائی اس قدر رازداری سے کی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" عبدالطیف نے رحیم داد کو بتایا۔ "پتہ اس وقت چلا جب وکیل نے عدالت سے سب کی بے دخلی کے احکامات

حاصل کیے اور ایک روز پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ پہنچا۔ تمام مکانات پولیس کی مدد سے خالی کرائے۔ ان کو کدالوں اور بیلچوں سے توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیا گیا۔"

"پر وکیل کو اس سے کیا ملا؟" رحیم داد اب تک بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

"اس نے مرگھٹ کی زمین کو دو دو اور چار چار مرلے کے چھوٹے بڑے پلاٹوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے بیشتر کو سوسائٹی کے فرضی ممبروں کے نام الاٹ کر کے فروخت کر دیا۔ اس طرح اس نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔"

"لگتا ہے وکیل بہت اونچا کاریگر تھا۔" رحیم داد نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

عبداللطیف نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں رہا اسے خاموش کالونی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کا کیا نام رکھا گیا' یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں ایسا دل برداشتہ ہوا کہ شیخو پورہ ہی چھوڑ دیا۔ لاہور آ گیا۔ تب سے یہیں ہوں۔"

اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو یہ پیغام پہنچایا کہ احسان شاہ نے اسے بلایا ہے۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عبداللطیف بھی کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "لطیف' تو کل آ جانا۔ میں آج شاہ جی سے بھی تیرے بارے میں مشورہ کر لوں گا۔" رحیم داد آگے بڑھا۔ عبداللطیف سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

☆

احسان علی شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ رحیم داد اس کے پاس پہنچا۔ احسان علی شاہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "چوہدری تو کمرے میں بیٹھا کس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا؟"

"عبداللطیف تھا۔" رحیم داد نے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"کون عبداللطیف؟" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہی جسے مہربان علی لایا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "تو نے کہا تھا انگریزی پڑھنے کے لیے ماسٹر لگا لے۔ وہ اسی لیے آیا تھا۔"

احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "مہربان سے تو میں نے ہی کہا تھا۔ وہ تیرے لیے ماسٹر لے آیا؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ تجھے کیسا لگا؟"

"مجھے تو ٹھیک ٹھاک بندہ لگتا ہے۔ بی اے تک پڑھا ہے۔ کہتا تھا امتحان دیا تھا پر بی اے پاس نہیں کر سکا۔"

"پر تجھے پڑھانے کے لیے تو اتنی تعلیم کافی ہے۔"

"پہلے بھی سکول میں پڑھاتا رہا ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کا عندیہ لینا چاہا۔ "تیری رائے ہو تو اسے لگا لوں۔"

"پڑھنا تجھے ہے یا میں نے؟" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "تجھے ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا ہے تو لگا لے۔ اپنے ساتھ لے جا۔"

"میں نے اسے کل بلایا ہے۔" رحیم داد نے مطلع کیا۔ "پتہ نہیں' وہ کوٹلہ ہرکشن جانے کو تیار بھی ہو گا کہ نہیں۔ اس کے بال بچے ادھر ہی ہوتے ہیں۔"

"مہربان نے اسے یہ بات پہلے ہی بتا دی ہو گی۔ آگے اس کی مرضی ہے۔ تو اس سے پوچھ لینا۔"

"پوچھ لوں گا۔" رحیم داد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ بتا' تو نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟"

"میں کل صبح پشاور جا رہا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہو گی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ہفتہ بھر لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے آجاؤں۔" کوٹلہ ہرکشن جانا چاہے تو چلا جانا۔ ویسے تیری مرضی ہے۔ میرے واپس آنے تک ٹھہر سکتا ہے تو ٹھہر جا۔"

"کیا کروں گا ادھر ٹھہر کر۔ پتہ نہیں لائل پور کی زمین کا جھگڑا کب طے ہو۔ تو نے تو مجھے اسی کے لیے روکا تھا۔" رحیم داد نے تجسس کا اظہار کیا۔ "یہ بتا' لائل پور کی زمین کا کیا بنا؟"

"اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔ ویسے میری کوشش تو یہی ہے کہ جلد ہی کام بن جائے۔ جھگڑا عدالت میں نہ جاتا تو بہت پہلے زمین اپنے پاس آجاتی۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ "تو کوٹلہ ہرکشن ہی میں ٹھہرنا۔ ضرورت ہو گی تو تجھے بلا لوں گا۔"

"میں کل نہیں تو پرسوں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی مجھے اب اپنے پنڈ میں ہونا چاہیے۔ وہاں سے آئے ہوئے ڈیڑھ مہینے سے بھی کچھ اوپر ہی ہو گیا۔"

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ دونوں اٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے روز صبح ہی صبح احسان شاہ پشاور کے لیے روانہ ہو گیا۔

ساڑھے نو بجے عبداللطیف آگیا۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ عبداللطیف بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی بش شرٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ اس روز گرمی بھی زیادہ تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے' مگر ہوا بند تھی۔ حبس اس قدر تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"عبداللطیف تو رہتا کہاں ہے؟" رحیم داد نے اس کی خستہ حالت دیکھ کر قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے کہیں دور ہی رہتا ہے۔"

"یہاں سے کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ ہو گا۔"

"تب تو بہت دور سے چل کر آرہا ہے۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ "کرائے کا مکان لے رکھا ہو گا۔"

"نہیں چوہدری صاحب" عبداللطیف نے بتایا۔ "اتنی آمدنی ہی نہیں کہ مکان کا کرایہ ادا کر سکوں۔ لہٰذا تلاش ہی نہیں کیا۔"

"پر کہیں نہ کہیں تو رہتا ہی ہو گا۔"

"میں نے آپ سے بتایا تھا کہ شام کو ایک صاحب کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔" عبداللطیف نے رحیم داد کو کسی قدر تفصیل سے اپنی رہائش کے بارے میں بتایا۔ "وہ آگرہ کے مہاجر ہیں۔ انارکلی میں ان کی جوتوں کی دکان ہے۔ آگرہ میں بھی یہی کاروبار کرتے تھے۔ سنا ہے وہاں بہت بڑا کاروبار تھا۔ مکان بھی اپنا ذاتی تھا۔ یہاں ان کو جو کوٹھی الاٹ ہوئی ہے اس میں گیراج بھی ہے۔ مگر گیراج میں رکھنے کے لیے کار نہیں ہے۔ میں اسی گیراج میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"اس میں تو بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔

"ہوتی تو ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ سر چھپانے کو ٹھکانا تو ہے۔" اس کے لہجے میں دفعتہً افسردگی پیدا ہو گئی۔ "شاید اسے بھی جلد ہی خالی کرنا پڑے۔ سنا ہے اسے جوتوں کا گودام بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ صرف سنا ہی سنا ہے۔ کسی نے اس سلسلے میں مجھ سے بات نہیں کی۔"

"فکر نہ کر' اب تجھے زیادہ دنوں پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو میرے ساتھ کوٹلہ ہرکشن چل۔ بال بچوں کو بھی ساتھ لے لے۔ ادھر ٹھہرنے کو بہت جگہ ہے۔ ویسے مہربان علی نے تجھے بتا ہی دیا ہو گا۔ تجھے کوٹلہ ہرکشن جانا ہو گا۔"

"انھوں نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔" عبداللطیف کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی ابھرنے لگی۔ "دوسری تفصیلات کے بارے میں فیصلہ آپ کریں گے۔"

"فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے۔" رحیم داد نے عبداللطیف کو بتایا۔ "تجھے ۶۰ روپے مہینہ تنخواہ ملے گی۔ رہنے کو مکان اور فصل پر غلہ بھی ملے گا۔ اپنے پاس بہت مویشی ہیں۔ دودھ اور مکھن بھی ملے گا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "جان بن جائے گی تیری۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ بدن پر ذرا بھی گوشت نہیں۔ ہڈیوں کا پنجر نظر آتا ہے۔"

"آپ کب تک کوٹلہ ہرکشن جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"مجھے تو کل جانا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "اگر تجھے میری نوکری کرنی منظور ہے تو کل میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔"

"مگر میں اتنی جلدی کیسے چل سکتا ہوں۔" عبداللطیف نے اپنی مشکل بیان کی۔ "میرے ساتھ بیوی بچے بھی تو ہیں۔"

"ایسا کر، تو کل میرے ساتھ کوٹلہ ہرکشن چل۔" وہاں ٹھہر کر دو چار روز میں دیکھ لے، سمجھ لے۔ آگے جیسی تیری مرضی۔ بال بچوں کو بعد میں ادھر لے آنا۔"

"آپ کی تجویز نہایت مناسب ہے۔" عبداللطیف نے اتفاق رائے کیا۔

رحیم داد نے جیب سے پچاس روپے نکال کر عبداللطیف کو دیئے۔ "لے یہ رکھ لے۔ جو کتابیں شروع میں پڑھانی ہیں، ان کو خرید لینا۔ کاپیاں شاپیاں بھی خرید لینا۔ جو روپے بچ جائیں اپنے پاس رکھ لینا۔ تجھے گھر کا کام چلانے کے لیے گھر والی کو بھی تو کچھ دے کر جانا ہوگا۔"

"جی ہاں، مجھے سب سے زیادہ یہی فکر تھی۔" عبداللطیف کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"کل آپ کس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے؟"

"صبح ناشتا کر کے چلنے کا ارادہ ہے۔ تب تک تو پہنچ جائے گا نا؟"

"میں صبح ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اجازت ہو تو میں اب چلا جاؤں۔"

"بالکل چلا جا۔ کل میں تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

عبداللطیف نے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

صبح آٹھ بجنے سے چند منٹ پہلے ہی عبداللطیف پہنچ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی تھا جس میں چند کپڑے اور ضروری ساز و سامان تھا۔ بغل میں بستر دبا تھا جو ایک دری، چادر اور تکیے کو لپیٹ کر بنایا گیا تھا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر سفر کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ کوٹھی کے پھاٹک پر اس کی جیپ کھڑی تھی۔ رحیم داد نے عبداللطیف کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کوٹھی سے باہر نکلا اور عبداللطیف کے ہم راہ اس میں بیٹھ گیا۔ جیپ آگے بڑھی اور پختہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

بارش رکی ہوئی تھی۔ راستے میں بھی بارش سے سابقہ نہ پڑا۔ مگر جب جیپ کوٹلہ ہرکشن میں پہنچی تو چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ اطلاع ملتے ہی نادر خان حویلی کے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ رحیم داد کو ادب سے سلام کیا۔ مزاج پوچھا۔ حال احوال معلوم کیا۔ رحیم داد نے اسے عبداللطیف سے ملایا۔

اس کی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اور یہ ہدایت کی کہ عبداللطیف کے قیام کا عارضی طور پر مہمان خانے میں بندوبست کر دیا جائے۔

رحیم داد نے نادر خان سے زیادہ بات چیت نہ کی۔ سفر کی تکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ غسل کرنے کے بعد آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مڑ کر نادر خان کی جانب دیکھا۔ "نادر، تجھ سے کل صبح آرام سے کُل بات ہوگی۔ اب تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" وہ آگے بڑھا اور اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔ نادر خان خاموش کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

عبداللطیف بھی گم صم کھڑا تھا۔ وہ حویلی کی شان و شوکت اور رحیم داد کی آن بان دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔ نادر خان کے ہم راہ مہمان خانے میں گیا۔ ایک کمرے میں داخل ہوا جس میں نوکروں نے پہلے ہی اس کا بستر لگا دیا تھا۔ نادر خان اس کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد رحیم داد صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اوپر کی منزل سے اتر کر نیچے آیا۔ بڑے کمرے میں پہنچا اور ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے نادر خان کو طلب کیا اور خاموش بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نادر خان پہنچ گیا۔ اس کی بیوی، جنت بھی اس کے ہم راہ تھی۔ وہ بن سنور کر آئی تھی اور دوپٹے کے آنچل سے ہلکا سا گھونگھٹ نکال کر اپنے شوہر کے پہلو میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی۔ گود میں اپنے شیر خوار بیٹے کو اٹھائے ہوئے تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو چونک پڑا۔ معاً اسے اپنا پہلوٹی کا بیٹا کریم داد یاد آ گیا۔ بچپن میں وہ ہو بہو ایسا ہی تھا۔ مگر کریم داد عرف کریما اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی ماں نوراں کے ساتھ آگ میں جل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔

جنت شرماتی لجاتی آگے بڑھی اور اپنے بچے کو رحیم داد کی طرف بڑھایا۔ رحیم داد نے اسے ہاتھوں میں لے کر سنبھالا۔ سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ گال کو پیار سے تھپ تھپایا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نادر خان بہت خوش نظر آ رہا تھا تھا۔ چار بیٹیوں کے بعد یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جنت کا چہرہ بھی مسرت سے سرخ پڑ گیا تھا۔

بچے نے ماں کی طرف دیکھا۔ رونے کے لیے منہ بگاڑا۔ رحیم داد نے اسے واپس جنت کی گود میں دے دیا۔ وہ سر جھکائے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ جنت نے بچے کو سینے سے چمٹا کر پیار کیا اور باہر نکل گئی۔

رحیم دار نے نادر خان کی جانب دیکھا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اس کے قریب ہی ایک

صوفے پر بیٹھ گیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔ "رفیع سمہ فصل اٹھا کر لے گیا؟"

"ہاں جی' وہ لے گیا۔ اس کی جو رکم بنتی تھی وہ بھی دے گیا۔" اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں موجود تھیں۔ "یہ رہی جی پوری رکم۔"

رحیم داد نے رومال میں لپٹے ہوئے نوٹ لے کر اپنے قریب رکھ لیے۔

نادر خان نے کہا۔ "سمہ خریف کی فصل اٹھانے کو بھی کہتا تھا۔"

"خریف کی فصل کے بارے میں واڈھی پر سوچا جائے گا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ بتا' تو نے نیچے کے چھوٹے زمین داروں اور حصے داروں کی زمین خریدنے کے لیے بیعانہ شیعانہ تو ابھی نہیں دیا؟"

"تیری اجازت کے بغیر کیسے دے سکتا تھا۔ ویسے شہ زور مزاری کی حویلی میں میں نے تجھ سے پوچھ لیا تھا۔ پر نہ اب تک کسی کو کچھ دیا نہ بات پکی کی۔" نادر خان نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "پچھے مہینے ان کے کچھ بندے سودا طے کرنے کی نیت سے آئے بھی تھے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ چوہدری کی واپسی سے پہلے کچھ طے نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تو نے بہت ٹھیک کیا۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "میں نے اس بارے میں شاہ جی سے بھی گل بات کی تھی۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ ابھی تو برسات کا موسم ہے۔ پانی ویسے ہی بہت ہے۔ بارش کے بعد جب پانی کی کمی ہو جائے تب سودا کرنا ٹھیک رہے گا۔"

"شاہ جی نے مشورہ تو ٹھیک ہی دیا۔" نادر خان نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "جب پانی کی کمی ہو تو اپنے موگھوں سے زیادہ پانی نکالنا شروع کر دیا جائے۔ فصلیں خراب ہونے لگیں گی تو بہت سستے مول زمینیں مل جائیں گی۔"

"پر شاہ جی تو یہ بھی کہتا تھا کہ ابھی غلام محمد بیراج تیار نہیں ہوا۔ سندھ میں بیراجوں کی زمینوں کی الاٹمنٹ کیسے شروع ہو گئی؟" رحیم داد نے نادر خان کو مطلع کیا۔ "زمینوں کی الاٹمنٹ تو تب ہی ہونی چاہیے جب بیراج بن کر تیار ہو جائے۔"

"مجھے تو جی بیراجوں کی زمینوں اور ان کی الاٹمنٹوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" نادر خان نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "اور اب تو' تو آ ہی گیا ہے جو طے کرنا ہو گا طے کر لینا۔" اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "دلاور والا کی زمین کا کیا بنا جی؟"

"وہ تو بہت جھگڑے کی زمین ہے۔ مزارعے اتنے سرکش اور جھگڑالو ہیں کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔ انھوں نے تو بہت رولا کیا۔ کسی طرح کبضہ دینے کو تیار نہیں۔"

"جب ایسا ہے تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔" نادر خان نے دبی زبان سے کہا۔ "میں نے تو جی پہلے ہی کہا تھا ایسی جھگڑے کی زمین اپنے پاس رکھنا ٹھیک نہیں۔"

"تو نے جو کہا تھا میں نے وہی کیا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "سردار عظمت اللہ دریشک کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا۔ اب زمین کا کبضہ اس نے ہی حاصل کرنا ہو گا۔ جب کبضہ مل جائے گا تو وہ زمین کی کیمت یہاں آکر ادا کر دے گا۔ اس کے بارے میں میں نے خود طے نہیں کیا۔ شہ زور مزاری پر چھوڑ دیا ہے۔ شاہ جی کو بھی میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کی کوٹھی پر لکھا پڑھی ہو جائے گی۔"

"یہ تو جی بہت ہی ٹھیک ہو گیا۔" نادر خان نے مسکرا کر تائید کی۔

بارش رکی ہوئی تھی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کمرے میں گیا۔ نادر خان نے فصل کی جو رقم دی تھی، اسے لوہے کی مضبوط ٹرنک میں رکھ کر تالا لگایا۔ واپس آیا اور نادر خان کے ہم راہ خریف کی فصل کا معائنہ کرنے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

☆

رحیم داد نے عبداللطیف کو بلایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "تجھے ادھر کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟ نوکر تو مہمان خانے میں موجود ہی رہتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔"

"آپ کی مہربانی ہے۔ چوہدری صاحب، میں بہت آرام سے ہوں۔" عبداللطیف نے اسے اطمینان دلایا۔ "مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔" اس نے رسان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "اگر سفر کی تھکن دور ہو گئی ہو تو کیوں نہ آج ہی شام سے پڑھائی کا سلسلہ شروع کر دیا جائے؟"

رحیم داد نے بلا عذر اس کی بات مان لی۔

عبداللطیف شام کو کتابیں لے کر رحیم داد کے پاس پہنچ گیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رحیم داد نے پڑھائی میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ عبداللطیف بھی پوری توجہ سے اسے پڑھاتا۔ ہر لفظ اور ہر جملہ ذہن نشین کراتا۔ رحیم داد کہیں الجھتا یا اسے دقت پیش آتی تو نہایت صبر و سکون سے سمجھاتا اور نہایت وضاحت سے بار بار سمجھاتا۔

وہ رحیم داد کو صبح و شام دونوں وقت پابندی سے پڑھاتا رہا۔ ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ رحیم داد سے اجازت لے کر عبداللطیف لاہور گیا اور بیوی بچوں کو بھی لے آیا۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام بھی مہمان خانے میں ہی کیا گیا۔ رحیم داد کے پاس کوئی مہمان آتا ہی نہ تھا۔ پاس پڑوس کے زمین

داروں سے اس کا میل جول بھی نہ تھا۔ سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے بھی اس نے کبھی مراسم پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا مہمان خانہ عام طور پر خالی ہی رہتا تھا۔

برسات کے موسم میں تو ویسے بھی کسی مہمان کے آنے اور قیام کرنے کی توقع نہ تھی۔ عبداللطیف نہایت سکون سے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ جسم پر گوشت چڑھنے لگا تھا۔ چہرہ بھر گیا تھا۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی تھی۔

عبداللطیف کی بیوی کو کچھ عرصہ تو اجنبیت کا احساس ہوا۔ وہ بیزار اور اکتائی ہوئی رہتی۔ مگر جب جنت کے ساتھ میل ملاپ بڑھا تو اس کا دل لگ گیا۔ بیشتر وقت جنت ہی کے ساتھ ہنستے بولتے گزرتا۔ جنت بھی ہر طرح اس کی مدد کرتی۔ دل جوئی کرتی۔ نادر خان کا رویّہ بھی عبداللطیف کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ ہر طرح اس کا خیال رکھتا۔ عبداللطیف زیادہ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ لہٰذا نادر خان کو لکھنے پڑھنے کے کام میں اس سے مدد ملتی۔

برسات کا بھیگا بھیگا موسم گزر گیا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو گئی۔ جاڑا شروع ہو گیا۔ رحیم داد نہایت لگن اور دلچسپی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ عبداللطیف پوری توجہ سے اس کی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد نے پینا پلانا بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی ہڑک اٹھتی تو کمرے میں تنہا بیٹھ کر شغل کر لیتا۔ نادر خان کی غیر حاضری میں وہ کبھی کبھار چوری چھپے جنت کو اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ مگر اب وہ بہت محتاط رہتی تھی۔ کترانے اور دور دور رہنے کی کوشش کرتی۔ عبداللطیف کی بیوی میں اس نے کبھی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ وہ سیدھی سادھی گھریلو عورت تھی۔ بھدی اور کم رو بھی تھی۔ بناؤ سنگھار کا بھی شوق نہ تھا۔ ویسے بھی رحیم داد استاد کی حیثیت سے عبداللطیف کا خاصا احترام کرتا تھا۔ حالانکہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑا نہ تھا۔

جاڑا بھی ختم ہو گیا۔ کھیتوں میں گندم اور جو کے ہرے بھرے پودے لہرا رہے تھے۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مگر اس عرصے میں نہ احسان شاہ نے رحیم داد کو بلایا اور نہ ہی رحیم داد اس سے ملنے کے لیے لاہور گیا۔ دلاور والا کی زمین کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ حسب وعدہ نہ سردار شہ زور مزاری اس کے پاس آیا اور نہ سردار عظمت اللہ دریشک نے کوئی پیغام بھیجا۔ رحیم داد کو تشویش پیدا ہوئی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

اپریل کے آغاز میں رحیم داد ایک صبح اپنی جیپ میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ تو نظر نہ آیا مگر مہربان علی مل گیا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ ''میں تو تیرے پنڈ کی طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تو آ گیا یہ ٹھیک ہوا۔ چوہدری 'لائل پور کی زمین

کا تصفیہ ہو گیا ہے' کبضہ بھی مل گیا۔"

"یہ خوش خبری سننے کے بعد رحیم داد سارا گلہ شکوہ بھول گیا۔ اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ پوچھا۔ "شاہ جی کدھر ہے؟"

"وہ کل ہی کراچی گیا ہے۔" مہربان علی نے مطلع کیا۔ "مجھے کہہ گیا تھا کہ تجھے لائل پور کی زمین کے بارے میں خوش خبری سنا دوں۔"

"شاہ جی کراچی کیوں گیا ہے؟"

"جہاں تک مجھے پتہ ہے وہ اپنی کمپنی' جوائنٹ اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹر کرا چکا ہے۔" مہربان علی نے بتایا۔ "ٹیکسٹائل مل لگانے کا پرمٹ اور مشینری امپورٹ کرنے کا لائسنس نکلوانے گیا ہے۔ بینک سے کرضہ بھی لینا ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تجھے تو مجھ سے زیادہ پتہ ہونا چاہیے۔ تجھے تو کمپنی کا ڈائرکٹر لگایا گیا ہے۔ میں نے تو ساری ہی دستاویزات دیکھی ہیں۔"

"شاہ جی نے مجھے بتایا تو تھا۔ آگے کا مجھے پتہ نہیں۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے بتایا۔ "شاہ جی کب تک لوٹے گا؟"

"اس دفعہ تو جی اس کا لمبا ہی پروگرام ہے۔ پتہ نہیں کب واپس آئے۔ بتا کر بھی نہیں گیا۔"

"سردار شہ زور مزاری یا سردار عظمت اللہ دریشک تو پچھلے دنوں ادھر نہیں آئے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے بے چینی آشکارہ تھی۔

"میرے سامنے تو جی دونوں میں سے کوئی نہیں آیا۔" مہربان علی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "شاہ جی نے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

رحیم داد نے مزید پوچھ گچھ نہیں کی۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا معلوم کر چکا تھا۔ اس نے احسان شاہ کی کوٹھی پر ایک روز قیام کیا۔ دوسرے روز وہ واپس جانے لگا تو مہربان علی موجود تھا۔ رحیم داد اپنی جیپ میں جا کر بیٹھا تو مہربان علی نے کہا۔

"چوہدری' مجھے بھی جانا ہے۔ کوٹھی کے نامکمل حصے کی تعمیر کے لیے اینٹوں کا بندوبست کرنا ہے۔ ادھر اینٹوں کے بھٹے ہیں۔ مجھے وہیں جانا ہے۔ تو مجھے ادھر چھوڑ دینا۔"

"ضرور چھوڑ دوں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر مہربان علی سے پچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "عابد' جیپ فیروز پور روڈ کی طرف لے چل۔ مہربان کو ادھر پہنچانا ہے۔"

مہربان علی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ فیروز پور روڈ پہنچی۔ مہربان علی اینٹوں کے ایک بھٹے کے سامنے اتر گیا۔

جیپ آگے بڑھی۔ میل بھر سے بھی کم راستہ طے کیا ہو گا کہ ڈرائیور نے اسے روک کر ایک سائے دار درخت کے نیچے کھڑا کر دیا۔ ڈرائیور کو ریڈائیٹر میں پانی ڈالنا تھا۔ وہ ٹین کا خالی ڈبا ہاتھ میں دبا کر ایک طرف چلا گیا۔ رحیم داد بھی نیچے اترا اور جیپ کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

سڑک کے دونوں طرف جگہ جگہ اینٹوں کے بھٹے تھے۔ ان کی چمنیوں سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اس سمت دیکھ رہا تھا جدھر ڈرائیور گیا تھا۔

"وے چوہدری' تو ادھر کیسے؟" اچانک عقب سے آواز ابھری۔

رحیم داد نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ شاداں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ گھبراہٹ میں کچھ کہہ نہ سکا۔ لیکن شاداں نے مسکرا کر پوچھا۔ "چوہدری' تو نے مجھے پہچان لیا ناں؟"

رحیم داد نے گہرے سبز شیشوں کا چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا۔ "تو شاداں تو نہیں ہے؟"

"ہاں جی' میں شاداں ہی ہوں۔" وہ چہک کر بولی۔ "پچھلے سال تو مجھے چوکی پر نظر آیا تھا۔ میں نے بار بار ہانک لگائی۔ تجھے بہت روکا۔ پر تو نہ رکا۔ گڈی میں سوار ہو کر چلا گیا۔ اس روز تو لالی بھی میرے ساتھ تھا۔"

"کون لالی؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تو لالی کو نہیں جانتا؟" شاداں کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "پر تو نے اسے کہاں دیکھا ہو گا۔" اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ہاں' یہ تو یاد ہو گا میں تجھے کاسم بیلا میں ملی تھی۔ ان دنوں تو گردیزیوں کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا۔ لالی تب ملتان جیل میں ہوتا تھا۔ کاسم بیلا جیل سے زیادہ دور نہیں۔ میں اسی کے لیے ادھر تھی۔ تجھے بتایا بھی تھا۔"

"کچھ یاد تو پڑتا ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ "تو نے کاسم بیلا کیوں چھوڑ دیا؟"

"میں اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھی۔"

"تیرے بچے بھی ہیں؟" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"گھر والا بھی تھا۔" شاداں نے بتایا۔

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"اپنے پنڈ میں ہوتا ہے۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔" شاداں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "پر

اب وہ میرا گھر والا نہیں رہا۔ میں نے پچھلے دنوں اس سے طلاک لے لی۔ اس نے دوسرا ویاہ بھی کر لیا ہے۔"

"تب تو لالی سے تو نے بھی ویاہ کر لیا ہو گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"نہیں!" وہ نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ "پر اب کر لوں گی۔"

"لالی' اب کدھر ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہ اب جیل سے چھوٹ چکا ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "تب میں چوکی میں اپنے ماماں کے پاس ہوتی تھی۔ لالی کو پتہ تھا۔ جیل سے نکلتے ہی سیدھا میرے پاس پہنچا۔"

"لالی نے کوئی کام دھندا بھی شروع کیا یا ابھی تک۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" شاداں فوراً اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ اس نے صفائی پیش کی۔ "لالی پہلے ایک کارخانے میں لگ گیا تھا۔ پر وہاں چھانٹی ہوئی تو اس کی نوکری بھی جاتی رہی۔ اب بھٹے پر پتھیرا لگ جائے گا۔" اس نے ایک اونچی چمنی کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ "جمعدار حنیف ڈوگر نے لگوایا ہے۔ بھٹے کے لیے وہی پتھیروں کی بھرتی کرتا ہے۔ لالی اس کے پاس گیا ہے۔"

"تو بھی لالی کے ساتھ بھٹے پر لگ گئی؟"

"ہاں جی میں بھی لگ جاؤں گی۔ دونوں مل کر کام نہیں کریں گے تو گزارہ کیسے ہو گا۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر محنت بہت کرنی پڑتی ہے۔ دہاڑی بھی کم ملتی ہے۔"

ڈرائیور ڈبے میں پانی بھر کر لے آیا تھا۔ وہ ریڈایٹر کا ڈھکنا کھول کر پانی ڈالنے لگا۔ رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں شاداں کی آواز ابھری۔ "چوہدری' لے دیکھ لالی بھی آگیا۔" رحیم داد نے مڑ کر دیکھا۔ لالی ایک بھٹے سے نکل کر جیپ کی طرف آرہا تھا۔ رحیم داد نے لالی کو دیکھا تو سخت سراسیمہ ہوا۔

شاداں اس کی گھبراہٹ سے بے نیاز بولتی رہی۔ "چوہدری' تو وڈا زمیں دار ہے۔ لالی کو اپنے پاس لگا لے۔ میں بھی تیری حویلی میں لگ جاؤں گی۔ دونوں ساتھ رہیں گے۔ بھٹے پر تو سخت دھوپ اور گرمی میں کام کرنا پڑے گا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "تو لالی کو اپنے پاس لگا لے گا ناں؟"

"یہ تو دیکھنے ہی میں مویشی چور لگتا ہے۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "تجھے پتہ نہیں' میں دوسرے وڈے زمیں داروں کی طرح رسہ گیری کا دھندا نہیں کرتا۔"

"نا جی نا' لالی نے دوسروں کے ڈھور ڈنگر اٹھانے کا دھندا کبھی نہیں کیا۔" شاداں نے لالی کی

جانب سے تردید کی۔

"فیر' جیل کیوں گیا تھا؟"

"پر اب اس نے چوری ڈکیتی بالکل چھوڑ دی ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "کبھی ایسا گندا کام نہیں کرے گا۔ چوہدری' اس نے مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔ اب تو بالکل نیک بندہ بن گیا ہے۔ میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"اس کے وعدے کا کیا اعتبار۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "یہ ٹھیرا چور ڈکیت۔ میں شریف اور عزت دار زمین دار ہوں۔ ایسے سزا یافتہ اور جرائم پیشہ بندے کو اپنے پاس رکھ کر میں نے اپنی عزت خراب کرنی ہے؟"

لالی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ شاداں نے مسکرا کر کہا۔ "لے یہ تیرے پاس آگیا۔ تو خود اس سے گل بات کر لے۔"

رحیم داد نے لالی کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور جھپاک سے جیپ میں بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "چوہدری' میری گل تو سن۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ رحیم داد نے اس کے شور میں سنا۔ شاداں کہہ رہی تھی۔ "چوہدری' تو لالی سے تو مل لے۔" رحیم داد نے مڑ کر اس کی جانب نہ دیکھا۔ گردن اونچی کیے سامنے دیکھتا رہا۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔

لالی نے شاداں سے پوچھا۔ "یہ کون تھا؟"

"یہ اپنا چوہدری نور الٰہی ہے۔" شاداں نے بتایا۔ "گورداسپور کا مہاجر ہے۔ پر آج کل منٹگمری میں ہوتا ہے۔ کوٹلہ ہرکشن کا وڈا زمیں دار ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی تجھ سے گل بات کی تھی۔ یاد ہے ناں' تو کی پر بھی یہ نظر آیا تھا۔"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "یہ چوہدری نور الٰہی ہے۔" وہ گردن اٹھا کر جیپ کی طرف دیکھنے لگا۔

جیپ فراٹے بھرتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دور نکل گئی۔ شاداں اور لالی سڑک کے کنارے کھڑے کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کی جیپ دیکھ رہے تھے' جو گرد و غبار کے بگولے اڑاتی رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

۴۶

تیموں کے ایک بھٹے پر لالی اور شاداں، مٹی کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہے تھے۔ لالی صرف دھوتی باندھے ہوئے تھا جس پر جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ چلچلاتی دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے سر پر پگڑی تھی۔ پگڑی بھی دھوتی کی طرح بوسیدہ اور میلی کچیلی تھی اور بے ترتیبی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کی رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

لالی کے قریب ہی شاداں اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دھوپ اور گرد سے مٹیالے پڑ گئے تھے۔ بالوں کی بے ترتیب لٹیں ہوا کے جھونکوں سے اڑ اڑ کر چہرے پر آجاتیں جن کو وہ مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھوں سے بار بار ہٹا کر سر کے پیچھے لے جانے کی کوشش کرتی۔ اس کا چہرہ سورج کی تیز کرنوں سے جھلس کر تانبے کی طرح دہک رہا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی تھی اور ہونٹ خشک پڑ گئے تھے۔

دونوں کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ وہ رک رک کر پیشانی پر بکھرے ہوئے پسینے کے قطرے کو پونچھتے۔ ہاتھوں کو پھرتی سے چلاتے۔ لوہے کے سانچوں میں گارا بھر بھر کا اینٹیں تیار کرتے۔ ان پر بھٹے کے ٹریڈ مارک کا نشان ڈالتے، ٹھکتے، پہلو بدلتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کو نہ گرمی کی شدت کا احساس تھا نہ بھوک پیاس کا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اینٹیں تیار کرنے کی دھن میں مگن تھے۔

سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ آسمان غبار آلود تھا۔ زمین سے گرمی کے بھبکے اٹھتے تھے۔ لو کے گرم گرم جھکڑ چلتے تھے۔ دھوپ کی تمازت سے جسم پگھلتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی گول چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

فیروز پور روڈ کے کئی میل کے علاقے میں جگہ جگہ بھٹوں کی اونچی نیچی چمنیاں تھیں جو دور سے نظر آتی تھیں۔ کچھ چمنیاں پختہ تھیں کچھ لوہے کی معمولی چادروں کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ چمنیوں کے دامن میں وسیع میدان تھے جن میں بڑے بڑے گڑھے تھے۔ ان گڑھوں سے پتھیرے زمین کھود کو مٹی نکالتے۔ مٹی میں ضرورت کے مطابق پانی ملاتے' پھاوڑے اور ہاتھوں کی مدد سے اسے آٹے کی طرح گوندھ کر گارا تیار کرتے' گارے کو سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کرتے۔

پتھیروں میں کڑیل جوان' بوڑھے' بچے اور عورتیں سب ہی شامل تھے۔ پورے پورے کنبے اور خاندان تھے۔ دوسری ذات برادریوں کے علاوہ ان میں شیخ' مصلی اور عیسائی زیادہ بڑی تعداد میں تھے۔ بیشتر بھاول پور کے رہنے والے تھے جن کو ریاستی کہا جاتا تھا۔ یہ خاندانوں کی صورت میں کام کرتے۔ یہ پتھیرے نہ صرف پنجاب کے دور دراز علاقوں کے بھٹوں پر اینٹیں تیار کرتے۔ بلکہ بلوچستان بھی جاتے جہاں کوئٹہ کا وہ مشہور بھٹہ ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اینٹیں تیار کرنے کا سب سے بڑا بھٹہ ہے۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر پتھیروں کے سدھے ہوئے ہاتھ مشینوں کی طرح تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کے سامنے ہموار زمین تھی جس پر دور تک ریت بچھی تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں ریت چاندی کے تاروں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ اینٹیں سانچوں سے نکل نکل کر ریت کے اس چمکتے دمکتے فرش پر قطاروں میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ یہ کچی اینٹیں تھیں۔

اینٹیں دھوپ میں سوکھ کر سخت ہو جاتیں تو چٹے بنا کر ان کی گنتی کی جاتی۔ گنتی کے بعد چٹوں پر گیلا چونا اس طرح چھڑک دیا جاتا کہ گنتی میں دوبارہ شامل کرانے کے لیے کوئی پتھیرا ہیرا پھیری نہ کر سکے۔ کمہار ان اینٹوں کو چٹوں سے نکال نکال کر گدھوں پر لادتے یا ریڑھوں کے ذریعے بھٹوں تک پہنچاتے۔ بھرائی کرنے والے مزدور ان کو اٹھا اٹھا کر بھٹوں کے اندر اس مہارت سے چن دیتے کہ آگ تمام اینٹوں کو ایک ساتھ پکا کر سرخ کر دے۔ جب کچی اینٹیں چن دی جاتیں تو جلائی کا کام کرنے والے آگے بڑھتے اور لکڑیاں اور کوئلے سلگا کر آگ روشن کر دیتے۔ سرخ سرخ انگارے دہکتے۔ شعلے بلند ہوتے اور بھٹوں کی چمنیاں گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اگلنے لگتیں۔

ہر بھٹے کی چمنی کے عین نیچے پختہ چبوترہ تھا جس پر ریت اور نرم مٹی بچھی تھی۔ اس چبوترے کو پتھیروں کی اصطلاح میں توا کہا جاتا ہے۔ توا رفتہ رفتہ سرخ پڑتا جاتا اور اس پر چنی ہوئی کچی اینٹیں دہکتے انگاروں کی تیز آنچ سے تپ کر ٹھوس اور پختہ بن جاتیں۔ پھر وہ مرحلہ آتا جب آگ بجھ جاتی۔

تو کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اینٹوں کی تپش کم ہو جاتی۔ تب بھٹوں سے اینٹیں نکالنے والوں کا کام شروع ہوتا۔ ان کے پیروں میں لکڑی کی کھڑاویں ہوتیں اور انگلیوں پر کپڑے کی پٹیاں لپٹی ہوتیں تاکہ پیر اور انگلیاں اینٹوں اور توے کی تمازت سے جھلس نہ جائیں۔

پختہ اینٹوں کو باہر نکالا جاتا۔ ایک بار پھر ریڑھوں اور ٹھیلوں میں بھرا جاتا اور میدان کے ایک گوشے میں ترتیب سے لگا کر چٹے بنا دیئے جاتے۔ توے کے اوپر سے سرخ سرخ راکھ ہٹا کر حصّہ صاف کر دیا جاتا۔

☆

تیموں کے بھٹے پر اینٹیں تیار کرنے والے اپنے اپنے کام میں جٹے تھے۔ لالی اور شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کے سامنے کچی اینٹوں کی قطاریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ گارا کم ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اینٹوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

گارا ختم ہو گیا۔ مگر شاداں کام کرنے کے لیے مستعد تھی۔

"ہور گارا تیار کر۔" شاداں نے دوپٹے کے پلّو سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے لالی کو للکارا۔ "پھوڑا اٹھا فٹافٹ مٹی نکال۔ آج تو زیادہ ہی کام کرنا ہوگا۔ تو نے سویرے ہی سویرے مجھے جگا کر کیا کہا تھا۔ یاد ہے ناں؟"

"یاد ہے بالکل یاد ہے۔" لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "تھوڑا دم لینے دے۔" وہ پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔

شاداں نے منہ بگاڑ کر پھر ڈانٹا۔ "پوستی نہ بن۔ اٹھا پھوڑا۔" اس نے قریب پڑے ہوئے پھاوڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

لیکن لالی نہ اٹھا۔ دانت نکال کر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

اسی لمحے عقب سے آواز ابھری۔ "بھین جی، تھوڑا پانی مجھے پلا دے۔"

شاداں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان بتھیرن کچی اینٹوں کے نزدیک نڈھال بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کچیلے بال خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے بکھرے تھے۔ کیلشیم اور غذائیت کی کمی کے باعث چہرہ مرجھا کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔ سر کے بال بھورے ہو گئے تھے۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ اس کی جوانی سسک رہی تھی اور بڑھاپے کے سائے وقت سے پہلے ہی منڈلانے لگے تھے۔ اس کے سامنے میلے اور بوسیدہ کپڑے پر نصف روٹی رکھی تھی۔ روٹی کے ساتھ ہری مرچیں اور نمک کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تھیں۔

شاداں اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ فوراً اٹھی اور شیشم کے اس درخت کی جانب بڑھی جس کے نیچے پانی سے بھرا ہوا مٹکا رکھا تھا۔ وہ مٹکے کے پاس پہنچی۔ مٹی کے پیالے میں پانی بھرا اور اسے سنبھالے ہوئے اس عورت کے قریب گئی۔ پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پیالہ ہونٹوں سے لگا کر بے صبری سے غٹا غٹ پانی پینے لگی۔

وہ پانی پی چکی تو شاداں نے پوچھا۔ "ہور پانی چاہیے؟"

اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ پیالہ قریب ہی رکھ لیا۔ اس میں ابھی پانی موجود تھا۔ اس نے روٹی کا ٹکڑا توڑ کر لقمہ بنایا۔ منہ میں رکھا۔ مرچ اٹھا کر دانتوں سے کتری اور نمک کی ایک ڈلی منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔

شاداں نے پوچھا۔ "تیرا نام مریم ہے؟"

"ہاں!" اس نے لقمہ چباتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

شاداں نے اسے غور سے دیکھا۔

☆

کل دن ڈھلے شاداں جب لالی کے ساتھ اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی تو یکایک پتھیروں، کمہاروں، بھرائی اور جلائی کرنے والے مزدوروں کی ملی جلی آوازوں کے شور میں نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ شاداں جھٹ اس طرف متوجہ ہوئی۔ دیکھا ایک نوجوان عورت کچی اینٹوں کی قطاروں کے پاس زمین پر پڑی بے قراری سے پہلو بدل رہی ہے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے پتھیروں میں سے چند عورتیں اٹھیں۔ جھپاک سے قریب پہنچیں۔ سروں سے چادریں اتاریں اور اس کے چاروں طرف چادروں کا پردہ تان کر کھڑی ہو گئیں۔

شاداں بھی گھبرا کر وہاں پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک پتھیرن نے بچہ جنا ہے۔ بچہ چادروں کے حصار کے اندر ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بوڑھی عورت، پتھیروں کی جھونپڑیوں کی جانب سے نمودار ہوئی۔ نزدیک پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ اسے سنبھالے ہوئے وہ چادروں کے پیچھے گئی۔ چھری سے نال کاٹی۔ بچے کو علیحدہ کیا۔ ذرا ہی دیر بعد زچہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لال لال گوشت کا لوتھڑا، نوزائیدہ بچہ، اس کے ہاتھوں میں کلبلا رہا تھا۔ زچہ ایک عورت کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

یہ زچہ مریم تھی اور شاداں کے سامنے بیٹھی ہری مرچ اور نمک کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی۔ وہ دوسرے پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ہی صبح کام پر آ گئی تھی۔ اور مٹی

کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ سے اس کا جسم پگھل رہا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ "تو نے کل ہی بچہ جنا ہے اور آج کام پر بھی آگئی؟"

"لگتا ہے تو نے بھٹے پر نیا نیا کام شروع کیا ہے۔" مریم کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ادھر رہے گی تو پتہ چل جائے گا کیا کیا ہوتا ہے۔ کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔"

"پر تجھے کچھ روز آرام تو کرنا ہی چاہیے۔" شاداں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "ایسے تو بیمار پڑ جائے گی۔ دیکھ تو کتنی کمزور لگ رہی ہے۔ جا کر آرام کر' کل آنا۔"

"آرام کرنے لگیں تو گزارہ کیسے ہو۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ "ویسے ہی خالی پیٹ رہنا پڑتا ہے۔ آرام کی سوچنے لگیں تو بھوک اور ننگ سے مر جائیں۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "ادھر رہے گی تو تجھے بھی ایسا ہی کرنا ہو گا۔" آرام شارام بھول جا۔"

مریم نے روٹی ختم کی۔ مٹی کا پیالہ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگی۔

"میں تو کبھی ایسا نہیں کروں گی۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"تیری بات دوسری ہے۔ پر ہم نے تو سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔" مریم کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "جتنا زیادہ کام کریں' اتنا ہی کم ہوتا ہے۔"

"تجھے اتنا زیادہ کام کیوں کرنا پڑتا ہے؟" شاداں کے لہجے میں تجسس تھا۔

"وہ ایسا ہے جی۔" مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ قریب سے مردانہ آواز ابھری۔ "مریم تو نے کام نہیں کرنا؟ باتیں ہی کرتی رہے گی۔"

شاداں نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ ایک بتیس تیرا تیکھی نظروں سے مریم کو گھور رہا تھا۔ شاداں نے مریم سے پوچھا۔ "یہ تیرا گھر والا ہے؟"

"ہاں!" مریم آہستہ سے بولی۔ اس نے مٹی کا پیالہ اٹھایا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوئی پانی کے مٹکے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچی' پیالہ پانی سے بھرا اور ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔ پیالہ مٹکے کے پر رکھا اور واپس آگئی۔

لالی' گارا بنانے کے لیے اب مٹی کھود رہا تھا۔

مریم اپنی جگہ بیٹھ کر اینٹیں بنانے لگی۔ اس نے شاداں کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ سر جھکائے مستعدی سے سانچوں میں گارا بھرتی رہی۔ شاداں اٹھ کر لالی کے پاس چلی گئی اور کھدی ہوئی مٹی میں پانی ملا کر گارا تیار کرنے لگی۔

مریم کے شوہر نے ڈپٹ کر کہا۔ ''مریم تیز ہاتھ چلا۔''

''چلا تو رہی ہوں۔'' مریم نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''عنایت' مجھے تنگ نہ کر۔ تجھے پتہ ہے' میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''مجھے پتہ ہے' سب پتہ ہے۔'' عنایت مسیح نے نظریں اٹھا کر بیوی کی طرف نہ دیکھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ سانچوں میں گارا بھر بھر کر اینٹیں بناتے رہے۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں رک رک کر بولتا رہا۔ ''پر مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ شام کو چھنا بٹے گا۔''

''مجھے بھی پتہ ہے۔ تب ہی تو سویرے ہی سویرے کام پر آ گئی۔'' مریم کے لہجے میں ہنوز گلہ شکوہ تھا۔ ''نکے کو صرف ایک بار دودھ پلانے گئی تھی۔ بار بار اس کے رونے کی آواز سنتی ہوں۔ پر کام چھوڑ کر اس کے پاس نہیں گئی۔'' وہ اپنے نوزائیدہ بچے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ''بھوک سے رو رہا ہے۔ شور مچا رہا ہے۔''

''تو نے شیماں کو بھی ادھر نکے کے پاس چھوڑ رکھا ہے۔'' عنایت مسیح نے مریم کو یاد دلایا۔ ''اس کا کام بھی تو ہم نے ہی کرنا ہو گا۔''

''شیماں کو ادھر نہ چھوڑتی تو نکا اکیلا رہ جاتا۔ کسی کو تو اس کے پاس رہنا ہی چاہیے۔'' مریم نے صفائی پیش کی۔ ''ویسے چار سال کی شیماں کتنا کام کر سکتی ہے۔''

''یہ جو سارے ذرا ذرا سے نکے اور نکیاں ہیں' ان کو دیکھ رہی ہے۔'' عنایت نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا اور ان کم سن اور نو عمر بچوں اور بچیوں کی جانب اشارہ کیا جو عورتوں اور مردوں کے ساتھ طرح طرح کے کام کر رہے تھے۔ ''یہ کھیل تماشا تو نہیں کر رہے۔ کام ہی تو کر رہے ہیں ناں؟''

''تو چاہتا ہے شیماں کو بھی ادھر کام پر لگا لیتی۔ نکے کو ادھر اکیلا چھوڑ دیتی تاکہ روتے روتے اس کا مرن ہو جائے۔'' مریم نے جھنجلا کر عنایت کی جانب دیکھا۔ ''یہی چاہتا ہے ناں؟''

''میں تو یہ جانتا ہوں کام کم ہوا تو نہ تجھے کھانے کو ملے گا نہ نکے کو۔'' عنایت مسیح کے سدھے ہوئے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ اس کے ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ بدن پر گوشت اس قدر کم تھا کہ جگہ جگہ سے ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل کام کرتا رہا اور بولتا رہا۔

''آگے کی سوچ مریم' آگے کی۔''

''سوچتے سوچتے میرا تو مگز فر گیا۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''تجھے پتہ ہے ہماری دہاڑی تو پیشگی میں کٹ جاتی ہے۔ ملتا ہے کیا ہے؟ زیادہ کام نہیں کرے گی

تو ہفتہ کیسے گزرے گا؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "منشی، میرا یا تیرا چاچا یا ماماں تو ہے نہیں۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرے گا۔ ایک ایک پیسہ کاٹ لے گا۔"

عنایت مسیح جن اندیشوں اور وسوسوں سے سہا ہوا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد کھل کر سامنے آگئے۔ وہی ہوا جو اس نے مریم سے کہا تھا۔

☆

یہ ہفتے کی شام تھی۔ پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے دوسرے محنت کشوں کا چِٹھا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ان کو ہفتے بھر کی محنت کی اجرت ادا کی جا رہی تھی۔ بھٹے کے مالک، میاں اسلم کا منشی، ایک بوسیدہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے لکڑی کی بھدی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ قریب ہی دھندلی سی لالٹین تھی۔ میز کے اردگرد پتھیرے، کمہار، بھرائی کرنے والے اور دوسرے مزدور نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔

منشی کے سپاٹ چہرے پر سنجیدگی سے زیادہ خشونت تھی۔ آنکھوں سے بے مہری جھلکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی عینک درست کرتا۔ رجسٹر کے اوراق پلٹتا۔ لالٹین کی زرد زرد روشنی میں نظریں جھکا کر ان کو دیکھتا۔ وہ پتھیروں کا چِٹھا تقسیم کر رہا تھا۔ رجسٹر کے مندرجات کا غور سے جائزہ لینے کے بعد وہ نظریں اٹھاتا۔ اونچی آواز سے نام پکارتا۔ نام سنتے ہی مطلوبہ پتھیرا اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور منشی کے روبرو پہنچ جاتا۔ وہ پتھیرے کے انگوٹھے پر روشنائی لگاتا۔ اس کا ہاتھ پکڑتا۔ قریب لاتا اور رجسٹر کے کھلے ہوئے ورق پر پتھیرے سے انگوٹھے کا نشان لگواتا۔ معاوضے کی رقم گن کر اس کے حوالے کر دیتا۔ کوئی پتھیرا معاوضے کی رقم لینے کے بعد اعتراض کرتا یا بے اطمینانی کا اظہار کرتا تو وہ بے زاری سے اسے معاوضے کی تفصیل بتا دیتا۔ مزید حجت کرتا تو غصے سے جھڑک دیتا۔

وہ پتھیروں کے نام پکارتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا پتھیرا اس کے سامنے پہنچتا رہا اور اپنا معاوضہ وصول کرتا رہا۔ منشی نے عنایت مسیح کا نام پکارا۔ وہ اٹھا اور جھٹ منشی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ منشی نے رجسٹر میں انگوٹھے کا نشان لگوایا اور دو روپے آٹھ آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

عنایت معاوضے کی رقم ہاتھ میں لیے چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ "سیں منشی، یہ تو بہت کم ہے۔ اس بار تو میں نے زیادہ ہی محنت کی ہے۔ دہاڑی بھی اتنی ہی ہونی چاہیے۔"

منشی نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اپنی عینک درست کی۔ جھک کر رجسٹر دیکھا اور طوطے کی طرح فر فر پڑھنے لگا۔

تعداد اینٹ	۶۲۲۵
فی ہزار پر بیس اینٹ کے حساب سے کٹوتی	۱۲۵
ٹوٹ پھوٹ	۱۰۰
کل اینٹ جس کی ادائیگی کی گئی	۶۰۰۰
دو روپے فی ہزار کی شرح سے چھے ہزار اینٹ کی اجرت	۱۲ روپے
ٹیڑھی دنگی اینٹوں پر کٹوتی	ایک روپے چار آنے
دو آنے فی ہزار کی شرح سے جمعداری	۱۲ آنے
وصولی پیشگی	۷ روپے ۸ آنے
کل اجرت	۲ روپے ۸ آنے۔

عنایت مسیح نے حساب کتاب کی پوری تفصیل سنی، مگر مطمئن نہ ہوا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "سیں منشی، تیرا حساب سمجھ نہیں آیا۔"

"وہ تو کبھی نہیں آئے گا۔" منشی نے بے رخی سے کہا۔ "تیرے اڑھائی روپے بنتے ہیں وہ تجھے مل گئے نا؟"

"وہ تو جی مل گئے۔" عنایت اب گڑگڑانے لگا۔ "پیشگی اس دفعہ کم کاٹ۔ سیں، تجھے پتہ ہے میری ذال نے کل ہی نکا جنا ہے۔"

"مجھ سے پوچھ کر جنا ہے؟" منشی نے اسے ڈانٹا۔ "خاما خا کی ٹرٹر نہ کر۔ مجھے ابھی دوسروں کو بھی چتھا بانٹنا ہے۔" اس نے مڑ کر حنیف ڈوگر کو دیکھا جو ہاتھ میں چمڑے کا چھتر دبائے کھڑا تھا۔ منشی نے اسے ہشکارا۔ "ڈوگر! اسے سنبھال۔ سیدھی گل بات اسے سمجھ نہیں آتی۔"

حنیف ڈوگر فوراً آگے بڑھا۔ اس نے عنایت مسیح کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ عنایت نے احتجاج کیا۔ "میرا بازو تو چھوڑ۔" مگر ڈوگر نے اس کا بازو نہ چھوڑا۔ کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ چھتر اٹھایا اور سڑاک سڑاک عنایت کی کمر اور پیٹھ پر مارنے لگا۔

عنایت مسیح نے کھا جانے والی نظروں سے حنیف ڈوگر کو دیکھا۔ نہ اس نے اپنی کمر اور پیٹھ کی چوٹ سہلائی نہ زبان سے کچھ کہا۔ خاموشی سے مڑا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی جھونپڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔

وہ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ دیکھا شاداں اس کی بیوی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ اس کا نوزائیدہ بچہ مریم کے سامنے پڑا تھا۔ شیماں جھونپڑی کے باہر بے خبر سو رہی تھی۔ چراغ کی دھندلی

دھندلی روشنی میں مریم کا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ مگر عنایت نے نہ شاداں کی جانب توجہ دی نہ بیوی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

مریم نے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے اور تیوری پر پڑے ہوئے بل دیکھے تو دم بخود رہ گئی۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”دہاڑی مل گئی؟“

”ہاں!“ عنایت نے تلخی سے جواب دیا اور ہاتھ میں دبی ہوئی ڈھائی روپے کی رقم حقارت سے اس کے سامنے پھینک دی۔ ”لے یہ رہی دہاڑی۔“

”کل اڑھائی روپے!“ مریم نے دو روپے اور اٹھنی اٹھاتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ”اتنا کم کیوں ملا؟“

”یہ جا کر منشی سے پوچھ۔“ عنایت نے تلخی سے کہا۔ ”آگے اتنا بھی نہیں ملے گا۔ تجھ سے کام ہو نہیں سکتا۔ شیماں کو تو نے ننکے کی دیکھ بھال پر لگا دیا۔ جتنا کم کام ہو گا دہاڑی اتنی ہی کم ملے گی۔“

”پر اب گزارہ کیسے ہو گا؟ پورا ہفتہ کیسے کٹے گا؟“ وہ دل گرفتہ ہو کر اپنی پریشانی بیان کرنے لگی۔ ”روٹی نہیں ملے گی تو ننکے کو دودھ کیسے پلاؤں گی۔“ بچے نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ ”بھوک سے رو رہا ہے۔“

وہ غصے سے چیخا۔ ”ایسا کر اس کا گلا گھونٹ دے۔“ بچہ اس کی اونچی آواز سن کر اور زور زور سے رونے لگا۔ عنایت مسیح مشتعل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ ”میں خود ہی اس کا گلا دبائے دیتا ہوں۔“ وہ تڑپ کر بچے کی جانب بڑھا۔

مریم جھپاک سے اٹھی اور عنایت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مگر وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کو دھکا دیا۔ وہ پہلے ہی نڈھال تھی۔ دھکے سے سنبھل نہ سکی۔ لڑکھڑاتی ہوئی دور جا کر گری۔ عنایت مسیح بچے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بچے کی جانب ہاتھ بڑھائے۔

شاداں بے قرار ہر کو چیخی۔ ”تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔“ وہ تیزی سے اٹھی اور عنایت کے دونوں کندھے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

عنایت مسیح نے پلٹ کر شاداں کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ شاداں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”اتنا ناراض نہ ہو۔ آرام سے گل کر، آرام سے۔“ اس نے عنایت کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی۔ عنایت خاموش رہا اور اپنی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ شاداں نے پیالہ اٹھایا۔ قریب رکھے ہوئے گھڑے سے اس میں پانی انڈیلا

پیالہ لے کر عنایت کے پاس گئی اور اس کے ہاتھ میں دے کر بولی۔ "لے پانی پی لے۔" عنایت پیالہ ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔

مریم ابھی تک فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔

شاداں نے دھوتی کے ڈب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور عنایت مسیح کی طرف بڑھا کر بولی۔ "لے اسے رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔"

"میں نے تیرے روپے نہیں لینے۔" عنایت نے انکار کر دیا۔ "میں تیرا ادھار ادا نہیں کر سکوں گا۔ پیشگی ہی اب تک ادا نہیں کر سکا۔ تیرا ادھار کیسے چکاؤں گا۔"

"جب تیرے پاس ہوں دے دینا۔ میں تجھ سے مانگوں گی نہیں۔" شاداں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "تو بالکل فکر نہ کر۔"

مریم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاداں کو منع کرنے لگی۔ "بھین جی' اپنے روپے واپس لے لے۔" وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ "تو نئی نئی آئی ہے۔ تجھے پتہ نہیں' ادھر کوئی کسی کو ادھار نہیں دیتا۔ ہوتا ہی نہیں' ادھار دیں کہاں سے۔"

"ابھی تو میرے پاس ادھار دینے کو ہے۔" شاداں مسکرا کر بولی۔ "جب نہیں ہو گا تو نہیں دوں گی۔ اب تو جھگڑا ختم کر۔"

مگر مریم نے جھگڑا ختم نہ کیا۔ اس نے غصے سے چیخ کر عنایت سے کہا۔ "تو نکے کا گلا دبا دے ضرور دبا دے۔ پر یہ بھی سوچ لے' اس کے کفن دفن کو کوئی ادھار نہیں دے گا۔ نہ منشی دے گا نہ مالک۔"

عنایت مسیح سر جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ مریم کی آواز ابھرتی رہی۔ "تجھے پتہ ہے' پچھلے جاڑے میں واحد کے پتر کا مرن ہوا تو کیا ہوا تھا۔ واحد' منشی کے پاس گیا۔ میاں صاحب کے پاس بار بار گیا۔ منت کی' زاری کی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا جب تک پیشگی ادا نہیں ہو گی کوئی ادھار نہیں ملے گا۔"

"میت کو اٹھانے کے لیے بھی کچھ نہیں دیا۔ ہائے ربا' وہ کیسا بندہ ہے۔" شاداں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مریم کو دیکھا۔

"تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب بہت زیادہ بو اٹھنے لگی تو ڈوگر آ کر واحد پر سخت گرم ہوا۔ گالاں نکالیں۔ چھتر تھام کر بار بار اسے مارنے کو جھپٹا۔" مریم بتاتی رہی۔ "واحد نے شام تک کفن

دفن کا وعدہ کیا۔ تب ڈوگر نے اسے چھوڑا۔ واحد ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ کسی نے کچھ دیا کسی نے انکار کر دیا۔ پر پورے سات روپے بھی اکٹھے نہ ہوئے۔ اس میں تو کفن بھی نہ آسکتا تھا۔"

"فیر لاش کا کیا بنا؟" شاداں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ویسے میونسپلٹی کی مردہ گاڑی لاش اٹھانے آگئی تھی۔" اس دفعہ عنایت مسیح نے جواب دیا۔ "پر شام ہونے سے پہلے پہلے میاں صاحب کے حکم پر منشی ۱۵ روپے لے کر پہنچ گیا تھا۔"

"اب یاد آیا تجھے۔" مریم نے تیکھے لہجے میں کہا۔ پھر وہ شاداں کی جانب متوجہ ہوئی۔ "ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ کئی بار ہو چکا ہے۔ تجھے کیا پتہ ادھر کیا کیا ہوتا ہے۔"

مریم کی باتیں سن کر شاداں پریشان ہو گئی۔ اسی عالم میں وہ لالی کے پاس پہنچی۔

☆

لالی اپنی جھونپڑی کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ایک ادھیڑ ٹھیرا بھی بیٹھا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

لالی نے شاداں کو دیکھا تو تعجب سے پوچھا۔ "تو اب تک کدھر تھی؟" اس نے پاس بیٹھے ہوئے ٹھیرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ باری ہے۔ پرانا ٹھیرا ہے۔ تیرے بارے میں بار بار پوچھ رہا تھا۔"

"کیا پوچھ رہا تھا تو؟" شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"ناراض نہ ہو۔" باری نے صفائی پیش کی۔ "تو جوان رن ہے۔ تجھے رات کو اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے۔"

"تیرا مطلب ہے کوئی مجھے اٹھا کر لے جائے گا۔" شاداں کے لہجے میں بدستور جھنجلاہٹ تھی۔

"آہستہ بول آہستہ۔" باری نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

"تجھے پتہ نہیں شاداں۔" لالی نے دبی زبان سے بتایا۔ "باری کی ایک دھی میاں صاحب نے اپنے پاس رکھ چھوڑی ہے۔ دوسری ڈوگر کے پاس ہے۔ ایک ۱۲ سال کی ہے دوسری ۱۰ سال کی۔ باری مجھے تیرے آنے سے پہلے یہی بتا رہا تھا۔"

"باری تو نے ان کو واپس لانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟" شاداں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"غریب ٹھیرا ہوں کیا کر سکتا ہوں؟" باری نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ادھر تو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" شاداں نے اس کی تائید کی۔ "ادھر تو کوئی کسی سے کُھل بات نہیں کرتا۔ سب چپ چپ رہتے ہیں۔ پوچھو تو بتاتے بھی نہیں۔ ایسے دیکھتے ہیں جیسے سنا ہی نہیں۔"

"سب میاں اسلم اور اس کے کرندوں سے ڈرتے ہیں۔ کرندے تو شکاری کتوں کی طرح جھپٹتے ہیں۔ ایسی زبردست مار لگاتے ہیں کہ میرا جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔" باری نے دھیمے لہجے میں اپنا دکھ درد بیان کیا۔ "میں تو جنم جنم کا پتھیراں ہوں۔ میرا پیو بھی پتھیرا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے مجھے بھی بھٹے پر لگا دیا تھا۔ میں نے سارے ہی بھٹوں پر کام کیا ہے۔"

"میاں اسلم ہمیشہ سے ہی اس بھٹے کا مالک ہے؟" لالی نے سوال کیا۔

"نا جی۔ میں تو اسے برسوں سے جانتا ہوں۔" باری نے کہا۔ "بھٹوں کے مالک سب ہی ہندو ہوتے تھے۔ لالہ سرل چند اور امرناتھ سب سے زیادہ بھٹوں کے مالک تھے۔ میاں اسلم تو لالہ سرل چند کا منشی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے منشی گیری کرتے دیکھا ہے۔ پاکستان بنا تو سرل چند بھی دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھاگ کر امرتسر چلا گیا۔"

"میاں اسلم پہلے منشی ہوتا تھا؟" شاداں کے لہجے میں استجاب تھا۔

"ہاں جی، لالہ سرل چند کا منشی تھا اور بہت وفادار منشی تھا۔" باری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شروع شروع میں تو چوری چھپے لالہ سرل چند کو بھٹے کی آمدنی کے ہزاروں روپے بھی پہنچاتا رہا۔ بعد میں مالک بن بیٹھا۔ تجھے پتہ ہے، اب تو میاں اسلم کے کئی بھٹے ہوتے ہیں۔"

"پہلے بھی بھٹوں پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ پتھیروں کو اسی طرح تنگ کیا جاتا تھا؟" اس دفعہ لالی نے پوچھا۔

"دہاڑی تو کم ملتی تھی۔ ایک ہزار اینٹ بنانے کے چوداں آنے سے ایک روپیہ تک ملتا تھا۔ تب اتنی مہنگائی بھی نہیں تھی۔" باری بتاتا رہا۔ "جمعداری دو پیسے ہزار اینٹ پر کٹتی تھی۔ پر ہر ہفتے ایک من لکڑی، مٹی کا تیل اور گڑ دیا جاتا تھا۔" اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ "ہاں، ہزار اینٹ پر اسی طرح ۲۰ اینٹوں کی کٹوتی ضرور ہوتی تھی۔"

"پر اب تو نہ لکڑی ملتی ہے نہ تیل نہ گڑ۔ جمعداری بھی زیادہ ہو گئی ہے۔" شاداں نے تبصرہ کیا۔ "پتھیرے لکڑی، تیل اور گڑ کیوں نہیں مانگتے؟"

"شروع شروع میں ملتا تھا۔ جب بند ہوا تو پتھیروں نے رولا کیا۔ پر ان کو ایسی کڑی سزائیں دی گئیں، ایسی مار لگائی گئی کہ سب چپ کر کے بیٹھ گئے۔" باری نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ "اب تو ایسا ڈر اور خوف ہے کہ کڑیاں اور زنانیاں بھی اٹھائی جائیں تب بھی کچھ نہیں کرپاتے۔"

"ایسی گل نہ کر۔ باری تیری تو غیرت مر گئی ہے۔" لالی نے جھنجلا کر طعنہ دیا۔

باری نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت حنیف ڈوگر کی آواز ابھری۔ وہ کسی پتھیرے یا بھٹہ مزدور پر برس رہا تھا۔ گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ڈوگر کی آواز سنتے ہی باری کے چہرے سے غصہ غائب ہو گیا۔ وہ سراسیمہ ہو گیا۔ خاموشی سے اٹھا اور اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

حنیف ڈوگر ایک جھونپڑی کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ لالی اور شاداں ہی کی جانب آرہا تھا۔

حنیف ڈوگر کے ہم راہ دو کارندے بھی تھے۔ دونوں ہی مسلح تھے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خشونت تھی۔ آنکھوں سے سفاکی جھلکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ زور زور سے کھنکارتے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی ہر آواز اور ہر آہٹ ختم ہو گئی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ کھانس رہا تھا۔ بھٹے کا وسیع میدان دفعتہً قبرستان کی طرح سنسان ہو گیا تھا۔

ڈوگر کے ہاتھ میں اس وقت بھی چمڑے کا چھتر دبا تھا۔ وہ بھی میاں اسلم کا کارندہ تھا۔ قابل اعتماد تھا اور محرم راز بھی تھا۔ اس کا کام بھٹے کی نگرانی کرنا تھا۔ بھٹے پر کام کرنے والے پتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ ان کو پوری طرح قابو میں رکھنا اور ضرورت کے مطابق بھٹے کے لیے پتھیرے اور مزدور فراہم کرنا بھی تھا۔

کوئی پتھیرا یا بھٹہ مزدور سرکشی کرتا یا ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کرتا تو ڈوگر اس کے جسم پر چھتر مارنا شروع کر دیتا۔ ہنگامہ کرنے والے اگر تعداد میں زیادہ ہوتے تو وہ مسلح کارندوں کے ساتھ ان پر دھاوا بول دیتا۔ مار مار کر ان کو لہولہان کر دیتا۔ طرح طرح کی سزائیں دیتا۔ کسی کی داڑھی کٹوا دیتا کسی کو چمنی کے دہکتے ہوئے توے پر برہنہ پا کھڑا کر دیتا۔ کسی کو درخت سے الٹا لٹکا کر مرچوں کی دھونی دیتا۔ ہر پتھیرا اور ہر بھٹہ مزدور اس کے نام سے تھرّاتا تھا' لرزتا تھا۔ اس کے سامنے نظریں اٹھا کر بات کرنے کی جرات نہ کرتا تھا۔

بھٹے پر جب کام زیادہ ہوتا تو حنیف ڈوگر پتھیروں اور دوسرے مزدوروں کی بھرتی کے لیے میاں اسلم کے حکم پر نکلتا۔ بستی بستی' گاؤں گاؤں گھومتا پھرتا۔ ایسے کسانوں کو تلاش کرتا جن کے پاس کھیتی باڑی کے لیے زمین نہ ہوتی۔ جو کھیت مزدور ہوتے یا زمین داروں کے ہاتھوں بے دخل ہونے

والے بے روزگار اور پریشان حال مزارعے ہوتے۔ ان کو وہ کم سے کم اجرت پر بھرتی کرتا۔ ان کی مجبوری اور زبوں حالی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ ہنگامی حالات اور فوری ضرورت کی صورت میں وہ زیادہ اجرت پر بھی پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کو بھرتی کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ میاں اسلم نے اسے ایسے اختیارات بھی دے رکھے تھے۔

پتھیروں اور مزدوروں کو بھرتی کرنے کے بعد وہ ریل گاڑی یا لاری سے جتھوں کی صورت میں بھٹے پر پہنچاتا۔ مگر ایک بار بھٹے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی کی جاتی۔ اگر کوئی پتھیرا یا مزدور کسی اشد ضرورت کے تحت اپنے آبائی گاؤں یا عزیز و اقارب کی غمی یا خوشی میں شرکت کرنے کے لیے جانا چاہتا تو عام طور پر اسے اجازت ہی نہ ملتی اور ملتی بھی تو اس شرط پر کہ اس کے بال بچوں کو یرغمال بنا کر رکھا جاتا۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ کوئی پتھیرا اس قید و بند سے گھبرا کر فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ پکڑا جاتا تو اسے کڑی سزا دی جاتی۔ رات کو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں زنجیریں ڈال کر قید کر دیا جاتا۔ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو ڈوگر اس کی تلاش میں نکلتا۔ اس کا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ اور ایک روز اچانک چھاپہ مار کر اسے پکڑ لیتا۔ پولیس اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی۔ بھٹے تک پہنچانے میں ہر طرح کی مدد کرتی اور اس کے صلے میں نقد محنتانہ وصول کرتی۔

حنیف ڈوگر ہرچند کہ میاں اسلم کا کارندہ تھا۔ نہایت وفادار تھا۔ حامی اور مددگار بھی تھا۔ اس کے لیے ہر جائز اور ناجائز کام کرنے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا تھا۔ وہ کسی دوسرے بھٹے کے لیے نہ کام کر سکتا تھا نہ اس سے کوئی تعلق رکھ سکتا تھا۔ مگر اس تمام کارگزاری اور جانثاری کے باوجود اس کی حیثیت ایک ٹھیکیدار سے زیادہ نہ تھی۔ اسے نہ کوئی تنخواہ ملتی تھی نہ کمیشن ملتا تھا اور نہ کسی قسم کا بھتہ یا الاؤنس۔

اسے صرف جمعداری ملتی تھی۔ یہ جمعداری ہر ہزار کچی اینٹ پر مقرر تھی۔ ہر ہفتے جب چٹھا پاٹا جاتا تو پتھیروں کو اجرت ادا کرنے سے پہلے ہی جمعداری کی رقم کاٹ لی جاتی۔ کوئی پتھیرا نہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا تھا نہ اعتراض۔ جمعداری کی ادائیگی ایک تسلیم شدہ ضابطہ تھا جو سالہا سال سے رائج تھا۔ اتنا قدیم تھا کہ کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ کب رائج ہوا اور کس نے رائج کیا۔

پتھیروں کی فی ہزار کچی اینٹ کی اجرت میں اضافہ ہوتا تو جمعداری میں بھی اضافہ ہوتا۔ لیکن جمعدار کو چونکہ بھٹہ مالک کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہوتی تھی، لہٰذا ہر بار جب پتھیرے اپنی اجرت بڑھانے کے لیے آواز بلند کرتے اور اپنی اجرت بڑھانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو

جمعداری میں اجرت کے تناسب سے کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو جاتا۔

حنیف ڈوگر کو ان دنوں ہر ہزار کچی اینٹ پر دو آنے جمعداری مل رہی تھی۔ مگر وہ اپنی جمعداری میں اضافہ کرانے کے لیے پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں پر ہر طرح کا ظلم و ستم ڈھا رہا تھا تاکہ میاں اسلم پر اپنی زیادہ سے زیادہ وفاداری اور خیر خواہی کا سکہ بٹھا سکے۔ اس کی خوشنودی اور اعتماد حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھٹے کے لیے سستے اور جفاکش پتھیرے بھی مہیا کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

یہ میاں اسلم کی مرضی پر تھا کہ کسی پتھیرے کو کب تک بھٹے پر رکھا جائے اور کب علیحدہ کر دیا جائے۔ مگر وہ کسی بھی صورت میں ان کو آزاد نہ کرتا تھا۔ کاروبار میں مندی ہوتی تو وہ ان کو دوسرے بھٹوں کے مالکان کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں باقاعدہ مول تول ہوتا۔ موسمی حالات اور رسد و طلب کی روشنی میں بھاؤ طے کیا جاتا اور جب سودا پٹ جاتا تو مویشیوں کے ریوڑ کے طرح ان کو خریدار کے حوالے کر دیا جاتا۔

ہر بھٹے کا مالک پتھیروں کا اسی طرح لین دین کرتا تھا۔ حالانکہ بھٹوں کے مالکان میں سخت کاروباری رقابت تھی اور کبھی کبھی تو یہ رقابت اتنی شدید ہو جاتی کہ مسلح تصادم بھی ہوتے۔ مقدمے بازی ہوتی اور برسوں چلتی۔ مگر پتھیروں کے معاملے میں وہ ایک دوسرے سے ہر طرح کا تعاون کرتے۔ کوئی پتھیرا فرار ہو کر کسی دوسرے بھٹے پر پہنچ جاتا تو اسے گرفتار کر کے فوراً اس کے مالک کے پاس پہنچا دیا جاتا۔ بھٹوں کے مالک ضرورت کے مطابق پتھیرے خریدتے بھی تھے اور فروخت بھی کرتے تھے۔

خرید و فروخت کے اس کاروبار میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کے خاندان بکھر جاتے۔ شوہر ایک بھٹے پر ہوتا تو بیوی کسی دوسرے پر۔ باپ کہیں ہوتا بیٹا کہیں اور۔ جب وہ بچھڑ کر بکھر جاتے تو ایک دوسرے کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ کون کہاں ہے؟ کس بھٹے پر کام کر رہا ہے؟ کس شہر میں ہے، کس علاقے میں ہے؟ یہاں تک کہ آمنے سامنے یا قریب کے بھٹے پر کام کرنے کے باوجود وہ مہینوں بے تعلق اور بے خبر رہتے اور اگر کسی دوسرے شہر کے بھٹے پر لگا دیئے جاتے تو برسوں ایک دوسرے سے جدا رہتے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتے۔

پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کی خرید و فروخت کی بنیاد، بھٹہ مالکوں کی اصطلاح میں پیشگی ہوتی تھی۔ پیشگی کی صورت یہ ہوتی کہ جب پتھیروں یا بھٹہ مزدوروں کو بھرتی کیا جاتا تو عام طور پر وہ بالکل قلاش ہوتے۔ ان کے بدن پر لباس کے بجائے چیتھڑے ہوتے۔ مسلسل فاقہ کشی

سے نیم جاں ہوتے۔ وہ بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر ہی اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ بیشتر مقروض بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ قرض کی ادائیگی اور فوری ضروریات کے لیے بھرتی کے وقت بھٹہ مالکان کی جانب سے پتھیروں کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی۔ یہ ایسا قرض ہوتا جو قسطوں میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کی اجرت سے کٹتا رہتا۔

قرض دینے کا یہ طریقہ کار قیام پاکستان سے قبل ہندو بھٹہ مالکان نے رائج کیا تھا۔ مگر سود در سود کی بنیاد پر وہ پتھیروں کو قرض کے جال میں اس طرح جکڑ دیتے تھے کہ کم ہونے کے بجائے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔

قرض میں اس اضافے کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ ہر ہفتے چٹھا بانٹتے وقت پتھیروں کی اجرت سے پیشگی رقم کی جو قسط کاٹی جاتی وہ حساب کتاب کے رجسٹر میں کم اور اکثر سرے سے درج ہی نہیں کی جاتی۔ پتھیرے اور بھٹہ مزدور ان پڑھ اور جاہل ہوتے۔ انھیں مطلق خبر نہ ہوتی کہ رجسٹر میں ان کے نام کے خانے میں کتنی رقم کا اندراج کیا گیا اور آیا کیا بھی گیا کہ نہیں۔

منشی ان کے ان پڑھ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا اور مالک کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کارگزاری دکھانے کی کوشش کرتا۔ اس کارگزاری کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پیشگی کا سلسلہ ایک بار شروع ہوتا تو کبھی ختم نہ ہوتا۔ پتھیرے اور بھٹہ مزدور مالکان کی ایک طرح سے ذاتی ملکیت بن جاتے۔ ملک تقسیم ہوا۔ آزاد ہوا۔ مگر ہندو بھٹہ مالکان نے پیشگی کا جو طریقہ کار رائج کیا تھا' اسی طرح برقرار رہا۔ اس میں سرمو فرق نہ آیا۔ بلکہ اس پر پہلے کی بہ نسبت زیادہ سختی سے اس طرح عمل درآمد کیا جاتا کہ پیشگی کا طریقہ کار کھلی دھاندلی بن گیا۔

لالی نے بھی بھٹے پر کام شروع کرنے سے قبل تین سو روپے پیشگی لیے تھے حالانکہ اسے اتنی رقم کی ضرورت نہ تھی۔ شاداں کے پاس کچھ کم پچاس روپے موجود تھے۔ ان سے وہ کام چلا سکتا تھا مگر حنیف ڈوگر کے اصرار کرنے پر اس نے بھی دوسرے پتھروں کے ساتھ پیشگی وصول کرلی تھی۔ بعد میں بھی ڈوگر کا رویّہ اس کے ساتھ دوستانہ رہا۔ بات کرتا تو لہجے میں نرمی اور شگفتگی ہوتی اس شفقت اور سرپرستی کو نہ صرف اس نے محسوس کیا بلکہ دوسرے پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں نے بھی محسوس کیا تھا۔ لالی اس کی اس قدر مہربانی کا مقصد ہنوز سمجھ نہ سکا تھا۔ وہ اس سے خائف تھا اور کتراتا بھی تھا۔ اس لیے کہ بھٹے پر کام کرنے والے سارے ہی پتھیرے اور محنت کش ڈوگر سے شدید نفرت کرتے تھے۔

☆

حنیف ڈوگر اپنے مسلح گرگوں کے ساتھ آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ گیا اس نے شاداں کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ گھبرا گئی۔ دوپٹہ کھینچ کر سر ڈھک لیا۔ نظریں جھکا کر فرش کو خاموشی سے تکنے لگی۔

لالی نے اٹھ کر ڈوگر کو سلام کیا۔ پوچھا۔ "جمعدار کیسے آنا ہوا ہے؟"

"تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی تھی۔" حنیف ڈوگر نے اس وقت بھی مسکرا کر شفقت کا اظہار کیا۔ "آ میرے ساتھ۔"

"صبح بات نہیں ہو سکتی۔" لالی نے ٹالنا چاہا۔ "اب تو مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ کام بھی زیادہ ہی کیا تھا۔"

"سو جانا۔ میں نے تجھے زیادہ دیر نہیں روکنا۔"

"جیسی تری مرضی۔" لالی مزید انکار نہ کر سکا۔

حنیف ڈوگر نے دونوں مسلح کارندوں کو گشت پر روانہ کر دیا اور لالی کے ہم راہ جھونپڑیوں کے قریب سے گزرنے لگا۔ وہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر چلتے رہے اور گہرے گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ ان کے سامنے ایک کشادہ کوٹھری تھی جس پر ٹین کا سائبان تھا۔

سائبان کے نیچے دیسی شراب کشید کرنے کی بھٹی تھی۔ جنوبی دیوار میں طاق تھا۔ اس میں لالٹین رکھی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ صرف دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ کوٹھری میں گرمی اور امس تھی ان کے چہروں اور پیٹھ پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ شراب کشید کر رہے تھے۔ ہر طرف تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا تھا۔ حنیف ڈوگر اندر داخل ہو گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ شراب کشید کرنے والوں نے مڑ کر ڈوگر اور لالی کو دیکھا۔ اونچی آواز سے سلام کیا۔ لالی کو بھٹی کے بارے میں سن گن مل چکی تھی۔ مگر پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے بھٹی کی اس نلکی کو دیکھا جس سے قطرہ قطرہ شراب ٹپک رہی تھی اور نلکی کے نیچے رکھے ہوئے ایک پیپے میں جمع ہو رہی تھی۔

خالی اور شراب سے بھرے ہوئے کئی پیپے کوٹھری کے ایک گوشے میں رکھے تھے۔ شراب سے بھری ہوئی چند بوتلیں بھی تھیں۔ ڈوگر نے مسکرا کر لالی کی جانب دیکھا۔ پوچھا۔ "پینی ہے؟"

"نہیں جی، میں ایسا کام نہیں کرتا۔" لالی نے صاف انکار کر دیا۔

"جیسی تیری مرضی۔" ڈوگر نے اصرار نہ کیا۔ اس کے منہ سے بھبکے نکل رہے تھے۔ آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ "میں نے تو شام ہی کو اپنا کوٹا پورا کر لیا تھا۔"

لالی خاموش کھڑا رہا۔ حنیف ڈوگر بھٹی کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ گرمی اور حبس سے اس کے ماتھے پر بھی پسینے کے قطرے جھلملانے لگے تھے۔ وہ باہر نکلا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ باہر آ گیا۔ تازہ ہوا میں ان کو سکون ملا۔ ہوا کے جھونکے ٹھنڈے اور خوشگوار محسوس ہوئے۔ دونوں آگے بڑھے۔ شراب کشید کرنے کی بھٹی سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر بھٹے کا دفتر تھا۔ اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ دفتر کے دروازے پر اس وقت قفل پڑا تھا۔

دفتر سے منسلک پختہ کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی مقفل تھا اور صرف میاں اسلم کی آمد پر کھلتا تھا۔ وہ اکثر رات کو اس کمرے میں ٹھہرتا بھی تھا۔ سرما کی طویل اور کہر آلود راتوں میں یہ کمرہ عام طور پر آباد رہتا تھا۔ میاں اسلم دوست احباب کے ساتھ آتا۔ پیتا پلاتا۔ بے تکلفی سے قہقہے لگاتا۔ داد عیش دیتا۔ کبھی آدھی رات کو اٹھ کر چلا جاتا اور کبھی صبح تک کمرے میں مقیم رہتا۔

کمرے کی کنجی بھٹے کے ایک پرانے ملازم کے پاس رہتی تھی۔ وہ ادھیڑ تھا۔ قابل اعتماد تھا اور دفتر کی پشت پر ایک جھونپڑی میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ حنیف ڈوگر اور لالی کے پہنچتے ہی وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور ایک چارپائی لا کر دفتر کے سامنے ڈال دی۔ حنیف ڈوگر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی کو بھی اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ اس نے ملازم کو مخاطب کیا۔

"میراں، پانی تو پلا۔ بہت پیاس لگی ہے۔"

میراں مڑا اور ذرا ہی دیر بعد المونیم کے گلاس میں پانی لے کر واپس آ گیا۔

حنیف ڈوگر نے پانی پی کر گلاس میراں کو واپس دیا۔ وہ خاموشی سے اپنی جھونپڑی کی جانب چلا گیا۔ ڈوگر نے مڑ کر لالی کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "پتہ ہے میں تجھے یہاں کس لیے لایا ہوں۔"

"مجھے کیا پتہ تو کس لیے لایا ہے۔" لالی نے اپنی لاعلمی کا برملا اظہار کیا۔ "جب تک تو بتائے گا نہیں مجھے کیسے پتہ چلے گا۔"

"بھٹے پر جو کام کر رہا ہے اس سے تو خوش ہے؟" ڈوگر نے قطعی مختلف سوال کیا۔

لالی نے چونک کر ڈوگر کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "جمعدار، میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"مطلب یہ کہ تو شاداں کے ساتھ سخت دھوپ اور گرمی میں اینٹیں تیار کرنے کا جو کام کرتا ہے تجھے پسند ہے؟" ڈوگر نے اس دفعہ اپنی بات کا مفہوم وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی۔

"میں تو جی، جب بہت چھوٹا تھا تب بھی بھٹے پر کام کرتا تھا۔" لالی نے حنیف ڈوگر کو آگاہ کیا۔ "سخت گرمی میں کام کرتا تھا اور کڑاکے کے جاڑے میں بھی کرتا تھا۔ ویسے ہی اب کرتا ہوں۔ کام جو کرنا ہوا۔ کوئی مفت میں تو دہاڑی دیتا نہیں۔"

"تو اب تک میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" ڈوگر نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لو دھوپ میں کام کرکے تو اور شاداں دونوں ہی ختم ہو جائیں گے۔ بدن پر نہ گوشت رہے گا نہ خون۔ کچھ ہی دنوں بعد ہی تم دونوں دوسرے پتھیروں کی طرح ہڈیوں کا پنجر رہ جاؤ گے۔ یہی دیکھ جب تو ادھر آیا تھا تو کیسا تھا اور اب تیرا کیا حال ہے۔ شاداں بھی ایسی لگتی ہے جیسے بھٹے کے اندر سے جھلس کر نکلی ہو۔"

"وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ پتھیرے کا کام ہی ایسا ہوتا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں تو پتھیرے کا کام چھوڑ دے۔" حنیف ڈوگر نے کھل کر بات کی۔ "کرندہ لگ جا۔" اس نے لالی کا بازو پکڑ کر انگلیوں سے گوشت ٹٹولا۔ "تو تکڑا جوان ہے۔ بہت چنگا کرندہ بن سکتا ہے۔ کام بھی کم کرنا ہوگا۔"

"صرف دیسی شراب پی کر نشے میں بڑھکیں مارنی ہوں گی۔ پتھیروں اور کمہاروں کی کڑیاں اٹھا کر تیرے پاس پہنچانی ہوں گی۔ کوئی گڑ بڑ کرے گا، شور شرابہ کرے گا تو دبا کے اس کی پٹائی کرنی ہوگی۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "یہی کام کرنا ہوگا؟"

"زیادہ اونچی اونچی گلاں نہ کر۔" ڈوگر مشتعل ہوگیا۔ "مجھے پتہ ہے تو چوری ڈکیتی کرتا رہا ہے۔ کئی بار جیل میں بھی بند رہا ہے۔" اچانک اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "تو چاہتا ہے نیک بندہ بن کر رہ تاکہ پولسیے تجھے تنگ نہ کریں۔ سچ سچ بتا میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔"

"تو پولسیوں کی فکر نہ کر۔" حنیف ڈوگر نے لالی کو رام کرنے کی کوشش کی۔ "سارے ہی میاں اسلم کے یار ہیں۔" اس نے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "جاڑا آنے دے تب دیکھنا تھانیدار اور دوسرے وڈے افسر تجھے ہر رات ادھر نظر آئیں گے۔ پر گرمی میں بھی کبھی کبھی ادھر محفل جمتی ہے۔ یہیں کمرے کے سامنے کرسیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ رات دیر تک پینے پلانے کا شغل ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا جی، پر میں نے اس سے کیا لینا۔"

"تنخواہ ٹھیک ٹھاک ملے گی۔ سب پر رعب بھی رہے گا۔" ڈوگر نے لالی کو متاثر کرنے کی ایک

اور کوشش کی۔ "میرے کہنے پر چلے گا تو عیش کرے گا۔"

لالی پھر بھی آمادہ نہ ہوا۔ حنیف ڈوگر کے سمجھانے بجھانے اور اصرار کرنے کے باوجود آمادہ نہ ہوا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں تو جی پتھیرا ہوں اور پتھیرا ہی رہ کر ادھر کام کروں گا۔ میں نے کرندہ شرندہ نہیں بننا۔" لالی نے اس کی پیشکش سختی سے مسترد کردی۔ "تو مجھے پتھیرا رکھنا نہیں چاہتا تو میں تیرا بھٹہ چھوڑ دوں گا کسی اور بھٹے پر لگ جاؤں گا۔"

"دوسرے بھٹے پر جانے کی نہ سوچ۔ آگے ایسی گل نہ کرنا۔" ڈوگر نے تنبیہہ کی۔ "تو پتھیرا رہنا چاہتا ہے تو پتھیرا ہی رہ۔ میں نے تو تیرے ہی بھلے کو کہا تھا۔ سوچا تھا سخت گرمی اور لو سے تنگ ہو گا۔"

"لو دھوپ کی تو فکر نہ کر۔ اس کے بارے میں تو پتھیرا لگنے سے پہلے میں نے سوچ رکھا تھا۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ دوسرے بندے بھی ہیں۔ سب ہی دھوپ اور گرمی میں کام کرتے ہیں۔"

"پر ان میں کئی ایسے ہیں جو ٹھیک بندے نہیں ہیں۔ کام چور اور کمینے ہیں۔ سختی کرو تو میرے اور میاں اسلم کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گند اور نفرت پھیلاتے ہیں۔" ڈوگر نے حقارت سے منہ بگاڑ کر لالی کو خبردار کیا۔ "تو ان کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دینا۔"

"میرا تو جی ادھر کسی سے میل ملاپ ہی نہیں ہے۔" لالی نے اسے اطمینان دلایا۔ "دن بھر کام کرنے کے بعد اتنا تھک جاتا ہوں کہ کسی سے گل بات کرنے کو جی نہیں کرتا۔"

"میں یہ نہیں کہتا تو کسی سے میل ملاپ نہ رکھ۔ گل بات نہ کر۔" اس کا لہجہ رازدارنہ ہو گیا۔ "پر کوئی گند اور نفرت پھیلانے کی کوشش کرے تو مجھے اس کے بارے میں بتا دینا۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر ڈوگر کی جانب دیکھا مگر خاموش رہا۔ ڈوگر نے نشے کی جھونک میں لہرا کر بے تکلفی سے لالی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں منشی سے تیرے بارے میں بول دوں گا۔ آگے نہ وہ تیری دہاڑی سے ٹوٹ پھوٹ کاٹے گا نہ خراب اور ٹیڑھی ونگی اینٹوں کا چکر چلائے گا۔ پیشگی میں بھی کوئی ہیر پھیر نہیں کرے گا۔ تجھے بالکل تنگ نہیں کرے گا۔ ٹھیک ٹھیک دہاڑی دے گا۔"

لالی ہنوز خاموش رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ ڈوگر اسے اعتماد میں لے کر کہتا رہا۔ "ادھر ایسے اور بھی بندے ہیں جو مجھے بھٹے پر کام کرنے والوں کے بارے میں ایک ایک بات بتاتے

ہیں۔ وہ میرے کہنے پر چلتے ہیں۔ میں بھی ہر طرح ان کی مدد کرتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "تو چاہتا ہے، میں تیرے لیے مخبری کروں۔ یہی چاہتا ہے نا؟"

"مخبری شخبری نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں تو ادھر رہے تو ایسا بندہ بن کر رہے جس پر میں بھی بھروسہ کر سکوں۔ اس میں تیرا ہی فائدہ رہے گا۔"

"جمعدار تیری بہت بہت مہربانی۔" لالی نے انکساری سے کام لیا۔ "پر میں ایسا کام نہیں کر سکتا۔ میں نے مخبری ہی کرنی ہوتی تو پولیس کا مخبر لگ جاتا۔ اس میں تو زیادہ فائدہ تھا۔ پر میں کسی ایسے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حنیف ڈوگر نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ اور برہمی آشکارہ تھی۔ مگر وہ چپ رہا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

لالی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ حنیف ڈوگر کے رویّے میں نمایاں تبدیلی آ گئی ہے۔ بات کرتا تو تیوری پر بل پڑے ہوتے۔ لہجہ کرخت اور تحقیر آمیز ہوتا۔ وہ لالی کو بات بات پر ڈانٹتا ڈپٹتا۔ طرح طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کرتا۔

منشی بھی اب چٹھا بانٹتے وقت اس کی اجرت سے زیادہ سے زیادہ کٹوتی کرتا۔ ٹوٹ پھوٹ بڑھا کر لکھتا۔ خراب اور غیر معیاری اینٹوں میں اضافہ کر دیتا۔ اینٹوں کی کم سے کم تعداد مقرر کر کے معاوضہ ادا کرتا۔ پیشگی کی وصولی میں بھی گھپلا کرتا۔ ہرچند کہ لالی کی تعلیمی استعداد بہت واجبی سی تھی مگر رجسٹر میں درج کی جانے والی ہر تفصیل پڑھ سکتا تھا۔ وہ انگوٹھا لگانے کے بجائے ہمیشہ دستخط کرتا تھا اور دستخط کرنے سے پہلے رجسٹر میں لکھی جانے والی کچی اینٹوں کی تعداد اور ان کے معاوضے کی رقم ضرور پڑھتا تھا۔ کوئی غلطی دیکھتا تو منشی کو ٹوکتا اور اسے درست کراتا۔

منشی نے اسے پریشان کرنے اور پیشگی کی وصولی میں دھاندلی کرنے کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایسے شکستہ اور جناتی خط میں اندراج کرتا کہ لالی کے لیے اس کا پڑھنا مشکل ہوتا۔ لالی نے اس کے اس رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ بگڑ کر بولا۔ "منشی، صاف صاف لکھ۔ تو لکھتا کچھ ہے پڑھتا کچھ اور ہے۔" مگر منشی نے اسے جھڑک دیا۔ "بکواس نہ کر۔" وہ بہت اونچی آواز سے بولا۔ یہ ڈوگر کے لیے اشارہ تھا جو اس کی پشت پر اپنے مسلح گرگوں کے ساتھ چٹھا بٹتے وقت موجود رہتا تھا۔ وہ فوراً بڑھا۔ ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ "کنون نہ بگھار۔ دہاڑی لے اور آگے بڑھ۔" وہ چمڑے کا چھتر

سنبھال کر لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔

لالی نے حنیف ڈوگر سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ منشی نے جو کچھ دیا لے کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ بعد میں بھی اس نے کئی بار منشی سے احتجاج کیا۔ اسے ٹوکا۔ مگر ہر بار ڈوگر چمڑے کا چھتر سنبھالے اسے دہشت زدہ کرنے کی غرض سے بڑھ کر سامنے آجاتا۔ ویسے دوسرے پتھیروں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ لیکن ڈوگر نے لالی کو کبھی چھتر سے مارا پیٹا نہیں۔ صرف ڈرانے دھمکانے پر اکتفا کیا۔ لالی نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ منشی جو دہاڑی دیتا خاموشی سے لے لیتا۔

لالی اب چپ چپ رہتا۔ شاداں سے بھی کم بات چیت کرتا۔ وہ خود بھی پریشان تھی۔ لالی کو گم صم دیکھتی تو اور پریشان ہو جاتی۔

☆

ایک شام لالی کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹا تھا۔ شاداں اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ بھٹے کے وسیع میدان میں جگہ جگہ چولہوں میں آگ روشن تھی۔ کوئی روٹی پکا رہا تھا۔ کوئی کھا چکا تھا۔ کوئی کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بچوں کے رونے اور شور مچانے کے ساتھ ساتھ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ مگر لالی خاموش تھا۔

شام خوش گوار تھی۔ شدید گرمی کے بعد موسم کسی قدرے بدل گیا تھا۔ آسمان پر صبح سے بادل چھائے تھے۔ لیکن بارش نہیں ہوئی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی چت لیٹا تھا اور آسمان کو تک رہا تھا۔ بادلوں کی اوٹ سے کہیں کہیں کوئی ستارہ جھلملاتا ہوا نظر آرہا تھا۔

شاداں نے لالی کو مخاطب کیا۔ ”لالی‘ میں نے تجھ سے ایک گل کہنی ہے۔ کئی روز سے اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

مگر لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔

”تو بولتا کیوں نہیں؟“ اس دفعہ شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”بول “کیا کہنا چاہتی ہے؟“ لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

”میں نے اب ادھر نہیں رہنا۔“ شاداں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے لالی کو مطلع کیا۔ ”میں تجھے صاف صاف کہے دیتی ہوں۔“

”تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ لالی نے کروٹ بدل کر شاداں کی جانب تیکھی نظروں سے

دیکھا' دھیرے سے بولا۔ "ڈوگر کو پتہ چل گیا تو گلے پڑ جائے گا اور زیادہ تنگ کرے گا۔"

"تو کچھ ہی کہہ۔ پر میں نے اب یہاں نہیں رہنا۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"کیسے جائے گی؟ کس کے ساتھ جائے گی؟" لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جاؤں گی کس کے ساتھ' تیرے ساتھ جاؤں گی۔ اکیلی نہیں جاؤں گی۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ عاجزی سے بولی۔ "دیکھ لالی' میں نے تیری ہر گل بات مان لی۔ جو تو نے کہا میں نے وہی کیا۔ تیرے ساتھ بھٹے پر بھی لگ گئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے' اب ادھر نہیں رہنا۔ گرمی میں' دھوپ میں سخت کام کرو پر نہ کپڑے لتے رہے نہ ٹھیک سے کھانے کو روٹی ملتی ہے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔ ذرا اپنی حالت دیکھ۔ میں نے تو اب آئینہ ہی دیکھنا چھوڑ دیا۔ لگتا ہے اپنی نہیں کسی اور کی شکل دیکھ رہی ہوں۔"

"تو چاہتی کیا ہے؟" لالی بھنا کر بولا۔

"ذرا سوچ تو یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ خانہ بدوشوں کی طرح میدان میں پڑے ہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ میرا بھی گھر ہو۔" شاداں نے اپنی محرومیوں کا اظہار کیا۔ "سب سمجھتے ہیں میں تیری گھر والی ہوں۔ پر کسی کو کیا پتہ۔ میرا تو تیرے ساتھ ویا بھی نہیں ہوا۔" اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

"میں یہاں سے نکل کر سب سے پہلے تیرے ساتھ نکاح پڑھواؤں گی۔ کیا تو ایسا نہیں چاہتا؟"

"بالکل چاہتا ہوں۔" شاداں نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ "پر یہ تو سوچ۔ ہم یہاں سے نکل کیسے سکتے ہیں۔ تجھے پتہ ہے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اور جب تک پیشگی ادا نہیں ہو جاتی بھٹے سے کہیں اور جا ہی نہیں سکتے۔"

"تجھے پتہ ہے' پیشگی تو کبھی ادا نہیں ہو گی۔" شاداں نے گہری سانس بھری۔ "اب تو اسے ادا کرنے کو بھی کچھ نہیں رہا۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔

شاداں چند لمحے خاموش بیٹھی لالی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا' ہم دونوں تو اکٹھے یہاں سے نکل نہیں سکتے۔" لالی نے اپنی تجویز شاداں کے سامنے پیش کی۔ "ایسا کر تو یہاں سے کسی بہانے نکل جا۔"

"میں اکیلی تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔" شاداں نے لالی کی بات کاٹ کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ "تو بھی میرے ساتھ ہی چلے گا۔"

"پہلے میری پوری گل تو سن لے۔" لالی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یا تو میں جا سکتا ہوں یا تو۔ دونوں ہرگز نہیں جا سکتے۔ کسی ایک کو پیشگی ادا کرنے کے لیے رکنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تجھے میں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہی رکنا پڑے گا۔"

"تب تو کبھی تو نہیں نکل سکے گا۔" شاداں نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ "نہ پیشگی کبھی ادا ہو گی نہ تو نکل سکے گا۔"

لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنا منہ شاداں کے قریب کر کے رازداری سے مدھم لہجے میں کہا۔ "جب تو یہاں سے چلی جائے گی تو میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے باہر نکل جاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر شاداں کو دیکھا۔ "جب میں جیل سے فرار ہو سکتا ہوں تو یہاں سے نکلنا میرے لیے کیا مشکل ہے۔"

"مجھے تو ابھی سے ڈر لگ رہا ہے۔" شاداں کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ "تو نے کرندوں کو دیکھا ہے۔ کتوں کی طرح ادھر ادھر سونگھتے پھرتے ہیں۔ تو ان کے ہوتے ہوئے کیسے نکل سکے گا؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "مجھے تو یہ فکر ہے کہ تو یہاں سے نکلے گی کیسے؟ ڈوگر ویسے بھی خار کھاتا ہے۔ وہ تو ہرگز تجھے جانے نہیں دے گا۔"

"کوئی نہ کوئی بہانہ سوچ لے۔" شاداں اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر رضامند ہو گئی۔ "ڈوگر کی منت سماجت کر لینا۔"

"تو کہتی ہے تو ایسا بھی کر لوں گا۔" شاداں کی بات لالی کے دل کو لگی۔

"ضرور کر لینا۔" شاداں نے مسکرا کر کہا۔ "اپنا کام ہی تو نکالنا ہے۔ آگے ہم نے اس سے کیا لینا۔"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں جلد ہی ڈوگر سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس نے غصے سے دو چار گلاں بھی نکالیں تو وہ بھی چپ کر کے سن لوں گا۔ اسے تو میں کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لوں گا۔ مجھے پتہ ہے وہ کیا چاہتا ہے۔"

"یہاں سے تو جیسے بھی ہو فٹافٹ نکل جانا چاہیے۔ بہت گندی جگہ ہے۔ جیل بھی ایسی ہی ہوتی ہو گی۔" شاداں نے لالی سے پوچھا۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"تو نے ٹھیک ہی کہا۔ ایک طرح سے یہ بھی جیل ہی ہے۔" لالی نے اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا۔ "یہ بتا یہاں سے نکل کر تو جائے گی کہاں؟"

"ویسے تو میں اپنے ماماں کے پاس بھی جا سکتی ہوں۔ پہلے بھی اس کے ساتھ ہی ٹھیری ہوئی تھی۔" شاداں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "میرا ارادہ چوہدری نور الٰہی کے پاس کوٹلہ ہر کشن جانے کا ہے۔"

لالی نے جھٹ مداخلت کی۔ "تو بار بار اس کا ذکر کرتی ہے۔ پر نہ جانے کیوں مجھے وہ بالکل چنگا بندہ نہیں لگا۔"

"تو چوہدری کو جتنا برا سمجھتا ہے وہ ایسا برا بندہ نہیں ہے۔ دکھی بھی ہے۔ پہلے گورداسپور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو گھر بار' بال بچے سب چھوٹ گئے۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کا کوئی بھی نہیں رہا۔"

"یہ باتیں تو اس کے بارے میں پہلے بھی بتا چکی ہے۔" لالی نے ناگواری سے کہا۔ "اب اور کتنی بار بتائے گی۔"

"ناراض نہ ہو۔" شاداں نے نرمی سے کہا۔ "سچ پوچھ تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ وہ نیک بندہ ہے۔ وڈا زمین دار ہے۔ تجھے اپنے ساتھ لگا لے گا۔ میں بھی اس کی حویلی میں لگ جاؤں گی۔ دونوں آرام سے رہیں گے۔"

"پر میں چاہتا ہوں تو چوہدری کے پاس نہ جانا۔ یہاں سے نکل کر اپنے ماماں کے پاس جانا۔"

"تیری مرضی ہے تو ماماں ہی کے پاس چلی جاؤں گی۔" شاداں نے اس کی بات مان لی۔ مگر دبی زبان سے یہ بھی کہا۔ "پر یہ بتا دوں میں چوہدری سے کہوں گی تو وہ ہم دونوں کو ضرور لگا لے گا۔ ادھر ادھر دھندا ڈھونڈنے سے بچ جائیں گے۔"

"تو کہتی ہے تو چوہدری کے پاس کوٹلہ ہر کشن بھی چلے جائیں گے۔" لالی نے شاداں سے مزید الجھنے کی کوشش نہ کی۔ "پر میں جب یہاں سے فرار ہو کر باہر نکلوں گا تو تیرے ماماں کے گھر پہنچوں گا۔ تو میرا وہیں انتظار کرنا۔"

شاداں نے انکار نہ کیا۔ فوراً ہامی بھر لی۔

لالی کی ہدایت پر شاداں صبح کام پر نہ گئی۔ تمام دن چادر اوڑھے اپنی جھونپڑی میں پڑی رہی۔ لالی اکیلا ہی گارا بناتا رہا اور لوہے کے سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کرتا رہا۔ شاداں کی غیر حاضری کے بارے میں کوئی ہتھیرا پوچھتا تو کہہ دیتا کہ بیمار ہے۔ شاداں کے پاس کوئی عیادت کرنے جاتا تو وہ بھی یہی کہتی۔ آواز میں نقاہت پیدا کرنے کی کوشش کرتی اور بہت دھیمے لہجے میں بولتی۔

کوئی بھی ہتھیرا یا بھٹہ مزدور کام سے غیر حاضر ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ غیر

حاضری کے نتیجے میں اس کی دہاڑی نہ لگتی اور دہاڑی کا نہ لگنا پریشانی کا باعث ہوتا۔ ہفتہ گزارنا مشکل ہو جاتا۔ شاداں دوسرے روز بھی کام پر نہ گئی۔ جھونپڑی میں بیماروں کی طرح پڑی رہی۔ لالی اکیلا ہی کام کرتا رہا۔ دو ہی روز میں بھٹے پر یہ بات پھیل گئی کہ شاداں بیمار ہے۔

تیسرے روز لالی سورج غروب ہوتے ہی حنیف ڈوگر سے ملنے گیا۔

☆

موسم گرما کی سلگتی ہوئی شام درو بام سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جھونپڑیوں میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ڈوگر شام کے جھٹ پٹے میں بھٹے کے دفتر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے تازگی اور سرخوشی پیدا کرنے کے لیے پینے پلانے کا شغل شروع نہیں کیا تھا۔

لالی اندھیرے سے نکل کر سامنے آیا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی، استعجاب تھا۔ اس نے منہ بگاڑ کر حقارت سے پوچھا۔ "میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

لالی نے عاجزی سے جواب دیا۔ "تجھ سے ایک گل کرنی تھی۔" وہ مجرم کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"میں نے اس وکھت کوئی گل شل نہیں سننی۔"

"کل آجاؤں گا جی۔ جب تو کہے گا تب آجاؤں گا۔" لالی گڑگڑانے لگا۔ "جمعدار، مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دے۔"

"تجھے اب اپنی غلطی کا پتہ چلا۔"

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ڈوگر نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر گویا ہوا۔ "تجھے اپنی غلطی کا تب پتہ چلا جب منشی نے تیرا دماغ پوری طرح ٹھیک کر دیا۔ ابھی تو وہ اور چابی کے گا۔" اس کا لہجہ اور درشت ہو گیا۔ "تیرے ایسے ٹیڑھے ہتھیرے روز ہی ادھر آتے ہیں۔ پر جیسے ہی چابی کسی گئی ایک دم ٹھیک ہو کر رستے پر آجاتے ہیں۔"

لالی بدستور نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ چاہتا تھا ڈوگر اپنی برہمی کا پوری طرح اظہار کر لے۔ اور جب اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے تو حرف مطلب زبان پر لائے۔ حنیف ڈوگر نے جھنجلا کر اسے برا بھلا کہا۔ گندی گندی مغلظات بھی سنائیں۔ مگر لالی مطلق مشتعل نہ ہوا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اندھیرا اور بڑھ گیا۔ پھر ڈوگر کی آواز ابھری۔ "شاداں کیسی ہے؟"

اس دفعہ اس کا لہجہ درشت نہ تھا۔

"وہ تو جی سخت بیمار ہے۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔

"فکر نہ کر، دو چار روز میں چنگی ہو جائے گی۔"

"جمعدار، تجھے پتہ نہیں وہ بہت بیمار ہے۔" لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ "ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی۔ ہائے ہائے کرتی رہتی ہے۔"

"دوا دارو کے لیے کل کسی کرندے کے ساتھ اسے خیراتی شفا خانے بھجوا دوں گا۔" حنیف ڈوگر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "تو فکر نہ کر۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" یکایک اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا اس سے سخت گرمی میں کام نہ کرا۔ تب تو تو اونچا اڑ رہا تھا۔ وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ کرندہ لگ جاتا تو عیش کرتا۔ اب تو کرندہ بھی نہیں لگ سکتا۔ میاں صاحب نے ایک بندے کو لگا دیا ہے۔"

"ہاں جی غلطی ہو گئی۔" لالی نے اطمینان کی سانس لی۔ نہ وہ پہلے کارندہ بننا چاہتا تھا اور نہ اب ایسا کوئی ارادہ تھا۔ لالی نے دبی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ "وہ تو جی علاج کے لیے اپنے ماماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔"

"وہ کسی پنڈ میں رہتا ہو گا۔ ادھر پنڈ میں کس سے علاج کرائے گی؟" ڈوگر نے لالی کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "نہ ڈاکٹر نہ حکیم، علاج کون کرے گا؟"

"نہیں جی، وہ گوجرانوالہ شہر میں رہتا ہے۔" لالی نے فوراً بات بنائی۔ ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "وہ ایک ڈاکٹر کا کمپوڈر لگا ہوا ہے۔ ادھر شاداں کا علاج بہت ٹھیک ٹھاک ہو سکتا ہے۔"

"تو اسی لیے میرے پاس آیا ہے۔" ڈوگر نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

"ہاں جی۔ آیا تو اسی لیے تھا۔" لالی انکار نہ کر سکا۔

"اس کے لیے تو میاں صاحب سے اجازت لینی ہو گی۔" ڈوگر نے ٹالنا چاہا۔

"تو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔" لالی نے خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا۔ "سچ پوچھ تو بھٹہ تو ہی چلاتا ہے۔ تیرے بنا تو ادھر ایک روز کام نہیں چل سکتا۔ سارا ہی کام تو کرتا ہے۔ یہ تو سب ہی کو پتہ ہے۔"

"پر میاں صاحب کو تو پتہ نہیں میں کتنا کام کرتا ہوں۔" اس نے دبی زبان سے شکوہ کیا۔ "سارے ہی بھٹوں کے جمعداروں کو پتھیرے بھرتی کرنے کا نہ صرف کمیشن ملتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو مالک خوش ہو کر بخشش اور انعام بھی دیتے ہیں۔"

"تجھے بھرتی کرنے پر کمیشن ومیشن نہیں ملتا؟" لالی نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے لہجے میں استعجاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"توبہ کرو جی۔ کیسا کمیشن کہاں کا انعام۔ اوپر سے ڈانٹ ڈپٹ بھی سننی پڑتی ہے۔"

"جمعدار یہ تو ٹھیک گل نہیں ہوئی۔" لالی نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "تیرے ساتھ تو بہت بے انصافی ہو رہی ہے۔ تیرا ایسا کام کا بندہ تو میاں صاحب کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔"

"جب یہ بھٹہ چھوڑ دوں گا تب اسے پتہ چلے گا۔" ڈوگر نے تلخی سے کہا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "پر یہ گل تو کسی سے نہ بتانا۔" اس نے دھمکی دی۔ "تجھے پتہ نہیں بدلہ لینے پر آؤں تو میں کیا نہیں کر سکتا۔ ڈھونڈے سے لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"مجھے پتہ ہے تو کتنا زور آور ہے۔" اس نے ڈوگر کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تو مجھ پر بھروسہ رکھ۔ ایسی گل تو میں شاداں کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔"

ڈوگر مطمئن ہو کر بولا۔ "تو شاداں کو کب اس کے ماماں کے گھر بھیجنا چاہتا ہے؟"

"جب تو کہے گا تب بھیج دوں گا۔" لالی نے خوش ہو کر کہا۔ "ویسے میں اسے جلدی بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس کی طبیعت زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔"

"کل صبح جب میاں اسلم ادھر دفتر میں آئے گا تو میں شاداں کے بارے میں اسے بتا دوں گا۔" حنیف ڈوگر نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "اس کو بتانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ بعد میں بہت گرم ہوتا ہے۔ ننگی ننگی گالاں نکالتا ہے۔ تب ہی تو میں کوشش کرتا ہوں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔"

"ایسی گل بات ہے تو اس سے ضرور مشورہ کر لینا۔" لالی نے ٹوہ لگانے کی غرض سے دریافت کیا۔ "اگر تو اجازت دے تو میں شاداں کو چھوڑنے گوجرانوالہ چلا جاؤں۔ تجھے تو پتہ ہی ہے وہ کتنی سخت بیمار ہے۔" لالی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "اسے ماماں کے پاس چھوڑ کر فٹافٹ واپس آجاؤں گا۔"

"تو کیسے جا سکتا ہے؟" ڈوگر ایک دم بھڑک اٹھا۔ "جب تک شاداں واپس نہیں آجائے گی تو بھٹے سے باہر نہیں جا سکتا۔ تو اتنے دنوں سے بھٹے پر کام کر رہا ہے، تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ پیشگی ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو ضرور ضمانت کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ ویسے تو عام طور پر کسی کو چھٹی دی ہی نہیں جاتی۔"

لالی کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کہے گا۔ وہ خاموش رہا۔ ڈوگر بولتا رہا۔ "چھٹی تو ان کو دی جاتی ہے

جن کا پورا ٹبر ادھر ہوتا ہے۔ بال بچے ہوتے ہیں۔ تو شاداں کے جانے کے بعد اکیلا رہ جائے گا۔ تیرا ادھر سے فرار ہونا کوئی مشکل نہیں۔"

"ایسی گل نہ کر۔" لالی نے اسے ٹوکا۔ "میں نے پیشگی کے تین سو روپے کے لیے فرار ہی ہونا ہوتا تو اب تک چوری ڈکیتی کرتا ہوتا۔ ادھر بھٹے پر لو دھوپ میں اینٹیں بنانے کا دھندا نہ کرتا۔"

لالی کی بات حنیف ڈوگر کے دل کو لگی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ شاداں کو چھٹی دینے پر پوری طرح رضامند ہو گیا۔

لالی جھونپڑی میں واپس گیا۔ شاداں کو خوش خبری سنائی تو اس کے چہرے پر تازگی آ گئی۔

صبح کو لالی اکیلا ہی کام پر گیا۔ شاداں جھونپڑی میں رہی۔ چادر سے منہ لپیٹے اس طرح بے حال پڑی رہی گویا سخت علیل ہو۔

دوپہر کو میاں اسلم معمول کے مطابق بھٹے سے چلا گیا تو ڈوگر نے لالی کو اپنے پاس بلایا۔ ہنس کر بولا۔ "تو چاہے تو شاداں کو آج ہی گوجرانولہ بھیج دے۔ ورنہ کل سویرے بھیج دینا۔" دفعتہً اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تجھے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ میاں صاحب نے میری ضمانت پر شاداں کو بھٹہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے۔ اگر شاداں کے جانے کے بعد یہاں سے بھاگ گیا تو تیری پیشگی میری جمعداری سے کاٹ لی جائے گی۔"

"جمعدار تیری بہت بہت مہربانی۔" لالی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ خوشامد بھی کی۔ "تو بہت نیک بندہ ہے۔ مجھے اب پتہ چلا تو دل کا کتنا بھلا ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "تو بالکل اطمینان رکھ میں تجھ سے ہرگز دھوکا نہیں کروں گا۔"

حنیف ڈوگر خاموش بیٹھا اپنی مونچھیں مروڑتا رہا۔

لالی اٹھ کر سیدھا اپنی جھونپڑی میں گیا۔ شاداں کو مطلع کیا۔ وہ سہ پہر کو جانا چاہتی تھی۔ مگر لالی نے اسے روک لیا۔

رات کو دونوں دیر تک جاگتے رہے۔ مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ آئندہ کے بارے میں منصوبے بناتے رہے۔

شاداں بہت تڑکے بیدار ہو گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ روٹی پکائی۔ لالی کو جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا' شاداں سفر کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ مشرقی افق پر روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اجالا دھیرے دھیرے پھیلتا جا رہا تھا۔ بھٹے پر چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔

شاداں نے روانگی سے پہلے رازداری میں کہا۔ "دیکھ لالی تو جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا۔ میں تیرا

انتظار کروں گی۔ تو نے دیری کی تو میں پریشان ہو جاؤں گی۔"

"تو اطمینان رکھ، میں جلدی تیرے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔" لالی نے مسکرا کر شاداں کو دیکھا۔ "تو سیدھی اپنے ماماں کے پاس جائے گی نا؟"

"اسی کے پاس جاؤں گی۔ اور میں نے کہاں جانا ہے؟"

"میں نے سوچا تو ماماں کا کہہ کر کہیں چوہدری کے پاس نہ چلی جائے۔" لالی نے اسے چھیڑا۔ "تو اسے بہت یاد کرتی ہے۔ بار بار اس کا ذکر کرتی ہے۔"

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" شاداں تنک کر بولی۔ "میں نے چوہدری سے کیا لینا۔ وہ میرا کون لگتا ہے۔" اس نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "ویسے میں یہ ضرور کہوں گی۔ وڈا زمین دار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بھلا بندہ بھی ہے۔"

"مجھے کیا پتہ وہ کیسا بندہ ہے۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔ میری تو اس سے کبھی گل بات بھی نہیں ہوئی۔"

"میں تو اسے کئی بار مل چکی ہوں۔ گل بات بھی کر چکی ہوں۔" اس نے ایک بار پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ "اگر وہ ہم دونوں کو اپنے پاس لگا لے تو آرام نال رہیں گے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "تو کہہ تو میں اس بارے میں بات کرنے اس کے پاس کوٹلہ ہرکشن چلی جاؤں؟"

لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا۔

شاداں نے ٹوکا۔ "لالی، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگتا ہے چوہدری کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔" لالی نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"تو پہلے بھی کئی بار یہ بات کہہ چکا ہے۔" شاداں نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے ایسے ہی شک ہو گیا ہے۔ تو چوہدری سے پہلے ملا ہوتا تو وہ تجھے ضرور پہچان لیتا۔ پر مجھے پتہ ہے وہ تو تجھے بالکل نہیں جانتا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" لالی نے بات خواہ مخواہ بڑھانے کی کوشش نہ کی۔

شاداں نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کون سی بات؟" لالی نے شاداں کے چہرے کی جانب حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔

"حد کر دی تو نے۔" شاداں نے ہاتھ جھٹک کر اپنی بات دہرائی۔ "تو کہہ تو میں چوہدری کے پاس کوٹلہ ہرکشن چلی جاؤں۔" وہ اسے خوش کرنے کے لیے مسکرانے لگی۔ "میں چاہتی ہوں جب

تو میرے پاس پہنچے تو میں تیرے لیے کام دھندے کا بندوبست کر رکھوں۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا ہے؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ پر جب تک میں پہنچ نہ جاؤں تو اپنے ماماں ہی کے پاس رہنا۔" لالی نے تاکید کی۔ "کسی کے پاس نہ جانا۔ پتہ نہیں میں کب اور کس روز تیرے پاس پہنچوں۔"

"ایسا ہی کروں گی۔" شاداں نے یقین دلایا۔ ساتھ ہی اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔ "دیکھ بہت ہشیاری سے کام لینا۔ ایسا نہ ہو کسی چکر میں پھنس جائے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ اب تو میں ادھر آ بھی نہ سکوں گی۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ویسے ادھر رہ کر بھی کسی کو کسی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا یہ اتنی خراب اور گندی جگہ ہو گی۔"

"اب تو تجھے یہاں سے آزادی مل گئی۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "پتہ نہیں میں یہاں سے کب نکل سکوں گا۔"

شاداں بھی افسردہ ہو گئی۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہے، پھر شاداں نے اپنی گٹھری اٹھائی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ آگے بڑھی۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے۔ اداس اور دل گرفتہ تھے۔

وہ لالی سے رخصت ہوئی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بھٹے کی حدود سے باہر چلی گئی۔ مڑ مڑ کر لالی کو دور تک دیکھتی رہی۔ پھر ایک موڑ پر شاداں نظروں سے اوجھل گئی۔ لالی دیر تک گم صم کھڑا رہا۔

دھوپ اب ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کی چمک اور تمازت بھی بڑھ گئی تھی۔

۴۷

لالی اب زیادہ سے زیادہ محنت کرتا۔ سویرے ہی سویرے کام پر چلا جاتا۔ مٹی کھود کر گارا تیار کرتا۔ سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں بناتا۔ تھلے پر کچی اینٹوں کی قطاریں بنتی جاتیں۔ دوسرے پتھیروں کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ ہی دیر تک کام میں جتا رہتا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھوتا۔ چولھے میں آگ سلگاتا اور روٹی پکانے بیٹھ جاتا۔ کھانا کھاتا اور دن بھر کی سخت محنت مشقت سے ایسا نڈھال اور تھکا ہارا ہوتا کہ بستر پر لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی۔

سورج طلوع ہوتا' غروب ہوتا۔ وقت' دن رات میں بدلتا رہتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لالی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ شاداں کے جانے کے بعد ہی اس نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ موقعے کی تاک میں تھا۔ گھوم پھر کر بھٹے کے محل وقوع کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔

دن میں فرار ہونا ممکن نہ تھا۔ باہر آنے جانے پر سخت روک ٹوک تھی۔ خاص طور پر ان پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کی جاتی جن کی پیشگی واجب الادا تھی۔ بھٹے پر کام کرنے والوں کی بھاری اکثریت ایسے ہی قرض داروں پر مشتمل تھی۔ رات کا وقت فرار ہونے کے لیے مناسب اور سازگار تھا۔ نہ کسی قسم کی چہل پہل ہوتی نہ گہما گہمی۔ پہر رات گزرتے ہی بھٹے پر سناٹا طاری ہو جاتا۔ رات جس قدر آگے بڑھتی سناٹا بھی اسی قدر بڑھتا۔

سنسان اور اندھیری راتوں کو لالی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ فرار ہونے کا منصوبہ بناتا۔ گرد و پیش کا جائزہ لیتا۔ اس کے کان ہر آہٹ اور ہر آواز پر لگے ہوتے۔ نظریں ادھر ادھر گردش کرتیں۔ طرح طرح

کے اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ ساتھ فرار ہونے کی امنگ اور ترنگ بھی ہوتی۔ وہ مناسب موقعے کی تلاش میں برابر لگا رہا۔

چاند کی ابتدائی تاریخوں کا ذکر ہے۔ ایک رات لالی نے فرار ہونے کا تہیہ کیا۔ چاند مغربی افق پر طلوع ہوا اور چند گھنٹے بعد غروب ہو گیا۔ آسمان بھی دھندلا اور غبار آلود تھا۔ چاند کے غروب ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ لالی سویا نہیں جاگتا رہا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار گردن اٹھا کر چوکنا نظروں سے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتا۔ بھٹے کی نگرانی کرنے والے پہریدار گشت پر تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ رات کے سناٹے میں رک رک کر اُبھر رہی تھی۔

لالی جاگتا رہا اور پہریداروں کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا۔ چاپ کبھی قریب آجاتی کبھی دور ہو جاتی۔ مگر وہ جھونپڑیوں اور جھگیوں کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے۔ رات آدھی ہو گئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ پہریداروں کے قدموں کی آہٹ بھی مدھم پڑ گئی۔ وہ بھی اب تھکن اور نیند کے غلبے سے نڈھال ہو رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے سخت اور بنجر زمین پر اپنی لاٹھیاں بجاتے اور اس طرح کھنکارتے اور بولتے کہ ان کی آواز میں غنودگی کا عنصر شامل ہوتا۔

پہریداروں کی آوازیں جب دور ہو گئیں اور مدھم ہوتے ہوتے سناٹے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں تو لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھونپڑیوں کے آگے کھلے میدان میں مرد، عورتیں اور بچے چارپائیوں اور فرش پر بے خبر سو رہے تھے۔ لالی نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا اور گہری نیند سونے والوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔

وہ جھونپڑیوں سے دور نکل گیا۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ سونے والے ہنوز بے خبر سو رہے تھے۔ جھونپڑیاں اور جھگیاں سایوں کی مانند دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ لالی آگے بڑھتا گیا۔ ناگاہ اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ کوئی اسی کی طرف آ رہا تھا۔ لالی نے سراسیمہ ہو کر آواز کی جانب پلٹ کر نظر دوڑائی۔ ایک سایہ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ جھٹ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ نگاہیں گھما پھرا کر آس پاس دیکھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اینٹوں کا چٹا تھا۔ لالی آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس طرف بڑھا۔ قریب پہنچا اور چٹے کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔

قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی۔ لالی چٹے کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا رہا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی دم سادھے چپ بیٹھا رہا۔ انتظار کرتا رہا کہ آنے

والا گزر جائے اور دور چلا جائے تو وہ اٹھ کر آگے بڑھے اور بھٹے کی حدود سے باہر نکل جائے۔ آگے ویرانہ تھا۔ کیکر اور جنگلی بیریوں کی جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں۔ ان کی آڑ میں چھپتا چھپاتا وہ آگے نکل جاتا۔ فرار ہو کر شاداں کے پاس پہنچ جاتا جو اپنے ماموں کے گھر میں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

مگر چاپ عین اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے لاٹھی سے ٹھوکا دیا۔ لاٹھی پر لوہے کی ٹھوس شام چڑھی تھی۔ لاٹھی کمر سے جھلتی ہوئی گزری اور گھٹنے پر اس زور سے ٹکرائی کہ لالی تڑپ اٹھا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

"اوئے، کون ہے تو؟"

لالی نے مڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں ایک پہریدار اس کے سر پر بھوت کی مانند کھڑا تھا۔

لالی نے گھٹنا سہلاتے ہوئے جھٹ بات بنائی۔ "پیٹ میں جی سخت مروڑ تھی۔ ادھر ٹٹی کرنے آگیا تھا۔"

لیکن پہریدار نے اس کا عذر قابل اعتنا نہ سمجھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "اتنی دور کیوں آیا؟ ادھر جھگیوں کے نزدیک ہی کیوں نہیں بیٹھ گیا؟" اس نے غصے سے لالی کو دیکھا جو سہما ہوا بیٹھا تھا۔ "تجھے پتہ نہیں ادھر ٹٹی کرنے کی اجازت نہیں۔ اینٹیں گندی اور خراب ہو جاتی ہیں۔"

لالی نے گڑگڑا کر معذرت کی۔ "غلطی ہو گئی جی۔"

"کھڑا ہو۔" پہریدار نے لالی کی گردن اپنے مضبوط ہاتھ سے دبوچی اور ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔

لالی کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ الجھنے اور مزید تاویل پیش کرنے کی کوشش نہ کی۔ لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ اپنی جھونپڑی کی جانب چلا۔ پہریدار سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پھر لالی کو ڈانٹا، تنبیہہ کی اور زمین پر اپنی لاٹھی بجاتا اور زور زور سے کھنکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

لالی خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ آس پاس سونے والوں میں سے کئی کی نیند پہریدار کی ڈانٹ ڈپٹ سے اچاٹ ہو گئی۔ کسی نے کروٹ بدلی کسی نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ مگر نہ کوئی بولا نہ پرسش احوال کی۔ لالی بھی چپ پڑا رہا۔ لاٹھی سے گھٹنے میں ایسی کراری چوٹ آئی تھی کہ درد کی کسک سے دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ کسی پہلو قرار نہ تھا۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ بہت دیر بعد اسے نیند آئی۔ صبح کام پر بھی دیر سے گیا۔ گھٹنے کی تکلیف کے باعث ٹھیک سے کام بھی نہ کر سکا۔

گھٹنے پر چوٹ سے ورم آگیا تھا۔ وہ دو تین روز تک درد میں جتلا رہا۔ چلنے پھرنے اور کام کرنے میں تکلیف ہوتی۔ مگر اس واقعے کے بعد وہ بہت محتاط ہو گیا۔ یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ بھٹے سے فرار ہونا وہ جس قدر آسان سمجھتا تھا ایسا نہ تھا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے ارادے پر مضبوطی سے جما رہا۔ اس نے زیادہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے اور اپنے منصوبے کو زیادہ سے زیادہ ہوشیاری سے عملی جامہ پہنانے کا ایک بار پھر تہیہ کیا۔ وہ فرار ہونے کے لیے دن رات سوچتا رہا۔ اور مناسب موقعے کی تلاش میں لگا رہا۔

☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ یکایک تیز ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ بادل گھر کر آئے۔ بارش کا چھینٹا بھی پڑا۔ تھلوں پر رکھی ہوئی اینٹیں دھوپ میں خشک ہونے کے لیے دور دور تک قطاروں میں پھیلی تھیں۔ بارش بیس منٹ بھی نہ ہوئی مگر خاصی تیز تھی۔ کچی اینٹیں بڑی تعداد میں موٹے موٹے قطروں سے بھیگ کر جگہ جگہ سے چٹخ گئیں۔ ایسی اینٹیں ناکارہ قرار دے کر مسترد کر دی جاتی ہیں۔ پتھیروں کو ان کی کوئی اجرت نہیں دی جاتی۔

بارش ختم ہو گئی۔ مگر بھٹے پر کام نہ ہو سکا۔ گارا بارش کے پانی سے تربتر ہو کر اس قابل نہ رہا تھا کہ اسے سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کی جا سکیں۔ زمین بھی نم تھی اور بھیگی ہوئی اینٹیں، جو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچ گئی تھیں، اس قابل نہ رہی تھیں کہ کمہار ان کو اٹھاتے اور ریڑھوں میں بھر کر پکنے کے لیے بھٹے کے اندر پہنچاتے۔

مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی شام کا سماں تھا۔ فضا نہایت سہانی اور خوش گوار تھی۔ مگر پتھیرے سوگوار تھے۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے منڈلاتے تھے۔ ان کی ایک روز کی دہاڑی ماری گئی تھی۔ ان کی اجڑی اور بکھری ہوئی زندگی میں یہ ایک دل خراش سانحہ تھا۔

شام دھیرے دھیرے بھٹے کے در و دیوار پر پھیلتی جا رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی جھونپڑیوں کے سامنے نڈھال اور گم صم بیٹھے تھے۔ کہیں کہیں چولھوں میں آگ روشن تھی۔ فضا میں پکی ہوئی روٹیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مگر نہ روز مرہ کی چہل پہل تھی نہ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ ہر طرف بے کیف خاموشی چھائی تھی۔

اس خاموشی سے اکتا کر بھاول پور کے ایک ریاستی پتھیرے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگائی اور ایک ماہیا الاپنے لگا۔

بدلی آگئی ہے ساونڑدی
کوئی تدبیر ڈسا
رٹھے یار مناونڑدی
ہٹیاں تے کھنڈ وکدی
ہک تال غریبی ہے
دوجھا سنجڑاں کنڈ کیتی
باغاں وچ گھا کوئی ناں
جیرڑ ہے پاسے ماہی ٹریا
اوں پاسے دا راہ کوئی ناں

اس کی آواز میں سوز تھا۔ درد کی کسک تھی۔ سانولی سلونی شام اجڑ کر راکھ ہو گئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل دھواں دھواں ہو گئے۔ فضا بوجھل اور نڈھال ہو گئی۔ سرسراتی ہوئی ہوا میں ماہیے کے بولوں کی بازگشت تھی۔ لالی بھی اپنی جھونپڑی کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ ماہیا سن کر تڑپ اٹھا، جس کے بولوں کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

ساون کی بدلی گھر کر آگئی۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ روٹھے ہوئے یار کو منا سکوں! دکانوں پر شکر اور شیرینی بک رہی ہے۔ ادھر غربت ہے۔ یار نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا ہے باغوں میں کہیں سبزہ نہیں ہے۔ جدھر میرا محبوب گیا ہے، اس طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں۔

لالی کو شاداں یاد آگئی۔ اس کے پاس جانے اور اسے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے نئے عزم اور تازہ ولولے کے ساتھ فرار ہونے کا تہیہ کیا۔ موسم بھی فرار ہونے کے لیے سازگار تھا۔ اندھیرا دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے روٹی پکائی۔ کھانا کھایا۔ اور رات کے سنسان ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

لیکن پہر رات بھی نہ گزری تھی کہ میاں اسلم اپنے چند دوستوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ سیدھا بھٹے کے دفتر گیا۔ اسے کھلوایا۔ نوکروں نے جھپاک جھپاک کرسیاں نکال کر دفتر کے سامنے رکھیں۔ ایک میز بھی رکھی۔ میاں اسلم اپنے یار دوستوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی میراں بھٹی میں گیا۔ دیسی شراب کی بوتل لایا اور میاں اسلم کے سامنے میز پر رکھ دی۔ گلاس بھی رکھ دئے اور پانی سے بھرا ہوا جگ بھی میز پر رکھ دیا۔ پینے پلانے کا دور شروع ہو گیا۔

میاں اسلم لگ بھگ مہینہ بھر بعد رات کے وقت بھٹے پر آیا تھا۔ اس کی آمد کے خبر آن کی آن

میں ہر طرف پھیل گئی۔ لالی کو اطلاع ملی تو اس نے فرار ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب ایسی کوشش میں ناکامی کے امکانات زیادہ تھے۔ طرح طرح کے خطرات تھے۔ اور سب سے بڑا خطرہ میاں اسلم کا بھٹے پر موجود ہونا تھا۔ جب تک وہ موجود تھا' ہر کارندہ اور ہر نوکر مستعد اور چوکس تھا۔ لالی بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ دفتر کی سمت سے قہقہوں اور بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان آوازوں میں بھٹے کے مالک میاں اسلم کی آواز بھی شامل تھی۔ لالی ان آوازوں کو سنتا رہا۔ پھر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گیا۔

☆

رات کے سناٹے میں دبا دبا شور بلند ہوا۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ شور مغربی کونے کی جھونپڑیوں میں ہو رہا تھا۔ البتہ دفتر کی جانب خاموشی چھائی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پینے پلانے کی محفل ختم ہو چکی ہے۔ رات ابھی آدھی نہیں گزری تھی۔ مگر ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ لالی اٹھا اور تاریکی میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اس طرف روانہ ہوا جدھر شور اٹھ رہا تھا۔

قریب جا کر اس نے دیکھا' ایک بوسیدہ جھونپڑی کی دہلیز پر ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔ جھونپڑی کے اندر چراغ روشن تھا۔ اس کی پھیکی پھیکی روشنی میں عورت کا چہرہ مٹیالا نظر آ رہا تھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو ننگ دھڑنگ نو عمر بچے بھی اس کے پہلو میں حیران و پریشان بیٹھے تھے۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں عورت کو پہچان لیا۔ وہ سلامو بتھیرے کی بیوی' جگنی تھی۔ سلامو کا نام بھی اسلم تھا۔ مگر سب اسے سلامو کہتے تھے۔

سلامو کی بیوی کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لیکن سلامو غائب تھا۔ اس کی بیوی کے آس پاس بھٹے پر کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا۔ ہجوم زیادہ بڑا نہ تھا اور اس میں بھی اکثریت سلامو کے عزیز و اقارب کی تھی۔ لالی بھی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ دریافت کرنے پر عقدہ کھلا کہ اندھیرے میں دو کارندے آئے اور جھونپڑی کے باہر سوتی ہوئی سلامو کی چودہ سالہ بیٹی رانو کو اٹھا کر لے گئے۔ انھوں نے جب رانو کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مزاحمت کی۔ ہاتھ پیر چلائے۔ چیخنے چلانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن ایک کارندے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے دبایا کہ آواز نہ نکل سکی۔

سلامو اور اس کی بیوی کی بھی آنکھ کھل گئی۔ دونوں نے پریشان ہو کر دیکھا' رانو کا بستر خالی تھا۔ کارندے اسے اٹھا کر تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ اب سلامو کی بیوی اپنی رسوائی اور بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ اور سلامو اپنی بیٹی کو واپس لینے میاں اسلم کے پاس گیا تھا جو ابھی تک دفتر کے

برابر والے کمرے میں موجود تھا۔

ہجوم میں شامل عورتوں اور مردوں کے چہروں پر جھنجلاہٹ تھی۔ آنکھوں میں نفرت کے شرارے تھے۔ وہ دبی زبان سے اپنے اپنے طور پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھی۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کوئی احتجاج کر رہا تھا۔ کوئی رانو کی ماں سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا' تسلی دے رہا تھا' دل جوئی کر رہا تھا۔ اور وہ رو رو کر بیتا رہی تھی۔

"میں نے اور سلامو نے تو یہ سوچا تھا جی کہ اب کے برکھا میں پنڈ جا کر رانو کا ویاہ کر دیں گے۔ نکاح تو تب ہی کر دیا تھا جب وہ نو سال کی تھی۔ اب تو وداع کرنا تھا۔ اسے سوہرے بھیجنا تھا۔" وہ بے قرار ہو کر سینے پر دو ہتھڑ مارتی۔ "ہائے ربا' میں تو برباد ہو گئی۔"

وہ روتی رہی' بلکتی رہی' فریاد کرتی رہی۔ اپنا دکھ درد سناتی رہی۔ اندھیری رات دم بخود کھڑی تھی۔ آسمان پر ابھی تک بادل چھائے تھے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی' سرسراہٹ تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ لالی خاموش کھڑا تھا۔ نہ اس نے کوئی تبصرہ کیا نہ کسی رد عمل کا اظہار کیا۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ ابھری۔ سلامو اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ قریب آیا تو دھندلی دھندلی روشنی میں سب نے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا۔ رانو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال گرد سے آلودہ تھے۔ قمیص پھٹ کر لیرلیر ہو گئی تھی۔ برہنہ پیٹھ اور کمر پر چھتری مار کے نشان صاف نظر آ رہے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ کنپٹی اور رخساروں پر خراشیں تھیں۔

بیوی نے اسے تنہا دیکھا تو اور زور زور سے رونے لگی۔ تڑپ کر بولی۔ "تو اکیلا آ گیا۔ میری رانو کو نہیں لایا۔ ہائے' اب میں اس کے گھر والے کو کیا بتاؤں گی۔ انہیں کیسے منہ دکھاؤں گی۔" وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ گلے شکوے کر رہی تھی۔ "سلامو' تو رانو کو کیوں نہیں لایا؟ تیری غیرت کو کیا ہو گیا۔؟ بول' اب بولتا کیوں نہیں؟"

سلامو کچھ نہ بولا۔ یکایک اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تناؤ پیدا ہو گیا۔ ہانپنے کے سے انداز میں زور زور سے سانس لینے لگا۔ اس نے خونخوار نظروں سے اپنی بیوی' جگنی' کو دیکھا۔ تیزی سے جھپٹا اور اس کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ دوہری ہو گئی۔ سلامو نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پکڑے' اپنی طرف کھینچا' اور پاگلوں کی طرح مارنے لگا۔ کئی مرد ہجوم سے نکل کر جھٹ اس کے قریب پہنچے اور پکڑ کر علیحدہ کیا۔ مگر وہ بار بار ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ بیوی کو ننگی ننگی گالیاں دیتا' بپھرتا اور مارنے کے لیے جھپٹتا۔

شور سن کر ہر طرف سے مرد اور عورتیں گھبرا کر وہاں پہنچ گئے۔ ہجوم اب بڑھ گیا تھا۔ سب سلامو کو دیکھ رہے تھے۔ فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی جگنی کو دیکھ رہے تھے۔ بول رہے تھے' باتیں کر رہے تھے' بڑبڑا رہے تھے۔ کوئی سلامو کو لعن طعن کر رہا تھا۔ کوئی سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اس کی بیوی سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا۔

اسی اثنا میں حنیف ڈوگر کئی کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے سلامو کو غصے سے ڈانٹا۔ "اوئے حرام دے' تو نے فیر رولا کیا۔ ابھی تیرا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔ کچھ اور گرمی اتروانی ہے؟"

ڈوگر کو دیکھتے ہی سب دم بخود ہو گئے۔ ہجوم بکھرنے لگا۔ سب دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگے۔ حنیف ڈوگر نے ان کو بھی قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ گندی سی گالی دے کر زور سے دھاڑا۔ "یہاں تماشا دیکھنے آئے ہو؟ جاؤ' جا کر سو جاؤ' سویرے کام نہیں کرنا۔" کسی نے کچھ نہ کہا۔ اور سب منتشر ہو کر اس کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنی اپنی جھونپڑیوں کی جانب کھسکنے لگے۔ لالی بھی پیچھے ہٹا' مڑا اور اپنی جھونپڑی کی سمت روانہ ہو گیا۔ بعد میں سلامو اور اس کی بیوی پر کیا گزری اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

صبح ہوئی تو لالی نے دیکھا' سلامو سانچوں میں گارا بھر بھر کر اینٹیں بنا رہا تھا۔ بیوی بھی اس کے ساتھ کام کر رہی تھی اور رانو بھی موجود تھی۔ وہ سر جھکائے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ بادل اب چھٹ چکے تھے۔ گہرے نیلے آسمان پر ابر کے سفید سفید لکے منڈلا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سورج چمک رہا تھا۔ گرمی پھر بڑھ گئی تھی۔

سلامو کام کرتا جاتا۔ پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھتا اور جھنجلا جھنجلا کر کبھی بیوی کو گالیاں دیتا' کبھی بیٹی کو۔ اس کی اونچی آواز بار بار سنائی دیتی۔ آس پاس کام کرنے والے پتھیرے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے بجھاتے۔ خاموش رہنے کی تلقین کرتے۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ برابر گالم گلوچ کرتا رہا۔ جو سمجھانے کی کوشش کرتا اس پر بھی غصے سے برستا۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز بھٹے کے دفتر تک پہنچ رہی تھی جہاں اسلم بیٹھا تھا۔ وہ اس روز خلاف معمول سہ پہر کو آیا تھا۔

میاں اسلم کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد حنیف ڈوگر پتھیروں کی جانب آتا ہوا نظر آیا۔ وہ سیدھا سلامو کے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھتر دبا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ حنیف ڈوگر نے غصے سے سلامو کو ڈانٹا پھٹکارا۔ گالیاں بھی دیں۔ آنکھیں نکال کر جھپٹا اور سڑاک سڑاک چھتر مارے۔ سلامو چند لمحے خاموش کھڑا پٹتا رہا اور تیکھی نظروں سے ڈوگر کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے

جھپٹ کر ڈوگر کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ کچی اینٹوں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ سنبھل کر پلٹا اور چھتر اٹھا کر سلامو پر جھپٹا۔ مگر سلامو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ آخر ڈوگر نے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ اب وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے بھر بھر کر سلامو کو چھتر سے مارنا شروع کر دیا۔ سلامو بلبلا بلبلا کر کبھی ادھر ہٹتا کبھی ادھر۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ وہ جھپٹا اور ڈوگر سے چمٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی ہر طرح کوشش کرنے لگے۔ اس کشمکش اور کھینچا تانی میں دونوں نے اپنی پیروں سے تازہ بنی ہوئی کچی اینٹوں کو روند کر مسمار کر دیا۔

یہ سب اینٹیں سلامو' اس کی بیوی اور بیٹی نے بنائی تھیں۔ مگر اس کی بیوی اور بیٹی سہمی ہوئی کھڑی تھیں اور سلامو کو ڈوگر سے ہاتھا پائی اور زور آزمائی کرتے دیکھ رہی تھیں۔ پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں نے بھی کام چھوڑ دیا تھا اور دونوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ رہے تھے۔ وہ خاموش تھے اور حیران و پریشان نظر آ رہے تھے۔ نہ کسی نے سلامو کو منع کیا نہ بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔

حنیف ڈوگر بھاری بھرکم تھا۔ اس کے جسم پر خوب گوشت چڑھا تھا۔ تگڑا اور مضبوط بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں سلامو دبلا پتلا تھا۔ گوشت کم اور ہڈیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ ڈوگر بار بار دھکا دے کر سلامو کو گرا دیتا۔ کبھی اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا کبھی سر کے بال پکڑ کر اٹھاتا اور گھما کر چھتر مارتا۔ مگر سلامو ہر بار اس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا۔ پلٹتا اور پھر جھپٹتا۔ وہ برابر پٹتا رہا' مار کھاتا رہا۔ مگر باز نہ آیا۔ اب ڈوگر لمبی لمبی سانسیں بھر کر ہانپنے لگا تھا۔

سلامو نے ایک بار کچکچا کے اس زور سے ڈوگر کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ چکرا گیا۔ سنبھلا بھی نہ تھا کہ سلامو نے اچھل کر دھکا دیا۔ ڈوگر لڑکھڑا کر گارے میں گر پڑا۔ سلامو نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لی اور گارے میں ٹھونس دی۔ مگر ڈوگر نے جلد ہی زور لگا کر اپنی گردن گارے سے باہر نکال لی۔ اس کا چہرہ گارے سے لت پت ہو کر نہایت ڈراؤنا اور ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا اور اونچی آواز سے سلامو کو گالیاں دے رہا تھا۔

چیخ پکار سن کر آناً فاناً چاروں طرف سے کارندے حنیف ڈوگر کی مدد کو دوڑے۔ انھوں نے سلامو کو دبوچ کر بے بس کر دیا۔ ڈوگر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گارے سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ اس بری طرح ہانپ رہا تھا کہ سانس سینے میں نہ سماتی تھی۔ نہ اس نے سلامو کو مارنے کی کوشش کی اور نہ ہی گالیاں دیں۔ سب کی سامنے اس کی ایسی کرکری ہوئی تھی کہ وہ کسی سے نظر

ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔ وہ چہرے سے گارا پونچھتا' کپڑے جھاڑتا' دفتر کی جانب روانہ ہوا۔ اس کی ہدایت پر کارندے سلامو کو مارتے پیٹتے اور گھسیٹتے ہوئے اسی سمت لے گئے جدھر حنیف ڈوگر گیا تھا۔

سارے پتھیرے اور بھٹہ مزدور ہکا بکا کھڑے تھے۔ نہ کسی نے کارندوں سے باز پرس کی اور نہ ہی سلامو کو چھڑانے اور آزاد کرانے کی کوشش کی۔ صرف سلامو کی بیوی اور بیٹی کے چہروں پر غم و غصہ برس رہا تھا۔ وہ سسکیاں بھر کر رو رہی تھیں اور قہر آلود نظروں سے سلامو کو کارندوں کے نرغے میں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

ڈوگر کے ساتھ ساتھ سلامو بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بھٹے پر سکوت طاری ہو گیا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے۔ کسی کو مطلق پتہ نہ چلا کہ سلامو کا کیا حشر ہوا۔ اس کی بیوی بھی ادھر نہ گئی۔ سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ اس کے ساتھ صرف اس کی بیٹی رو رہی تھی۔ نہ کوئی ان کو تسلی دینے آیا نہ کسی نے دل جوئی کی۔ سب خاموش اور دہشت زدہ تھے۔

☆

سورج مغرب میں اتر گیا۔ شام نیچے اترنے لگی' پھیلنے لگی۔ جھٹ پٹے میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں نے دیکھا' سلامو دفتر کے عقب سے نکلا۔ کارندے اس کے بازو اور ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ نہایت حقارت اور بے دردی سے سلامو کو دھکے دیتے ہوئے چمنی کی جانب بڑھے اور بھٹے کے اندر داخل ہو گئے۔

سلامو کو بھٹے کے دہکتے ہوئے توے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پیر برہنہ تھے۔ توے پر پہنچتے ہی اس کے تلوے سلگنے لگے۔ اس نے تکلیف اور جلن برداشت کرنے کی غرض سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ تپتے توے سے وہ نیچے نہ اتر سکتا تھا۔ دو کارندے اس کی نگرانی پر مامور تھے اور نہایت چوکس کھڑے تھے۔ سلامو بار بار پیر پٹختا۔ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتا۔ اس کے پیر جھلستے رہے' سلگتے رہے۔ اس نے بے بسی سے گردن ہلائی۔ درد سے تلملایا' منہ پھاڑا اور بے اختیار چیخ نکل گئی۔

شام کے سناٹے میں چمنی کے اندر سے سلامو کی گھٹی گھٹی چیخیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ اس کی بیوی اور بیٹی ہر چیخ پر تڑپ اٹھتیں۔ روتیں' آنسو بہاتیں' بے قرار ہو کر چمنی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھتیں جس کے بیچوں بیچ گرم توے پر سلامو کھڑا تھا۔ اس توے کو کوئلے اور لکڑیاں جلا کر انگارے کی طرح گرم کیا جاتا تھا اور کچی اینٹوں کو پکا کر پختہ بنایا جاتا تھا۔ اب اس توے پر کچی

اینٹوں کے بجائے کارندوں نے سلامو کو کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے پیر جل رہے تھے۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو کر چیخ رہا تھا' چلا رہا تھا' دہائی دے رہا تھا۔

موسم گرما کی سلگتی شام رفتہ رفتہ تاریک ہوتی گئی۔ بھٹے پر کام کرنے والا ہر پتھیرا ہر محنت کش سہما ہوا تھا' خوف زدہ تھا۔ سلامو کی چیخیں سن رہا تھا۔ اچانک چیخیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد سلامو بھٹے سے باہر نکلا۔ مگر چند قدم چلتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ فرش پر بے حال پڑا تھا۔ کارندوں نے اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ وہ کھڑا ہو سکتا تھا نہ چل سکتا تھا۔

ایک مضبوط اور قوی ہیکل کارندے نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا سلامو کی جھونپڑی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا۔ جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور سلامو کو بستر پر ڈال دیا۔ کارندہ چلا گیا۔ سلامو خاموش لیٹا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ اس کے تلوے جل کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ بیوی اور نوجوان بیٹی' رانو نے اس کا یہ حال دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ دونوں بچے بھی ماں اور بہن کو روتے دیکھ کر منہ بسورنے لگے۔ جھونپڑی میں کہرام برپا تھا۔

سب سے پہلے عزیز دار اور کنبے والے سلامو کو دیکھنے جھونپڑی کے اندر گئے۔ رفتہ رفتہ دوسرے پتھیرے اور ہٹ مزدور بھی پہنچنے لگے۔ لالی بھی گیا۔ اس نے دیکھا' چراغ کی زرد زرد روشنی میں سلامو آنکھیں بند کئے پڑا تھا اور بے قراری سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ نہ وہ بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔

ایک پتھیرے نے سلامو کی بیوی جگنی کو مشورہ دیا۔ "پیروں پر دیوے کا گرم گرم تیل روئی ڈبو کر لگا دے۔ جلن کم پڑ جائے گی۔"

"دیوے کے تیل سے کیا بنے گا۔ یہ علاج تجھے کس نے بتایا؟" سلامو کے بوڑھے چچا نے اسے ٹوکا اور اپنا نسخہ تجویز کیا۔ "دودھ مل دے۔ آرام آجائے گا' پر دودھ ابلا ہوا نہ ہو۔ دودھ بالکل تازہ ہو تو فوراً آرام آجائے گا۔"

"بابے تو نے بھی حد کر دی۔" سلامو کے سرہانے کھڑے ہوئے ایک نوجوان کمہار نے حیرت کا اظہار کیا۔ "ادھر بھٹے پر دودھ کہاں ملے گا اور تازہ دودھ ملنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "یہاں تو ٹک کی روٹی بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتی۔ تو دودھ کی گل کر رہا ہے۔"

باری بھی جھونپڑی میں موجود تھا۔ وہ جنم جنم کا پتھیرا تھا۔ اس کا باپ بھی پتھیرا تھا۔ اور کم سنی ہی میں اسے اینٹیں بنانے پر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ اب وہ ادھیڑ ہو چکا تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ وہ دور اور نزدیک کے مختلف بھٹوں پر کام کر چکا تھا۔ اس کی دو نوجوان بیٹیاں ابھی تک میاں اسلم اور حنیف ڈوگر کے قبضے میں تھیں۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ کسی اور بھٹے پر کام کر رہا تھا۔ بیوی کہیں اور کام کر رہی تھی۔ باری کو بیٹے اور بیوی کی بارے میں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟

جوانی میں باری بھی بہت سرکش اور جیالا مشہور تھا۔ بھٹہ مالکوں اور ان کے جمعداروں کے طرح طرح کے مظالم جھیل چکا تھا۔ دو بار سزا کے طور پر بھٹے کے دہکتے ہوئے توے پر بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے ہر طرح کے ظلم و ستم کا بخوبی تجربہ تھا۔

باری نے پہلا کام تو یہ کیا کہ دوسرے پتھیروں کی مدد سے سلامو کو جھونپڑی سے باہر نکالا اور تازہ ہوا میں ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک طرح چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچے آلو دبے تھے۔ خدا معلوم کہاں سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔ وہ جھونپڑی کے اندر گیا۔ چراغ کی روشنی میں آلو پتھر پر رکھ کر اچھی طرح کچلے۔ مٹی کی ایک پلیٹ میں سمیٹ کر رکھے۔ سلامو کے پاس پہنچا اور ہولے ہولے کچلے ہوئے آلوؤں کا لیپ سلامو کے تلوؤں پر لگانے لگا۔

سلامو نے تلملا کر پہلو بدلا۔ باری نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔ "گھبرا نہیں، تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "مجھے بھی پتہ ہے۔ توے پر کھڑے ہونے کی بعد پیروں میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔"

باری نے آلوؤں کا لیپ سلامو کے دونوں تلوؤں پر اچھی طرح لگا دیا۔ سلامو کچھ دیر تو بے قرار رہا، مگر اب وہ خاموش پڑا تھا اور آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ بیوی چارپائی کی پٹی سے لگی اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ سر دبا رہی تھی۔ قریب ہی اس کی بیٹی، رانو اور دونوں بچے دم بخود بیٹھے تھے۔

ڈوگر ایک طرف سے دو کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ سلامو کی پاس پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسروں کو بھی گالیاں دینے لگا، دھونس اور دھمکی دینے لگا۔ مگر اس دفعہ کوئی ہٹا نہیں۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں رہا۔ حنیف ڈوگر برافروختہ ہو کر اور زور زور سے ڈانٹنے پھٹکارنے لگا۔ پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کے چہروں پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ احتجاج کے طور پر طرح طرح کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

"جمعدار گالاں نہ نکال۔"

"رب سے ڈر۔ اتنا ظلم کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"گڑیاں اور زنانیاں اٹھاتے ہوئے تجھے شرم کرنی چاہیے۔"

"سلامو نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا۔"

"ہن جی' یہ عزت کا سوال ہے۔"

آوازیں اونچی اور اونچی ہوتی گئیں۔ لہجہ تلخ تر ہوتا گیا۔ چہروں کا تناؤ بڑھ گیا۔ آنکھوں سے غم و غصہ جھلکنے لگا۔ حنیف ڈوگر نے ان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہوا اپنے کارندوں کے ہم راہ چلا گیا۔ وہ سخت چراغ پا تھا۔

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ صرف سلامو اپنی جھونپڑی میں تنہا لیٹا تکلیف سے کراہتا رہا۔ بے چینی سے باربار کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بیوی جگنی اور بیٹی رانو گارا بنا رہی تھیں اور گارے کو سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کر رہی تھیں۔ سلامو کے دونوں کم سن بچے بھی ماں اور بہن کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق مستعدی سے مدد کر رہے تھے۔

حنیف ڈوگر دن بھر نظر نہ آیا۔ مگر شام کو جب چھٹا بٹا تو وہ حسب معمول منشی کے عقب میں کارندوں کے ہم راہ موجود تھا۔ وہ منشی کے سامنے نیم دائرے میں فرش پر بیٹھے ہوئے پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کو غصے سے گھور رہا تھا۔ گزشتہ شب اس کی جو بے عزتی ہوئی تھی' اس پر سخت برہم تھا۔ اس کی آنکھوں سے جو کدورت اور نفرت جھلک رہی تھی' اس کی شدت کا اندازہ اس وقت ہوا جب کسی کو منشی نے اجرت نہ دی۔ ہفتے بھر کی پوری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لی۔ جس نے بھی احتجاج کرنے کی کوشش کی حنیف ڈوگر نے بپھر بپھر کر اس کی پیٹھ اور کمر پر سڑاک سڑاک چھتر لگائے۔ مگر نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ گڑبڑ۔

☆

تمام پتھیرے اور بھٹہ مزدور رات بھر جاگتے رہے۔ چوری چھپے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ سرگوشیاں کرتے رہے۔ تمام رات یہ خفیہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ صبح ہوئی تو کوئی پتھیرا اور کوئی بھٹہ مزدور کام پر نہ گیا۔ سب اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھے رہے۔

پھر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ مگر بھٹہ سنسان تھا۔ نہ کوئی چہل پہل تھی نہ گہما گہمی۔ حنیف ڈوگر اپنے کارندوں کے ساتھ پیچ و تاب کھاتا ہوا

جھونپڑیوں پر پہنچا۔ چیخا چلایا۔ ڈرایا دھمکایا۔ مگر کوئی بھی جھونپڑی سے نکل کر کام پر نہ گیا۔
دوسرے روز بھی کوئی کام پر نہ گیا۔
میاں اسلم اس صورت حال سے سخت پریشان ہوا۔ اسے ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے لیے بہت بڑی تعداد میں اینٹیں فراہم کرنا تھیں اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں فراہم کرنا تھیں۔ یہ ٹھیکہ اس نے بہت بھاگ دوڑ کرنے اور تگڑی رشوت دینے کے بعد حاصل کیا تھا۔ ٹھیکے کی بنیادی شرط وقت مقرر کے اندر اینٹیں فراہم کرنا تھی۔ تاخیر کی صورت میں ٹھیکہ منسوخ ہو جانے کا شدید خطرہ تھا۔
سہ پہر کو میاں اسلم نے ڈوگر کو طلب کیا۔ وہ اس وقت بھٹے کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ بشرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ چہرے سے پسینا پونچھ رہا تھا۔ حنیف ڈوگر دفتر میں داخل ہوا اور سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔
میاں اسلم نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”ڈوگر، آج بھی بھٹے پر کام شروع نہیں ہوا۔“
”فکر نہ کریں جی، کل کام شروع ہو جائے گا۔“ حنیف ڈوگر نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”بھوکے مریں گے تو سارے ہی پتھیرے اور مزدور خود ہی کام پر پہنچ جائیں گے۔“
”اور وہ کل بھی کام پر نہ آئے تو؟“
”نئے پتھیرے بھرتی کر کے لے آوں گا۔“ ڈوگر نے صفائی پیش کی۔ ”کیا کریں جی۔ سب نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ آنکھیں دکھاتے ہیں۔ رولا کرتے ہیں۔ ان کی چھابی کسنا بہت ضروری تھی۔ آگے بھی بہت زیادہ تنگ کریں گے۔“
”تو چھابی کستا رہنا، ادھر اپنا بیلیتھن نکل جائے گا۔“ میاں اسلم برس پڑا۔ ”تو بالکل کام کا بندہ نہیں۔ ایک دم ہڈ حرام ہو گیا ہے۔ تجھ سے جمعداری نہیں ہونے کی۔“
”میاں صاحب، میری گل تو سنو۔“ ڈوگر نے عاجزی سے ایک بار پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
”میں نے تیری کوئی گل شل نہیں سننی۔“ میاں اسلم جھنجلا کر زور سے چیخا۔ ”تو میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔ نکل جا یہاں سے۔“
حنیف ڈوگر نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مڑا اور گردن جھکائے ہوئے چپ چاپ دفتر سے باہر چلا گیا۔
شام کو میاں اسلم نے تمام پتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو بلایا۔ جب وہ دفتر کے سامنے

پہنچ گئے تو میاں اسلم باہر آیا۔ میراں نے کرسی نکال کر دفتر کے باہر رکھ دی۔ میاں اسلم اس پر اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ اس کے روبہ رو بھٹے پر کام کرنے والے تمام پتھیرے اور مزدور فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے جسموں سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ ان کے چہرے بالکل سپاٹ تھے۔ وہ نظریں اٹھائے میاں اسلم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میاں اسلم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اونچی آواز سے سب کو مخاطب کیا۔ ”کیوں جی‘ تم سب نے دو روز سے کام کیوں بند کر رکھا ہے؟“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

”بولو‘ جواب دو۔ تم نے کام کیوں بند کر رکھا ہے؟“ اس دفعہ اس نے زیادہ اونچی آواز سے پوچھا۔

سب نظریں گھما پھرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ سراسیمہ اور گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی‘ پھر ایک بوڑھا پتھیرا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب اسے بابا نور دین کہتے تھے۔ بابا نور دین نے پچھلے چند روز کے واقعات سنبھل سنبھل کر میاں اسلم کو سنائے۔ حنیف ڈوگر اور کارندوں کے ظلم و ستم بتائے۔ منشی کی دھاندلی سے آگاہ کیا۔ اس نے رانو کے اغوا کی واردات اور سلامو پر ڈھائے جانے والے جبر و تشدد کی روداد اس قدر دل گرفتہ اور جذباتی ہو کر سنائی کہ آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ بابا نور دین نے بوسیدہ قمیص کا دامن اٹھایا اور اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

میاں اسلم خاموش بیٹھا بابا نور دین کی ایک ایک بات پوری توجہ سے سنتا رہا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو میاں اسلم نے رانو کے اغوا پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈوگر نے کرندوں کے ذریعے رانو کو اٹھوایا تھا؟ یہ تو اس نے بہت گندی حرکت کی۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ اسے اٹھا کر کہاں لے گیا تھا؟“

رانو بھی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی اور تعجب سے آنکھیں پھاڑے میاں اسلم کو دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ اس نے تمام رات بے بسی کے عالم میں بسر کی تھی۔

مگر میاں اسلم اس کے احساسات اور حیرانی و پریشانی سے بالکل بے نیاز تھا۔ اس نے تیوری پر بل ڈالے‘ چہرے پر جھنجلاہٹ طاری کی اور اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ ”میں ڈوگر کی جمعداری ختم کر دوں گا۔ اس کی چھٹی کر دوں گا۔“

مجمعے میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہوئی۔ دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ مرجھائے ہوئے چہروں پر

اطمینان جھلکنے لگا۔ میاں اسلم نے سلامو کی بیوی ' جگنی ' کو بلایا۔ پندرہ روپے جیب سے نکال کر سلامو کے علاج معالجے کے لیے دیئے۔ اسے تسلی بھی دی۔ اس نے گردن اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے پتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو دیکھا۔ غصے سے حنیف ڈوگر اور کارندوں کو برا بھلا کہا۔ منشی کو فہمائش کرنے کا وعدہ کیا اور پتھیروں کو خوش کرنے کے لیے فی ہزار کچی اینٹ کی اجرت میں دو آنے کے اضافے کا اعلان کیا۔

اس اعلان سے پتھیرے واقعی خوش ہو گئے۔ بن مانگے مراد پوری ہوئی تھی۔ وہ ہنستے مسکراتے میاں اسلم کو دعائیں دیتے اپنی اپنی جھونپڑیوں اور جھگیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ سلامو کی بیوی بھی اپنا سارا دکھ درد بھول گئی۔ پندرہ روپے اس کی دھوتی کے ڈب میں نہایت حفاظت سے رکھے تھے۔ باری سب سے زیادہ خوش تھا۔ اس کی دونوں بیٹیاں جو لگ بھگ چار مہینے سے لاپتہ تھیں رات ہی کو واپس آ گئی تھیں۔

میاں اسلم نے ایسا انجر پھینکا کہ پتھیرے اس سے نہال ہو گئے۔ ن کے سوکھے پتلے اور مریل جسموں میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ وہ اب دبا کے محنت کرتے۔ زیادہ جوش و ش سے کام کرتے اور اکثر و بیشتر بلا عذر چودہ چودہ گھنٹے کام کرتے۔ بھٹے کے وسیع میدان میں ہر طرف اینٹوں کے چٹے نظر آتے تھے۔

منشی کا رویّہ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ چٹھا بانٹتے وقت بے زاری اور جھنجلاہٹ کا اظہار نہ کرتا۔ نرمی سے بات کرتا۔ پیشگی بھی کم سے کم کاٹتا۔ ٹوٹ پھوٹ اور ٹیڑھی بیڑھی اینٹوں کی کٹوتی میں بھی رعایت سے کام لیتا۔ ہنسنے بولنے اور ملنے جلنے پر بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ کارندے بھی بہت کم نظر آتے۔ اور حنیف ڈوگر تو بالکل نظر نہ آیا۔ عام خیال یہ تھا کہ میاں اسلم نے اس کی جمعداری ختم کر دی ہے۔

☆

لالی نے زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے کی خاطر فرار ہونے کا ارادہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا تھا۔ وہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی دیر تک اینٹیں بناتا رہتا۔ وہ تھکا ہارا کام سے واپس آتا۔ جلدی جلدی روٹی پکاتا اور کھانا کھاتے ہی بے خبر ہو کر سو جاتا۔ دو ہفتے سے بھی زائد عرصہ اسی عالم میں گزر گیا۔ مگر ایک صبح اس نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا' حنیف ڈوگر بھٹے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم راہ ایسے نئے پتھیرے بھی تھے جنھیں لالی نے پہلی بار دیکھا تھا۔

لالی نے معمول کے مطابق کچی اینٹیں تیار کیں۔ کام ختم کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر سو

گیا۔ پہر رات گزری تھی کہ کسی نے اسے زور زور سے جھنجوڑا۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک مُسلح کارندہ سرہانے کھڑا تھا۔ لالی نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کارندے نے ڈپٹ کر کہا۔ ”فٹافٹ اپنا سامان اٹھا۔“

”کیوں؟“ لالی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔“ کارندہ آنکھیں نکال کر بولا۔ اندھیرے میں وہ بھوت کی مانند خوفناک نظر آ رہا تھا۔

لالی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ چارپائی سے نیچے اترا اور جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ کارندے نے اپنی لمبی ڈانگ سے اس کی کمر کو ٹہوکا دیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”تیزی سے ہاتھ چلا۔“ لالی نے کچھ نہ کہا۔ اپنا سامان سمیٹ کر گٹھری بنائی اور کارندے کی جانب دیکھنے لگا۔

”ادھر چل۔“ کارندے نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر چلنے کا اشارہ کیا۔

لالی چپ چاپ آگے بڑھا۔ کارندہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ لالی ہنوز حیران و پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دبی زبان سے دریافت کیا۔ ”تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”چپ کر کے چلتا رہ۔“ کارندے نے بے رخی سے ڈانٹا۔ ”بیکار کی بکواس نہ کر۔“

ڈانٹ سن کر لالی کو مزید پوچھ گچھ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ اپنی گٹھری سنبھالے ’کان دبائے‘ کارندے کے ہم راہ چلتا رہا۔ دونوں اندھیرے میں ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں اور گڑھوں سے بچتے بچاتے آگے بڑھتے رہے۔ نہ کارندے نے کوئی بات چیت کی اور نہ ہی لالی بولا۔ کارندہ گردن اٹھائے نہایت مستعدی سے چل رہا تھا۔

لالی نے دور سے دیکھا' بھٹے کے نکڑ پر سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ کارندہ ٹرک ہی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ اسی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اسے جمعدار حنیف ڈوگر نظر آیا۔ وہ ٹرک کے نزدیک دھندلی دھندلی روشنی میں نہایت پر اسرار انداز میں کھڑا سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ کا سلگتا ہوا کنارہ اندھیرے میں بار بار دہکتا۔ اس کے دہکنے سے سرخ سرخ روشنی پھیلتی۔

حنیف ڈوگر نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ سرسری نظر سے اسے دیکھا اور کارندے کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نے لالی کو ٹرک کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا جو کھلا ہوا تھا۔ کئی پتھیرے پہلے ہی

ٹرک میں موجود تھے۔ سب ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ لالی بھی سہما ہوا تھا۔ پتھیرے جھونپڑیوں کی طرف سے کارندوں کی نگرانی میں آتے رہے اور ٹرک میں بیٹھتے رہے۔ پھر ان کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا۔

چار مسلح کارندے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے اور پتھیروں کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ حنیف ڈوگر نے ٹرک کے آس پاس گھوم پھر کر پتھیروں کا جائزہ لیا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور ٹرک سڑک پر دوڑنے لگا۔ ٹرک میں انیس پتھیرے سوار تھے۔ ان میں مرد تھے۔ عورتیں تھیں اور بچے بھی تھے۔ مگر سلامو اور اس کے بال بچے ان میں شامل نہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سلامو ابھی تک چل پھر نہیں سکتا تھا۔ البتہ اس کے لگ بھگ سب ہی عزیز و اقارب ٹرک میں بیٹھے تھے۔

ٹرک رات کے سناٹے میں سڑک پر دوڑتا رہا۔ مختلف راستوں سے گزرتا' موڑ کاٹتا' کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف گھومتا' آگے اور آگے بڑھتا رہا۔ پتھیرے چپ بیٹھے تھے۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔ انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کی۔ اور اگر جھونپڑیوں اور جھگیوں سے نکلتے ہوئے ایسی کوشش کی بھی تو ان کو بھی لالی کی طرح کارندوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا تھا۔

بھٹے کے چاروں کارندے نہایت چوکس بیٹھے تھے۔ دو کے پاس بندوقیں بھی تھیں جنھیں وہ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ وہ چوکنا نظروں سے ٹرک میں بیٹھے ہوئے پتھیروں کو گھور رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بوڑھا کھانستا تو خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا۔ کارندے کھانسی کی آواز کے ساتھ ہی چونک پڑتے اور غصے سے کھانسنے والے پتھیرے کو دیکھتے۔ ان کے چہروں پر سختی اور کرختگی تھی۔ نام کو بھی نرمی اور مروت نہ تھی۔ وہ اپنے ہر رویے اور ہر انداز سے ڈرے سہمے پتھیروں کو دہشت زدہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ٹرک نے ایک موڑ کاٹا تو گشت کرنے والی پولیس کی ایک ٹولی سامنے آ گئی۔ ایک پولیس والے نے ہاتھ اٹھا کر ٹرک روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹرک رک گیا۔ کارندوں نے جھٹ اپنی بندوقیں قریب رکھی ہوئی پتھیروں کی گٹھریوں کی اوٹ میں چھپا دیں۔ پولیس والے ٹرک کی تلاشی لینے کی غرض سے آگے بڑھے۔

حنیف ڈوگر خود نیچے اترا۔ نرم لہجے میں ایک پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا "حوالدار جی' ٹرک میں پتھیرے بیٹھے ہیں۔ ان کو بھٹے پر پہنچانے جا رہا ہوں۔"

حوالدار نے ٹرک کے نزدیک جا کر ہتھیروں اور کارندوں کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ سارے ہتھیرے چپ بیٹھے رہے۔ کسی نے ڈر کے مارے چوں تک نہ کی۔ حوالدار اور دوسرے پولیس والوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

حوالدار نے ڈوگر سے پوچھا۔ ''تو کون ہے؟''

''میں جی جمعدار ہوں۔'' حنیف ڈوگر نے اسے مطلع کیا۔ ''سارے ہی ہتھیرے میاں اسلم کے بھٹے کے ہیں۔''

حوالدار نے مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ ہاتھ ہلا کر ٹرک آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ حنیف ڈوگر ٹرک پر سوار ہوا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ ٹرک ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے لگا۔ کارندوں نے جھک کر اپنی بندوقیں نکالیں۔ انھیں سنبھالا اور چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔

ٹرک لکھوڈیر کے بھٹے پر پہنچ کر رک گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ حنیف ڈوگر ٹرک کو ایسے پیچیدہ اور طویل راستوں سے گھما پھرا کر لے گیا تھا کہ ہتھیروں کو نہ تو راستے کا کچھ اندازہ ہو سکا اور نہ یہ علم ہوا کہ وہ کہاں پہنچے اور کس بھٹے پر پہنچے؟ وہ حیرت زدہ تھے۔ سہمے ہوئے تھے۔ تھکن اور نیند سے نڈھال تھے۔

ٹرک کے پہنچتے ہی بھٹے کا جمعدار 'زماں خان' کئی کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ ہتھیرے ٹرک سے نیچے اترے۔ حنیف ڈوگر نے ہتھیروں کو زماں خان کے حوالے کیا۔ اس نے ان کی گنتی کی۔ حنیف ڈوگر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ زماں خان سے رخصت ہوا اور ڈرائیور کے ساتھ ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ اس کے ہم راہ آنے والے چاروں کارندے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور فیروز پور روڈ کی جانب واپس روانہ ہو گیا۔

زماں خان کی ہدایت پر لالی اور دوسرے ہتھیروں کو بھٹے کے کارندوں نے دفتر کے پاس درختوں کے نیچے پہنچا دیا۔ نہ انھوں نے کارندوں سے کچھ پوچھا اور نہ ہی انھوں نے کچھ بتایا۔ ہتھیرے بے سروسامانی کے عالم میں رات بھر درختوں کے نیچے پڑے رہے۔ سویرے کچھ جھونپڑیاں خالی کرائی گئیں اور ان کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا گیا۔ مگر انھیں پرانے ہتھیروں سے الگ تھلگ رکھا گیا۔

لالی نے دوپہر تک آرام کیا۔ کھانا کھایا اور کام کرنے پہنچ گیا۔ اس نے مٹی کھود کر گارا تیار کیا اور سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگا۔ تھکن اور شب بیداری کے باعث اس روز وہ زیادہ دیر تک کام نہ کر سکا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اٹھ گیا۔ سرِ شام ہی پڑ کر سو گیا اور ایسی

گہری نیند سویا کہ صبح ہونے سے پہلے آنکھ نہ کھل سکی۔

☆

چند ہی روز میں لالی نئے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ لکھوڈیر کے بھٹے اور تیموں کے بھٹے میں کوئی فرق نہ تھا۔ پتھیروں پر وہی روک ٹوک اور پابندی تھی۔ جمعدار اور کارندوں کی وہی شورہ پشتی تھی۔ بات بات پر ڈانٹتے ڈپٹتے تھے۔ حقارت سے دھتکارتے تھے۔ تمام دن کڑی نگرانی کرتے تھے۔ رات کو پہریدار جھونپڑیوں کے اردگرد گشت کرتے تھے۔ زمین پر زور زور سے لاٹھیاں مار کر بجاتے تھے۔ اونچی آواز سے کھنکارتے تھے۔ کوئی پیشاب کو بھی اٹھتا تو فوراً ڈپٹ کر ٹوکتے تھے۔

ہفتے کی شام کو چٹھا بانٹا گیا۔ لالی کو پانچ روز کی دہاڑی کا صرف ڈیڑھ روپیہ ملا تو وہ بہت چکرایا۔ منشی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ صورت شکل سے وہ بھی خرانٹ لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، پھولے پھولے گال، بے ڈول جسم، پیٹ بڑھا ہوا۔ وہ گردن جھکائے رجسٹر کو بغور دیکھ رہا تھا۔

لالی نے دریافت کیا۔ "سوا چار ہزار اینٹ کی تو یہ بہت کم دہاڑی ہوئی۔ تو نے ٹوٹ پھوٹ کی کتنی کٹوتی کی؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ٹوٹ پھوٹ تو اتنی نہیں بنتی۔ پر تیری طرف پیشگی بہت ہے۔" منشی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کتنی پیشگی ہوتی ہے جی؟"

"پورے آٹھ سو روپے۔" منشی نے لالی کو مطلع کیا۔

"آٹھ سو!" لالی ہکا بکا ہو کر منشی کا منہ تکنے لگا۔ "میری طرف تو جی دو سو سے بھی کم پیشگی ہوتی تھی۔"

"کتنی پیشگی پہلے ہوتی تھی، اس کے بارے میں جمعدار حنیف ڈوگر بتائے گا۔" منشی نے بے زاری سے بتایا۔ "میرے رجسٹر میں آٹھ سو روپے پیشگی کے لکھے ہیں۔" اس دفعہ اس نے نظریں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ "تیرے نام پر اتنی ہی پیشگی ڈوگر کو ادا کی گئی ہے۔" اس کا لہجہ تلخ اور تیکھا ہو گیا۔ "کان کھول کر سن لے۔ ادھر رہ کر تجھے اتنی ہی پیشگی ادا کرنی ہوگی۔"

"پر میں نے تو جی، کل تین سو روپے پیشگی لی تھی۔" لالی نے وضاحت کی۔ "میرے حساب سے دیکھا جائے تو لگ بھگ سو روپے پیشگی کے ادا بھی کر چکا ہوں۔"

"میں نے تیرے حساب کو نہیں دیکھنا۔ میں نے تو وہ دیکھنا ہے جو میرے رجسٹر میں درج ہے۔"

اس کی آواز اونچی ہو گئی' برہم ہو کر بولا۔ "اب تو میرا مغز نہ کھا۔ اپنی دہاڑی اٹھا اور یہاں سے ٹرجا۔ تو اکیلا نہیں' میں نے اوروں کو بھی چھٹا یا نٹنا ہے۔"

لالی نے منشی سے مزید حجت کرنے کی کوشش نہ کی۔ خاموشی سے اپنی جھونپڑی میں گیا۔ آٹھ سو روپے پیشگی کی اطلاع نے اسے ذہنی طور پر اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ نہ تو اس نے روٹی پکائی اور نہ ہی کچھ کھایا پیا۔ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگا۔

شام جب رات میں ڈھل گئی تو واجد اس کے پاس آیا۔ وہ بھی تھیرا تھا۔ بیوی اور ایک نو عمر بیٹے کے ساتھ قریب کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کی بال کھچڑی ہو گئے تھی۔ ہر وقت کھانستا بھی رہتا تھا۔

لالی نے واجد کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واجد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا۔ "تو شام سے چپ پڑا ہے۔ تو نے روٹی بھی نہیں کھائی۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس کے لہجے سے ہمدردی عیاں تھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔ پر بھوک ہی نہیں لگی۔"

"تو کچھ پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔" واجد نے قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے دہاڑی بہت کم ملی۔ میں نے دیکھا تھا تو منشی سے پیشگی کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ میں تو منشی کے بالکل سامنے ہی بیٹھا تھا۔ کتنی پیشگی تو نے لے رکھی ہے؟"

"پیشگی تو میں نے تین سو لی تھی۔ سو روپے کے لگ بھگ دہاڑیوں سے کٹ بھی چکے تھے۔" لالی نے اسے مہربان پایا تو دل کی بات زبان پر لایا۔ "میرے حساب سے دو سو سے کچھ ہی اوپر ہو گی۔ تب میں میاں اسلم کے بھٹے پر کام کرتا تھا۔ ادھر آیا تو منشی نے اٹھ سو پیشگی بتائی۔ ساری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لی' کل ڈیڑھ روپیہ دیا۔"

"ہاں جی' یہ پیشگی کا چکر ہی ایسا ہے۔ ایک بار شروع ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔" واجد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جتنی کٹتی ہے اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک بھٹے سے دوسرے پر جاؤ تو اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ منشی سے پوچھو تو ٹھیک سے بتاتا بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جتنی چاہتا ہے کاٹ لیتا ہے۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتا ہے۔"

"تو نے کتنی پیشگی لے رکھی ہے؟" لالی نے دریافت کیا۔

"کوئی پیشگی شیشگی نہیں لی۔" واجد نے وضاحت کی۔ "جب ملتان کے بھٹوں پر کام کرتا تھا' تب بھی نہیں لی۔ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں لی۔"

"تب تو ادھر کیسے آ گیا؟ جمعدار زیادہ دہاڑی کا لالچ دے کر لایا ہو گا۔"

"نا جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" واجد نے لالی کو بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ میرا ایک بھتیجا' جی ٹی روڈ کے بھٹے بندے ماراں پر پتھیرا لگا ہوا تھا۔ اس کا ناں ہاشم ہے۔ بھٹے کے مالک نے اس پر ہزار روپے پیشگی بنا رکھی تھی۔ ساری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لیتا تھا۔ ہاشم کے پاس ہفتے بھر کی روٹی کو بھی نہ بچتا۔ اس کا پتر بیمار پڑا۔ منت سماجت کرنے پر بھی بھٹہ مالک نے اس کے دوا دارو کے لیے ادھار نہ دیا۔ وہ بیماری اور بھوک سے مر گیا۔ تھا تو پندراں سال کا پر جوان لگتا تھا۔ یہ اونچا ہوتا تھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچائی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "ہاشم خود بھی بیمار رہتا تھا اور اس کی گھر والی بھی روگی تھی۔ بھٹہ مالک نے ہاشم کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔"

"تنگ تو جی سارے ہی پتھیروں کو اسی طرح کیا جاتا ہے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"ہاشم کو زیادہ ہی تنگ کر رکھا تھا۔" واجد نے مطلع کیا۔ "اس کے بارے میں جب مجھے پتہ چلا تو بہت دکھ ہوا۔ اپنے خاندان والوں سے بات کی۔ وہ بھی پتھیرے تھے اور ایک ہی بھٹے پر اکٹھے کام کرتے تھے۔ سب کے صلاح مشورے سے یہ طے کیا گیا کہ ہاشم کو بھوک اور تنگ سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ وہ بھی اپنے پتر کی طرح مر جائے گا۔"

"تم سب نے اس کے لیے کیا کیا؟" لالی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کرنا کیا تھا جی' ملتان سے لہور پہنچے اور ہاشم کی پیشگی اتارنے کے لیے بندے ماراں کے بھٹے پر کام کرنے لگے۔" واجد نے بتایا۔ "ہم اٹھ بندے تھے۔ ان میں تین زنانیاں بھی تھیں۔ سب یہ سوچ کر گئے تھے کہ ہاشم کو اپنے ساتھ ہی ملتان لے جائیں گے۔ ہم نے دن رات زبردست محنت کی۔ اینٹیں بنا بنا کے ڈھیر لگا دیئے۔ کئی لاکھ اینٹیں بنا ڈالیں۔"

"تب تو ہاشم کی پیشگی ادا ہو گئی ہو گی۔"

"ادا تو ہو جانا چاہیے تھی' پر ایسا ہوا نہیں۔" واجد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مہینہ بھر سے کچھ اوپر ہوا ہو گا کہ ہم سب کو فیروز پور روڈ کے ایک بھٹے کے مالک کو تین ہزار روپے لے کر فروخت کر دیا گیا۔ ہم کو اپنے فروخت ہونے کا بھی تب پتہ چلا جب نئے بھٹے پر پہنچے۔"

"ہاشم بھی تمہارے ساتھ ہی نئے بھٹے پر چلا گیا ہو گا؟"

"نہ وہ ہمارے ساتھ آیا نہ ہی اس کی پیشگی ادا ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح اپنی گھر والی کے ساتھ بندے ماراں کے بھٹے پر کام کرتا رہا۔"

"یہ کیسے ہوا؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بس ایسے ہی ہوا جی جیسے میں بتا رہا ہوں۔" واجد نے لالی کی حیرت پر توجہ نہ دی۔ "ہم سب کو ایک رات زبردستی ٹرک میں بھرا گیا اور ایسے ہی ادھر پہنچا دیا گیا جیسے تو ادھر آیا ہے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تو اپنی مرضی سے تو ادھر نہیں آیا۔"

"تو مرضی کی گل کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میاں اسلم کے بھٹے سے اٹھا کر مجھے کیوں لایا گیا؟" لالی نے بے زاری سے بتایا۔

"بتھیروں کی خرید و فروخت ایسے ہی ہوتی ہے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب اور کہاں جانا ہو گا۔ لگتا ہے تو نیا نیا بتھیرا لگا ہے۔"

"ایسی ہی گل بات ہے۔" لالی نے اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی دریافت کیا۔ "یہ بتا تو فیروز پور روڈ کے بھٹے سے ادھر لکھوڈیر کیسے آگیا۔ تو میاں اسلم کے بھٹے پر تو نہیں کام کرتا تھا؟"

"نا جی' وہ شریف خان کا بھٹہ ہوتا تھا۔" واجد نے فوراً تردید کی۔ "اس کے بھٹے پر لگ بھگ ہم نے دو مہینے کام کیا۔ وہ جی سردی کے دن تھے۔ ہم کو رہنے کے لیے کوئی جھونپڑی کوئی جھگی بھی نہ دی گئی۔ سردی سے بچنے کے لیے رات ہم چمنی کے پاس گزارتے۔ وہ گرم ہوتی تھی۔ اندر کچی اینٹیں پکانے کے لیے آگ جلتی رہتی تھی۔ تب بھی سردی سے نیند نہ آتی۔ چادریں اوڑھے سکڑے سکڑائے پڑے رہتے۔"

"تمہارے پاس رضائیاں نہیں تھیں؟"

"ہمارے پاس رضائیاں بنانے کو کچھ بھی نہ تھا۔" واجد نے لالی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ "شریف خان کی جب بہت منت سماجت کی تو اس نے بیس بیس روپے پیشگی دی۔ ہم نے اس کے بھٹے پر دو مہینے تک کام کیا۔ پر ہم کو کچھ بھی نہ ملا۔ پیشگی کے ساتھ ساتھ وہ تین ہزار بھی ہماری دہاڑیوں سے کاٹے گئے جو بندے ماراں کے بھٹہ مالک نے ہم کو خریدنے کے لیے شریف خان کو دیے تھے۔" اسے کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ بے چین ہو کر کھانسنے لگا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی' تو میں یہ بتا رہا تھا کہ شریف خاں نے ہم کو بہت تنگ کیا۔ اتنا تنگ کیا کہ کھانے کو روٹی بھی نہ ملتی۔ تب ہم نے شور شرابہ کیا۔"

"تب تو شریف خان نے اپنی کرندوں کے ذریعے سب کی زبردست پٹائی کی ہو گی۔" لالی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"ان دنوں وہ لہور میں نہیں تھا۔ اس کا جمعدار بھی نہیں تھا۔ دونوں کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ تب ہی تو ہم نے بھٹہ چھوڑا اور واپس ملتان چلے گئے۔ پر ادھر بھی زیادہ دن نہ ٹھیرے۔ لودھراں چلے

گئے۔"

"ہاشم کا کیا بنا؟" لالی نے استفسار کیا۔ "وہ ابھی تک بندے ماراں کے بھٹے پر کام کر رہا ہے یا کہیں اور چلا گیا؟"

"وہ جی' اپنے رب کے پاس چلا گیا۔" واجد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پچھلے دنوں اس کا مرن ہو گیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر تم آٹھوں بندے تو شریف خان کے چکر سے چھوٹ ہی گئے۔"

"کہاں چھوٹے جی۔ ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ شریف خاں اپنے جمعدار رحمان اور دو کرندوں کے ساتھ پہلے ملتان پہنچا۔ وہاں سے اس نے ہمارے بارے میں پتہ کیا اور لودھراں پہنچ گیا۔ تھانیدار سے ملا۔ ہمارے خلاف پرچہ چاک کرایا۔" واجد نے بتایا۔ "رات کے اندھیرے میں پولیس نے گھروں پر اس طرح چھاپے مارے جیسے ہم نے کوئی وڈا جرم کیا ہے۔ سب کو گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا۔ رات بھر چھتروں اور سوٹوں سے پٹائی کی گئی اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔"

"پر پولیس نے ایسا کیوں کیا؟ تو نے تھانیدار سے نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔" واجد نے جواب دیا۔ "تھانیدار نے بتایا کہ ہم نے شریف خان کے اڑھائی ہزار پیشگی کے ادا کرنے ہیں۔ ہم نے انکار کیا۔ قسمیں کھائیں۔ پر اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ گالاں نکالیں۔ لاتوں اور مکوں سے پٹائی بھی کی۔"

"شریف خان نے تگڑی رشوت دی ہو گی یا سفارش پہنچائی ہو گی۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ایسا ہی ہو گا۔ میں نوں کچھ پتہ نہیں۔" واجد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "مجھے تو یہ پتہ ہے کہ تھانیدار کے حکم پر ہم سب کو دھکے دے دے کر ایک لاری میں بھرا گیا۔ ایک حوالدار اور تین پولیسے نگرانی پر لگائے گئے۔ پہلے ہم سب ملتان گئے۔ وہاں سے ہاشم کے بھائی اور پیو کو پکڑ کر بٹھایا۔ اس کا پیو بوڑھا اور بیمار تھا۔ اس نے گڑگڑا کر منت کی تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے اوکاڑے لے جایا گیا۔ رات بھر سب کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے رکھا گیا۔ کھانے کو روٹی بھی نہ دی گئی۔ اس کے کرندے بندوکیں اور پستول دکھا کر ڈراتے دھمکاتے رہے۔"

"یہ تو بہت ظلم ہوا جی۔" لالی نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ "جعلی پیشگی بنائی اور اوپر سے اتنا تنگ بھی کیا۔"

"سنتا جا کیسا کیسا ظلم ہوا۔" واجد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اوکاڑے سے شریف خان ہم سب کو لہور لے گیا۔ اس کے سات بھٹے ہیں۔ کرندوں نے پہلے تو ہم سب کی دبا کے پٹائی کی۔ فیر منہ میں جوتا دے کر کمر میں رسیاں ڈالی گئیں اور تمام بھٹوں پر سارے پتھیروں کے سامنے گھمایا تاکہ وہ بھی ڈر جائیں اور آگے شریف خان کے خلاف شور شرابہ اور گڑبڑ کرنے کی ہمت نہ کریں۔"

"تم سب کو اس لیے یہ سزا دی گئی تھی کہ شریف خان کی مرضی کے خلاف اس کا بھٹہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے؟"

"ہاں جی' یہ اسی کی سزا دی گئی تھی۔" واجد نے تائید کی۔ "شریف نے مہینہ بھر تک اپنے ایک بھٹے پر ہم سب کو رکھا۔ بعد میں اس بھٹے کے جمعدار' رحمان' کے ذریعے فروخت کر دیا۔ تب سے جی میں ادھر ہی ہوں۔"

"دوسرے بندے بھی تیرے ساتھ ہی ہوں گے۔"

"ناجی' ایسا نہیں ہے۔" اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "دوسروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ کہاں کہاں ہیں اور کس کس بھٹے پر کام کر رہے ہیں؟ میری ایک دھی اور ایک پتر کا بھی پتہ نہیں کدھر ہیں' کیسے ہیں؟" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ پیشگی کا چکر ہی ایسا ہے۔ اس سے کبھی چھٹکارہ نہیں ملنے کا۔ ہر ہفتے دہاڑی سے کٹتی ہے پر کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

لالی اس کی باتیں سن کر اور پریشان ہو گیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ واجد اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں گیا۔ ایک روٹی اور مرچیں لایا۔ لالی کے آگے رکھ کر بولا۔ "لے اسے کھا لے' تو نے شام سے کچھ نہیں کھایا۔" لالی نے انکار کیا۔ مگر واجد نے اصرار کر کے کھانا کھلا دیا۔

واجد زیادہ دیر نہ رکا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

☆

لالی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں جاگتا رہا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی نے اس رات فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ رات گزرتی رہی۔ آدھی سے زیادہ ہو گئی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف پہریداروں کے کھنکارنے اور لاٹھیاں بجانے کی آوازیں رک رک کر سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ جھونپڑیوں کے سامنے پتھیرے اور مزدور گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا ایک طرف بڑھا۔ کبھی قدموں کی رفتار تیز کر دیتا کبھی سست۔ کبھی ٹھہر جاتا۔ وہ راستہ بدلتا' رکتا' مڑتا' پہریداروں کی نظروں سے بچتا بچاتا

بھٹے کی حدود سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔

مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ بھٹہ اب پیچھے رہ گیا تھا اور گہرے اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دونوں جانب ویرانہ تھا۔ لالی تیز تیز قدم اٹھاتا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ اسے توقع نہ تھی کہ اس قدر آسانی سے وہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ مڑ مڑ کر عقب میں دیکھتا۔ مگر دور دور تک نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔

اس نے میل سوا میل فاصلہ طے کیا تھا کہ دور سے روشنی جھلملاتی نظر آئی۔ ساتھ ہی پختہ سڑک پر گھوڑے کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ قریب آتی گئیں۔ لالی نظریں اٹھائے روشنی کی سمت دیکھتا گیا۔ اس نے قدموں کی رفتار میں اعتدال پیدا کیا۔ اور آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد اس نے دیکھا' ایک تانگا سامنے سے آ رہا ہے۔ تانگا دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ مگر نہ اس نے راستہ بدلا اور نہ اپنی جگہ رکا۔ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

تانگا قریب آتا گیا۔ اس کے رفتار اچانک ست پڑ گئی۔ نزدیک پہنچ کر تانگا چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ لالی نے مڑ کر چوکنا نظروں سے دیکھا' ایک شخص تانگے کی پچھلی نشست سے نیچے اترا۔ لالی نے گردن موڑی اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ فوراً عقب سے آواز ابھری۔

"اوئے خانہ خراب' تو ادھر کیسے آگیا؟"

لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ بھٹے کا جمعدار' زماں خان' تانگے کی لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ سینما کا آخری شو دیکھ کر ایک کارندے کے ہم راہ بھٹے کی جانب واپس جا رہا تھا۔ کارندہ بھی تانگے سے اتر کر سڑک پر آگیا تھا اور زماں خان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ لالی نے دونوں کو دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ مڑا' سڑک سے نشیب میں اترا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

زماں خان کے ساتھ ساتھ کارندے نے بھی لالی کا تعاقب کیا۔ زماں خان نے اسے روکنے کی غرض سے زور سے ڈانٹا۔ "ٹھہر جا' ورنہ بہت برا ہو گا۔" مگر لالی کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ زماں خان غصے سے چیختا چلاتا' ڈانٹتا ڈپٹتا' برابر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ بھی نہایت چست اور پھرتیلا تھا۔ دوڑتا بھی تیز تھا۔

لیکن لالی اس کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ عادی اور منجھا ہوا چور رہ چکا تھا۔ بھاگنے کے معاملے میں چھلاوا تھا۔ آن کی آن میں دور نکل گیا۔ وہ ایک پرانے بھٹے سے گزر رہا تھا جو ختم ہو کر اب ویران پڑا تھا۔ جگہ جگہ گہرے گڑھے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے بکھرے ہوئے ڈھیر پھیلا نکتا' جھاڑیوں سے

دامن بچاتا، ادھر ادھر مڑتا تیزی سے دوڑتا رہا۔ وہ جلد سے جلد بھٹے کی حدود سے نکل جانا چاہتا تھا تاکہ پوری رفتار سے دوڑ سکے اور زماں خان کی پہنچ سے اتنی دور نکل جائے کہ وہ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

خوف اور گھبراہٹ کے باوجود وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ناہموار زمین پر دوڑتے ہوئے کہیں ٹھوکر بھی کھاتا تو فوراً خود کو سنبھال لیتا۔ مگر ایک گڑھے سے بچتے ہوئے اندھیرے میں اینٹوں کے ایک ڈھیر سے اس بری طرح ٹکرایا کہ اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اچھل کر دور گرا اور لڑھکتا ہوا گہرے گڑھے میں چلا گیا۔ سر میں ایسی کراری چوٹ آئی کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ وہ خاک میں لتھڑا ہوا زمین پر بے حال پڑا تھا اور منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

دور سے قدموں کی آہٹ ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی نے سنا، زماں خان اونچی آواز سے کارندے کو بلا رہا تھا۔

"کرمے! اسی طرف آجا۔ میں نے اسے ادھر ہی بھاگتے دیکھا تھا۔"

لالی خاموش پڑا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ زماں خان اور کرما دوسری طرف چلے جائیں تو وہ راستہ بدل کر نکل بھاگنے کی کوشش کرے۔ قدموں کی آہٹ اور قریب آگئی۔ لالی نے مڑ کر اس سمت دیکھا۔ دھندلی روشنی میں زماں خان گڑھے کے اوپر نظر آیا۔ لالی کے کپڑوں کی سفیدی اندھیرے میں صاف نظر آرہی تھی۔ زماں خان نے اسی دیکھا تو ٹھہر گیا۔

لالی نے خطرہ بھانپ لیا۔ اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر اس وقت تک زماں خان دوڑ کر عین اس کے سر کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور اس طرح نیچے آیا کہ لالی زمین پر لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو وہ اس کے اوپر ہی گرتا۔ لالی اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھا، زماں خان اس کے پیچھے لپکا۔ لالی نے نشیب سے اوپر جانے کے لیے زقند بھرنے کی کوشش کی۔ لیکن زماں خان نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔

لالی لڑکھڑا کر گرا۔ زماں خان نے جھٹ اسے دبوچ لیا۔ لالی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ مگر لالی کمزور پڑ رہا تھا۔ سخت محنت اور پوری غذا نہ ملنے کے باعث اس کے جسم میں اب پہلا سا کس بل نہ رہا تھا۔ زماں خان مضبوط اور توانا تھا۔ اس نے لالی کو اپنی گرفت سے نکلنے نہ دیا۔

اسی اثناء میں کرما بھی پہنچ گیا۔ وہ بھی لالی سے لپٹ گیا۔ اب زماں خان اور کرما نے لالی کو پوری

طرح قابو میں کر لیا تھا۔ دونوں دھکے دیتے ہوئے اسے گڑھے سے اوپر لے گئے اور سڑک کی جانب بڑھنے لگے۔ لالی کی سانس دھونکنی کی طرح زور زور سے چل رہی تھی۔ اس نے دونوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ ان کے نرغے میں چلتا رہا۔

زماں خان نے چلتے چلتے لالی کے منہ پر غصے سے تھپڑ مارا۔ دریافت کیا۔ "تو پہریداروں کی نظروں سے بچ کر فرار کیسے ہوا؟"

لالی نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "میں جی فرار شرار نہیں ہوا تھا۔ میرا چاچا ادھر ہی ہوتا ہے بہت بیمار ہے۔ اسے ملنے جا رہا تھا۔ صبح واپس آجاتا۔ جمعدار میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں۔"

زماں خان کو اس کی ڈھٹائی پر اور تاؤ آیا۔ اس نے تڑاق سے ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ "مجھے پتہ ہے تو بالکل سچ بول رہا ہے۔" اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تب ہی تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔"

"میں تجھے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔" لالی نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"بات یہ ہے جی' میں کسی پہریدار کو بتا کر نہیں آیا تھا۔ بتاتا تو وہ بھٹے سے باہر جانے نہ دیتا۔"

"اب تو چپ کر کے چل۔ بیکار کی بکواس نہ کر۔" زماں نے ایک بار پھر مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن مارا نہیں۔

لالی خاموش ہو گیا۔ زماں خان اور کرما اس کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اور سڑک سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ تینوں اونچی نیچی ناہموار زمین پر سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ ہر طرف بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں' خود رو پودوں اور جھاڑیوں سے بچنے کی غرض سے بار بار ادھر ادھر مڑتے تھے۔ آخر وہ اس پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو بھٹے کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک کی طرف جاتی تھی۔

تانگا ابھی تک سڑک پر کھڑا تھا۔ اس کی لالٹینوں کی روشنی تاریکی میں دور سے نظر آ رہی تھی۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ سڑک پر آگئے۔ زماں خان نے حقارت سے دھکا دے کر لالی کو تانگے پر سوار کرایا۔ اس نے مطلق احتجاج نہ کیا۔ سہما ہوا خاموشی سے کوچوان کے برابر بیٹھ گیا۔

کوچوان نے مسکرا کر زماں خان سے کہا۔ "میں نے تو سوچا تھا جی' یہ اب ہاتھ نہیں آنے کا۔ پر تو اسے پکڑ ہی لایا۔"

"نکل کیسے جاتا۔" زماں خان نے رعونت سے کوچوان کی جانب دیکھا۔ "اسے پتہ نہیں۔ میرا

ناں زماں خان ہے۔ یہ کیا ہے' اس سے بہت زیادہ بدمعاش ہتھیرے میں نے دیکھے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اول تو میں اسے نکل کر جانے ہی نہ دیتا۔ اور اگر اندھیرے میں نکل بھی جاتا تو میں اس کا پتہ چلا لیتا۔ پکڑ کر بھنے پر لے آتا۔" اس نے مڑ کر کرما کو دیکھا۔ "کرمے' تیں نوں یاد ہے۔ وہ جو تین ہتھیرے چیکے سے بھاگ نکلے تھے انھیں میلسی اور حاصل پور سے پکڑ کر لایا تھا۔ وہ تو بہت چالاک تھے۔ یہ تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔"

زماں خان اپنی ترنگ میں بولتا رہا۔ کوچوان نے تانگا آگے بڑھایا۔ گھوڑے کے سموں میں لگی ہوئی لوہے کی نئی نعلیں پختہ سڑک پر ٹپ ٹپ بجنے لگیں۔ زماں خان اور کرما مضبوطی سے لالی کے بازو اور ہاتھ پکڑے چوکس بیٹھے تھے۔

۲۸

رات کے سناٹے میں گھوڑے کے سموں سے ٹپ ٹپ کی آواز تسلسل سے ابھر رہی تھی۔ تانگا سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہوا کے سرسراتے ہوئے جھونکے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ آسمان صاف شفاف تھا۔ ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔

لالی کو بھٹے کے جمعدار زماں خان اور کارندے کرما نے اپنے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ مگر لالی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ موقعے کی تاک میں تھا۔ تانگے نے میل بھر سے زیادہ راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اس نے زور زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کی بے چینی سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اچانک کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہے۔ کھانستے کھانستے لالی نے ادھر ادھر پہلو بدلا۔ زماں خان اور کرما کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

لالی آگے جھکا، کسمسایا اور دونوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ کھسک کر تانگے کے اگلے سرے پر پہنچا۔ جھپاک سے زغند بھری اور تانگے سے دور جا کر گرا۔ لالی نے ایسی پھرتی دکھائی اور اس صفائی سے چلتے ہوئے تانگے سے کود کر باہر گیا کہ زماں خان اور کرما ہکا بکا رہ گئے۔ کوچوان بھی چکرا گیا۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا۔ لالی کی نشست خالی تھی۔

سڑک پر گرتے ہی لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ داہنے گھٹنے میں رک رک کر ٹیسیں اٹھ رہی تھی۔ مگر اس نے کسی چوٹ چپیٹ کی ذرا پرواہ نہ کی۔ کھڑا ہوا اور سڑک پر نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔

زماں خان نے ڈپٹ کر کوچوان سے کہا۔ "تانگا روک۔"

کوچوان نے تانگا روکنے کی کوشش کی۔ لیکن تانگا رکنے بھی نہ پایا تھا کہ زماں خان نے چھلانگ لگائی۔ سڑک پر گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس نے گرتے گرتے کرما کو چیخ کر مدد کے لیے پکارا۔

کرما بھی کود کو تانگے سے باہر آ گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور زماں خان کی جانب بڑھا، وہ اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے مڑ کر کرما کی طرف نہ دیکھا اور لالی کے تعاقب میں سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کرما بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

لالی نے پختہ سڑک پر قدموں کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا، زماں خان اور کرما اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ کچھ دور تو سڑک پر دوڑتا رہا، پھر سڑک سے کچے میں اتر گیا۔ زمین بنجر اور ناہموار تھی۔ یہ چٹیل میدان تھا۔ چھپنے اور اوجھل ہونے کے لیے دور دور تک کوئی درخت نہ تھا۔ کہیں کہیں خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں، لیکن اتنی گھنی اور بڑی نہ تھیں کہ وہ ان کی اوٹ میں دبک کر روپوش ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ منہ اٹھائے برابر دوڑتا رہا۔

زماں خان اور کرما بھی سڑک سے اتر کر میدان میں پہنچ گئے۔ لالی دھندلے سائے کی مانند ان کے سامنے بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے تعاقب جاری رکھا۔ زماں خان آگے آگے تھا۔ اس کی رفتار بھی تیز تھی۔ اور جوش و خروش بھی زیادہ تھا۔ مگر لالی رفتہ رفتہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دھندلا سایہ اور زیادہ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ زماں خان نگاہیں اٹھائے لالی کی جانب دیکھتا رہا اور سرپٹ دوڑتا رہا۔ کرما بھی اس کے عقب میں تھا اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی دوڑتے دوڑتے دور نکل گیا۔ مگر اس نے اپنی رفتار سست نہ کی۔ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ان کی روشنی میں منزل سے بے خبر، لالی مسلسل دوڑ رہا تھا۔ یکایک خود رو پودوں کے درمیان سے ایک شخص نکل کر سامنے آ گیا۔ کوئی راہ گیر تھا۔ کسی ضرورت سے جا رہا تھا۔ وہ اس طرح سامنے آیا کہ بچتے بچتے بھی لالی بچ نہ سکا۔ اس زور سے ٹکرایا کہ وہ بھی گرا اور لالی بھی سنبھل نہ سکا۔ اس کے پیر لڑکھڑائے اور وہ ایک جھاڑی پر گرا۔ یہ کیکر کی جھاڑی تھی۔ زیادہ گھنی نہ تھی۔ لیکن لالی کی دھوتی اور قمیص کانٹوں سے کچھ اس ڈھب سے الجھی کہ نکلنے کے بجائے وہ اس میں پھنس کر رہ گیا۔

لالی خود کو جھاڑی کے کانٹوں سے چھڑانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ زماں خان دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اسی اثناء میں کرما بھی پہنچ گیا۔ وہ بھی لالی پر جھپٹا اور گردن

میں ایک ہاتھ ڈال کر اس طرح دبایا کہ وہ بے بس ہو گیا۔

زماں خان بری طرح ہانپ رہا تھا۔ کرما بھی ہانپ رہا تھا اور لالی بھی۔ راہ گیر جھاڑی سے ہٹ کر چند قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ تینوں کو حیران و پریشان ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سخت خوف زدہ اور سہا ہوا تھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ جس طرح زمین پر پڑا تھا اسی طرح دم بخود پڑا رہا۔

زماں خان ذرا سنبھلا تو زور سے دھاڑا۔ "تجھے پتہ نہیں' میں پولیس میں رہ چکا ہوں۔ مجھ سے بچ کر کوئی مجرم نکل نہیں سکا۔" اس نے گردن پکڑ کر لالی کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل زمین پر گرا۔

لالی کچھ دیر زمین پر پڑا رہا' پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کرما نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا اور منہ پر زوردار تھپڑ بھی رسید کیا۔ لالی تڑپ اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر کرما پر جھپٹا۔ گردن جھکا کر اس کے منہ پر ٹکر ماری۔ کرما چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ لالی نے دوسری ٹکر ماری۔ اس بار وہ سنبھل نہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ زماں خان بڑھ کر قریب پہنچا تو لالی نے پلٹ کر مکا مارا۔ مکا کنپٹی پر ایسا بیٹھا کہ زماں خان کا سر گھوم گیا۔

لالی نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر کرما اٹھ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ زماں خان بھی جھپٹا اور لالی کو دبوچ کر بے بس کر دیا۔ زماں خان اپنا جبڑا ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے بولا۔ "خانہ خراب' تو نے تو میرا دانت ہی توڑ دیا تھا۔" اس نے لالی کے منہ پر جھنجلا کر تھپڑ مارا۔

کرما نے بھی مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر زماں خان نے روک دیا۔ "رہنے دے کرمے' بھٹے پر چل کر اس کی ٹھیک طرح گرمی اتارنی ہے۔" اس نے دھکا دے کر لالی کو آگے بڑھایا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تیری پیشگی کے آٹھ سو روپے حنیف ڈوگر کو بھٹے کے مالک نے نہیں دیئے' میں نے اپنی جیب سے دیئے ہیں۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "میں نے تو تجھے پکڑنا ہی پکڑنا تھا۔"

لالی خاموش رہا اور زماں خان اور کرما کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا چلتا رہا۔ تینوں سڑک کی جانب روانہ ہوئے۔ میدان عبور کیا اور سڑک پر پہنچ گئے۔ تانگا موجود تھا۔ تینوں تانگے کے قریب پہنچے۔

کوچوان' تانگے سے اتر کر نیچے آگیا۔ زماں خان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ اس بار یہ نکل ہی گیا۔ پر جمعدار تو نے اسے چھوڑا نہیں پکڑ ہی لایا۔ تو بھی بہت اونچی چیز ہے۔"

"جمعداری کرنا مخول نہیں۔" زماں خان نے گردن اکڑا کر کہا۔

"پر بادشاہو' اسے میرے نزدیک نہ بٹھانا۔" کوچوان نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "ایسا کود کر ہوا کی طرح گیا کہ میں تو دیکھ بھی نہ سکا۔"

زمان خان نے کچھ نہ کہا۔ پہلے لالی کے سر سے پگڑی اتاری' پھر کرما کے سر سے۔ دونوں پگڑیوں سے لالی کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھے اور پشتارے کی مانند اٹھا کر تانگے کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا اور لالی کی ٹانگیں اپنے پیروں کے نیچے دبا لیں۔ کرما اگلی نشست پر کوچوان کے برابر بیٹھ گیا اور لالی کی گردن اس طرح اپنے ایک ہاتھ کے حلقے میں دبالی کہ اگر بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کی گرفت سے نکل نہ سکے۔

تانگا آگے بڑھا۔ سڑک پر دوڑنے لگا۔ بھٹے پر پہنچا۔ تانگا دیکھ کر پہریدار بھی پہنچنے لگے۔ زماں خان کی ہدایت پر لالی کو تانگے سے نیچے اتارا گیا۔ وہ بت کی مانند خاموش تھا اور آنے والے طوفان کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کوئی طوفان نہ آیا۔ زماں خان نے نہ اسے مارا پیٹا اور نہ ہی گالی گلوچ کی۔ تانگے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ لالی کے ہاتھوں اور پیروں کو کھلوایا۔

"جمعدار!" لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"چپ کر کے کھڑا رہ۔" زماں خان نے غصے سے ڈانٹا۔

لالی نے مزید کچھ نہ کہا۔ زماں خان نے لوہے کی زنجیر منگوائی جس سے معتوب پتھیروں اور مزدوروں کو باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ زنجیر آئی تو اس سے لالی کے دونوں ہاتھوں کو کس کر باندھا گیا۔ زنجیر کے دونوں سروں کے حلقوں میں تالا ڈال دیا گیا۔

بھٹے کے دفتر کے برابر ایک کوٹھری تھی۔ زماں خان نے اسے کھلوایا اور لالی کو اس میں بند کر دیا۔ کوٹھری کے دروازے پر نہ صرف لوہے کا مضبوط تالا پڑا تھا بلکہ ایک پہریدار بھی نگرانی پر مقرر تھا۔

دو روز تک لالی کو کوٹھری میں قید رکھا گیا۔

☆

صبح ہوتے ہی لالی کو باہر لایا جاتا۔ ہاتھوں پر لپٹی ہوئی زنجیر کا تالا کھولا جاتا۔ زنجیر علیحدہ کی جاتی اور کام پر لگا دیا جاتا۔ دن بھر وہ بھٹے کے دوسرے پتھیروں کے ساتھ کچی اینٹیں بناتا۔ جب تک کام کرتا اس کی کڑی نگرانی کی جاتی۔ شام کو دونوں ہاتھ پھر جکڑ دیئے جاتے۔ زنجیر کے حلقوں میں تالا ڈالا جاتا' اور کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔

تیسرے روز کوٹھری کے بجائے لالی کو جھونپڑی میں رکھا گیا۔ یہ جھونپڑی دوسری جھونپڑیوں اور جھگیوں سے الگ تھلگ ایک گوشے میں تھی۔ البتہ بھٹے کے دفتر سے قریب تھی۔ اس رات لالی کے ساتھ ایک اور پتھیرے کو بھی رکھا گیا۔ دونوں کا ایک ایک ہاتھ ملا کر زنجیر سے جکڑ دیا گیا۔

زنجیر کے سروں کو جوڑ کر تالا ڈال دیا گیا۔ زنجیر اس قدر کس کر لپیٹی گئی کہ کلائیوں کی کھال میں اتر گئی۔ سخت تکلیف ہوئی۔ مگر لالی نے اف نہ کی۔ دوسرا قیدی بھی چپ رہا۔ نہ اس نے کسی طور احتجاج کیا نہ دہائی دی۔

دونوں کو جھونپڑی کے اندر ایک ہی چارپائی پر لٹایا گیا۔ ٹانگوں پر مضبوط رسی لپیٹ کر چارپائی کی پٹیوں سے اس طرح باندھ دی گئی کہ وہ نیچے نہ اتر سکیں۔ ان کی نگرانی کے لیے کوئی پہریدار تو مقرر نہیں کیا گیا، مگر رات بھر جھونپڑی کے ارد گرد پہریداروں کا گشت رہا۔ وہ رات کے سناٹے میں زور زور سے کھنکارتے۔ اپنی لاٹھیاں وقفے وقفے سے زمین پر مار کر بجاتے۔ ان کے قدموں کی آہٹ مسلسل ابھرتی رہی۔ کبھی کبھار ان کے بولنے اور باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔

مگر لالی خاموش تھا۔ دوسرا قیدی بھی گم صم تھا۔ دونوں چارپائی پر چت لیٹے جھونپڑی کی چھت کو تک رہے تھے۔ اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نہ انھوں نے ایک دوسرے سے بات چیت کی نہ پرسش احوال۔ دونوں دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ لالی نے گردن موڑ کر قریب لیٹے ہوئے قیدی کی جانب دیکھا۔ وہ بھی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ لالی نے اس کا نام پوچھا۔

"ارشاد!" اس نے لالی کی طرف دیکھے بغیر نہایت مختصر جواب دیا۔

لالی نے اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی۔ "تجھے کس چکر میں یہ سزا ملی؟"

ارشاد خاموش رہا۔

لالی نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"چپ کر کے پڑا رہ۔" وہ بے رخی سے بولا۔ "کوئی راکھا ادھر آگیا تو دونوں کی چھتر سے پٹائی کرے گا۔"

"حد ہو گئی جی، بات کرنے پر کیوں پٹائی ہو گی؟"

لیکن اس بار بھی ارشاد خاموش رہا۔ وہ بہت خوف زدہ اور سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ نگاہیں اٹھائے بدستور چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لاغر تھا۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی اس کے چہرے پر ویرانی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے محرومی جھلکتی تھی۔ جسم کی ہڈیاں جگہ جگہ سے ابھری ہوئی تھیں کیلشیم کی کمی کے باعث بال بھورے پڑ گئے تھے۔

لالی نے بھی اس سے مزید گفتگو کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور پہریداروں کی

آوازیں سنتا رہا۔ جھونپڑی میں حبس تھا۔ اس کا بدن پسینے کی نمی سے چپچپا رہا تھا۔ اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد کھل گئی۔ ارشاد نے کروٹ لی۔ جسم کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی ہلا۔ لالی کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ اسے بھی پہلو بدل کر کروٹ لینا پڑی۔ رات بھر یہی ہوتا رہا۔ ارشاد کروٹ بدلتا تو لالی بیدار ہو جاتا۔ لالی کروٹ لیتا تو ارشاد کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ کبھی ہاتھوں کی زنجیر پریشان کرتی کبھی پیروں میں بندھی ہوئی رسی۔ دونوں ہر بار جھنجلاتے۔ دل ہی دل میں کڑھتے۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتے۔ تمام رات نہایت بے چینی میں کٹی۔

ان کی راتیں اسی طرح سوتے جاگتے بے چینی میں کٹتی رہیں۔ دن میں ان کو کھلا رکھا جاتا۔ کچی اینٹیں بنوائی جاتیں اور رات ہوتے ہی ہاتھوں اور پیروں کو زنجیر اور رسی سے باندھ کر چارپائی پر لٹا دیا جاتا۔ چھٹے کا دن آیا۔ وہ خوشی خوشی ہفتے بھر کی دہاڑی لینے منشی کے روبرو پہنچے۔ مگر دونوں ہی خالی ہاتھ لوٹے۔ ان کو کچھ بھی نہ ملا۔ صرف ہفتے بھر کے راشن کے طور پر فی کس ڈھائی سیر آٹا اور ایک چھٹانک نمک دیا گیا۔ ڈیڑھ چھٹانک سرخ مرچ بھی دی گئی۔

اس رات ارشاد بہت بے قرار اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار کروٹ بدلتا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے کروٹیں بدل بدل کر لالی کی نیند بھی اڑا دی۔ شام سے رک رک کر بارش ہو رہی تھی۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ پہریدار بھی گشت پر نہ تھے۔ لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ چوکس اور چوکنا بھی تھے۔ رک رک کر کھانس رہے تھے۔ کھنکار رہے تھے۔ ان کی آوازیں رات کی خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔

ارشاد نے ایک بار کروٹ بدلی تو لالی نے اس کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے احتجاج کیا۔ "یار' تو نے آج سونا نہیں؟"

"نیند نہیں آرہی۔" ارشاد نے آہستہ سے کہا۔ "سر میں درد ہے۔"

لالی نے کھلا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ "بخار تو بالکل نہیں ہے۔" اس نے اظہار ہمدردی کیا۔ "شام کو بتاتا تو کسی جمعیرے سے اسپرو کی ٹکیہ مانگ لیتا۔ اسے کھانے سے درد جاتا رہتا۔" وہ ایک ہاتھ سے ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگا۔

ارشاد کو کچھ سکون ملا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ لالی نے سر دباتے دباتے دریافت کیا۔

"تو پہلے تو اس بھٹے پر نہیں ہوتا تھا۔ کہاں تھا تو؟"

"میں جی ملتان روڈ کے ایک بھٹے پر ہوتا تھا۔ وہ بھی ملک صاحب کا بھٹہ ہے۔" ارشاد نے بتایا۔

"تجھے یہ تو پتہ ہی ہوگا کہ اس بھٹے کا مالک' ملک نثار محمد ہے۔"

"مجھے پتہ ہے یہ ملک کا بھٹہ ہے۔ پر یہ نہیں پتہ اس کے اور بھی بھٹے ہوتے ہیں اور کہاں کہاں ہوتے ہیں۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ "پر تو ادھر کیسے آگیا؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔" لالی نے کہا۔ "باتیں کرنے سے کچھ آرام ہی ملے گا۔ نیند بھی آجائے گی۔"

"تو نے سر دبایا تو درد کچھ کم ہو گیا۔" ارشاد نے کروٹ بدلی۔ لالی کو بھی کروٹ بدلنا پڑی۔ اب دونوں چت لیٹے تھے۔ مگر لالی اس کا سر نہیں دبا سکتا تھا۔ ارشاد نے گہری سانس بھری۔ "ملتان روڈ کے بھٹے پر ہم آٹھ پتھیرے ایسے تھے جن کو بھٹے کا جمعدار' دلاور' حاصل پور سے خرید کر لایا تھا۔ پچھلے مہینے منشی سے پیشگی پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ اس نے ہفتے بھر کی لگ بھگ پوری ہی دہاڑی کاٹ لی۔ دوسرے تو سب چپ کر کے رہ گئے۔ پر دیدار چپ نہ رہا۔ وہ منشی کے گلے پڑ گیا۔ منشی ایک دم گرم ہو گیا۔ پہلے تو اس نے ننگی ننگی گالاں نکالیں' فیر دوات اٹھا کر ماری۔ دیدار کے متھے پر اس زور سے لگی کہ خون نکل آیا اور اس کے منہ پر پھیل گیا۔"

"منشی بہت غصے والا بندہ تھا۔" لالی نے تبصرہ کیا۔ "اسے اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"وہ جی بہت ہی غصہ کرتا ہے۔ بات بات پر گالاں نکالتا ہے۔ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔" ارشاد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "پہلے بھی کئی بار وہ ایسا ہی کر چکا تھا۔ کبھی رجسٹر اٹھا کر منہ پر مار دیتا۔ کبھی کچھ اور۔ جو ہاتھ میں آجاتا وہی اٹھا کر مار دیتا۔"

"دیدار کے متھے سے خون بہتا دیکھ کر ساتھ کے پتھیروں کو بھی غصہ آگیا ہو گا۔"

"ہاں جی' ایسا ہی ہوا۔" ارشاد نے اس کی تائید کی۔ "سب پہلے ہی منشی سے خار کھائے ہوئے تھے۔ اس روز وہ بھی اتنے گرم ہو گئے کہ منشی پر ایک دم ہلا بول دیا۔ منشی کو گرا کر لاتوں اور مکوں سے زبردست پٹائی کی۔"

"بھٹے کا جمعدار موجود نہیں تھا؟"

"نہیں!" ارشاد نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔ "کرندے بھی صرف دو ہی تھے۔ وہ منشی کی مدد کو آئے تو ان کی بھی دبا کے پٹائی کی گئی۔"

"پر بعد میں تو جمعدار اور بھٹے کے دوسرے کرندوں نے تم سب کو زبردست مار لگائی ہو گی۔"

"ہاں جی بہت پٹائی کی۔" ارشاد نے لالی کو بتایا۔ "ہم تو بھٹہ چھوڑ کر حاصل پور کی طرف نکل

جانا چاہتے تھے۔ پر ہمارے نکلنے سے پہلے ہی جمعدار پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ کرندوں کے علاوہ اور بھی کئی بندے تھے۔ سب مسلح تھے۔ ایک کے پاس تو بھری ہوئی کاربین بھی تھی۔ وہ آگے آگے تھا۔ اسے دیکھ کر سب ڈر گئے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پٹائی کرنے کے بعد ہم سب کے ہاتھوں کو زنجیروں سے جکڑا گیا اور ایک جھگی میں بند کر دیا گیا۔"

"میں بھی دو روز تک ایسے ہی بند رہ چکا ہوں۔"

"تو نے بھی منشی سے جھگڑا کیا تھا؟" ارشاد نے پوچھا۔

"میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔" لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "بھٹے سے تو نکل بھی گیا تھا اور بہت دور چلا گیا تھا۔ پر میرا نصیبہ ہی خراب تھا۔"

"کیا ہو گیا تھا؟" ارشاد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"رستے میں اس بھٹے کا جمعدار زماں خان مل گیا۔ وہ ایک کرندے کے ساتھ فلم دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور تانگے میں ڈال کر واپس لے آیا۔" لالی کے لہجے سے افسردگی جھلکنے لگی۔ "تو بتا' آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا جی۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تین روز تک تو روٹی بھی نہیں دی گئی۔ جھگی کے باہر ہر وکھت دو کرندے موجود رہتے تھے۔ صبح کو ٹٹی پیشاب کے لیے لے جاتے۔ پر سر پر کھڑے ہو کر کڑی نگرانی کرتے تھے۔"

"تم سب کو کام پر بھی نہیں لگایا گیا؟"

"کام شام کیسا' رات ہو یا دن' ہر دم جھگی میں بند رکھا جاتا تھا۔" ارشاد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ویسے بھوک کے مارے اٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ نہ پوچھ کیا برا حال تھا۔" اس نے لحہ بھر کے لیے تامل کیا۔ "چوتھے روز روٹی ملی۔ مجھے ادھر بھیج دیا گیا۔ دوسروں پر کیا بیتی' کچھ پتہ نہیں۔ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ میں تو یہاں اکیلا ہی آیا تھا۔" اس نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "تو میری گل سن رہا ہے ناں؟"

مگر لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے بے خبر سو رہا تھا۔ ارشاد نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ بارش اب بند ہو چکی تھی۔ پہریداروں نے گشت شروع کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹ رات کے سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔

☆

مطلع بالکل صاف تھا۔ ہوا میں سرسراہٹ تھی۔ نیلے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ لالی اور

ارشاد دن بھر کچی اینٹیں بناتے رہے۔ شام کو انھوں نے روٹیاں پکائیں۔ کھانا کھایا۔ بھٹے کے کارندوں نے ان کے ہاتھ زنجیر سے جکڑ دیے۔ چارپائی پر لٹایا اور پیروں کو رسیوں سے باندھ دیا۔

رات کو ارشاد ہی نے بات چھیڑی۔ ”میں تجھے بتا رہا تھا‘ ملتان روڈ کے بھٹے پر مجھ پر کیا بیتی۔ ادھر سے مجھے یہاں کیسے آنا پڑا۔“ وہ مسکرایا۔ ”مڑ کر دیکھا‘ تو سو رہا تھا۔“

”ہاں جی اونگھ آگئی تھی۔ پر میں نے تیری پوری گل سن لی تھی۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”ساری رات ٹھیک سے سونے کو بھی نہیں ملتا۔ تو پلٹتا ہے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں پلٹتا ہوں تو تو جاگ اٹھتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک یہ چکر چلے گا۔“

”یہ تو ملک نثار کو پتہ ہو گا۔“ ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کی مرضی ہے جب چاہے سزا ختم کر دے‘ پر ابھی تو وہ چھوڑے گا نہیں۔ پتھیرے بتاتے ہیں بہت ظالم بندہ ہے۔“

”مجھے تو یہ پتہ ہے بھٹوں کے سارے ہی مالک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پتھیروں کو تو وہ ڈھور ڈنگر سمجھتے ہیں۔“ لالی نے تیکھے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ گردن کو خم دے کر ارشاد کی جانب دیکھا۔ ”تو مجھے پرانا پتھیرا نہیں لگتا۔ تو کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔“

”بس جی پھنس ہی گیا۔“ ارشاد نے بتایا۔ ”جب کوئی کام دھندا نہ ملا تو پتھیرا لگ گیا۔ پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے پتھیرا بننا پڑے گا۔ میرا پیو تو مجھے پڑھا لکھا کر وڈا افسر بنانا چاہتا تھا۔ اب تو یہ بالکل خواب لگتا ہے۔“ اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ ”دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ کیا سے کیا ہو گیا؟“

”تو مہاجر تو نہیں ہے؟“ لالی نے قیاس آرائی کی۔

”ہاں جی‘ میں مہاجر ہی ہوں۔“ ارشاد نے بتایا۔ ”میں گورداس پور میں ہوتا تھا۔ فسادات کی آگ بھڑکی تو بھاگ کر ادھر آگیا۔“

”جب فسادات اور بلوے شروع ہوئے‘ تب تو کتنے برس کا تھا؟“

”میں جی دس گیاراں برس کا رہا ہوں گا۔“ ارشاد نے لالی کو بتایا۔ ”پر مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ عید منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرے دو بھائی بھین وڈے تھے۔ ماں نے سب کے لیے نئے کپڑے لتے سلوائے تھے۔ ٹھیک چاند رات کو آس پاس کے سکھوں اور ہندوؤں نے پنڈ پر دھاوا بول دیا۔ ان کو تو مسلمانوں نے بھگا دیا تھا‘ پر ان کے بھاگنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ریاست پٹیالہ کی ملٹری کے فوجی‘ جیپوں اور لاریوں میں بھر کر حملہ کرنے پہنچے۔ ان کے پاس تو مشین گنیں بھی تھیں۔“

"انھوں نے تو بہت خون خرابہ کیا ہو گا۔" لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔

"کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ ان کے آنے سے پہلے ہی پنڈ کے سارے مسلمان بندے فصلوں میں چھپ گئے تھے۔" ارشاد نے بتایا۔ "ان کی لاریوں اور جیپوں کی بتیاں اس طرح چمک رہی تھیں کہ بہت دور تک روشنی پھیلی تھی۔ سکھ فوجی لاریوں اور جیپوں سے کود کود کر نیچے اتر رہے تھے۔ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ مڑ مڑ کر ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ سارے مسلمان ڈرے ہوئے چپ کر کے بیٹھے تھے۔ پر وہ فصلوں کی طرف نہیں آئے۔ مجھے تو اب تک یاد ہے گیانی ہرنام سنگھ ایک فوجی افسر کے سامنے ہاتھ جوڑے منت کر رہا تھا۔"

"ہرنام سنگھ بھی سکھ ہی تھا نا۔ اس نے مخبری نہیں کی؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

"ہاں جی' بالکل سکھ تھا۔ پر بہت نیک بندہ تھا۔ پنڈ ہی میں رہتا تھا۔ ماں بتاتی تھی' اسی نے سب کو بچایا تھا۔ اور وہی سب کو پنڈ سے نکال کر تریموں کے پتن پر لے گیا تھا۔" ارشاد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "سب مسلمان بندے پنڈ سے اس طرح گھبرائے ہوئے نکلے کہ گھروں کو بھی نہ جا سکے۔ سب کچھ چھوڑ دیا۔ کچھ بھی نہ لیا۔ سکھ فوجیوں کے دوبارہ آنے کا ڈر لگا تھا۔ پر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ رستے میں کئی بار میں اپنے نئے کپڑوں کے لیے رویا۔ ماں سے واپس گھر چلنے کی ضد کرتا۔ وہ ناراض ہوتی۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہر دم تو سکھوں اور ہندوؤں کے حملے کا سر پر خطرہ تھا۔ نئے کپڑے پہننے اور عید منانے کا کسی کو ہوش ہی کب تھا۔ عید کا تو پتہ ہی نہ چلا۔" اس کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ "عیدیں تو بعد میں بھی آتی رہیں مگر میں نئے کپڑے کبھی نہ پہن سکا۔"

"تو اکیلا تو پاکستان نہیں آیا۔ تیرے ماں پیو' بھین بھائی بھی آئے ہوں گے۔" لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ "وہ کدھر ہوتے ہیں؟"

"یہ نہ پوچھ' وہ کدھر ہوتے ہیں' اور کہاں ہوتے ہیں؟" اس نے آہ سرد کھینچی اور یوں گویا ہوا۔ "تریموں کے پتن تک تو سب ساتھ تھے۔ پر بیڑیاں اور کشتیاں چند ہی تھیں۔ بیچ میں راوی بہتا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد تھی۔ بس بیڑیوں میں سوار ہو کر راوی پار کرنا تھا۔ سارے ہی ملاح اور ماجھی مسلمان تھے۔ پر ایک ایک بندے کا کئی کئی سو کرایہ مانگتے تھے۔ تریموں کے پتن پر اور بھی نہ جانے کتنے مسلمان بندے پڑے تھے۔ ہر روز اور ہر دم ان کی ٹولیاں پہنچ رہی تھیں۔ سب ہی لٹ پٹ کر آ رہے تھے۔ پر ملاحوں نے نہ کسی سے رعایت کی نہ ترس کھایا۔ وہ تو جی دبا کے کمائی کر رہے تھے۔ ادھر سارے ہی بندے ننگے بھوکے تھے۔ جیبیں خالی تھیں۔ نہ کھانے کو روٹی تھی نہ سر

چھپانے کو چھت تھی۔ اوپر سے زبردست بارشیں ہو رہی تھیں۔ ہر دم حملے کا بھی ڈر رہتا تھا۔"

"پر حملہ ہوا بھی کہ نہیں؟" لالی نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"بالکل ہوا تھا' ایک بار نہیں' بار بار ہوا۔" ارشاد نے مطلع کیا۔

دونوں چت لیٹے تھے۔ نہ پہلو بدل رہے تھے نہ کروٹ لے رہے تھے۔ ارشاد آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "مجھے اب تک یاد ہے۔ اس روز بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ سب نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑے لتے دھوپ میں سوکھنے کے لیے ریت پر اور جنگلی جھاڑیوں پر پھیلا رکھے تھے۔ ایک دم شور اٹھا۔ بلوائی آگئے' بلوائی آگئے۔ دور سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ سب ادھر اُدھر بھاگے۔ نزدیک ہی کھیت بھی تھے اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں مکئی اور کماد کی فصلیں کھڑی تھیں۔ ماں میرا اور سردار کا ہاتھ پکڑ کر کھیتوں کی طرف دوڑی اور فصلوں میں گھس گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے۔ خون میں ڈوبی ہوئی لال لال تلواریں اٹھائے کبھی ادھر حملہ کرتے کبھی ادھر۔ جو سامنے آیا اسے کتل کر دیا۔ نہ زنانی دیکھی' نہ بوڑھا نہ بچہ۔ ہر طرف رونے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گھوڑوں کے دوڑنے سے ریت کے بادل اٹھ رہے تھے۔ میں ماں سے چمٹا ہوا ڈرا سہا بیٹھا تھا۔"

"سارے مسلمانوں نے اکٹھے ہو کر سکھوں کا مکابلہ نہیں کیا؟"

"کئی جوانوں نے مکابلہ بھی کیا۔ پر کتنی دیر کرتے۔ ادھر لڑنے کے لیے تھا ہی کیا؟ صرف ڈانگیں اور کلہاڑیاں تھیں۔ وہ بھی تھوڑے ہی بندوں کے پاس تھیں۔ ادھر بلوائیوں کے پاس بندوکیں تھیں۔ رائفلیں تھیں۔ تلواریں تھیں۔ پوری تیاری کر کے حملہ کرنے آئے تھے۔" ارشاد نے وضاحت کی۔

"تب تو بہت مسلمان بندے مارے گئے ہوں گے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"ہاں جی' بہت مارے گئے۔" ارشاد نے اعتراف کیا۔ "جب میں ماں کے ساتھ فصلوں سے باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں ریت پر پڑی تھیں۔ ان میں میرا وڈا بھرا' کرم الٰہی بھی تھا۔ وہ بلوائیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ زخمی بھی بہت تھے۔ کوئی تڑپ رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ نہ پوچھ کیسا ڈراؤنا سماں تھا۔ میں تو ایسا ڈرا ہوا تھا کہ رو بھی نہ سکا۔ ماں' کرم الٰہی کی لاش سے لپٹ کر روتی رہی۔"

"تیرا پیو کدھر تھا؟" لالی نے پوچھا۔

"ایک زخمی بندے نے بتایا۔ وہ بیڑی میں سوار ہو کر راوی پار چلا گیا تھا۔ بار بار سب کو پکارتا تھا۔ گھبرایا ہوا ادھر ادھر دوڑتا تھا۔ جب کوئی نہ ملا کوئی نہ آیا تو وہ آخری بیڑی سے چلا گیا۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ "اسی زخمی بندے نے یہ بھی بتایا تھا کہ سکھ بلوائی میری جوان بھین صابرہ کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ کرم الٰہی اس کو بچانے کے لیے دوڑا بھی تھا۔ پر گولی کھا کر ایسا گرا کہ دوبارہ اٹھ نہ سکا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے بہت پیار کرتا تھا۔"

"سکھ رات کو حملہ کرتے تھے یا صرف دن میں؟"

"وہ تو جی ان کی مرضی تھی۔ جب جی کرتا اکٹھے ہو کر، گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آتے اور دھاوا بول دیتے۔ ان کے آتے ہی ہم کھیتوں میں بھاگ کر چھپ جاتے۔" ارشاد نے لالی کو مطلع کیا۔ "خریف کی فصل سمجھو تیار ہی تھی۔ روٹی شوٹی تو ملتی نہیں تھی۔ مکئی کے سٹوں میں دانے آگئے تھے۔ ان کو کھا کر پیٹ بھرتے تھے۔"

ارشاد اپنی بات کہتے کہتے اچانک چپ ہو گیا۔ لالی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا تھا۔ لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "ارشاد، تو چپ کیوں ہو گیا؟"

"کیا، کیا بتاؤں تجھے۔ اب یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے، وہ سب کچھ ڈراؤنا خواب تھا۔" ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب حملہ ہوتا تو تڑتڑ گولیوں کی آوازیں ابھرتیں۔ ایک گولی میرے چھوٹے بھائی سردار الٰہی کی ٹانگ میں لگی، بہت خون نکلا۔ دوا دارو کو تو کچھ تھا نہیں۔ ماں نے پٹی شٹی باندھ دی تھی۔ گولی ٹانگ کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ سردار چل بھی نہ سکتا تھا۔ ہر دم پڑا درد سے ہائے ہائے کرتا رہتا۔"

"اب وہ کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ جی ہمارے ساتھ نہ آسکا۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ ماں نے ایک ملاح کی بہت منت کی۔ اس کے پاس جو زیور شیور تھا سب اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسے کچھ ترس آگیا۔ وہ ہم سب کو اپنی بیڑی میں اس پار لے جانے پر تیار ہو گیا۔ ہم بیڑی میں بیٹھنے جا ہی رہے تھے کہ حملہ آور گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا کوئی ادھر۔ ماں نے مجھے اور سکینہ کو بیڑی میں بٹھا دیا تھا۔ وہ بھی میری وڈی بھین تھی۔ پر صابرہ سے چھوٹی تھی۔"

"صابرہ سب سے وڈی تھی؟"

"نا جی وہ کرم الٰہی سے، چھوٹی تھی۔" ارشاد نے لالی کو بتایا۔ "سب سے وڈا تو کرم الٰہی تھا۔ بہت

زور آور اور گبھرو ہوتا تھا۔"

"اب تو آگے کی بتا۔ سردار کا کیا بنا؟"

"سردار پیچھے رہ گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ پر اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ تب تک حملہ آور نزدیک آگئے تھے۔ ملاح نے گھبرا کر ماں کو زور زور سے ڈانٹا۔ وہ گڑگڑانے لگی۔ پر ملاح نے اس کی ایک نہ سنی۔ بازو پکڑ کر کھینچا اور دھکا دے کر جلدی سے بیڑی میں ڈال دیا۔ خود بھی بیڑی میں سوار ہوا اور تیزی سے اسے آگے بڑھانے لگا۔"

"سردار بیڑی میں نہ بیٹھ سکا؟" لالی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"وہ جی کنارے پر کھڑا زور زور سے ماں' ماں پکار رہا تھا۔ ماں ملاحوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی۔ ملاحوں سے رو رو کر کہہ رہی تھی' بیڑی واپس لے چلو۔ میں نے اپنے پتر کے بنا نہیں جانا۔"

ارشاد نے آہ بھرنے کے انداز میں لمبی سانس لی۔ "ادھر بلوائیوں نے بیڑیوں پر بھی فائر کھول دیا تھا۔ گولیاں چیختی ہوئی ہمارے پاس سے گزر رہی تھیں۔ سب ڈر کر کشتی میں لیٹ گئے۔ پر ماں روتی رہی' گڑگڑاتی رہی۔ ملاح بھی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ ناراض ہو کر ماں کو ننگی ننگی گالاں نکالنے لگے۔ دوسرے بندے بھی آنکھیں نکال کر چیخنے لگے۔ کہنے لگے تو عجیب زنانی ہے۔ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ اپنے ساتھ ہم سب کی جان لینا چاہتی ہے۔"

"تب تو وہ بھی چپ کر کے بیٹھی رہی ہو گی۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"نہیں جی' ماں برابر روتی رہی' چیختی رہی۔ وہ تو دریا میں کود جاتی پر کئی بندوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس پار پہنچ کر بھی وہ سردار سردار کی پکار لگاتی رہی۔ ان دنوں زبردست بارشیں ہوتی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اتنا شور کرتا ہوا بہہ رہا تھا کہ ماں کی آواز سردار تک پہنچ بھی نہ سکتی تھی۔ دوسرا کنارہ نظر بھی نہ آتا تھا۔ شام بھی ہو رہی تھی۔"

"سردار بعد میں بھی نہ آیا؟"

"وہ کبھی نہیں آیا۔ وہ چھوٹا سا تو چھوہرا تھا۔ چھ سال کا بھی نہ رہا ہو گا۔ زخمی بھی تھا۔ کون اسے اپنے ساتھ لاتا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔ پتہ نہیں ہمارے آنے کے بعد اس کا کیا بنا۔ کرم الٰہی کی طرح کسی بلوائی کی گولی یا تلوار نے اسے بھی ختم کر دیا ہو گا۔ وہ تو بھاگ کر فصلوں میں چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "دونوں بھائی مارے گئے۔ بھین بھی گئی۔ پتہ نہیں

زندہ ہے کہ مر گئی۔"

ارشاد نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ لالی کو بھی اس کے ساتھ ساتھ کروٹ بدلنا پڑی۔ ارشاد بالکل خاموش تھا۔ لالی نے آواز بھی دی۔ مگر وہ نہ بولا۔ لالی نے محسوس کیا' وہ رو رہا تھا۔ اس کی دبی دبی سسکیوں کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ لالی بھی افسردہ ہو گیا۔ ارشاد کو تسلی بھی نہ دے سکا۔ چپ لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆

لالی اور ارشاد اپنے تھلوں پر پہنچے۔ گارا بنایا اور اسے سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگے۔ شام تک کام کرتے رہے۔ روٹی پکائی اور مرچ اور نمک سے کھا کر جھونپڑی کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک کارندے نے ان کے ہاتھوں کو زنجیر سے جکڑ کر تالا ڈال دیا۔ جھونپڑی کے اندر لے گیا۔ چارپائی پر لٹایا اور پیروں کو رسی سے باندھ دیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بھٹے کی چہل پہل اجڑ گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے میں گشت کرنے والے پہریداروں کے قدموں کی آہٹ وقفے وقفے سے ابھرنے لگی۔ لالی اور ارشاد جاگ رہے تھے۔ دونوں چت لیٹے تھے۔ اس طرح لیٹنے میں ان کو آرام ملتا تھا۔

پچھلی رات گفتگو کرنے کے بعد لالی کو ارشاد سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اسے بہت مظلوم اور دل گرفتہ نظر آیا۔ اس کی ذات میں دلچسپی بھی پیدا ہوئی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "ارشاد' جب تو پاکستان پہنچا تو تیرا پیو کدھر تھا؟ وہ تو تم سب کا انتظار ہی کرتا ہو گا۔"

"پتہ نہیں جی۔ وہ ہم کو ملا ہی نہیں۔" ارشاد نے جواب دیا۔ "ہم سب کو لہور کے باؤلی رفیوجی کیمپ میں ٹھیرا گیا تھا۔"

"تیرا پیو بھی دوسرے پناہ گیروں کے ساتھ اسی کیمپ میں ٹھیرا ہو گا۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"کیمپ کا تو جی یہ حال تھا کہ ہر طرف بندے ہی بندے نظر آتے تھے۔ زنانیاں تھیں' منڈے اور کڑیاں تھیں۔ سب ہی اپنے اپنوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سب ہی اپنوں کو ڈھونڈتے تھے۔ ایک ایک سے پوچھتے تھے۔ ماں تو مجھے کہیں جانے بھی نہ دیتی تھی۔ ڈرتی تھی ادھر ادھر بھٹک کر کھو نہ جاؤں۔ وہ مجھے اور سکینہ کو چھوڑ کر پیو کو ڈھونڈنے نکل جاتی۔ اس کے بارے میں پوچھتی پھرتی۔ پر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔" ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "ایک

روز ہم تینوں کو ٹرک میں بھر کر لہور سے لائل پور پہنچا دیا گیا۔ ماں نے پیو کو وہاں بھی تلاش کیا۔ پر وہ نہ ملا۔"

"بعد میں تو نے اس کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی؟"

"کیوں نہیں کی۔" ارشاد نے مستعدی سے جواب دیا۔ "میں تو چھوٹا تھا۔ ماں اسے برابر ڈھونڈتی رہی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ وہ گھروں میں نوکری چاکری کرتی۔ ہر ایک سے پیو کے بارے میں پوچھتی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم لائل پور سے خوشاب گئے' سیالکوٹ گئے' گوجرانوالہ گئے۔ اسی کو ڈھونڈتے ہوئے ملتان پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ بھاول نگر کے موضع نذر محمد جھلن میں ہوتا ہے۔ ماں مجھے ساتھ لے کر نذر محمد جھلن پہنچی۔"

"تیری بہن سکینہ ساتھ نہیں گئی تھی۔" لالی نے کرید کر پوچھا۔ "اسے کسی کے پاس چھوڑ دیا تھا؟"

ارشاد خاموش رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ سکینہ بھی تو تیرے ساتھ ہی پاکستان آئی تھی نا؟"

"آئی تھی' بالکل آئی تھی۔ میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب ہم خوشاب میں ہوتے تھے تو سکینہ بھی ساتھ ہی تھی۔ ماں کے ساتھ وہ بھی ایک زمیں دار کی حویلی میں کام کرتی تھی۔ اس نے ہم کو شاہ پور جہانیاں کے پیر انعام محمد کے پاس بھیج دیا۔ وہ بہت وڈا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس سینکڑوں مربع اراضی تھی۔ حویلی بھی بہت شاندار تھی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ایک روز ماں کو پتہ چلا کہ سکینہ کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ سخت ناراض ہوئی۔ سکینہ کو مارا۔ گالاں نکالیں' بد دعائیں دیں۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔ نہ کچھ بولی نہ روئی۔ رات کو روٹی بھی نہ کھائی۔ چپ کر کے سو گئی۔ صبح دیکھا' تو وہ غائب تھی۔ بعد میں اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی۔"

"اسے کسی نے کتل کر کے لاش نہر میں ڈال دی تھی؟"

"اسے کتل شتل نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے نہر میں چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی تھی۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ "زمیں دار کو پتہ چلا تو اس نے ماں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دو سو روپے دیے اور دھمکی دی کہ سکینہ کے بارے میں کسی سے کچھ کہا تو تیرے پتر کی بھی جان جائے گی۔ ماں ایسی ڈری کہ مجھے ساتھ لے کر ایک رات چھپتی لکتی شاہ پور جہانیاں سے نکل گئی۔"

"جب تو ماں کے ساتھ نذر محمد جھلن پہنچا تو تیرا پیو وہاں موجود تھا یا تیری ماں کو غلط اطلاع ملی

تھی؟"

"اطلاع تو بالکل ٹھیک تھی' پر وہ وہاں موجود نہ تھا۔" ارشاد نے بتایا۔ "نذر محمد جھلن میں اسے چار مربع متروکہ اراضی الاٹ ہو گئی تھی۔ وہ ادھر شان سے زمیں داری کرتا رہا۔"

"پر وہ اپنی زمین داری چھوڑ کر چلا کیوں گیا؟"

"وہ مخدوموں کا علاکہ ہے۔" ارشاد نے لالی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ "مخدوم رحمان شاہ ادھر کا بہت وڈا زمین دار ہوتا ہے۔ اس نے کسی بھی مہاجر کو ادھر ٹھہرنے نہ دیا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ مزارعوں کو سرکشی پر اکساتا تھا۔ اس کے کرندے مسلح ہو کر آتے' ڈراتے دھمکاتے۔ جب میرا پیو ڈرانے دھمکانے پر بھی اپنی زمین داری چھوڑنے پر تیار نہ ہوا تو اس نے اپنے کرندوں کو بھیجا۔ وہ اسے گرفتار کر کے مخدوم کے پاس لے گئے۔ وہ مجسٹریٹ بھی ہوتا تھا۔ اس نے میرے پیو کے خلاف مویشی چوری کا جھوٹا مکدمہ بنوایا۔ اس کی اپنی جیل بھی تھی۔ اس نے میرے پیو کو اپنی جیل میں بند کر دیا۔ اس کی خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اسے بھی اٹھوا لیا۔ گھر توڑ پھوڑ کر گرا دیا۔ بہت ظلم کیا جی؟"

"تیرا پیو کب تک مخدوم کی جیل میں رہا؟"

"یہ تو جی مجھے پتہ نہیں۔" ارشاد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "سنا ہے جب وہ جیل سے نکلا تو سخت بیمار تھا۔ اسے بخار رہتا تھا۔ ہر دم کھانستا رہتا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد وہ ایک روز بھی نذر محمد جھلن میں نہ ٹھہرا۔ مخدوم چاہتا بھی یہی تھا۔ اس کے پاس منظور شدہ کلیم ہوتا تھا۔ وہ متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے کسی اور طرف نکل گیا۔"

"اس کے پاس کلیم بھی ہوتا تھا؟ پہلے بھی زمیں دار ہی رہا ہو گا؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

"ہاں جی' وہ زمیں دار ہی ہوتا تھا۔" ارشاد نے نہایت اعتماد سے بتایا۔ "ویسے تو وہ ریاست پٹیالہ کی پولیس میں حوالدار ہوتا تھا' پر ماں بتاتی تھی ضلع گورداس پور کے موضع نصیر پور میں اس کے پاس سات مربعے ہوتے تھے۔ پکی ماڑی تھی۔ وہ اچھا وڈا زمیں دار تھا۔"

لالی نے چونک کر گردن موڑی۔ ارشاد کو غور سے دیکھا۔ "تو پہلے گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا؟" وہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت زدہ نظر آتا تھا۔

ارشاد نے بھی اس کے لہجے میں حیرت محسوس کی۔ "ہاں جی' نصیر پور ہی میں ہوتا تھا۔ پر اس میں اتنے اچنبھے کی کون سی گل ہے؟"

لالی نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "تیرے پیو کا نام کیا تھا۔ وہ چوہدری تو نہیں تھا؟"

"ہاں جی چوہدری ہی تھا۔" ارشاد نے کہا۔ "اس کا نام چوہدری نور الٰہی اور میرا ارشاد الٰہی ہے۔ پر تو ایسی گل بات کیوں پوچھ رہا ہے؟" اس کے لہجے میں بھی استعجاب تھا۔ "تو اسے جانتا ہے؟"

"ہاں میں اسے جانتا ہوں۔" لالی نے مسکرا کر خوش خبری سنائی۔

ارشاد الٰہی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "تو نے اسے کہاں دیکھا کب دیکھا؟"

"میں ان دنوں فیروز پور روڈ کے ایک بھٹے پر نیا نیا بھیرا لگا تھا۔" لالی نے بتایا۔ "تیرا پیو جیپ میں بیٹھ کر ادھر آیا تھا۔"

"یہ کب کی گل ہے؟" ارشاد الٰہی کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔

"پچھلے ہی برس کی گل ہے۔ یہی گرمی کے دن ہوتے تھے۔"

"تب تو اسے نہیں جانتا۔" ارشاد الٰہی کا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرے پیو کو تو مرے ہوئے بھی تین برس سے اوپر ہو گئے۔"

"تجھے کسی نے غلط بتایا۔ وہ مرا نہیں، زندہ ہے۔" لالی نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔" اس نے شاداں کا حوالہ دیے بغیر مطلع کیا۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے وہ گورداس پور کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہے۔ اس کا نام چوہدری نور الٰہی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام اور موضع پوچھا تھا۔"

"پر میں نے تو اس کی کبر بھی دیکھی ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ مکان بھی دیکھا ہے جس میں وہ مرا تھا۔" ارشاد الٰہی نے لالی کا بیان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "پتہ نہیں تو کس کی گل کر رہا ہے۔"

"تو نے کب اس کی کبر دیکھی تھی؟" لالی نے ججھکتے ہوئے استفسار کیا۔

"دو برس پہلے دیکھی تھی۔" ارشاد الٰہی نے مطلع کیا۔ "تو پچھلے برس کی گل کر رہا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "وہ کبر سے نکل کر تو تیرے پاس آنے سے رہا۔ تجھے دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور ہی بندہ ہو گا۔"

"تیری بات سمجھ نہیں آئی۔" لالی الجھن میں پڑ گیا۔ اسے یقین تھا کہ شاداں نے اسے نور الٰہی

کے بارے میں وہی بتایا تھا' جو اس کی زبانی سنا تھا۔ وہ اس سے ایک بار نہیں کئی بار مل چکی تھی۔ ایک عرصے سے اسے جانتی تھی لالی نے کرید کر پوچھا۔ "ارشاد' یہ بتا تو نے اپنے پیو کی کبر کہاں دیکھی تھی۔ تو وہاں تک پہنچا کیسے؟"

"میں نے چک ۵۸ میں اس کی کبر دیکھی تھی۔" ارشاد الٰہی نے بتایا۔ "میں ان دنوں بھی حاصل پور ہی میں ہوتا تھا۔ وہیں مجھے پٹیالہ کے ایک مہاجر سے پتہ چلا تھا۔ میرا پیو بھی متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے ادھر گیا تھا' پر اسے وہاں الاٹمنٹ نہیں ملی۔ بعد میں وہ چک ۵۸ چلا گیا اور ادھر الاٹمنٹ کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ بیمار تھا اور وہیں رہتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس کے بارے میں پتہ چلا' میں فوراً چک ۵۸ پہنچا۔"

"ماں بھی تیرے ساتھ گئی تھی؟"

"لو جی' وہ کیوں نہ جاتی۔ وہی تو مجھے لے کر ادھر گئی تھی۔" ارشاد الٰہی نے جواب دیا۔ "چک ۵۸ زیادہ وڈا پنڈ نہیں ہے۔ پہلے دو زمیں دار ہوتے تھے۔ ایک مسلمان اور دوسرا ہندو کراڑ تھا۔ مسلمان زمین دار تو ابھی تک ادھر ہوتا ہے پر ہندو زمین دار پاکستان بننے کے بعد بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ بعد میں اس کی زمینوں پر مزارعوں نے کبضہ کر لیا۔ اکبر بھی اس کا مزارع تھا۔ پر بہت نیک بندہ ہے۔ اکبر چاہتا تھا' وہ زمین جو اس نے دبا رکھی تھی' میرے پیو کے نام الاٹ ہو جائے اور وہ اس کا مزارع بن کر کاشت کرے۔"

"اکبر کے پاس جو زمین تھی' وہ تیرے پیو کے نام الاٹ ہو گئی تھی؟"

"الاٹ تو ہو جاتی پر میرا پیو بہت بیمار تھا۔ اکبر بتاتا تھا وہ کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر وکھت منجی پر پڑا کھانسا کرتا۔ بکھار بھی رہتا تھا۔ کھانستا تو منہ سے خون بھی آتا تھا۔" ارشاد الٰہی نے گہری سانس بھری۔ "اسے جی ٹی بی تھی۔ اسے یہ بیماری مخدوموں کی جیل میں ہی ہو گئی تھی۔ ٹھیک سے دوا دارو بھی نہیں ہوا۔ ایک حکیم سے دوائی لاتا تھا۔ پر بیماری کم نہ ہوئی اور بڑھ گئی۔"

"جب وہ اتنا سخت بیمار تھا تو اس کا کام کیسے چلتا تھا۔"

"اکبر اور اس کی گھر والی' جیناں میرے پیو کا سارا کام کرتے تھے۔ جیناں اس کے لیے روٹی تیار کرتی تھی۔ صبح شام خود پہنچاتی تھی۔ اس کے کپڑے دھوتی تھی۔ گھر کی صفائی کرتی تھی۔ خوشی خوشی ہر کام کرتی تھی۔ اکبر بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ حکیم دوسرے پنڈ میں ہوتا تھا۔ وہ ان سے اس کے لیے دوائی لاتا تھا۔" ارشاد الٰہی آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "دونوں بہت نیک بندے ہیں۔ مزارع نہ ہونے پر بھی وہ خود کو میرے پیو کا مزارع سمجھتے تھے۔"

"تو ان سے ملا تھا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"میں چک ۵۸ گیا۔ تو ان کے ہی گھر میں ٹھہرا تھا۔" ارشاد الٰہی نے لالی کو بتایا۔ "میں نے وہ مکان بھی دیکھا جس میں میرا پیو رہتا تھا۔ جیناں مجھے اور ماں کو لے کر وہاں گئی تھی۔ رو رو کر میرے پیو کے بارے میں بتاتی تھی۔ کہتی تھی' وہ ہر دم ہم سب کو یاد کرتا رہتا تھا۔ جگہ جگہ ڈھونڈتا تھا۔"

"تیرے پیو کے پاس تو روپیہ پیسہ بھی ہو گا۔ اس کا تو منظور شدہ کلیم بھی تھا۔ اکبر اور جیناں نے وہ سب کچھ تجھے اور تیری ماں کو نہیں دیا؟"

"میرے پیو کے بکسے سے کل ۲۲ روپے نکلے تھے جس سے اس کا کفن دفن کر دیا گیا۔" ارشاد الٰہی نے جواب دیا۔ "کلیم کے کاغذات بکسے سے نہیں نکلے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جیناں نے مجھے وہ بکسہ دکھایا تھا جس میں میرے پیو کے کپڑے لتے تھے۔ کنگھی اور آئینہ تھا۔ اس کی پگڑی اور جوتے تک جیناں نے بکسے میں بند کر کے رکھ چھوڑے تھے۔"

"پر اس کے کلیم کے کاغذات کہاں گئے؟ اکبر اور جیناں کے تو وہ کسی کام کے نہ تھے۔" لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تو نے یا تیری ماں نے ان کے بارے میں اکبر اور جیناں سے ملوم نہیں کیا؟"

"ملوم کیا تھا۔ ماں نے تو بار بار پوچھا تھا۔" ارشاد الٰہی نے کہا۔ "اکبر کہتا تھا اس نے کلیم کے کاغذات میرے پیو کے پاس دیکھے بھی تھے۔ وہ ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھتا تھا۔ زمین کی الاٹمنٹ کے لیے سرکاری افسروں کے پاس جاتا تو کاغذات اس کے ہاتھ میں دبے ہوتے تھے۔ واپسی پر بکسے میں رکھ دیتا تھا اور اس میں تالا ڈال دیتا تھا۔ اس کے پاس سیکل بھی ہوتی تھی۔ اسی پر سوار ہو کر وہ سرکاری افسروں کے پاس جاتا تھا۔ وہ سیکل بھی میں نے دیکھی۔" ارشاد الٰہی نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "اکبر نے سیکل' بکسہ اور بستر' سب کچھ مجھے دے دیا تھا۔ سیکل تو میں نے بعد میں بیچ دی تھی۔ کرتا بھی کیا' ان دنوں تو اپنے پاس پیٹ بھرنے کو بھی کچھ نہ تھا۔"

لالی کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلیم کے کاغذات ہوتے تو اکبر وہ بھی تجھے دے دیتا۔"

"ضرور دے دیتا۔ میں نے بتایا نا کہ اکبر بہت نیک بندہ ہے۔ میں نے اور ماں نے پوچھا تو ہر بار یہی کہتا تھا' پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ نہ بکسے میں ملے نہ بستر تلے ملے۔ بہت ڈھونڈا پر کہیں نہ ملے۔" ارشاد الٰہی لحہ بھر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "پر اس نے ایک عجب گل بھی بتائی۔"

"وہ کیا تھی؟" لالی نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"اکبر کہتا تھا' میرے پیو کے مرنے سے دو تین روز پہلے اس کے پاس ایک انجان بندہ آکر ٹھہرا تھا۔ نہ وہ کبھی گھر سے باہر نکلا نہ اسے کسی نے دیکھا۔"

"اکبر کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟"

ارشاد الٰہی نے لالی کو بتایا۔ "اکبر نے ایک شام کھڑکی سے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پیو کے نزدیک موڑھے پر بیٹھا آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ اکبر نے اس کے بارے میں اپنی گھر والی جیناں کو بھی بتایا تھا۔ پر جیناں نے جب میرے پیو سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ بولا' جیناں تجھے دھوکا ہوا۔ میرے پاس تو کوئی بندہ نہیں آیا۔"

"اکبر کو دھوکا ہی ہوا ہو گا۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"پر اکبر بتاتا تھا کہ جیناں سے بات کرنے کے بعد بھی اسے اطمینان نہ ہوا۔ دوسرے روز وہ شام کا اندھیرا ہوتے ہی وہاں پہنچا۔ چھپ کر کھڑکی سے جھانکا تو وہ میرے پیو کے پاس موجود تھا۔ آرام سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر میرے پیو کو پانی بھی پلایا تھا۔ اکبر نے اسے ٹھیک طرح دیکھا تھا۔" ارشاد الٰہی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "پر سویرے وہ اس بھید کو جاننے کے لیے میرے پیو کے پاس پہنچا تو وہ بستر پر مرا ہوا پڑا تھا۔"

"یہ تو بہت اچنبھے کی گل ہوئی۔" لالی نے حیرت سے کہا۔ "تو نے اس بارے میں کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی؟"

"جیناں کہتی تھی' وہ موت کا فرشتہ تھا۔ بھیس بدل کر میرے پیو کی روح کھینچنے آیا تھا۔" ارشاد الٰہی نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بات اسے مسجد کے ملاں نے بتائی تھی۔"

"پتہ نہیں کیا چکر تھا۔" لالی نے اپنی رد عمل کا اظہار کیا۔

ارشاد الٰہی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی بھی تھوڑی دیر چپ پڑا سوچتا رہا' پھر اس نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔ "اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے' مرنے والا تیرا پیو نہیں تھا۔ کوئی اور ہی مرا تھا۔" اس نے مسکرا کر ارشاد کی طرف دیکھا۔ "شادے! تیرا پیو مرا نہیں زندہ ہے۔ اس نے اپنے کلیم کے ذریعے ضلع منٹگمری کی تحصیل دیپال پور میں متروکہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس کی زمیں داری ہے۔ وہ ادھر کا وڈا زمیں دار ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا ہے۔ حویلی بھی اسے کلیم ہی میں ملی ہے۔" یہ تمام تفصیلات اسے شاداں ہی نے بتائی تھیں۔ مگر لالی نے اس بار بھی شاداں کے متعلق ارشاد الٰہی سے کوئی ذکر نہ کیا۔ ضرورت بھی نہ تھی۔ لالی نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "لگتا ہے' تجھے اپنے پیو کے بارے میں ٹھیک سے پتہ نہیں

چلا۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" ارشاد الٰہی مخمصے میں پڑ گیا۔ اس نے مزید وضاحت کی۔ "پر میں دو بار اپنے پیو کے بارے میں پوچھ تاچھ کے لیے چک ۵۸ جا چکا ہوں۔ کاور آباد سٹیشن سے بہت نزدیک ہے۔ یوں سمجھ 'نہریاری دو آب کے ٹبوں کے بالکل اس پار ہے۔ آگے تخت ہزارہ ہے۔"

☆

لالی کو رحیم داد یاد آ گیا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس نے روپوش ہونے کے لیے نہریاری دو آب کے اجاڑ اور اونچے نیچے ٹبوں اور ٹیلوں کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ اس کی لاش بھی ٹیلوں کے درمیان ہی ملی تھی۔ پولیس کی حراست میں رحیم داد کی لاش اسی نے شناخت کی تھی۔ لیکن لاش اس بری طرح مسخ ہو چکی تھی کہ صرف جیل کی وردی ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جو ہنوز مقتول کے جسم پر موجود تھی۔ البتہ اسے اپنی وہ ہمیانی بار بار دیکھنے کے باوجود نظر نہ آئی تھی جس میں تین ہزار سے اوپر رقم تھی۔ یہ ہمیانی پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے اس نے احتیاطاً رحیم داد کے حوالے کر دی تھی۔ اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ اسے حفاظت سے کمر کے گرد باندھ لے۔ مگر لاش کی کمر پر ہمیانی نہ تھی۔ قاتلوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی یا ہو سکتا ہے پولیس والوں نے اڑا لی ہو۔ لالی نے اس وقت ہمیانی کے بارے میں یہی قیاس آرائی کی تھی۔

وہ اب تک نہ ہمیانی بھولا تھا نہ رحیم داد کو۔ اس کی نگاہوں میں چوہدری نور الٰہی کا چہرہ گردش کرنے لگا۔ اس چہرے کی پیچھے اسے رحیم داد کی ہلکی سی جھلک نظر آئی جسے اس نے چوہدری نور الٰہی کو دیکھتے ہی محسوس بھی کیا تھا۔ لیکن لالی نے اپنے اس شبے کا کبھی شاداں سے اظہار نہ کیا۔ لالی نے اسے صرف چند لمحے کے لیے دیکھا تھا۔ نہ بات چیت کا موقع ملا تھا نہ غور سے دیکھنے کا۔ دوبارہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آئی۔ شبہ ابھرا اور ذہن کے نہاں خانے میں دب کر گم ہو گیا۔ مگر اب وہ اس کے متعلق خاموشی سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔

"تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" ارشاد الٰہی نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر دریافت کیا۔

لالی خیالات کے حصار سے فوراً باہر نکل آیا۔ ارشاد الٰہی سے پوچھا۔ "تو اپنے پیو کو دیکھ کر پہچان تو لے گا نا؟"

"پہچان تو لینا چاہیے۔" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے دس گیاراں برس میں میری طرح وہ بھی بہت بدل گیا ہو گا۔"

ارشاد الٰہی کے لہجے سے تذبذب آشکارہ تھا۔ لالی نے بھی اسے محسوس کیا۔ "پر تیری ماں تو

اسے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "وہ اسے ضرور پہچان لے گی۔ برسوں گھر والی بن کر اس کے ساتھ رہی ہے۔ اس کے تین پتروں اور دو بیٹیوں کو پیدا کر چکی ہے۔"
لالی نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ "تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا نا؟"
مگر ارشاد الٰہی! اتنا ذہین اور جہاندیدہ نہ تھا کہ لالی کی بات کی تہہ تک پہنچ جاتا۔ وہ چند لمحے تک ہونق کی طرح نظریں اٹھائے لالی کو تکتا رہا' پھر اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ہاں وہ اسے پہچان لے گی۔ دیکھتے ہی پہچان لے گی۔" اس کے رویے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔
"تیری ماں آج کل کہاں ہوتی ہے؟"
ارشاد الٰہی نے لالی کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ لیٹا چھت کو تکتا رہا۔
مگر لالی چپ نہ رہ سکا۔ اصرار کر کے پوچھا۔ "شادے! تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ تیری ماں کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟"
"ملتان میں ہوتی ہے۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ نگاہیں اٹھائے چھت کو تک رہا تھا۔
"ادھر بھی کسی کے پاس نوکرانی شوکرانی لگی ہوئی ہے؟" لالی نے کرید کر دریافت کیا۔ "کوئی نہ کوئی کام دھندا تو کرتی ہی ہو گی۔"
"کیا کرے گا جان کر وہ کیا کرتی ہے۔" ارشاد الٰہی نے بے زاری سے کہا۔
"جب تو نے سب کچھ مجھے بتا دیا تو یہ بھی بتا دے وہ کیا کرتی ہے؟" لالی نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ "ویسے نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔"
"میں نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ' جب ہم لہور کے رفیوجی کیمپ میں ہوتے تھے تو ایک رات رضا کار نہ جانے کس طرح سکینہ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔"
"رضا کار تیری بھین کو اٹھا کر لے گئے تھے؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔
"ہاں جی رضا کار ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔" ارشاد الٰہی نے بلا جھجک بتایا۔ "پر یہ بات بھی ایک رضا کار ہی نے ماں کو بتائی تھی۔" اس نے گردن گھما کر لالی کی جانب دیکھا۔ "سب ہی بندے ایک سے تو نہیں ہوتے۔ چنگے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ وہ رضا کار بھی چنگا اور نیک بندہ تھا۔ اس کا نام وارث تھا۔ عمر بھی اس کی زیادہ نہیں تھی۔ ۲۲ برس سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ ہر ایک کی مدد کرتا تھا۔ کبھی ناراض نہ ہوتا تھا۔ بات بھی بہت پیار سے کرتا تھا۔"
لالی نے ارشاد الٰہی کو ٹوکا۔ "تو سکینہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وارث کو کہاں سے بیچ میں لے

آیا۔"

"ہاں جی، میں سکینہ ہی کے بارے میں بتا رہا تھا۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی مداخلت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تجھے پتہ نہیں وارث کتنا بھلا بندہ تھا۔ پہلے کالج میں پڑھتا تھا۔ پر ان دنوں تو سکول کالج سب بند تھے۔ میں جب نصیر پور میں ہوتا تھا تو پرائمری اسکول کی تیسری جماعت میں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اول آتا تھا۔ تب ہی تو میرا پیو مجھے آگے پڑھا کر وڈا افسر دیکھنا چاہتا تھا پر نصیر پور چھوٹا تو میری پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ سکول جانا نصیب نہ ہوا۔ روٹی تو پیٹ بھر کر ملتی نہیں تھی۔ پڑھتا کیسے طرح طرح کے کام دھندے کرتا رہا۔ کبھی یہاں لگ گیا کبھی وہاں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اپنے نصیب میں تو بتھیرا بننا لکھا تھا۔ آخر بتھیرا بن گیا۔ گل ایہہ ہے۔"

"سکینہ کیسے واپس ملی؟" لالی نے اکتا کر مداخلت کی۔

"وارث ہی کی مدد سے ملی تھی۔" ارشاد الٰہی نے بتایا۔ "رضا کاروں نے اسے ایک کنجری کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ اطلاع بھی وارث ہی نے دی تھی۔ ماں کو پتہ چلا تو وہ اس کنجری سے سکینہ کو واپس لینے ہیرا منڈی پہنچی۔ پر اس نے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ماں نے ناراض ہو کر شور شرابہ کیا۔ کنجری اور اس کے دلّوں نے ماں کو مارا پیٹا اور دھکّے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔" اس نے جھنجلا کر گالی دی۔ "ایسے زور سے اسے دھکّا دیا کہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی دور جا کر گری۔ کمر میں ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اس سے اٹھا بھی نہ گیا۔ زمین پر پڑی ہائے ہائے کرتی تھی۔"

"وارث اس کے ساتھ نہیں تھا؟"

"وہ بعد میں پولیس لے کر پہنچا تھا۔" ارشاد نے لالی کو مطلع کیا۔ "پولیس کو دیکھ کر کنجری اور اس کے دلّے ڈر گئے۔ سکینہ کو واپس کر دیا۔ بہت ساری منتیں بھی کیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وارث مدد نہ کرتا تو سکینہ واپس نہ آتی۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "کنجری کے ساتھ رہ کر کنجری بن جاتی۔"

"ہاں جی، ایسا ہی ہوتا۔ ماں کو تو انھوں نے دھکّے دے کر نکال ہی دیا تھا۔" ارشاد الٰہی نے کہا۔ "کئی روز تو وہ پڑی رہی۔ کمر پر بہت زور کی چوٹ آئی تھی۔ بعد میں مالش کرانے سے کچھ ٹھیک ہو گئی تھی۔ پر ٹھیک سے چل نہ سکتی تھی۔ دھیرے دھیرے درد جاتا رہا۔ ہاں، سردی میں اس کا درد بڑھ جاتا۔ کچھ عرصہ وہ بھی میرے ساتھ حاصل پور کے بھٹے پر کام کرتی رہی۔ پر ایک رات اندھیرے میں بھٹے کے گڑھے میں گر گئی۔ اس بار بھی اس کی کمر پر چوٹ آئی اور ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اس سے کام نہ کیا جاتا تھا۔ لنگڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ جب اس میں بالکل کام کرنے کی

سکت نہ رہی تو ایک روز حاصل پور سے چلی گئی۔ مجھے بتایا بھی نہیں۔ بعد میں پتہ چلا وہ ملتان چلی گئی تھی۔"

"ملتان میں وہ کیا کرتی ہے؟"

"اب تجھ سے کیا چھپانا' وہ ملتان کی ایک درگاہ پر بھیک مانگتی ہے۔" ارشاد الٰہی نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ "وہ ملنگوں اور بھکاریوں کے ساتھ رہتی ہے۔"

"تو اس کے پاس گیا نہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں' پر مجھے پتہ ہے وہ کہاں ہوتی ہے۔"

"تجھے اس کے پاس جانا چاہیے تھا۔" لالی نے اس کے رویے کو پسند نہ کیا۔ "اسے اپنے پاس لا کر رکھتا۔ تجھے یہ جان کر دکھ نہیں ہوتا' تیرے ہوتے ہوئے وہ لاوارثوں کی طرح ملتان میں پڑی بھیک مانگتی رہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ارشاد نے لالی کی بات پر کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ "میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے اپنے پاس لے آؤں۔ پر میں ملتان جا نہ سکا۔ ملتان روڈ کے بھٹے کا جمعدار دلاور دوسرے پتھیروں کے ساتھ مجھے بھی خرید کر حاصل پور سے لہور لے آیا۔ تب سے میں ادھر ہی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اب تو ماں کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ پتہ نہیں کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟"

"پرواہ نہ کر شادے' میں تجھے ماں کے پاس ملتان لے جاؤں گا۔" لالی نے اسے تسلی دی۔

"تو مجھے ماں کے پاس لے جائے گا۔" ارشاد الٰہی نے تعجب کا اظہار کیا۔ "تو مجھے ملتان کیسے لے جا سکتا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "بھٹے سے باہر جانے کی تو اجازت نہیں۔ تو ملتان جانے کی گل کر رہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا میں تجھے کیسے ملتان لے جاؤں گا۔" لالی نے اسے اطمینان دلایا۔

"سمجھ نہیں آتی تو مجھے کیسے لے جائے گا۔؟" ارشاد الٰہی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر زنجیر کو آہستہ آہستہ ہلایا۔ "یہ زنجیر دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھ رہا ہوں' بالکل دیکھ رہا ہوں۔ پر یہ ہمیشہ تو ہاتھوں میں نہیں پڑی رہے گی۔ ایک نہ ایک روز تو اس سے چھٹکارہ مل ہی جائے گا۔"

"مان لے زنجیر سے ہاتھوں کو باندھنا بند بھی کر دیا گیا تب بھی تو بھٹے سے باہر کیسے نکلے گا؟" ارشاد الٰہی نے بے دلی سے کہا۔ "تو نے دیکھا نہیں کرندے ہم دونوں کی کتنی کڑی نگرانی کرتے

ہیں۔ دن میں تو رات سے بھی زیادہ نگرانی کرتے ہیں۔ کسی دوسرے تیسرے سے بات تک تو کرنے نہیں دیتے۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتے ہیں۔"

"نگرانی شگرانی تو چلتی ہی رہے گی۔" لالی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "تو دیکھ لینا۔ ایک روز یہاں سے صاف نکل جاؤں گا اور تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میں نے ایسا نہیں کرنا۔" ارشاد الٰہی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خوف زدہ اور گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ "تو ایسا کیوں کر کر سکتا ہے؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" لالی نے اسے ایک بار پھر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو چپ کر کے دیکھتا جا۔ میں جیسا کہوں تو ویسا ہی کرنا دونوں آرام سے نکل جائیں گے۔"

"نہیں جی، اس طرح کسی اور چکر میں پڑ جائیں گے۔" ارشاد الٰہی آمادہ نہ ہوا۔ وہ بدستور خوف زدہ تھا۔ "یہ تو سوچ فرار ہونے کی کوشش میں پکڑے گئے تو کیا ہو گا؟"

"پکڑے بھی گئے تو کیا ہو گا۔ جیسے اب زنجیر سے جکڑ کر رکھا گیا آگے بھی ایسے ہی رکھا جائے گا۔ جان سے تو نہیں مار دیا جائے گا۔ پھانسی پر تو نہیں لٹکایا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا۔ نگرانی اور سخت کر دی جائے گی۔" لالی نے اسے للکارا۔ "شادے! حوصلے سے کام لے حوصلے سے۔" اس نے آہستہ آہستہ زنجیر ہلائی۔ "تجھے اس زنجیر سے ہاتھ میں درد ملوم نہیں ہوتا؟"

"کیوں نہیں ملوم ہوتا۔ رات میں ٹھیک سے نیند بھی نہیں آتی۔ دن میں اینٹیں تیار کرنے اور گارا بنانے میں بھی بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

"یہ تو سوچ نہ دہاڑی لگتی ہے نہ پیٹ بھر روٹی ملتی ہے۔ اس طرح ہم کب تک دیگار کرتے رہیں گے؟ کب تک اس طرح زنجیر اور رسی سے جکڑے ہوئے ساری ساری رات پڑے رہیں گے؟" لالی نے ارشاد الٰہی کی ہمت افزائی کی۔ "اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے ارشاد الٰہی کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "کیسے یہاں سے نکلیں گے، یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔ آگے میں جو کچھ کروں گا اچھی طرح سوچ بچار کر کے کروں گا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "میں تجھے ماں سے بھی ملاؤں گا اور تیرے پیو کے پاس بھی لے جاؤں گا۔ تجھے غلط اطلاع ملی۔ تیرا پیو مرا نہیں زندہ ہے۔ وہ کوٹلہ ہر کشن میں شان سے زمیں داری کرتا ہے۔ تو اس کے پاس چلا گیا تو عیش کرے گا۔"

ارشاد الٰہی نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ لالی نے بھی مزید بات چیت نہ کی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور سونے کی

کوشش کرنے لگا۔

☆

لالی معمول کے مطابق سانچے میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرتا رہا اور مسلسل ارشاد الٰہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی اجڑنے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے کی دل گداز روداد سن کر وہ شدت کے ساتھ متاثر ہوا تھا۔ لالی کو اس سے گہری ہمدردی اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ارشاد الٰہی کو بھٹے سے نکال کر باہر لے جائے۔ اس کے ہم راہ کوٹلہ ہرکشن پہنچے چوہدری نور الٰہی سے ملے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آیا وہ ارشاد الٰہی کا باپ ہے کہ نہیں؟ اگر وہ واقعی اس کا باپ نکلا تو ایک دوسرے سے مل کر دونوں کس قدر خوش ہوں گے۔ ارشاد الٰہی کے دن پھر جائیں گے۔ طرح طرح کی اذیت ناک مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ اس کی اپاہج ماں کو ملتان میں مزاروں اور خانقاہوں پر بھیک کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا۔ وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جائے گی۔ برسوں کے بچھڑے ایک بار پھر مل بیٹھیں گے تو کتنے مسرور اور شاداں ہوں گے۔ اس خوشی میں جو لذت اور گرم جوشی تھی اس کے احساس سے لالی وارفتہ ہو جاتا۔

وہ اینٹیں تیار کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سہ پہر ہو گئی۔ ایک کارندہ اس کے پاس آیا اور یہ پیغام لایا کہ بھٹے کے مالک 'ملک نثار محمد' نے اسے بلایا ہے۔ لالی کو حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی لاحق ہوئی۔ تشویش کی بات ہی تھی۔ اب تک اس کی ملک نثار محمد کے سامنے پیشی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی عام طور پر نہ وہ کسی پتھیرے سے بات کرتا تھا نہ اپنے دفتر میں بلاتا تھا۔ پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں سے اس کا رابطہ ہمیشہ جمعدار کے وسیلے سے رہتا تھا۔

لالی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دفتر کی جانب چلا۔ کارندہ اس کے ہم راہ تھا۔ مگر وہ دروازے کے باہر رک گیا۔ لالی دفتر کے اندر چلا گیا۔ ملک نثار محمد کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ ملک نثار نے کوئی جواب نہ دیا۔ اخبار میز پر ڈالا اور نظریں اٹھا کر لالی کی جانب متوجہ ہوا۔

"تو لالی پتھیرا ہے؟" ملک نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔

"ہاں جی!" لالی نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

ملک نے نہایت گندی گالی دی۔ چیخ کر بولا۔ "تو نے اپنی بدمعاشی نہیں چھوڑی۔"

"میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔" لالی نے سادگی سے کہا۔ "میں تو جی دن بھر اینٹیں بناتا ہوں۔ شام کو زنجیر سے باندھ کر منجی پر ڈال دیا جاتا ہوں۔ بھٹے کے پہریدار رات بھر کڑی نگرانی کرتے ہیں۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "نہ کسی سے مل سکتا ہوں نہ گل بات کر سکتا ہوں۔"

"تیرے ساتھ شادا ہتھیرا نہیں ہوتا؟"

"ہاں جی، وہ تو ہوتا ہے۔" لالی نے اعتراف کیا۔ "رات ہوتے ہی میرا اور اس کا ہاتھ زنجیر سے جکڑ کر تالا لگا دیا جاتا ہے۔ پیروں سے رسی لپیٹ کر منجی سے باندھ دی جاتی ہے۔"

"تیرے منہ میں تو تالا نہیں ڈالا جاتا۔ تو شادا سے گل بات تو کر سکتا ہے۔"

لالی نے گھبرا کر ملک کی جانب دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

"چپ کر کے کیوں کھڑا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟" ملک نثار محمد نے ڈپٹ کر کہا۔ "تو نے پہلے بھی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے تجھے ٹھیک سے سزا نہیں ملی۔ تب ہی دوبارہ فرار ہونے کی سوچ رہا ہے اور شادا کو بھی اپنے ساتھ نکال لے جانا چاہتا ہے۔"

"نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "لگتا ہے کسی نے میرے بارے میں تجھے غلط اطلاع دی ہے۔"

"کوئی اور نہیں، تیرا ساتھی شادا خود میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا کہ تو کیا کرنا چاہتا ہے۔" ملک کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "اب تو کہہ دے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔"

"اگر اس نے تجھ سے ایسی بات کہی تو بالکل غلط کہی۔" لالی نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ "اس نے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے کبھی اس سے ایسی گل بات نہیں کی۔"

ملک نثار محمد نے باہر دروازے پر کھڑے ہوئے کارندے کو آواز دی۔ وہ اندر آیا تو ملک نے اس سے کہا۔ "شادا ہتھیرے کو یہاں بھیج دے۔"

لالی سخت پریشان ہوا۔ سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔ ملک بھی چپ بیٹھا بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ارشاد الٰہی اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو دیکھا تو بہت سٹ پٹایا۔ جھٹ گردن موڑی اور ملک نثار محمد کی جانب منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"اس نے کل رات تجھے فرار ہونے کے لیے کہا تھا نا؟" ملک نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب

اشارہ کیا۔

ارشاد الٰہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بشرے سے گھبراہٹ اور پریشانی جھلک رہی تھی۔ ملک نے اسے ڈانٹا۔ "چپ کیوں ہے؟ بتاتا کیوں نہیں؟"

اس بار اس نے اقرار کرنے کے انداز میں گردن ہلائی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"اس طرح گردن نہ ہلا۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔" ملک نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ "اس نے یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تجھے کیا کہا تھا؟"

"اس نے وہی کہا تھا جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔" ارشاد الٰہی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ بھٹے سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہتا تھا۔"

لالی نے جھنجلا کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "بکواس نہ کر۔ میں نے تجھ سے کب ایسی گل بات کہی تھی۔ تجھے جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔"

"چپ کر کے کھڑا رہ۔" ملک نے برہم ہو کر لالی کو ڈانٹا۔ مڑ کر ارشاد الٰہی کی طرف متوجہ ہوا۔ "صاف صاف بتا' اس نے تجھے کیا کہا تھا؟"

"اس نے کہا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے بعد یہ مجھے اپنے ساتھ لے کر میرے پیو کے پاس جائے گا۔ مجھے اس سے ملائے گا۔"

"یہ بات تو نے مجھے پہلے نہیں بتائی تھی۔" ملک نثار نے تیکھی نظروں سے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ قدرے توقف کیا "یہ بتا تیرا پیو کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ مر چکا ہے۔" ارشاد الٰہی نے مطلع کیا۔ اس کے لہجے سے افسردگی عیاں تھی۔

لالی نے پلٹ کر ارشاد الٰہی کی جانب دیکھا۔ "اسے جی کچھ پتہ نہیں۔ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جی۔ اسے مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "مجھے اچھی طرح پتہ ہے وہ کب مرا اور کہاں مرا؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "یہ تو جی مجھے بہکانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا تاکہ میں اس کے ساتھ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔"

"نہیں جی' اسے بالکل پتہ نہیں۔" لالی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "اسے کسی نے غلط بتایا۔ میں نے اسے دیکھا ہے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے وہ کہاں ہوتا ہے؟"

اس بار ملک نثار محمد نے مداخلت کی۔ "شادے کا پیو زندہ ہے یا مر گیا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا پر اس سے تو انکار نہیں کر سکتا تو شادا کو اس کے پیو سے ملانے کے بہانے یہاں سے فرار ہونا

چاہتا تھا اور اپنے ساتھ اسے بھی لے جانا چاہتا تھا۔"

لالی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جوش میں آکر ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی۔ اس نے گھبرا کر ملک نثار محمد کی جانب دیکھا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ خود کو سنبھالا اور ایک بار پھر جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ "میں نے تو جی اسے صرف اس کے پیو کے بارے میں بتایا تھا۔ فرار ہونے کو نہیں کہا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔"

"مجھے اچھی طرح پتہ چل گیا ہے۔ کون جھوٹ بول رہا ہے کون سچ؟" ملک نثار محمد نے ڈپٹ کر کہا۔ "تو نے ایک بار پہلے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ کہہ دے یہ بھی جھوٹ ہے۔"

لالی نے نظریں نیچی کرلیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا فرش کو تکتا رہا۔ اسی اثناء میں جمعدار زمان رخان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

بھٹے کے مالک نے اسے مخاطب کیا۔ "یہ ٹھیک ہوا تو بھی آگیا۔ میں تجھے بلانے ہی والا تھا۔" اس نے غصے سے گالی دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ "یہ خانہ خراب دوبارہ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ضرور کر رہا ہو گا جی۔" جمعدار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "مجھے پتہ چلا ہے یہ تو جی جیل سے بھی فرار ہو چکا ہے۔ چوری ڈکیتی کے جرم میں کئی بار سزا کاٹ چکا ہے۔" اس نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "اس بار میں اس کی ایسی چابی کسوں گا۔ ایسی کڑی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے۔" جمعدار نے نثار محمد کو یقین دلایا۔ "فکر نہ کریں جی۔ میں اس کو بالکل ٹھیک کر دوں گا۔ ساری بدمعاشی نکال دوں گا۔"

"میں نے اب اس کے ساتھ نہیں رہنا جی۔" ارشاد الٰہی نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ مجھے بہت تنگ کرے گا۔"

"نہیں تجھے اب اس کے ساتھ نہیں رکھا جائے گا۔ ہاتھوں میں زنجیر بھی نہیں ڈالی جائے گی۔" ملک نثار محمد نے ارشاد الٰہی کو اطمینان دلایا۔

"میری دہاڑی بھی لگانی شروع کر دی جائے۔ بہت مہربانی ہو گی جی۔" ارشاد الٰہی نے گڑگڑا کر کہا۔ "جو غلطی ہو گئی اسے معاف کر دیا جائے۔"

ملک نثار محمد نے فیصلہ سنانے کے انداز میں جمعدار کو ہدایت کی۔ "زمان، ابھی جا کر منشی سے کہہ دے، آج سے شادا کی بھی دوسرے پتھیروں کی طرح دہاڑی لگانی شروع کر دے۔ اسے علیحدہ جھگی دی جائے۔ مجھے یہ کام کا بندہ لگتا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر لالی کو خفگی سے دیکھا۔ "یہ تو دیکھنے میں بھی خطرناک جرائم پیشہ لگتا ہے۔"
اس نے گردن موڑی۔ جمعدار کی طرف متوجہ ہوا۔ "زمان' تو نے بھٹے کے لیے اسے کیسے بھرتی کر لیا؟"

"یہ جی پہلے تیموں کے بھٹے پر پتھیرا ہوتا تھا۔" جمعدار نے فوراً صفائی پیش کی۔ "ادھر سے دوسرے پتھیروں کے ساتھ آیا تھا۔ تب مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ سزا یافتہ ہے۔ کئی بار جیل میں رہ چکا ہے۔"
"تو دونوں کو اپنے ساتھ لے جا۔" ملک نثار نے حکم صادر کرنے کی انداز میں اونچی آواز سے کہا۔ "اور دیکھ' شادا کا آگے خیال رکھنا۔"
جمعدار آگے بڑھا۔ ارشاد الٰہی اور لالی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں چپ چاپ باہر چلے گئے۔
باہر نکل کر جمعدار نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا اور ارشاد الٰہی سے نرم لہجے میں کہا۔
"شادے' تو جا کر آرام سے اپنا کام کر۔"
ارشاد الٰہی خاموشی سے مڑا۔ اپنے تھلّے پر پہنچا اور سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرنے لگا۔ مالک کے حکم پر اسے قید و بند سے چھٹکارا مل گیا۔ اسی روز سے اس کی دہاڑی بھی لگنے لگی۔ رہنے کے لیے علیحدہ جگہ بھی مل گئی۔ لالی کے خلاف مخبری کرنے کا اسے خاطر خواہ صلہ ملا۔

۳۹

جمعدار زماں ایک جھونپڑی میں پہنچا۔ لالی اس کے ہم راہ تھا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی اور بھٹے سے الگ تھلگ ایک ویران گوشے میں تھی۔ جمعدار نے لالی کے تمام کپڑے اتروائے اور اس کے برہنہ جسم پر پانی میں بھیگے ہوئے چھتر اس طرح بے دردی سے سڑاک سڑاک لگائے کہ لالی تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ بلبلا کر چیخنے چلانے لگا۔ کبھی ادھر مڑتا کبھی ادھر۔ مگر جمعدار کا ہاتھ برابر چلتا رہا۔ وہ پیترے بدل بدل کر لالی کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے حال ہو گیا۔ منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

لالی کے جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ کہیں کہیں سے کھال بھی پھٹ گئی تھی۔ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اسی حالت میں کمر کے گرد رسی باندھ کر بھٹے پر گشت کرایا گیا۔ اس کا جسم مادر زاد برہنہ تھا۔ زخموں سے ٹیس اٹھ رہی تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

عورتیں لالی کو اس حال میں دیکھتیں تو گھبرا کر دوپٹے کے آنچل سے منہ چھپا لیتیں۔ بھٹے پر کام کرنے والا ہر شخص دم بخود تھا۔ خوف سے لرزہ براندام تھا۔ پورے بھٹے پر دہشت طاری تھی۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔

ارشاد الٰہی کے سامنے سے گزرتے ہوئے لالی ٹھٹکا۔ نظریں بلند کیں، ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ سینے میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے منہ بگاڑا۔ گہری سانس بھری اور جھنجلا کر حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ جمعدار نے آگے بڑھ کر لالی کی کمر پر

سڑاک سے چھتر مارا۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ لالی درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔ آگے بڑھا اور نظریں جھکائے ہوئے پتھیروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔

بھٹے کا گشت کرانے کے بعد دن ڈھلے لالی کے پیروں کو رسی سے جکڑا گیا اور شیشم کے درخت کی ایک مضبوط ڈال سے باندھ کر لٹکا دیا گیا۔ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور سر نیچے تھا۔ جسم پر ہنوز کوئی لباس نہ تھا۔ نہ اس نے کوئی مزاحمت کی نہ شور مچایا۔ اس کے لیے یہ نیا تجربہ نہیں تھا۔ کئی بار اقبال جرم کرانے کے لیے تھانوں میں اسی طرح الٹا لٹکایا جا چکا تھا۔ اس کا سابقہ ایک ایسے بکٹ تھانے دار سے بھی پڑ چکا تھا جو ملزموں کو الٹا لٹکا کر طرح طرح سے اذیتیں پہنچانے کے باعث رسا شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ لہٰذا اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اگر اس نے ہنگامہ برپا کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو اس کے زخمی جسم کو چھتر مار مار کر مزید زخمی کر دیا جائے گا۔ وہ الٹا لٹکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ پتھیروں نے کام ختم کر دیا۔ جھونپڑیوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ چولہوں میں آگ سلگنے لگی۔ تازہ روٹیوں کی خوشبو فضا میں رچ گئی۔ لالی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹیوں کی خوشبو سے بھوک کی شدت اور بڑھ گئی۔ مگر اس نے بھوک پر تو قابو پا لیا' البتہ پیشاب پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ ایک کارندہ اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ لالی نے گڑگڑا کر اس سے فریاد کی۔ اپنی تکلیف بیان کی' منت سماجت کی۔

لیکن وہ ذرا متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "تو چاہتا ہے میں تجھے نیچے اتار دوں۔ جانتا ہے کیا ہو گا؟ جمعدار مجھے بھی تیری طرح الٹا لٹکا کر چھتر سے مار لگائے گا۔ پیشاب کرنا ہے تو کر لے۔ کس نے منع کیا ہے؟ میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

لالی خاموش ہو گیا۔ بے چین ہو کر جسم کو ادھر ادھر گردش دینے لگا۔ مگر وہ دیر تک یہ تکلیف اور اذیت برداشت نہ کر سکا۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب اس کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ پیشاب نکلا اور اس کے قطرے اس کے جسم پر پھیلنے لگے۔ اور پھیلتے پھیلتے اس کے چہرے تک پہنچ گئے۔ اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ مگر پیشاب کی قطرے نتھنے کے راستے ناک کے اندر جانے لگے۔ اس نے سانس روک لی۔ کسی نہ کسی طرح ایک ہاتھ اٹھا کر منہ اور ناک پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اس کا برہنہ پیٹ' سینہ' گردن' چہرہ اور سر کے بال پیشاب سے تر بتر ہو گئے۔

پیشاب کرنے کے بعد اسے سکون تو ملا لیکن اس کی تیز بو اور گندگی کے احساس سے جی متلانے

لگا۔ وہ بار بار ابکائی لیتا اور ہر بار آلائش اس کے منہ سے خارج ہوتی۔ اس نے گردن ہلا ہلا کر چہرہ ادھر ادھر کیا۔ بے بسی سے سامنے بیٹھے ہوئے کارندے کو دیکھا۔ مگر وہ لاتعلق بیٹھا نہایت بے نیازی سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ رات ہو گئی۔ بھٹے پر سناٹا چھا گیا۔ پہریداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا۔ گہری خاموشی میں ان کے قدموں کی آہٹیں اور وقفے وقفے سے کھنکارنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ لالی درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ رات آدھی ہو گئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ صبح ہو گئی۔ پتھیرے جھونپڑیوں سے نکل نکل کر اپنے تھلّوں پر پہنچنے لگے۔ گارا تیار کر کے اینٹیں بنانے لگے۔

بھٹے پر ہر طرف چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ پتھیرے اینٹیں تیار کر رہے تھے۔ کمہار سوکھی ہوئی اینٹیں ریڑیوں اور ٹھیلوں میں بھر بھر کر چمنی کے نیچے پہنچا رہے تھے۔ بھرائی کرنے والے مزدور کچی اینٹیں توے پر جما رہے تھے۔ آگ سلگائی جا چکی تھی۔ تیز آنچ سے کچی اینٹیں تپ کر پختہ ہو رہی تھیں۔ چمنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

لالی ہنوز الٹا لٹکا ہوا تھا۔ پتھیرے اور دوسرے مزدور سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے اور خوف زدہ ہو کر زیادہ تن دہی سے اپنے کام میں جٹ جاتے۔ دوپہر ہو گئی۔ سورج مغربی افق کی سمت کھسکنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ اس عرصے میں کئی بار لالی کی قوت مزاحمت جواب دے گئی۔ اس پر غشی طاری ہو جاتی۔ آنکھیں بند ہو جاتیں۔ منہ سے رال بہنے لگتی۔ جب اس کی حالت بہت غیر ہو جاتی تو جمعدار زماں کو اطلاع دی جاتی۔ وہ آتا۔ لالی کی دگرگوں حالت کا اندازہ لگاتا۔ اسے نیچے اتارتا۔ پینے کو پانی دیتا۔ مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔ صرف ایک بار لسی پلائی۔ لالی کچھ دیر بے سدھ پڑا رہتا۔ مگر جب حالت کچھ سنبھل جاتی تو جمعدار پھر اسے درخت سے الٹا لٹکا دیتا۔

غروب آفتاب سے کچھ پہلے ملک نثار محمد بھٹے میں داخل ہوا۔ لالی کے قریب سے گزرا۔ حقارت سے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور گردن اٹھائے بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے کارندے بھی بے نیازی سے گزر گئے۔ کسی نے اس کی جانب توجہ دینے کی مطلق زحمت گوارہ نہ کی۔ ہر شخص خاموش تھا اور اپنے رویے سے لاتعلقی کا اظہار کرتا تھا۔

جھٹ پٹا ہوتے ہی جمعدار زماں خان اس کے قریب آیا۔ کچھ دیر قہر آلود نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر لالی کے منہ پر تابڑ توڑ کئی تھپڑ مارے۔ زماں خان کا جسم بھاری بھرکم اور مضبوط تھا۔ ہاتھ ایسے کرارے پڑے کہ لالی کا ایک ہونٹ پھٹ گیا۔ اس سے خون رس رس کر

بہنے لگا اور رخسار سے بہتا ہوا پیشانی تک پھیل گیا۔ لالی چپ چاپ الٹا لٹکا رہا۔ نہ اس نے دہائی دی نہ احتجاج کیا۔

جمعدار کے حکم پر کارندوں نے لالی کو درخت سے نیچے اتارا۔ دونوں پیروں کو رسی سے آزاد کیا۔ مگر ہاتھ بدستور زنجیر سے جکڑے رہے۔ لالی تھکن اور نقاہت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ جمعدار نے اشارہ کیا۔ ایک کارندے نے مٹی کے پیالے میں پینے کو پانی دیا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا۔ مگر وہ فرش پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے پہننے کے لیے کپڑے دیے گئے۔ مگر وہ ان کو پہن نہ سکتا تھا۔ اس دفع اس کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کپڑے پہنے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شام دھیرے دھیرے بھٹے کے در و دیوار پر اتر رہی تھی۔ سرمئی دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ جھونپڑیوں کے آگے چولہوں پر کھانا پک رہا تھا۔ اس کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ لالی کی بھوک شدت سے بیدار ہوئی۔ مگر اسے کچھ کھانے کو نہ دیا گیا۔ جھونپڑی میں پہنچایا گیا اور چارپائی پر ڈال کر ہاتھوں کو ایک بار پھر زنجیر سے جکڑ کر تالا ڈال دیا گیا۔ پیروں کے گرد رسی لپیٹ کر چارپائی کی پٹیوں سے باندھ دیا گیا۔

پہلے اس کا ایک ہاتھ زنجیر سے جکڑا جاتا تھا۔ مگر اس دفعہ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جکڑ دئے گئے۔ اسی طرح پہلے رسی اس طور پیروں سے باندھی جاتی تھی کہ وہ کروٹ بدل سکتا تھا۔ اب وہ اپنے پیروں کو ہلا نہ سکتا تھا۔ صرف چت لیٹا رہ سکتا تھا یا اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ زنجیر اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کے حلقے گوشت کے اندر پیوست ہو گئے تھے۔ کلائیوں میں درد سے ٹیس اٹھ رہی تھی۔

ایک پہریدار اس کی جھونپڑی کے آگے گشت لگاتا رہا۔ وقفے وقفے سے اس کے جوتوں کی آہٹ ابھرتی۔ جھونپڑی کے عین سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹکتا۔ ایک نظر جھونپڑی کے اندر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ لالی رات بھر بھوکا رہا۔ دن میں بھی اسے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔

☆

شام ہونے سے کچھ دیر قبل بادل گھر کر آئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اندھیرا بڑھا۔ شام ہو گئی۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ بارش بھی تیز ہو گئی۔ بارش کے چھینٹے ہوا کے ساتھ جھونپڑی کے اندر پہنچنے لگے۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ تیز بارش سے بھٹے میں ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ ہر سو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر زور سے گرجتے تھے۔ تیز بارش کے باعث پہریداروں نے گشت لگانا ختم کر دیا تھا۔ البتہ بھٹے کے مشرقی گوشے سے ان کے بار بار کھنکارنے اور بولنے کی آوازیں خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔ لالی خاموش لیٹا تھا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بے چین ہو کر بار بار پہلو بدلنے کی کوشش کرتا۔ مگر دونوں پیر رسی سے اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ وہ کسی طور کروٹ نہ لے سکتا تھا۔

بے چینی جب زیادہ بڑھی تو لالی بے قرار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے جھونپڑی کے باہر نظر دوڑائی۔ بارش کے قطروں کی جھالر کے سوا اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ دیر وہ گم صم بیٹھا رہا' پھر آگے جھکا۔ ہاتھ کو بڑھا کر پیروں تک لے گیا۔ انگلیوں سے پیروں میں بندھی ہوئی رسی ٹٹولی۔ رسی سوت کی بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ کی انگلی سے زیادہ موٹی نہ تھی۔ لالی نے ہاتھوں کو ادھر ادھر گھمایا۔ رسی کی گرہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بار بار کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا ہاتھ رسی کی گرہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ گرہ چارپائی کے ایک پائے کے نچلے حصے کے گرد رسی لپیٹ کر لگائی گئی تھی۔

لالی نے دونوں پیروں کو زور زور سے اس طرح ہلایا کہ گرہ ڈھیلی پڑ کر کھل جائے۔ اس کے پیر تکلیف سے دکھنے لگے مگر رسی کی گرہ نہ کھلی۔ لالی نے دل برداشتہ ہو کر گہری سانس بھری اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ مگر اسے قرار نہ آیا۔ ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھا۔ ہاتھ کو بڑھا کر رسی کے قریب لے گیا۔ اس نے رسی کاٹنے کی غرض سے ناخن کے دھار دار کنارے سے آہستہ آہستہ رگڑی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت تیز اور تیز ہوتی گئی۔ لیکن رسی نہ کٹی۔ لالی کے ہاتھ شل ہو گئے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا اور زیادہ دیر بیٹھ نہ سکا۔ تھکا ہوا سا چارپائی پر پھر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ بھوک اور نقاہت سے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ ذہنی کوفت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بارش کے قطروں کی آواز مسلسل ابھر رہی تھی۔ آخر پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جھونپڑی میں گہرا اندھیرا تھا۔ یکایک خاموشی میں آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سایہ لہرایا اور رفتہ رفتہ قریب آ گیا۔

بارش ابھی رکی نہ تھی۔ مگر اس کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ رات کے گہرے سکوت میں بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں جل ترنگ کی مانند بج رہی تھیں۔ ہوا بدستور تیز تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی کچھ دیر دم بخود پڑا رہا' پھر گھبرا کر اٹھا۔ سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ ''کون ہے؟'' وہ حیرت

سے سائے کی جانب آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

"دھیرے بول۔" اندھیرے میں آواز ابھری۔

لالی نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ارشاد الٰہی تھا اور لالی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ لالی نے غصے اور نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔ "تو یہاں کیوں آیا؟" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "کتل کرنے آیا ہے؟"

ارشاد الٰہی نے اس کی خفگی پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہاتھ میں دبی روٹی کا نوالہ توڑ کر لالی کے منہ کے قریب لے گیا۔ نرم لہجے میں بولا۔

"لے اسے کھالے۔"

"میں نے کچھ نہیں کھانا۔" لالی نے روٹھے ہوئے بچے کی مانند گردن جھٹک کر انکار کیا۔ "تو یہاں سے چلا جا۔ میں نے تیری روٹی شوٹی نہیں کھانی۔"

ارشاد الٰہی نے اس دفعہ بھی مطلق برا نہ مانا۔ نوالہ لالی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ مسکرا کر بولا۔ "پہلے روٹی کھالے۔ بعد میں ناراض ہونا۔ مجھے پتہ ہے' تو نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔"

لالی کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے روٹی کا لقمہ چبانے لگا۔ ارشاد الٰہی نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔ روٹی کے لقمے بنا بنا کر لالی کو کھلاتا رہا۔ لالی بھوک سے بے قرار تھا۔ چند لمحے تو اس نے تکلف برتا' پھر ہبڑ ہبڑ روٹی کے لقمے کھانے لگا۔ ارشد الٰہی سہما ہوا تھا۔ بار بار مڑ کر جھونپڑی سے باہر نظر دوڑاتا۔

لالی روٹی کھا چکا تو ارشاد الٰہی نے جھونپڑی میں رکھے ہوئے گھڑے سے المونیم کے گلاس میں پانی انڈیلا۔ واپس لالی کے پاس گیا۔ گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ لالی نے پانی پی کر آہستہ سے ڈکار لی۔ پیٹ میں غذا پہنچی تو نقاہت کم ہوئی۔ جان میں جان آئی۔ حواس بجا ہوئے۔ اس نے ارشاد الٰہی سے پوچھا۔ "پہلے تو نے میرے خلاف ملک نثار سے مخبری کی۔ سزا دلوائی۔ اب روٹی لے کر آیا۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟" وہ ابھی تک ارشاد الٰہی کے بدلے ہوئے رویے پر حیران و پریشان تھا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا' تیرے ساتھ اتنا ظلم ہو گا۔" اس نے نرم لہجے میں اظہار پشیمانی کیا۔ "غلطی ہو گئی۔ معافی دے دے۔"

"پر تو مجھے کب تک اس طرح چوری چوری روٹی کھلاتا رہے گا؟" لالی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "جمعدار کو پتہ چل گیا تو تجھے بھی میری طرح سخت سزا دے گا۔ تجھے پتہ ہے' وہ کتنا ظالم ہے۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔ پر تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔" ارشاد الٰہی نے تنبیہہ کی۔

لالی خاموش ہو گیا۔ ارشاد نے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ لالی نے کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں دیکھا تو سخت سراسیمہ ہوا۔ گھبرا کر بولا۔ "تو کیا کرنا چاہتا ہے؟" اس نے پریشانی کے عالم میں زنجیر سے جکڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیے۔

مگر ارشاد الٰہی نے مڑکر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ نہ زبان سے کچھ کہا۔ آگے بڑھا اور لالی کے پیروں میں بندھی ہوئی رسی جلدی جلدی چاقو سے کاٹنے لگا۔ اس کے رویے سے صاف عیاں تھا کہ وہ خود کو خطرے میں ڈال کر پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لالی کو قید سے رہائی دلانے کی غرض سے آیا ہے۔

رسی کٹ گئی۔ لالی کے دونوں پیر آزاد ہو گئے۔ اس نے پیروں کو آہستہ آہستہ ہلا کر اطمینان کیا۔ اب وہ چارپائی سے نیچے اتر سکتا تھا۔ چل پھر سکتا تھا۔ جھونپڑی سے نکل کر باہر جا سکتا تھا۔

ارشاد الٰہی نے چاقو بند کیا۔ دھوتی کے ڈب میں حفاظت سے رکھا۔ سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "بھٹے کی پہریداری پر آج رات صرف دو راکھے ہیں۔ دونوں ہی نشے میں مست پڑے ہیں۔"

"تجھے ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" لالی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ادھر آنے سے پہلے میں ان کی جھگی میں گیا تھا۔ دونوں ایسے بے سدھ پڑے ہیں کہ ان کو میرے آنے کا ذرا بھی پتہ نہ چلا۔" اس نے جھک کر باہر دیکھا۔ "بارش ابھی رکی نہیں۔ ایسے میں تو آرام سے فرار ہو سکتا ہے۔"

"تو میرے ساتھ نہیں چلے گا؟" لالی نے اسے ایک بار پھر اپنے ہم راہ فرار ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں!" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مجھے تیرے ساتھ نہیں جانا۔" ارشاد الٰہی نے مڑکر لالی کی جانب دیکھا۔ "تو میری فکر نہ کر۔ فٹافٹ یہاں سے نکل جا۔" اس کی آواز خوف سے تھرتھرا رہی تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تیرا اب ادھر ٹھہرنا ہم دونوں ہی کے لیے بہت خطرناک ہو گا۔"

"تھوڑی دور بھی میرے ساتھ نہیں چلے گا؟"

"نہیں۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ "میں تو اب چھپتا لکتا اپنی جھگی میں جاؤں گا۔ میں نے تو اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکنا۔"

لالی کچھ کہہ نہ سکا۔ خاموشی سے ارشاد الٰہی کو دیکھتا رہا۔

ارشاد الٰہی نے گردن جھکا کر باہر چوکنا نظروں سے دیکھا۔ باہر رم جھم رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ بھیگی ہوئی ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔

ارشاد الٰہی نے پلٹ کر لالی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا گہری تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

☆

لالی چارپائی سے نیچے اترا۔ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ ان میں رہ رہ کر اینٹھن ہو رہی تھی۔ نقاہت بھی بہت تھی۔ کچھ دیر تک وہ اندھیرے میں گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے ہمت سے کام لیا۔ قدم اٹھایا۔ ڈگمگایا' سنبھلا۔ دوسرا قدم اٹھایا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کے پیر پتھر کے بن گئے ہیں۔ بھاری اور بے جان۔ وہ جھونپڑی کے دوسرے سرے تک گیا۔ واپس آیا۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ جھونپڑی کے اندر ٹہلنے لگا تاکہ ٹانگوں میں توانائی اور اعتدال پیدا ہو جائے۔ وہ رک رک کر قدم اٹھاتا۔ بار بار پیروں کو جھٹکتا۔ رسی کٹ جانے کے بعد اس کی ٹانگیں آزاد ہو گئی تھیں لیکن دونوں ہاتھ لوہے کی مضبوط زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو ہلایا۔ ادھر ادھر گھمانے پھرانے کی کوشش کی۔ مگر زنجیر کی کڑیاں گوشت میں اس طرح پیوست ہو گئی تھیں کہ ہلانے سے کلائیوں میں ٹیس اٹھتی تھی۔

اس کے لیے اب جھونپڑی میں مزید ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ باہر نکلنا خطرناک تھا تو جھونپڑی میں رکنا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ نہ صرف اس کے لیے بلکہ ارشاد الٰہی کے لیے بھی جو ہر طرح کا خطرہ مول لے کر چھپتا چھپاتا اس کے پاس آیا تھا۔ کھانا لایا تھا اور کھلایا بھی تھا۔ پیروں میں بندھی ہوئی رسی چاقو سے کاٹی تھی۔ چلنے پھرنے کے قابل بنایا تھا اور فرار ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ اس موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے گردن بڑھا کر چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ بارش کی ننھی منی بوندیں مسلسل آسمان سے گر رہی تھیں۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اس کی جھونپڑی' بھٹے کے ایک گوشے میں الگ تھلگ تھی۔ سامنے نیم دائرے میں پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ان کے آگے گہرا اور وسیع گڑھا تھا جس کی مٹی نکال کر اینٹیں بنائی جا چکی تھیں۔

دائیں طرف لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر بھٹے کا دفتر تھا۔ اس کے قریب دو جھونپڑیاں تھیں۔

ایک جھونپڑی کے باہر لالٹین کی ہلکی ہلکی زرد روشنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ جھونپڑی کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ دونوں پہریدار اسی جھونپڑی میں موجود ہیں۔ جھونپڑی پر گہری خاموشی طاری تھی۔ ارشاد الٰہی کی اطلاع کے مطابق دونوں ہی پہریدار نشے میں دھت تھے اور بے سدھ پڑے تھے۔

لالی اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ بھیگی ہوئی ہوا کا سرد تھپیڑا منہ پر لگا۔ قدم لڑکھڑائے۔ جسم سردی سے کپکپایا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ خوف زدہ نظروں سے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ بارش کی بوندوں سے ہلکا ہلکا جل ترنگ بجتا تھا۔ جگہ جگہ پانی سے بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ کیچڑ تھی۔ وہ پانی اور کیچڑ سے بچتا بچاتا، سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ اچانک پیر رپٹا۔ قدم ڈگمگائے، گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ گرنے سے خاموشی میں آہٹ پیدا ہوئی۔ عین اس وقت کوئی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔

اس نے بدحواس ہو کر دفتر کی جانب دیکھا۔ مگر وہاں سکوت طاری تھا۔ کھانسی دفتر کے عقب سے ابھر رہی تھی۔ لالی دم سادھے پڑا رہا اور اس سمت دیکھتا رہا جدھر سے کھانسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔ مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ صرف چمنی اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش کے باعث بھٹی سرد پڑی تھی۔ نہ وہاں آگ روشن کی گئی نہ چمنی کے نیچے دہکتے ہوئے توے پر کچی اینٹیں رکھ کر پکائی گئیں۔

لالی کے دونوں ہاتھ زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے لیے اٹھنا اور اٹھ کر کھڑا ہونا آسان نہ تھا۔ خطرہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔ کھانسی وقفے وقفے سے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔ وہ پانی اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کچھ دیر زمین پر پڑا رہا اور بارش میں بھیگتا رہا۔ اس کا جسم بار بار سردی سے تھرتھراتا، لیکن وہ اس طرح زیادہ دیر پڑا نہ رہ سکتا تھا۔ اسے جلد سے جلد بھٹے کی حدود سے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کروٹ بدلی۔ جھکا، کہنیوں کے بل اٹھا اور ٹانگوں پر پورا زور دے کر کھڑا ہوا تو گرتے گرتے بچا۔

وہ چند لمحے اندھیرے میں کھڑا رہا اور بارش میں بھیگتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے قدم اٹھایا۔ آگے بڑھا۔ بار بار ٹھٹکتا، مڑ کر عقب میں دیکھتا وہ ڈرا سہما آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ بھٹے کی حدود سے باہر نکلا اور پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور بارش کے قطروں سے بے نیاز آگے بڑھتا گیا۔ اس کے کپڑے پانی اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ ایک کہنی فرش سے اٹھنے کی کوشش میں چھل گئی تھی۔ اس میں

مسلسل سوزش ہو رہی تھی۔ لیکن نہ وہ اسے چھو سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا۔ نہ یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ زخم کہاں ہے اور کیسا ہے۔ خوف بھی دامن گیر تھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتا۔ مگر دور تک نہ کوئی آواز تھی نہ آہٹ۔ صرف ہوا کہ سر سراہٹ تھی اور بادلوں سے گرتی ہوئی بوندوں کا ہلکا ہلکا جل ترنگ تھا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکا۔ جسم تھکن اور سردی سے شل ہو گیا تھا۔ قدم آگے نہ بڑھتے۔ آخر وہ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر ٹھہر گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی۔ درخت کے پتوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ ایک موٹی شاخ کی آڑ میں سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ وہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر اب یہ مسئلہ سامنے تھا کہ کہاں جائے اور کس کے پاس جائے؟ وقت کم تھا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اسے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ درخت کے نیچے سہما ہوا کھڑا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

مشرقی افق پر بادلوں کے پیچھے ہلکا ہلکا اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ بارش ہلکی ہوتے ہوتے رک گئی۔ مگر ہوا تیز تھی۔ اس میں خنکی بھی تھی۔ لالی کا لباس ابھی تک بھیگا ہوا تھا۔ جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ صبح کی آمد کے ساتھ خطرہ بڑھ گیا تھا۔ وہ درخت کے نیچے سے نکلا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ فیروز پور روڈ ہے اور وہ اس وقت چونگی امرسدھو کے گرد و نواح میں ہے۔ سڑک ہنوز سنسان تھی۔ دور دور تک نہ کوئی راہ گیر تھا نہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ لالی نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

اب آبادی کے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ دور تک اونچے نیچے مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک پختہ عمارت پر پولیس اسٹیشن کا بورڈ دھندلی روشنی میں دور سے نظر آیا۔ لالی اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ خوف زدہ بھی ہوا۔ مسلسل چلتے چلتے اس کے پیر شل ہو گئے تھے۔ دونوں ہاتھ زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ مزید آگے جانے کی اس میں سکت نہ رہی تھی اور خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ کہیں اور جانے کے بجائے وہ سیدھا تھانے میں پہنچا۔ اس وقت تھانہ ہی اسے محفوظ مقام معلوم ہوا۔

☆

تھانے پر خاموشی چھائی تھی۔ لالی ہیڈ محرر کے پاس گیا اور اس کے روبرو گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ محرر رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نیند کی غنودگی تھی۔ وہ مضمحل اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے چونک کر لالی کو دیکھا۔ اس کے بال بھیگ کر پیشانی اور کنپٹیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لباس پر جگہ جگہ مٹی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ پیر کیچڑ سے لت پت تھے اور ہاتھ زنجیر سے

بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔

وہ لالی کو چند لمحے تک حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا' پھر ٹوہ لگانے کے انداز میں دریافت کیا۔

"کون ہے تو؟"

لالی نے مسکین سی صورت بنا کر آہستہ سے بتایا۔ "میرا نام لال دین ہے جی۔ پتھیرا ہوں۔ ملک نثار محمد کے بھٹے پر کام کرتا ہوں۔"

"تیرے ہاتھوں میں یہ زنجیر کیوں پڑی ہے؟" ہیڈ محرر بدستور حیرت زدہ تھا۔

لالی نے رقت انگیز لہجے میں بتایا کہ بھٹے کے مالک ملک نثار محمد نے اپنے جمعدار اور کارندوں کے ذریعے اس پر کس قدر ظلم و ستم ڈھایا۔ کیسی کیسی ایذا پہنچائی۔ کس طرح قیدی بنا کر رکھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

ہیڈ محرر ادھیڑ تھا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ چہرے پر عام پولیس والوں کی سی سختی اور خشونت نہ تھی۔ عیال دار تھا اور درد مند دل بھی رکھتا تھا۔ پچھلے ہی دنوں اس کا بڑا بیٹا' بھری جوانی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ لالی کی الم ناک روداد سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ فکر نہ کر۔ ملزمان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔" اس نے روزنامچہ کھسکا کر سامنے کیا۔ قلم اٹھا کر ابتدائی رپورٹ درج کرنا چاہی مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا۔

"حوالدار جی!" لالی نے تعجب سے ہیڈ محرر کو مخاطب کیا۔ "تو نے میری رپٹ نہیں لکھنی؟"

"نہیں!" ہیڈ محرر نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے نرم لہجے میں وضاحت کی۔ "کیس کی نوعیت خاصی سنگین ہے۔ ایس ایچ او صاحب کے سامنے تیری پیشی ہونی ضروری ہے۔ وہی تیرا بیان لیں گے اور ضروری کارروائی کا حکم جاری کریں گے۔ وہ صبح نو بجے تک تھانے میں آئیں گے۔ ویسے میری ڈیوٹی بھی اب ختم ہونے والی ہے۔" اس نے لالی کو اطمینان دلایا۔ "پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

لالی اس کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔ اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

ہیڈ محرر نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ لالی کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اسے اپنے ساتھ لے جا۔ سویرے ایس ایچ او صاحب کے سامنے پیش کرنا ہو گا۔"

کانسٹیبل نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھا اور لالی کو حوالات کے سامنے

ایک گوشے میں بٹھا دیا۔ نہ لالی نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے لالی سے کچھ پوچھا۔ کانسٹیبل چلا گیا۔ لالی سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔

صبح ہو گئی۔ دن چڑھے تھانیدار اپنے دفتر میں پہنچا۔ لالی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے گڑگڑا کر اسے بھی اپنی اذیت ناک روداد سنائی۔ ہاتھ جوڑ کر دادرسی چاہی۔ تھانیدار کچھ ہی عرصہ قبل تھانے میں تعینات ہوا تھا۔ سرگرم اور مستعد افسر تھا۔ ہوشیار اور دبنگ تھا۔ اپنی کارکردگی سے علاقے پر دھاک بٹھانے کے ساتھ ساتھ افسران بالا کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تھانیدار نے لالی کا بیان توجہ سے سنا۔ الزامات کی نوعیت پوری طرح سمجھنے کے لیے مختلف سوالات بھی کیے۔

لالی کے لیے یہ پہلا موقع نہ تھا۔ وہ کئی بار تھانیداروں اور دوسرے پولیس افسروں کے روبرو پیش ہو چکا تھا۔ ان کے مزاج اور افتاد طبع کو بخوبی سمجھتا تھا۔ بات کرنے کا ڈھب جانتا تھا۔ اس نے ہر سوال کا سوچ سمجھ کر اور سنبھل سنبھل کر جواب دیا۔ تھانیدار کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

تھانیدار کے بشرے سے رعب و دبدبہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ کرید کر پوچھا۔ "تو بھٹے سے فرار ہو کر یہاں پہنچا کیسے؟"

لالی اس سوال کے لیے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار تھا۔ مگر وہ تھانیدار کو صاف بات بتانا نہ چاہتا تھا۔ خدشہ تھا کہ اگر اس نے ارشاد الٰہی کا نام بتایا تو بھٹہ مالک نثار محمد اسے بھی اپنے جبر و تشدد کا نشانہ بنائے گا۔ طرح طرح سے پریشان و ہراساں کرے گا۔ اس نے سرے سے ارشاد الٰہی کا ذکر ہی نہ کیا۔ کہنے لگا۔ "وہ جی ایسا ہوا کہ میرے پیر جس رسی سے جکڑ کر باندھے گئے تھے اس کی گرہ میں نے کسی نہ کسی طرح کھول لی۔ منجی سے نیچے اترا۔ باہر نکلا۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔"

"تیری نگرانی پر کل رات کوئی پہریدار نہیں لگایا گیا تھا؟"

"ایک نہیں جی دو راکھے نگرانی پر تھے۔ پر دونوں ہی نشہ کر کے مست پڑے تھے۔ ان کو بالکل ہوش نہیں تھا۔" لالی نے تھانیدار کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "بارش بھی ہو رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ میں چھپتا لکتا بھٹے سے نکل کر سڑک پر پہنچا اور بارش میں بھیگتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔"

تھانیدار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے عاجزی سے کہا۔ "میرے ساتھ بہت ظلم ہوا جی۔ بھاگ کر ادھر نہ آتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتے۔ میرے ساتھ انصاف کیا جائے۔ میں اسی لیے یہاں آیا

ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "دوبارہ ہٹ مالک کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ اور اس کا جمعدار تو بہت ہی ظالم ہے۔ ذرا ترس نہیں کھاتا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جمعدار کا جبر و تشدد یاد کر کے اس کا دل بھر آیا۔ آنسو پلکوں سے ٹپکنے لگے۔

تھانیدار نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ نہ تسلی دی نہ دل جوئی کی۔ چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ اسے حکم دیا کہ بھٹے پر جائے اور ملک نثار محمد کو اپنے ہم راہ لے کر آئے۔ کانسٹیبل نے جوتے کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے سلام کیا۔ مڑا' کمرے سے باہر نکلا اور بھٹے کی جانب روانہ ہو گیا۔

لالی کو ایک بار پھر حوالات کے سامنے بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ اسے چائے بھی پلائی گئی۔ مگر اس کے دونوں ہاتھ لوہے کی زنجیر سے ہنوز جکڑے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی اس کی رپورٹ درج کی گئی تھی۔ وہ گومگو کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ ملک نثار محمد کے پہنچنے کے بعد ضابطے کی کیا کارروائی ہو گی۔

لگ بھگ گھنٹہ بھر بعد کانسٹیبل واپس آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ملک نثار محمد نہیں تھا۔ بھٹے کا جمعدار' زماں خان تھا۔ اس کے پہنچتے ہی تھانیدار نے لالی کو بھی اپنے دفتر میں طلب کیا۔ لالی فوراً تھانیدار کے سامنے پہنچا اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

جمعدار زماں خان وہاں موجود تھا۔ اس نے کرسی کھسکائی اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر نہ کسی قسم کی پریشانی تھی نہ گھبراہٹ۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ مسکرا کر تھانیدار کے سامنے پیش کیا۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ جمعدار نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی' سلگائی اور بے نیازی سے کش لگانے لگا۔

تھانیدار کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جمعدار کا رویّہ اسے شاق گزرا ہے۔ مگر اس نے کسی برہمی کا اظہار نہ کیا۔ لالی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جمعدار سے دریافت کیا۔

"اسے جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں جانتا جی' اپنے بھٹے کا پتھیرا ہے۔" جمعدار نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ "رات کو چپکے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ جی ایک نمبری بدمعاش ہے۔ پہلے بھی ایسی کوشش کر چکا ہے۔ پر میں نے اسے پکڑ لیا۔ بھاگنے نہ دیا۔" وہ تھانیدار کی جانب متوجہ ہوا۔ "سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ لیں۔"

مگر تھانیدار نے لالی سے کچھ نہ پوچھا۔ جمعدار سے سوال کیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا؟

ضرب شدید پہنچائی گئی۔ ننگا کر کے درخت سے الٹا لٹکایا گیا۔ تین روز تک کچھ کھانے کو نہ دیا گیا۔"

"یہ بالکل بکواس کرتا ہے جی۔ نہ اسے مارا پیٹا گیا نہ الٹا کر کے لٹکایا گیا۔" جمعدار نے نہایت ڈھٹائی سے تردید کی۔ "یہ جی بہت جھوٹا ہے۔ اس نے سب غلط بتایا۔"

"کیا یہ بھی غلط ہے کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو باندھ کر حبس بے جا میں رکھا گیا؟" تھانیدار نے اس دفعہ اونچی آواز سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ "اس کے زنجیر سے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہے ہو۔"

"ایسا تو جی کرنا ہی پڑتا ہے۔" جمعدار انکار نہ کر سکا۔ اس نے لالی کو حقارت سے دیکھا۔ "آپ کو پتہ نہیں جی۔ یہ حرام دا کتنا کمینہ اور بدمعاش ہے۔ یہ ان دھوکے باز ہتھیروں میں سے ہے جو ہزاروں روپے منت اور خوشامد کر کے پیشگی لے لیتے ہیں اور چپکے سے کسی روز فرار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسی کارروائی نہ کی جائے تو کیسے کام چلے۔ پیشگی وصول کرنے کے لیے تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

لالی نے مداخلت کی۔ "پیشگی کا معاملہ تو یہ ہے جی، جتنی ادا کرو اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ تو جی کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

تھانیدار نے لالی کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے جمعدار سے کہا۔ "تو گویا تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اسے مارا پیٹا گیا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "زنجیر سے جکڑ کر حبس بے جا میں رکھا گیا۔"

جمعدار نے اس دفعہ صاف گوئی سے کام لیا۔ نہایت بے باکی سے بتایا۔ "میں نے بتایا نا جی' ایسا نہ کریں تو کیسے کام چلے۔ ان کی تو اس طرح چابی کسنی ہی پڑتی ہے۔" وہ دانت نکال کر بھونڈے پن سے ہنسنے لگا۔

تھانیدار کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا وہ زور سے دھاڑا۔ "ٹھیک سے بات کر۔" وہ بپھر کر اٹھا۔ آگے بڑھا اور جمعدار کے منہ پر تڑ سے تھپڑ رسید کیا۔

ہاتھ ایسا کرارا پڑا کہ کرسی ڈگمگائی۔ جمعدار نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تھانیدار نے زناٹے کا ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ جمعدار لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ تھانیدار اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمعدار اٹھا۔ سراسیمہ ہو کر وحشت زدہ نظروں سے تھانیدار کی جانب دیکھا۔ ایسا گھبرایا کہ زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

جمعدار کرسی کی جانب بڑھا۔ تھانیدار نے ٹوکا۔ ڈپٹ کر حکم دیا۔ "کھڑا رہ۔" اس نے غضب

ناک ہو کر کئی گالیاں دیں۔ تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "بھٹے کا مالک کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"وہ تو جی دفتر میں بیٹھا ہے۔" جمعدار نے مسکین سی صورت بنا کر مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اسی نے مجھے ادھر بھیجا تھا۔"

تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو طلب کیا۔ جمعدار کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اسے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔"

جمعدار سہمی ہوئی نظروں سے تھانیدار کے جھنجلائے ہوئے چہرے کو تکنے لگا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ ہکا بکا کھڑا رہا۔ تھانیدار مڑ کر لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو نے بالکل ٹھیک بتایا۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ "دوسرے پتھیروں پر بھی اسی طرح جبر و تشدد ہوتا ہوگا۔"

"بہت ہوتا ہے جی۔ چھتر سے سڑاک سڑاک مارا جاتا ہے۔ ننگا کر کے سارے بھٹے پر گھمایا جاتا ہے۔ درخت سے باندھ کر الٹا لٹکایا جاتا ہے۔" لالی رقت انگیز لہجے میں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "بھٹی کے گرم گرم توے پر اتنی دیر تک کھڑا رکھا جاتا ہے کہ چیخیں نکل جاتی ہیں۔ پیروں کی کھال جل جاتی ہے۔ نہ کوئی دوا دارو ہوتا ہے نہ بھٹے سے باہر جانے دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے راکھے کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ کیا بتاؤں جی، پتھیروں پر کیسا کیسا ظلم ہوتا ہے۔"

"اطمینان رکھ، اب ظلم نہیں ہوگا۔" تھانیدار نے تسلی دی۔ سامنے کھڑے ہوئے کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ "کھوکھر، اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ہاتھ کھول دے۔ کھانے کو بھی دے۔ پتہ نہیں کب سے اسے روٹی نہیں ملی۔"

کھوکھر جانے کے لیے مڑا تو تھانیدار نے اسے ٹوکا۔ "بات سن۔ بھٹے کے مالک 'نثار محمد' کو یہاں لے کر آ۔ دو کانسٹیبل ساتھ لیتا جا۔ سیدھی طرح آجائے تو ٹھیک ہے۔ گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے یا ہیکڑی دکھائے تو پکڑ کر لے آ۔ حوالات میں بند کر کے اس کی بھی گرمی اتارنی ہے۔ اس کے خلاف جبر و تشدد اور حبس بے جا میں رکھنے کے الزامات ہیں۔ خاصا سنگین کیس ہے۔"

کھوکھر نے نہایت مستعدی سے دونوں پیروں کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے تھانیدار کو سیلوٹ کیا۔ جمعدار زماں خان کا بازو پکڑا اور نہایت تحقیر کے ساتھ دھکے دیتا ہوا باہر لے گیا۔ لالی بھی دونوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ خاموش اور سہما ہوا نظر آرہا تھا۔

باہر نکل کر جمعدار کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ لالی کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی زنجیر کا تالا کسی نہ کسی طرح کھولا گیا۔ ہاتھ آزاد ہوئے تو لالی نے دیکھا کلائیوں میں زنجیر کی کڑیاں پیوست ہونے سے

گڑھے پڑ گئے تھے۔ دونوں ہاتھ ابھی تک دکھ رہے تھے۔ مگر وہ ہاتھوں کی تکلیف سے بے نیاز دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ مڑ مڑ کر حوالات کی جانب دیکھ رہا تھا جس کی سلاخوں کے پیچھے جمعدار زماں خان حیران و پریشان کھڑا تھا۔

لالی نے کھانا کھایا۔ چائے بھی پی۔ اور ہیڈ محرر کے کمرے میں پڑی ہوئی بنچ پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔

☆

دوپہر کو بھٹے کا مالک نثار محمد تھانے میں داخل ہوا۔ لالی نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ہم راہ دو افراد اور بھی تھے۔ ایک تو ملک نثار محمد کا منشی تھا۔ دوسرے کو لالی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا اور معزز نظر آتا تھا۔ چال ڈھال میں تمکنت تھی، طمطراق تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سب سے پہلے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا۔ ملک نثار محمد اور اس کا منشی بھی اندر چلے گئے۔ دونوں سہمے ہوئے اور خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔ تھانیدار اپنے کمرے میں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے کسی واردات کی تفتیش کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

تینوں کو کمرے میں گئے ہوئے دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو اندر بلایا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ باہر نکلا۔ سیدھا حوالات کے دروازے پر پہنچا۔ قفل کھولا۔ جمعدار کو باہر نکالا اور تھانیدار کے کمرے میں پہنچا دیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ تھانیدار کے دفتر میں چائے پہنچائی گئی۔ لالی بے چینی سے مڑ مڑ کر اس طرف دیکھتا رہا۔ کمرے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

نصف گھنٹے بعد ملک نثار محمد کمرے سے باہر نکلا۔ منشی اور دوسرا شخص بھی باہر آیا۔ جمعدار زماں خان بھی ان کے ہم راہ تھا۔ ایس ایچ او انھیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ لالی یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ نہ جمعدار اور نہ ہی ملک نثار محمد حوالات کی جانب آئے۔ ان کے چہروں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور نہایت سکون سے قدم اٹھاتے تھانے کی حدود سے باہر چلے گئے۔

لالی صورت حال کی اس تبدیلی پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل اس کے پاس آیا۔ اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں حوالات کے دروازے پر پہنچے۔ قفل کھولا گیا۔ کانسٹیبل نے حقارت سے دھکا دے کر لالی کو حوالات میں داخل کر دیا۔ دروازہ بند کیا گیا

اور اس میں قفل ڈال دیا گیا۔

لالی بہت چکرایا۔ اس نے احتجاج کیا۔ "یار تو نے مجھے کیوں بند کر دیا۔ میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"یہ ایس ایچ او صاحب سے پوچھ جن کے حکم سے تجھے بند کیا گیا۔" کانسٹیبل نے بے رخی سے جواب دیا۔

"پر میں تو فریاد لے کر یہاں آیا تھا۔" لالی ہنوز حیران و پریشان تھا۔

"بکواس نہ کر۔" کانسٹیبل نے آنکھیں نکال کر ڈانٹا۔ مڑا اور اس کی جانب مزید توجہ دیے بغیر ایک طرف چلا گیا۔

لالی حوالات کے آہنی دروازے کی سلاخیں تھامے حیرت زدہ کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ تبدیلی اچانک کیسے رونما ہوئی۔ عجب ماجرا تھا۔ جمعدار آزاد ہو کر ملک نثار محمد کے ساتھ جا چکا تھا اور لالی حوالات میں بند تھا۔ وہ گم صم کھڑا کانسٹیبلوں کو دیکھ رہا تھا جو تھانے میں ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

دوسرے روز بھی لالی حوالات میں رہا۔ اس روز اتوار تھا۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ اسے کیوں حوالات میں رکھا گیا؟ اس کے خلاف کیا الزام عائد کیا گیا؟ پیر کی صبح اسے حوالات سے باہر نکالا گیا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں۔ علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ مزید تفتیش اور پوچھ گچھ کے لیے پولیس کی درخواست پر عدالت نے ایک ہفتے کا ریمانڈ دے دیا۔ لالی کو ہتھکڑیاں ڈال کر تھانے میں واپس لایا گیا۔ ایک بار پھر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہ سخت آزردہ اور نڈھال تھا۔

مگر نہ لالی سے مزید پوچھ گچھ کی گئی اور نہ ہی تھانیدار کے روبرو پیشی ہوئی۔ حوالات میں کئی اور بھی ملزم بند تھے۔ لیکن کوئی بھی اس کا شناسا نہ نکلا۔ ان کے جو عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والے آتے، ان میں بھی کوئی ایسا نظر نہ آیا جس سے اس کی جان پہچان ہوتی۔ وہ خود کو یک و تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ حیران و پریشان بھی تھا۔ وہ تھانے میں دادرسی کی غرض سے آیا تھا مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بھٹے کے مالک، ملک نثار محمد اور جمعدار زماں خان کے بجائے اسے ملزم قرار دے کر حوالات میں ڈال دیا گیا۔

وہ اسی پریشانی کے عالم میں تھا کہ ایک روز بھٹے کا جمعدار اس کے پاس آیا۔ لالی نے اسے دیکھا تو

نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”اب کیا لینے آیا ہے؟“

جمعدار مسکرا کر نرمی سے گویا ہوا۔ ”تیں نوں اب تو پتہ چل گیا کہ تو ملک نثار کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی بہت اوپر تک جان پہچان ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے یاری ہے۔ اس روز ملک جب تھانیدار سے ملنے آیا تھا تو اپنے ساتھ صوبائی اسمبلی کے ممبر کو لایا تھا۔ تو نے دیکھ لیا۔ اس کے آنے سے میں حوالات سے باہر آگیا اور تو اندر ہو گیا۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”سوچ لے، ابھی کچھ نہیں ہوا۔ پولیس نے تیرے خلاف ابھی نہ مکدمہ بنایا ہے نہ عدالت میں چالان پیش کیا ہے۔“

”تو چاہتا کیا ہے؟“ لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بھٹے پر چل کر کام کر۔ تو نے جو پیشگی ادا کرنی ہے ادا کر۔“ جمعدار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نے ملک کو منت کر کے راضی کر لیا ہے۔ اب وہ تجھے کوئی سزا شزا نہیں دے گا۔ آرام سے پہلے کی طرح کام کرنا۔“ اس نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھ کر سرگوشی کی۔ ”ملک نثار کے کہنے پر تھانیدار معاملہ دبا دے گا۔ تجھے حوالات سے رہائی مل جائے گی۔“

لیکن لالی آمادہ نہ ہوا۔ بے رخی سے بولا۔ ”میں نے اب بھٹے پر نہیں جانا۔ نہ پیشگی ادا کرنی ہے اور نہ ہی پتھیرے کا کام کرنا ہے۔“

”ایسا سوچے گا تو جیل کاٹنی ہو گی۔“

”جیل کیوں کاٹنی ہو گی؟“ لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہ ہوا۔ ”میں نے جرم ہی کیا کیا ہے؟“

جمعدار نے جل کر کہا۔ ”آگے تجھے پتہ چل جائے گا کیا جرم کیا ہے؟“

لالی خاموش رہا۔ جمعدار چلا گیا۔

ریمانڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد لالی کو دوبارہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا گیا۔ پولیس نے عدالت سے ایک ہفتے کا اور ریمانڈ مانگا۔ وہ بھی مل گیا۔ لالی پھر حوالات میں واپس آگیا۔ دوسرے روز بھٹے کا جمعدار، زماں خان پھر اس کے پاس آیا۔ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ ڈرایا دھمکایا بھی۔ لیکن لالی کسی طور بھٹے پر واپس جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ جمعدار اس بار بھی ناکام اور جھنجلایا ہوا گیا۔

لالی کو عدالت میں حاضر کیا گیا۔ اس دفعہ پولیس نے اس کے خلاف چالان بھی پیش کر دیا۔ پولیس نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۸۲ کے تحت سرقہ بالجبر کا مقدمہ قائم کیا تھا۔ مقدمہ کی بنیاد

بھٹے کے منشی کی رپورٹ تھی جس میں لالی کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے چاقو دکھا کر منشی کو دہشت زدہ کیا اور پانچ ہزار سے زائد کی وہ رقم زبردستی چھین کر فرار ہو گیا جو پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کا چٹھا بانٹنے کے لیے اس کی تحویل میں تھی۔ استغاثہ کے مطابق ابتدائی رپورٹ درج کرنے کے بعد پولیس کی ایک جمعیت نے لالی کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے اور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چوری کی رقم بھی برآمد ہو گئی۔ اس کے عینی شاہد بھی تھے۔ چالان میں استغاثہ کے گواہوں کی فہرست بھی درج تھی۔

عدالت نے مقدمے کی آئندہ سماعت تک کے لیے لالی کو جیل بھیج دیا۔

لالی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ خالی جیبیں' خالی ہاتھ۔ لہٰذا وہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے نہ کوئی وکیل کھڑا کر سکا اور نہ ہی ضمانت کے لیے کوئی بھاگ دوڑ کرنے والا تھا۔ وہ بالکل بے یارومددگار تھا۔ مقدمے کی سماعت کا سلسلہ جاری رہا۔ پیشیاں پڑتی رہیں۔ لگ بھگ دس مہینے جیل میں گزر گئے۔ مگر مقدمے کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ لالی' حوالاتی تھا لیکن جیل میں اسے ان قیدیوں کی طرح مشقت کرنا پڑتی جن کو عدالتوں سے مجرم قرار دیا جا چکا تھا۔

لالی نے عدالت کے روبرو اپنی صفائی پیش کی۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ بھٹے کے مالک اور جمعدار نے جو ظلم و ستم ڈھایا تھا' گڑگڑا کر اور رقّت انگیز لہجے میں اس کی ایک ایک تفصیل بیان کی۔ مگر اپنے بیان کی تائید میں نہ وہ کوئی ثبوت پیش کر سکا نہ گواہ۔ دوسری طرف استغاثہ کی جانب سے ایک نہیں کئی گواہ پیش کیے گئے۔ ان میں بھٹے کا منشی تھا' جمعدار تھا اور وہ پتھیرے بھی شامل تھے' جن کو بخوبی علم تھا کہ لالی بے قصور ہے اور بھٹے کے مالک نے انتقامی کارروائی کے طور پر اس کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا ہے جس میں اسے پولیس کے اہل کاروں کی پوری پوری حمایت اور تائید حاصل ہے۔

گواہوں کے علاوہ وکیل سرکار کو اپنے دلائل میں لالی کے داغدار ماضی سے بہت مدد ملی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ عادی مجرم رہ چکا تھا۔ چوری اور ڈکیتی کے کئی مقدمات میں سزا کاٹ چکا تھا۔ جرح کے دوران وہ لالی سے اس کے سابقہ جرائم کا اعتراف کرانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس نے لالی کے خلاف دستاویزی ثبوت بھی پیش کیے۔ غرضیکہ استغاثہ نے بہت مضبوط مقدمہ تیار کیا تھا۔

آخرکار مقدمہ کی سماعت مکمل ہو گئی۔ وہ دن بھی آ گیا جب عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اسے دفعہ ۳۸۲ کے تحت سرقہ بالجبر کے جرم میں ایک سال قید بامشقت اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا

دی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید تین ماہ قید بھگتنے کا حکم دیا گیا۔

لالی نے مقدمے کا فیصلہ نہایت صبر و سکون سے سنا۔ نہ اس نے فریاد کی نہ احتجاج اور نہ ہی ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے بارے میں سوچا۔ اتنے وسائل ہی نہ تھے۔ عدالت نے جو فیصلہ دیا' اس کے لیے وہ ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ مقدمے کا رخ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فیصلہ اس کے خلاف ہی ہو گا۔ پولیس کی حراست میں وہ عدالت سے باہر نکلا اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کی گاڑی میں خاموشی سے سوار ہو گیا۔ گاڑی سینٹرل جیل کی جانب روانہ ہو گئی۔ لالی جیل میں واپس پہنچ گیا۔ اب وہ حوالاتی نہ رہا تھا سزا یافتہ قیدی بن چکا تھا۔

جیل میں کتنے ہی قیدی ایسے تھے جن سے لالی کی شناسائی تھی' یاری دوستی تھی۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جو قید کی مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے۔ لالی نے ان کے ذریعے شاداں کو پیغام بھیجا کہ وہ آئے اور اس سے ملے۔ ایسا ہر پیغام بھیجنے کے بعد وہ ملاقات کے دن کا بے چینی سے انتظار کرتا۔ ملاقات کا دن آتا۔ اس کی نگاہیں ملاقاتیوں کے ہجوم میں شاداں کو تلاش کرتیں۔ مگر ہر بار اس کی نظریں بے قراری سے بھٹکتی رہ گئیں اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شاداں اسے دکھائی نہ دی۔ وہ اس سے ملنے نہ آئی۔

وہ شاداں کی جانب سے مایوس ہو گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شاداں کی یاد کے نقوش دھندلے پڑ گئے۔ لیکن بھولنے کی کوشش کے باوجود وہ اسے بھلا نہ سکا۔ صبح ہوتی شام ہوتی۔ دن ہفتوں میں' اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ ادھر ملک میں بھی نت نئی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ مرکز اور صوبوں میں آئے دن وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی رہیں۔ اسمبلیوں میں سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین پرانے رشتے ختم ہوتے' نئے گٹھ جوڑ ہوتے۔ راتوں رات اکثریت' اقلیت میں اور اقلیت' اکثریت میں بدل جاتی۔ نئے وزیر اعلیٰ اور نئے وزیر اعظم مقرر ہوتے۔

ملک فیروز خاں نون' وزیر اعظم تھے۔ فروری ۱۹۵۹ء میں ہونے والے عام انتخابات کا ہر طرف چرچا تھا۔ لیکن انتخابات سے چار مہینے قبل اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک رات کو ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مارشل لا نافذ کر کے فوج نے اقتدار مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ کتنے ہی سیاسی اور ٹریڈ یونین رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کئی سیاسی نظر بندوں کو سینٹرل جیل میں بھی رکھا گیا جس میں لالی تھا۔

☆

لالی کی رہائی میں کچھ کم دو مہینے باقی تھے۔ اب وہ جیل کی زندگی سے مانوس ہو چکا تھا۔ ایک روز اسے اطلاع ملی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ ملاقات کا دن تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ قیدی ہنستے مسکراتے نظر آرہے تھی۔ لالی نے جا کر دیکھا' ملاقاتیوں کے ہجوم میں' شاداں بھی موجود تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

شاداں اب اتنی بدل چکی تھی کہ پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہ سکا۔ لالی نے جب اسے آخری بار دیکھا تھا تو بھٹے پر چلچلاتی دھوپ اور لو کے گرم گرم تھپیڑوں میں کام کرنے سے اس کا رنگ روپ ماند پڑ گیا تھا۔ چہرہ جھلس کر راکھ ہو گیا تھا۔ بال بھورے پڑ گئے تھی۔ آنکھیں بے رونق اور ویران نظر آتی تھیں۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی کے باعث اس کا مضبوط اور بھرا بھرا صحت مند جسم مرجھا گیا تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی تھی۔ دانت گندے اور پیلے پیلے نظر آتے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سن رسیدہ لگتی تھی۔ اس کے ملگجے اور بوسیدہ لباس سے پسینے کی تیز بو کے بھبکے اٹھتے تھے۔

مگر اب شاداں کا رنگ نکھر گیا تھا۔ چہرے پر شگفتگی اور رعنائی کی چاندنی تھی۔ آنکھیں ایسی روشن اور اجلی تھیں گویا چراغ جھلملا رہے ہوں۔ لباس بھی عمدہ اور بھڑکیلا تھا۔ وہ بڑے زمیں دار گھرانوں کی عورتوں کی طرح ریشمی کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جسم کا بالائی حصہ سفید اونی شال سے ڈھکا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی کنگن اور کانوں میں جڑاؤ مندرے تھے۔ لباس سے عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ دل ربا اور طرح دار نظر آرہی تھی۔

لالی نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو ایسا حیرت زدہ ہوا کہ کچھ کہہ نہ سکا۔ گم صم کھڑا کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ شاداں کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شرما کر شال کھینچی اور سر ڈھک لیا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟" اس کے انداز میں پہلی سی بے باکی اور اکھڑ پن نہ تھا۔

"دیکھ رہا ہوں تو کتنی بدل گئی ہے۔ پہلے تو میں تجھے پہچان ہی نہ سکا۔" لالی نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "لشکارے مار رہی ہے۔ تو اب تک رہی کہاں؟ میں نے کتنے بندے ترے پاس بھیجے' پر تو نہ آئی۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔ "تو اپنے ماماں ہی کے پاس ہے نا؟"

"نہیں۔" شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "اس کی تو موت کو بھی بہت مدت ہو گئی۔ میرے پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ مر گیا۔"

"تیرا ماماں مر گیا؟" لالی نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیسے مر گیا؟"

"سویرے دودھ لے کر جا رہا تھا۔" شاداں کی چہرے پر افسردگی کا غبار چھا گیا۔ آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "وڈی سڑک پر اس کی سیکل ایک بس سے ٹکرا گئی۔ بس اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ یہ بھی پتہ نہ چلا' کس کی بس تھی اور کہاں چلی گئی؟ ماماں کی لاش گھر آئی تو ایسی خراب ہو گئی تھی کہ پچھانی نہ جاتی تھی۔ بس کا پہیا اس کی سر پر سے گزر گیا تھا۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ تیرا ماماں بہت نیک بندہ تھا۔" لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ "تجھے تو بہت پیار کرتا تھا۔"

"نہ پوچھ کتنا پیار کرتا تھا۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔"

"پر تو نے اس کا گھر کیوں چھوڑ دیا؟ مامی تو موجود تھی۔"

"ماماں کی موت کے بعد تو اس نے زبردست سیاپا کیا۔ اسے یاد کر کے بہت روتی تھی۔" شاداں نے بتایا۔ "پر عدت پوری ہوتے ہی اس نے ایک دودھی سے نکاح پڑھوا لیا۔ وہ چنگا بندہ نہیں ہے۔ مجھے طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ نشہ کر کے مامی کو بھی مارتا پیٹتا تھا۔ ایک شام مامی گھر پر نہیں تھی۔ وہ نشہ کر کے آیا۔ مجھے اکیلا پایا تو نوچنے کھسوٹنے لگا۔ اتنے میں مامی بھی آ گئی۔ اس نے اپنے گھر والے کو تو کچھ نہ کہا۔ الٹا مجھ پر نراض ہوئی۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ مجھے اتنا کہتہ آیا کہ دوسرے ہی روز اس کا گھر چھوڑ دیا۔"

"گھر چھوڑ کر تو کہاں گئی؟" لالی نے دریافت کیا۔

"جاتی کہاں' سیدھی تیرے پاس پہنچی۔" شاداں نے مطلع کیا۔ "پر تو تیموں کے بھٹے کو چھوڑ چکا تھا۔ کسی کو پتہ نہ تھا تو کہاں ہے؟ کس بھٹے پر کام کر رہا ہے؟ کتنے ہی پتھیروں سے پوچھ تاچھ کی پر کسی نے تیرے بارے میں کچھ نہ بتایا۔"

"بھٹے کے جمعدار کو تو میرے بارے میں سب کچھ پتہ تھا۔ تو نے اس سے کیوں نہیں پوچھا؟"

"اس کے پاس اس ڈر سے نہ گئی کہ پکڑ کر بھٹے پر نہ لگا دے۔" شاداں نے بتایا۔ "جب تو نہ ملا تو میں کاسم بیلا اپنی ممیری کے پاس چلی گئی۔ جب تو ملتان جیل میں ہوتا تھا تب بھی میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ پر اس بار اس کی بیوہ نناں بھی گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ ایسی جھگڑالو کہ میں تجھ سے کیا بتاؤں۔ روز ہی مجھ سے جھگڑا کرتی تھی۔ تنگ آ کر میں نے کاسم بیلا بھی چھوڑ دیا۔"

"تو کاسم بیلا سے یہاں آئی ہے؟"

"تب تو مجھے پتہ بھی نہ تھا تو جیل میں ہوتا ہے۔"

"فیر تو یہاں کیسے پہنچی؟" لالی نے دریافت کیا۔

"پچھلی جمعرات کو میں پاک پتن گئی تھی۔" شاداں نے جواب دیا۔ "وہاں بابا فرید کی زیارت پر ماسی مل گئی۔ جب سے اس کا گھر چھوڑا پہلی بار ملی تھی۔ تیرے جیل کے کئی ساتھی اس کے گھر جا چکے تھے۔ ان سے ماسی نے تیرے بارے میں جو کچھ سنا تھا مجھے سب بتایا۔"

"اب تو کہاں ہوتی ہے؟"

"کاسم بیلا چھوڑنے کے بعد میں چوہدری نور الٰہی کے پاس نوکری کرنے چلی گئی تھی۔" شاداں نے لالی کو مطلع کیا۔ "تب سے میں کوٹلہ ہرکشن میں ہوں۔"

"تو نوکرانی تو بالکل نہیں لگتی۔" لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تو نے چوہدری سے ویاہ تو نہیں کر لیا؟"

"ہاں، میں نے اس سے ویاہ کر لیا۔ اب وہ میرا گھر والا ہے۔" شاداں نے دبی زبان سے اعتراف کیا۔

لالی ششدر رہ گیا۔ چند لمحے شاداں کو گھورتا رہا، پھر اس نے یقین نہ آنے کے انداز میں پوچھا۔ "تو نے چوہدری سے ویاہ کر لیا؟ کب کیا ویاہ؟"

"پچھلے مہینے کیا ہے۔" شاداں نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

لالی تڑپ کر بولا۔ "تجھے پتہ ہے چوہدری کیسا بندہ ہے؟"

"میں نوں پتہ ہے، ٹھیک طرح پتہ ہے وہ کیسا بندہ ہے۔" شاداں نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تجھ سے بہت زیادہ چنگا بندہ ہے۔ وڈا زمیں دار ہے۔ شان سے رہتا ہے۔ مجھے پیار کرتا ہے۔ ہر طرح کا آرام پہنچاتا ہے۔"

"جب تو آرام سے ہے تو اب میرے پاس کیوں آئی ہے؟" لالی نے غصے سے جھنجلا کر شاداں کو دیکھا۔

"تیرے پاس یہ بتانے آئی ہوں کہ میں اب چوہدری کی گھر والی بن چکی ہوں۔ وہ تجھے بالکل پسند نہیں کرتا۔" شاداں نے لالی کو خبردار کیا۔ "اگے تو میرے پاس نہ آنا۔ میں نے تجھ سے اب کچھ نہیں لینا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھے دھوکا دیتی رہی۔ تو نے مجھ سے جھوٹے وعدے کیے۔" لالی نے گلہ کیا۔

"جھوٹا وعدہ میں نے کیا یا تو نے؟" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو نے پکا وعدہ کیا تھا کہ چوری ڈکیتی چھوڑ دے گا۔ پر تو باز نہ آیا۔ چوری کی پکڑا گیا۔ اب جیل میں بند ہے۔" اس کا لہجہ

اور تلخ ہو گیا۔ "میں نے تیرے ایسے چور ڈکیت سے کوئی رشتہ ناتا نہیں رکھنا۔"

"تجھے غلط اطلاع ملی۔ میں نے کوئی چوری ڈکیتی نہیں کی۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "بھٹے کے مالک نثار محمد اور اس کے جمعدار نے پولیس کی مٹھی گرم کر کے میرے خلاف جھوٹا کیس بنوایا اور مجھے جیل میں بند کروا دیا۔"

"مجھے سب پتہ ہے تو جیل میں کیوں ہے؟ ماسی نے تیرے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" شاداں اس کی صفائی سے ذرا متاثر نہ ہوئی۔ "اسے تو تیرے ہی جیل کے ساتھی کیدیوں نے ساری باتیں بتائی ہیں۔"

"انھیں کچھ پتہ نہیں۔" لالی نے شاداں کو مطمئن کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "تو ملک نثار محمد کے بتھیروں سے پوچھ لے۔ ان کو پتہ ہے کہ کس طرح میرے خلاف جھوٹا مکدمہ بنایا گیا۔"

"میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔" اس نے اس دفعہ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی میں نے اب تجھ سے کیا لینا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ مجھے تو اب چوہدری کی گھر والی ہی بن کر رہنا ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتی اب تو وڈی زمیں دارنی بن گئی ہے۔ شان سے رہتی ہے۔ عیش کرتی ہے۔ اب میرے ایسے غریب بندے سے تجھے کیا لینا۔" لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو جو چاہتی تھی تجھے مل گیا۔"

"تیرا جو جی چاہے سوچتا رہ۔" شاداں نے مڑتے ہوئے کہا۔ "پر آگے تو مجھے ملنے یا میرے پاس آنے کی نہ سوچنا۔"

شاداں آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ لالی لوہے کی سلاخیں ہاتھوں سے تھامے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سامنے ایک گھنے درخت کے نیچے جیپ کھڑی تھی۔ شاداں جیپ کے نزدیک پہنچی اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

جیپ کا انجن شور مچاتا ہوا اسٹارٹ ہوا۔ پہیے حرکت میں آئے۔ جیپ تیزی سے مڑی۔ پختہ سڑک پر پہنچی اور تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔

لالی لوہے کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھامے جیپ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیپ آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاداں چلی گئی۔ لالی کی پہنچ سے بہت دور چلی گئی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے رخصت ہو چکی تھی۔ لالی سے منہ موڑ کر کسی اور کی بن چکی تھی۔

لالی نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری اور بے قرار ہو کر اپنا سر سلاخوں پر رکھ دیا۔

۵۰

شاداں کو ٹلہ ہرکشن واپس پہنچی تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شاداں سفر کی تکان سے نڈھال تھی۔ لالی سے ملنے کے بعد ذہنی طور پر پریشان بھی تھی۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں اور چہرے پر افسردگی چھائی تھی۔

رحیم داد نے شاداں کو افسردہ اور مضمحل پایا تو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "شاداں! تو کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے لالی سے تیرا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا اس کے پاس نہ جا' پر تو نے میری بات نہ مانی۔ یہ نہ سوچا وہ بدنام مجرم ہے۔ چوری ڈکیتی کرنا اور جیل جانا اس کا دھندا ہے۔ سمجھ نہیں آتی تو اس کے چکر میں کیسے پڑ گئی۔"

شاداں کے دل کے کسی گوشے میں ابھی تک لالی کے لیے جگہ تھی۔ رحیم داد کی جلی کٹی باتیں سن کر اس نے لالی کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر وہ تو کہتا تھا' میں نے چوری نہیں کی۔ بھٹے کے مالک نے پولیس کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف جھوٹا مکدمہ بنایا اور مجھے جیل میں بند کرا دیا۔"

"شاداں' تو جتنی سوہنی ہے اتنی ہی بھولی بھی ہے۔" رحیم داد نے محبت سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ "کوئی مجرم کبھی یہ نہیں کہتا اس نے جرم کیا ہے۔ ہمیشہ اپنے تئیں بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تو جب پولیس دبا کے پٹائی کرتی ہے تب بتاتا ہے اس نے کیا جرم کیا ہے۔ اور لالی تو ایسا پکّا جرائم پیشہ ہے کہ زبردست مار پڑنے پر بھی اپنا جرم صاف صاف بتانے کا نہیں۔ تجھے پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔"

"وہ تو مجھے یہ بھی کہتا تھا کہ بھٹے کے سارے ہی ٹھیروں کو پتہ ہے اس نے چوری نہیں کی۔"
شاداں پر رحیم داد کی باتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے لالی کی جانب سے مزید صفائی پیش کی۔ "وہ تو یہاں تک کہتا تھا تجھے میری بات پر یقین نہ ہو تو بھٹے پر جا کر ٹھیروں سے پوچھ لے۔ خود ہی پتہ چل جائے گا میں جھوٹ بول رہا ہوں یا سچ۔"

"وہ کچھ ہی کہے اور اپنے بے گناہ ہونے کے بارے میں کیسی ہی صفائی پیش کرے' پر میں تجھے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب تو میری گھر والی ہے' آگے میں تیری زبان سے لالی کا ذکر نہ سنوں۔" رحیم داد اچانک بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر اس نے تیکھے لہجے میں شاداں کو خبردار کیا۔ "نہ تو اب اسے ملے گی اور نہ وہ کبھی یہاں آئے گا۔ میں عزت دار زمیں دار ہوں۔ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری گھر والی کسی بدنام جرائم پیشہ کے ساتھ کسی بھی طرح کا میل ملاپ رکھے۔"

شاداں نے رحیم داد کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گئی۔ فوراً اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "برا نہ منا۔ تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔ میں نے لالی کو صاف صاف کہہ دیا۔ آگے نہ کبھی یہاں آئے اور نہ مجھے ملنے کی کوشش کرے۔ میں اسے یہی کہنے جیل گئی تھی اور تجھے بتا کر گئی تھی۔" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دیا' مسکرا کر دیکھا اور رحیم داد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔ "چوہدری' تو میرا گھر والا ہے۔ زندگی بھر کا سنگی ساتھی ہے۔ میں نے اب لالی شالی سے کیا لینا۔"

اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ دلداری تھی۔ ناز اور عشوہ تھا۔ رحیم داد اس کی اس ادا پر تڑپ اٹھا۔ ساری برہمی اور کدورت کافور ہو گئی۔ ایسا وارفتہ ہوا کہ بے اختیار دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر شاداں کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے کندھے محبت سے ہولے ہولے تھپکنے لگا۔

☆

فروری کا مہینہ تھا۔ سردی کا زور اب کسی قدر ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اس وقت فضا میں خاصی خنکی تھی۔ کہر کی ہلکی نیلگوں دھند مٹتی جا رہی تھی۔ سورج درختوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت لطف دیتی تھی۔ ربیع کی فصل تیاری کے مرحلے میں تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ گندم کے ہرے بھرے پودے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ سرسوں کے کھیتوں میں زرد زرد پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں جھوم رہی تھیں۔ بسنت کی آمد آمد تھی۔ فضا خوش گوار تھی' مہک رہی تھی۔

رحیم داد صبح سے کھیتوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ فصل کے بارے میں مزارعوں سے ہنس ہنس

کر رہا تھا۔ جب وہ حویلی میں واپس پہنچا تو پہر دن گزر چکا تھا۔ سورج نیلے آسمان پر دمک رہا تھا۔ دھوپ کی حرارت اور گرمی بڑھ گئی تھی۔

رحیم داد ٹہلتا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ مہمان خانہ خالی پڑا تھا۔ ماسٹر عبداللطیف اپنے بال بچوں کے ساتھ جا چکا تھا۔ اسے سکھر کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے وہ سکھر ہی میں تھا۔ رحیم داد نے اسے روکنا بھی چاہا مگر اس کی بیوی کسی طور راضی نہ ہوئی۔ وہ مزاج کی تیز اور طرار تھی۔ آئے دن نادر خان کی بیوی 'جنت' سے اس کا جھگڑا ہوتا تھا۔ عبداللطیف بیوی سے دبتا بھی تھا۔ منع کرتا تو اس کی ذرا پرواہ نہ کرتی۔ حقارت سے جھڑک دیتی۔ عبداللطیف روز روز کے جھگڑے سے عاجز آگیا تھا۔ اور جیسے ہی اپنے رشتے کے ایک سالے کے ذریعے ملازمت کی سبیل پیدا ہوئی اور بیوی نے دباؤ ڈالا' اس نے بستر بوریا باندھا اور سکھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

عبداللطیف کے جانے کی بعد رحیم داد نے مہمان خانے کی مرمت کرائی تھی۔ دو نئے کمرے تعمیر کرائے تھے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کر نیا فرنیچر ڈلوایا تھا۔ در و دیوار پر نیا رنگ روغن کیا گیا۔ پردے تبدیل کئے گئے۔ اب مہمان خانے کا حلیہ بالکل بدل گیا تھا اور اس قابل ہو گیا تھا کہ سرکاری افسر اور دوسرے مہمان قیام کرتے تو آرام و سکون محسوس کرتے۔

رحیم داد مہمان خانے سے باہر جا رہا تھا کہ دروازے پر نادر خان مل گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو سیدھا لہور ہی سے آرہا ہے؟"

"دو روز تو مہربان علی کے پاس شاہ جی کی کوٹھی میں رہا' پر رات کو پیراں والہ آگیا تھا۔ مہربان بھی ساتھ ہی آیا ہے۔ وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔"

"وہ پیراں والہ کیوں آگیا؟"

"شاہ جی آج کراچی سے واپس آرہا ہے۔" نادر خان نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ لہور کی بجائے اس دفعہ پیراں والہ ٹھہرے گیا۔"

"شاہ جی کب پیراں والہ پہنچے گا؟"

"اسے لینے سویرے ہی سویرے ڈرائیور کار لے کر سٹیشن چلا گیا تھا۔ مہربان نے مجھے ادھر بھیج دیا۔ کہا چوہدری کو اپنی ساتھ لے کر پیراں والہ آجا۔ شاہ جی نے چوہدری سے آج ہی ملنا ہے۔ فون پر شاہ جی نے اسے یہی کہا تھا۔"

"ایسا ہے تو روٹی کھا کر پیراں والہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" رحیم داد نے اپنا پروگرام بتایا۔ "تب تک شاہ جی بھی پہنچ جائے گا۔"

نادر خان سے رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد حویلی کی جانب مڑ گیا۔

دوپہر کا کھانا شاداں کے ساتھ کھانے کے بعد رحیم داد نے جیپ منگوائی اور احسان شاہ سے ملنے پیراں والہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ نادر خان بھی اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خان اب پہلے کی نسبت کسی قدر فربہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے سر اور مونچھوں کے بال زیادہ سفید ہو گئے تھے جو مہندی کا وسمہ لگانے کے باعث سرخی مائل نظر آتے تھے۔ البتہ وہ ابھی تک نہایت چاق چوبند تھا اور اپنے فرائض نہایت مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔

☆

رحیم داد پیراں والہ پہنچا۔ احسان علی شاہ حسب معمول نہایت گرم جوشی سے ملا۔ مسکرا کر بولا "چوہدری' سنا ہے تو نے ویاہ کر لیا۔"

"تو نے ہی تو کراچی جانے سے پہلے کہا تھا فوراً ویاہ کر لے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میں نے وہی کیا جو تو نے کہا تھا۔ پہلے بھی تیرا مشورہ میں نے کب ٹالا ہے۔"

"یہ تو نے بہت نیک کام کیا۔ تیرے لیے ویاہ کرنا بہت ضروری تھا۔" اس نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ "وہٹی کیسی ہے؟ کہاں کیا ویاہ؟"

"بس جی ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات نہ کی۔ وہ شاداں کے بارے میں اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ "ایک گھر والی چاہیے تھی وہ آ گئی۔"

احسان شاہ نے بھی مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ "نئی نئی وہٹی ملی ہے۔ تو آج کل تو اس کے ناز نخرے اٹھانے میں لگا ہو گا۔ عیش کر رہا ہو گا۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر سرگوشی کی۔ ایسی بات کہی کہ رحیم داد کچھ کہہ نہ سکا۔ شرما کر رہ گیا۔

احسان شاہ اسے لان پر لے گیا۔ سہ پہر کی ہلکی ہلکی دھوپ میں کئی کرسیاں گھاس پر قرینے سے رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر علی نواز چانڈیو بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ سندھ کا ایک بڑا وڈیرا تھا۔ ادھیڑ تھا۔ احسان شاہ کے ساتھ کراچی سے آیا تھا اور اس کے حویلی کی مہمان خانے میں ٹھہرا تھا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے اٹھ کر رحیم داد سے مصافحہ کیا۔ حسب دستور حال احوال دریافت کیا۔

جب تینوں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو علی نواز چانڈیو نے احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ "سائیں احسان شاہ! تو نے اخبار میں وہ خبر تو پڑھی ہو گی۔ ڈیرہ غازی خان کے علاقے' چوٹی بالا میں

ایک نہر چوری ہو گئی۔"

"نہر چوری ہو گئی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ "نہر کیسے چوری ہو سکتی ہے جی۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ نہ آنے والی بات ہی ہے۔ اب تک تو مویشیوں کی چوری کی واردات سنی تھیں۔ مال اسباب اور روپے پیسے کی چوری سنی تھی۔ طرح طرح کی اور چوریاں سنی تھیں، لیکن نہر کی چوری کے بارے میں تو اب تک نہ سنا نہ دیکھا۔" علی نواز نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "سائیں، معلوم ہوتا ہے تو نے وہ خبر نہیں پڑھی۔"

"کیوں نہیں پڑھی، پر اب تو خبر پرانی ہو گئی۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اس کے بارے میں تو انکوائری بھی ہوئی تھی۔"

"نہر تو جی چوری ہونے سے رہی۔" رحیم داد نے کھل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "یہ تو کچھ اور ہی چکر جان پڑتا ہے۔"

"چکر شکر کیا ہے۔ ہوا یہ کہ لغاریوں کا ایک وڈا سردار، صوبائی وزیر زراعت و آب پاشی لگ گیا تھا۔ اس کی وزارت کے زمانے میں چوٹی بالا کے لیے ایک نہر تعمیر کرنے کے منصوبے پر کام ہو رہا تھا۔" احسان شاہ نے مطلع کیا۔ "لغاری سرداروں کی زمینیں چوٹی زیریں کے علاکے، درخواست جمال میں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے چوٹی بالا میں نہر نکلنے سے وزیر کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا موکے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چوٹی بالا کی بجائے نہر کے پانی سے اپنی بنجر اور غیر مزروعہ زمینوں کو زرخیز بنایا جائے۔ اس نے محکمہ آب پاشی کے افسروں اور انجنیئروں کو اپنے ساتھ ملایا۔ کسی کو پروموشن دی۔ کسی کی تنخواہ بڑھائی۔ نہر کی کھدائی رکوائی۔ سروے رپورٹ بدلوائی اور سرکاری ریکارڈ میں بالا کی جگہ زیریں لکھوا دیا۔"

"یہ تو جی اس نے زبردست کارروائی ڈالی۔" رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔

"اس طرح جو نہر چوٹی بالا سے گزرنی تھی، چوٹی زیریں پہنچ گئی۔" احسان شاہ نے مزید تفصیل بتائی۔ "چوٹی بالا کی پیاسی زمینیں، جو برسوں سے پانی کو ترس رہی تھیں، بنجر اور غیر آباد ہی رہیں۔ اور چوٹی زیریں کے درخواست جمال کی زیر کاشت اراضی میں ہزاروں ایکڑ کا اضافہ ہو گیا۔ زمیں ایسی زرخیز ہو گئی کہ اب سونا اگلتی ہے۔ ویران اور چٹیل میدان کی جگہ ہر طرف فصلیں لہلہاتی نظر آتی ہیں۔"

"سائیں، چوٹی بالا میں بھی تو زمین دار ہوں گے۔ انھوں نے شور شرابہ نہیں کیا۔" علی نواز نے

کرید کر پوچھا۔ "ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔"

"چوٹی بالا میں زمیں دار تو ہوتے ہیں، پر زیادہ تر چھوٹے ہی زمیں دار ہیں۔ لغاری سرداروں کے سامنے تو بہت چھوٹے ہیں۔ ان کا زیادہ اثر و رسوخ بھی نہیں۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "انھوں نے احتجاج کیا۔ اوپر درخواستیں بھی لگائیں۔ ان کے وفد وزیر اعلیٰ اور گورنر سے بھی ملے۔ پر کوئی کارروائی نہ ہوئی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "چوٹی بالا کا ایک وکیل بہت ہشیار نکلا۔ وہ لہور میں پریکٹس کرتا ہے۔ اس کی کچھ زمین داری بھی چوٹی بالا کے علاکے میں ہوتی ہے۔ اس نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے مل کر نہر کی چوری کی خبر لگوا دی۔ خبر ایسی انوکھی اور چونکا دینے والی تھی کہ ہر طرف اس کا چرچا ہو گیا۔ بات اتنی زیادہ پھیلی کہ ایک ممبر نے صوبائی اسمبلی میں بھی اس مسئلے کو اٹھایا۔ زبردست بحث ہوئی۔ آخر یہ طے ہوا کہ سارے معاملے کی انکوائری کرائی جائے۔"

"سائیں، انکوائری کا کیا نتیجہ نکلا؟" علی نواز چانڈیو نے استفسار کیا۔

"نتیجہ کیا نکلنا تھا۔ ایک ایس ڈی او اور دو اوور سیر معطل کر دیے گئے۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "وزیر آب پاشی اور اس کے گروپ کے اسمبلی ممبروں نے دباؤ ڈال کر ان کو بھی ملازمت پر بحال کرا دیا۔ تینوں کو صرف اتنی سزا ملی کہ تبادلہ کر کے دوسرے ضلع میں لگا دیا گیا۔"

"وزیر آب پاشی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی؟"

"اس کے خلاف کیا کارروائی ہونی تھی۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "صوبائی اسمبلی میں اس کا گروپ بہت تگڑا تھا۔ اس کے گروپ کے ممبروں کی مدد جاتی رہتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ پوری کابینہ ہی ختم ہو جاتی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزیروں کو اس کے خلاف کارروائی کر کے اپنی وزارتوں سے ہاتھ دھونا تھا؟"

"سائیں، یہ تو بہت سنگین جرم تھا۔"

"یار علی نواز تو کیسی گل کر رہا ہے۔ ایسے جرائم تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ سیاست میں ان کو جرم شرم نہیں سمجھا جاتا۔" احسان شاہ نے علی نواز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ جو وڈے وڈے زمیں دار اسمبلی کی ممبری حاصل کرنے اور وزیر بننے کے لیے اتنا روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ طرح طرح کی رشوتیں دیتے ہیں، تو وہ صرف اسمبلی میں تکریریں کرنے یا وزیر کہلانے کے لیے تو نہیں کرتے۔ پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "سچی بات یہ ہے جی۔ ان کو ایسا کرنا بھی چاہیے۔ گھاٹے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔ غلط کہہ رہا ہوں

میں؟"

مگر رحیم داد نے اس سے اتفاق رائے نہیں کیا۔ "جب ایس ڈی او اور اوور سیئر معطل کیے گئے تو وزیر کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ کارروائی تو ہونی ہی چاہیے تھی۔ جرم بھی اس نے معمولی نہیں کیا تھا۔ پوری نہر کی نہر رستہ بدل کر اپنی بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے لے گیا۔ حد ہو گئی جی۔"

"چوہدری، تجھے پتہ نہیں۔ وہ لغاریوں کا بہت وڈا سردار ہے۔ توڈیرہ غازی خان میں رہ چکا ہے۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سرداروں سے تو ہر حکومت ڈرتی ہے۔ ادھر تو ان کی حکمرانی اور ان کا ہی کنون چلتا ہے۔" احسان شاہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "سرداروں کے خلاف نہ پہلے کوئی کارروائی ہوتی تھی اور نہ اب ہوتی ہے۔ تب ہی تو ساری انکوائری شنکوائری دبا دی گئی۔"

"ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"ویسے انکوائری سے ہوتا بھی کیا۔ نہر تو بن ہی چکی تھی۔ نہ اسے توڑ پھوڑ کر ختم کیا جا سکتا تھا نہ اٹھا کر چوٹی زیریں سے چوٹی بالا پہنچایا جا سکتا تھا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "لغاری وزیر نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اس کی میلوں تک پھیلی ہوئی بیکار اور بنجر زمینوں کو اتنا پانی ملنے لگا کہ جیسی چاہے فصلیں اگائے۔ اس کے ساتھ دوسرے لغاری سرداروں کے بھی عیش ہو گئے۔ چوٹی بالا والوں کے شور شرابے صرف شور شرابے ہی ہو کر رہ گئے۔"

"سائیں، چوٹی بالا کے زمین داروں کی زمینیں تو ابھی تک بنجر اور غیر آباد پڑی ہیں۔ وہ کیسے چپ رہ سکتے ہیں۔" علی نواز چانڈیو نے تازہ ترین صورت احوال سے آگاہ کیا۔ "انھوں نے معاملے کو دوبارہ اٹھایا۔ تب ہی تو ایک بار پھر انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اور اس بار تو مارشل لا کے تحت ہونے والی ہے۔ میں نے یہی بتانے کے لیے تو بات چھیڑی تھی۔ سائیں اب حالات پہلے سے نہیں رہے۔ نہ اسمبلیاں رہیں نہ ان کی ممبری نہ وزارتیں۔ وہ سارا سیاسی چکر ہی ختم ہو گیا۔"

"انکوائریاں تو دوسرے بھی کئی وزیروں کے خلاف ہو رہی ہیں۔ پر میں تو یہی کہوں گا ہونا ہوانا کچھ نہیں۔" احسان شاہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی "علی نواز تو خاندانی وڈیرا ہے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ یہ بتا تو نے کبھی کسی وڈے زمیں دار کے خلاف کارروائی ہوتے دیکھی یا سنی ہے۔"

"پہلے تو نہیں دیکھی لیکن آئندہ کی کچھ خبر نہیں۔" اس کے لہجے سے تشویش صاف عیاں تھی۔ "سائیں، روز ہی تو مارشل لا کے نئے نئے ضابطے جاری کئے جا رہے ہیں۔ طرح طرح کے آرڈیننس نافذ ہو رہے ہیں۔ سب سے زیادہ پریشانی تو زرعی اصلاحات کی ہے جو سر پر تلوار کی طرح

لٹک رہی ہے۔"

☆

علی نواز چانڈیو نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا ان کی نوعیت یہ تھی کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے ایک لینڈ ریفارم کمیشن مقرر کیا گیا۔ کمیشن نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں اپنی رپورٹ مارشل لا حکومت کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر فروری میں مارشل لا ضابطہ نمبر ۶۴ نافذ کیا گیا۔ اس ضابطے کے ذریعے جو زرعی اصلاحات کی گئیں' وہ کچھ اس طرح تھیں۔

۱۔ زرعی اراضی کی حد ملکیت پانچ سو ایکڑ نہری یا ہزار ایکڑ بارانی یا ۳۶ ہزار پیداواری یونٹ جو بھی زیادہ ہو' مقرر کی گئی۔

۲۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد اگر کسی زمیں دار نے جس کی اراضی مقررہ حد ملکیت سے زیادہ تھی اور اس نے اپنی اراضی یا اس کا کچھ حصہ رہن' بیع یا ہبہ کر دیا تھا' ایسا ہر رہن' بیع یا ہبہ کالعدم قرار دے دیا گیا۔

۳۔ مقررہ حد ملکیت اراضی سے یونیورسٹیوں اور منظور شدہ تعلیمی اداروں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۴۔ دینی اور رفاہی اداروں کو بھی مقررہ حد ملکیت اراضی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۵۔ گھوڑی پال' گائے پال اور بکری پال فارموں کے مالکان کو بھی مقررہ حد ملکیت سے' فارموں کی زیر استعمال اراضی کی حد تک' مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۶۔ زرعی اراضی کے مالکان کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ مقررہ حد ملکیت کے علاوہ ۱۵۰ ایکڑ اراضی باغات کے مالک رہ سکتے ہیں۔

۷۔ مالکان اراضی کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ ۱۸ ہزار پیداروار ی یونٹ تک اپنے ورثا میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی مستورات کو' جن کی وہ کفالت کرتے ہوں' ۶ ہزار پیداواری یونٹ منتقل کر سکتے ہیں یا بطور عطیہ دے سکتے ہیں۔

۸۔ مقررہ حد ملکیت اور مستثنیات کے تحت آنے والی اراضی کے علاوہ تمام فاضل اراضی' مالکان سے بحق سرکار لے لی جائے گی اور ایک مقررہ فارمولے کے تحت اس اراضی کے مالکوں کو معاوضہ دیا جائے گا۔

۹۔ مالکان سے حاصل کی جانے والی اراضی' مزارعوں اور گزارہ ملکیت سے کم اراضی رکھنے والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور فروخت کے وقت قابض مزارعوں کا حق افضل

قرار دیا گیا۔

۱۰۔ غیر اقتصادی ملکیتوں کی فروخت اور تقسیم وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔

۱۱۔ مزارعوں کی بے دخلی کے متعلق مروجہ قوانین جاری رکھے گئے۔

☆

علی نواز کے بشرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ رحیم داد بھی مضمحل اور گم صم بیٹھا تھا۔ مگر احسان علی شاہ مطمئن اور نہایت ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نے مسکرا کر علی نواز کی جانب دیکھا۔ بے تکلفی سے گویا ہوا۔ "جب سے مارشل لا ریگولیشن ۶۴ سامنے آیا ہے علی نواز تیری طرح زرعی اصلاحات کا بھوت نہ جانے کتنے وڈے زمیں داروں اور جگیر داروں کے سروں پر خطرہ بن کر منڈلا رہا ہے۔ سب ہی تیری طرح ڈرے ہوئے ہیں۔" اس کا لہجہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ "پر یہ تو سوچ، زرعی اصلاحات پہلی بار تو ہوئی نہیں۔ پیچھے بھی ہوتی رہی ہیں۔"

"مشرقی پاکستان میں تو سائیں ۱۹۵۰ء ہی میں زرعی اصلاحات کا قانون لاگو ہو گیا تھا۔ کسی بھی زمیں دار یا مالک اراضی کو ایک سو بیگھ سے زیادہ زمین رکھنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔" علی نواز چانڈیو نے مطلع کیا۔

"یہ ایک سو بیگھ کتنے کلا زمیں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"۳۳ ایکڑ اور وہ بھی فی کنبہ۔" علی نواز چانڈیو نے جواب دیا۔

"یہ تو جی بہت کم زمین ہوئی۔" رحیم داد نے پریشان ہو کر کہا۔ "اتنی تھوڑی زمین سے کیا بنتا ہو گا۔"

احسان شاہ نے رحیم داد کی تشویش نظرانداز کرتے ہوئے علی نواز چانڈیو سے کہا۔ "ادھر کی گل چھوڑ، بنگال اسمبلی میں تو پاکستان بن نے سے پہلے ہی زمیں داری ختم کرنے کا کنون منظور ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں تو اسے لاگو کیا گیا تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لگ بھگ سارے ہی وڈے زمیں دار ہندو ہوتے تھے۔ مسلمان زمیں دار چھوٹے تھے اور مغربی پاکستان کی طرح وڈے اور تکڑے بھی نہ تھے۔ اس طرف کا تو حال ہی کچھ اور ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "وزیر تک ایسے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل یتیم نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے ہیں۔ نہ کسی کے پاس موٹر ہے نہ گڈی۔ اور کسی کے پاس ہے تو ایسی پرانی کھٹارا جیسے کباڑ خانے سے اٹھا کر لایا ہو۔ میں تو ادھر کئی بار جا چکا ہوں۔ سب کو ٹھیک طرح جانتا ہوں۔"

"کراچی میں ادھر کے وزیروں سے تو ہمارا بھی میل ملاپ رہتا ہے۔" علی نواز چانڈیو نے کہا۔

"سائیں، تجھے تو معلوم ہی ہے۔ میں تو زیادہ تر کراچی میں ہی رہتا ہوں اور برسوں سے رہتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے اور ٹھیک طرح پتہ ہے تو کراچی ہی میں ہوتا ہے۔ پر تو اکیلا نہیں۔ سندھ کے زیادہ تر وڈے زمیں دار اور جگیر دار کراچی یا حیدر آباد میں ہوتے ہیں۔ سب ہی نے وہاں اپنی اپنی کوٹھیاں اور بنگلے بنا رکھے ہیں۔"

"سائیں ایسا نہ کریں تو کیسے کام چلے۔ گوٹھ میں نہ بجلی ہے نہ نلکے، اسکول ہیں بھی تو ایسے ہیں کہ ان میں ہاریوں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ اب ہاریوں کے بچوں کے ساتھ ہمارے بچے کیسے پڑھ سکتے ہیں؟"

"ادھر تو سکول بننے ہی نہیں چاہیے۔ ہاریوں اور مزارعوں کے پتر پڑھ لکھ جاتے ہیں تو سرکشی کرتے ہیں۔ کنون کی گل بات کرتے ہیں۔" احسان شاہ نے علی نواز چانڈیو کو مشورہ دیا۔ "میں نے تو اپنی زمیں داری میں آج تک کوئی سکول شکول نہیں بننے دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے بھی بہت زور لگایا، پر میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔"

"سائیں تو نے بالکل ٹھیک کیا۔" علی نواز نے احسان شاہ سے اتفاق رائے کیا۔ "گوٹھ میں نہ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ جوان لڑکے ادھر زمیں داری پر رہتے ہیں تو بدمعاشوں اور پتھاریداروں کی صحبت میں رہ کر خراب ہو جاتے ہیں۔ ہاریوں کی عورتوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ نشہ کرتے ہیں، مرغ اور کتے پالتے ہیں۔ ان کو لڑاتے ہیں۔ لمبی لمبی شرطیں لگاتے ہیں۔ ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں۔ زمیں داری سے تو ان کو کچھ مطلب ہوتا نہیں۔ صرف عیاشی کرتے ہیں۔"

احسان شاہ نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تجھے یہ تو پتہ ہوگا سندھ میں زرعی اصلاحات کے لیے ہاری کمیٹی بنائی گئی تھی۔"

"سائیں، بالکل یاد ہے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں بنی تھی۔"

"سر راجر ٹامس اس کا چیئرمین ہوتا تھا۔" احسان شاہ نے بات آگے بڑھائی۔ "مسعود بھی اس کمیٹی کا ممبر ہوتا تھا۔ بہت وڈا افسر تھا۔ آئی سی ایس تھا۔ پر نہ جانے کیسے زمیں داروں کا سخت دشمن بن گیا تھا۔" اس نے ایک عدد گندی گالی دی۔ "کسی کمی شمی خاندان سے رہا ہوگا۔ اس نے زمین داروں کے خلاف بہت بکواس کی۔ ہاری کمیٹی کی رپوٹ کے ساتھ اختلافی نوٹ بھی لکھا۔" احسان شاہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "اس میں یہ کہا تھا کہ زمیں داری بالکل ختم کر دی جائے اور ان کی ساری اراضی کسانوں کو دے دی جائے۔ پر حکومت میں بھی زمیں دار موجود تھے۔

انھوں نے دباؤ ڈال کر مسعود کا اختلافی نوٹ رکوا دیا تھا۔" اس نے مڑ کر علی نواز کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تجھے تو اس کے بارے میں یاد ہو گا۔"

"یاد ہے۔ سائیں ہم کو بالکل یاد ہے۔" علی نواز نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

"تجھے یہ بھی پتہ ہو گا سر راجر ٹامس خود بھی بہت وڈا زمیں دار تھا۔" احسان شاہ نے مطلع کیا۔ "تب ہی تو اس نے جو رپوٹ تیار کرائی تھی اس میں صاف صاف لکھا تھا کہ ہاریوں کو اگر کوئی تکلیف شکیف ہے تو وہ خود اس کے ذمے دار ہیں۔ زمیں دار تو ہر طرح ان کی مدد ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پر وہ ان کے احسانات کو مانتے ہی نہیں اور نہ ان کی مدد سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"سائیں، تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" علی نواز نے بھی اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔ "کمیٹی نے تو اپنی رپوٹ میں ہاریوں کو مستقل حقوق کاشت دینے پر بھی اعتراض کیا تھا۔ لیکن کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومت، بٹائی کو باقاعدہ بنائے اور ہاریوں کو ان کے حقوق دینے کے لیے قانون بنائے۔"

"پر اس کا تو کچھ نتیجہ نکلا شکلا نہیں۔ ہاں، مسعود کے نوٹ کے بارے میں اخبارات نے بہت شور شرابہ کیا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "حکومت سے مطالبہ کیا کہ کمیٹی کی رپوٹ شائع کی ہے تو مسعود کا اختلافی نوٹ بھی شائع کیا جائے۔ تب ہی تو لیاکت علی خان نے اس معاملے کی جانچ پڑتال کے لیے مسلم لیگ کی ایک خاص کمیٹی بھی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے بھی زمیں داروں کے خلاف کارروائی کرنے پر زور دیا تھا۔ پر زمیں دار بھی کمزور نہیں تھے۔ ان کا بھی مسلم لیگ میں زبردست زور رہا ہے۔ انھوں نے وہ رپوٹ ہی دبوا دی۔"

"لیکن سائیں، ملاؤں اور مولویوں نے بھی زمیں داروں کی بہت مدد کی۔" علی نواز چانڈیو نے کہا۔ "انھوں نے مسعود کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ وہ کمیونسٹ اور ملحد ہے اور اس کا اختلافی نوٹ غیر اسلامی ہے۔ یہ فتویٰ اخبارات میں چھپوانے کے علاوہ ملاؤں کی طرف سے مفت بانٹا گیا۔ پوسٹر بنا کر ہر جگہ دیواروں پر لگایا گیا۔"

"پر تجھے پتہ نہیں اس فتوے نے آگے چل کر بہت گڑ بڑ پیدا کی۔" سید احسان علی شاہ نے انکشاف کیا۔ "یہ فتویٰ حکومت سندھ نے دس ہزار روپے رشوت دے کر ملاؤں سے لیا تھا۔ مسعود کے ہاتھ اس کا دستاویزی ثبوت لگ گیا۔ اس نے صوبائی حکومت کو ہتک عزت کا مکدمہ چلانے کا نوٹس دیا۔ ۵ لاکھ روپے ہرجانے کا مطالبہ کیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ادھر

اخبارات میں یہ اعتراض اٹھایا جا رہا تھا کہ جب مسعود کا نوٹ شائع ہی نہیں ہوا تو ملاؤں کو کیسے پتہ چل گیا اس میں کیا لکھا ہے۔ تب تک وہ ایک خفیہ سرکاری دستاویز تھی۔"

"ہاں سائیں، بہت گڑبڑ پیدا ہوئی تھی۔" علی نواز چانڈیو نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس وقت پیر الٰہی بخش وزیر اعلیٰ تھا۔ اس اسکنڈل سے اس کی اتنی بدنامی ہوئی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اسے برطرف کر کے یوسف ہارون کو سندھ کا وزیر اعلیٰ لگا دیا۔ اس نے وزیر اعلیٰ بنتے ہی مسعود کا اختلافی نوٹ چھاپنے کا حکم دیا۔ آخر اسے شائع کر دیا گیا۔"

"پر یہ ہوا بہت برا۔" احسان شاہ نے منہ بگاڑ کر خفگی کا اظہار کیا۔ "لیاکت علی خان کو اس طرح دبنا نہیں چاہیے تھا۔"

"سائیں ایسا نہ کیا جاتا تو کیسے کام چلتا۔" علی نواز چانڈیو نے احسان شاہ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ "تجھے معلوم نہیں۔ سندھ میں ان دنوں ہاریوں نے بٹائی کی زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ وہ فصل کا نصف حصہ مانگتے تھے۔ ان کے لیڈر میاں محمد مبارک تالپور، خداداد اور رئیس بروہی تھے۔ ایک تھانیدار بھی ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ لگ گیا تھا۔"

"تھانیدار بھی ان کے ساتھ لگ گیا تھا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں سائیں، صرف تھانیدار ہی نہیں، شہداد پور کا ایک ہندو ڈاکٹر آشا رام بھی ان کے ساتھ تھا۔" علی نواز نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "حیدر بخش جتوئی تو بہت بڑا افسر تھا۔ کلکٹر لگا ہوا تھا۔ مگر سرکاری نوکری چھوڑ کر ہاریوں کا لیڈر بن گیا۔ کئی بار جیل بھی گیا۔"

"اس زمانے میں سندھ میں ہاریوں نے گڑبڑ بھی بہت پھیلا رکھی تھی۔" احسان شاہ نے تبصرہ کیا۔

"تب ہی تو ہاری کمیٹی کے بعض ممبروں کو جھکنا پڑا۔" علی نواز نے بتایا۔ "کمیٹی کی رپوٹ کی بنیاد پر ۱۹۵۰ء میں سندھ ٹیننسی ایکٹ بھی منظور کرنا پڑا۔ اس ایکٹ کے تحت ہاریوں سے بےگار لینے اور نذرانہ وصول کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ ہاریوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ جو ہاری کم از کم تین سال تک ایک ہی مالک کے چار ایکڑ پر کاشت کرے، اسے مستقل ہاری ہونے کا حق حاصل ہو جائے گا۔"

"سچ سچ بتا۔ ان زرعی اصلاحات کا اور مسعود کی سفارشات کا کیا نتیجہ نکلا؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "ہاریوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، مل گیا؟"

"شروع شروع میں تو سائیں سارے ہی زمیں داروں کو دینا پڑا۔ فصل کی نصف بٹائی بھی دینی

پڑی۔ نہ دیتے تو ہاریوں کے لیڈر اپنے ساتھیوں کے جتھے لے کر پہنچ جاتے۔ وہ سرخ جھنڈا ہاتھوں میں اٹھائے' نعرے لگاتے ہوئے گوٹھ میں داخل ہوتے اور زبردستی فصل کا نصف حصہ ہاریوں کو دے دیتے۔ ترازو نہ ملتی تو ٹین کے ڈبے سے فصل کو دو برابر حصوں میں بانٹ دیتے۔" علی نواز ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "وڈیرے اور زمیں دار اپنی مدد کے لیے پتھاریداروں کو اکٹھا کرتے' مگر ہاریوں کی طاقت ان دنوں ایسی زبردست تھی کہ پتھاریدار اور پولیس والے لال جھنڈے والوں کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔ وڈیرے ان سے ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ سرہاری کے ایک ہندو وڈیرے بھانومل' کے گوٹھ میں لال جھنڈے والے پہنچے تو وہ اتنا گھبرا گیا کہ گھوڑوں کی لگام پکڑ کر ان کو نیچے اترنے کے لیے سہارا دیا۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھا۔ اوطاق میں لے جا کر خود نیچے زمیں پر بیٹھا اور ان کو چارپائی پر بٹھایا۔ جو انھوں نے کہا' بالکل ویسا ہی کیا۔"

"لگتا ہے سندھ کے زمیں دار بہت کمزور اور بزدل ہیں۔" احسان شاہ نے جھنجلا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"سائیں' ایسی بات نہیں۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔" علی نواز نے وضاحت کی۔ "بعد میں وڈیروں نے بھی اپنی طاقت بڑھائی۔ اپنے کمداروں اور نوکروں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ پتھاریداروں اور پولیس کی مدد حاصل کی۔ سرکاری افسروں کو لمبی لمبی رشوتیں دے کر اپنے ساتھ ملایا۔ ہاریوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنے کی پوری پوری تیاری کی۔" اس نے احسان شاہ کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔

"سائیں' اس سلسلے میں تجھے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میرپور خاص میں ربوہ کے مرزا حامد کی بہت بڑی جاگیر ہے۔ اسکے ایک گوٹھ میں فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ مگر بٹائی نہ ہوئی تھی۔ گوٹھ کے سارے ہی مرد' ہاری کمیٹی کے ایک جلسے میں شرکت کرنے شہر گئے ہوئے تھے۔ قادیانوں کے مینجر نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے کمداروں اور پتھاریداروں کو لے کر گوٹھ میں پہنچا۔ ان کو حکم دیا کہ ساری فصل اٹھا کر لے جائیں۔ گوٹھ کی ایک بوڑھی عورت مائی بختاور نے ان کو فصل نہ اٹھانے دی۔ اناج کی ڈھیری پر جا کر لیٹ گئی۔ کہنے لگی آدھی سے زیادہ فصل کا ایک دانا اٹھانے نہ دوں گی۔ زمیندار کے آدمیوں نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ بندوقیں تان کر پہلے اسے دھمکی دی۔ جب وہ نہ ہٹی تو فائرنگ شروع کر دی۔ اتنی گولیاں برسائیں کہ اس کا بدن چھلنی ہو گیا۔ وہ اناج کے ڈھیری ہی پر مر گئی۔ کمداروں اور پتھاریداروں نے اس کی لاش اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور ساری فصل اٹھا کر لے گئے۔"

"ہاریوں نے بعد میں بہت شور شرابہ کیا ہو گا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"ہاں سائیں' انھوں نے بہت شور مچایا۔ جلسے کیے۔ تھانے میں رپوٹ لکھوائی۔ وزیروں اور افسروں کو درخواستیں دیں۔ لیکن کوئی کارروائی نہ ہوئی۔" علی نواز چانڈیو نے بتایا۔ "پھر تو زمیں داروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ ہاریوں کو پوری بٹائی دینی بھی بند کر دی۔ بے دخلیاں بھی شروع کر دیں۔ جو سرکش ہاری تھے ان کے خلاف فوجداری کیس بنائے اور جیلوں میں بند کروا دیا۔ مویشی اٹھوائے۔ نوجوان عورتوں کو اغوا کر لیا۔ گھروں میں آگ لگا کر ٹریکٹر چلوا دیے۔ ہاری ایسے ڈرے کہ کتنے ہی اپنے گوٹھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوسروں نے وڈیروں کے پیروں پر ٹوپیاں اور پگڑیاں ڈال دیں۔"

"زمیں داروں کو یہ کام تو پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "اصلی گل بات یہ ہے جی' کنون تو بنتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی پابندی کون زمین دار کرتا ہے۔ کنون تو پہلے بھی زمیں داروں کا چلتا تھا بعد میں بھی چلتا رہا۔ ہاری یا مزارعے جب بہت زیادہ شور شرابہ کرتے ہیں تو ان کو چپ کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کا چکر چلا دیا جاتا ہے۔"

"پنجاب میں بھی تو پہلے زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں۔" رحیم داد نے یاد دلایا۔

"اس کے بارے میں تو مجھے بھی اچھی طرح پتہ ہے۔" علی نواز نے کہا۔ "سندھی وڈیروں میں بھی اس کا بہت ذکر ہوتا تھا۔ سائیں' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ اخباروں میں اس کی خبریں روز چھپتی تھیں۔ حکومت پنجاب نے ایک انکوائری کمیٹی بنائی تھی۔ ملک فیروز خان نون اس کا چیئرمین تھا۔ اس کمیٹی کی رپوٹ پر ۱۹۵۰ء میں اور پھر ۱۹۵۲ء میں زرعی اصلاحات کی گئی تھیں۔ ان کا مقصد بے دخلیوں کو روکنا اور مزارعوں کو تحفظ دینا تھا۔" اس نے مڑ کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "سائیں' تجھے بھی یاد ہوگا۔ پنجاب اسمبلی کے جنوری ۱۹۵۳ء کے اجلاس میں بڑی گرما گرم بحث کے بعد زرعی اصلاحات کے بل پاس ہوئے تھے۔"

"تجھے تو پچھلی زرعی اصلاحات کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ بھی پتہ ہے کہ کوئی مالک اراضی' جو ایک ایکڑ سے زیادہ کا مالک ہو' ۵۰ ایکڑ نہری' ۷۵ ایکڑ نیم زرعی اور سو ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ خود کاشت کے لیے نہیں رکھ سکتا۔ پر کس نے اس کی پابندی کی۔" احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "مزارعوں کی بے دخلیاں جیسے پہلے ہوتی تھیں ویسے ہی بعد میں بھی ہوتی رہیں۔ بٹائی پر زمیں دار نہ مزارعے کو رسید دیتے ہیں نہ اس کے حصے کی پوری فصل دیتے ہیں۔ مزارعے کو بے دخل کرنا ہو تو اپنے حصے کی فصل نہیں اٹھاتے اور بٹائی نہ کرنے کے الزام میں مزارعے کے خلاف درخواست لگا دیتے ہیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہے جی کہ ان زرعی اصلاحات کا کچھ

بھی نہ بتا۔"

علی نواز نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔

احسان شاہ بولتا رہا۔ "زرعی اصلاحات کے تحت تو یہ بھی کنون میں تھا کہ کوئی مالک اراضی' مزارعے کو اس بیج کے علاوہ جو اس نے ادھار دیا ہو' زیادہ وصول کرے یا لگان کے علاوہ کوئی وصولی' خرچ' محصول یا نذرانہ وصول کرے' مزارعے کو غیر کنونی طور پر بے دخل کرے یا مکررہ خود کاشت اراضی سے زیادہ اپنے پاس رکھے اور افسر مال کو اس کی اطلاع نہ دے تو اس کے لیے ایک سال کی جیل اور جرمانے کی سزا یا دونوں ہی دی جا سکتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر علی نواز چانڈیو کو دیکھا۔ "اب تو ہی ایمان سے بتا۔ سارے ہی زمیں دار کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں' پر کون زمیں دار جیل گیا؟ کس پر جرمانہ لگا؟ کچھ بھی نہ ہوا۔ زمیں داری اسی رستے پر شان سے چل رہی ہے جس پر زرعی اصلاحات سے پہلے چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"سائیں' بات تو تیری ٹھیک ہی ہے۔ لیکن ان دنوں حالات بھی دوسرے تھے۔" علی نواز کے لہجے سے ایک بار پھر تشویش آشکارہ تھی۔ "تب تک ملک میں مارشل لاء نہیں لگا تھا۔ نہ مارشل لاء کے ضابطے تھے نہ فوجی عدالتیں تھیں۔ اب تو نہ وکیل پیش ہو سکتے ہیں نہ ضمانت ہو سکتی ہے۔ آج مقدمہ شروع ہوا کل فیصلہ ہو گیا۔ جیل بھی ہوتی ہے' جرمانہ بھی لگتا ہے اور کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں۔"

"تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔

"سائیں تیری بات دوسری ہے۔" علی نواز پریشان نظر آ رہا تھا۔ "تیرا ایک بیٹا محکمہ مال میں بڑا افسر ہے۔ بھتیجا فوج میں کرنیل ہے اور مارشل لاء میں لگا ہوا ہے۔ تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ تو فکر نہ کر۔" احسان شاہ نے ایک بار پھر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "چوہدری کو بھی میں نے اسی سلسلے میں گل بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ تجھ سے آرام سے بات ہو گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں تو یاروں کا یار ہوں۔ ہمیشہ یاروں کی مدد ہی کرتا ہوں۔ تجھے پریشان دیکھ کر ہی تو اپنے ساتھ لے آیا۔ اب تو آرام سے یہاں رہ اور اپنا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ تجھے پریشان ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔"

علی نواز نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہو کر دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی حرارت میں کمی

آگئی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی جانب اتر رہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ملازم نے چائے لا کر میز پر رکھ دی۔ تینوں چائے پینے لگے۔

علی نواز بہت تھکا ہوا تھا۔ چائے پینے کے بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

رحیم داد اور سید احسان علی شاہ ہلکی ہلکی دھوپ میں لان پر بیٹھے تھے۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری' زرعی اصلاحات سے علی نواز بہت ڈرا ہوا ہے۔ اس کے پاس اراضی بھی بہت ہے۔ ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ ہو گی۔ اور یہ اس میں سے ایک ایکڑ بھی زرعی اصلاحات کے تحت حکومت کو دینا نہیں چاہتا۔"

"یہ تو جی بہت زیادہ زمین ہوئی۔" رحیم داد نے کہا۔ "اسے تو بہت زیادہ زمین دینی بھی ہو گی۔"

"زمین کے معاملے میں تو یہ اتنا لالچی ہے کہ کمی کرنے کی بجائے اسے بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے۔ تب ہی تو اس کی دو بیٹیاں ویاہ کے بعد بھی ابھی تک گھر میں کنواری بیٹھی ہیں۔"

"ویاہ کے بعد بھی کنواری ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ "اپنی سسرال نہیں گئیں۔ ان کے گھر والے کیسے ہیں جنھوں نے ان کو اس کے پاس چھوڑ رکھا ہے؟"

"ان کا کوئی گھر والا نہیں۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"تب ان کا ویاہ کیسے ہوا؟"

"بہت عجب طرح سے ہوا۔ سنے گا تو حیران ہو گا۔" احسان شاہ بدستور بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ "پچھلے سال علی نواز مجھے کراچی سے اپنے گوٹھ لے گیا۔ ادھر بھی اس نے بہت شاندار حویلی بنا رکھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جمعے کا دن تھا۔ رات کو اس نے اپنے کچھ رشتے داروں اور شریکوں کو اکٹھا کیا۔ گوٹھ کی مسجد کا ملا بھی آیا۔"

"وہ کس لیے آیا تھا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نکاح پڑھانے آیا تھا۔"

"تب تو جنج بھی آئی ہو گی۔ اس کے ساتھ وہٹی کا گھوٹ بھی آیا ہو گا۔"

"نہ براتی آئے نہ دولہا۔ یہی تو میں تجھے بتانے جا رہا تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "لکڑی کی ایک چوکی پر رحل لا کر رکھی گئی۔ اس پر ریشمی جزدان میں بند کران مجید رکھا گیا۔ سارے مہمان چوکی کے گرد نیم دائرے میں بیٹھ گئے۔ ہر طرف اگربتیوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ کران مجید جزدان سے نکال کر اس طرح رکھا گیا کہ سب اسے دیکھ سکتے تھے۔"

"یہ سب کچھ کس لیے کیا گیا تھا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر مداخلت کی۔

"چپ کر کے سنتا جا۔" احسان شاہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "کران مجید پر پھولوں کا ہار ڈالا گیا۔ ملا نے ایک وکیل، دو گواہوں کے ہم راہ حویلی میں عورتوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی وہٹی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے اس سے اجازت لی۔ واپس آ کر ملا کو بتایا۔ ملا نے اونچی آواز سے نکاح پڑھایا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دوسروں نے بھی دعا کے لیے اپنے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ لو جی نکاح ہو گیا۔ چھوارے اور مٹھائی بانٹی گئی۔ سب نے علی نواز کو مبارک باد دی۔ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا جیسے نکاح میں ہوتا ہے۔ بعد میں علی نواز نے سب کو روٹی کھلائی۔"

"پر نکاح ہوا کس کے ساتھ؟" رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"کران مجید کے ساتھ ہوا تھا۔" احسان شاہ نے بتایا۔

"کران مجید کے ساتھ کیسے نکاح ہو سکتا ہے۔؟" رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "علی نواز نے ایسا کیوں کیا؟"

"ایسا اس لیے کیا تھا کہ کسی مرد کے ساتھ ویاہ کرتا تو بیٹی کے ساتھ اس کے حصے کی زمین اور جائیداد بھی چلی جاتی۔ علی نواز جائیداد اپنے خاندان میں رکھنا چاہتا ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر بتایا۔ "پہلے بھی ایک بیٹی کا اس نے نکاح کران مجید کے ساتھ پڑھایا تھا۔ دونوں اس کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

"پر یہ تو بہت غلط بات ہوئی۔"

"پتہ نہیں غلط ہے یا صحیح۔" احسان شاہ نے کہا۔ "یہ تو ملا ہی کو معلوم ہو گا جس نے نکاح پڑھایا تھا۔ پر مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے ادھر کے کتنے ہی زمیں دار اپنی بیٹیوں کا نہ صرف کران شریف سے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ چاند اور سورج سے نکاح پڑھا کر اپنے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ زندگی بھر کنواری ہی رہتی ہیں اور بوڑھی ہو کر مر جاتی ہیں۔"

رحیم داد کو معاً بھکر کے مراد خاں شاہانی کی بہن حمیدہ یاد آ گئی۔ مسکرا کر بولا۔ "تب تو حویلی کے نوکر چاکر عیش کرتے ہوں گے۔"

احسان علی شاہ نے اس کے طنز کا مفہوم فوراً بھانپ لیا۔ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جس کڑی کا کران سے نکاح ہو جاتا ہے، اسے بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی سے چوری چھپے یاری لگا لے تو اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ سزا کے طور پر اسے اور اس کے یار دونوں کو کاراکاری کرار دے کر کتل کر دیا جاتا ہے۔"

"پر شاہ جی، یہ تو بہت بری رسم ہوئی۔"

"سندھ میں ایسی ایک اور رسم بھی ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "مرید اپنے پیر کی خوش نودی اور برکت حاصل کرنے کے لیے منت مانتے ہیں۔ اپنی سب سے زیادہ سوہنی کڑی کو اس کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ اسے عمدہ سے عمدہ کھلاتے ہیں۔ جب وہ جوان ہو جاتی ہے تو ایک روز پیر کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اس کی دعوت کرتے ہیں۔ کڑی کا دلہنی کی طرح خوب سنگھار کرتے ہیں۔ پیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرتے ہیں کہ وہ اسے کبول کرلے۔ جب وہ راضی ہو جاتا ہے تو کڑی کو رات گئے اس کے کمرے میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہ ایک رات یا جتنی راتوں تک چاہے اسے اپنے ساتھ سلاتا ہے۔"

رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا احسان شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اسے بتاتا رہا۔ "ایسی کڑی کو بوھنی کہتے ہیں۔ پیر تو بعد میں اس کے پاس کبھی نہیں آتا، پر بوھنی بھی ایک طرح سے پیرنی بن جاتی ہے۔ اس کی اتنی عزت ہوتی ہے کہ لوگ اس کے پاس مرادیں مانگنے آتے ہیں۔ نذرانے چڑھاتے ہیں۔ اس کی خدمت کرتے ہیں۔"

"اس کا بھی ویاہ نہیں ہوتا ہو گا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں، بوھنی بننے کے بعد وہ پیر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "اگر وہ چوری چوری کسی سے یاری لگا لے اور پتہ چل جائے تو ماں پیو یا بھائی رات کو اسے گوٹھ سے باہر جنگل میں لے جاتے ہیں۔ اس کے سر کے بال کھول دیے جاتے ہیں۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے جاتے ہیں۔ اس کو زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ سر جھکا کر کسی لکڑ پر ٹکا دیا جاتا ہے۔ کلہاڑی تھام کر گردن پر ایسا بھرپور وار کیا جاتا ہے کہ سر کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔"

"جب اس کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے تو وہ شور شرابہ نہیں کرتی؟"

"سنا ہے وہ اپنا گناہ چپ کرکے مان لیتی ہے۔ سزا کے لیے بھی آسانی سے راضی ہو جاتی ہے۔ نہ شور شرابہ کرتی ہے نہ فریاد۔" احسان شاہ نے مطلع کیا۔ "خاموشی سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیتی ہے۔"

"پر شاہ جی یہ تو سیدھا سیدھا کتل ہوا۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "پولیس اس جرم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔"

"پولیس کو بھی اس رسم کا پتہ ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اور پولیس کوئی کارروائی کرے تو

کیسے۔ کتل کے فوراً ہی بعد لاش کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ اگر پولیس کو لاش مل جائے یا کتل کا پتہ چل جائے تو کوئی گواہ نہیں ملتا۔ گوٹھ یا پنڈ کے سارے ہی بندے ایسے کتل کو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بروھنی کو اپنے گناہ کی یہی سزا ملنی چاہیے۔"

"زمیں دار بھی اپنی کڑیوں کو اسی طرح پیر کے سامنے پیش کرتے ہیں؟"

"عام طور پر پیر کے ہاری مرید ہی ایسا کرتے ہیں۔" احسان شاہ نے کہا۔ "زمیں داروں کے بارے میں مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

"وہ تو جائیداد کو بچانے کے لیے صرف اپنی کڑیوں کا کران یا چاند سورج کے ساتھ نکاح کر دیتے ہیں۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔ "تیرے یار علی نواز نے بھی ایسا ہی کیا۔ ویسے شاہ جی، سچی بات یہ ہے، کوئی بھی زمیں دار یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اراضی کم ہو جائے۔"

"تب ہی تو علی نواز زرعی اصلاحات سے اتنا زیادہ پریشان ہے۔"

"پریشان تو جی، میں بھی بہت ہوں۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"تیری اراضی ہی کتنی ہے جو تو اتنا پریشان ہے۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکرا کر کہا۔

"نیچے کے حصے داروں اور چھوٹے زمیں داروں کی زمین خریدنے کے بعد میری زمین داری، لگ بھگ ۱۳۰۰ سو ایکڑ ہو جائے گی۔" رحیم داد نے بتایا۔ "دلاور والا کی زمیں دریشکوں کے ہاتھ نہ بیچ کی ہوتی تو اور زیادہ ہو جاتی۔"

"اسے بیچ کر تو نے بہت ٹھیک کام کیا۔"

"پر عظمت اللہ دریشک نے اس کا پورا معاوضہ اب تک نہیں دیا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔

"تو اس کا مطالبہ بھی نہ کرنا۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "عظمت اللہ تو اسے خرید کر خود مصیبت میں پھنس گیا۔ تجھے پتہ ہے بوہڑوں کو بے دخل کرنے کے لیے اسے کیا کیا کرنا پڑا؟"

"میں نے اس کے بارے میں سنا تو ہے پر پوری طرح معلوم نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "تو نے بھی مجھے اس کے بارے میں پہلے کب بتایا۔"

"عظمت اللہ دریشک نے اپنے ساتھ پولیس کی تکڑی پارٹی لی۔ اس کے اپنے بندے بھی تھے۔ سب ہی پوری طرح مسلح تھے۔ رات کے اندھیرے میں اچانک وہ دلاور والا پہنچا اور پنڈ کا چاروں طرف سے گھیراؤ کر کے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ بوہڑ ایسے ڈرے کہ منت سماجت کرنے لگے۔ پر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔"

"بوہڑوں نے بھی تو اس کے بندوں اور پولیس کے ساتھ پہلے کم بدمعاشی نہیں کی تھی۔" رحیم

داد نے کہا۔ "میں تو وہاں موجود ہی تھا۔ تھانیدار تنک کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ دریشک کو غصہ تو آنا ہی چاہیے تھا۔"

"اسی غصے میں اس نے پنڈ کی رڑی میں سب کو اکٹھا کیا۔ حکم دیا کہ ککڑ کی بولی بولو۔ بعد میں کھوتی کی آوازیں نکالو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ فیر اس نے سارے مردوں کو کپڑے اتار کر ناچنے کو کہا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "وہ ننگے ہو کر ناچتے رہے۔ عظمت اللہ اور تھانیدار آرام سے بیٹھے شراب پیتے رہے۔ اتنی زیادہ پی کہ بدمست ہو گئے۔ اسی حالت میں انھوں نے زنانیوں کو بھی ننگا کر کے نچوایا۔ جب سب ناچتے ناچتے تھک کر گرنے لگے تو کہا دوڑ لگاؤ۔ انھوں نے دوڑ لگائی۔ ادھر دریشک کے کرندوں نے فصلوں اور گھروں میں آگ لگوا دی۔ کتنے ہی بوڑھے اور بچے جل کر زخمی ہو گئے۔ مویشی تو نہ جانے کتنے مر گئے۔ سارا پنڈ جل کر راکھ ہو گیا۔"

"تب تو بعد میں بہت شور شرابہ ہوا ہو گا۔" رحیم داد نے کہا۔

"بہت زیادہ شور شرابہ ہوا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اخباروں میں خبریں چھپیں۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ انکوائری ہوئی۔"

"اب تو معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔" رحیم داد نے اکتے ہوئے کہا۔

"تجھے سب کچھ تو پتہ ہے۔ اس پر بھی گلہ ہے کہ زمین کا پورا معاوضہ نہیں ملا۔" احسان شاہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "چوہدری' زیادہ لالچ ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"شاہ جی' یہ بتا زرعی اصلاحات کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے استفسار کیا۔

"تو نے مارشل لاء ریگولیشن ۶۴ پڑھ لیا ہے؟"

"ہاں جی' پڑھ تو لیا ہے۔ تب ہی تو اتنا پریشان ہوں۔"

"اس میں پریشانی کی کون سی گل ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "۵ سو ایکڑ اراضی تو اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ڈیڑھ سو ایکڑ باغات کے ہو گئے۔ گھروالی کے علاوہ تیرا اور کوئی تو ہے نہیں۔ ورنہ ۱۲ ہزار پیداواری یونٹ تو اسے عطیہ کے طور پر دے سکتا ہے۔"

"پر یہ تو ۸ سو ایکڑ سے کچھ اوپر اراضی بنتی ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو اراضی بچ گئی اس کا کیا بنے گا؟"

"تین سو ایکڑ اپنے بھروسے کے مزارعوں کے نام اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی تاریخوں میں بیچ کر دے۔" احسان علی شاہ نے مشورہ دیا۔

"مزارعے بعد میں گڑبڑ کریں گے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "اللہ وسایا اور جمیلہ نے پہلے ہی ان کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

"سرکشی تو نہیں کرتے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "ویسے بیج کے ساتھ ہی ان سے ادھار کی رسید پر نشانی انگوٹھا لگوا لینا اور ادھار پر زمیں رہن رکھ لینا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اس طرح تو ایک ہاتھ سے زمیں دے کر دوسرے سے لے لے گا۔"

"پر شاہ جی، پچھلی تاریخوں میں بیج کیسے ہو گی؟" رحیم داد ہنوز پریشانی میں مبتلا تھا۔

"اس کی تو فکر نہ کر۔ پٹواری سے رجسٹر خسرہ گرداوری میں انتقالات اراضی کی پچھلی تاریخیں ڈلوا دوں گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "پٹواری اپنا بندہ ہے۔ بس اس کی مٹھی گرم کرنی ہو گی۔ اس کے بغیر تو وہ اپنے سگے پیو کے لیے بھی کچھ نہیں کرنے کا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اور دیکھ، یہ خیال رکھنا زمیں داری کے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ اس معاملے میں گھروالی پر بھی بھروسہ نہ کرنا۔"

"پر شاہ جی، سوال یہ ہے تیرے حساب سے ساری زمین تو میرے پاس نہ رہ سکے گی۔"

"کچھ نہ کچھ تو سرکار کو دینی ہی ہو گی۔" احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "یہ بتا، تیرے پاس بنجر اور بے کار کتنی زمین ہے؟"

"پہلے تو بہت تھی، پر کچھ زمین پر میں نے باغات لگوا لیے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "ڈیڑھ سو کلا سے زیادہ بنجر اور غیر آباد پڑی ہے۔"

"یہ زمین تیرے لیے تو بیکار ہی ہے نا۔ اسے سرکار کو نہری بتا کر دے دے۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "یہ مفت نہیں جائے گی۔ اس کا ایک روپے سے پانچ روپے تک حکومت معاوضہ دے گی جو وراثتی بونڈ کی صورت میں ملے گا۔ یہ رکم سٹیٹ بینک کے کھاتے میں عوامی کرض کے نام سے ڈال دی جائے گی۔ اس پر تجھے چار فی صد سالانہ سود ملتا رہے گا۔ اپنی بنجر اور غیر مزروعہ اراضی کو نہری اور زرخیز دکھائے گا تو معاوضہ بھی چنگا ملے گا۔ اسے فروخت کرتا تو ہرگز اتنی کیمت نہ ملتی۔" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "جتنا تو حکومت کو دے گا نہیں، اس سے زیادہ تجھے ملے گا۔ تو زرعی اصلاحات سے فضول میں پریشان ہے۔ اس میں تو تیرا فائدہ ہی فائدہ ہے۔"

"ایسا ہو جائے تب تو فائدہ ہی رہے گا۔" رحیم داد کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "پر میں یہ سب کچھ کروں گا کیسے؟"

"اس کی تو فکر نہ کر۔ میرا مینجر مہربان علی بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو نادر کو اس کے ساتھ لگا دینا۔"

احسان شاہ نے کہا۔ ”حکومت کو زمین داری کے بارے میں جو گوشوارے بھر کر دینے ہیں‘ مہربان اور نادر مل کر تیار کر لیں گے۔ پٹواری اور محکمہ مال کے افسروں سے مل جل کر اپنا کام نکال لیں گے۔ جو رشوت وشوت دینی ہوگی اس کے بارے میں بھی وہی طے کریں گے۔ تجھے اب اس معاملے میں سوچنے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آرام سے کوٹلہ ہرکشن جا اور اپنی نئی نویلی وہٹی کے ساتھ عیش کر۔“

”میں کل تیرے پاس فیر آجاؤں گا۔“ رحیم داد نے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو ابھی تو ادھر ہی ہے نا؟“

”نہیں‘ کل دوپہر کی روٹی کھا کر‘ میں نے علی نواز چانڈیو کے ساتھ لہور جانا ہے۔ اسے ادھر کچھ ضروری کام ہے اور مجھے اس کا وہ کام کروانا ہے۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”پر میں ہفتہ بھر بعد واپس آجاؤں گا۔ گوشوارے بھرنے کا کام اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔ تجھے بھی بلوالوں گا۔“

سورج مغربی افق پر پہنچ چکا تھا۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جھلملا رہی تھی۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

رحیم داد آگے بڑھا۔ احسان شاہ اس کے ساتھ ساتھ حویلی کے باہر گیا۔ گلے لگا کر گرم جوشی سے رحیم داد کو رخصت کیا۔ رحیم داد نے احسان شاہ کی ہدایت پر نادر خان کو مہربان علی سے گوشواروں کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ رحیم داد اپنی جیپ میں بیٹھا اور کوٹلہ ہرکشن کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆

اپریل کا آخری ہفتہ تھا۔ موسم بدل چکا تھا‘ گرمی شروع ہو گئی تھی۔ ربیع کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گندم اور جو کے پودے سورج کی تمازت سے پک کر سنہری ہو گئے تھے۔ ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ہوتیں۔ سٹیوں کی سی ہلکی ہلکی جھنکار گونجتی۔ فروری اور مارچ کے اوائل میں بارش بھی ہوئی تھی۔ کھیتوں کو سیراب ہونے کے لیے خوب پانی ملا تھا۔ لہٰذا اس دفعہ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ گندم کے پودے‘ خوشوں سے لدے ہوئے تھے۔

زمیں دار اور مزارعے اپنی فصلوں کو دیکھتے تو خوشی سے ان کے چہرے دمکنے لگتے۔ شاداں بھی بہت خوش و خرم تھی۔ اب وہ بڑی زمیں دارنی بن چکی تھی۔ شاندار حویلی میں رہتی تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی۔ عمدہ سے عمدہ لباس پہنتی تھی۔ خدمت کے لیے ہر وقت نوکرانیاں آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ گاؤں کا ہر فرد اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔

اس کی چال ڈھال میں تمکنت آگئی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور سلیقہ آگیا تھا۔ مزارعوں اور کمیوں کی عورتوں سے بات کرتی تو اس کے انداز میں طنطنہ اور رعب داب ہوتا۔ اس کا کسا ہوا مضبوط جسم حالانکہ اب کسی قدر پھیل گیا تھا مگر اس میں بھدا پن نہ تھا۔ اس کی شخصیت اور نکھر گئی تھی۔ رنگ خاصا اجلا ہو گیا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھلتے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس قدر عیش و آرام ملا تھا کہ وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی۔ خوشی اور مسرت میں مگن رہتی۔

رحیم داد اس کا ہر طرح خیال رکھتا۔ ناز برداری کرتا۔ اسے خوش دیکھ کر خود بھی مسرور ہوتا۔ وہ نکھر کر جتنی خوبصورت اور طرح دار ہوتی جا رہی تھی رحیم داد اس پر اتنا ہی زیادہ فریفتہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر نہر کے کنارے اکثر شام کو سیر کرانے لے جاتا۔ کئی بار کپڑے اور زیورات کی خریداری کے لیے اسے شہر بھی لے گیا۔ خریداری کے ساتھ ساتھ دونوں نے سینما میں ساتھ بیٹھ کر تین چار بار فلمیں بھی دیکھیں۔ اس کی اسی دل داری اور دل جوئی نے شاداں کو بھی رحیم داد کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے دکھ بھرے ماضی کی تلخ یادیں بھولتی جا رہی تھی۔

شاداں کسی سے بدکتی یا بھڑکتی تھی تو وہ ادھیڑ عمر نادر خان کی جوان بیوی، جنت تھی۔ اس نے اب تک شاداں کی اہمیت اور مرتبے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ہر معاملے میں ہم سری بلکہ خود کو اونچا اور زیادہ اہم ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔ شاداں کو ذرا خاطر میں نہ لاتی۔ وہ موجود بھی ہوتی تو جنت نوکر چاکروں پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہی زمیں دارنی اور حویلی کی مالک و مختار ہے۔

جنت کئی بچوں کی ماں تھی، مگر ہر وقت بنی ٹھنی رہتی تھی۔ لباس بھی شوخ اور بھڑکیلا پہنتی تھی۔ اس کا رنگ خوب کھلتا ہوا اور گورا تھا جو شاداں کو شاق گزرتا تھا۔ جنت کبھی رحیم داد کے سامنے آتی تو اٹھلا اٹھلا کر بات کرتی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے مسکراتی۔ اس کے ہر انداز میں عشوہ ہوتا، لگاوٹ ہوتی۔ شاداں اس کی یہ ادائیں اور غمزے دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی۔

شاداں کو اس کی ایک اور حرکت بھی سخت ناگوار گزرتی۔ وہ رحیم داد کے پاس آتی تو ہمیشہ اپنے اکلوتے بیٹے شاکر کو ساتھ لاتی اور نہایت بے تکلفی سے رحیم داد کی گود میں دے دیتی۔ رحیم داد بھی بچے کے ساتھ شفقت سے پیش آتا۔ اسے زانو پر بٹھاتا۔ محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتا۔ زیادہ خوش ہوتا تو اس کے رخسار چوم لیتا۔ اسے ہنسانے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں کرتا۔

ایک شام ایسا ہوا کہ جنت کا بیٹا باغیچے میں رحیم داد کی گود میں بیٹھا تھا۔ رحیم داد پیار سے اس

کے سر کے بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنت بھی خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے مسکراتے اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "زمیں دار' شاکر تیرے پاس آکر ایسا خوش ہوتا ہے جیسے تیرا اپنا پتر ہو۔" شاداں نے چونک کر پہلے جنت کو مشتبہ نظروں سے دیکھا پھر شاکر کو۔ اسے گول مٹول' گورے چٹے شاکر میں رحیم داد کی شباہت صاف جھلکتی نظر آئی۔

اس وقت تو وہ خاموش رہی' مگر شبہ اس کے دل میں گھر کر گیا۔ رات کو اس نے رحیم داد سے اپنے شبے کا اظہار بھی کر دیا۔ "چوہدری' آج جنت نے اپنے شاکر کے بارے میں یہ کیوں کہا وہ تیرا پتر لگتا ہے؟"

"اس نے ایسے ہی کہہ دیا ہو گا۔" رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ اس نے شاداں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تجھے' اس پر پیار نہیں آتا؟"

رحیم داد نے بات اس ڈھب سے کی کہ شاداں لاجواب ہو گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی۔ "پر جنت مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "خصم کو دیکھو تو کتنا بوڑھا لگتا ہے اور وہ ایسی چٹک مٹک کرتی ہے جیسے الھڑ مٹیار ہو۔" شاداں کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیل گئی۔

مگر رحیم داد پر سکون رہا۔ بے نیازی سے بولا۔ "وہ جانے اور اس کا خصم۔ تجھے اس سے کیا لینا؟"

"پر وہ تیرے سامنے ایسے نخرے کیوں دکھاتی ہے؟ ذرا بھی تو اسے شرم نہیں آتی۔" شاداں نے کھل کر اپنے شبے کا اظہار کیا۔ "تو نے اس سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟"

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" رحیم داد ایک دم بھڑک اٹھا۔ "کوئی اور گل بات کر۔ بیکار کی گلاں نہ کر۔" وہ بے زاری سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "اپنی طبیعت آج کل ویسے ہی پریشان رہتی ہے۔ تجھے یاری آشنائی نظر آ رہی ہے۔"

رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ اس طرح ڈپٹ کر بات کی کہ شاداں نرم پڑ گئی۔ اس نے بات آگے نہ بڑھائی۔ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "میں بھی دیکھ رہی ہوں تو ادھر کچھ عرصے سے پریشان پریشان دکھائی پڑتا ہے۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتا۔ اکیلا بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔" شاداں نے ہمدردی کے ساتھ ساتھ گلہ بھی کیا۔ "تجھے پریشانی ہے کچھ بتاتا بھی تو نہیں۔" اس نے اصرار کیا۔ "بول تو آج کل پریشان اور کھویا کھویا کیوں رہتا ہے؟"

رحیم داد ان دنوں واقعی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ لیکن اصرار کے باوجود اس نے شاداں کو اپنی

پریشانی سے آگاہ نہ کیا۔ بات کو صاف ٹال گیا۔ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”فصل تیار کھڑی ہے، پر کٹائی کے لیے ابھی تک لاوے ہی نہیں ملے۔ نادر خان ان کی تلاش میں دن رات بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔“ اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ ”ویسے جب سے گرمی بڑھی ہے، طبیعت گڑبڑ ہی رہتی ہے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی رہتا ہے۔“

”کسی ڈاکٹر یا حکیم کو دکھا کر دوائی لے لے۔“ شاداں نے دل جوئی کی۔ ”ایسے کس طرح کام چلے گا؟“

رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”تو کہتی ہے تو دوائی بھی لے لوں گا۔“ اس نے بات کا رخ بالکل موڑ دیا۔ شاداں کو اپنی اصل پریشانی کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔ بتانا بھی چاہتا تو اسے مطلق نہ بتا سکتا تھا۔ اس کی پریشانی اور ذہنی الجھن کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتا سکتا تھا۔

☆

رحیم داد کی پریشانی ایسا سربستہ راز تھی جو صرف اور صرف اس کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس راز میں کسی کو شریک کرنے کا مطلب سراسر خطرہ مول لینا تھا۔ خطرہ ایسا ویسا بھی نہ تھا۔ اس میں جیل جانے سے کہیں زیادہ پھانسی پر لٹک جانے کا واضح امکان تھا۔ رحیم داد کی اس پریشانی کا سبب یہ تھا کہ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ محکمہ بحالیات کے تفتیشی شعبے نے سینکڑوں ایسے جعلی کلیموں کا سراغ لگایا ہے جن کے ذریعے لگ بھگ بارہ کروڑ روپے مالیت کی متروکہ زرعی اراضی اور صنعتی اداروں پر ناجائز طریقے سے قبضہ کر لیا گیا تھا۔ ایک سرکاری اعلامیہ کے مطابق صرف صوبہ سندھ میں ڈیڑھ کروڑ کی متروکہ زرعی املاک سالہا سال سے غیر مستحق افراد کے قبضے میں تھیں۔ ایسی دھاندلی اور ہیرا پھیری کے معاملے میں پنجاب کی صورت حال کم تشویش ناک نہ تھی۔

محکمہ بحالیات کا تفتیشی شعبہ ان دنوں بہت مستعد تھا۔ اپنی کارگزاری دکھانے کی غرض سے نہایت سرگرمی سے متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کے بارے میں چھان بین کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت کی جانب سے یہ اعلان بھی کیا جا چکا تھا کہ متروکہ جائیداد پر غیر قانونی قبضہ کرنے والے مجرموں کو مارشل لا کے تحت سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ان میں جرمانہ، قید با مشقت اور کوڑوں کی سزا شامل تھی۔

تفتیش اور تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ اسی اثناء میں حکومت نے ایک نیا قانون نافذ کیا۔

اسے "پاکستان میں متروکہ جائیداد کی تنظیم کا قانون" کہا گیا۔ اس نئے قانون کے ذریعے ۱۹۵۷ء کے متروکہ جائیداد کی تنظیم کے ایکٹ (۷) میں نہ صرف اہم ترمیمات کی گئیں بلکہ اس کے تحت متروکہ جائیداد کی تحقیق اور جانچ پڑتال کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل بھی قائم کیا گیا۔ اس ٹریبونل کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہائی کورٹ کے ایک جج کو بھی رکن کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔

رحیم داد ہر روز پابندی سے اخبار پڑھتا تھا۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات اور حکومت کے نت نئے اقدامات کی خبریں پڑھ پڑھ کر اس کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ خطرہ سر پر منڈلاتا نظر آتا۔ اپریل اسی پریشانی اور طرح طرح کے خدشات میں گزر گیا۔

مئی کا مہینہ شروع ہوا۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ چلچلاتی دھوپ میں جسم پگھلتا ہوا محسوس ہوتا۔ نادر خان نے فصل کی کٹائی کے لیے لاووں کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے گاؤں کے باہر میدان میں درختوں تلے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ رحیم داد بھی اس کی دیکھ بھال میں سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ وہ سویرے ہی سویرے کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور دوپہر کو واپس آتا۔

اس روز بھی رحیم داد کھیتوں سے تھکا ہارا حویلی میں واپس آیا۔ گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ چہرہ اور لباس خاک دھول سے آلود تھا۔ اس نے غسل کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ اپنے کمرے میں گیا' میز پر اخبار رکھا تھا۔ اس نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔

ان دنوں اخبارات کے نامہ نگار اور کالم نویس بہت سرگرم تھے۔ متروکہ جائیداد کی دھاندلیوں کے بارے میں خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا جا رہا تھا۔ صفحہ اول پر ایک ایسی دو کالمی خبر تھی جس کی سرخی پر رحیم داد کی نظر ٹھٹک گئی۔ یہ محمد یار کھنڈ' ایڈیشنل کمشنر بحالیات کا ایک انٹرویو تھا۔ انھوں نے کچھ ہی عرصہ قبل بھاول پور ڈویژن کا دورہ مکمل کیا تھا۔

محمد یار کھنڈ نے اپنے اس انٹرویو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ضلع بھاول نگر کی تحصیل منچن آباد میں زرعی اراضی کے سلسلے میں ایسے پچاس کلیم ان کے معائنہ میں آئے جو مشتبہ اور جعلی تھے۔ انھوں نے ایسے کلیم فارموں کو مفصل تحقیقات کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ یار کھنڈ نے موقعے پر جو ابتدائی تحقیقات کی تھی' اس سے یہ عقدہ کھلا کہ منچن آباد میں بیشتر متروکہ اراضی کا الاٹمنٹ جعلی کلیموں کے ذریعے حاصل کیا گیا تھا۔

محمد یار کھنڈ نے ضلع منٹگمری کا بھی دورہ کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ تحصیل پاک پتن میں درجن بھر

سے زیادہ جعل سازی اور دھوکہ دھی کی واردات کا سراغ ملا ہے جن میں جعلی کلیموں اور بوگس کلیم فارموں کی بنیاد پر متروکہ جائیداد الاٹ کرائی گئی تھی۔ ان کلیم فارموں کو سینٹرل ریکارڈ آفس لاہور، اور تحصیل کے دفاتر میں جعل سازی کے ذریعے تیار کیا گیا تھا۔ انھوں نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ ایک دعویدار کو اصل ریکارڈ کے مطابق ۱۷۶ کنال متروکہ اراضی الاٹ ہونا چاہیے تھی، مگر اسے ۲۲۴۳ کنال زمین ناجائز طور پر الاٹ کر دی گئی۔

محمد یار کھنڈ نے زور دے کر کہا تھا کہ جعلی دستاویز بنانے والوں اور محکمہ بحالیات کے حکام کو دھوکا دے کر غیر قانونی طور پر متروکہ املاک الاٹ کرانے والوں کے خلاف مفصل تحقیقات کی جا رہی ہے۔ ایسے دعویداروں کے خلاف جنھوں نے جعلی کلیم فارموں کے ذریعے متروکہ جائیداد اپنے نام الاٹ کرا رکھی ہے، سخت کارروائی کی جائے گی۔ ان کی تمام ایسی جائیداد نہ صرف بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی، بلکہ مارشل لا کے مختلف قوانین اور ضابطوں کے تحت عبرت ناک سزائیں بھی دی جائیں گے تاکہ متروکہ جائیداد کے سلسلے میں ہونے والی ہر طرح کی بدعنوانی اور جعل سازی کا مکمل طور پر سدباب ہو جائے۔

رحیم داد نے یہ خبر پڑھی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس قدر ہراساں ہوا کہ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکا۔ شاداں نے اصرار بھی کیا۔ مگر سر میں درد ہونے کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ اس کے بشرے سے پریشانی عیاں تھی۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلاتے تھے۔ اس نے ذہنی انتشار پر قابو پانے کے لیے پانی کے کئی گلاس پیے اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

شاداں سرہانے بیٹھ کر محبت سے اس کا سر دبانے لگی۔ رحیم داد نے منع بھی کیا، مگر وہ باز نہ آئی ہولے ہولے اس کا سر دباتی رہی۔ رحیم داد کو اس کی انگلیوں کے لمس سے کسی قدر سکون بھی ملا۔ مگر بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد نے غسل کیا۔ لباس بھی تبدیل کیا اور باغیچے میں جا کر بیٹھ گیا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ گرمی کا زور کسی قدر ٹوٹ چکا تھا۔ ہوا میں فرحت اور تازگی تھی۔ لیکن رحیم داد ہنوز مضمحل اور گم صم تھا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ نہ وہ مہاجر تھا اور نہ چودھری نور الٰہی جس کے کلیم کی دستاویزات پر جعلی دستخط ثبت کر کے اس نے کوٹلہ ہرکشن کی متروکہ اراضی اور حویلی کا الاٹمنٹ حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ علاقے کا ایک بڑا زمیندار سمجھا جاتا تھا۔

وہ اسی خوف اور پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ نوکر نے آکر احسان علی شاہ کی آمد کی اطلاع دی۔ رحیم داد نے شاداں کو اشارہ کیا۔ وہ باغیچے سے اٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ کے پاس پہنچا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باغیچے میں واپس آگیا۔ دونوں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر دریافت کیا۔ "چوہدری' خیریت تو ہے؟ تو کچھ پریشان سا نظر آرہا ہے۔" اس نے لہجے میں بے تکلفی پیدا کی۔ "تو زرعی اصلاحات سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ معرکہ تو گزر گیا۔ تیرے گوشوارے داخل ہو گئے۔ ان پر کوئی اعتراض شتراض بھی نہیں ہوا۔ زمین بھی تو نے صرف ۷۵ ایکڑ حکومت کے حوالے کی۔ سارا کام تیری مرضی کے مطابق ہو گیا اور بالکل ٹھیک ٹھاک طور پر ہو گیا۔"

"مجھے جی اس میں کیا کرنا تھا۔ جیسے تو نے ہدایت دی' مہربان اور نادر نے ویسے ہی گوشوارے بھر دیے۔ جتنی زمین انھوں نے چھوڑی وہی میں نے حکومت کو دے دی۔"

"صرف تو نے ہی نہیں' سارے وڈے زمیں داروں نے ایسا ہی کیا۔" احسان شاہ نے مطلع کیا۔ "زرعی اصلاحات کے تحت زمین داروں کو جو رعایت دی گئی تھی' اس سے تو انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ مویشی فارموں' شکار گاہوں اور چراگاہوں کی کوئی حد نہیں رکھی گئی۔ ہر ایک نے اپنی مرضی چلائی اور حکومت نے تسلیم بھی کر لی۔ رحیم یار خان کے ایک جگیر دار نے جو شکار گاہ دکھائی ہے' وہ ایک لاکھ ایکڑ سے بھی اوپر زمین پر پھیلی ہے۔ اسی طرح کتنے ہی وڈے زمیں داروں نے ایسی چراگاہیں تیار کی ہیں' اور ایسے مویشی خانے بتائے ہیں جو ہزاروں ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سچ پوچھ تو یہ ساری ہی زیر کاشت اراضی ہے اور بہت زرخیز ہے۔ نہ بنجر ہے نہ کلر۔ بنجر اور کلر تو حکومت کے حوالے کر دی اور اس کا ری اور زرخیز زمین کے مول معاوضہ وصول کریں گے۔"

"حد ہو گئی جی۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"کئی وڈے زمین دار اور جگیر دار تو اپنی پرانی اور بیکار زمین سے پہلے ہی تنگ آچکے تھے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "تب بھی ۳ کروڑ ۹۳ لاکھ اراضی میں سے کل تین لاکھ ایکڑ زمیں داروں نے حکومت کو دی۔ میرا پتر یہی بتاتا تھا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "اس اراضی کو بھی زمیں دار جب چاہیں گے واپس لے لیں گے۔ میں نے تجھے کہا تھا نا کہ ایسی زرعی اصلاحات

سے کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ پہلے بھی زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں۔ ان کا جو نتیجہ نکلا وہ کسے نہیں معلوم۔ جنرل ایوب خان زمین دار نہیں ہے۔ اس لیے اسے زمین داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جب وہ خود وڈا زمیں دار بن جائے گا تب اسے سب پتہ چل جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "تو دیکھ لینا وہ جلد ہی وڈا زمیں دار بن جائے گا اور یہ کام اس کا یار جنرل برکی کرے گا۔ اسے تو دیوانگی کی حد تک زمین حاصل کرنے کا مرض ہے۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ گم صم بیٹھا رہا۔

احسان شاہ نے کہا۔ "چوہدری' تو چپ کر کے کیوں بیٹھا ہے؟" اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو مجھے پریشان لگتا ہے۔ بتانا' پریشانی کیا ہے؟"

رحیم داد تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اپنی پریشانی احسان شاہ کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ مگر اسے شاداں کی طرح ٹال بھی نہ سکتا تھا۔ وہ اس کا ہمدرد تھا اور ہر آڑے وقت میں کام بھی آتا تھا۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ "متروکہ اراضی کے بارے میں آج کل جو خبریں چھپ رہی ہیں' تو نے وہ تو پڑھ ہی رکھی ہوں گی۔"

"ضرور پڑھ رکھی ہیں۔ پر تجھے ان سے کیا لینا۔" اس نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا۔ رسان سے پوچھا۔ "تیرے کلیم مین کوئی گڑبڑ شڑبڑ تو نہیں؟"

رحیم داد نے اسے صحیح صورت حال سے تو آگاہ نہیں کیا' صرف اتنا بتایا۔ "وہ ایسا ہے جی' میرے کلیم کی دستاویزوں پر دستخطوں میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ ان دنوں اللہ وسایا زندہ تھا۔ اس نے اور اس کے وکیل رندھاوا نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کرا دیا تھا۔" وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ مڑکر احسان شاہ کو دیکھا۔ "اس کے بارے میں تو تجھے بھی پتہ ہو گا۔"

"کچھ یاد تو پڑتا ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "پر وہ تو بہت پرانی بات ہو گئی۔ اب تو اس کے بارے میں کیوں اتنا پریشان ہے؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے جی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹوں کی آج کل دوبارہ جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ روز ہی اخباروں میں ان کے بارے میں طرح طرح کی خبریں چھپ رہی ہیں۔ کسی افسر نے دستخطوں کا معاملہ فیر اٹھا دیا تو خاما خا کا چکر شروع ہو جائے گا۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "مارشل لا کا زمانہ ہے۔ ڈرتا ہوں اس چکر میں کہیں میری الاٹمنٹ منسوخ نہ ہو جائے۔"

"اس طرح الاٹمنٹ منسوخ نہیں ہوتی۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "یہ دستخطوں کا

بھی عجب چکر ہے۔ وکت کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت بدلتے ہی رہتے ہیں۔ مارشل لا لگنے سے کچھ ہی دنوں پہلے کا ذکر ہے۔ نواب مشتاک احمد گورمانی کے ساتھ ایسا ہی چکر چلا۔"

"وہ کیا تھا جی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تجھے پتہ ہے سیاست دانوں میں تو ایک دوسرے سے لگتی ہی رہتی ہے۔ کبھی یاری دوستی ہے تو کبھی مخالفت میں بیان بازی ہوتی ہے۔ گرانے کے لیے سازشیں ہوتی ہیں۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "کراچی کے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے' جس کا اخبار چلتا چلاتا نہیں تھا' حکومت سے اشتہارات اور کچھ روپیہ اینٹھنے کے لیے فیروز خان نون کے اشارے پر گورمانی کے خلاف چکر چلایا۔ فیروز خان نون تب وزیر اعظم ہوتا تھا۔ صدر اسکندر مرزا کی حمایت سے وزیر اعظم لگا تھا۔ ان دنوں اسکندر مرزا کی گورمانی سے سخت لگتی تھی۔"

"گورمانی کے خلاف اخبار نے کیا چکر چلایا تھا؟" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"اس میں گورمانی کا ایک خط چھپا تھا جو ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کے نام تھا۔ جب یہ خط لکھا گیا تب گورمانی ریاست بھاول پور کا وزیر اعظم ہوتا تھا۔" احسان شاہ نے تفصیل بتائی۔ "پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ گورمانی نے سردار پٹیل کو اپنے خط میں لکھا تھا۔ اگر اس کو ہندوستان کی حکومت میں وزیر لگا دیا جائے تو وہ ریاست بھاول پور اپنی کوششوں سے ہندوستان میں شامل کرا دے گا۔ سردار پٹیل نے اس کی شرط مان لی۔ گورمانی کو اس سلسلے میں خط بھی لکھا۔"

"پر ریاست بھاول پور تو ہندوستان میں شامل نہیں ہوئی۔ پاکستان ہی میں رہی۔" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"گورمانی بہت ہشیار بندہ ہے۔ اسے تو دراصل سردار پٹیل کے خط کی ضرورت تھی۔ خط اس کے ہاتھ آیا تو اسے لے کر وزیر اعظم لیاکت علی خان کے پاس پہنچا۔ سردار پٹیل کا اسے خط دکھایا۔ سنا ہے وہ سخت پریشان ہوا۔ نواب گورمانی نے جو شرط سردار پٹیل کو پیش کی تھی وہی اسے پیش کی۔" احسان شاہ اطمینان سے بولتا رہا۔ "لیاکت علی خان نے اس کی شرط مان لی۔ اپنی کابینہ میں وزیر لگا دیا۔ اس طرح ریاست بھاول پور' ہندوستان میں نہ جا سکی۔ پاکستان میں شامل ہو گئی۔"

"پر اس میں دستخطوں کا کیا چکر تھا؟"

"اخبار میں خط چھپا تو گورمانی کی بہت بدنامی ہوئی۔ سچ پوچھ تو اسے چھاپا ہی اسی لیے گیا تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "گورمانی نے جھٹ ایک بیان کے ذریعے اس کی تردید کی۔ خط کو جعلی بتایا۔ ساتھ ہی اخبار کے خلاف عدالت میں ہتک عزت کا مکدمہ دائر کر دیا۔ اخبار سے

مطالبہ کیا کہ وہ اس کی تردید کرے اور معافی مانگے۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔
"اخبار نے معافی نہ مانگی۔ ادھر ملک فیروز خان نے بھی اخبار کی حمایت میں بیان دے دیا۔"
"گورمانی نے تب کیا کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔
"وہ بھی کمزور نہیں تھا۔ وزیر اعظم کی کھلم کھلا اور صدر اسکندر مرزا کی درپردہ حمایت کے باوجود ڈٹا رہا۔ عدالت کو بتایا کہ اس نے سردار پٹیل کو کبھی ایسا خط لکھا ہی نہیں۔ خط پر اس کے جعلی دستخط بنائے گئے ہیں۔" احسان شاہ نے کہا۔ "اس مرحلے پر عدالت نے دستخطوں کی جانچ پڑتال کرنے والے ایکسپرٹ کو بلایا۔ اس نے دستخط کا ٹھیک طرح معائنہ کرنے کے بعد عدالت کو بتایا کہ خط پر جو دستخط ہیں وہ نواب گورمانی کے نہیں ہیں۔"
"عدالت نے کیا فیصلہ دیا؟"
"عدالت نے جعلی خط چھاپنے کے جرم میں اخبار کے ایڈیٹر کو جیل میں بند کر دیا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ایڈیٹر کو جیل بھی کاٹنی پڑی اور عدالت کے حکم پر تین روز تک اپنے اخبار کے پہلے صفحے پر معافی نامہ بھی چھاپنا پڑا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "فیروز خان نون کی بھی بہت بدنامی ہوئی۔ خیال تو یہ تھا کہ اتنی بدنامی کی بعد وہ حکومت سے استعفیٰ دے دے گا۔ انگلستان کا وزیر اعظم ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ پر فیروز خان جما رہا۔ چپ کر کے بیٹھ گیا۔"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دستخط گورمانی کے تھے ہی نہیں۔ جعلی بنائے گئے تھے۔" رحیم داد کے دل کا چور بول اٹھا۔
"اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔" احسان شاہ نے وضاحت کی۔ "خط بالکل جعلی ہوتا تو فیروز خان نون اس کی حمایت نہ کرتا۔ وہ بھی کم ہشیار نہیں ہے۔ اس نے بھی خط چھپوانے سے پہلے اطمینان کر لیا ہوگا۔ ویسے وہ خط تو بھوپال کا ایک حکیم دلبر حسین لایا تھا۔ پر سنا ہے وہ اسے ہندوستانی افسروں سے مل ملا کر سرکاری فائلوں میں سے کسی نہ کسی طرح اڑا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ خط کے بارے میں ہندوستانی حکومت کی جانب سے بھی کوئی تردید نہیں کی گئی۔"
"تب تو خط جعلی نہ تھا۔ نواب گورمانی نے سردار پٹیل کو ایسا خط لکھا ہوگا۔"
"مجھے ایک وڈے سرکاری افسر نے کراچی میں بتایا تھا کہ گورمانی نے ایسا خط لکھا تو تھا۔ پر وہ بہت ہی زیادہ ہشیار بندہ ہے۔ اسے پتہ تھا کہ آگے چل کر یہ راز کبھی نہ کبھی ضرور کھلے گا۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "سنا ہے اس نے یہ کیا کہ خط پر اپنے ہاتھ سے دستخط نہ کیے۔ اپنے بھروسے

کے کسی بندے سے ایسے دستخط کروائے جو اس کے دستخط سے بالکل ملتے جلتے تھے۔"

"یہ تو جی اس نے زبردست چکر چلایا۔" رحیم داد بے ساختہ ہنس پڑا۔

"پتہ نہیں کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔ پر اتنا ضرور ہے کہ نواب گورمانی زبردست سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ہشیار بھی بہت ہے۔ جب اس کے خلاف یہ معاملہ چل رہا تھا تو اس کی ہوشیاری کے بارے میں ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار "ٹائمز آف انڈیا" نے بھی ایک دلچسپ خبر چھاپی تھی۔"

"وہ کیا تھی جی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"خبر میں لکھا تھا کہ گورمانی نے اونٹوں کی دموں کے ذریعے لاکھوں روپے بنائے تھے۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اونٹوں کی دموں سے کیسے لاکھوں روپے بن سکتے ہیں؟"

"اخبار نے بتایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں گورمانی وڈا سرکاری افسر لگا ہوا تھا۔ فوجی سازوسامان کی جو سپلائی بھاول پور اور جیسلمیر کے ریگستانی رستے سے ہوتی تھی وہ اونٹوں کے ذریعے ہوتی تھی اور گورمانی کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ رستے میں اکثر اونٹ مرجاتے تو حکومت اس کا معاوضہ ادا کرتی تھی۔ پر جتنے اونٹ ہوتے نہیں تھے، اس سے کہیں زیادہ کا معاوضہ وصول کیا جاتا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "پر یہ بات زیادہ دن چھپی نہ رہ سکی۔ حکومت کو پتہ چلا تو اس بدعنوانی کی روک تھام کے لیے یہ حکم جاری کیا گیا کہ جتنے اونٹ رستے میں مرجائیں، ان کا معاوضہ وصول کرنے کے لیے ساتھ میں مرے ہوئے اونٹ کی دم بھی کاٹ کر بھیجی جائے ورنہ پے منٹ نہیں ہوگا۔"

"ایسا کیا بھی گیا کہ نہیں؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"کیوں نہیں کیا گیا؟ سرکاری حکم جو تھا۔" احسان شاہ نے کہا۔ "مرنے والے اونٹوں کا معاوضہ لینے کے لیے دمیں کاٹ کر بھیج دی جاتیں۔"

"تب تو بدعنوانی بالکل بند ہو جانی چاہیے تھی۔"

"ہرگز بند نہیں ہوئی۔ بدعنوانی کرنے والے تو ہر روک تھام کا توڑ بھی نکال لیتے ہیں۔" احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ہوتا یہ تھا کہ جو دمیں بھیجی جاتیں ان کو مال خانے میں رکھ دیا جاتا۔ بعد میں مال خانے کے انچارج کو رشوت دے کر چوری چوری دمیں واپس لے لی جاتیں۔ ان کو نئے مرنے والے اونٹوں کی دموں کے ساتھ دوبارہ بھیج دیا جاتا۔ سب ہی مل کر کھاتے تھے۔

اس طرح لاکھوں روپے کی ہیرا پھیری ہوتی رہی۔ پر اس کا بھی پتہ چل گیا۔ ایک روز تو چلنا ہی تھا۔ لڑائی کا زمانہ تھا' بدنامی کے ڈر سے دبا دیا گیا۔ یہ اونٹوں کی دموں کے سکینڈل کے نام سے مشہور ہوا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں پوچھا۔

"ویسے میں نے وہ اخبار تو دیکھا نہیں پر سننے میں یہی آیا ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "ویسے یہ تو تجھے بھی ماننا پڑے گا کہ نواب گورمانی بہت ہشیار بندہ ہے۔ ہشیار نہ ہوتا تو مرکزی حکومت میں وزیر کیسے لگتا۔ مغربی پاکستان کا گورنر کیسے بنتا۔ سیاسی جوڑ توڑ کا تو وہ ماہر ہے۔ جواب نہیں اس کا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گورمانی زبردست سیاست داں رہا ہے۔" رحیم داد نے سید احسان علی شاہ کی تائید کی۔ "وہ تو جی ہر حکومت میں ہوتا تھا۔"

"سچی گل تو ایسہ ہے چوہدری' صرف نواب گورمانی ہی نہیں چوہدری محمد علی' غلام محمد' اسکندر مرزا سب ہی بہت ہشیار بندے ہیں۔ ورنہ سرکاری افسری کرتے کرتے کیسے وزیر اعظم' گورنر جنرل' اور صدر بن گئے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ذرا سوچ تو چوہدری محمد علی' غلام محمد اور اسکندر مرزا نے پاکستان بنانے کے لیے کیا کیا تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں پاکستان بنانے کے لیے انھوں نے مسلم لیگ کو الیکشن میں ووٹ بھی دیا تھا کہ نہیں۔"

"پر وہ اتنے وڈے وڈے حاکم کیسے بن گئے؟"

"میں نے بتایا نا۔ وہ بہت ہشیار بندے ہیں۔ انھوں نے انگریز افسروں کی ماتحتی میں کام کیا ہے۔" اس نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "انگریز افسروں کی کیا بات تھی۔ وہ حکومت چلانا جانتے تھے۔ انگریز افسروں سے ہی انھوں نے بھی حکومت چلانی سیکھی اور یہ بھی سیکھا کہ حکومت کیسے حاصل کی جاتی ہے۔"

رحیم داد دلچسپی اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ احسان شاہ مسکرا مسکرا کر بتاتا رہا۔ "تجھے پتہ ہے' چوہدری محمد علی کیسے سیاست میں آیا۔ ہوا یہ کہ جب لیاقت علی خان کا پنڈی میں کتل ہوا تو اس رات کو چوہدری محمد علی نے سارے وزیروں کو اپنی کوٹھی پر اکٹھا کیا۔ تب وہ حکومت میں سیکرٹری جنرل ہوتا تھا۔ اس نے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم بنایا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل لگایا۔ گورمانی کو وزیر داخلہ بنایا۔ اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کو گورنر بنا کر صوبہ سرحد میں پھینکا اور خود وزیر خزانہ بن گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نہ وہ مسلم لیگ کا لیڈر تھا اور نہ دستور ساز اسمبلی کا ممبر تھا۔ ایسا چکر چلایا کہ کسی کو مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

"اسکندر مرزا تب کیا ہوتا تھا؟"

"وہ وزارت دفاع کا سیکریٹری ہوتا تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ پولیٹیکل ایجنٹ رہ چکا تھا۔ طرح طرح کی رشوت دے کر کبائلی سرداروں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا۔ جو سردار سرکشی کرتا اس کے خلاف دوسروں کو لگا دیتا۔ وہ آپس میں لڑتے تو ان میں صلح صفائی بھی وہی کراتا تھا۔ چوہدری محمد علی' سرکاری افسر سے وزیر بنا تو سکندر مرزا کو بھی وزیر بننے کی سوجھی اور وزیر بن بھی گیا۔ اتنا آگے بڑھا کہ محمد علی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کبھی کسی پارٹی میں نہ رہا۔ ہمیشہ سیاست سے باہر رہا اور سیاست لڑاتا بھی رہا۔ ایسی زبردست سیاست لڑاتا تھا کہ سارے ہی سیاست داں اس کی مٹھی میں رہتے تھے۔ جسے چاہا اوپر چڑھا دیا جسے چاہا گرا دیا۔"

"پر جنرل ایوب خان تو اسکندر مرزا سے بھی زیادہ ہشیار نکلا۔ اس نے اسکندر مرزا کا ایسا پتا کاٹا کہ اسے صرف حکومت ہی سے نہیں پاکستان سے بھی باہر نکال دیا۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "ویسے شاہ جی' دیکھا جائے تو ایوب خان اور اس کے جرنیلوں نے بھی پاکستان بنانے کے لیے کیا کیا تھا۔ سنا ہے انگریزوں کی فوج میں ایوب خان کرنیل ہوتا تھا۔" وہ زیب لب مسکرایا۔ "پر اب تو جی اپنے جرنیلوں کے ساتھ ٹھاٹھ سے حکومت کر رہا ہے۔ سیات ایسی بند کی ہے کہ سارے ہی سیاست داں چپ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔"

"اس کے پاس بندوک جو ہے' اور بندوک سے کون نہیں ڈرتا؟" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ یہ بتا تیری الاٹمنٹ میں اور تو کوئی گڑبڑ نہیں؟"

"نہیں جی' اور کوئی گڑبڑ نہیں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔

"مان لے تیرا کلیم اگر جعلی بھی ہے تب بھی تجھے فکر کرنے کی ذرا ضرورت نہیں۔ تیرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "اب تجھ سے کیا چھپانا۔ جمیلہ کے پیؤ' لالہ کشن دیال کی متروکہ اراضی کا اچھا خاصا حصہ میرے پاس ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں کہاں کا مہاجر ہوں۔ میرے پاس تو کوئی کلیم تسلیم بھی نہیں۔"

"پر تو نے اس پر کیسے کبنہ کر رکھا ہے؟"

"الاٹمنٹ کرا رکھی ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر اپنے نام سے نہیں' اپنے ایک مہاجر منشی کے نام سے۔"

"اگے چل کر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔" احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "الاٹمنٹ کے ساتھ

ہی اراضی کی بیچ کر رکھی تھی۔ پکا کام کیا ہے۔ اب وہ ساری اراضی میری ملکیت ہے۔ پر ایسا میں نے ہی نہیں کیا۔ کتنے ہی غیر مہاجر زمیں داروں نے بھی اسی طرح متروکہ جائیداد پر کبضہ کر رکھا ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چوہدری' سچ پوچھ تو کتنی ہی جگہ ہندوؤں اور سکھوں کی جائیداد اور اراضی پر کبضہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بھڑکا کر فسادات کرائے گئے۔"

"چکر تو زبردست چلایا۔ فسادات سے ڈر کر ہندو اور سکھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سرحد پار چلے گئے اور ان کی جائیداد اور اراضی پر بعد میں کبضہ کر لیا گیا۔"

"ویسے ایہہ گل بھی ہے کہ ہندو بنئے اور لالے ادہار اور سود در سود کے ذریعے مسلمانوں کی اراضی اور جائیداد دھیرے دھیرے اپنی ملکیت میں لیتے جا رہے تھے۔ وڈے زمین دار بن گئے تھے۔" احسان شاہ نے وضاحت کی۔ "ایسی لوٹ مار مچا رکھی تھی کہ مسلمان ان سے خار کھانے لگے تھے۔ ان کے سینوں میں آگ تو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مسلمان زمین داروں نے یہ آگ ذرا بھڑکائی تو ایسی پھیلی کہ پھیلتی ہی چلی گئی۔"

"شاہ جی' تو نے ٹھیک ہی کہا۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "بالکل ایسا ہی ہوا۔ ادھر کے مسلمانوں نے جو کچھ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کیا ویسا ہی ادھر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔" رحیم داد نے خود کو مہاجر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ "تجھے کیا بتاؤں' ادھر کے مسلمانوں پر کتنا ظلم ہوا۔ اس کے بارے میں کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں جی' بہت ظلم ہوا۔ اب اس کی یاد نہ کر۔ دکھ ہی ہو گا۔" احسان شاہ نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "تو اپنی الاٹمنٹ سٹلمنٹ کے بارے میں فکر نہ کر۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنے جوش و جذبے کا اظہار کیا۔ "میرے ہوتے ہوئے تجھے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو کیا ہوا' سرکاری افسر تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اب وہ فوجیوں کے ساتھ مل کر حکومت چلا رہے ہیں۔ ویسے فوجی ہوں یا غیر فوجی افسر' سارے ہی اپنے بندے ہیں۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "چوہدری' ایک گل تو بتا۔ میں نے سنا ہے' تیری گھر والی پہلے نوکرانی ہوتی تھی؟"

رحیم داد فوراً تاڑ گیا کہ نادر خان نے شاداں کے بارے میں احسان شاہ کو آگاہ کر دیا۔ اب انکار کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی' تو نے ٹھیک ہی سنا۔ مجھے تجھ سے

جھوٹ نہیں بولنا۔"

"چوہدری' تجھے ویاہ کرنے کے لیے کوئی اور کڑی نہیں ملی۔" احسان شاہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ "اس سے یاری لگائی تھی تو لگائے رکھتا۔ نوکرانیاں شوکرانیاں تو ہوتی اسی کام کے لیے ہیں۔ پر ان سے ویاہ نہیں کیا جاتا۔"

"تو بھول گیا۔ تو نے ہی تو کہا تھا جھیتی نال ویاہ کر لے۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "دوجی ڈھونڈتا تو دیر لگتی۔ لمبا چکر چلتا۔ فوری طور پر تو وہی مجھے ویاہ کرنے کے لیے نظر آئی۔ دھوم دھام تو کرنی نہیں تھی۔ مسجد کے ملاں کو بلایا اور خاموشی سے نکاح پڑھوا لیا۔"

"جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب اگے کی سوچ۔" احسان شاہ نے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ "تجھے پتہ ہونا چاہیے اب تو وڈا زمین دار ہے۔ تجھے اپنی نسل کے بارے میں پوری طرح سوچ بچار کرنی چاہیے۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کسی عزت دار اور اونچے زمیں دار خاندان کی کڑی ویاہ کر لا تاکہ تیرا بھی نام اونچا ہو اور تیرے بال بچوں کا بھی۔" اس نے بات کو مختصر کیا۔ "ایسا کر' میرے ساتھ لہور چل۔ میں نے پیراں والہ نہیں' لہور ہی جانا ہے۔ وہاں اکٹھے بیٹھ کر سوچیں گے اس معاملے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

رحیم داد کی پریشانی احسان علی شاہ سے گفتگو کرنے کے بعد کم ہو گئی تھی' مگر ہنوز خوف زدہ تھا۔ کوٹلہ ہرکشن کے بجائے لاہور اسے زیادہ محفوظ مقام معلوم ہوا۔ وہاں احسان شاہ موجود تھا۔ اگر اس کے کلیم کے بارے میں کوئی تحقیقات ہوتی اور اس کے نتیجے میں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا تو احسان شاہ بروقت مدد کر سکتا تھا۔ ہر طرح سے مشکل کشائی کر سکتا تھا۔ وہ بہت بڑا زمیں دار تھا۔ سرکاری حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ ملنسار اور یار باش بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری افسروں سے کام نکالنے کا گر بھی جانتا تھا۔

رحیم داد نے تامل نہ کیا۔ فوراً احسان علی شاہ کے ہم راہ لاہور جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ذرا ہی دیر بعد اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔

شاداں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ جلد ہی لوٹنے کا وعدہ کیا۔ اس نے شاداں سے زیادہ بات چیت نہ کی۔ واپس احسان شاہ کے پاس پہنچا۔ اس کے ساتھ کار میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

۱۵

دن کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ بھری دوپہر تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ شاداں کمرے میں تنہا تھی۔ باہر چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی۔ شاداں کا یہ معمول تھا کہ رات بالائی منزل پر بسر کرتی۔ سورج غروب ہوتے ہی چھت پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ نوکر کمرے سے پلنگ نکال کر باہر چھت پر بچھا دیتے۔ ان پر اجلا بستر لگا دیا جاتا۔ صبح اٹھ کر وہ ناشتا اوپر ہی کی منزل پر کرتی تھی۔ دھوپ کی تمازت بڑھ جاتی تو پہر دن چڑھے نیچے چلی جاتی۔ وہاں بھی آرام کرنے کے لیے اس کا کمرہ مخصوص تھا۔ رحیم داد کوٹلہ ہرکشن میں موجود ہوتا تب بھی اس کے اس معمول میں فرق نہ آتا۔

رحیم داد ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ شاداں اس روز خلاف معمول بالائی منزل کے کمرے میں تھی۔ وہ نیچے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ایک نوکرانی نے اطلاع دی۔

"چوہدرانی، تجھے ملنے کوئی بندہ آیا ہے۔"

"مجھے ملنے کون آیا ہے؟" شاداں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں کون ہے۔" نوکرانی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "اپنا نام لالی بتاتا ہے۔"

لالی کا نام سن کر شاداں چونکی۔ اسے لالی کا آنا ناگوار گزرا۔ پیشانی پر بل پڑ گیا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ چھا گئی۔ اس نے سوچا، لالی سے ملنے سے صاف انکار کر دے۔ اب وہ اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ رحیم داد اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے نام سے بھڑکتا تھا۔ وہ رحیم داد کو ناراض کرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر وہ لالی کو بھی ناراض نہ کر سکتی تھی۔ لالی اسے سکھ نہ دے سکا لیکن اسے کبھی دکھ پہنچانے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔

شاداں چند لمحے تذبذب کے عالم میں گم صم بیٹھی رہی' پھر اس نے نوکرانی سے کہا۔ "اسے وڈے کمرے میں بٹھا دے۔ میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

نوکرانی خاموشی سے مڑی اور واپس چلی گئی۔

شاداں نے گرمی کے باوجود سفید ریشمی چادر اوڑھی۔ جسم کے بالائی حصے کو اچھی طرح ڈھانکا کمرے سے باہر نکلی۔ چھت عبور کی اور زینے کی سیڑھیاں طے کرکے بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔ لالی کمرے میں موجود تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور میلا کچیلا تھا۔ چہرہ اور سر کے بال خاک دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ تھکا ہارا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔ اس کے بشرے سے پریشان حالی آشکارہ تھی۔

شاداں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چادر کے پلو سے بکل مار کر نصف چہرہ چھپا لیا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور لالی کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر نوکرانی کی جانب دیکھا۔ لسی لانے کی ہدایت کی' پھر لالی کی طرف متوجہ ہوئی۔ لالی کی آنکھوں میں حسرت و یاس تھی۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے شاداں کو دیکھا۔

شاداں اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔ فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ آہستہ سے بولی۔ "اب تو کیوں آیا ہے؟ چوہدری کو پتہ چلے گا تو سخت ناراض ہوگا۔ میں تجھے یہی بتانے جیل گئی تھی۔ پر منع کرنے پر بھی تو نے میری بات نہ مانی اور یہاں چلا آیا۔ یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" اس کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔

"تو نے اس روز میری پوری گل بات ہی کب سنی تھی۔ اپنی ہی کہتی رہی۔" لالی نے شکوہ کیا۔ "میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں چوری ڈکیتی کرنے کے جرم میں جیل نہیں گیا تھا۔ تجھ سے وعدہ کرنے کے بعد میں نے تو کبھی چوری ڈکیتی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ تجھے پتہ نہیں۔"

"مجھے پتہ بھی نہیں کرنا۔" شاداں نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "تجھے جو کچھ بتانا تھا' اسی روز مجھے بتا دیا تھا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "تو جیل کیوں گیا؟ کیسے گیا؟ مجھے اب اس سے کچھ نہیں لینا۔"

"تو پہلے میری گل تو سن لے۔" لالی نے اصرار کیا۔

مگر شاداں نے اس دفعہ بھی اسے صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ "میں نے کچھ نہیں سننا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔" اس کے لب و لہجے میں اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔ اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "میں اب چوہدری کی گھر والی بن چکی ہوں۔ اس کے سوا کسی اور مرد کے بارے

میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

"سوچنا بھی نہیں چاہیے۔" لالی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آواز میں تلخی پیدا ہو گئی۔ اس نے نظریں گھما پھرا کر دروازوں پر پڑے ہوئے خوش رنگ پردے' فرش پر بچھا ہوا نرم نرم قالین اور صوفے دیکھے۔ شاداں کا قیمتی لباس دیکھا۔ "ایسی شاندار حویلی میں رہ کر تو کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب تو وڈی زمیں دارنی بن گئی ہے۔ عیش کر رہی ہے۔"

لالی کے لہجے میں طنز تھا۔ جھنجلاہٹ اور برہمی تھی۔ شاداں نے اسے محسوس کیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ مگر اس نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اپنے رویے سے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لالی نے قدرے توقف کیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمایاں ہوا۔ "لگتا ہے تجھے چوہدری سے بھی پیار ہو گیا ہے۔"

"ہاں!" شاداں نے اس کی جانب دیکھے بغیر نہایت مختصر جواب دیا۔

"یہ بتا' تیرا کب تک چوہدری سے پیار کرنے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں تحقیر تھی' تلوار کی کاٹ تھی۔ "تو نے پہلے بالے سے یاری لگائی۔ اس کے لیے اپنے خصم کو چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا' بال بچوں کو چھوڑا۔ فیر بالے سے ناراض ہوئی تو اس کا خون کر دیا۔ مجھ سے یاری لگالی۔"

لالی کے منہ سے بالے کا ذکر سن کر شاداں لرز کر رہ گئی۔ اس کے بشرے سے ٹپکتی ہوئی برہمی کافور ہو گئی۔ اسے تمام عرصے میں پہلی بار اندازہ ہوا کہ لالی اس کے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ نہ صرف اقبال عرف بالا کے قتل کے راز سے واقف تھا' بلکہ اس نے بالا کی لاش ٹھکانے لگانے میں اس کی پوری پوری مدد بھی کی تھی۔ وہ اس کے جہانگیرہ کے مکان کی اس کوٹھری کو بھی اچھی طرح جانتا تھا جس میں گہرا گڑھا کھود کر لاش دفن کی گئی تھی۔

شاداں نے بولنا چاہا' مگر سراسیمگی کے عالم میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اسی اثنا میں نوکرانی لسی کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ آگے بڑھی' شاداں کے اشارے پر گلاس لالی کو پیش کیا۔ مگر لالی نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔ "میں نے لسی شسی نہیں پینی۔" اس کی آنکھوں سے خفگی جھلک رہی تھی۔

شاداں نے اصرار کیا۔ "گرمی میں چل کر آیا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پینے سے آرام ملے گا۔" اس کا لہجہ نرم اور شیریں تھا۔ لالی مزید انکار نہ کر سکا۔ پیاسا بھی تھا۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بے نیازی سے گلاس ہاتھ میں لیا اور ہونٹوں سے لگا کر بڑا گھونٹ بھرا۔

نوکرانی نے شاداں سے پوچھا۔ "زمین دارنی روٹی تیار ہے۔ یہیں لے آؤں یا تو نے اپنے

کمرے میں کھانی ہے؟"

"میں بعد میں روٹی کھاؤں گی۔" شاداں نے نوکرانی کو ہدایت کی۔ "پہلے تو لالی کے لیے روٹی لے آ۔ یہ روٹی کھا کر جائے گا۔"

نوکرانی چلی گئی۔ لالی نے گلاس خالی کیا۔ ایک طرف رکھا۔ اور ایک ہاتھ سے بھیگی ہوئی مونچھیں صاف کرنے لگا۔ شاداں خاموش بیٹھی رہی۔ لسی پینے سے لالی کو سکون ملا۔ اس کے غم و غصے میں کمی پیدا ہوئی۔ لیکن وہ ہنوز روٹھا ہوا تھا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "مجھے اب جانا ہے۔ تیری روٹی شوٹی نہیں کھانی۔" اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

مگر شاداں نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ "کہاں چلا؟ تجھے روٹی کھا کر جانا ہو گا۔ رستے میں تجھے کہاں روٹی ملے گی۔" اس نے پیار سے ڈانٹا۔ "اتنی ناراضگی ٹھیک نہیں۔ چپ کر کے بیٹھا رہ۔ دیکھ تو' تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔" اس نے اظہار ہمدردی کیا۔

"میرا کچھ بھی حال ہے' تجھے اس سے کیا لینا۔" لالی نے ایک بار پھر گلہ شکوہ شروع کر دیا۔ شاداں چاہتی بھی یہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لالی کہتا رہا۔ "یاد ہے' تو نے مجھ سے کیسے کیسے وعدے کیے تھے۔ وہ سب کیا تھا؟"

"اسے بھول جا۔" شاداں نے نرمی سے کہا۔ "میں نے کہا ناں جو ہونا تھا ہو گیا۔"

لالی نے افسردہ نظروں سے شاداں کو دیکھا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ صرف گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

نوکرانی کھانا لے کر آئی۔ اس نے چھوٹی میز اٹھا کر لالی کے سامنے رکھی اور کھانا اس پر چن دیا۔ کھانا عمدہ اور مرغن تھا۔ پراٹھے تھے' بھنا ہوا گوشت تھا' سبزی تھی' دال تھی اور چاول بھی تھے۔ لالی نے نوالا توڑا اور کھانے لگا۔ لالی پچھلی رات سے بھوکا تھا۔ کھانا خوش ذائقہ تھا۔ وہ سر جھکا کر رغبت سے کھاتا رہا۔ شاداں خاموش بیٹھی اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر شاداں کو دیکھا۔ پوچھا۔ "تجھے پتہ ہے چوہدری کون ہے؟"

"مجھے سب پتہ ہے وہ کون ہے کیسا ہے؟" شاداں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" لالی کا لہجہ اونچا ہو گیا۔

"دھیرے بول۔" شاداں نے نرمی سے سمجھایا۔ "تو چوہدری کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ وہ میرا گھر والا ہے۔ مجھ سے پیار بھی کرتا ہے۔ مجھے ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے تو اپنی زمیں داری میں سے ڈیڑھ سو کلا زمین بھی میرے نام لکھ دی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس

بھری "میں نے اپنے پہلے گھر والے کو چھوڑ کر جو غلطی کی اس کی سزا بھی پائی۔ لالی میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ تو جیل چلا گیا۔ تجھے کیا پتہ میں نے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "اب میں وہ دکھ وہ مصیبتیں نہیں اٹھا سکتی۔ اتنی جوان بھی نہیں رہی۔ میں چوہدری سے دھوکا نہیں کر سکتی۔" اس کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔ نگاہیں جھک گئیں۔ "میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے چونک کر شاداں کو دیکھا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں اسے جو کچھ بتانا چاہتا تھا بتا نہ سکا۔ شاداں آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "میں نے ایک بار اپنا گھر اجاڑا ہے اب اسے دوبارہ اجاڑنے کی مجھ میں بالکل ہمت نہیں۔ میں اب تیرے کام کی بھی نہیں رہی۔ تو کسی سوہنی کڑی سے ویاہ کر کے اپنا گھر بسا لینا۔"

"میں نے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا' یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں۔" لالی نے جل کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"ناراض نہ ہو۔" شاداں نے عاجزی سے کہا۔ "میں تیری منت کرتی ہوں مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے برسوں دکھ اٹھانے کے بعد آرام پایا ہے' خوشی کے دن دیکھے ہیں۔ میری اس خوشی کو برباد کرنے کی نہ سوچنا۔" اس نے آب دیدہ ہو کر لالی کو دیکھا۔ "اب تو یہاں نہ آنا۔ میرا رستہ اور ہے تیرا اور۔ ہم نے اب ایک دوسرے سے کچھ نہیں لینا۔ سمجھ لے تیری شاداں مر گئی۔" اس کا لہجہ اور جذباتی ہو گیا۔ "ہاں لالی' وہ شاداں اب مر گئی۔ میں نے جس روز چوہدری کے ساتھ نکاح کیا تھا وہ اسی روز مر گئی تھی۔" اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

لالی بھی جذباتی ہو گیا۔ وہ شاداں کو اس قدر دل گرفتہ نہ دیکھ سکا۔ تڑپ کر بولا۔ "شاداں آنسو پونچھ لے۔ میں اب تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔ تجھے بھول جانے کی کوشش کروں گا۔" جذبات کی شدت سے اس کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ پی گیا۔ پانی پینے سے طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ وہ پھر شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔ "شاداں' میں نے ہمیشہ تجھے خوشی دینے کی کوشش کی پر دے نہ سکا۔ تو چوہدری کے ساتھ رہ کر خوش ہے تو تیری خوشی کے ساتھ میں بھی خوش ہوں۔"

شاداں نے آنسو پونچھے۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا افسردگی کا غبار چھٹنے لگا۔ اس نے لالی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے پتہ ہے' تیرا دل بہت وڈا ہے۔" وہ لالی کی دل جوئی

کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے' تو نے زندگی بھر دکھ ہی اٹھائے ہیں۔ تو کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔"

لالی خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے ٹوکا۔ "کہاں چلی؟"

"میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تیرے لیے کچھ روپے لے کر آتی ہوں۔ لگتا ہے تیرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

"تو مجھے رشوت دینا چاہتی ہے؟" لالی نے مسکرا کر چوٹ کی۔

"ایسی گل نہ کر۔" شاداں نے گردن کو خم دے کر تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تو نے ہمیشہ ہی میری مدد کی ہے۔ میری نّ ملک کی گولی سے مرگئی۔ تو نے مجھے ویسی ہی دوسری نّ لا کر دی۔ بعد میں دو ہزار روپیہ بھی دیا۔ تو نے کب میری مدد نہیں کی؟" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "اب میں تیری کچھ مدد کر سکتی ہوں تو اسے رشوت کہہ رہا ہے۔ تو مجھے اتنا ذلیل سمجھتا ہے؟"

"ناراض نہ ہو۔" لالی نرم پڑ گیا۔ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ "میں نے تو تجھے چھیڑنے کے لیے کہا تھا۔ تو ایک دم بھڑک اٹھی۔"

شاداں نے کچھ نہ کہا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ لالی سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں نہ شاداں تھی نہ اس کی نوکرانی۔ سامنے رحیم داد کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے تو؟" لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹٹولنے والی نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو تکتا رہا۔

"بولتا کیوں نہیں؟ کون ہے تو؟" اس دفعہ رحیم داد نے زیادہ برہمی کا اظہار کیا۔

"میں لالی ہوں جی۔" لالی نے دبی زبان سے کہا۔

"تو جیل میں ہوتا تھا نا۔ باہر کیسے آ گیا؟"

"سزا ختم ہو گئی تو باہر آ گیا۔" لالی نے تلخی سے کہا۔ "میرے باہر آنے سے تجھے تکلیف ہوئی؟"

"بکواس نہ کر۔" رحیم داد بھڑک اٹھا۔ "یہاں کیسے آیا؟ تجھے کس نے یہاں آنے دیا؟"

لالی کچھ نہ بولا۔ ٹکٹکی باندھے رحیم داد کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے اور ہر ہر انداز کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ ہر چند کہ اس کی آنکھوں پر اب عینک تھی۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ اور رخسار پر زخم کا ہلال نما واضح نشان تھا۔ اس کا حلیہ بڑی حد تک بدل چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور لہجے میں اس رحیم داد کی جھلک تھی جو مدت تک لالی کی ساتھ جیل میں رہ چکا تھا اور اسی کے ہم

راہ جیل سے فرار بھی ہوا تھا۔ لالی کا شبہ رفتہ رفتہ پختہ ہو گیا۔

رحیم داد اس کی متجسس نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ غضب ناک ہو کر چیخا۔ "تو میری حویلی میں داخل کیسے ہوا؟" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آواز اونچی ہو گئی۔ "چور ڈکیت۔ کیسی شان سے صوفے پر بیٹھا آرام سے روٹی کھا رہا ہے۔ تیری اتنی ہمت کیسے ہوئی؟" وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ میز پر زور سے ٹھوکر ماری۔ میز الٹ گئی۔ کھانے کی قابیں اور پلیٹیں چھنا کے کے ساتھ فرش پر گریں اور ادھر ادھر بکھر گئیں۔ رحیم داد کا غصہ کم نہ ہوا۔ "تجھے اس کمینی نے بلایا ہو گا۔ کدھر ہے وہ؟ کہاں چلی گئی؟" وہ شاداں کو گالیاں دیتا رہا۔

لالی پر سکون رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ رحیم داد زور سے دھاڑا۔ "نکل جا یہاں سے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔" مگر لالی اس کے غیظ و غضب سے مرعوب نہ ہوا۔ ڈھیٹ بن کر بولا۔ "اتنی گرمی نہ دکھا۔ پانی تو پی لینے دے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اس نے پانی پیا۔ گلاس فرش پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد غصے سے ہانپ رہا تھا۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ نڈھال ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ ٹھٹکا' رحیم داد کو ایک بار پھر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہ مڑا اور چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگا۔

لالی کمرے سے باہر نکلا۔ دالان میں پہنچا تو شاداں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے لالی کو ٹوکا۔ "تو کہاں چلا؟"

لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اندر جا کر دیکھ۔ تیرا پیار کرنے والا کھسم تجھے اور مجھے دونوں کو ننگی ننگی گالاں نکال رہا ہے۔" شاداں کے چہرے پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ لالی نے اس کی جانب مزید توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور قدم اٹھاتا ہوا حویلی سے باہر چلا گیا۔

☆

حویلی کے سامنے کھلے میدان میں ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ لالی دھوپ کی تمازت اور لو کے تھپیڑوں سے بے نیاز چلتا رہا۔ لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ نیلی ٹرانسپورٹ کی ایک لاری میں سوار ہوا۔ شہر پہنچ کر وہ لاہور جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد بھی اس کے ذہن پر رحیم داد سوار تھا۔ اس نے لالی کو جس حقارت سے دھتکار کر اپنی حویلی سے نکالا تھا' اس بے عزتی اور ذلت کو وہ بھولا نہ تھا۔ اسے رہ رہ کر رحیم داد کی گالیاں اور ڈانٹ پھٹکار یاد آ رہی تھی۔ جتنا وہ ان کو یاد کرتا اسی شدت کے ساتھ رحیم داد کے

خلاف اس کی نفرت اور کدورت بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد کے ساتھ ساتھ وہ شاداں سے بھی خفا تھا۔

رحیم داد کے بارے میں اس کا شبہ پختہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ ارشاد الٰہی سے اس کی تصدیق کرانا چاہتا تھا۔ اپنے اطمینان کے لیے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا باپ چوہدری نور الٰہی نہیں بلکہ رحیم داد ہے جو اس کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی الاٹ کرا کے کوٹلہ ہر کشن کا بہت بڑا زمیں دار بن گیا ہے۔

وہ ارشاد الٰہی کو تلاش کرنے ملک نثار محمد کے بھٹے پر پہنچا۔ جیل جانے سے قبل ارشاد الٰہی اسی بھٹے پر پتھیرا تھا۔ لالی نے بھٹے کے پتھیروں سے چوری چھپے رابطہ قائم کیا۔ ارشاد الٰہی کے بارے میں دریافت کیا۔ مگر وہ اب اس بھٹے پر نہیں تھا۔ جمعدار نے کچھ دوسرے پتھیروں کے ساتھ اسے کسی اور بھٹے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ مگر پوچھ گچھ کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ ارشاد الٰہی کس بھٹے پر پہنچایا گیا تھا۔

لالی نے فیروز پور روڈ، جی ٹی روڈ اور بیدیاں روڈ کے تمام ہی بھٹوں پر ارشاد الٰہی کو تلاش کیا۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسی کوشش میں لگا رہا کہ کہیں اس کا سراغ مل جائے۔ وہ ارشاد الٰہی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک شام اس کا پرانا ساتھی غنی چتّا مل گیا۔ وہ تالا توڑنے اور نقب زنی میں ماہر تھا۔ کئی بار پکڑا گیا۔ جیل گیا، مگر باز نہ آیا۔ اب وہ منجھا ہوا جرائم پیشہ بن چکا تھا۔

غنی چتّا اصرار کر کے لالی کو اپنے گھر لے گیا۔ نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے۔ دو بڑے بھائی تھے۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ لیکن چتّا ان سے ملتا نہ تھا۔ وہ بھی اس سے کتراتے تھے۔ چتّا مصری شاہ کے چھوٹے سے تنگ و تاریک مکان میں رہتا تھا۔ لالی کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ غنی نے زور دیا تو وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

غنی نے لالی کو اپنے دھرے پر لگانا چاہا۔ اسے ایک معاون و مددگار کی ضرورت تھی۔ لالی نے بہت چاہا کہ جس دلدل سے ایک بار نکل چکا ہے دوبارہ اس میں نہ گرے۔ مگر نہ اسے کہیں کام دھندا ملا اور نہ ہی سر چھپانے کے لیے جگہ ملی۔ مسلسل بے روزگاری اور پریشان حالی سے تنگ آکر اس نے غنی کا کہا مان لیا۔ ویسے بھی نہ اب شاداں اس کی رہی تھی اور نہ اس وعدے کی کوئی اہمیت رہی تھی جو اس نے چوری ڈاکہ زنی نہ کرنے کے سلسلے میں اس سے کیا تھا۔

لالی اور غنی چتّا مل جل کر چوری ڈکیتی کرتے اور چوری کا مال آپس میں بانٹ لیتے۔ رہتے بھی

ایک ہی گھر میں تھے۔ لالی ایک بار پھر نڈر اور بے باک جرائم پیشہ بن گیا۔ ایسے دھڑلے سے واردات کرتا کہ کبھی کبھی تو چتّا دنگ رہ جاتا۔

دو مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ گرمی کا زور ٹوٹنے لگا۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ بارش کا پہلا چھینٹا پڑ چکا تھا۔ ایک رات غنی چتّا اور لالی چوری کی نیت سے کرشن نگر کے ایک مکان میں داخل ہوئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ واردات سے پہلے ہی جاگ ہو گئی۔ گھبرا کر دونوں نے راہ فرار اختیار کی۔ لالی تو بچ کر صاف نکل گیا۔ چتّا بد حواس ہو کر چھت پر پہنچ گیا۔ شور زیادہ بلند ہوا تو اس نے برابر کے مکان پر پہنچنے کی کوشش کی۔

دونوں مکانوں کے درمیان تنگ گلی حائل تھی۔ غنی نے زغند بھری لیکن چھت کے منڈیر پر اس کا پیر اس طرح پھسلا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر دھڑام سے گلی کے پختہ فرش پر گرا۔ ٹخنہ اتر گیا۔ اس نے چوٹ کی مطلق پرواہ نہ کی۔ سرپٹ بھاگا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ گھر پہنچا تو لالی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ چوٹ تازہ تھی' لہٰذا رات کو اس کی شدت کا پوری طرح اندازہ نہ ہو سکا۔ چتّا صبح سو کر اٹھا تو پیر میں شدید درد کے ساتھ ساتھ ورم بھی تھا۔

غنی چتّا اب گھر ہی پر رہتا۔ ٹوٹی ہڈیاں جوڑنے اور ہڈیوں کے اکھڑے ہوئے جوڑ بٹھانے والے ایک معالج کے علاج معالجے سے ٹخنے کی ہڈی کا جوڑ تو بیٹھ گیا لیکن ابھی تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ اس عرصے میں چوری کی ساری رقم ختم ہو گئی۔ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ لہٰذا ایک رات لالی اکیلا ہی چوری کرنے کے ارادے سے نکلا۔

آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا مدھم چل رہی تھی۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔

لالی نے ایک مکان تاڑا۔ گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ موقع و محل دیکھا۔ یہ پرانی وضع کا بنگلہ تھا۔ اس کے پچھلے حصے کی دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ آس پاس آبادی بھی کم تھی۔ جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ لالی اچھل کر آسانی سے ایک دیوار پر چڑھ گیا۔ بنگلے کے وسیع صحن میں ایک پلنگ پڑا تھا۔ کوئی اس پر بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ سے نیچے اتر گیا۔

صحن کے ساتھ کھپریل کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ لالی دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے کے دروازے پر رکا۔ ہولے سے دھکا دیا۔ مگر دروازہ بند تھا۔ دوسرا بھی اندر سے بند تھا۔ البتہ نکڑ کے کمرے کا دروازہ ہاتھ لگاتے ہی چرچراتا ہوا کھل گیا۔ لالی دم سادھے کمرے کے باہر کھڑا رہا۔ اس نے مڑ کر پلنگ پر لیٹے ہوئے شخص کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور گہری نیند

سو رہا تھا۔

لالی نے نہایت احتیاط سے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ قمیص کی جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ اسے روشن کیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ ایک گوشے میں میز تھی۔ اس پر چند کتابیں رکھی تھیں۔ کلائی پر باندھنے کی گھڑی بھی ایک طرف رکھی تھی۔ میز کے قریب ہی کھونٹی پر پتلون اور بش شرٹ لٹکی ہوئی تھی۔ لالی نے ٹارچ بجھا دی۔ ہاتھ بڑھا کر پتلون اور بش شرٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ پتلون کی پچھلی جیب میں چند کرنسی نوٹ موجود تھے۔ اس نے نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ میز پر رکھی ہوئی گھڑی بھی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔

میز سے ذرا ہٹ کر لکڑی کی اونچی الماری تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا۔ مگر اس کا ایک پیر قریب رکھے ہوئے پیڈسٹل لیمپ سے کچھ اس طرح ٹکرایا کہ لیمپ ڈگمگا کر کرسی پر گرا اور کرسی اس کے بوجھ سے الٹ گئی۔ رات کے سناٹے میں اچانک شور ہوا۔ لالی سراسیمہ ہو کر جہاں تھا وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ باہر صحن میں کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

دروازے کی دہلیز پر اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا۔ لالی کو خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ دیوار پر لگا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ کمرے میں ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ لالی نے جھٹ چاقو نکالا۔ اسے کھولا اور مضبوطی سے ہاتھ میں دبا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ سامنے سلیم لودھی کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ چہرے پر خوف و ہراس تھا۔ اس کا جسم چھریرا تھا۔ عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر بالوں میں وقت سے پہلے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی سن رسیدہ نظر آتا تھا۔

لالی نے سلیم لودھی کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اسے سامنے دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ لالی جب جیل میں قیدی تھا تو انھی دنوں سلیم لودھی بھی نظر بند تھا۔ اسے مارشل لا کے ایک ضابطے کے تحت دوسرے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ تخریب کاری اور ملک دشمنی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بی کلاس قیدی تھا اور لالی کو اس کا مشقتی لگایا گیا تھا۔ لالی کے ساتھ اس کا رویّہ نہایت دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ نرمی اور شگفتگی ہوتی۔ لالی بھی اسے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔

سلیم لودھی نے بھی لالی کو پہچان لیا تھا۔ کچھ دیر حیران و پریشان کھڑا لالی کو تکتا رہا، پھر اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "تو لالی تو نہیں ہے؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "یاد پڑتا ہے تو میرے ساتھ

جیل میں تھا۔"

لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

"یار، تو بولتا کیوں نہیں؟" اس دفعہ اس کے انداز میں کسی قدر بے تکلفی تھی۔ "تو لالی ہے نا؟"

"ہاں جی، میں لالی ہی ہوں۔" لالی نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔

"تو یہاں پہنچا کیسے؟" اس نے پلٹ کر صحن کی چار دیواری کی جانب دیکھا۔ "دیوار پھاند کر آیا ہو گا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "چوری کرنے آیا تھا۔ مگر تو نے غلط مکان کا انتخاب کیا۔ میرے پاس مشکل سے تیس پینتیس روپے ہوں گے۔ ان سے تیرا کیا کام بنے گا؟"

لالی بہت خجل ہوا۔ لیکن نہ اس نے معذرت کی نہ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ سر جھکائے ملزموں کی طرح چپ کھڑا رہا۔ سلیم لودھی مسکرا مسکرا کر بولتا رہا۔ "یار، چوری ہی کرنی تھی تو کسی مال دار کا گھر تاکا ہوتا۔ زر و مال بھی تگڑا ہاتھ آتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "ویسے اس گھر کو دیکھ کر بھی مغالطہ ہوتا ہے۔ یہ میری چھوٹی بہن کا گھر ہے۔ اس کا شوہر پی ڈبلیو ڈی کا ٹھیکیدار ہے۔ پیسے والا بھی ہے۔ مگر آج کل وہ بال بچوں کے ساتھ مری میں ہے۔ برسات شروع ہو چکی ہے۔ اب اسے واپس آجانا چاہیے۔"

سلیم لودھی نے جھک کر فرش پر اوندھی پڑی ہوئی کرسی اٹھا کر سیدھی کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ابھی تک دبا تھا۔ سلیم لودھی نے سہمی ہوئی نظروں سے چاقو دیکھا۔ "یار لالی، اسے بند کر کے جیب میں رکھ۔ دیکھ کر خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے۔" اس نے چاقو کی جانب اشارہ کیا۔

لالی نے اس کی طرف دیکھے بغیر چاقو بند کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی جیب سے گھڑی اور چند نوٹ نکال کر خاموشی سے میز پر رکھ دیے۔ سلیم لودھی نے نوٹ اور گھڑی دیکھ کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "یار یہ تو میرے پاس آخری اثاثہ تھا۔ لے جاتا تو سگریٹ خریدنے کو بھی کچھ نہ رہتا۔" اس نے مسکرا کر شوخی سے لالی کو دیکھا۔ "ہاں گھڑی کے بغیر تو کسی نہ کسی طرح کام چل سکتا ہے۔ تجھے اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو تو لے جا۔"

"نہیں جی، میں نے کچھ نہیں لینا۔" لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ لہجے میں معذرت اور پشیمانی تھی۔ "مجھے تو جی بالکل پتہ نہ تھا کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں مجھے بالکل پتہ نہ تھا۔"

"تو سچ ہی کہہ رہا ہو گا۔" سلیم لودھی نے پیڈسٹل لیمپ اٹھا کر درست کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔
"ویسے رشوت خور اور چور کسی کے یار نہیں ہوتے۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ سلیم لودھی نے سوئچ دبایا۔ چھت سے لٹکتا ہوا بجلی کا پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سلیم لودھی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے قریب رکھی ہوئی دوسری کرسی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ اب تو نیند آنکھوں سے اڑ ہی گئی۔ تجھ سے کچھ باتیں ہی ہو جائیں۔"

لالی خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جب تو جیل میں تھا تو خود کو بے گناہ ثابت کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ تیرے خلاف چوری ڈکیتی کا جھوٹا کیس بنایا گیا۔ کسی جرم کے بغیر تجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہی کہا کرتا تھا نا؟"

"ہاں جی یہی کہتا تھا۔" لالی نے تردید نہ کی۔ "اور جی میں غلط بھی نہیں کہتا تھا۔"

"یہ بھی تو کہتا تھا کہ تو نے چوری ڈکیتی چھوڑ دی ہے۔" سلیم لودھی نے مسکرا کر طنز کیا۔ "یہاں تو دیوار پھاند کر آدھی رات کو چوری کرنے کے لیے نہیں مجھ سے ملنے آیا ہو گا۔"

"اصلی بات یہ ہے جی۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "کئی سال پہلے میں نے شاداں سے چوری ڈکیتی نہ کرنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی کوشش کی۔ بھتوں پر ہتھیرا لگ گیا۔" لالی کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ "پر جب میں جیل میں تھا تو اس نے مجھ سے دھوکا کیا۔ ایک زمیں دار سے ویاہ کر لیا۔"

"اس نے ٹھیک ہی کیا۔ تیرے انتظار میں بیٹھی رہتی تو بھوک اور مفلسی سے مر جاتی۔" سلیم لودھی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "اب آرام سے رہتی ہو گی۔ عیش کرتی ہو گی۔"

"ہاں جی بہت عیش کرتی ہے۔ وڈی زمین دارنی بن گئی ہے۔" لالی کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "اس کا گھر والا ویسے ہے تو بہت وڈا زمین دار' پر اس نے جعلی کلیم کے ذریعے متروکہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہے۔ بے ایمانی اور دھوکے فریب سے اتنا وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔"

"صرف وہی نہیں' سارے ہی وڈے زمیں داروں نے بے ایمانی اور دھوکے فریب کے ذریعے اتنی وسیع زمین داریاں حاصل کی ہیں۔ کچھ نے خود اس طرح حاصل کی ہیں' کچھ ایسے ہیں جن کے بزرگوں نے اسی طرح کی تھیں اور مرنے کے بعد اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ گئے۔" سلیم لودھی اطمینان سے بولتا رہا۔ "کسی نے زبردستی زمین دبالی' کسی نے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے ملک اور اس کے محکوم عوام سے غداری کی اور انعام کے طور پر دولت اور جاگیر پائی۔" اس کا

لہجہ تلخ ہو گیا۔ "انگریزوں کی حکومت تھی' تب بھی وہ عیش کرتے تھے۔ اب بھی عیش کرتے ہیں۔ پہلے وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر حکومت چلاتے تھے۔ اب ان کے دیسی ماتحتوں اور کارندوں کے ساتھ مل کر چلاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو لوٹ مار اور غداری کے صلے میں ملنے والی زمین داریاں کب کی ختم ہو جاتیں۔ بحق سرکار ضبط کر کے بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی جاتیں۔"

"مجھے اس بارے میں جی کچھ پتہ نہیں۔"

"تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا کہ تو چور ہے تو وہ زمیں دار بھی چور ہے' جس نے تیری شاداں سے شادی کر لی۔" سلیم لودھی نے لالی کو بتایا۔ "بلکہ تو چھوٹا چور ہے' اور وہ بڑا چور ہے۔"

"وہ کیسے چور ہو سکتا ہے جی؟ اس نے چوری ڈکیتی تو نہیں کی۔" لالی اس کی بات کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ نہایت سادگی سے بولا۔ "یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔"

"آ بھی نہیں سکتی۔ تو اکیلا نہیں۔ کروڑوں ایسے بندے ہیں جو یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔" سلیم لودھی نے میز پر رکھی ہوئی اپنی گھڑی اٹھائی۔ لالی کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ "یہ گھڑی دیکھ رہا ہے جسے تو چوری کر کے لے جانا چاہتا تھا۔ اسے میں نے دو سو روپے میں خریدا تھا۔ تو اسے چرا کر لے جاتا تو یوں سمجھ لے' میرے دو سو روپے کی چوری کر لیتا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

"ہاں جی' یہ تو بالکل ٹھیک گل ہوئی۔" لالی نے اس کی تائید کی۔

"یہ دو سو روپے کیسے بنے؟" سلیم لودھی سر اٹھا کر لمحہ بھر سوچتا رہا' پھر گویا ہوا۔ "یہ میری لگ بھگ ۱۵ روز کی تنخواہ تھی۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ میری ۱۵ روز کی محنت دو سو روپے میں بدل گئی۔ یہ گھڑی اٹھا کر تو لے جاتا تو در اصل وہ مری ۱۵ دن کی محنت کی چوری ہوتی۔" اس نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔ "تو میری بات کا مطلب سمجھ رہا ہے نا؟"

"ہاں جی' بالکل سمجھ رہا ہوں۔" لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔

"اب تو ذرا اپنی شاداں کے شوہر کے بارے میں سوچ۔" سلیم لودھی نے کہا۔ "اس کے مزارعے چلچلاتی دھوپ' کڑاکے کی سردی اور سخت بارشوں میں فصلیں اگاتے ہیں۔ ہل چلاتے ہیں' بوائی کرتے ہیں' فصلوں کو پانی لگاتے ہیں۔ دن رات محنت کرتے ہیں۔ اور زمیں دار کچھ نہیں کرتا۔ پر بٹائی پر آدھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ فصل اپنے حصے کے طور پر لے جاتا ہے۔" اس نے لالی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "لے جاتا ہے نا؟"

"ہاں جی' بالکل لے جاتا ہے۔"

"جس طرح میری ۱۵ روز کی محنت گھڑی میں بدل گئی' بالکل اسی طرح مزارعوں کی محنت فصل

میں بدل جاتی ہے۔" وہ اس انداز سے بات کر رہا تھا جیسے اسکول کا کوئی استاد اپنے شاگرد کو کوئی نکتہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا استدلال عام فہم تھا۔ بات کرنے کا انداز دل نشین اور اثر انگیز تھا۔ وہ بتاتا رہا۔ "زمیں دار جب فصل کا آدھے سے بھی زیادہ حصہ بٹائی کے ذریعے اٹھا کر لے جاتا ہے تو وہ دراصل اپنے حصے کی شکل میں مزارعوں کی کئی مہینوں کی محنت چرا کر لے جاتا ہے۔"

"یہ بات سمجھ نہیں آئی جی۔" لالی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ "زمین جو اس کی ہوتی ہے۔ زمین دار اسی کی بنا پر اپنے حصے کی فصل لے جاتا ہے۔ یہ چوری تو نہیں ہوئی۔"

"میں نے تجھے بتایا نہیں کہ وڈے زمین داروں کو یا ان کے بزرگوں کو یہ زمین انگریز حاکموں کی خدمت اور وطن سے غداری کرنے کے صلے میں ملی تھی۔ سچ پوچھ تو انگریز بھی چور تھے۔"

"وہ جی کیسے چور ہوئے؟" لالی نے مداخلت کی۔

"وہ اس طرح چور ہوئے کہ وہ بھی اس ملک کے عوام کی محنت طرح طرح سے لوٹتے تھے۔ زمیں دار اور جاگیردار اس لوٹ مار میں ان کی مدد کرتے تھے۔ وہ لوٹ کے مال میں ان کے ساجھے دار ہوتے تھے۔ لوٹ کے حصے کا یہ مال زمین ہوتی تھی۔ لگ بھگ سارے ہی وڈے زمین دار ایسے ہی زمین حاصل کر کے بنے ہیں۔"

"پر اب تو جی زمین ان ہی کی ہوئی نا۔" لالی قائل نہ ہوا۔

"تو میری یہ گھڑی چرا کر لے جاتا تو یہ چوری ہی کا مال ہوئی نا؟" سلیم لودھی نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ "زمین دار کا معاملہ تو اور بھی مختلف ہے۔ جس طرح ہوا' روشنی اور پانی سب ہی کی ملکیت ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے اعتبار سے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح زمین بھی سب کی ملکیت ہے۔ ہر ایک کو اپنی ضرورت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ زمین تو اس کی ہونی چاہیے جو فصل اگانے کے لیے اس پر ہل چلائے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اس طرح' تو خود ہی سوچ' تو اگر چور ہے تو تیری شاداں کا زمین دار شوہر تجھ سے وڈا چور ہے۔ ہر چوری دراصل محنت ہی کی چوری ہوتی ہے۔" سلیم لودھی نے لالی کے چہرے کو دیکھا۔ "تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا نا؟"

لیکن اس کی بات کا مفہوم لالی بالکل نہ سمجھ سکا۔ اسے یاد آیا کہ جیل میں بھی وہ کبھی کبھی ایسی ہی بے تکی باتیں کرتا تھا۔ اور جب بولنے پر آتا تو بے تکان بولتا تھا۔ تب ہی تو جیل کے عملے کے ارکان اسے خبطی اور سنکی کہتے تھے۔ اور چکر منشی تو اسے ہمیشہ چریا کمہ کر یاد کرتا تھا۔ غرضیکہ سلیم

لودھی کا انقلابی فلسفہ لالی کے پلے نہ پڑا۔ البتہ رحیم داد کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا' اسے سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ سلیم لودھی کی یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس نے نہایت جوش و خروش سے سلیم لودھی کی تائید کی۔ "وہ تو جی بہت ہی وڈا چور ہے۔ میرا تو یہ پکا شبہ ہے' اس نے جعلی کلیم سے زمین الاٹ کرائی ہے' اور وڈا زمین دار بن کر اپنی شان اور ٹوہر دکھاتا ہے۔" لالی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اس نے مجھے چور اور جرائم پیشہ کہہ کر اپنی حویلی سے نکال دیا۔ میری بہت بے عزتی کی۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ آپ کو جی اس کے بارے میں پتہ نہیں۔"

"مجھے اس کے بارے میں پتہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" سلیم لودھی نے قطع کلام کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ "سارے ہی وڈے زمین دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ دوسروں کی محنت نہایت بے دردی سے چوری کرتے ہیں اور خود کو چور نہیں بلکہ شریف اور عزت دار سمجھتے ہیں۔ تیرے ایسے چھوٹے چوروں کو نیچ اور کمینہ سمجھتے ہیں۔ ان کو دھتکارتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ ان کو گرفتار کروا کر جیل میں ڈلوا دیتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ابھرا۔ "خیریت ہوئی کہ اس نے تجھے جیل نہیں بھجوایا۔ آئندہ تو اس کے پاس گیا' تو وہ تجھے چوری کے الزام میں ضرور گرفتار کروا دے گا۔"

"پر میں نے ایک بار شاداں کے پاس ضرور جانا ہے۔ اسے رحیم داد کے بارے میں کئی باتیں بتانی ہیں۔"

"تو اسے جو کچھ بتائے گا' وہ اس پر بالکل اعتبار نہیں کرے گی۔" سلیم لودھی نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "تو اب اسے بھول جا۔ وہ اب وڈی زمین دارنی بن چکی ہے۔ عیش کرتی ہے۔ آرام سے رہتی ہے۔ اور اسے یہ سارا عیش و آرام اس کے زمین دار شوہر ہی نے دیا ہے۔ وہ نہ اسے چھوڑ سکتی ہے اور نہ اس کے خلاف کچھ سن سکتی ہے۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "بات در اصل یہ ہے کہ ایک بار عیش و آرام کا چسکا لگ جائے تو مشکل ہی سے چھوٹتا ہے۔" سلیم لودھی لمحہ بھر خاموش رہ کر بے تکلفی سے بولا۔ "یار تو جو چاہتا ہے اب نہیں ہو سکتا۔"

لالی نے غور کیا' شاداں نے بھی اس سے یہی بات کہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سلیم لودھی نے نرم لہجے میں کہا۔ "لالی اب تو شاداں کی نہیں اپنی فکر کر۔" اس نے لالی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تو چوری ڈکیتی نہیں چھوڑ سکتا؟"

"چھوڑ تو دی تھی جی۔" لالی نے کہا۔ "میں نے اس بارے میں پہلے بھی بتایا تھا۔"

"تو وہی اپنی محبوبہ شاداں کی بات کرے گا۔" سلیم لودھی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر اس نے تجھے

دھوکا دیا' بے وفائی کی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تو خودکشی کر لے۔ یہ چوری ڈکیتی اختیار کرنا' سچ پوچھ تو خودکشی ہی کرنا ہوا۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔"

لالی سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اس نے سر اٹھا کر سلیم لودھی کو دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

"آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لگا سکتے؟"

"میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو آج کل خود بے روزگار ہوں۔"

"آپ تو جی کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔" لالی نے اسے یاد دلایا۔ "جیل میں تو جی آپ نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"پہلے میں انگریزی کا پروفیسر ہوتا تھا۔" سلیم لودھی نے لالی کو مطلع کیا۔ "مگر جب میں جیل سے رہا ہو کر کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔"

"ایسا کیوں کیا گیا جی؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں طلباء کو حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہوں' ان کو دہشت گردی پر اکساتا ہوں۔ تخریب کاری کرتا ہوں۔" سلیم لودھی نے بتایا۔ "اسی الزام میں مجھے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔"

"یہ تخریب کاری کیا ہوتی ہی جی؟"

"وہی باتیں جو میں چھوٹے چور اور بڑے چور کے بارے میں تجھے بتا رہا تھا۔" سلیم لودھی نے ہنس کر کہا۔ "حکومت کے نزدیک یہ تخریب کاری ہے۔ ملک دشمنی ہے۔"

"آپ نے تو جی سچی سچی گلاں کی تھیں' کچھ کچھ تو سمجھ بھی آتی ہیں۔"

"یہی تو لطیفہ ہے۔ سچ بات کہو تو تخریب کاری کہلاتی ہے۔ ملک دشمنی سمجھی جاتی ہے۔ جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔" سلیم لودھی کا لہجہ تیکھا تھا۔ "ایوب خان اپنے جرنیلوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح بندوق دکھا کر حکومت پر قبضہ کر لے تو اسے ڈاکہ زنی نہیں حب الوطنی کہا جاتا ہے۔ نظریہ ضرورت قرار دیا جاتا ہے۔" وہ روانی سے بولتا رہا۔ "مارشل لا لگا کر طرح طرح کے ضابطوں سے اپنے ہی ملک کے پرامن عوام کو ڈرایا دھمکایا جائے۔ جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو اسے غنڈہ گردی اور دہشت گردی نہیں' ملک اور قوم کی خدمت ثابت کرنے کے لیے ریڈیو اور اخبارات سے دن رات پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ کیسی کیسی قصیدہ خوانی ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "ادھر اپنا حال یہ ہے کہ سچ بات کہنا بھی چاہیں تو کہہ نہیں سکتے۔" وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بد نام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لالی نے اس کی باتوں میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اکتا کر بولا۔ ”ٹیم کیا ہو گیا ہے جی؟“

سلیم لودھی نے گھڑی اٹھا کر دیکھی۔ لالی کو بتایا۔ ”چار بجنے والے ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ جماہی لی۔ ”لگتا ہے تجھے نیند معلوم ہو رہی ہے۔ اب تو جا۔ جی چاہے تو کبھی آجانا۔ مگر چوری کے ارادے سے نہیں۔“

”ایسی گل نہ کریں جی۔“ لالی نے احتجاج کیا۔ ”آپ تو اب ادھر ہی ہوتے ہیں نا؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا' کب تک یہاں رہوں۔“ سلیم لودھی نے کہا۔ ”پتہ نہیں مری سے واپسی کے بعد بہنوئی مجھے اب ٹھیرنے بھی دے گا کہ نہیں۔ وہ میری وجہ سے حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ سرکاری ٹھیکیدار جو ٹھیرا۔“

سلیم لودھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ برآمدے سے گزر کر صحن میں پہنچے۔ سلیم لودھی نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھولا۔ لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لالی اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچا تو مسجدوں سے اذان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مشرقی افق پر ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیل رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ غنی چنّا بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“

”کوئی گڑبڑ' شڑ بڑ نہیں ہوئی۔“ لالی نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”پر کام نہیں بنا۔“

”کام نہیں بنا۔“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تو اب تک رہا کہاں؟“

” یار اب سونے دے۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔“ لالی نے بے زاری سے کہا۔ ”بعد میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

چنّا خاموش ہو گیا۔ وہ اس وقت لالی سے الجھنا نہ چاہتا تھا۔ لالی نے آنکھیں بند کیں اور گہری نیند سو گیا۔ وہ دوپہر تک بے خبر سوتا رہا۔

☆

سلیم لودھی کی باتوں کا لالی پر کچھ اثر ہوا تو یہ ہوا کہ رحیم داد کے خلاف اس کی نفرت دو چند ہو گئی۔ رات کو وہ چوری کے ارادہ سے نکلا۔ اس دفعہ اس نے ایک جنرل اسٹور تاکا۔ تالا توڑ کر دکان کے اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دکان کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر کی ایک دراز کی تلاشی لی

تو نقدی نظر آئی۔ رقم زیادہ نہ تھی۔ ۴۶۸ روپے تھے۔ لالی نے تمام روپے اٹھا کر جیب میں رکھے اور جس ہوشیاری سے دکان کے اندر پہنچا تھا اسی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے ہی روز اس نے ایک بار پھر ارشاد الٰہی کی تلاش شروع کر دی۔ وہ رحیم داد کے بارے میں جتنا غور کرتا اسی قدر اس کا یہ گمان پختہ ہوتا جاتا کہ وہ ارشاد الٰہی کا باپ نہیں ہو سکتا۔ ارشاد الٰہی کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی تو وہ کسی طرح پینتیس سے زیادہ نہ تھا۔ مستزاد یہ کہ ارشاد الٰہی سے بڑی ایک بہن بھی تھی جسے بلوائی اٹھا لے گئے تھے اور اس سے بھی بڑا ایک بھائی تھا جو تریموں کے پتن پر دریائے راوی کے کنارے سکھ حملہ آوروں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔

یہ تمام باتیں ارشاد الٰہی نے اسے بتائی تھیں۔ اس نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا اور اس کے بڑے بھائی بہن کا باپ ایک ہی تھا اور اس کی ماں نے دوسری شادی بھی نہیں کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ ادھیڑ تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال کہیں کہیں سے سفید بھی ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس رحیم داد جوان تھا اور اس کا ایک بھی بال سفید نہ تھا۔ علاوہ ازیں' حلیہ بہت حد تک تبدیل ہو جانے کے باوجود لالی کو اس کے چہرے کے خدوخال' آواز اور بات کرنے کے انداز میں اس رحیم داد کی جھلک نظر آتی تھی جو مدت تک اس کے ساتھ رہ چکا تھا۔

رحیم داد نے نہ صرف شاداں کو اس سے چھین لیا تھا بلکہ اسے ذلیل و خوار کر کے اپنی حویلی سے نکالا بھی تھا۔ لالی اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں ارشاد الٰہی اس کے لیے نہایت کار آمد اور موثر ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ رحیم داد کو بے نقاب کر سکتا تھا۔ گرفتار کرا سکتا تھا۔ سیف اللہ کے قتل اور جعلی کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی الاٹ کرانے کے جرم میں جیل بھجوا سکتا تھا۔ پھانسی پر لٹکوا سکتا تھا۔

چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد اس بار وہ ارشاد الٰہی کا سراغ لگانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ ان دنوں بھٹوں پر عام طور سے کام بند رہتا تھا۔ لہٰذا جتھیروں اور حصہ مزدوروں سے ملنا آسان تھا۔

جی ٹی روڈ کے ایک بھٹے کے واقف کار جتھیرے کے ذریعے اسے یہ اطلاع ملی کہ ارشاد الٰہی میلسی کے ایک بھٹے پر کئی مہینے سے کام کر رہا ہے۔

لالی اس روز ارشاد الٰہی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جی ٹی روڈ کے بھٹے پر ایک بار پھر گیا۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن تھا اور میلسی جا کر ارشاد الٰہی سے ملنے کا منصوبہ بنا رہا

تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی شام کا سماں تھا۔ بارش ہونے کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک کوئی راہ گیر دکھائی نہ دیتا تھا۔

بارش شروع ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ ناگاہ عقب میں ہارن کی آواز ابھری۔ لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جیپ سڑک پر دوڑتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ آن کی آن میں جیپ اس کے قریب پہنچی اور آگے نکل گئی۔ مگر کچھ فاصلے پر جا کر اس کی رفتار سست پڑگئی۔ جیپ رک گئی۔

جیپ میں رحیم داد بیٹھا تھا۔ اس نے اب ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور اکثر خود ہی جیپ چلاتا تھا۔ ان دنوں اس کا ڈرائیور بیمار تھا۔ لہٰذا اس وقت خود ہی جیپ چلا رہا تھا۔ وہ ایک بھٹے کے مالک سے ملنے کے بعد واپس کوٹلہ ہرکشن جا رہا تھا۔ اس نے لالی کو پہچان لیا تھا اور جیپ روک کر اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

لالی قدم بڑھاتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چلتے چلتے جیپ کے اندر جھانکا۔ رحیم داد اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ وھیل پر تھا اور دوسرے سے گیئر کو آہستہ آہستہ ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گیئر پھنس گیا ہے اور وہ اسے درست کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لالی نے بھی رحیم داد کو پہچان لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔ اسکی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ گیئر درست کرنے میں منہمک تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر نہ لالی کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی توجہ دینے کی کوشش کی۔

لالی نے نفرت سے رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ مگر وہ رکا نہیں۔ پیچ و تاب کھاتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ مسلسل رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جیپ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ لالی آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ اس نے فرلانگ بھر راستہ بھی نہ طے کیا ہو گا کہ سڑک پر جیپ کے پہیوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ لیکن اس نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

جیپ کے پہیوں کی آواز قریب آتی گئی۔ پھر اس قدر قریب آگئی کہ لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ جیپ سڑک سے اتر کر کچے راستے پر دھول اڑاتی طوفان کی مانند اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لالی کو فوراً

خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے تیزی سے نشیب میں اترنے کی کوشش کی۔ وہ سخت بدحواس اور سراسیمہ تھا۔

لالی نشیب میں جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ جیپ اس کے سر پر پہنچ گئی۔ اس زور سے ٹکرائی کہ لالی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ جیپ گرد کے بادل اڑاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد کچے راستے سے پھر پختہ سڑک پر پہنچ گئی۔ اور نہایت تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔

لالی گرد و غبار میں لتھڑا ہوا سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ سڑک ویران تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بادل ایک بار زور سے گرجے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

☆

اکتوبر کے نیم گرم نیم سرد شب و روز تھے۔ برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ مگر خلاف معمول کوٹلہ ہرکشن میں اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی تھیں۔ رات تاریک اور ساکت تھی۔ ہوا میں نمی تھی، سرسراہٹ تھی۔ لالی کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوا تو دس بج رہے تھے۔ بستی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف کیچڑ تھی۔ جگہ جگہ بارش کے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے تھے۔

لالی کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں سے بچتا بچاتا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا حویلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سنسان رات میں مینڈکوں کے زور زور سے ٹرانے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حویلی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ سامنے مہمان خانہ تھا اور اس سے متصل نادر خان کا مکان تھا۔ مکان پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ایک کھڑکی کی جھری سے روشنی اس طرح پھوٹ رہی تھی کہ اندھیرے میں زرد زرد دھبے کی مانند نظر آتی تھی۔ لیکن مہمان خانے میں اندھیرا تھا۔

وہ مہمان خانے کے دروازے کے قریب گیا۔ چوکنا نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مہمان خانے میں بھی خاموشی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ کچھ دیر اندھیرے میں دم سادھے کھڑا رہا، پھر نگاہیں اٹھا کر مہمان خانے کی چار دیواری کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ اس نے چاقو نکالا، کھولا اور دانتوں میں دبا لیا۔

اس نے دونوں ہاتھ بلند کیے، جسم سمیٹ کر زور سے اچھلا اور دیوار کے اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اچھلنے کے ساتھ ہی کمر میں ٹیس اٹھی۔ یہ اس چوٹ کی تکلیف تھی جو رحیم داد کی جیپ سے ٹکرانے کے باعث ریڑھ کی ہڈی میں آئی تھی۔ یہ چوٹ ایسی شدید تھی کہ وہ کئی روز تک بستر پر پڑا رہا۔ کروٹ بھی بدلتا تو درد سے بلبلا اٹھتا۔ اس چوٹ کے علاوہ جیپ کی ٹکر سے کمر اور ٹانگوں پر زخم بھی آئے تھے، مگر زیادہ گہرے نہ تھے۔ کوئی ہڈی پسلی بھی نہ ٹوٹی تھی۔ علاج معالجے سے وہ صحت یاب تو ہو گیا تھا، لیکن جھٹکا لگتا تو چمک کے ساتھ کمر میں ابھی تک درد ہوتا تھا۔

لالی دیوار سے چمٹ کر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ صحن بالکل خالی تھا۔ البتہ برآمدے میں ایک چارپائی نظر آرہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی سمت دیکھتا رہا۔ مگر نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز۔ وہ ٹانگیں لٹکا کر آہستہ سے نیچے اترا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نہایت احتیاط سے بیرونی دروازے کی کنڈی کھول دی تاکہ خطرے کی صورت میں آسانی سے باہر نکل جائے۔ وہ ہوشیار اور منجھا ہوا چور تھا اور ہر ایسا چور واردات سے پہلے فرار ہونے کا بندوبست کر لیتا ہے۔

وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ چارپائی کو قریب سے دیکھا مگر چارپائی خالی تھی۔ مہمان خانے کا ملازم موجود نہ تھا۔ لالی نے نہایت احتیاط سے کمروں کا جائزہ لیا لیکن سب خالی تھے۔ مہمان خانے کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد وہ پھر صحن میں آیا۔ گردن اٹھا کر اس دروازے پر پہنچا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ لالی نے آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ خاموشی سے اندر چلا گیا۔

حویلی میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ صدر دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار جاگ رہا تھا۔ اس کی کھنکار وقفے وقفے سے رات کی خاموشی میں ابھر رہی تھی۔ لالی حویلی کے طویل دالان میں داخل ہوا۔ بائیں ہاتھ کو اوپر جانے کا زینہ تھا۔ وہ آگے نہ گیا۔ زینے میں داخل ہوا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ چھت خالی تھی۔ مگر سامنے کے کمرے میں روشنی تھی۔

لالی نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں دبا لیا۔ نہایت ہوشیاری سے آگے بڑھا اور دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ لالی نے گردن بڑھائی۔ دروازے کی اوٹ سے اندر دیکھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں لیمپ روشن تھا۔ مدھم روشنی میں رحیم داد عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صرف بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس کی نیچے دھوتی تھی۔

اس لباس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر پر لیٹنے جا رہا ہے۔ لالی نے اسے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے سراسمہ ہو گیا۔ لیکن وہ جلدی ہی سنبھل گیا۔ رحیم داد اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ لالی نہایت خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ رحیم داد کو اس کی آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

لالی دہلیز کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا۔ ٹکٹکی باندھے نہایت چوکنا نظروں سے رحیم داد کو دیکھتا رہا۔ کئی لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ پھر لالی نے جرات سے کام لیا۔ ٹوہ لگانے کی غرض سے رحیم داد کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ "رحیمے!" اس کا یہ نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا۔ رحیم داد چونکا۔ فوراً پلٹ کر دیکھا۔ لالی کو روبرو پایا تو بوکھلا گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "تت' تت' تو لالی ہے!!" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

"ہاں' میں لالی ہوں۔" لالی نے اس کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں مر گیا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "تو نے تو اپنی جیپ چڑھا کر مجھے مار ڈالنے کی پوری کوشش کی تھی' پر میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں رحیمے۔"

"تو مجھے رحیمے کیوں کہہ رہا ہے؟؟" رحیم داد کے چہرے پر گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی چھا گئی۔ "میرا نام چوہدری نور الہٰی ہے۔ میں کسی رحیمے تحیمے کو نہیں جانتا۔"

"تو رحیمے کو نہیں جانتا تو آواز دینے پر پلٹا کیوں؟" لالی نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"تجھے دھوکا ہوا۔" اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ "میں نے تجھ سے جھگڑا نہیں کرنا۔" رحیم داد چاہتا تو شور مچا کر اپنے نوکروں کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ لالی کو پکڑ کر چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ پولیس کی تحویل میں جانے کی بعد وہ اس کے لیے اور خطرناک بن جاتا۔ لہٰذا اس نے صرف دھمکی پر اکتفا کیا۔ "اب تو یہاں سے چپ کر کے چلا جا ورنہ مجھے اپنے نوکروں کو بلانا پڑے گا۔"

"اسے دیکھا ہے۔" لالی نے جھٹ کھلا ہوا چاقو سامنے کر دیا۔ "آواز نکالی تو چھاتی میں ایسا اتار دوں گا کہ سانس بھی نہ لے سکے گا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ خونخوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اچانک وہ تیزی سے پلٹا۔ میز پر رکھا ہوا کانسی کا گلاس اٹھا کر لالی کے سر پر مارا۔ لالی بھی غافل نہ تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے سر ایک طرف کر لیا۔ گلاس اس کے کان کے پاس سے گزرتا ہوا کھڑکی کے پردے سے الجھ کر فرش پر گر گیا۔ اس کے گرنے سے ہلکی سی جھنکار ابھری۔ لالی نے مڑ کر اس

جانب دیکھا۔

لالی کی نظر بھٹکی تو رحیم داد نے فوراً موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے خود کو اسکی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے زور لگایا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ دونوں زور آزمائی کرنے لگے۔ لالی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رحیم داد میں اس سے کہیں زیادہ کس بل ہے۔ وہ پہلے سے اور قوی ہو گیا ہے۔ رحیم داد نے لالی کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر بے بس کر دیا تھا۔

لالی کے کے ہاتھ میں ہنوز چاقو دبا تھا۔ اس نے آخری حربے کے طور پر چاقو سے وار کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد نے اسے وار کرنے کا موقع نہ دیا۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر چاقو چھین نے کی کوشش کی۔ لالی نے مدافعت کی۔ اس چھینا چھپٹی میں چاقو لالی کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلا گیا۔

رحیم داد چاقو اٹھانے کے لیے جھپٹا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ زور سے جھٹکا دیا۔ رحیم داد لڑکھڑا کر گرا۔ لالی اس سے چمٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ رحیم داد نے اس بار بھی طاقت کے بل پر لالی کو زیر کر لیا۔ اسے مضبوطی سے پکڑا' زور لگایا اور ڈھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس نے لالی کو دیوار سے اڑا دیا۔ غضب ناک ہو کر تھپڑ اور گھونسے مارنے لگا۔ لالی خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ اس نے کسی طرح کی مزاحمت نہ کی۔ رحیم داد نے اس بری طرح دبا رکھا تھا کہ وہ مزاحمت کر بھی نہ سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ پولیس والوں کے ہاتھوں اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب پٹنے کا عادی ہو گیا تھا۔ پولیس تشدد کے ذریعے کبھی اس سے اقبال جرم کرانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ مار کھا کھا کر اس کی کھال سخت اور ہڈیاں مضبوط ہو گئی تھیں۔

رحیم داد اس پر جھکا ہوا تھا۔ بھر بھر کر مار رہا تھا۔ مارتے مارتے رحیم داد کے ہاتھ شل ہو گئے۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ لالی بظاہر نڈھال اور شکستہ نظر آرہا تھا۔ مگر موقعے کی تلاش میں تھا اس نے رحیم داد کا زور اور دباؤ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا تو فوراً خود کو سنبھالا۔ اپنی پیٹھ پوری طرح دیوار سے ٹکائی۔ دونوں پیر سمیٹے' تیزی سے اوپر اٹھائے اور رحیم داد کے پیٹ پر زور سے مارے۔ وہ اس اچانک اور شدید حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے جسم کا توازن کچھ اس طرح بگڑا کہ قدم اکھڑ گئے۔ وہ پلٹ کر فرش پر دھڑام سے گرا۔

لالی نے ایک بار پھر اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچنا چاہی۔ ٹانگ تو اسکے ہاتھ نہ آئی' دھوتی آ گئی۔ رحیم

داد کا نچلا دھڑ بالکل برہنہ ہو گیا۔ اس نے کروٹ لی۔ اٹھنا چاہا۔ لیکن لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دھوتی ایک طرف پھینکی۔ عقاب کی طرح جھپٹا اور اچھل کر اس قدر زور سے کمر پر لات ماری کہ رحیم داد فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

لالی پلٹا اور آگے بڑھ کر فوراً اپنا چاقو اٹھا لیا۔ رحیم داد کے پاس پہنچا اور گردن گھٹنے سے دبا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد اب بے بس ہو چکا تھا۔ وہ خاموش پڑا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے برہنہ کولہے پر زخم کا بڑا سا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اس نشان کو دیکھ کر چونکا اور بغور دیکھنے لگا۔ رحیم داد کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ رک رک کر گہری سانس بھر رہا تھا۔

لالی نے زخم کے نشان پر چاقو کی نوک آہستہ سے چھوئی۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "رحیمے!" رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "تو نے داڑھی رکھ لی۔ عینک لگانی شروع کر دی۔ ہر طرح اپنا حلیہ بدل لیا۔ نام بھی بدل لیا۔ پر تو اس نشان کو نہ بدل سکا۔" رحیم داد دم بخود پڑا رہا۔ لالی بولتا رہا۔ "تیری شناخت کا یہ نشان تو تھانے اور جیل' دونوں جگہ رجسٹروں میں لکھا ہے۔" اس نے رحیم داد کی گردن پر رکھے ہوئے گھٹنے کو دبایا۔ "اب چپ کر کے کیوں پڑا ہے؟ کہہ دے میں رحیم داد نہیں' چوہدری نور الٰہی ہوں۔ اور احمد کوٹ کا نہیں' ضلع گورداسپور کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہوں۔" اس نے اپنے گھٹنے کو ذرا سا اور دبایا۔

"میری گردن تو چھوڑ۔" رحیم داد نے تکلیف سے بے قرار ہو کر فریاد کی۔

"پہلے میری بات کا جواب دے۔" لالی نے اس دفعہ گھٹنے پر زور دے کر رحیم داد کی گردن کو زیادہ قوت سے دبایا۔

رحیم داد چیں بول گیا۔ "بتا دوں گا' سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے بلبلا کر عاجزی سے کہا۔ "میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔" وہ منہ کھول کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں تکلیف سے پھٹی ہوئی تھیں۔

لالی علیحدہ ہو گیا۔ اٹھا اور رحیم داد کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاقو بدستور اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر بے سدھ پڑا رہا۔ پھر اس نے پہلو بدلا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ دھوتی اٹھائی اور اسے باندھنے لگا۔ اس نے لالی سے نظریں نہ ملائیں۔ وہ نڈھال اور شکست خوردہ نظر آ رہا تھا۔

لالی نے چاقو لہراتے ہوئے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ "سامنے بیٹھ جا۔" رحیم داد گردن جھکائے ہوئے بڑھا اور بستر پر پیر لٹکا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے

پر ویرانی چھائی تھی۔

"رحیمے!" لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "یہ بتا، نہرباری دو آب کے نزدیک بُوں پر جیل کی وردی میں جو لاش ملی تھی، وہ کس کی تھی؟"

"تو اسے نہیں جانتا۔" رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ حکیم چشتی تھا۔"

"تجھے پتہ نہیں میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے ایک بار میرا علاج بھی کیا تھا۔ شادو مجھے اس کے پاس لے گیا تھا۔ وہ دوائی نہ دیتا تو میں کب کا مر چکا ہوتا۔ وہ بہت نیک بندہ تھا۔" لالی کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "اس کا خون کر کے تو نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"ان باتوں کو چھوڑ۔" رحیم داد نے اس دفعہ نظریں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ "صاف صاف بتا۔ تو چاہتا کیا ہے؟"

"پہلے یہ بتا، تو نے جیپ دوڑا کر مجھے جان سے مار دینے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

"صاف بات یہ ہے کہ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تو نے مجھے پہچان لیا۔" اس نے عذر پیش کیا۔ "مجھے تیری طرف سے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں تجھے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے حکیم کا بھی اسی لیے خون کیا تھا کہ اس نے جیل کی وردی میں مجھے دیکھ لیا تھا۔"

"تیری گھر والی نوراں اور بال بچے کہاں ہیں؟"

"وہ اس دنیا میں اب نہیں رہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "نوراں کو بھی مجھ پر شبہ ہو گیا تھا۔"

"تو نے جان بچانے کے لیے اپنی بیوی بچوں کا بھی خون کر دیا۔" لالی نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "مجھے یہ پتہ نہ تھا تو اتنا ظالم اور بے رحم ہے۔"

"میں نے ان کا خون نہیں کیا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "اس نے تیل چھڑک کر خود ہی آگ لگائی اور بچوں کے ساتھ جل کر مر گئی۔"

لالی کچھ نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔

☆

کمرے میں ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے نم آلود جھونکے آ رہے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پختہ چھت پر بارش کے قطروں سے ہلکا ہلکا جل ترنگ بج رہا تھا۔ رات سنسان اور بھیگی ہوئی تھی۔

"تجھے اچھی طرح پتہ ہے میں شاداں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس کے سوا دنیا میں کسی بھی عورت سے اتنا پیار نہیں کیا۔" لالی نے خاموشی کو توڑا اور افسردہ لہجے میں رک رک کر بولنے

لگا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی تو نے اس سے ویاہ کر لیا۔ اسے مجھ سے چھین لیا۔ مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی۔" اس کی باتوں سے اچانک تلخی جھلکنے لگی۔ "اب مجھ سے پوچھتا ہے میں کیا چاہتا ہوں؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ہاں' میں تجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔" لالی نے بڑے جوش سے کہا اور کھلا ہوا چاقو نکال کر سامنے کر دیا۔

رحیم داد نہ خوف زدہ ہوا نہ پریشان۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ "تو نے مجھے کتل کر دیا تو یہ بھی جان لے' تو بھی میری طرح اپنی جان بچانے کے لیے ایک کے بعد دوسرا کتل کرتا جائے گا۔ اور پھانسی کا پھندا ہر گھڑی تیرے سر پر خطرہ بن کر لٹکتا رہے گا۔" وہ نہایت اطمینان سے بول رہا تھا۔ "تو موت سے جتنا دور بھاگے گا وہ اتنا ہی تیرے نزدیک آتی جائے گی۔ ہر دم اس کے ڈر سے سہما ہوا رہے گا۔"

لالی نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کی دانش مندی اور سوجھ بوجھ سے دنگ رہ گیا۔ نئے ماحول اور نئے حالات نے اسے اس قدر تبدیل کر دیا ہے' لالی نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے نفرت اور کدورت کے چراغ بجھ گئے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

لالی کو خاموش پا کر رحیم داد نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "میں نے اپنے تجربے سے جو کچھ سیکھا' تجھے بتا دیا۔ آگے تیری مرضی۔" رحیم داد نے اسے مزید متاثر کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا۔ تو مجھے کتل کرنے ہی کے ارادے سے آیا تھا نا؟"

"نہیں' میں نے تجھے کتل نہیں کرنا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔" لالی نے پسپائی اختیار نہ کی۔ "پر میں نے تجھ سے بدلہ لینا ہے۔ اور ضرور لینا ہے۔"

رحیم داد جواب تک نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا' لالی کی بات سن کر بہت سٹپٹایا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تو کیا کرے گا؟"

"تو نے جس چوہدری نور الٰہی کے کلیم کے ذریعے اتنی وڈی متروکہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہی اس کا پتر ارشاد الٰہی زندہ ہے۔" لالی نے چبھتی ہوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "اور میں اسے جانتا ہوں۔"

"تو اسے کیسے جانتا ہے؟" رحیم داد کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے پھیل گئے۔

"جن دنوں میں ملک نثار کے بھٹے پر ہتھیرا لگا ہوا تھا' وہ بھی میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی جھگی میں اکٹھے رہتے تھے۔ وہ اپنے پیو کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" لالی بے باکی سے مسکرانے لگا۔ "تو صاف صاف سننا چاہتا ہے تو وہ بھی سن لے۔ میں ارشاد الٰہی کی جانب سے تیرے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرواؤں گا۔ قتل اور جعل سازی کے الزام میں تجھے گرفتار کرواکر مکدمہ چلواؤں گا۔ آگے جو کچھ ہونا ہے' اس کے بارے میں تو خود اندازہ لگا سکتا ہے۔"

لالی اس کا فوری رد عمل معلوم کرنا چاہتا تھا' مگر رحیم داد بالکل خاموش رہا۔ چند لمحے بعد اس نے لالی سے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔ "یہ بتا' تجھے شاداں سے بہت محبت ہے؟"

"ہاں!" لالی نے تعجب سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پر تو مجھ سے یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے گرفتار کروایا تو یہ بھی سمجھ لے تیری شاداں بھی نہیں بچے گی۔" رحیم داد گردن اٹھائے نہایت سنبھلے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں زمین دارانہ طنطنہ تھا۔

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "اس نے کیا کیا؟"

"میں نے سیف اللہ اور حکیم چشتی کا خون کیا ہے تو شاداں نے بالے کا۔" رحیم داد نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تو اس راز کو پوری طرح جانتا ہے۔ تو جہانگیرہ کے اس مکان کی کوٹھڑی کو بھی جانتا ہے جس میں تو نے بالے کی لاش دبائی تھی۔" اس نے براہ راست دھمکی دی۔ "تو نے لاش ٹھکانے لگانے میں شاداں کی مدد کی تھی۔ اس کو اعانت جرم کہا جاتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی قانونی سوجھ بوجھ سے لالی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ "اس الزام میں شاداں کے ساتھ تو بھی گرفتار ہو گا۔ تیرے خلاف بھی مکدمہ چلے گا۔ آگے جو کچھ ہو گا' وہ تجھے سوچنا ہے۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ لالی بہت چکرایا۔ اس نے صورت احوال کے اس پہلو کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ بالا کے قتل کی واردات کو قطعی طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "میں نے تو اپنے بارے میں سوچ لیا۔ یہ بتا تو نے شاداں اور اپنے بارے میں کیا سوچا؟"

"میرے خلاف تو ہر کارروائی کر سکتا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی گل بات نہیں۔" لالی نے رحیم داد کو خبردار کیا۔ "پر شاداں تو تیری گھروالی ہے۔ تو اسے پیار بھی کرتا ہے۔ پیار نہ کرتا تو اسے ویاہ کیوں کرتا۔"

"مجھے شاداں سے کوئی پیار شیار نہیں۔" رحیم داد نے نہایت حقارت سے کہا۔ "میں نے اسے

نہیں بلایا تھا۔ وہ خود ہی میرے پاس آئی تھی اور منتیں کر کے میری حویلی میں نوکرانی لگ گئی تھی۔"

"اگر ایسی ہی گل بات ہے تب تو نے اس سے ویاہ کیوں کیا؟"

"وہ تو میری ایک ضرورت تھی۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "مجھے جلد سے جلد ویاہ کرنا تھا اور اس لیے کرنا تھا کہ زرعی اصلاحات کے تحت حکومت میری سیکڑوں ایکڑ اراضی ضبط کر لیتی۔ اسے بچانے کے لیے مجھے ایک گھر والی چاہیے تھی جس کے نام عارضی طور پر میں اپنی کچھ اراضی علیحدہ کر سکتا تھا۔ گوشواروں کی خانہ پری کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔" رحیم داد بے باکی سے مسکرانے لگا۔ "مجھے شاداں ہی ایسی زنانی نظر آئی جسے میں فوری طور پر اپنی گھر والی بنا سکتا تھا۔ سچ پوچھ تو ان دنوں وہ مجھے بہت سوہنی بھی لگ رہی تھی۔"

"پر اب تو وہ تیری گھر والی ہے۔ تجھے اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔" لالی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"کیوں نہیں سوچنا چاہیے؟" رحیم داد یکایک بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "تجھے پتہ ہے، میں وڈا زمیں دار ہوں، عزت دار ہوں۔ شاداں ایسی کمی زنانی کو جو میری ہی حویلی میں نوکرانی رہ چکی ہو، کب تک اپنی گھر والی بنا کر رکھ سکتا ہوں؟ مجھے آگے کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ مجھے اپنی نسل خراب نہیں کرنی۔"

"تو کیا تو اسے چھوڑ دینا چاہتا ہے؟"

"بالکل چھوڑ دوں گا۔ بلکہ اب تک اسے چھوڑ بھی چکا ہوتا۔ پر مسجد کے ملاں نے روک دیا۔ کہنے لگا جب تک وہ حاملہ ہے طلاک نہیں ہو سکتی۔ شرع اس کی اجازت نہیں دیتی۔" رحیم داد نے اپنے ارادے سے کھل کر لالی کو آگاہ کیا۔ "میں تو یہ مہینہ ختم ہوتے ہی دوسرا ویاہ کرنے والا ہوں۔ احسان شاہ کی ایک بیوہ بھین کی بیٹی سلیمہ کے ساتھ رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔"

"یہ احسان شاہ کون ہے؟" لالی نے کرید کر پوچھا۔

"میرا بہت گہرا یار ہے۔ ادھر کا وڈا اور خاندانی زمین دار ہے۔" رحیم داد نے نہایت فخر سے بتایا۔ "تو اسے نہیں جانتا۔ شاداں جانتی ہے۔"

"شاداں کو یہ بھی پتہ ہے کہ تو دوسرا ویاہ کرنے والا ہے اور اسے طلاک دینا چاہتا ہے؟"

"میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے پتہ چل گیا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "لگتا ہے، نادر خان کی گھر والی، جنت نے اسے ضرور کچھ نہ کچھ بتا دیا ہے۔ تب ہی پچھلے کئی روز سے وہ روٹھی روٹھی نظر آتی ہے۔ رات بھی نیچے ہی کے کمرے میں رہی۔ یہاں کم

ہی آتی ہے۔ آج سویرے اس نے مجھ سے بات بھی کرنی چاہی۔ میرا خیال ہے وہ اسی سلسلے میں مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی' پر میں نے اسے ٹال دیا۔"

"تو نے یہ بھی سوچا طلاک ہونے کے بعد وہ اپنے بچے کے ساتھ کہاں جائے گی؟" لالی نے شاداں کے لیے شدت کے ساتھ جذبہ ہمدردی محسوس کیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "اس کا تو کوئی بھی نہیں۔ وہ کس کے پاس جائے گی۔ کیا کرے گی؟ کیسے گزر بسر کرے گی؟"

"پہلے بھی تو کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتی تھی۔ آگے بھی کر لے گی۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ "میں نے کوئی اس کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

لالی اس کے زمیں دارانہ طنطنے پر پہلے ہی بھنایا ہوا تھا۔ برابر ضبط سے کام لے رہا تھا۔ دل ہی دل میں سلگ رہا تھا۔ رحیم داد کی کھلی خود غرضی کے اس مظاہرے پر وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ دانت پیس کر بولا۔ "بکواس نہ کر۔" وہ تیزی سے جھپٹا اور رحیم داد کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو سامنے کر کے غصے سے لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔ "یہ پورا گردن میں اتار دوں گا۔ آواز بھی نہ نکل سکے گی۔" اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ "تجھے اپنی عزت اور نسل کے خراب ہونے کا ایسا ہی خیال تھا تو اس سے ویاہ کیوں کیا؟"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ لالی بڑبڑاتا رہا۔ "تیری تو عزت ہے' اس کی کوئی عزت نہیں۔" لالی نے جھنجلا کر رحیم داد کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ لالی نے اچھل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ لات ایسی کراری لگی کہ رحیم داد لڑکھڑا کر پلنگ سے نیچے گر گیا۔ لالی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ جھٹ اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد اس قدر بدحواس ہو گیا کہ منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لالی کی آواز ابھرتی رہی۔ "خونی' دھوکے باز۔" اس نے حقارت سے منہ بگاڑا۔ "کہتا ہے میں وڈا زمیں دار ہوں' عزت دار ہوں۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا عزت دار ہے۔ آخ تھو!" لالی نے غضب ناک ہو کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"میری گل تو سن۔" رحیم داد گھگیانے لگا۔

"بہت سن لیں تیری گلاں۔" لالی نے اس کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ چاقو لہرا کر بولا۔ "تیرے جیسے پاپی اور کمینے کو میں نے زندہ نہیں چھوڑنا۔"

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا تو مجھے کتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

"پر اس کا انجام بھی سوچ لے۔" اس نے لالی کو دبی زبان سے دھمکی دی۔ "اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے' سب پتہ ہے۔" لالی کے غصے کا جھاگ اب آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا تھا۔ رحیم داد نے بھی اسے بھانپ لیا۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ "مجھے جان سے مار کر تجھے کیا ملے گا؟"

لالی خاموش رہا۔ رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ "پہلے میری ایک گل سن لے۔ بعد میں جو تیرا جی کرے کرنا۔"

لالی بدستور خاموش رہا۔ مگر رحیم داد کے سینے پر سے اتر کر علیحدہ ہو گیا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "تو اجازت دے تو منجی پر بیٹھ جاؤں۔"

"بیٹھ جا۔" لالی نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔

رحیم داد اٹھا اور ایک بار پھر پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا طنطنہ اور طمطراق کافور ہو گیا تھا۔ منہ لٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔

☆

بارش اب رک گئی تھی مگر ہوا تیز تھی اور درختوں میں سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کالی اور سنسان تھی۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ لیمپ کی لو ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے ڈگمگا رہی تھی۔ اس کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں دیواروں پر پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

رحیم داد نے سر اٹھایا۔ لالی کی طرف دیکھا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "ایک تجویز سمجھ آتی ہے۔ پر اس کے لیے مجھے تیری مدد چاہیے ہو گی۔"

"کیا تجویز ہے؟" لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تو شاداں سے پیار کرتا ہے نا۔" رحیم داد نے لالی کے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں۔ "ایسا کر' تو اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس میں ہم تینوں ہی کا بھلا ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "نہ تو مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ارشاد الٰہی کی مدد کے بارے میں سوچے گا اور نہ مجھے شاداں اور تجھے گرفتار کرانے کے لیے پولیس کو بالے کے کتل کا راز بتانے کی ضرورت پڑے گی۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "تجھے تیری شاداں مل جائے گی۔"

"تو اپنی چار سو بیسی سے باز نہیں آئے گا۔" لالی نے جل کر اسے گالی دی۔ "میں تیرا مطلب ٹھیک طرح سمجھ گیا۔" اس نے نفرت سے رحیم داد کو دیکھا۔ "ایسا کر کے شاداں سے تیرا پنڈ بھی چھوٹ جائے گا۔ شان سے نیا ویاہ کرے گا۔ وڈا زمیں دار بن کر عیش کرے گا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "یہی چاہتا ہے نا؟ رحیمے تو بہت کتی چیز ہے۔"

"پہلے میری پوری گل تو سن لے۔" رحیم داد نے گالیاں سن کر بھی کسی برہمی کا اظہار نہ کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرے پاس تیرے چار ہزار روپے ہیں۔ وہی جو تو نے ہمیانی میں رکھ کر مجھے نہرباری دو آب کے ٹبوں پر دیے تھے۔ یاد ہے نا؟"

"کیوں نہیں یاد؟ بالکل یاد ہے۔" لالی نے گردن ہلا کر کہا۔ "یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔"

"میں صرف چار ہزار نہیں، تجھے دس ہزار روپے دوں گا۔" رحیم داد نے کھل کر اپنی تجویز لالی کے سامنے رکھی۔ "اتنے روپے سے تو کوئی بھی دھندا شروع کر سکتا ہے۔ شاداں کے ساتھ آرام سے رہ سکتا ہے۔"

تجویز معقول تھی اور دل کو بھی لگتی تھی۔ مگر لالی بھی کم کائیاں اور گھاگ نہ تھا۔ جیل میں ہر طرح کے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ عرصہ دراز تک رہ چکا تھا۔ ان میں چور اچکے، سٹے باز، جعل ساز، بلیک میلر، سب ہی شامل تھے۔ نہایت فخر سے اپنے کارنامے سناتے تھے۔ طرح طرح کے گر اور ہتھکنڈوں سے آگاہ کرتے تھے۔ اس وقت لالی کا پلا بھاری تھا۔ رحیم داد دبا ہوا تھا۔ لالی نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سودے بازی کرنا چاہی۔ کہنے لگا۔ "دس ہزار تو بہت کم ہوئے، ۵۰ ہزار تو دے۔" لالی کا غصہ رفع ہو چکا تھا۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا ہو چکی تھی۔

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" رحیم داد نے بھنا کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"دماغ میرا خراب ہو گیا یا تیرا۔" لالی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تو اتنا وڈا زمیں دار ہے۔ تیرے پاس سیکڑوں کلا زمین ہے۔ رہنے کو شاندار حویلی ہے۔ سواری کو جیپ ہے۔ کام کرنے کو نوکر چاکر ہیں۔ کیا نہیں ہے تیرے پاس؟ عیش کر رہا ہے۔"

"تو اپنی گل کر۔" رحیم داد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اس دفعہ اس کا رویہ نرم تھا۔ "لالچ میں نہ پڑ۔ بعد میں پچھتائے گا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "سوچ لے۔"

"سوچ لیا، سوچ لیا۔" لالی ذرا مرعوب نہ ہوا۔ "سوچنا تو تجھے ہے۔" اس نے پینترا بدلا، رحیم داد کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو صرف لاش ٹھکانے لگائی تھی۔ اور لاش ٹھکانے لگانے یا دبانے کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کی سزا ہو گی۔ پہلے بھی کاٹ چکا ہوں، ایک بار اور کاٹ لوں گا۔" اس نے رحیم داد کو کھل کر خطرے سے خبردار کیا۔ "تو نے تو ایک سے زیادہ کتل کیے ہیں۔ اور کتل کی سزا پھانسی ہی ہوتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو نے نہیں، پر شاداں نے تو بالے کا کتل کیا ہے۔" رحیم داد نے بھی لالی کی کمزوری سے فائدہ

اٹھانے کی کوشش کی۔

"تو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے؟" لالی کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔ اس نے رحیم داد پر رعب جمانے کی کوشش کی۔ "تجھے پتہ ہے کہ زنانی کے لیے کتل کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔ میں ایک بار نہیں کئی بار جیل جا چکا ہوں۔ مجھے کنون کے بارے میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔ میں نے تو کبھی کسی زنانی کو پھانسی پر لٹکتے نہ دیکھا نہ سنا۔" اس کے ہونٹوں پر [illegible] نمودار ہوا۔ "تو اپنی فکر کر۔ تو کتلِ عمد کے جرم میں دفعہ ٣٠٢ کے تحت پھانسی سے نہیں بچ سکتا۔

"اس کا فیصلہ تو نے نہیں عدالت نے کرنا ہے۔" رحیم داد نے [illegible] ع میں تاویل پیش کی۔ مگر لالی کی باتیں سن کر وہ دہل گیا تھا۔ اسے مطلق اندازہ نہ تھا [illegible] بوجھ کے معاملے میں لالی اس سے [illegible]۔ لالی کی دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس نے لالی سے الجھنے کی کوشش نہ [illegible] لیا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"کڑوی [illegible] ے کی کل [illegible] رنے سے نہ تجھے فائدہ [illegible] نہ مجھے اور نہ ہی شاداں کو۔ ایسی [illegible] کر جس [illegible] کا بھلا ہو۔"

" [illegible] وں۔" لالی نے بھی [illegible] سے کام لیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کر۔ تو نے چوہدری نور الٰہی کے کلیم [illegible] متروکہ جائیداد الاٹ کرالی۔ تو اس میں سے مجھے [illegible] کی نہیں دے [illegible]

"تجھے پتہ نہیں۔ یہ [illegible] اد میں نے بڑی اپنی کوشش سے الاٹ کرائی ہے۔ چوہدری نور الٰہی تو برسوں بھاگ دوڑ کرے اور سرکاری دفتروں کے دن رات چکر کاٹنے کے بعد بھی ساڑھے باراں کلا گزارہ اراضی بھی الاٹ نہ کرا سکا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "وہ تو بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ تخت ہزارہ کے نزدیک ایک چک میں پڑا خون تھوکتا تھا۔ اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ بالکل اکیلا تھا۔ سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے رحیم داد کو نہ روکا اور نہ ہی ٹوکا۔ وہ اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔

بات کہتے کہتے رحیم داد نے کاروباری پینترا بدلا۔ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "لالی، میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔" اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "سچی گل بات یہ ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں جتنا تو مانگ رہا ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح ٢٥ ہزار روپے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ نرم اور سرپرستانہ ہو گیا۔ "میرا

کہنا مان۔ اتنا روپیہ لے لے۔ اس سے تو کوئی بھی اچھا کاروبار کر سکتا ہے۔ چوری ڈکیتی چھوڑ۔ اس میں ہردم جیل جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ تو کب تک جیل کاٹتا رہے گا۔ نیک بندہ بننے کی کوشش کر۔ میں تو تجھے ابھی تک اپنا یار بیلی سمجھتا ہوں۔" اس کا رویہ ناصحانہ ہو گیا۔ اس میں اپنایت تھی۔ بے تکلفی تھی۔ "تو لہور میں نہ رہنا۔ پولیے تجھے آرام سے رہنے نہیں دیں گے۔ طرح طرح سے تنگ کرتے رہیں گے۔ پہلے تو یہی پوچھیں گے کہ کاروبار کرنے کے لیے تیرے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ میری گل بات کا مطلب تو سمجھ رہا ہے ناں؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں۔" لالی نے اختلاف رائے نہ کیا۔ "تو اپنی بات پوری کر۔"

"میرا تو مشورہ یہ ہے کہ تو کراچی چلا جا۔ وہاں نہ تجھے پولیس کا ڈر ہوگا نہ جان پہچان والوں کا۔" رحیم داد نے لالی کو رسان سے سمجھایا۔ "کراچی بہت وڈا شہر ہے۔ وہاں تو آرام سے کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر سکتا ہے۔" وہ کھل کر بے تکلفی سے مسکرایا۔ "شاداں کو اپنی ساتھ لے جا۔ عیش کر۔ آرام سے زندگی بسر کر۔ جو کچھ تو نے اب تک کیا اسے بھول جا۔ آگے کی سوچ۔"

رحیم داد نے لالی کو شیشے میں اتارنے کے لیے ہر نفسیاتی حربہ اور ہر گر آزمایا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی بر آمد ہوا۔ لالی اس کی تجویز پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے زندگی کے ایسے نشیب و فراز سمجھائے اور ایسی فضا پیدا کی جس کے حصار سے باہر نکلنا مشکل تھا۔

لالی خاموش بیٹھا رہا اور گردن جھکائے سوچتا رہا۔

رحیم داد نے اسے خاموش پایا تو کسی قدر بے چین ہو کر پوچھا۔ "لالی تو کس سوچ میں پڑ گیا۔ تجھے میری تجویز منظور نہیں؟"

"سوچ رہا ہوں' میں نے تیری تجویز مان بھی لی' پر سوال یہ ہے کہ شاداں بھی اس کے لیے تیار ہو گی کہ نہیں؟" لالی نے کھل کر اپنے تذبذب کا اظہار کیا۔ "اس بارے میں پہلے اس سے بھی پوچھنا ہو گا۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

لالی کی بات دل لگتی تھی۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی خاموش تھا۔

۵۲

لالی اور رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔

آخر کمرے کے گہرے سکوت میں لالی کی آواز ابھری۔ "رحیمے' تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا' اچانک باہر چھت پر قدموں کی آہٹ ابھری۔

لالی اور رحیم داد نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

شاداں اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ لالی کو کمرے میں دیکھ کر وہ دہلیز پر ٹھٹکی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

رحیم داد نے اس کا استعجاب نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "شاداں' تو ابھی تک جاگ رہی تھی؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" شاداں بدستور دہلیز پر کھڑی رہی۔

"ادھر کیوں کھڑی ہے؟" رحیم داد نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ "ادھر آ کے بیٹھ۔"

شاداں وہاں ٹھہرنا تو نہیں چاہتی تھی مگر لالی کو اتنی رات گئے رحیم داد کے کمرے میں دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئی تھی اور یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی کہ وہ رحیم داد کے پاس اس اندھیری رات میں کیوں آیا ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ وہ ان سوالات پر غور کرتی ہوئی آہستہ آہستہ

آگے بڑھی۔ مگر رحیم داد کے قریب بستر پر نہ بیٹھی۔ ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

کمرے میں سکوت تھا۔ شاداں زیادہ دیر اپنی بے چینی قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا' استفسار کیا۔ "تو یہاں کیسے آیا؟" لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ وہ گم صم بیٹھا رہا۔ اسے خاموش پا کر وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چوہدری' تو نے اسے بلایا ہے؟" شاداں نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ کیوں آیا اور کیسے آیا؟ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "پہلے یہ بتا' تو اتنی رات گئے کیسے ادھر آگئی؟"

"میرے یہاں آنے کی مناہی ہے؟" شاداں نے تند لہجے میں پوچھا۔ "جب چاہوں' جس وکھت چاہوں آسکتی ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"تجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تو بالکل یہاں آسکتی ہے۔ یہ تیرا اپنا گھر ہے۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "میں سمجھا تو نے کوئی خاص گل بات کرنی ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" شاداں کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ "میں نے تجھ سے ایک خاص ہی گل کرنی تھی۔ پر اب نہیں کروں گی' کل کرلوں گی۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیا گل کرنا چاہتی ہے۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "میں دوسرا ویاہ کر رہا ہوں۔ تو یہی معلوم کرنا چاہتی ہے نا؟" وہ بے نیازی سے مسکرایا۔ "اس بارے میں تجھے جنت نے بتایا ہو گا۔"

"میں اس کنجری سے بات نہیں کرتی۔" جنت کا نام سن کر شاداں پھٹ پڑی۔ جو بات وہ لالی کے سامنے کرنا نہ چاہتی تھی' جھنجلاہٹ میں بے ساختہ زبان پر آگئی۔ "پر اس نے حویلی کی ساری ہی نوکرانیوں میں یہ بات پھیلا دی ہے۔ شام ہی کو کریماں نے بھی مجھے یہی بات کہی تھی۔ وہ جنت کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آئی تھی۔" اس نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "وہ کنجری ایسی گلاں کیوں کر رہی ہے؟ بتا وہ ایسا کیوں کہتی ہے۔؟"

"سچ بات سننا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں میں سچ ہی بات سننا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ بدستور تند اور تیکھا تھا۔

"جنت نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ وہ اب ذہنی طور پر اپنے ارادے سے شاداں کو آگاہ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

مگر شاداں ایسی بات رحیم داد کے منہ سے سننے کے لیے ذہنی طور پر بالکل آمادہ نہ تھی۔ حیرت

سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہاں!" رحیم داد نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بات میں اب تجھ سے چھپانا نہیں چاہتا۔"

شاداں غصے سے تڑپ کر بولی۔ "اگر تو نے ایسا کیا تو یہ بھی سن لے۔ میں نے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ ہرگز نہیں رہنا۔"

"کیا کرے گی؟" رحیم داد نے اس کا ارادہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ ہی کروں گی' جو جی کرے گا کروں گی۔" وہ غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ ویسے اسے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہو گا۔ وہ کس طرح اس کا اظہار کرے گی۔ اس نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اب تک اس نے جس بات کو محض افواہ سمجھا تھا اچانک حقیقت بن کر سامنے آگئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں تو جو کچھ کرنا چاہتی ہے' اس کے بارے میں آرام سے گل بات ہو جائے۔" رحیم داد نے نرم اور سلجھے ہوئے لہجے میں اظہار خیال کیا۔ "اگر تو یہاں نہیں رہنا چاہتی تو اس پر بھی سوچا جا سکتا ہے۔"

"کیا تو مجھے چھوڑ دینا چاہتا ہے؟" شاداں نے پریشان ہو کر اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔

"ارادہ تو میرا یہی ہے۔" اس نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ "اس بارے میں لالی سے بات بھی کر چکا ہوں۔"

"یہ میرا اور تیرا معاملہ ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ "یہ بیچ میں بولنے والا کون ہوتا ہے۔ اس نے کیا لینا؟"

لالی نے مداخلت کی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "رحیمے' میری گل سن۔" لالی نے جان بوجھ کر اسے رحیمے کہا۔ وہ شاداں کو ذہنی جھٹکا دینا چاہتا تھا۔ وہ جھٹکا لگا بھی۔ شاداں ہکا بکا ہو کر لالی کا منہ تکنے لگی۔ چند لمحے وہ اسی عالم میں بیٹھی رہی' پھر اس نے پوچھا۔ "تو نے چوہدری کو رحیمے کیوں کہا؟" اس کے لہجے میں تجسس اور بے چینی تھی۔

"میں اسے ہمیشہ رحیمے ہی کہتا ہوں۔" لالی نے گردن اٹھا کر پر اعتماد لہجے میں کھل کر انکشاف کیا۔ "تجھے پتہ ہے یہ کون ہے؟" اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ چوہدری نور الٰہی نہیں' میرا پرانا یار رحیم داد ہے۔"

شاداں نے یقین نہ آنے کے انداز میں رحیم داد سے دریافت کیا۔ "لالی سچ کہہ رہا ہے؟ تو رحیم داد ہی ہے؟" وہ سخت حیران و پریشان تھی۔

رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

لالی نے شاداں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''اس۔ یہ پوچھ رہی ہے؟ مجھ سے بات کر۔'' وہ رحیم داد کی زمیں دارانہ شان و شوکت کی بلند و بالا عمارت توڑ پھوڑ کر نہ صرف ملبے کا ڈھیر بنا دینا چاہتا تھا بلکہ شاداں کو اس کی پر کشش شخصیت کے حصار سے باہر بھی لانا چاہتا تھا۔ ''اس نے سیف اللہ ہی کا خون نہیں کیا، حکیم چشتی کا بھی کتل کیا ہے۔ چوہدری نور الٰہی بن کر اس کے کلیم کے ذریعے جعل سازی سے اتنی وڈی متروکہ جائیداد بھی الاٹ کرائی ہے۔ وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔''

رحیم داد کو اس کی باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اس نے جھنجلا کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ لالی نے بھی اس کی برہمی محسوس کی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ شاداں کو ایک اور زوردار ذہنی جھٹکا دیا۔ ''تو نے اسے اب تک نہیں پہچانا۔ جب تو نے بالے کا خون کیا تھا تو اس رات یہ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اور اس نے مل کر تیرے مکان کی کوٹھڑی میں کھدائی کی تھی۔ اور بالے کی لاش اس میں دبائی تھی۔ یاد ہیں نا تجھے وہ ساری باتیں؟''

رحیم داد کے چہرے پر چھایا ہوا غم و غصہ زائل ہو گیا۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مگر لالی نے اس دفعہ شاداں کو جو ذہنی جھٹکا دیا تھا وہ اس قدر لرزہ خیز تھا کہ وہ بد حواس ہو گئی۔ تڑپ کر بولی ''ہائے ربا، ایہہ کیہہ ہو گیا؟ میں کیہہ کراں؟'' وہ خود پر قابو نہ پا سکی۔ بے قرار ہو کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے کر رخساروں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ شاداں اب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔ اس کی ساری تیزی طراری ختم ہو گئی تھی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اس طرح ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلے گا۔ بول، اب کیا کہتی ہے؟ تجھے ساری ہی باتوں کا ٹھیک طرح پتہ چل گیا۔ بتا اب تو نے آگے کیا کرنا ہے؟''

''سمجھ نہیں آتی، کیا کہوں؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بے بسی سے بولی۔

''تجھے سمجھ نہیں آتی۔ پر میں نے اور لالی نے مل کر ایک تجویز سوچی ہے۔'' اس دفعہ رحیم داد نے بات شروع کی۔ ''تجویز یہ ہے کہ لالی تجھے اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔''

''میں نے اس کے ساتھ نہیں جانا۔'' شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔ ''مجھے اس کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو تجھ سے ویاہ کیوں کرتی۔'' اس نے کھا جانے والی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ''یہ چوری ڈکیتی کرے گا۔ جیل جائے گا۔ میں نے ایسے خطرناک بندے کے ساتھ نہیں رہنا۔''

''میں اسے ۲۵ ہزار روپے دوں گا، جس سے یہ کراچی میں کوئی بھی ٹھیک ٹھاک دھندا شروع کر سکتا ہے۔'' رحیم داد نے شاداں کو رضامند کرنے کے لیے اپنی تجویز کھل کر بیان کی۔ ''اسے چوری

ڈکیتی کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ محنت سے اپنا کام دھندا کرے گا۔ تجھے آرام سے اپنی گھر والی بنا کر رکھے گا۔"

"میں نے تو اس سے وعدہ کرنے کے بعد چوری ڈکیتی بالکل چھوڑ دی تھی۔" لالی نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میرے خلاف تو ملک نثار محمد نے چوری کا جھوٹا مکدمہ بنایا تھا۔ میں نے اس کے بھٹے سے فرار ہو کر بتھیروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرایا تھا۔ اس لیے اس نے مجھ سے بدلہ لیا۔ پولیس کے ساتھ مل کر مجھے جیل بھجوا دیا۔" اس نے براہ راست شاداں کو مخاطب کیا۔ "شاداں، تجھے تو ٹھیک سے پتہ ہے۔ بھٹوں میں بتھیروں پر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ تو نے تو میرے ساتھ بھٹے پر کام بھی کیا ہے۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

شاداں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ گردن جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے زور دے کر اس سے پوچھا۔ "بول، تو نے کیا سوچا۔ تجھ سے اب کچھ بھی چھپا نہیں۔ ساری باتیں تیرے سامنے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، اس میں ہم تینوں ہی کا بھلا ہے۔" اس نے قائل کیا، پھر کھل کر اپنے ارادے سے شاداں کو آگاہ کیا۔ "ویسے میں تجھے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"میں نے بھی تیرے ایسے خونی اور دھوکے باز کے ساتھ نہیں رہنا۔" شاداں نے جل کر کہا۔

لالی نے جھٹ مداخلت کی۔ "رحیمے، جب تک تو اسے طلاک نہیں دے گا یہ میرے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟"

"جب یہ اپنے پہلے خصم کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ جہانگیرہ میں رہتی تھی، تب اس نے کون سی طلاک شلاک لے رکھی تھی۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

"پرانی گلاں نہ نکال۔" شاداں نے بھنا کر رحیم داد کو ٹوکا۔ "میں نے اب ایسا نہیں کرنا۔"

"ویسے تو جب نکاح کی لکھا پڑھی نہ ہوئی تو طلاک کا کاغذ لکھنے سے کیا فائدہ؟" رحیم داد نے شاداں سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "تو کہتی ہے تو میں کاغذ لکھ کر بھی دے دوں گا۔ ویسے میری طرف سے تجھے پوری اجازت ہے جہاں جی کرے رہے۔ میری رائے پوچھ تو میں یہی کہوں گا، تجھے لالی سے اچھا گھر والا نہیں ملے گا۔ یہ جتنا تجھے پیار کرتا ہے، کوئی نہیں کر سکتا۔" اس نے مڑ کر لالی پر نظر ڈالی۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"یہ تو اسے بھی ٹھیک طرح پتہ ہے۔" لالی نے جذباتی ہو کر شاداں کی جانب دیکھا۔ گہری سانس بھری۔ آواز میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوں پر یہ

بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہے کہ نہیں؟"

شاداں نے کچھ نہ کہا' نہ لالی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"تو اس کی فکر نہ کر۔ مجھے پتہ ہے یہ تیرے ساتھ چلی جائے گی۔ اب تو آگے کی سوچ۔" رحیم داد نے اپنے طور پر بات ختم کر دی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو جا کر آرام سے مہمان خانے میں سو۔ ساری باتیں تو سمجھ لے طے ہی ہو گئیں۔ میں نے اب تجھے روپیہ دینا ہے۔ اس کا بھی کل ہی کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بندوبست کر دوں گا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گا۔ لالی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ رحیم داد نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ "میں تیرے ساتھ مہمان خانے میں چلوں گا۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ اتا پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے' وہاں نوکر بھی نہ ہو گا۔ اسے کل شام سے بخار ہے۔ سویرے کسی دوسرے نوکر کا بندوبست ہو جائے گا۔ تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہو گی۔"

وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ شاداں نے نگاہیں اٹھا کر دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر نہ کچھ بولی اور نہ ہی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ہر وقت جھلملاتے ہوئے چراغ بجھ گئے تھے۔ وہ شکستہ اور دل گرفتہ نظر آ رہی تھی۔

☆

آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد اور لالی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زینے میں داخل ہوئے۔ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچے۔ مہمان خانے میں جانے والا دروازہ ہوا سے پاٹوں پاٹ کھل گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے نظرانداز کر دیا۔ لالی کے ہم راہ مہمان خانے میں چلا گیا۔

مہمان خانے میں کوئی نہ تھا۔ اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ رحیم داد نے برآمدے میں پہنچ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ سامنے پلنگ موجود تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ پلنگ کے سرہانے میز تھی۔ اس پر لیمپ رکھا تھا۔ قریب ہی ماچس بھی موجود تھی۔ رحیم داد نے ماچس اٹھا کر لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں زرد زرد روشنی پھیل گئی۔

رحیم داد نے باغیچے میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

"اب تو بستر پر آرام سے سو۔ میں سویرے تیرے پاس آؤں گا۔" ایک بار پھر اس نے لالی کو یقین دلایا۔ "اطمینان رکھ۔ میں کل ہی روپے دے کر شاداں کو تیرے ساتھ رخصت کردوں گا۔ پر جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔ سیدھا کراچی جانا۔"

"تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی کروں گا۔" لالی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے جماہی لی۔ وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

رحیم داد خاموشی سے بڑھا۔ کمرے سے باہر نکلا اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ دیئے۔ اس نے مہمان خانے کا صحن عبور کیا۔ حویلی میں داخل ہوا۔ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے چھت پر پہنچا۔ دیکھا شاداں کمرے سے باہر نکل رہی ہے۔ اس نے قریب پہنچ کر ٹوکا۔

"شاداں' تو کہاں جا رہی ہے؟"

"میں نے اب یہاں رک کر کیا لینا ہے۔" شاداں نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "جو کچھ طے ہونا تھا وہ تو سب طے ہو گیا۔"

"ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔" رحیم داد نے مسکرا کر ہولے ہولے شاداں کی پیٹھ تھپ تھپائی اور محبت سے اس کا بازو تھام لیا۔ "ابھی تو میں نے تجھ سے کئی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تجھے بتانا ہے میں نے آگے کیا کرنا ہے۔"

"میں نے پتہ ہے تجھے آگے کیا کرنا ہے۔" وہ ہنوز روٹھی ہوئی تھی۔

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ "تجھے اصلی گل بات کا تو تب چلے گا جب میں تجھے بتاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "اندر چل۔ آرام سے گل بات ہو گی۔"

رحیم داد اس کا بازو تھامے ہوئے آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد نے شاداں کو کرسی پر بٹھایا اور دوسری کرسی کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شاداں بھونچکا ہو کر سوچ رہی تھی کہ رحیم داد کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟ وہ تو جلد سے جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اور کچھ ہی دیر پہلے اس کا برملا اظہار بھی کر چکا تھا۔ شاداں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"صاف صاف بتا' تو کہتا کیا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"تو سمجھتی ہے میں تجھے چھوڑ دوں گا۔" اس نے شاداں کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ "تو اتنی سوہنی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔ مجھے ہر طرح آرام پہنچاتی ہے۔ اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ تو میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تو خود ہی سوچ میں تجھے کیسے چھوڑ سکا ہوں۔ تو چلی گئی تو یہ حویلی ویران ہو جائے گی۔"

"سمجھ نہیں آتی تو کیسا بندہ ہے۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔" شاداں نے تیوری چڑھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بھول گیا' تھوڑی ہی دیر پہلے تو لالی کے سامنے کیا کہہ رہا تھا؟ تو نے اس کے ساتھ کیا طے کیا تھا؟"

"وہ تو میں لالی کو بہکانے کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"کیوں؟" شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہ میں تجھے چھوڑنا چاہتا ہوں اور نہ لالی کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مان لے' میں نے اسے ۲۵ ہزار روپے دے دیئے تو وہ جا کر عیش کرے گا۔ جب روپے خرچ ہو جائیں گے تو بعد میں اور روپے لینے کے لئے مجھے بلیک میل کرتا رہے گا۔"

"وہ کس طرح کرے گا؟" شاداں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔

"وہ اس طرح کرے گا کہ اگر میں اسے روپے دینے سے انکار کر دوں گا تو دھمکی دے گا کہ پولیس کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے اس کی بات ماننی پڑے گی۔ وہ اسی طرح دھمکی دے کر مجھ سے بار بار روپیہ اینٹھتا رہے گا۔" رحیم داد نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ "تو خود ہی سوچ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ نہیں؟"

"وہ ایسا کر تو سکتا ہے۔" شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "پر وہ ایسا کرے گا نہیں۔"

"وہ بالکل ایسا ہی کرے گا۔ وہ پرانا جرائم پیشہ ہے۔ برسوں سے چوری ڈکیتی کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔" رحیم داد نے شاداں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "میں اسے جتنا جانتا ہوں تو نہیں جانتی۔ میں جیل میں مدت تک اس کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ اسی کے بہکانے پر میں جیل سے فرار ہوا۔ اگر میں اس کے ساتھ فرار نہ ہوتا تو میں نے اب تک جو کچھ کیا کبھی نہ کرتا۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو سوچ نہیں سکتی اس نے میرے ساتھ کتنا ظلم کیا۔ مجھے برباد کر دیا۔ مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔"

"اب تو کیا کرنا چاہتا ہے؟" شاداں نے دبی زبان سے دریافت کیا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" رحیم داد کا لہجہ یکایک درشت ہو گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ تیزی سے کمرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ شاداں ایسی حواس باختہ ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر اپنی نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ "میں ہمیشہ کے لیے لالی

کا کانٹا ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا تو اسے قتل کر دے گا؟" شاداں سراسیمہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔"

"لگتا ہے تجھے لالی سے بہت پیار ہے۔"

"بکواس نہ کر۔" شاداں آنکھیں نکال کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "مجھے تو تیری فکر ہے۔ یہ تو سوچ' اسے قتل کر کے تو پھانسی پہ نہیں لٹک جائے گا؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پولیے تفتیش کرنے آئیں گے تو ان سے کیا کہے گا؟"

"کہہ دوں گا ڈکیتی کرنے آیا تھا۔ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہو گیا۔ اگر میں گولی نہ چلاتا تو مجھے جان سے مار دیتا۔ یہ بھی کہوں گا' وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈکیت اور بھی تھے۔ سب پوری طرح مسلح تھے۔ لالی زخمی ہو کر گرا تو اس کے دونوں ساتھی گھبرا کر اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ وہ لالی کی بندوک بھی اٹھا کر لے گئے۔"

"تو جو کچھ کہے گا پولیے اسے آسانی سے مان بھی لیں گے؟" شاداں قائل نہ ہوئی۔

"بالکل مان لیں گے۔ تھانیدار اپنے احسان علی شاہ کا یار ہے' مجھ سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ لالی کو ۲۵ ہزار دینے کی بجائے تھانیدار کو ۵ ہزار بھی دوں گا تو وہ معاملے کو بالکل دبا دے گا۔" رحیم دار ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "لالی پرانا جرائم پیشہ ہے۔ چوری ڈکیتی کرنے کے جرم میں کئی بار جیل جا چکا ہے۔ پچھلے ہی دنوں چوری کرنے کے جرم میں جیل سے رہا ہو کر نکلا ہے۔ پچھلے ریکارڈ سے پولیس کو اس کے خلاف کیس تیار کرنے میں پوری پوری مدد ملے گی۔" رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ "شاداں' تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے اس بارے میں پہلے ہی سے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔"

"پر خطرہ تو ہے۔" شاداں نے ایک بار پھر اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "میں کہتی ہوں تو لالی کی جان لے کر اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے؟ کوئی ایسی تدبیر سوچ۔"

رحیم داد نے اسے اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی۔ جھنجلا کر بولا۔ "کان کھول کر سن لے شاداں۔" اس کا چہرہ خونخوار ہو گیا۔ آنکھوں سے خون ابلنے لگا۔ "جسے بھی اس راز کا پتہ چل جاتا ہے کہ میں چوہدری نور الٰہی نہیں رحیم داد ہوں میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔" وہ رائفل کے میگزین میں کارتوس ڈالنے لگا۔

شاداں دم بخود رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خوف زدہ ہو کر رحیم داد کے چہرے کو تکنے لگی۔ جو اس وقت بہت ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

☆

لالی مہمان خانے میں گہری نیند سو رہا تھا۔

رات کے پچھلے پہر آہٹ سے لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کمرے کے باہر چاپ سنائی دی جو رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی تھی‘ پھر گہری خاموشی میں ڈوب گئی۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر میز پر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا چاقو موجود نہ تھا۔ لالی نے اپنے اردگرد خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس کیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا۔ میز پر رکھی ہوئی اپنی ٹارچ اٹھائی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ اس نے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ واپس میز کے قریب گیا۔ پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

مہمان خانہ بدستور ویران تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ لیکن بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی نے صحن میں نکل کر حویلی کی بالائی منزل کی سمت گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے کمرے میں روشنی جھلملاتی ہوئی نظر آئی۔ یکایک ایسا محسوس ہوا کہ بالائی منزل پر کوئی آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ مگر یہ کراہ جلد ہی خاموشی میں ڈوب گئی۔

لالی اس دروازے کی جانب لپکا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ قریب پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ لالی اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور ٹانگیں لٹکا کر حویلی میں اترا۔ حویلی بالکل سنسان تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ لالی زینے میں داخل ہوا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مگر اس میں خاموشی چھائی تھی۔ لالی زینے کے قریب اندھیرے میں دبکا ہوا دم بخود کھڑا رہا۔ جب کمرے میں کسی قسم کی آہٹ نہ ابھری تو وہ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے اندر نظر ڈالی۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے شاداں کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ لالی نے پلٹ کر نگاہیں دوڑائیں۔ بارش سے بھیگی ہوئی چھت بالکل ویران تھی۔ گاؤں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کی پرچھائیں دیوار پر لہرائی۔ شاداں نے چونک کر لالی کی جانب دیکھا۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ تازہ خون سے لتھڑا ہوا چاقو دبا تھا۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا وہ اس کا چاقو تھا۔ لالی خوف زدہ نظروں سے

شاداں کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

شاداں نے خون خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ تیز لہجے میں پوچھا۔ "تو یہاں کیوں آگیا؟"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "تو نے خون میں ڈوبا ہوا چاقو کیوں دبا رکھا ہے؟ کسی کا خون کیا ہے؟"

شاداں نے بستر کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تو بھی دیکھ لے۔"

لالی نے دیکھا بستر کی چادر اور تکیے پر لال لال خون پھیلا تھا۔ رحیم داد بے جان لیٹا تھا۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ گوشت کے لوتھڑوں سے ابھی تک خون رس رس کر ادھر ادھر بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ نہایت خوف ناک نظر آرہا تھا۔ وہ لالی کے پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

لالی پریشان ہو کر شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔ "یہ تو نے کیا کر دیا شاداں؟"

شاداں نے خون آلود چاقو اس کے سامنے کر دیا۔ "اسے دیکھ رہا ہے۔" اس نے غضب ناک ہو کر خبردار کیا۔ "چپ کر کے یہاں سے چلا جا۔ ورنہ تجھے بھی کاٹ کر اس کے برابر لٹا دوں گی۔" اس کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ وہ ہانپنے کے انداز میں رک رک کر گہری سانس بھر رہی تھی۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔

لالی کو وہ رات یاد آگئی جب اس نے پہلی بار شاداں کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ اتنا ہی ڈراؤنا تھا۔ اس رات اس نے بالا کا قتل کیا تھا اور لالی کو اسی طرح خونخوار نظروں سے گھور کر دھمکی دی تھی۔ وہ بالکل وہی شاداں تھی۔ ویسے ہی بکھرے ہوئے بال۔ وہی لال لال ڈراؤنی آنکھیں۔ وہی چہرے پر چھائی ہوئی وحشت و دیوانگی۔

لالی نے نرمی سے کہا۔ "تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

شاداں نے بپھر کر اسے ڈانٹا۔ "تو مجھ سے یہ کہنے والا کون ہوتا ہے؟" اس نے چاقو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ "جا' ٹر جا یہاں سے۔" وہ چاقو اٹھا کر لالی پر جھپٹی۔ وار کیا۔ مگر لالی جھکائی دے کر صاف بچ گیا۔ لالی نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑلی۔ شاداں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ لالی نے ہاتھ مروڑ کر چاقو چھین لیا۔

وہ خاموش کھڑی اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر بپھر کر اس پر جھپٹی۔ چاقو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لالی نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ نرمی سے سمجھایا۔ "ہوش میں آ شاداں

تو پاگل تو نہیں ہو گئی؟" مگر وہ باز نہ آئی۔ اس نے لالی کے اس ہاتھ کو جھپٹ کر پکڑ لیا جس میں چاقو دبا تھا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ چاقو لالی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے لپکی۔ لیکن لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ لالی نے اسے سنبھلنے اور سنبھل کر جھپٹنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا' دوسرا' پھر تیسرا۔ شاداں چکرا گئی۔ تیورا کر فرش پر گری۔ چند لمحے بے حال پڑی ہانپتی رہی' پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

لالی نے چاقو اٹھا کر اپنے قبضے میں کیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی صراحی کے قریب گیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا۔ اسے ایک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے واپس شاداں کے پاس پہنچا اور اس کے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے پیار سے اس کا سر تھپکا۔ سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لالی نے گلاس بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ "تھوڑا سا پانی پی لے۔" شاداں نے مزاحمت نہ کی۔ خاموشی سے پانی پینے لگی۔ وہ پورا گلاس چڑھا گئی۔ لالی نے بازو تھام کر اسے کھڑا کر دیا اور قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا۔

شاداں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم ہو چکی تھی۔ وہ اب مضمحل اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کا کٹا ہوا گلا اور اس کی پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ لالی سے یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھا گیا۔ اس نے چادر ڈال کر اس کا خوف ناک چہرہ چھپا دیا۔ بارش ابھی تک تھمی ہوئی تھی۔ لیکن بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔

لالی بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شاداں کی جانب دیکھا۔ اظہار تاسف کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا شاداں۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا اور تیرے سامنے ہی طے ہوا تھا۔" شاداں نے جواب نہ دیا۔ گم صم بیٹھی رہی۔ لالی نے زور دے کر کہا۔ "تو نے ایسا کیوں کیا؟ بولتی کیوں نہیں؟"

شاداں نے نظریں اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "تجھے پتہ ہے بالے نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا تو میں نے اس کا چھری سے گلا کاٹ ڈالا تھا۔ یہ تو بہت زیادہ گندا اور پاپی تھا۔" اس نے رحیم داد کی لاش کی جانب حقارت سے دیکھا۔ "اس نے تو مجھ سے زبردست دھوکا کیا۔ اسے میں کیسے زندہ چھوڑ دیتی۔"

"مجھے بھی پتہ ہے' اس نے تیرے ساتھ دھوکا کیا۔" لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے تجھے

بالے کی طرح اس سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ یہی بات ہے نا؟"

"بالکل ایسی گل بات نہیں۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو اس سے صرف اس لیے ویاہ کیا تھا کہ مجھ سے اب دکھ نہیں اٹھائے جاتے تھے۔ تو جیل میں تھا۔ میرا نہ کوئی گھر تھا نہ کوئی ٹھکانا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ایک بار اپنا گھر اجاڑ کر میں نے سوچا تھا دوبارہ گھر بساؤں گی۔ میرے بال بچے ہوں گے۔ گھر والا ہو گا۔ آرام سے زندگی گزاروں گی۔"

"پر تو میرے ساتھ بھی اسی طرح آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔ میں تو تیرے ساتھ تیرے بچے کو بھی ہمیشہ اپنا ہی سمجھتا۔ تجھے کیا پتہ میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔" لالی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "میں غریب بندہ ہوں۔ تو مجھے کیوں پیار کرنے لگی؟ کیوں میرے ساتھ رہتی؟ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"سچ بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔" شاداں نے کہا۔ "میں نے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔" اس نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ "میں نے تجھے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں' تو برا بندہ نہیں' بہت بھلا ہے' اور میرے لیے تو ہمیشہ ہی بھلا رہا ہے۔ مجھے پیار بھی کرتا ہے۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہی' پھر گویا ہوئی۔ "میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں تیرے ساتھ جانے کو بالکل تیار تھی۔"

"پر تو نے اس لیے ارادہ بدل دیا کہ میں تجھے اتنا آرام نہ دے سکوں گا جو تجھے یہاں مل رہا ہے۔ میں تجھے رہنے کے لیے ایسی شاندار حویلی اور زمیں داری کی ٹوہر نہیں دے سکتا۔"

"ایسی گل بات نہیں۔"

"اور کیا گل بات ہے؟" لالی نے مداخلت کی۔ شاداں کی بات کاٹ کر بولا۔ "رحیم داد مجھے ۲۵ ہزار روپے دے رہا تھا۔ اتنے روپے سے تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔"

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" شاداں نے وضاحت کی۔ "وہ تجھے ایک پیسہ نہ دیتا۔"

"تیرے سامنے ہی تو اس نے وعدہ کیا تھا۔" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ کتنا دھوکے باز تھا تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔" شاداں نے بتایا۔ "تجھے مہمان خانے میں پہنچانے کے بعد وہ واپس آیا اور مجھے بہکانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا' نہ میں دوسرا ویاہ کر رہا ہوں نہ تجھے چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں تو لالی کا ٹنٹا ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ میری جان کے لیے زبردست خطرہ بن گیا ہے۔"

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا؟"

"ہاں!" شاداں نے دیوار پر کھونٹی سے لٹکی ہوئی رائفل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ اس نے تجھے جان سے مار دینے کے لیے بھر کر رکھی تھی۔ وہ سویرا ہونے سے پہلے ہی تجھے گولی مار کر ختم کر دینا چاہتا تھا۔"

"مجھے پتہ نہیں تھا' وہ اتنا وڈا دھوکے باز تھا۔" لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

شاداں نے اسے رحیم داد کے خطرناک منصوبے سے پوری طرح آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ "پر جب اس نے گنّے سے آنکھیں نکال کر یہ کہا کہ جو کوئی یہ راز جان جاتا ہے' میں چوہدری نور الٰہی نہیں رحیم داد ہوں تو میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔ یہ سن کر میں اتنی ڈر گئی کہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں نے سوچا اس کا یہ راز تو مجھے بھی معلوم ہو گیا ہے۔ وہ مجھے صاف صاف دھوکا دے رہا ہے۔ تجھے کتل کرنے کے بعد مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پر میں نے اس بارے میں اس سے کچھ نہ کہا۔ اس کی باتیں سن کر چپ بیٹھی رہی۔"

"یہ تو نے بالکل ٹھیک کیا۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "کچھ کہتی تو اسے تیرے بارے میں شبہ ہو جاتا۔"

"ہاں' اسے ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔" شاداں نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "جب میں سونے کے لیے نیچے جانے لگی تو اس نے پیار محبت کی باتیں کیں۔ بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "نیچے آکر میں بستر پر لیٹ گئی۔ پر مجھے نیند نہ آئی۔ دیر تک چپ کر کے لیٹی رہی' فیر اٹھ کر تیرے کمرے میں گئی۔ سوچا تجھے جگا کر سب کچھ بتا دوں پر بعد میں' میں نے ارادہ بدل دیا۔ مجھے ڈر لگا تو گصّے میں کہیں اس کا خون نہ کر دے۔ مجھے پتہ ہے تیرا گصّہ بھی کم نہیں۔ میں نے میز پر رکھا ہوا تیرا چاکو اٹھا لیا اور چپ کر کے نکل گئی۔"

"تو میرا چاکو اٹھانے آئی تھی؟" لالی نے چونک کر شاداں کی طرف دیکھا۔ "میں تو فوراً جاگ گیا تھا۔ پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چپ کر کے لیٹا رہا۔"

"میں اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ یہاں آگئی۔ رحیم داد بے خبر سو رہا تھا۔ اسے میرے آنے کا ذرا پتہ نہ چلا۔ مجھے بندوک چلانی نہیں آتی۔ ورنہ میں اسے گولی مار کر ختم کر دیتی۔" شاداں نے لالی کو بتایا۔ "میں نے آہستہ سے چاکو کھولا اور رحیم داد کا گلا کاٹ دیا۔ وہ ذرا ہی دیر بعد ختم ہو گیا۔"

"میں نے اس کے ہائے ہائے کرنے کی آواز تو سنی تھی' تب ہی تو میں ادھر آیا۔"

"اس نے صرف تھوڑی سی ہائے ہائے کی اور وہ بھی زیادہ زور سے نہیں۔" شاداں بولی۔ "پر اس کی آواز تو نے بھی سن لی۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے شاداں سے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب آگے کی سوچ۔ سویرا ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ لاش بھی کھود کر کہیں دبائی نہیں جا سکتی۔ سب کو پتہ چل جائے گا۔"

"وہ تو چلنا ہی ہے۔" شاداں نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔"

"کیا سوچ رکھا ہے؟" لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"صاف صاف کہہ دوں گی' میں نے خون کیا ہے۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اب زندہ نہیں رہنا۔ مجھے ایسی گندی زندگی نہیں چاہیے۔" اس نے بے زاری سے کہا۔ "اب تو جا' بیکار میں پکڑا جائے گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔"

"ایسے تو نہیں چھوڑوں گا۔" لالی کے لہجے میں اچانک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "تو نے میری جان بچائی اور میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں۔ تو مجھے اتنا کمینہ اور خود غرض سمجھتی ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اب میں جیسا کہتا ہوں' وہ کر۔"

"کیا کرنا چاہتا ہے تو؟" شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو نیچے جا کر اپنے یہ خون لگے کپڑے بدل لے۔ انھیں کہیں چھپا دینا۔ بعد میں جلا کر راکھ کر دینا تاکہ تجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔"

"اور تو کیا کرے گا؟" شاداں نے دریافت لیا۔

"میں یہیں بیٹھا رہوں گا' پولیس کے آنے کا انتظار کروں گا۔" لالی نے نہایت سکون سے اپنا منصوبہ بتایا۔ "پولیس سے صاف صاف کہہ دوں گا' میں نے خون کیا ہے۔"

"ایسا کرے گا تو پھانسی پر نہیں لٹک جائے گا؟"

"تیرے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "تو کتل کے الزام میں پکڑی جائے یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"اور میں چپ کر کے یہ دیکھتی رہوں کہ خون میں کروں اور تو پھانسی سے لٹک جائے۔"

"ہاں' تجھے ایسا ہی کرنا ہو گا۔" لالی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے پھانسی لگنے سے کسی کو دکھ نہیں ہو گا۔ کچھ بھی نہ ہو گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "میرا تو کوئی نہیں' کوئی بھی نہیں۔" اس کی پلکوں سے آنسو ڈھلک کر رخساروں پر آ گئے۔ "مجھے یہ تو خوشی ہو گی تو آرام سے رہے گی۔ یہ حویلی' یہ ساری زمین داری تیری ہو گی۔" اس نے قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے۔

"میری ایک خواہش ہے' اور وہ یہ کہ تیرا جو بچہ پیدا ہو' اس کا نام لالی رکھنا۔ اس سے تو ضرور پیار کرے گی۔ میں سمجھ لوں گا مجھے تیرا پیار مل گیا۔ تو ایسا ضرور کرنا۔"

شاداں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

"کب تک تو اس طرح یہاں بیٹھی رہے گی؟" لالی نے پوچھا۔

"تو چاہتا کیا ہے؟" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"تو نے سنا نہیں' میں نے اب تک کیا بکواس کی؟" وہ جھنجلا کر بولا۔ "نیچے جا اور فٹافٹ کپڑے بدل۔"

"میں نے کہیں نہیں جانا۔" شاداں نے صاف انکار کر دیا۔

"تو نہیں جائے گی۔" لالی نے غضب ناک ہو کر کہا۔

"نہیں' میں نے کہیں نہیں جانا۔" شاداں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ "چاقو مجھے دے اور تو یہاں سے جا۔"

"تجھے نہیں جانا یہاں سے؟" لالی تیکھی نظروں سے شاداں کو گھورتا ہوا اٹھا۔ قریب پہنچا۔ چاقو سامنے کر کے بولا۔ "اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے ہاتھ سے تیرا گلا کاٹ دوں گا اور اپنا بھی کاٹ ڈالوں گا۔ تجھے پتہ ہے' میں جو کہتا ہوں اسے کر کے دکھا بھی دیتا ہوں۔"

شاداں نے لالی کو اس قدر غیظ و غضب کے عالم میں دیکھا تو سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے تو پرے ہٹا۔" اس نے خون آلود چاقو کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "لا' یہ مجھے دے۔ خون تیرے کپڑوں سے بھی لگ جائے گا۔"

"لگنے دے۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔

"پاگل نہ بن۔ اسے دے دے۔ میں اسے پانی سے دھو کر صاف کر دوں گی۔" شاداں نے اسے نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں اپنی جان بچانے کے لیے تجھے پھانسی پر لٹکنے نہیں دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "میں اپنے خون بھرے کپڑے بدل کر دوسرے پہن لوں گی۔ جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی کروں گی۔ پر تو یہاں ٹھیرے گا نہیں۔ جیتی نال چلا جانا۔"

"نہیں' میں نے کہیں نہیں جانا۔" لالی نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔

"تو نے میری بات نہیں مانی تو میں نے بھی کہیں نہیں جانا۔" وہ بھی اپنی ضد پر اڑ گئی۔ "چاہے تو میرا خون ہی کر دے۔ مجھے خوشی ہو گی کہ تیرے ہاتھوں ماری جاؤں۔"

"تو چاہتی کیا ہے؟" لالی نے زچ ہو کر پوچھا۔

"جو میں کہہ رہی ہوں وہ کر۔ لا اسے مجھے دے دے۔" شاداں کی نظریں لالی سے ملیں۔ لالی کو اس کی آنکھوں میں ستاروں کے کنول جھلملاتے دکھائی دیے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور دل آویز تھیں۔ لالی اس کی شفاف آنکھوں کی جھیلوں میں ڈوب گیا' کھو گیا۔ شاداں نے ہاتھ بڑھایا اور چاقو لے لیا۔ لالی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

شاداں مڑی اور برابر والے کمرے کی سمت بڑھی۔

"ادھر کہاں چلی؟" لالی نے اسے ٹوکا۔

"میرے کپڑے لتے اسی کمرے میں رکھے ہیں۔" شاداں نے جواب دیا۔

"فٹافٹ واپس آنا۔ میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تو بھی میرے ساتھ چلے گی۔" لالی نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ "رات ختم ہو رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے پہلے دونوں یہاں سے بہت دور نکل جائیں گے۔" لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "سن رہی ہے ناں؟"

شاداں نے نہ کوئی جواب دیا نہ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ آگے بڑھی' کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اس نے اندر سے دروازے کے پٹ بند کر دیے۔

بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے۔ لیمپ کی لو بار بار بھڑکتی۔ دیواروں پر پرچھائیاں منڈلانے لگتیں۔ بستر پر رحیم داد کی لاش پڑی تھی۔ اس کے ڈراؤنے چہرے پر پڑی ہوئی چادر پر خون کے دھبے نمایاں ہو گئے تھے۔ لالی نے لاش کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ چپ بیٹھا شاداں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔

بھیگی بھیگی اندھیری رات دھیرے دھیرے اپنا آخری سفر طے کر رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھڑپھڑا رہی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے' مگر شاداں کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بستی کے کسی مکان سے پچھلی رات کے سناٹے میں مرغ کی بانگ ابھری اور ٹھہر ٹھہر کر ابھرتی رہی۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لالی نے پریشان ہو کر مشرقی رخ کے اس کمرے کی سمت دیکھا جس میں شاداں کپڑے تبدیل کرنے گئی تھی۔ یکایک کمرے میں دھم سے کچھ گرا۔ آہٹ ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

لالی بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے آواز دی۔ "شاداں' شاداں' تو اندھیرے میں کیا کر رہی ہے؟" کوئی جواب نہ ملا۔ اس

نے مزید انتظار نہ کیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شاداں کو پکارا۔ لیکن اس دفعہ بھی کوئی جواب نہ ملا۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔

لالی نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں گھما پھرا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دیوار کے پاس روشنی کے زرد زرد حلقے میں اسے شاداں نظر آئی۔ وہ فرش پر خون میں لت پت پڑی تھی۔ لالی وہاں مزید نہ ٹھہرا۔ باہر نکلا۔ لیمپ اٹھایا اور اسے سنبھالے ہوئے واپس کمرے میں پہنچا۔

شاداں دم توڑ رہی تھی۔ اس کی گردن میں چاقو پیوست تھا۔ شہ رگ کٹ گئی تھی۔ گلے کے گہرے زخم سے خون ابل ابل کر اس کے سینے پر، کپڑوں اور فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

لالی نے شاداں کو اس جانکنی کے عالم میں دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ اس نے لیمپ قریب کے ایک ٹرنک پر رکھ دیا اور شاداں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی حیران و پریشان نگاہوں سے شاداں کی گردن دیکھنے لگا جو دور تک کٹی ہوئی تھی۔ گوشت کے لوتھڑوں میں پھنسا ہوا چاقو گہرائی تک اتر گیا تھا۔ لالی نے تڑپ ہو کر کہا۔ ”شاداں، یہ تو نے کیا کر لیا؟ میں نے تو سوچا تھا۔ دونوں رات کے اندھیرے میں چھپتے لکتے نکل جائیں گے۔ شادو کے پاس لائل پور جائیں گے۔ تو اس کے گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتی۔ میرے بارے میں تو کسی کو پتہ نہیں میں کب آیا اور کب یہاں سے چلا گیا۔“ لالی بے قراری کے عالم میں بولتا رہا۔ مگر شاداں نے کچھ بھی نہ کہا۔ اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ان میں جھلملاتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ منکا ایک طرف ڈھلک گیا۔ شاداں ختم ہو گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ لالی اسے سفر آخرت پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے سینے سے دھواں اٹھا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ اب کچھ بھی نہ رہا تھا۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ شاداں اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس نے وہی کیا جو سوچا تھا، پہلے سے طے کر رکھا تھا۔

لالی نے جھک کر شاداں کے چہرے پر بکھرے ہوئے بال ہٹائے۔ اس کی اجلی اور روشن پیشانی کو چوما اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیمپ اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے لیمپ اسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ مڑا، رحیم داد کی لاش پر ایک نظر ڈالی۔ آگے بڑھا۔ دروازے سے گزر کر چھت پر پہنچا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

زینے کی سیڑھیاں طے کر کے وہ نیچے پہنچا۔ حویلی پر ویرانی چھائی تھی۔ صدر دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار زور سے کھنکارا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ فوراً مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوا۔ مہمان خانہ ہنوز سنسان تھا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی چڑھائی۔ اچھلا اور دیوار پر پہنچ گیا۔

جب وہ دیوار سے نیچے اترا تو عین اس وقت مہمان خانے کے برابر والے مکان میں کوئی زور زور سے کھانسنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ نادر خان باہر نکلا۔ وہ دس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ لالی جھٹ دیوار کے ساتھ اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ نادر خان اس کی جانب بڑھا۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد مڑا اور واپس گھر میں چلا گیا۔

بستی کے مکانوں میں اب بوڑھوں کے کھانسنے کھنکارنے، بچوں کے رونے اور مویشوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں وقفے وقفے سے ابھر رہی تھیں۔ کالے کالے بادلوں کے مشرقی کناروں سے ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھوٹ رہی تھی۔ رات کا چل چلاؤ تھا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بارش تیز نہ تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں سے بچتا بچاتا آگے بڑھا۔ نہر کے پاس پہنچا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ مڑ کر کوٹلہ ہر کشن کے مکانوں کو دیکھا اور ان کے درمیان ابھری ہوئی دو منزلہ حویلی دیکھی جس کی بالائی منزل کے کمروں میں رحیم داد اور شاداں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے وہ کوٹلہ ہر کشن سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔

پھر دن چڑھے وہ چک بیدی پہنچ گیا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ لاریوں کے اڈے پر چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور ہوٹل میں جا کر گرم گرم پراٹھا کھایا۔ چائے پی۔ شب بیداری کا خمار کچھ کم ہوا۔ باہر نکلا تو نیلی ٹرانسپورٹ کی ایک بس شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ بس پر سوار ہو گیا۔ بس ذرا ہی دیر بعد روانہ ہو گئی۔ وہ لاہور جانا چاہتا تھا جہاں غنی چتّا رہتا تھا۔ اس کا گھر ہی اب لالی کا واحد ٹھکانا تھا۔ پچھلے کئی مہینے سے وہ چتّے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔

لیکن شہر پہنچ کر لالی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ لاہور جانے کے بجائے میلسی کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

لالی میلسی پہنچا تو شام در و بام سے نیچے اتر رہی تھی۔ وہ سیدھا اینٹوں کے اس بھٹے پر گیا جہاں ارشاد الٰہی دوسرے پتھیروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بھٹے کا جمعدار اکبر سانول تھا۔ لمبا تڑنگا، کالا

بجنگ۔ چہرے پر چیچک کے گہرے گہرے داغ۔ صورت شکل سے جتنا خوف ناک نظر آتا تھا مزاج کے اعتبار سے اتنا ہی درشت اور کڑوا بھی تھا۔ لالی اس سے ملا۔ ارشاد الٰہی کے بارے میں دریافت کیا۔

"جمعدار، پتھیرا ارشاد الٰہی ادھر ہی ہوتا ہے؟"

"تو شادا کے بارے میں پوچھ رہا ہے؟" جمعدار اکبر سانول نے تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے جواب دیا۔ "وہ ادھر ہی ہوتا ہے، پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"میں جی، شادا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو اسے نہیں مل سکتا۔" سانول نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ "اسے کوئی نہیں مل سکتا۔"

"میں اسے کیوں نہیں مل سکتا؟" لالی نے لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"اس کی طبیعت گڑ بڑ رہتی ہے۔ بخار آتا ہے۔ ہر دم کھانستا رہتا ہے۔" اس نے لالی کو بتایا۔ "اس سے کام دھندا بھی نہیں ہوتا۔ منتیں کر کے پیشگی لیتا رہتا ہے۔ اس کی پیشگی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔" جمعدار نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "تجھے پتہ نہیں جس پتھیرے کی پیشگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے وہ نہ بھٹے سے باہر جا سکتا ہے اور نہ کسی سے مل سکتا ہے۔ بھٹہ مالک رانا محمود نے اس پر سخت پابندی لگا رکھی ہے۔" وہ منہ ٹیڑھا کر کے بڑبڑانے لگا۔ "ایسی سختی نہ کریں تو پیشگی کیسے وصول ہو۔ پتھیرے تو سارے ہی ہڈ حرام اور نکمے ہوتے ہیں۔"

اکبر سانول کے سخت گیر رویے سے لالی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے ارشاد الٰہی سے ملنے نہیں دے گا۔ اس کا ذاتی تجربہ تھا کہ جمعدار کی مرضی کے بغیر کوئی بھی کسی پتھیرے سے نہ مل سکتا ہے نہ بات کر سکتا ہے۔ اس نے جمعدار سے الجھنے کی کوشش نہ کی اور جس ارادے سے آیا تھا اس کا کھل کر اظہار کر دیا۔

"جمعدار، میں اس کی پیشگی ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو اس کی پیشگی ادا کرے گا؟" جمعدار نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "تو اس کا ضامن بنے گا؟ جب تک اس کی پیشگی ادا نہ ہو گی بھٹے پر کام کرتا رہے گا؟"

"ہاں جی، جب تک شادا کی پیشگی ادا نہ ہو گی میں کام کرتا رہوں گا۔ میں پہلے بھی پتھیرا رہ چکا ہوں۔ مجھے پیشگی کے بارے میں اچھی طرح پتہ ہے کیسے ادا ہوتی ہے۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "تو اسے چھٹی دے دے، میں اس کی جگہ کام کروں گا۔"

جمعدار نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ اس کا ایک بازو پکڑ کر گوشت انگلیوں سے

ٹولا۔ مسکرا کر بولا۔ "دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ پتھیرا بھی رہ چکا ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر رضا مندی کا اظہار کیا۔ "ٹھیک ہے' شادا کو چھٹی مل جائے گی۔ تجھے اس کی جگہ لگا دیا جائے گا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پر ایسا کرنے سے پہلے رانا محمود سے اجازت لینی ہو گی۔ وہ یہاں موجود بھی ہے۔ تو یہیں ٹھیر۔ میں اس سے تیرے بارے میں بات کرنے جا رہا ہوں۔"

جمعدار مڑا۔ آگے بڑھا اور اندھیرے میں او جھل ہو گیا۔

لالی چپ چاپ کھڑا رہا۔

شام اب گہری ہو گئی تھی۔ مگر آسمان صاف تھا۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی جھونپڑیوں میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ چولہوں سے دھواں اٹھ کر فضا میں منڈلا رہا تھا۔

لالی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جمعدار اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ قریب پہنچ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "میرے ساتھ آ۔" وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں بھٹے کے مالک رانا محمود کے پاس پہنچے۔ وہ ادھیڑ تھا۔ سر کے بال کالے کم سفید زیادہ تھے۔ چہرے مہرے سے کاروباری اور گھاگ نظر آتا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے بھدی سی لکڑی کی میز تھی جس پر کھلا ہوا رجسٹر رکھا تھا۔ قریب ہی اس کا منشی بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

رانا محمود آنکھوں پر چشمہ لگائے سامنے رکھے ہوئے رجسٹر کو لالٹین کی روشنی میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ جمعدار اکبر سانول نے کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ رانا محمود نے گردن اونچی کی اور مڑ کر جمعدار کو دیکھا۔ لالی اس کے پہلو میں مسکین سی صورت بنائے سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔

جمعدار نے لالی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "یہ جی' شادا کا ضمانتی ہے۔ اس کی جگہ کام کرنا چاہتا ہے۔"

"سامنے آ۔" بھٹے کے مالک نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

لالی آگے بڑھا اور اس کے رو برو سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ رانا محمود نے آنکھوں پر لگا ہوا چشمہ اتارا اور لالی کو پرکھنے والی نظروں سے دیکھا۔ دریافت کیا۔ "تیرا نام کیا ہے؟" اس کے لہجے میں رعب اور دبدبہ تھا۔

"لالی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

"یہ جی' پتھیرا بھی رہ چکا ہے۔" جمعدار نے لقمہ دیا۔

لالی گھبرا گیا کہ اب رانا محمود پوچھے گا' کتنے بھٹوں پر کام کیا؟ کتنے عرصے کام کیا اور چھوڑا کیوں؟ مگر اسے سخت حیرت ہوئی کہ رانا محمود نے نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی بلکہ اس سے مزید بات چیت ہی نہیں کی۔ وہ جمعدار اکبر سانول کی جانب متوجہ ہوا۔

"تجھے یہ ٹھیک ٹھاک لگتا ہے تو کام پر لگا دے۔ کام تو تجھے ہی اس سے لینا ہے۔"

"تو جی فیر شادا کو چھٹی دے دی جائے؟" جمعدار نے پوچھا۔

"ہاں' اسے چھٹی دے دے۔" رانا محمود نے جمعدار سے اتفاق رائے کیا۔ "وہ اپنا علاج معالجہ کرا لے گا۔" قدرے توقف کے بعد اس نے مڑ کر منشی کی جانب دیکھا۔ "رحمت' ایسا کر۔ شادا کی پیشگی لالی کے نام ڈال دے۔ اور اسکا انگوٹھا لگوا لے۔"

منشی نے فوراً سرخ جلد کا دبیز رجسٹر نکالا۔ اسے کھولا۔ ورق الٹے۔ قلم اٹھایا۔ لالی سے دریافت کیا۔ "تیرا پورا نام کیا ہے؟"

"لال دین ولد کرم دین۔" لالی نے بغیر پوچھے اپنی ولدیت بھی بتا دی۔

"یہیں میلسی میں رہتا ہے؟"

"ہاں جی یہیں رہتا ہوں۔" لالی نے جان بوجھ کر لاہور کا پتہ نہ بتایا جہاں وہ ان دنوں مقیم تھا۔

منشی سر جھکا کر لالٹین کی روشنی میں رجسٹر کے سادہ ورق پر لکھنے لگا۔ اس نے پیشگی کا اقرار نامہ تیار کیا۔ لالی کو قریب بلایا اور رجسٹر سامنے کر کے انگلی سے بتایا۔

"یہاں انگوٹھا لگا دے۔"

لالی نے روشنائی لگائی اور منشی رحمت کی ہدایت کے مطابق انگوٹھا لگا دیا۔ وہ عام طور پر انگوٹھا لگانے کے بجائے دستخط کرتا تھا۔ تھوڑا بہت لکھ پڑھ بھی لیتا تھا۔ لیکن بھٹہ مالک کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ بالکل جاہل اور ان پڑھ ہے۔

رانا محمود نے آنکھوں پر چشمہ لگایا اور ایک بار پھر توجہ سے سامنے رکھا ہوا رجسٹر دیکھنے لگا۔

جمعدار نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے عقب میں چلا۔

باہر آ کر جمعدار نے ایک کارندہ بلایا۔ لالی کو اس کے سپرد کیا اور یہ ہدایت کی۔ "اسے شادا کی پاس لے جا۔" وہ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ "لالی' تو جا کر شادا سے گل بات کر۔ میں بھی تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔" وہ مڑا اور بھٹہ مالک رانا محمود کے پاس واپس چلا گیا۔

☆

جھونپڑی میں چراغ روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں ارشاد الٰہی چارپائی پر لیٹا رک رک کر

کھانس رہا تھا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی تھی۔ آس پاس کی جھونپڑیوں اور جگیوں سے بولنے اور بات کرنے کی ملی جلی آوازیں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

لالی بھٹے کے کارندے کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ کارندہ لالی کو جھونپڑی میں پہنچا کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

ارشاد الٰہی نے لالی کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ فوراً اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ خاموشی سے لالی کا چہرہ تکنے لگا۔ لالی نے مسکرا کر کہا۔ "شادے 'تو نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں لالی ہوں۔"

"کیوں نہیں پہچانا۔" ارشاد الٰہی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "پر تو یہاں آیا کیسے؟" لالی نے ارشاد الٰہی کو غور سے دیکھا۔ اس کا لاغر جسم اب ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ آنکھیں اور اندر دھنس گئی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ لالی کو دھچکا لگا۔ اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو نے اپنی حالت کیا بنالی ہے؟"

"بخار آتا ہے۔ کھانسی بھی آتی ہے۔"

"مجھے پتہ نہیں تھا تو اتنا بیمار ہے۔"

"کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔" ارشاد الٰہی نے لالی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "دوائی شوائی بھی لے رہا ہے؟"

"تو دوائی کی بات کر رہا ہے کھانے کو روٹی تو ملتی نہیں۔" ارشاد الٰہی بجھے ہوئے لہجے میں اپنی پریشان حالی بیان کرنے لگا۔ "پچھلے دنوں تو اتنا بیمار رہا کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ منجی پر پڑا رہتا تھا۔" بات کرتے کرتے وہ ہولے ہولے ہانپنے لگا۔ "پر اب طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ سوچتا ہوں کل صبح سے کام شروع کر دوں۔"

"پر تو کام کیسے کرے گا؟ کتنا تو بیمار ہے۔"

"کام نہیں کروں گا تو روٹی کہاں سے ملے گی؟ پیشگی کیسے ادا ہو گی؟"

"فکر نہ کر۔ اب تجھے پیشگی ادا نہیں کرنی پڑے گی۔" لالی نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔

"پیشگی کیوں نہیں ادا کرنی ہو گی؟" ارشاد الٰہی نے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔

"میں تیری پیشگی ادا کروں گا۔ تیری جگہ میں یہاں کام کروں گا۔ تجھے چھٹی مل گئی ہے۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ "میں پہلے جمعدار کے ساتھ بھٹہ مالک رانا محمود کے پاس گیا تھا۔ سب کچھ طے ہو گیا۔ میں نے پیشگی کی رسید پر انگوٹھا بھی لگا دیا۔"

"پر تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں تو بہت پہلے چاہتا تھا' تو اس چکر سے نکل جا۔ پر تو نے میری بات ہی نہیں مانی۔ الٹی میری شکایت جا کر لگا دی۔"

"ہاں جی' بہت غلطی ہو گئی۔" ارشاد الٰہی نے اظہار تاسف کیا۔ "تجھ پر ملک نثار اور اس کے جمعدار نے بہت ظلم کیا۔"

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" لالی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "تو ٹھیک کہتا تھا۔ تیرا پیو مر گیا۔ پر میں نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ کوٹلہ ہر کشن میں جو چوہدری نور الٰہی تھا' اس نے جعل سازی کر کی تیرے پیو کے کلیم کے ذریعے بہت وڈی زمین داری اور جائیداد الاٹ کرا لی تھی۔ وہ اب نہیں رہا۔ پچھلے دنوں وہ بھی مر گیا۔" لالی نے جان بوجھ کر رحیم داد کے قتل اور شاداں کی خود کشی کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ یہ بتایا کہ دونوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھا بلکہ ان کے ساتھ اس کے دیرینہ اور گہرے مراسم تھے۔ جیل میں پیشہ ور مجرموں اور طرح طرح کے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رہ کر وہ ہوشیار اور آزمودہ کار ہو گیا تھا۔ اس نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا۔ شاداں کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ رحیم داد کے بارے میں صرف اسی قدر بتایا۔ "اس بندے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ سنا ہے اس کا کوئی وارث بھی نہیں اور اگر وارث ہوتا بھی تو کوئی فرک نہ پڑتا۔ اپنے پیو کا اصلی وارث تو' تو ہے۔"

"پر میں کیا کر سکتا ہوں؟" ارشاد الٰہی نے نہایت سادگی سے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"تو ایسا کر۔ یہاں سے سیدھا ملتان جا۔" لالی نے مشورہ دیا۔ "ماں کو اپنے ساتھ لے اور کوٹلہ ہر کشن پہنچ کر پیو کی زمین داری اور جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کر۔"

"میں جاؤں گا کیسے؟" ارشاد الٰہی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ کھانے تک کو تو ہے نہیں۔ پڑوس کا بھتیرا ایسا نیک بندہ ہے۔ وہ کھانے کو روٹی دے دیتا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "جب وہ روٹی نہیں دیتا تو بھوکا پڑا رہتا ہوں۔ ویسے تو اب بھوک بھی نہیں لگتی۔"

لالی نے جیب سے روپے نکالے۔ ان کو گنا۔ اس کے پاس اس وقت ۴۸ روپے تھے۔ اس نے ۱۸ روپے اپنے لیے رکھ لیے۔ ۳۰ روپے ارشاد الٰہی کی جانب بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے یہ روپے رکھ لے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "اب تو تو ملتان جا سکتا ہے۔"

ارشاد الٰہی نے روپے لے لیے۔ رقت انگیز لہجے میں بولا۔ "مجھے پتہ نہیں تھا تیرا دل اتنا وڈا

ہے۔ کیسے بتاؤں تو کتنا نیک بندہ ہے۔" اس نے وفور جذبات سے وارفتہ ہو کر لالی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار رونے لگا۔

"اوئے شادے، تو تو رونے لگا۔" لالی نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ "یار، اس میں نیکی شیکی کرنے کی کونسی بات ہے۔ بندہ بندے کے کام آتا ہی ہے۔" وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "آنسو پونچھ لے اور کام کی گل سن۔"

ارشاد الٰہی نے کچھ نہ کہا۔ کرتے کا دامن اٹھا کر آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو پونچھنے لگا۔

"کوٹلہ ہرکشن جانا تو ایسی حالت میں نہ جانا۔" لالی نے اس کے میلے کچیلے اور بوسیدہ لباس کی جانب اشارہ کیا۔ "شان سے جانا۔ ایسی شان سے کہ دیکھنے میں زمیں دار لگے۔ اپنے لیے اور ماں کے لیے نئے کپڑے سلوا لینا۔" بات کہتے کہتے وہ جھجکا۔ "پر تو نئے کپڑے سلوائے گا کیسے؟" لالی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بار پھر روپے نکالے۔ تین جیب میں رکھ لیے اور پندرہ روپے ارشاد الٰہی کو دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "لے یہ بھی رکھ لے۔ اب تو تیرے اور تیری ماں، دونوں کے نئے کپڑے بن جانے چاہییں۔"

لیکن اس بار ارشاد الٰہی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔ تجھے بھی تو ضرورت پڑے گی۔"

"فکر نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ اصرار کر کے روپے ارشاد الٰہی کو دے دیے۔ ساتھ ہی تاکید کی۔ "تو یہاں سے فٹافٹ چلا جا۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی۔ ملتان جانے والی بس پکڑنا۔ ماں کو ساتھ لینا اور کوٹلہ ہرکشن پہنچنے کی کوشش کرنا۔"

"پر وہاں پہنچ کر کیسے ثابت کروں گا میں چوہدری نور الٰہی کا پتر ہوں۔ اس کی زمیں داری اور جائیداد کا وارث ہوں۔" ارشاد الٰہی نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ "مجھے تو اپنے پیو کے بارے میں ٹھیک سے کچھ یاد بھی نہیں۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں، ماں کو اپنے ساتھ لے جانا۔ اسے سب پتہ ہو گا۔ وہ ایک ایک بات بتا دے گی۔" لالی نے بے تکلفی سے ارشاد الٰہی کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مارا۔ "یار، تو تو ابھی سے گھبرانے لگا۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "زمیں داری مل جائے تو اس کی شان میں مجھے نہ بھول جانا۔"

"تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔" ارشاد الٰہی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک رونق آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر لالی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں گرم جوشی سے دبا لیا۔ "زمیں داری مل گئی تو پہلا کام یہ

کروں گا تیرے پاس آؤں گا' پیشگی ادا کروں گا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دونوں مل کر زمین داری چلائیں گے۔ یہ ٹھیک رہے گا ناں؟"

"شادے' تو تو ابھی سے سفنے دیکھنے لگا۔" لالی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے تو سب سے زیادہ خوشی اس کی ہو گی کہ تجھے تیرا حق مل جائے۔ ایسا ہو جائے تو میرے پاس آنا ضرور۔"

"ضرور آؤں گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تیرے پاس نہ آؤں۔" ارشاد الٰہی نے اسے یقین دلایا۔

"میں تیرا انتظار کروں گا۔"

ارشاد الٰہی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ "یہ تو بتا' میں کوٹلہ ہرکشن پہنچوں گا کیسے؟ مجھے تو ادھر کے بارے میں کچھ اتا پتا نہیں۔"

لالی اسے کوٹلہ ہرکشن کے راستے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ اسی اثناء میں جمعدار اکبر سانول آ گیا۔ اس نے مسکرا کر لالی کو مخاطب کیا۔ "لالی' تو نے اپنے یار سے ٹھیک طرح گل بات کر لی۔ کل ہی سے کام شروع کر دے۔"

"کل ہی شروع کر دوں گا۔" لالی نے رضامندی کا اظہار کیا۔

جمعدار نے مڑ کر ارشاد الٰہی کی جانب دیکھا۔ "لالی نے بتا ہی دیا ہو گا کہ تجھے چھٹی مل گئی۔ تیری پیشگی یہ ادا کرے گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد دریافت کیا۔ "یہ بتا اب تیرا ارادہ کیا ہے؟ ابھی جائے گا یا کل صبح؟"

ارشاد الٰہی کے جواب دینے سے پہلے ہی لالی نے لقمہ دیا۔ "آج ہی جائے گا جی۔ اور ابھی جائے گا۔ یہ بہت بیمار ہے' جا کر اپنا علاج کرائے گا۔"

"ہاں جی' میرا یہی ارادہ ہے۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آ۔ میں تجھے بھٹے کے باہر پہنچا دوں۔" سانول نے کوئی رخنہ نہ ڈالا۔

ارشاد الٰہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے گلے لگا کر رخصت کیا تو ارشاد الٰہی بے قرار ہو کر سسکیاں بھرنے لگا۔ لالی نے ہولے ہولے پیٹھ تھپک کر تسلی دی۔ ارشاد الٰہی آگے بڑھا اور جمعدار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

لالی خاموش کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ارشاد الٰہی نے چلتے چلتے کئی بار مڑ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ آخر وہ اور جمعدار اندھیرے میں اوجھل ہو گئے۔

لالی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ تھکا ہارا تھا اور مسلسل جاگتا بھی رہا تھا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر بے خبر ہو کر سو گیا۔

☆

لالی سویرے ہی سویرے کام کرنے پہنچ گیا۔ اس نے مٹی کھود کو گارا بنایا اور سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ ہنر مندی سے چل رہے تھے۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیر بھی تیزی سے چل رہے تھے۔ جھپاک سے کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔

سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ دھوپ میں تیزی آگئی۔ لالی دھوپ کی بڑھتی ہوئی تمازت سے بے نیاز کام میں جتا رہا۔ تھلّے پر پھیلی ہوئی اینٹوں کی قطاروں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ مگر ہاتھ اور پیر ہنوز تیزی سے چل رہے تھے۔

جمعدار اکبر سانول پتھیروں کے کام کا معائنہ کرتا ہوا لالی کے پاس بھی آیا۔ وہ ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا چھتر دبا تھا۔ سیاہ چہرہ دھوپ سے اور سیاہ پڑ گیا تھا اور کچھ زیادہ ہی کریہہ اور خوف ناک نظر آرہا تھا۔

لالی کی اس پر نظر پڑی تو فوراً سلام کیا اور گردن جھکا کر مودب کھڑا ہو گیا۔ وہ جمعدار کی خوش نودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جمعدار اس کے رویّے سے خوش بھی ہو گیا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کچھ کم ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے قریب آیا۔ اس کی پسینے سے بھیگی ہوئی پیٹھ ہولے ہولے تھپک کر گویا ہوا۔

"اوئے لالی، تو نے تو شام ہونے سے پہلے ہی تھلّا اینٹوں سے بھر دیا۔ تو تو بہت کام کا بندہ ہے۔"

"کام تو جی کرنا ہی کرنا ہے۔" لالی نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

"تجھے یہاں کوئی تکلیف شکیت تو نہیں؟"

"نہیں جی، بہت آرام سے ہوں۔" لالی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "منشی کو بول دے ابھی پیشگی کم کاٹے۔ میرے پاس جو روپے تھے سب شادا کو دے دیے۔ اس کے پاس تو گھر جانے کو کرایہ بھی نہیں تھا۔" لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "ایسا ہو جائے تو تیری بہت مہربانی ہو گی۔"

"تو بالکل فکر نہ کر۔ میں منشی کو بول دوں گا تیری پیشگی زیادہ نہ کاٹے۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹیں بھی گنتی میں کم نکالے۔" جمعدار نے رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ لالی کے کام سے بہت زیادہ مطمئن نظر آتا تھا۔ کہنے لگا۔ "ویسے تجھے پیشگی چاہیے ہو تو وہ بھی دلوا دوں گا۔"

"نہیں جی، ابھی ضرورت نہیں۔" لالی آمادہ نہ ہوا۔ "ابھی تو مجھے شادا کی پیشگی ادا کرنے کی فکر ہے۔ ضرورت پڑی تو بعد میں مانگ لوں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" جمعدار اکبر سانول نے خوش نودی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر لالی کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ "اب تو اپنا کام کر۔ میں کام کرنے والے بندے کی ہمیشہ مدد کرتا ہوں۔ کام چور اور نکمّے کے لیے اسے کام میں لاتا ہوں۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا چھتر آہستہ آہستہ لہرایا۔ "کیسا ہی ٹیڑھا بندہ ہو اس سے ایک دم سیدھا ہو جاتا ہے۔"

جمعدار مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لالی اپنے کام میں جٹ گیا۔ دبا دب اینٹیں تیار کرنے لگا۔ جمعدار کے نرم رویّے سے اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ بہت مطمئن تھا کہ پہلے ہی روز اپنے کام سے اس کی خوش نودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ جمعدار کو کسی طور ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ بھٹے پر سب سے زیادہ اہم شخصیت جمعدار کی ہوتی ہے۔ اس کا عتاب زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔

لالی غروب آفتاب کے بعد تک محنت اور پوری لگن سے کام کرتا رہا۔ شام کو اس نے روٹی پکا کر کھائی اور تھکن سے نڈھال ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

لالی مستعدی اور جانفشانی سے صبح سے شام تک کام کرتا رہتا۔ وہ نہ کسی پتھیرے سے غیر ضروری بات چیت کرتا اور نہ ہی اس نے کسی سے میل جول بڑھانے کی کوشش کی۔ اپنے کام سے غرض رکھتا۔ جمعدار اکثر کام کے دوران اس کے پاس آتا اور اس کے کام سے مطمئن ہو کر چلا جاتا۔ لالی نے کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔

سنیچر کا دن آگیا۔ شام کو چٹھا بٹا۔ ہفتے بھر کے کام کا پتھیروں اور دوسروں بھٹہ مزدوروں کو معاوضہ دیا گیا۔ جمعدار نے لالی سے جو وعدہ کیا تھا اس کا نتیجہ بھی اس روز بر آمد ہوا۔ منشی نے دوسرے پتھیروں کے مقابلے میں اس کے ساتھ زیادہ نرم رویہ اختیار کیا۔ پیشگی بھی زیادہ نہیں کاٹی۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹیں بھی کم مسترد کیں۔ لالی نے دو پتھیروں کے برابر کام کیا تھا۔ اسے کچھ کم دس روپے معاوضہ ملا۔

☆

رانا محمود کے بھٹے پر کام کرنے والوں میں دوسرے بھٹوں کے برعکس نو عمر لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں کوئی بھی تیرہ چودہ برس سے زیادہ عمر کا نہ تھا۔ لیکن یہ پتھیرے کم تھے بیشتر بھٹہ مزدور تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی پختہ اینٹیں ہتھوڑیوں سے توڑ کر روڑی بناتے۔ کچی اینٹیں ریڑھوں اور ٹھیلوں میں بھر کر چمنی کے پاس پہنچاتے۔ بھٹے سے پک کر نکلنے والی مختلف قسم کی اینٹوں کے علیحدہ علیحدہ چٹے بناتے۔

ان لڑکوں کی رہائش کا بندوبست سب سے الگ تھلگ ایک ہی جگہ کیا گیا تھا۔ یہ مویشیوں کے باڑے کے مانند طویل سائبان تھا جس کی دیواریں کچی تھیں اور پھوس کی چھت تھی۔ ان کو کام کرنے کی کوئی مزدوری نہیں ملتی تھی۔ کھانے کے لیے ہر ایک کو ہفتہ بھر کا راشن ملتا تھا۔ راشن میں آٹے کے علاوہ نمک ملتا تھا اور مرچیں۔ مہینے میں صرف ایک بار پاؤ بھر دال ملتی تھی۔ عام طور پر یہ چنے کی دال ہوتی تھی۔

جمعدار اکبر سانول ان کی بھرتی کے لیے گاؤں گاؤں، بستی بستی گھومتا رہتا تھا۔ غربت اور افلاس کے مارے عیال دار والدین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا اور فی لڑکا دو ڈھائی ہزار معاوضہ دے کر خرید لیتا۔ فوری ضرورت کے لیے بردہ فروشوں کے ذریعے بھی خریداری کرتا تھا۔ مگر بردہ فروش عام طور پر زیادہ قیمت لیتے تھے۔ ہر لڑکے کی خریداری پر جمعدار کو معقول کمیشن ملتا تھا۔ ایک بار بھٹے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد انھیں کبھی واپس جانا نصیب نہ ہوتا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد انھیں چھپر کے نیچے مویشیوں کی طرح ہانک کر پہنچا دیا جاتا۔ ہاتھوں کو زنجیروں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر تالے لگا دیے جاتے جن کی کنجیاں جمعدار کی تحویل میں رہتی تھیں۔ وہ لمبی لمبی قطاروں کی صورت میں چٹائیوں پر سوتے تھے۔ یہ چٹائیاں گندی اور بوسیدہ ہوتی تھیں اور ان میں کھٹملوں کی اس قدر بہتات ہوتی کہ انھیں چین سے نیند بھی نہ آتی۔ ان کی کڑی نگرانی کی جاتی۔ رات کو یہ نگرانی اور سخت کر دی جاتی۔ دو مسلح پہریدار رات بھر نہایت مستعدی سے ان کی چوکیداری پر تعینات رہتے۔

لالی نے انھیں بھٹے پر کام کرتے اور ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ مگر کسی سے بات چیت کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایک شام کو ایسا ہوا کہ اس نے کھانے کے لیے روٹی کے بجائے چاول پکائے۔ وہ پلیٹ میں چاول نکال کر کھانا شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک نو عمر لڑکا اندھیرے سے نکل کر جھونپڑی میں داخل ہوا اور اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر بارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ بار بار پلٹ کر چوکنا نظروں سے پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

لالی نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''اوئے، کون ہے تو؟''

''میں نیرا ہوں جی۔ بھٹے پر کام کرتا ہوں۔''

''یہاں کیسے آیا؟'' لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

''مجھے تھوڑے سے چاول کھانے کو دے دے۔'' نیرا نے ہاتھ سے اپنے پچکے ہوئے پیٹ کو ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ گڑگڑا کر بولا۔ ''بہت بھوک لگی ہے۔ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔''

"نیرے! تجھے کھانے کو روٹی نہیں ملتی؟"

"روٹی کھانے سے پیٹ میں بہت درد ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "ٹٹی آتی ہے۔ ٹٹی کے ساتھ خون بھی آتا ہے۔"

لالی نے اس بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کا جسم لاغر تھا۔ چہرہ بے رونق اور مرجھایا ہوا تھا۔ وہ خارش زدہ کتے کی طرح بیمار اور مرگھلا نظر آ رہا تھا۔ لالی اس کی حالت زار دیکھ کر پسیج گیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"لگتا ہے تجھے تو پیچش ہے۔ کوئی دوائی شوائی نہیں لیتا؟"

"نہیں جی' دوائی شوائی کہاں ملتی ہے۔" نیرا نے شکوہ کیا۔ "بھٹے سے باہر تو جانے نہیں دیا جاتا۔" وہ ندیدیوں کی طرح للچائی ہوئی نظروں سے پلیٹ میں رکھے ہوئے چاولوں کو تکنے لگا۔ "تو مجھے تھوڑے سے چاول نہیں دے سکتا؟"

"ضرور دوں گا تجھے چاول۔" لالی نے جھک کر نیچے رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ پلیٹ سے آدھے سے بھی زیادہ چاول نکال کر پیالے میں رکھے اور ان پر دال بھی ڈال دی۔ پیالہ اس کی جانب بڑھا کر چمکارتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے پتر' یہ کھا لے۔"

نیرا نے چاولوں سے بھرا ہوا پیالہ لیا اور وہیں فرش پر بیٹھ کر ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔ اس نے چند ہی لقمے چاولوں کے کھائے تھے کہ اچانک ایک کارندہ آفت ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھتر دبا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے نیرا کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "اوئے حرام دے۔ تو ادھر بیٹھا عیش کر رہا ہے۔ میں تجھے نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا۔" اس نے جھپٹ کر نیرا کا بازو پکڑا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ نیرا ڈگمگا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چٹاخ سے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چاول دور تک فرش پر بکھر گئے۔

نیرا نے بدحواس ہو کر بکھرے ہوئے چاولوں کو دیکھا اور فرش سے اٹھا کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ کارندے نے غضب ناک ہو کر اس کی پیٹھ پر زور سے چھتر مارا۔ دوسرا' تیسرا' وہ زناٹے سے چھتر مارتا رہا۔ مگر نیرا فرش پر اوندھا پڑا پٹتا رہا اور چاول اٹھا اٹھا کر بے صبری سے کھاتا رہا۔

لالی اس کی بے بسی دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس نے کارندے کو ٹوکا۔ "یار' اسے کھا تو لینے دے۔ بہت بھوکا لگتا ہے۔" اس نے اپنی پلیٹ اٹھا کر نیرا کی طرف بڑھائی۔ "نیرے' لے یہ کھا لے۔ وہ چاول تو مٹی میں مل کر خراب ہو گئے۔"

کارندے نے بھنا کر لالی کو دیکھا۔ "اوئے تو چپ کر۔" وہ تیزی سے لالی پر جھپٹا۔ سڑاک سے

ایک چھتر لالی کے کندھے پر مارا۔ لالی تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

کارندہ آنکھیں نکال کر لالی کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگا۔ "تو نے اسے یہاں کیوں بلایا؟ تو اس کا ماماں لگتا ہے؟" اس نے ایک اور چھتر مارا۔ اس دفعہ ہاتھ کمر پر پڑا۔

لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر طرح دے گیا۔ وہ کسی سے جھگڑا فساد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی سے وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ ارشاد الٰہی جلد ہی آئے گا۔ پیشگی کی تمام رقم بے باق کرے گا اور اسے جمعدار کی قید سے چھڑا کر اپنے ہم راہ لے جائے گا۔ لہٰذا اس نے برہمی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی کمر سہلاتے ہوئے نرمی سے صفائی پیش کی۔

"میں نے اسے نہیں بلایا۔ یہ تو خود ہی ادھر آیا تھا۔ میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔"

کارندے نے ڈپٹ کر لالی کو تنبیہہ کی۔ "آگے اسے یہاں نہ دیکھوں۔ ورنہ تیری چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" لالی کو ڈانٹنے پھٹکارنے کے بعد وہ نیرا کی جانب متوجہ ہوا جو زمین پر پڑا ابھی تک چاول اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ کارندہ اس کے قریب گیا اور مردار بھیڑ کی طرح گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

لالی اس قدر دل گرفتہ ہوا کہ کھانا بھی نہ کھایا۔ بھوکا ہی سو گیا۔

☆

لالی دوسرے پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں سے الگ تھلگ رہتا۔ پہلے ہی دن سے اس نے جو وتیرہ اختیار کیا تھا اس پر سختی سے قائم رہا۔ محنت اور لگن سے کام کرتا۔ جمعدار کو ہر طرح مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا۔

اس روز لالی سر شام ہی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ جھونپڑی میں خاموشی چھائی تھی۔ لیکن آس پاس کی جھونپڑیوں اور جگیوں سے ابھی تک ہنسنے بولنے، بوڑھوں کے کھانسنے کھنکارنے اور بچوں کے رونے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

لالی خاموش لیٹا ہر آواز اور ہر آہٹ سن رہا تھا۔ اسی اثناء میں جھونپڑی کے باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ اس نے گردن بڑھا کر اندر جھانکا۔ دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"لالی، جاگ رہا ہے؟"

لالی نے آواز پہچان لی۔ وہ تاج محمد تھا۔ وہ بھی پتھیرا تھا۔ دو چار جھونپڑیاں چھوڑ کر اس کی جھونپڑی تھی۔ وہ ادھیڑ تھا اور بیمار بھی رہتا تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کھانستا رہتا۔ لالی نے رات کے

سناٹے میں اکثر اس کی کھانسی سنی تھی۔ وہ ایک بار پہلے بھی لالی کے پاس آیا تھا۔ آٹا مانگنے آیا تھا۔ صبح سے اس نے اور اس کے بیوی بچوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لالی نے آٹے کے علاوہ اسے ایک روپیہ ادھار بھی دیا تھا۔ مگر زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دم بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔

لالی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "تاجے باہر کیوں کھڑا ہے؟ اندر آجا۔"

تاج محمد اندر آگیا۔ لالی سمٹ کر ایک طرف ہوگیا۔ تاج محمد سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "ادھر آرام سے بیٹھ جا۔" تاج محمد اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"سنا ہے رانا محمود کی ماں کا آج دن ڈھلے مرن ہوگیا۔" لالی نے کہا۔ "رانا نے زبردست سیاپا کیا ہے۔ سوگ میں تین روز تک بھٹے پر کام بند رہے گا۔"

"ہاں جی ایسا ہی ہو گا۔" تاج محمد نے بجھے ہوئے لہجے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "پچھلے دنوں بارش کی وجہ سے کام بند رہا۔ اب یہ تین دن کی چھٹی آگئی۔ پہلے ہی کم تنگی نہیں تھی پیشگی لے کر کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرنا پڑ رہا تھا۔ تب ہی تو پیشگی کبھی ادا نہیں ہو پاتی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ پیشگی ایسی گلے پڑی ہے کسی طرح پنڈ ہی نہیں چھوڑتی۔"

"پیشگی کا چکر بھی عجب چکر ہے۔ ایک بار جو اس چکر میں پھنس گیا فیر نہیں نکلتا۔"

"تیری پیشگی تو بہت زیادہ ہے۔" تاج محمد نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کا لہجہ رازدارانہ ہوگیا۔ "پر تیرے ساتھ تو بہت دھوکا ہوا۔"

"دھوکا کیسے ہوا؟" لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو شادا کی پیشگی ادا کر رہا ہے ناں؟"

"ہاں جی' اسی کی پیشگی ادا کر رہا ہوں۔" لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "پر اس میں دھوکے شوکے کی کون سی گل بات ہے۔"

"شادا کی پیشگی تو پہلے ہی معاف ہونے جا رہی تھی۔"

"شادا کی پیشگی معاف ہونے جا رہی تھی۔ وہ کیسے؟" لالی کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔ "ایسا تو کبھی ہوتا نہیں۔"

"اس کی چھٹی کی جا رہی تھی۔" تاج محمد نے بتایا۔ "جب کسی کی چھٹی کر دی جاتی ہے اور بھٹے سے اس کا کوئی ناتا نہیں رہتا تو فیر پیشگی کو تو معاف ہونا ہی ہوتا ہے۔"

"پر سوال یہ ہے کہ شادا کی چھٹی کیوں کی جا رہی تھی؟"

"تو شادا کا یار ہے پر لگتا ہے تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" تاج محمد کھسک کر لالی کے

قریب ہو گیا۔ مدھم لہجے میں بولا۔ "وہ سخت بیمار ہے۔ اسے ہر دم بخار رہتا ہے۔ کھانسی بھی ہے اور کھانسی کے ساتھ منہ سے خون بھی آتا ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا شادا کو ٹی بی ہے؟" لالی نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"ڈاکٹر نے جمعدار کو میرے سامنے بتایا تھا۔" تاج محمد نے کھل کر بات کی۔ "وہ شادا کو لے کر سرکاری اسپتال گیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان دنوں مجھے بھی بخار رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے تو ملیریا بتایا اور دوائی دے دی۔ شادا کے لیے کہا' اسے ٹی بی ہے۔" اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "ڈاکٹر نے تو یہ بھی کہا تھا اس کے پھیپھڑے بالکل بیکار ہو گئے۔ اب یہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں مر جائے گا۔ تبھی تو اس کی چھٹی کی جا رہی تھی۔ کفن دفن جو کرنا پڑتا۔"

"مجھے یہ پتہ نہیں تھا وہ اتنا زیادہ بیمار ہے۔" لالی فکر مند ہو گیا۔

"شادا تو بالکل جوان ہے۔" تاج محمد نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "اسے ابھی نہیں مرنا چاہیے۔"

"تاجے' فکر نہ کر شادا اتنی جلدی مرنے کا نہیں۔" لالی نے تاج محمد کے ساتھ ساتھ خود کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں سے جانے کے بعد وہ اپنا علاج کرائے گا اور بالکل چنگا ہو جائے گا۔" اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ "یہ بتا تو آیا کیسے؟" مسکرا کر پوچھا۔ "ادھار لینے آیا ہے؟"

"نہیں' میں ایک اور ہی کام سے آیا ہوں۔"

"کیا کام ہے؟"

"تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟"

"کیسی مدد چاہتا ہے؟" لالی نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "صاف صاف بتا۔"

"تو ناجو سے ویاہ کر لے۔" تاج محمد نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"ناجو کون؟" لالی نے پوچھا۔ "تیری دھی؟"

"ہاں۔" تاج محمد بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ "اب وہ پوری طرح جوان ہو گئی ہے۔ جمعدار اسے بری طرح گھورتا رہتا ہے۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ مجھے ہر دم فکر رہتی ہے وہ اپنے کرندوں سے اسے اٹھوا نہ لے۔" وہ رک رک کر بولتا رہا۔ "جب تک چاہے گا زبردستی اپنی پاس رکھے گا۔ جی کرے گا تو واپس کر دے گا۔ نہ ملتان لے جا کر کنجریوں کے ہاتھ بیچ دے گا۔ وہ کئی جوان کڑیوں کو اٹھوا کر ایسا ہی کر چکا ہے۔" اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ "میں غریب پتھیرا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ رولا یا جھگڑا کروں، گا تو الٹا لٹکا کر چھتر سے مار لگائے گا۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنا ظالم اور گندہ

ہے۔"

لالی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔
مگر تاج محمد خاموش نہ رہا۔ عاجزی سے بولا۔ "تو مجھے بدنامی سے بچا سکتا ہے۔ ناجو کو برباد ہونے سے بچا سکتا ہے۔" اس نے لالی کو رضامند کرنے کے لیے اونچ نیچ سے بھی آگاہ کیا۔ "تو اکیلا بندہ ہے۔ تجھے بہت وڈی پیشگی ادا کرنی ہے۔ تجھے پتہ ہے ناجو کتنی اہری اور محنتی ہے۔ دونوں مل کر کام کریں گے تو تیری پیشگی جلد ادا ہو جائے گی۔ تجھے اپنی روٹی بھی نہیں پکانی پڑے گی۔ بیمار پڑ جائے گا تو تیری دیکھ بھال کرے گی۔ وہ تیرا ہر کام کرے گی۔ جیسا کہے گا ویسا ہی کرے گی۔ ویاہ کر کے تو اس کے ساتھ آرام سے رہے گا۔"

"چاچا' اس معاملے میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" لالی نے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ بھی بتا دی۔ "بات یہ ہے نہ میرا ابھی ویاہ کرنے کا ارادہ ہے اور نہ یہاں رہنے کا۔" اس نے گردن اونچی کر کے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں پتھیرا بن کر یہاں کید رہنا نہیں چاہتا۔ یہاں کام کرنے والا ہر بندہ کیدی ہے۔ یہ تو جیل ہے۔ سرکاری جیل سے بھی بری۔ مجھے اس جیل میں نہیں رہنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"پر تو پیشگی ادا کیے بنا یہاں سے کیسے جا سکتا ہے؟" تاج محمد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ "یہاں سے بھاگنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کرنا۔" اس نے لالی کو خبردار کیا۔ "کرندے اور راکھے بہت چوکنا رہتے ہیں۔ تو ان کی نظروں سے بچ کر باہر نہیں جا سکتا۔ پکڑا گیا تو جمعدار بہت ظلم کرے گا۔ تو سوچ بھی نہیں سکتا' وہ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔"

"مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے وہ کتنا ظالم اور برا بندہ ہے۔" لالی نے تاج محمد سے اختلاف نہ کیا۔ "میں یہاں سے فرار ہونے کی بالکل کوشش نہیں کروں گا۔" اس نے مطلع کیا۔ "شادا جلد ہی واپس آئے گا۔ پیشگی کے سارے روپے رانا محمود کے سامنے ڈالے گا اور مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"شادا واپس آئے گا؟ تو کیسی گل بات کر رہا ہے؟" تاج محمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "بھٹوں پر کام کرتے کرتے اب تو میرے بال بھی چٹے ہو گئے۔" اس نے اپنے سر کے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میں نے تو دیکھا نہیں' کسی کی بیماری کے بعد چھٹی کر دی گئی ہو اور وہ بھٹے پر واپس آیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جو یہاں سے جاتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔"

"شادا کے معاملے میں ایسا نہیں ہو گا۔" لالی نے کھل کر بات نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ "اس نے

مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔ وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔"

"مجھے تو ایسا لگتا نہیں کہ شادا واپس آئے گا۔" تاج محمد مطمعن نہیں ہوا۔

لالی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔

تاج محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نڈھال اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ لالی کو الجھن میں مبتلا کر گیا۔ مگر وہ ناامید نہ ہوا۔ چارپائی پر لیٹ کر دیر تک ارشاد الٰہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

لالی حسب معمول مستعدی سے کام کرتا رہا۔ صبح سے شام تک سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرتا اور ہر روز بے چینی سے ارشاد الٰہی کی واپسی کا انتظار کرتا۔

موسم بدل رہا تھا۔ درختوں میں پت جھڑ لگ گیا تھا۔ تیز ہوائیں چلتیں۔ خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔ ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جاتے۔ آسمان پر غبار چھایا رہتا۔ دن میں گرمی رہتی۔ مگر رات کو ہلکی ہلکی خنکی ہو جاتی۔ بھٹے پر زور شور سے کام ہو رہا تھا۔ چمنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں نکلتا اور فضا میں پھیل جاتا۔

لالی اپنے تھلے پر بیٹھا اینٹیں بنا رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سورج ڈھلک کر مغربی افق پر پہنچ گیا تھا۔ پتھیرے اب تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ لالی بھی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ صبح سے اس کی طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ مگر وہ کام کرتا رہا۔ اسی اثناء میں لیما اس کے پاس آگیا۔

لالی نے ہاتھ چلاتے چلاتے اس کی جانب دیکھا۔ لیما کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی بجھی بجھی تھیں۔ لالی نے اسے افسردہ دیکھا تو ہاتھ روک کر پوچھا۔ "لیمے' تو کچھ پریشان پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"تو نے نیرا کو دیکھا ہے ناں۔" لیما نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہی چھوہرا جو ہر دم روتا رہتا تھا۔ ماں پیو کو بہت یاد کرتا تھا۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔" لالی نے لیما کو غور سے دیکھا۔ "بیمار بھی رہتا ہے۔ پر تو اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"نیرا مر گیا۔"

"کب مرا وہ؟" لالی بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"تھوڑی دیر پہلے۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔"

"پر وہ اتنا بیمار تو نہیں لگتا تھا۔"

"تیں نوں پتہ نہیں وہ بہت بیمار تھا۔" لیما نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اتنا بیمار تھا کہ اس کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ آج شام اپنے پنڈ جانے والا تھا۔ چلا جاتا تو ماں پیو سے مل لیتا۔ ان کے پاس جانے کو بہت کہتا تھا۔ پر جاتا کیسے۔ اسے تو جمعدار خرید کر لایا تھا۔ وہ تو..."

لیما نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ سامنے سے جمعدار آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر لیما گھبرا گیا۔ وہ مڑا اور اپنے ٹھلّے کی جانب چلا گیا۔ لالی اداس اور دل گرفتہ تھا۔ وہ کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔

جمعدار قریب آ گیا اور ہاتھ میں دبا ہوا چھتر ہولے ہولے ہلاتا ہوا خاموشی سے گزر گیا۔

جمعدار دور چلا گیا تو لالی پھر اپنا کام کرنے لگا۔ گارا ختم ہو گیا تھا۔ اس نے زمین کھود کر مٹی نکالی۔ اس میں پانی ملایا۔ آٹے کی طرح گوندھ کر گارا تیار کیا اور سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کرنے لگا۔ مگر اب وہ بے دلی سے کام کر رہا تھا۔ چابک دستی اور پھرتی ماند پڑ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

دن ڈھلا۔ سورج کھسکتا ہوا دھیرے دھیرے مغربی افق پر اپنی الوداعی شعاعیں بکھرتا ہوا اوجھل ہو گیا۔ شام ہو گئی۔ غبار آلود آسمان دھندلا ہو کر تاریک ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

خزاں کی ایسی کتنی ہی اداس شامیں آئیں اور دبے پاؤں گزر گئیں۔ لالی کی بے کیف زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ صبح سے شام تک بھٹے پر کام کرتا رہا۔

۵۳

خزاں کی ایک شام کا ذکر ہے۔ لالی کام ختم کر کے جھونپڑی میں پہنچا تو نڈھال اور بہت تھکا ہارا تھا۔ مگر اسے ابھی کھانا پکانا تھا۔ بھوکا سو جاتا تو دوسرے روز کام ٹھیک سے نہ ہوتا۔ کام کم ہوتا تو اجرت بھی کم ملتی۔ پیشگی کا بوجھ سر پر سوار تھا۔ اسے اتارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ضروری تھا۔

اس نے چولہا سلگایا۔ دال تو کسی نہ کسی طور پک گئی۔ مگر روٹی پکانا دوبھر ہو گیا۔ لکڑیاں گیلی تھیں۔ بار بار آگ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ پھونک پھونک کر اسے تیز کرنا پڑتا۔ سانس پھول جاتی۔ دھواں اتنا اٹھتا کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔

وہ جھکا ہوا چولہا پھونک رہا تھا کہ پشت پر آواز ابھری۔ "لکڑیاں گیلی ہیں۔ آرام سے آگ نہیں پکڑیں گی۔"

لالی پہلے ہی پریشان تھا۔ اس نے جھنجلا کر گردن موڑی۔ دیکھا' تاجو سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ لالی کو اس کی شوخی سخت ناگوار گزری۔ جل کر بولا۔ "لکڑیاں گیلی ہیں یا سوکھی' تجھے ان سے کیا لینا؟ چل اپنا رستہ پکڑ۔"

"وے ناراض کیوں ہوتا ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "لکڑیاں تنگ کر رہی ہیں تو مجھے کیوں آنکھیں دکھا رہا ہے؟"

"روٹی مجھے پکانی ہے تجھے تو نہیں پکانی۔" لالی نے بے زاری کا اظہار کیا۔

"پرے ہٹ۔" وہ دھوتی سنبھال کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "تجھ سے آج روٹی نہیں پکنے کی۔

میں تیری روٹی پکائے دیتی ہوں۔"

وہ گردن جھکا کر زور زور سے سلگتی ہوئی لکڑیوں کو منہ سے پھونکنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنچ تیز ہو گئی۔ لکڑیوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ ناجو نے گردن کو خم دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ "آگ ایسے جلتی ہے۔" اس نے آٹے سے پیڑا بنایا۔ جھپاک جھپاک اسے ہاتھوں پر پھیلایا اور روٹی توے پر ڈال دی۔

لالی ایک طرف کھسک گیا اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔

ناجو چولہے کے سامنے بیٹھی روٹی پکاتی رہی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ آگ کی تپش سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر بار بار رخسار پر آجاتی اور وہ ایک ہاتھ سے بار بار ہٹا دیتی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ مگر جسم سڈول اور کسا ہوا تھا۔ کولہے چوڑے اور بھرے بھرے تھے۔ چہرہ خون کی گرمی سے دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔

ناجو روٹی پکاتی رہی۔ لالی چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے اور بدن سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ لالی کو معاً شاداں یاد آگئی۔ روٹی پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی اسی طرح جھپا جھپ چلتے تھے۔ وہ بھی چہرے پر آئی بالوں کی لٹ روٹی پکاتے پکاتے ایک ہاتھ سے ہٹاتی رہتی تھی۔ شاداں کی یاد کے ساتھ کتنے ہی سہانے خواب آنکھوں میں اتر آئے۔ وہ یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

"لے روٹی پک گئی۔" ناجو کی آواز ابھری۔

لالی نے چونک کر دیکھا۔ وہ چولہے کے سامنے بیٹھی ہاتھوں میں لگا ہوا آٹا صاف کر رہی تھی۔ اس نے لالی کی جانب پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر جب وہ باہر جانے کے لیے مڑی تو لالی نے ٹوکا۔ "تو جا رہی ہے ناجو؟"

"جاؤں گی نہیں تو کیا یہیں بیٹھی رہوں گی۔" ناجو نے منہ بگاڑ کر بے رخی سے کہا۔

لالی کو اس کا تیکھا اور کڑوا لہجہ ناگوار نہ گزرا۔ شاداں بھی اسی لہجے اور اسی تنتنے سے بات کرتی تھی۔ ناجو آگے بڑھی تو لالی نے ایک بار پھر ٹوکا۔ "کدھر چلی؟ بات تو سن۔"

وہ ٹھٹکی۔ گردن کو خم دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ "کہہ، کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔

"جا کر اپنے پیو کو میرے پاس بھیج دے۔"

"کیوں؟ اسے میری شکایت لگانی ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔

"زیادہ تیزی نہ دکھا۔" لالی نے مسکرا کر اسے ڈانٹا۔ "جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔"

ناجو چلی گئی۔ لالی نے کھانا نکالا اور چارپائی پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار جھونپڑی کے باہر دیکھنے لگا۔ اسے تاج محمد کا انتظار تھا۔

لالی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پہر رات گزر گئی۔ تاج محمد نہیں آیا۔ لالی انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ لیکن تاج محمد اس کے پاس نہ آیا۔

ہفتے کی شام کو چھٹا بٹا۔ لالی نے اپنی اجرت لیتے ہوئے منشی سے پوچھا۔ "میری پیشگی اب کتنی رہتی ہے؟"

"بہت رہتی ہے۔" منشی نے رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے۔ "ابھی تو سو روپے بھی ادا نہیں ہوئے۔"

لالی بہت چکرایا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک پیشگی کے کئی سو روپے ادا ہو چکے ہوں گے۔ مگر اس نے منشی سے تکرار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر اس کا نقصان تھا۔ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

ہفتے بھر کی مزدوری کے روپے دھوتی کے ڈب میں رکھتے ہوئے لالی نے سوچا۔ صرف اس کی تنہا محنت سے تو پیشگی کا بوجھ کبھی سر سے نہیں اتر سکے گا۔ یکایک اسے ناجو یاد آگئی۔ وہ شاداں کی طرح محنتی اور جفاکش ہے۔ اس کے ہاتھ سدھے ہوئے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں۔ بغیر آرام کئے صبح سے شام تک کام کرتی ہے۔ تاج محمد ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے ساتھ شادی کر کے وہ بہت آرام سے رہے گا۔ دونوں مل کر جلد ہی پیشگی ادا کر دیں گے۔ اس کی سپاٹ اور بے کیف زندگی میں سرخوشی اور گہما گہمی پیدا ہو جائے گی۔

شام کے جھٹ پٹے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ اپنی جھونپڑی کی جانب جا رہا تھا۔ ابھی چولہا جلا کر اسے کھانا پکانا تھا۔ کپڑے بھی دھونا تھے۔ بہت میلے ہو گئے تھے۔ ایسے سارے کام ناجو کر سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی تو ان کے متعلق سوچنا بھی نہ پڑتا۔ اسے تاج محمد سے مل کر اب ناجو کے رشتے کی بات طے کر لینا چاہیے۔ مگر وہ اس کے پاس آیا کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے ناجو اس کا پیغام دینا بھول گئی ہو۔

لالی اپنی جھونپڑی سے دور ہی تھا کہ ایک موڑ پر تاج محمد مل گیا۔ چلتے ہوئے اس کی کمر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ لالی بڑھ کر اس کے قریب گیا اور جاتے

ہی شکوہ کیا۔

"چاچا میں نے تجھے بلایا تھا تو آیا نہیں۔"

"تو نے مجھے کیوں بلایا تھا؟" تاج محمد نے دریافت کیا۔

"مجھے تاجو کے بارے میں تجھ سے بات کرنی تھی۔" لالی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "میں تاجو سے ویاہ کرنے پر تیار ہوں۔"

"پر تجھے تو پتھیرا بن کر یہاں ٹھہرنا نہیں۔" تاج محمد کے لہجے میں تلخی تھی۔ "کہتا تھا یہ تو سرکاری جیل سے بھی بری جیل ہے۔ شادا آئے گا اور پیشگی ادا کر کے تجھے لے جائے گا۔"

"ان دنوں میں نیا نیا آیا تھا۔ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتا تھا۔ اب تو مجھے یہیں رہنا ہے۔ اور پتھیرا بن کر ہی رہنا ہے۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "چاچا' تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جس کی ایک بار بھٹے سے چھٹی کر دی جاتی ہے وہ واپس نہیں آتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔" اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے پھیل گئے۔ "تیرا کی طرح شادا بھی اپنے رب کے پاس چلا گیا۔"

"تیرا مطلب ہے شادا مر گیا۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" لالی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "زندہ ہوتا تو ضرور واپس آتا اور پیشگی ادا کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس نے مجھ سے پکّا وعدہ کیا تھا۔"

"مجھے یہ تو پتہ نہیں اس نے تجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ پر میں یہ جانتا ہوں وہ زندہ ہے۔" تاج محمد نے لالی کو مطلع کیا۔ "آج کل اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا میں ہوتا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ دونوں اڈے پر بھیک مانگتے ہیں۔"

لالی نے چونک کر تاج محمد کو دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تجھے کس نے بتایا کہ شادا زندہ ہے؟"

"جمعدار بتاتا تھا۔ اس نے شادا اور اس کی ماں کو جوند سنگھ والا میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔" تاج محمد نے لالی کو بتایا۔ "جمعدار پچھلے دنوں پتھیروں کی بھرتی کرنے کے لیے ادھر بھی گیا تھا۔"

"چاچا' تو سچ کہہ رہا ہے؟" لالی نے اس طرح حیرت کا اظہار کیا جیسے اسے تاج محمد کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"مجھے تجھ سے جھوٹ بول کر کیا لینا۔" تاج محمد نے وضاحت کی۔ "جمعدار نے مجھے جو بتایا میں نے تجھے بتا دیا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "پر جمعدار کو یہ نہ بتانا میں نے تجھے شادا کے

بارے میں بتایا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچے۔ بیکار میں میرے گلے پڑ جائے۔ تجھے پتہ ہے اس کا کمتہ کتنا برا ہے۔"

"چاچا' تو اطمینان رکھ میں جمعدار سے شادا کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کروں گا۔" لالی نے اسے یقین دلایا اور ایک بار پھر حرف مطلب پر آگیا۔ "یہ بتا۔ تاجو کے بارے میں اب کیا کرنا ہے؟ میں نے تو تیری بات مان لی۔"

تاج محمد نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکائے چپ چاپ لالی کے ساتھ چلتا رہا۔

لالی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "چاچا تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"سمجھ نہیں آتی کیا جواب دوں۔"

"کیوں؟" اس نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"تجھے پتہ ہے۔ تاجو کی ماں تو بیمار ہی رہتی ہے۔ ہر دم منجی پر پڑی ہائے ہائے کرتی رہتی ہے۔ میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھ سے اب کام نہیں ہوتا۔ نکا بہت چھوٹا ہے۔" تاج محمد ٹھہر ٹھہر کر اپنی پریشانی بیان کرتا رہا۔ "تاجو ویاہ کر چلی گئی تو ہم سب کا کیا بنے گا۔ سچ پوچھ تو اکیلی تاجو ہی کام کرتی ہے۔ وہ کام نہ کرے تو کھانے کو روٹی بھی نہ ملے۔"

اس کا جواب سن کر لالی بہت چکرایا۔ حیرت بھی ہوئی' غصہ بھی آیا۔ جل کر بولا۔ "چاچا' میں نے تیرے آگے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے۔ تو نے خود ہی تو کہا تھا کہ تاجو کو اپنی گھر والی بنا لے۔ جب تو نے اس کے رشتے کی بات کی تھی تب تو نے یہ باتیں نہیں سوچی تھیں۔"

"تب تو جمعدار کا ڈر تھا۔" تاج محمد نے جواز پیش کیا۔

"اور اب جمعدار نیک بندہ بن گیا ہے۔ تو سمجھتا ہے اب وہ تاجو کو کرندوں سے نہیں اٹھوا لے گا۔" لالی ہنوز جھنجلایا ہوا تھا۔ تاج محمد کا رویہ اسے سخت ناگوار گزرا تھا۔ "کہتا تھا مجھے بدنامی سے بچا لے۔ تاجو کو برباد ہونے سے بچا لے۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ "کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ پتہ نہیں کیسا بندہ ہے؟ ایک دم خود غرض اور نکما۔"

"بکواس نہ کر۔" تاج محمد بھی ایک دم بھڑک اٹھا۔ "تاجو میری دھی ہے۔ میں جب چاہے اس کا ویاہ کروں۔ جس سے چاہوں کروں۔ یہ میری مرضی ہے۔ تو مجھ سے پوچھنے والا کون؟" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "مجھے تاجو کا ویاہ تیرے ساتھ نہیں کرنا۔"

لالی سکتے میں آگیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ تاج محمد نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔ مڑا اور اپنی جھگی کی جانب چلا گیا۔

☆

لالی اب زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا تھا۔ وہ سویرے ہی سویرے اپنے تھلّے پر پہنچ جاتا اور شام کو اس وقت تک اینٹیں بناتا رہتا جب تک اندھیرا گہرا نہ ہو جاتا۔ ہفتے کے روز چٹھا بٹتا تو وہ منشی رحمت کی ہر طرح خوشامد کرتا۔ کم سے کم پیشگی کٹواتا اور زیادہ سے زیادہ مزدوری وصول کرنے کی کوشش کرتا۔

سردی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ دن میں دھوپ مزا دیتی اور رات کو آگ کے قریب بیٹھنے میں لطف آتا۔ جن بھٹہ مزدوروں اور پتھیروں کے پاس سردی سے محفوظ رہنے کے لیے گرم بستر نہیں تھے وہ چمنی کے ارد گرد لیٹ جاتے۔ حرارت اور گرمی حاصل کرتے اور صرف ایک سوتی چادر اوڑھ کر کسی نہ کسی طرح رات بسر کرتے۔ لحاف اور رضائیاں بنانے کے لیے پیشگی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ جمعدار کی طرح طرح سے خوشامد ہوتی۔ منشی کو راضی کیا جاتا۔ وہ ہر ضرورت مند کی درخواست قبول بھی کر لیتا۔ اس لیے کہ برسات اور جاڑے میں پیشگی دینے کا عام دستور تھا۔ منشی پیشگی تو دے دیتا مگر بھٹہ مالک کی ہدایت پر سختی سے عمل کرتا۔ ہیرا پھیری اور جعل سازی کرنے سے باز نہ آتا۔ جتنی پیشگی دیتا اس سے زیادہ رقم رجسٹر میں درج کرتا۔ ان پڑھ پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کو مطلق علم نہ ہوتا کہ منشی نے ان کے نام کتنی پیشگی لکھی ہے۔ وہ آنکھ بند کر کے انگوٹھا لگا دیتے اور جتنی رقم ملتی خوشی خوشی لے لیتے۔

لالی بھی پیشگی لینا چاہتا تھا اور زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس ڈیڑھ سو سے بھی زیادہ روپے موجود تھے۔ مگر تاج محمد سے گفتگو کرنے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھا کرنے کی فکر میں رہتا۔ اسی مقصد کے تحت وہ ایک رات جمعدار کے پاس پہنچا۔

جمعدار کی جھونپڑی بھٹے کے ایک گوشے میں الگ تھلگ تھی۔ اس کی دیواریں پختہ تھیں جو ناکارہ اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کی چنائی بھٹے سے نکلنے والی سرخ راکھ سے کی گئی تھی۔ اس کی جھونپڑی دوسری جھونپڑیوں اور جھگیوں سے بڑی بھی تھی۔

لالی اس کے پاس پہنچا تو اول شب تھی۔ جمعدار اس وقت تنہا تھا۔ چارپائی پر تھکا ہوا سا بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کیسے آیا؟"

"تجھے ملنے آیا تھا۔" لالی نے جاتے ہی خوشامد شروع کر دی۔ "جمعدار، بہت تھکا ہوا نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے آج تجھے بہت کام کرنا پڑا۔ ویسے تجھے تو روز ہی بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ سچ پوچھ تو بھٹہ

تو ہی چلاتا ہے۔" لالی اس کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"تو نے بتایا نہیں کیسے آیا؟" جمعدار نے مسکرا کر پوچھا۔

"تیری مدد چاہیے ہے۔" لالی کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"کیسی مدد؟" جمعدار کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "چھٹی کے لیے تو نہیں آیا؟ ایسی گل بات نہ کرنا۔ اس کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔"

"نہیں جی، مجھے چھٹی شٹی نہیں چاہیے۔" لالی نے فوراً تردید کی۔ "مجھے تو پیشگی چاہیے ہے۔"

"تو میرے پاس کیوں آیا؟ منشی کے پاس جا۔ وہ تو آج کل سب ہی کو پیشگی دے رہا ہے۔"

"مجھے کچھ زیادہ ہی پیشگی لینی ہے۔" لالی اور بھی زیادہ مستعدی سے جمعدار کے کندھے دبانے لگا۔ "تو منشی سے کہہ دے گا تو جتنی پیشگی کے لیے کہوں گا وہ دے دے گا۔ مجھے پتہ ہے وہ تیری سفارش پر انکار نہیں کر سکتا۔"

"کتنی پیشگی تجھے چاہیے؟"

"چاہیے تو چار سو ہیں۔ پر تین سو بھی مل جائیں تو کام چل جائے گا۔"

"تین سو تو بہت ہوئے۔ تجھے تو پہلے ہی بہت وڈی پیشگی ادا کرنی ہے۔" جمعدار نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اتنی زیادہ پیشگی لے کر تا جا کی کڑی ناجو سے ویاہ تو نہیں کرنا؟" اس نے لالی کو خبردار کیا۔ "پر تجھے یہ پتہ ہونا چاہیے ناجو میری رکھیل ہے۔ جب چاہتا ہوں رات کو اسے بلا لیتا ہوں۔ مفت میں رکھیل بنا کر نہیں رکھا۔ جتنی ناجو کو ہر ہفتے دہاڑی ملتی ہے اتنی ہی اس کے پیو کو بنا کام کئے دیتا ہوں اور اپنے ڈب سے نکال کے دیتا ہوں۔" اس کا لہجہ اچانک تند اور تلخ ہو گیا۔ "ناجو سے ویاہ کرنے کا دھیان دل سے نکال دے ورنہ بہت پچھتائے گا۔"

"نہیں جی، مجھے ناجو سے ویاہ نہیں کرنا۔ کسی نے تجھے غلط بتایا۔" لالی کے دل کو سخت دھچکا لگا مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ فوراً بات بنائی۔ "میں اس سے کیوں ویاہ کرنے لگا۔ میری گھر والی نہیں ہے؟"

"تیرا ویاہ ہو چکا ہے؟"

"کئی سال ہو گئے۔ اب تو دو نکوں کا پیو ہوں۔" لالی نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "گھر والی کو روپے بھیجنے کے لیے تو پیشگی مانگ رہا ہوں۔ وہ بیمار رہتی ہے۔ ادھار بھی اس نے بہت لے رکھا ہے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "چار سو پیشگی دلا دے۔ جمعدار تیری بہت مہربانی ہو گی۔"

"تو کہتا ہے تو چار ہی سو دلوا دوں گا۔ پر تو گھر والی کو روپے بھیجے گا کیسے؟ منی آڈر کرنے کے لیے ڈاک خانے جانے کی اجازت نہیں۔" جمعدار نے تیکھے لہجے میں کہا۔ قدرے تامل کے بعد بولا۔ "جتنے روپے بھیجنے ہوں، مجھے دے دینا۔ میں منی آڈر کروا دوں گا۔ تجھے رسید مل جائے گی۔ دوسرے پتھیروں کے لیے بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔"

"کب تک مل جائے گی یہ پیشگی؟"

"میں کل سویرے منشی کو بول دوں گا۔ تو دوپہر کو اس کے پاس چلا جانا۔ وہ تجھے روپے دے دے گا۔" جمعدار اکبر سانول نے لالی کو مطلع کیا۔ "میں چند دنوں بعد پتھیرے لینے بھاول نگر جاؤں گا۔ تیں نوں بھیجنی نال روپے منی آڈر کرنے ہوں تو مجھے پرسوں دے دینا۔ ورنہ واپسی پر تیرا کام کر دوں گا۔"

"تیری بہت بہت مہربانی۔" لالی نے منی آرڈر بھیجنے کے بارے میں مزید بات چیت نہیں کی۔ جمعدار کے کندھے اور زیادہ مستعدی سے دبانے لگا۔

"اب تو ٹر جا۔" جمعدار نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے آج رات ناجو کو بلایا ہے۔ وہ آتی ہی ہو گی۔"

لالی باہر نکلا اور اپنی جھونپڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اندھیرے میں دو سائے نظر آئے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ سائے قریب آ گئے۔ لالی نے دونوں کو پہچان لیا۔ تاج محمد آگے آگے تھا اور ناجو اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تاج محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ناجو مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ لالی نے نہ اسے ٹوکا نہ روکا۔ خاموشی سے ان کے برابر سے گزر گیا۔ لیکن اس نے دل میں ہلکی سی کسک محسوس کی۔

دوسرے روز دوپہر کو وہ منشی رحمت کے پاس گیا۔ جمعدار نے حسب وعدہ سویرے ہی سویرے منشی سے اس کی سفارش کر دی تھی۔ اس نے مسکر کر لالی کو دیکھا، پوچھا۔ "پیشگی لینے آیا ہے؟" اور رجسٹر کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "یہاں انگوٹھا لگا دے۔" منشی نے انگلی رکھ کر بتایا۔

لالی نے پڑھا۔ رجسٹر میں چار سو کے بجائے سات سو کی رقم کا اندراج کیا گیا تھا۔ اسے غصہ تو بہت آیا۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ اس نے نہ اعتراض کیا نہ احتجاج۔ وہ منشی پر یہ واضح کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ لکھ پڑھ بھی سکتا ہے۔ اس نے خاموشی سے انگوٹھا لگایا۔ منشی سے چار سو روپے لے کر گنے اور دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔

☆

لالی کے پاس اب ساڑھے پانچ سو سے بھی زیادہ روپے تھے۔ وہ جلد سے جلد بھٹے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے صرف جمعدار اکبر سانول کے بھاول نگر جانے کا انتظار تھا۔ اس کی موجودگی میں فرار ہونا خطرناک تھا۔ وہ بڑا گھاگ اور بے ڈھب جمعدار تھا۔ برسوں سے جمعداری کر رہا تھا۔ ہر پتھیرے پر نظر رکھتا تھا اور ہر وقت چوکنا رہتا تھا۔

لالی کی ان دنوں یہی کوشش رہتی کہ جمعدار سے آمنا سامنا نہ ہو۔ مبادا وہ منی آرڈر کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔ جمعدار نظر بھی آتا تو وہ اس قدر انہماک سے کھٹا کھٹ اینٹیں بنانے لگتا گویا اسے دیکھا ہی نہیں۔ اس کی گردن جھکی ہوتی اور ہاتھ تیزی سے چلتے رہتے۔ شام ہوتے ہی وہ کام ختم کرتا۔ سیدھا اپنی جھونپڑی میں جاتا اور چولہا جلا کر کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتا۔

چند ہی روز بعد جمعدار بھاول نگر چلا گیا۔ وہ صرف دو روز کے لیے گیا تھا۔ انھی دو دنوں میں لالی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ وقت بہت کم تھا اور اسے جو کچھ کرنا تھا جلد سے جلد کرنا تھا۔ مگر ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اور پوری احتیاط سے اٹھانا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تو ایسی ہولناک سزا ملے گی جس کے تصور ہی سے وہ لرزہ براندام ہو جاتا۔ ملک نثار محمد کے بھٹے سے فرار ہونے کی پاداش میں جمعدار زماں خان نے اس کی جو درگت بنائی تھی اسے اب تک فراموش نہ کر سکا تھا۔

دن میں تو فرار ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایسی کوشش کی جا سکتی تھی۔ بھٹہ میلسی کی آبادی سے الگ تھلگ ایک ویرانے میں تھا۔ اس کا محل وقوع کچھ اس طرح تھا کہ رات کو بھی فرار ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے ارد گرد دور تک پھیلا ہوا لق و دق میدان تھا۔ جس میں پیلو اور ببول کے اکا دکا درخت تھے۔ جھاڑیاں کہیں کہیں تھیں اور اتنی گھنی اور اونچی بھی نہ تھیں کہ ان کی اوٹ میں دبک کر چھپا جا سکے۔ میدان سے گزرنے والا دور ہی سے نظر آتا تھا۔

بھٹے کے صرف ایک طرف کھیت تھے جن کا سلسلہ بستی ۲۰۳ ڈبلیو بی تک جاتا تھا۔ ان میں کماد کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اگر لالی کسی طرح ان کھیتوں کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو گنے کے اونچے اونچے پودوں میں چھپتا چھپاتا آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ مگر کماد کے کھیتوں کی دن رات نگرانی کی جاتی تھی۔ رات کو یہ نگرانی اور سخت کر دی جاتی۔ کھیتوں کے آگے مٹی کی لگ بھگ پانچ فٹ اونچی دیوار تھی جسے زمیں دار نے اپنی فصلوں کو مویشیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ بھٹے کا ایک چوکیدار اس دیوار کے سامنے رات بھر چوکس کھڑا نگرانی کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی

پتھیرا یا بھٹہ مزدور بھولے سے بھی کھیتوں کے قریب چلا جاتا تو وہ سختی سے ڈانٹتا تھا اور چھتر سنبھال کر مارنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ ہاتھ آجاتا تو دو چار چھتر لگانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔

اس روز آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا بھی سنکی ہوئی تھی۔ سردی چمک گئی تھی۔ لالی کام ختم کر کے شام کو اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو بدن میں سردی سے ہلکی ہلکی کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چولہا روشن کیا۔ کھانا پکانے سے پہلے چائے تیار کی۔ پیالے میں انڈیلی اور گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ تھکا ہوا بھی تھا۔ چائے پینے میں بڑا لطف آیا۔ اسی اثناء میں بھٹے کا ایک کارندہ نواز گل آگیا۔ وہ ریاست دیر کا اتمان زئی پٹھان تھا۔ اس کی عمر ۴۰ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کارندوں میں سے تھا جن سے لالی نے شناسائی اور کچھ میل جول پیدا کر لیا تھا۔ نواز گل کبھی کبھار لالی کی جھونپڑی میں بھی آجاتا اور وہ بھی چائے پینے کے لیے۔ ورنہ چپ چاپ اس کی جھونپڑی کے سامنے سے گزر جاتا۔ وہ اس وقت یہ معلوم کرنے کے لیے گشت پر نکلتا تھا کہ تمام پتھیرے کام ختم کر کے اپنی جھونپڑیوں میں پہنچ گئے کہ نہیں۔ پتھیرے عام طور پر گڑ کی چائے بناتے تھے، مگر لالی گڑ کے بجائے چائے میں شکر ڈالتا تھا۔ لہٰذا اس کی چائے نواز گل کو پسند بھی آتی تھی۔

لالی چولہے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے نواز گل کو اپنے قریب بٹھایا۔ پیالے میں چائے ڈالی اور پیالہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ نواز گل بھی چائے پینے لگا۔

لالی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "لالہ، آج سردی بہت ہے۔"

"سردی ادھر کہاں پڑتا ہے۔" نواز گل نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ "سردی تو دیر میں پڑتا ہے۔ آج کل تو وہاں برف گرتی ہے۔ ہر طرف سفید سفید برف نظر آتی ہے۔ درختوں پر، مکانوں کی چھتوں پر، راستوں پر۔"

"تب تو سارے ہی راستے بند ہو جاتے ہوں گے۔ کوئی کام دھندا نہیں ہوتا ہوگا۔"

"ہاں جی، چھ مہینے تک کوئی کام دھندا نہیں ہوتا۔"

"بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی ہوگی۔" لالی نے دریافت کیا۔ "تم ادھر کیا کرتے تھے؟"

"جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا۔ اسے فروخت کرتا تھا۔ مزدوری کرتا تھا۔" نواز گل نے لالی کو بتایا۔ "ان دنوں امارا باپ زندہ تھا۔ میں چھوٹا تھا۔ شادی بھی نہیں ہوا تھا۔ باپ کے ساتھ بلزئی چلا جاتا۔ بلزئی دیر سے آٹھ میل آگے ہے۔ بلزئی سے پیٹھ پر دو ڈھائی من بوجھ اٹھا کر عشریت تک لے جاتا تھا۔ یہ تیس میل سے بھی زیادہ لمبا راستہ ہے۔ اور بہت خطرناک ہے۔ کہیں سیدھی

چڑھائی ہوتی کہیں ایک دم ڈھلوان آجاتا۔ راستے میں لواری کی چوٹی پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ بہت اونچی چوٹی ہے۔ نیچے دیکھو تو سر چکرانے لگے۔"

"یہ تو سخت محنت کا کام تھا۔ بہت خطرناک بھی تھا۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"کہیں کہیں تو راستہ اتنا تنگ ہوتا کہ کسی مزدور کا پیر پھسل جاتا یا پتھر سے ٹھوکر لگ جاتا تو لڑھک کے نیچے ایسے گہرے کھڈ میں جاتا کہ لاش نکالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ راستے میں پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے تودے گرتے تھے۔ بہت مزدور ان کے نیچے دب کر مرجاتے۔" نواز گل نے گہری سانس بھری۔ "امارا باپ بھی ایسے ہی تودے کے نیچے دب کر مرگیا۔ کئی مہینے بعد جب برف پگھلی تو لاش نکالی گئی۔" اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ "بڑی سخت مزدوری تھی۔"

"پر مزدوری تو چنگی ملتی ہوگی۔"

"ٹھیکیدار پانچ روپے فی من مزدوری دیتا تھا۔" نواز گل نے بتایا۔ "جس دن کام نہیں ملتا تو جیری کین ہوتا۔ کوئی مزدوری نہیں ملتا تھا۔ سات میل پیدل آنے جانے کا سفر بالکل بے کار جاتا۔ ایسا تب ہوتا تھا جب عشریت سے چترال جانے کے لیے کوئی سامان نہ ہوتا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "باپ کے مرنے کے بعد ام بلزئی سے دیر واپس آگیا۔"

"دیر میں اینٹیں بنانے کے بھٹے نہیں ہوتے؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں، بھٹے پشاور میں ہوتے ہیں، دیر میں بھٹے مٹے نہیں ہوتے۔ لکڑی سے مکان بنائے جاتے ہیں۔" نواز گل نے جواب دیا۔ "زیادہ تر مکان نواب محمد شاہجہاں خان کے ہیں۔ وہ ادھر کا حاکم ہے۔ مکان کا کرایہ چار روپے فی مربع گز کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے۔ کرایہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ایک ایک کمرے میں دس دس بارہ بارہ لوگ رہتا ہے۔ وہیں بھیڑ بکریاں بھی رکھی جاتی ہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کی جانب دیکھا۔ "کرائے میں دیری ہو تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ نواب کے ملازم سامان اٹھا کر باہر ڈال دیتے ہیں۔ زبردستی مکان خالی کرا لیتے ہیں۔ کرائے دار کو باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ چاہے برف باری ہوتی ہو یا طوفان آیا ہو۔ وہ ذرا بھی ترس نہیں کھاتے۔ کوئی رعایت نہیں کرتے۔ کرائے داروں کے لیے نواب کا یہی حکم ہے۔"

"تب تو ادھر بہت ظلم ہوتا ہے۔"

"یارا تم کو کیا پتہ کتنا ظلم ہوتا ہے؟" نواز گل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نواب کی ضرورت کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانی پڑتی ہیں۔ مویشیوں کے لیے گھاس لانی پڑتی ہے۔ وہ شکار پر جاتا ہے تو اس کے کتوں کے ساتھ دوڑنا پڑتا ہے۔ محل اور قلعے بنانے ہوتے ہیں۔ زمین کاشت

کرنی ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کا کوئی دہاڑی کوئی مزدوری نہیں ملتا۔" اس نے چائے کا بڑا گھونٹ بھرا۔ "ایسی بیگار نواب کے لیے کرنی پڑتی ہے اور خوانین کے لیے بھی۔ خوانین بھی بڑے زمیں دار ہوتے ہیں۔ ہر کسان کو جو اپنی زمین پر کاشت کرتا ہے اسے اپنے خاندان کا ایک جوان بیگار کے لیے دینا لازمی ہے ورنہ زمین کا ایک حصہ نواب یا خوانین کو دینا پڑتا ہے۔ کوئی ایسا نہ کرے تو اسے دریا پکدرہ کی جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

رات اب آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ چولہے میں جلتی ہوئی لکڑیوں سے شعلے ابھر کر لہرا رہے تھے۔ ان کی روشنی میں نواز گل کا سرخ چہرہ اور زیادہ سرخ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔ وہ چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور لالی کو بتاتا رہا۔

"بیگار تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ نواب کسانوں سے مویشی رکھنے پر کلنگ بھی وصول کرتا تھا۔ یہ ٹیکس گھی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جتنے زیادہ مویشی ہوں اتنا ہی زیادہ گھی لیا جاتا ہے۔ ۳۰ سیر سے من بھر تک سالانہ گھی لیا جاتا ہے۔ نواب اپنے نوکروں اور کرندوں کو کوئی تنخواہ نہیں دیتا۔ ان کے گزارے کے لیے ہر خاندان سے دس سیر غلہ فصل پر وصول کیا جاتا ہے۔ کسی کے بچہ پیدا ہو تو ایک مرغ اور ایک روپیہ نواب کو دینا ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "وہ کیا کیا ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ نواب زادگان اور خوانین کے علاوہ ریاست میں کسی کو اجلا لباس پہننے کا اجازت نہیں۔ مکانوں پر ٹین کی چھت ڈالنے اور کھڑکی یا روشن دان پر شیشہ لگانے کا اجازت نہیں۔ کوئی اس کا حکم نہ مانے تو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ٹوپی نہ پہنے تب بھی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن نواب زادگان ٹوپی نہیں پہنتے۔"

"لالہ' ریاست کا نواب کیسا بندہ ہے؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"عیش کرتا ہے۔ بہت عالی شان محل میں رہتا ہے۔ ایک نہیں اس کے کئی شاندار محل اور قلعے ہیں۔" نواز گل نے لالی کو بتایا۔ "وہ زبردست خنزیر ہے۔ اس کی چھ لو زنانیاں ہیں۔ دو سو عورات ہیں جو اس کی داشتائیں ہیں۔ ریاست میں کوئی خوبصورت لڑکی نظر آ جائے تو اسے بلوا کر محل میں زبردستی رکھ لیتا ہے۔"

"وہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟" لالی نے جل کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"اس کا باپ نواب اورنگ زیب خان اس سے بھی بڑا پاگل کا بچہ تھا۔" نواز گل کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "نواب اورنگ زیب خان کی ایک زنانی بہت خوبصورت تھی۔ اس سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ مر گئی تو نواب اورنگ زیب خان نے بہت غم منایا۔ اسی غم میں اس پاگل کے

بچے نے خدا کے نام انگریز پولیٹکل ایجنٹ کی معرفت ایک چٹھی بھیجی۔ اس میں لکھا۔ اللہ تعالیٰ! اگر تو اپنی رحمت سے میری زنانی کو دوبارہ زندہ کردے تو میں تو تیرے نام پر دو سو بھیڑوں کی قربانی کروں گا۔ نمازیں پڑھوں گا۔ ہر سال حج کروں گا۔ اس چٹھی پر اس نے ریاست کی سرکاری مہر لگائی۔ دستخط کیے۔ اپنے پیر سے اس پر سفارش لکھوائی اور رجسٹری سے بھجوادی۔ نواب مدت تک جواب کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا ایک ملازم روزانہ صبح شام ڈاک خانے جاتا اور یہ معلوم کرتا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی درخواست کا جواب آیا کہ نہیں۔"

"یار نواز گل، تو سچ کہہ رہا ہے؟" لالی نے حیران و پریشان ہو کر نواز گل کی جانب دیکھا۔

"یہ بالکل سچ ہے۔" نواز گل نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ریاست دیر کا ہر رہنے والا یہ بات جانتا ہے۔"

"ادھر تو سچ مچ بہت ظلم ہوتا ہوگا۔" لالی نے اظہار خیال کیا۔

"نواب محمد شاہجہاں خان کے علاوہ بڑا خان ہے۔ وہ بھی کسانوں اور مالا تاروں پر بہت ظلم کرتا ہے۔"

"یہ مالا تار کون ہوتے ہیں؟" لالی نے اظہار خیال کیا۔

"مالا تار وہ مزارع یا کسان ہوتے ہیں جو زمین کے مالک کو بٹائی نہیں دیتے۔ گھی، بکریاں اور مرغیاں دیتے ہیں۔ عشر ادا کرتے ہیں جو فصل کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔" نواز گل کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "یارا تم کو کیا کیا بتائیں۔ سرحد کے دوسرے خوانین جو بڑے زمیں دار ہیں غریب لوگ پر ایسا ہی ظلم کرتے ہیں۔ کسان پہاڑ اور چٹانیں کھود کو کھیتی باڑی کے لیے زمین نکالتے ہیں۔ اس پر فصل اگاتے ہیں۔ خوانین انھیں بے دخل کر کے خود زمین کے مالک بن جاتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "امارا ایک رشتے دار شالی ہشت نگر کے موضع کنڈو میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ خان نے پولیس کو رشوت دے کر اس کے خلاف مقدمہ بنوایا۔ اس کا زمین قرق کروایا۔ اس کا گھربار سب کچھ تباہ ہوگیا۔ آخر وہ پریشان ہو کر محنت، مزدوری کرنے کراچی چلا گیا۔ ام کو بھی وہی کراچی لے گیا تھا۔"

نواز گل نے چائے ختم کر کے پیالہ رکھ دیا۔ اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ کہنے لگا۔ "اب میں روانڈ پر اوں گا۔ تجھ سے آج بہت باتیں کرلیں۔"

لالی نے اسے جانے نہ دیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "یار، تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔ تو نے بہت عجیب و غریب باتیں بتائیں۔" اس نے نواز گل کے پیالے میں اور چائے ڈال دی۔ "لے ایک پیالہ چائے

اور پی۔ اسے ختم کر کے چلا جانا۔"

نواز گل نے انکار نہ کیا۔ پیالہ اٹھا کر چائے پینے لگا۔

"تو کراچی کتنا عرصہ رہا؟" لالی نے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"ادھر ام سات سال رہا۔" نواز گل نے بتایا۔ "وہاں بھی مزدوری کرتا تھا۔"

"کراچی تو نے کیوں چھوڑ دیا؟"

"ام اور سرحد کا دوسرا لوگ ادھر ایک خالی میدان میں جھگیاں ڈال کر رہتا تھا۔ وہ کسی ہندو کا زمین تھا۔ وہ ہندوستان چلا گیا تھا۔ ایک مسلم لیگی لیڈر نے وہ زمین اپنے نام الاٹ کرا لیا۔ ام کو بولا۔ زمین خالی کر دو۔" نواز گل نے تلخی سے کہا۔ "وہی بے دخلی کا چکر ادھر بھی شروع ہو گیا جس کی وجہ سے ام سرحد سے کراچی آیا تھا۔"

"آگے کیا ہوا؟" لالی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ام نے زمین خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت ڈرایا دھمکایا۔ پولیس کو بھی لایا۔ مگر ام نے زمین خالی نہ کیا۔"

"تب اس نے کیا کیا؟"

"اس خنزیر نے ایک رات اماری جھگیوں میں آگ لگوا دی۔" نواز گل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس رات ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی۔ ساری ہی جھگیاں جل گئیں۔ ایک بھی نہ بچی۔ سامان بھی جل گیا۔ ایک زنانی اور دو بچے بھی جل کر مر گئے۔"

"سب نے اس کے خلاف پولیس میں پرچہ نہیں درج کرایا؟"

"اخبار میں اس کا خبر بھی چھپا۔ لیکن نہ پولیس نے اس کے خلاف کارروائی کیا نہ سرکاری افسروں نے۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ ام کو وہ جگہ چھوڑنا پڑا۔" نواز گل نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ام ایسا مایوس ہوا کہ کراچی چھوڑ دیا۔ پر وطن واپس نہیں گیا۔ ادھر آگیا۔"

"یہاں تو تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔

"کیا ٹھیک ٹھاک ہے۔" نواز گل نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "کام بہت زیادہ ہے۔ رات کو ڈیوٹی دو۔ دن میں بھی کام کرو۔ اور پگار بہت کم۔ تم کو تو پیشگی ملتا ہے۔ ام کو تو وہ بھی نہیں ملتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "گھر خرچہ بھیجنا ہے۔ زنانی بیمار ہے۔ بچہ بھی بیمار ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہاں سے ان کو خرچہ مرچہ بھیجا جائے۔"

"تجھے گھر بھیجنے کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہے؟" لالی نے دریافت کیا۔

"پچاس روپے تو کم سے کم بھیجے ہی جائیں۔" نواز گل نے بتایا۔ مگر ساتھ ہی حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ "لیکن تم نے یہ بات کیوں پوچھا؟"

"نواز گل' تو میرا یار ہے۔ میرا بھائی ہے۔" لالی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے پیشگی ملی ہے۔ میں تیری مدد کروں گا۔" اس نے دھوتی کے ڈب سے سو روپے نکالے اور نواز گل کی جانب بڑھا دیئے۔ "پچاس نہیں سو روپے گھر بھیج دے۔"

"لیکن میں تمارا یہ روپی کیسے ادا کروں گا؟" نواز گل نے روپے لیتے ہوئے کہا۔

"تو اس کی فکر کیوں کر رہا ہے؟ میں تجھ سے روپے کب واپس مانگ رہا ہوں۔" لالی نے چہرہ افسردہ بناتے ہوئے کہا۔ "میرا پتر بھی سخت بیمار ہے۔ وہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ اس کے لیے میں ہر دم پریشان رہتا ہوں۔" اس نے آواز میں رقت پیدا کی اور منہ بسور کر گویا ہوا۔ "لالہ' اگر وہ مرگیا تو سمجھ نہیں آتی میرا کیا ہو گا؟ تو بھی اپنے پتر کا پیو ہے۔ تو میرے درد کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔"

"پریشان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا۔" نواز گل اسے تسلی دینے لگا۔ "ام اس کے لیے نماز پڑھنے کے بعد دعا کرے گا۔"

"لالہ' میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" لالی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "پر میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟"

"تم تو اس کے پاس نہیں جا سکتا۔" نواز گل نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تم کو تو بھٹے سے باہر جانے کا بالکل اجازت نہیں۔"

"جا تو سکتا ہوں۔ بس تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے۔" لالی نے اس کی صاف گوئی کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔

"تم امارا کیا مدد چاہتا ہے؟" نواز گل نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"لالہ' بندہ بندے کے کام آتا ہے۔ دنیا میں ایک دوسرے کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔" لالی نے اس دفعہ کھل کر بات کی۔ "کل رات تم اپنی ڈیوٹی کھیتوں کی طرف لگوالو۔"

"امارا تو کل ویسے ہی ادھر کا ڈیوٹی ہے۔ لیکن تم کو اس سے کیا لینا؟" نواز گل بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

"میں ایک بار کماد کی فصل میں داخل ہو گیا تو سمجھ لو کام بن گیا۔" لالی نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

"اور جو کسی نے تم کو ادھر دیکھ لیا۔ دوسرے پہریدار بھی ہیں۔ رات بھر رونڈ پر رہتے ہیں۔" نواز گل نے لالی کو خطرے سے خبردار کیا۔ "تب کیا ہوگا؟"

"تو مجھے سخت ڈانٹ پلاتا۔ گالاں بھی نکالتا۔ ایک آدھ چھتر بھی لگا دیتا۔" لالی نے اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کی۔ "پرواہ نہ کر۔ میں گالاں چپ کر کے سن لوں گا۔ مار بھی کھالوں گا۔" لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "پر میں تو ایسے وکھت آوں گا جب بالکل سناٹا ہوگا۔ آج کل اندھیرا بھی بہت ہوتا ہے۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔"

"بہت مشکل ہے۔ تم فرار ہو گیا تو جمعدار گرم ہوگا۔" نواز گل نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "بھٹہ مالک ام کو نوکری سے نکال دے گا۔"

"بھٹہ مالک یا جمعدار کو پتہ ہی کیسے چلے گا میں کدھر سے گیا۔" لالی نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو اکیلا تو نہیں۔ دوسرے پہریدار بھی تو ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ ذمہ داری تو سب ہی کی ہوتی ہے۔ وہ کس کس کو نوکری سے نکالے گا۔"

لالی نے بات دل لگتی کہی تھی۔ نواز گل کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لالی نے مالی اعانت کے طور پر اسے سو روپے رشوت بھی دی تھی۔ اصرار کر کے بڑے خلوص سے چائے پلائی تھی۔ پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کے دکھ درد کی روداد سنی تھی۔ ہر طرح سے دل جوئی کی تھی۔ نواز گل کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔

لالی نے اسے خاموش پایا تو ایک بار پھر خوشامد درآمد سے کام لیا۔ "لالہ، تیری بہت مہربانی ہو گی۔ میں اپنے پتر سے مل لوں گا۔ زندگی بھر تجھے دعائیں دوں گا۔" اس نے بڑے جذباتی انداز میں نواز گل کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔

لالی نے ایسے رقت انگیز لہجے میں بات کی کہ نواز گل پسیج گیا۔ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے گویا ہوا۔ "تم اپنے بیمار بچے کے پاس ضرور جائے گا۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر وعدہ کیا۔ "ام تمارا مدد کرے گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کل رات ام ادھر تمارا انتظار کرے گا۔"

نواز گل چلا گیا۔ لالی نے جلدی جلدی روٹی پکائی۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نواز گل کے وعدے کے باوجود اسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔

☆

رات آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی۔ جھونپڑیوں اور جھگیوں میں گہری خاموشی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ یکایک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی ہولے ہولے اس کا

کندھا جھنجوڑ رہا ہے۔ لالی گہری نیند میں تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا دھندلی روشنی میں نواز گل اس کے سرہانے کھڑا ہے۔

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نواز گل تم!" وہ سخت حیران و پریشان تھا۔

نواز گل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر تاکید کی۔ "شی' آہستہ بولو۔" اس نے جھک کر سرگوشی کی۔ "جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور امارے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ سراسیمگی میں بھی مبتلا تھا۔

"کل کی بجائے تم آج ہی رات کو نکل جاؤ۔"

لالی چارپائی سے نیچے اترا۔ نواز گل کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "آج کیوں؟"

"جمعدار کل شام کو واپس آجائے گا۔ اس کے آنے کے بعد تم بھٹے سے باہر نہیں جا سکے گا۔ وہ خنزیر بہت ہوشیار ہے۔" نواز گل نے لالی کو بتایا۔ "جمعدار کے کل شام واپس آنے کا اطلاع ام کو ایک کرندے نے دیا۔ اسے منشی نے بتایا تھا۔"

"مگر لالہ آج رات تو کھیتوں کی طرف دوسرے پہریدار کی ڈیوٹی ہو گی۔" لالی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "وہ مجھے کیسے جانے دے گا؟"

"تم اس کا فکر نہ کرو۔ سب پہریداروں کو سردی لگتا ہے۔ ادھر چمنی کے پاس آگ سے بدن کو گرم کرتا ہے۔" نواز گل نے وضاحت کی۔ "وہاں بیٹھ کر چائے پیتا ہے۔ کھیتوں کی طرف اب کوئی ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ سمجھ گیا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے مسکرا کر گردن ہلائی۔ "تب تو اپنا کام بن جائے گا۔"

نواز گل نے جیب سے سو روپے نکالے اور لالی کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "لو' اپنا یہ روپی رکھ لو۔ تمارا بچہ بیمار ہے۔ جا کر اس کا علاج ملاج کراؤ۔ تم کو ادھر روپی کا ضرورت ہو گا۔"

لالی نے روپے واپس نہ لیے۔ کہنے لگا۔ "یار' تیرا پتر بھی تو بیمار ہے۔ تیری گھر والی کو اس کے علاج کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ یہ روپے تو اسے بھیج دے۔ میری فکر نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔"

"نہیں' یہ روپی ام نہیں لے گا۔ ام نے ایک بار تم کو بول دیا۔ اپنا روپی اپنے پاس رکھو۔" نواز گل نے اس بار سختی سے کہا۔ "باتیں کم کرو۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔ ورنہ تم اپنے بیمار بچے کے پاس نہیں جا سکے گا۔"

نواز گل آگے بڑھا۔ لالی نے خاموشی سے روپے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے اور نواز گل کے

پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں جھونپڑی سے باہر نکلے۔

بھٹے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر طرف کہر کا نیل گوں دھندلکا پھیلا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے گڑھوں اور ادھر ادھر بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے بچتے بچاتے آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ بھٹے کی چمنی دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ اس کے نیچے جلتی ہوئی لکڑیوں کا الاؤ روشن تھا۔ چمنی کے کھلے ہوئے در سے گہری سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس روشنی میں بھٹے پر کام کرنے والے مزدور اور دوسرے لوگ پرچھائیوں کی مانند ادھر ادھر گردش کر رہے تھے۔

سردی اب اور بڑھ گئی تھی۔ لالی کا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ وہ بغلوں میں دونوں ہاتھ دبائے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ نواز گل اس سے چند قدم آگے تھا۔ لالی کی نظریں برابر اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جدھر مڑتا لالی بھی اسی طرف مڑ جاتا۔ چلتے چلتے اس نے کئی بار اندھیرے میں ٹھوکر بھی کھائی مگر سنبھل جاتا۔ ایک بار ایسی ٹھوکر لگی کہ لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا۔ گھٹنے پر خاصی کراری چوٹ آئی۔ لیکن نواز گل کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا گھٹنے کے درد کی پرواہ کیے بغیر جلدی سے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

دونوں چلتے چلتے ایک موڑ سے نکلے تو سامنے کماد کے کھیت تھے۔ نواز گل مٹی کی دیوار سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ لالی اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ چمنی کے نیچے پھیلی ہوئی سرخ سرخ روشنی میں ایک پہریدار نظر آیا جو اسی سمت آرہا تھا۔ نواز گل نے اسے دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"واپس جاؤ' واپس جاؤ۔ پہریدار آتا ہے۔"

مگر لالی منع کرنے کے باوجود نہ رکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی جانب بڑھا۔ نواز گل نے اس بار ڈپٹ کر کہا۔ "تم نے امارا بات نہیں سنا؟ فوراً واپس جاؤ۔"

پہریدار اب سامنے آگیا تھا۔ لالی بدستور خاموش رہا۔ آگے بڑھا اور دیوار کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ نواز گل نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "ٹھیرو۔ تم کیدر جاتا ہے؟" وہ جھنجلایا ہوا اس کی طرف جھپٹا۔

لالی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اچھلا اور دیوار کی بلندی پر دونوں ہاتھ رکھ کر زقند بھری اور گنّے کے اونچے اونچے پودوں کے درمیان جا کر گرا۔ اسی وقت دیوار کے پیچھے آواز ابھری۔

"کون تھا؟ کدھر چلا گیا؟"

"ام نے اسے روکا۔ مگر وہ خنزیر دیوار پھاند کر کھیتوں میں چلا گیا۔ پتہ نہیں کون تھا۔" نواز گل

تیکھے لہجے میں بتا رہا تھا۔ "اندھیرے سے نکلا اور ایک دم غائب ہو گیا۔"

لالی اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور پودوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹاتا ہوا کھیتوں کی منڈیر پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ کئی بار گنے کے پودوں سے الجھ کر ڈگمگایا۔ لمبے لمبے تیز دھار کے پتوں سے جسم پر جگہ جگہ خراشیں بھی آئیں۔ لیکن رکا نہیں۔ آگے' اور آگے بڑھتا گیا۔

کماد کے کھیتوں سے گزر کر وہ باہر نکلا تو سنسان رڑی میں کھڑا تھا۔ یہ گاؤں کے سامنے کا وسیع میدان تھا۔ اس پار مکانات تھے جو دھند میں لپٹے ہوئے دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی جو کہر کے جال میں الجھی ہوئی زرد زرد دھبوں کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔

لالی رڑی عبور کر کے بستی میں نہ گیا۔ مڑا اور ایک جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں اور خودرو پودوں کے درمیان سے گزرتا ہوا انجان راستوں پر چلتا رہا۔ رات تاریک تھی اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن کہیں ٹھہرے بغیر اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جب وہ موضع قادر بلوچ کے نزدیک پہنچا تو مشرقی افق پر اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ دھند میں الجھی ہوئی سرما کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

میلسی کی بستی پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے کوٹ ملک تھا۔ قادر بلوچ سے میلسی روڈ زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ایک راہ گیر نے اسے یہی بتایا تھا۔ وہ اسی سمت چلتا ہوا میلسی روڈ پر پہنچا تو دن نکل آیا تھا۔ کہر کا غبار چھٹنے لگا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اب چہل پہل اور آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ وہ بس میں سوار ہوا اور ملتان کے راستے جوند سنگھ والا کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف کہر کا ہلکا ہلکا نیلگوں دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر جوند سنگھ والا میں بسوں کے اڈے پر ابھی تک گہما گہمی تھی۔ لالی جیسے ہی بس سے اترا ایک گداگر اس کی جانب بڑھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال خاک دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ بے رونق اور مرجھایا ہوا تھا۔ لباس نہایت گندا اور بوسیدہ تھا۔

گداگر نے قریب پہنچ کر ہاتھ پھیلایا اور گھگیا کر صدا لگائی۔

دے جا سخیا اللہ نام!

مولا بنائے تیرے کام

لالی نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ارشاد الٰہی تھا۔ اس کی نظریں لالی کی نظروں سے دوچار ہوئیں

تو چہرے پر سراسیمگی اور گھبراہٹ چھا گئی۔ اس نے بھی لالی کو پہچان لیا تھا۔ وہ فوراً مڑا اور تیزی سے ایک جانب بڑھ کر چاہا کہ اندھیرے میں اوجھل ہو جائے۔ لالی نے جھپٹ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

"اوئے شادے' کدھر چلا۔ تو نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"تو لالی ہے ناں۔" ارشاد الٰہی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "تو یہاں کیسے آیا؟"

ارشاد الٰہی کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ لالی نے ارشاد الٰہی کو اس قدر خوف زدہ پایا تو دل لگی سوجھی۔ اسے اور دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ "جمعدار اکبر سانول نے مجھے بھیجا ہے کہ تجھے پکڑ کر بھٹے پر لے چلوں۔ تجھ سے پیشگی وصول کرنی ہے۔"

"ایسا نہ کرنا۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر گڑگڑانے لگا۔ "مجھ سے اب بھٹے پر کام نہیں ہو سکتا۔ بہت بیمار ہوں۔ کام کروں گا تو مر جاؤں گا۔"

"تو ادھر عیش کرتا رہے اور میں ادھر تیری پیشگی ادا کروں۔ تو یہ چاہتا ہے۔" لالی نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ "دھوکے باز' مجھ سے واپس آنے کا پکا وعدہ کر کے آیا تھا اور ادھر آکر چھپ گیا۔ تجھے بھٹے پر لے جا کر جمعدار کے سامنے پیش کروں گا۔"

ارشاد الٰہی اس قدر بدحواس ہو گیا کہ لالی کے پیر پکڑ لئے۔ "مجھے بھٹے پر نہ لے جا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے معافی دے دے۔"

"اٹھ کر کھڑا ہو۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

ارشاد الٰہی اٹھا اور ہاتھ جوڑے ہوئے لالی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یہ بتا تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔ "میں نے تو تیری مدد کرنی چاہی تھی اور تو میری گردن پھنسوا کر صاف نکل گیا۔ تو نے میری نیکی کا یہ صلہ دیا۔"

"تجھے پتہ ہے' میں پہلے ہی سخت بیمار تھا۔ ماں کے پاس ملتان پہنچا تو میری حالت ایسی تھی کہ یوں لگتا تھا دو چار روز میں مر جاؤں گا۔ مجھ سے بولا تک نہ جاتا تھا۔ بستر پر پڑا پڑا کھانستا تھا اور خون تھوکتا تھا۔" ارشاد الٰہی رقت انگیز لہجے میں صفائی پیش کرنے لگا۔ "ماں مجھے سرکاری اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر نے علاج کے لیے انجکشن بتائے۔ پر ایسے انجکشن اسپتال سے نہیں ملتے تھے۔ ماں بھیک مانگ کر پیسے اکٹھے کرتی تھی اور میرے لیے انجکشن خرید کر بازار سے لاتی تھی۔ دو مہینے تک اسپتال میں پڑا رہا اور انجکشن لگواتا رہا۔ پوری طرح چنگا بھی نہ ہوا تھا کہ اسپتال سے چھٹی کر دی گئی۔ ماں مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ تب تک میں چل بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اب تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔" لالی نے غور سے دیکھا۔

"بعد میں بھی انجکشن لگتے رہے۔" ارشاد الٰہی نے بتایا۔ "ان سے میں چنگا ہو گیا تو ماں مجھے ادھر لے آئی۔ میں بھی اس کے ساتھ بھیک مانگنے لگا۔ یہاں بس سٹاپ پر چنگی بھیک مل جاتی ہے۔"

دونوں بس اسٹاپ سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ارشاد الٰہی ابھی تک سہما ہوا تھا اور گڑگڑا کر صفائی پیش کر رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر پوچھا۔

"تو مجھے بھٹے پر کام کرنے تو نہیں لے جائے گا۔"

"میں تجھے کیسے بھٹے پر لے جاؤں گا؟ میں تو خود ادھر سے بھاگ کر تیرے پاس آیا ہوں۔" لالی نے اس کا خوف رفع کرنے کی غرض سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "پر شادے' تو ہے بہت ڈرپوک۔"

"تو نے مجھے ڈرا ہی اتنا دیا تھا۔" ارشاد الٰہی اب سنبھل چکا تھا۔ "پچھلے دنوں جمعدار ادھر آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ میں سمجھا اس نے تجھے ادھر بھیجا ہے۔ فیر تو نے باتیں بھی ایسی کیں کہ ڈر نہ جاتا تو کیا کرتا۔ سچ کہتا ہوں' بھٹے کے بارے میں سوچتے ہی جان نکل جاتی ہے۔ تجھے پتہ ہے کتنی خراب جگہ ہے۔ وہاں کام کرنے سے تو بھیک مانگنی ٹھیک ہے۔ بیگی تو گلے نہیں پڑتی۔"

"یہ بتا' تو کوٹلہ ہرکشن بھی گیا کہ نہیں؟" لالی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"ایک بار گیا تھا؟"

"ماں کو بھی ساتھ لے گیا تھا؟"

"نہیں' وہ نہیں گئی۔ وہ تو مجھے بھی وہاں جانے نہیں دے رہی تھی۔"

"کوٹلہ ہرکشن جا کر تو نے کیا کیا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"وہاں جا کر کرتا کیا تھا۔ وہ تو جی بہت وڈی زمیں داری ہے۔ حویلی اتنی شاندار ہے کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔" ارشاد الٰہی نے بتایا۔ "پر میرے پیو کی اتنی زمیں داری کہاں تھی۔ پورے دس مربع بھی نہیں تھی۔ گھر بھی معمولی تھا۔ تھا تو پکی اینٹوں کا بنا ہوا مگر بہت چھوٹا تھا۔ اتنی وڈی زمین داری اور ایسی شاندار حویلی اسے کیسے الاٹ ہو سکتی تھی۔ تجھے دھوکا ہوا۔"

"مجھے یہ تو پتہ نہیں تیرے پیو کی کتنی زمیں داری اور کتنی جائیداد تھی' پر مجھے یہ پتہ ہے کہ کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری اور حویلی رحیم داد نے تیرے پیو کے نام سے الاٹ کرا رکھی تھی۔" لالی نے

وضاحت کی۔ قدرے تامل کے بعد دریافت کیا۔ "تو نے کچھ پوچھ تاچھ بھی کی؟ یہ نہیں بتایا وہاں جا کر تو نے کیا کیا؟"

"کوٹلہ ہر کشن میں داخل ہوتے ہی میں حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ وہاں کئی نوکر موجود تھے۔ ایک سے میں نے پوچھ تاچھ کرنی چاہی۔ اتنے میں ایک شاندار کار آکر بالکل میرے سامنے رکی۔ سارے نوکر اس کی طرف دوڑے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اندر سے ایک بندہ بہت شان سے نکلا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ۔ قمیص پر سونے کے چمکتے ہوئے بٹن۔ ہاتھ پر سونے کی گھڑی۔" ارشاد الٰہی سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "اس نے میری طرف دیکھا۔ گردن ٹیڑھی کر کے پوچھا۔ کون ہے تو؟ میں نے اپنے بارے میں بتانا چاہا' پر میرے بولنے سے پہلے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔"

"اور تو نے چپ کر کے لے بھی لیا۔" لالی نے جل کر کہا۔

"لے نہ لیتا تو کیا کرتا؟"

"تجھے پتہ تھا اس نے بھکاری سمجھ کر تجھے بھیک دی تھی؟" لالی کا لہجہ بدستور تلخ اور تیکھا تھا۔

"بالکل پتہ تھا۔" ارشاد الٰہی نے سادگی سے جواب دیا۔ "اتنی بھیک تو مجھے آج تک کسی نے نہیں دی۔ پیسہ دو پیسہ ملتی ہے۔ بہت ہوا تو آنہ دو آنہ۔"

"حد کر دی تو نے۔" لالی نے جھنجلا کر اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔ "تو بھکاری کا بھکاری ہی رہا۔" اس نے منہ بگاڑ کر حقارت سے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ "نوٹ اس کے منہ پر مارا ہوتا۔ اسے بتاتا تو کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟"

"اس نے مجھ سے کوئی گل بات ہی نہیں کی۔ نہ میری طرف مڑ کر دیکھا نہ کسی اور کی طرف۔ گردن اٹھائے حویلی کے اندر چلا گیا۔" ارشاد الٰہی نے وضاحت کے ساتھ ساتھ قیاس آرائی بھی کی۔ "اس کی شان اور ٹوہر دیکھ کر تو مجھے ایسا لگا وہی ادھر کا زمیں دار ہے۔" اس نے گردن کو خم دے کر لالی سے دریافت کیا۔ "تو تو کہتا تھا کوٹلہ ہر کشن کا زمین دار مر گیا۔"

"پتہ نہیں وہ کون تھا۔" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نے تو یہی سنا ہے کہ ادھر کا زمین دار رحیم داد تھا جو کئی مہینے پہلے مر گیا۔ وہ خود کو چوہدری نور الٰہی بتاتا تھا۔"

"میں نے کہا ناں۔ تجھے دھوکا ہوا۔" ارشاد الٰہی نے زور دے کر کہا۔ "کسی نے تجھے غلط بتایا۔"

"مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے وہ مر چکا ہے۔" لالی نے اس دفعہ بھی کھل کر بات نہیں کی۔ وہ اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جب رحیم داد کا قتل ہوا تو اس وقت وہ حویلی میں موجود تھا۔ اس نے ارشاد الٰہی

کو غور سے دیکھا اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”تو اسی حلئے میں کوٹلہ ہرکشن گیا تھا؟ میں نے تجھے کہا تھا نئے کپڑے پہن کر شان سے جانا۔ اس کے لیے تجھے روپے بھی دیے تھے۔“

”وہ سارے ہی روپے ملتان پہنچتے ہی دوا علاج پر خرچ ہو گئے تھے۔“ ارشاد الٰہی نے وضاحت کی۔ ”نئے کپڑے لتے کیسے بنواتا؟“

”تب تو جس نے بھی تجھے بھکاری سمجھا ٹھیک ہی سمجھا۔ تو تو دیکھنے ہی میں بھک منگا لگتا ہے۔“ لالی نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا‘ پوچھا۔ ”تیری ماں کدھر ہے؟“

”ادھر جھگی میں ہے۔“ ارشاد الٰہی نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

”مجھے اس کے پاس لے چل۔“

ارشاد الٰہی آگے بڑھا۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ جھگی قریب ہی تھی جسے درختوں کی شاخوں‘ ٹین کے پرانے ٹکڑوں‘ لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے تختوں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے تیار کیا گیا تھا۔ جھگی کے ارد گرد سوکھی جھاڑیوں کی اونچی باڑھ تھی۔

لالی نے جھگی کے اندر داخل ہو کر دیکھا ایک ادھیڑ عورت چولہے کے سامنے بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اس کے بے رونق چہرے پر غربت اور افلاس کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا آدھے سے بھی زیادہ سر سفید تھا۔ لباس میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی تھی۔

ارشاد الٰہی نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”اماں‘ یہ لالی ہے۔ اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

کلثوم بی بی نے لالی کو اس طرح گھگیا کر دعائیں دینا شروع کر دیں جیسے خیرات مانگ رہی ہو۔ لالی نے مسکرا کر فوراً اسے ٹوکا۔ ”بے بے‘ تو اب اس طرح دعائیں شعائیں دینا چھوڑ دے۔ زمین دارنی کی شان پیدا کر۔ تو تھوڑے ہی دنوں میں وڈی زمین دارنی بن نے والی ہے۔“

”مخول نہ کر۔ میں نوں سب پتہ ہے۔“ کلثوم بی بی نے بے زاری کا اظہار کیا اور ارشاد الٰہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”جب تو نے اسے بھٹے سے چھٹی دلا کر میرے پاس بھیجا تھا تب یہ بھی ایسی ہی وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ اپنے نصیب میں تو بھیک مانگنی ہی لکھی ہے۔“

”بے بے‘ ایسے نہ سوچ۔“ لالی نے بات کو طول دینے کی کوشش نہ کی۔ ”تجھ سے آرام سے گل بات ہوگی۔ پہلے تو مجھے روٹی کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔“

لالی فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ارشاد الٰہی بھی‘ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی ماں نے کھانا تیار کیا۔ دال روٹی تھی جسے اس نے المونیم کی میلی میلی رکابیوں میں نکالا۔ وہ دونوں ہاتھ

گھٹنوں پر رکھ کر اٹھی۔ تکلیف سے منہ بگاڑا۔ تیکھے لہجے میں ارشاد الٰہی کو مخاطب کیا۔ "شادے، مجھ سے اب روٹی نہیں پکنے کی۔ کمر میں سخت درد ہوتا ہے۔ تو رات کو بھی بازار سے روٹی لے آیا کر۔" وہ دائیں طرف ذرا سا جھک کر لنگڑاتی ہوئی چلی اور کھانا لالی اور ارشاد الٰہی کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ خود چولہے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگی۔

لالی نے کھانا کھاتے ہوئے ارشاد الٰہی سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "جمعدار اکبر سانول مجھے تلاش کرتا ہوا ادھر بھی آئے گا۔ شاید کل ہی آجائے۔ اسے پتہ ہے تو ادھر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے ساتھ تجھے بھی پکڑ کر بھٹے پر لے جائے۔" اس نے ارشاد الٰہی کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی اور وہ خوف زدہ ہو بھی گیا۔ اس کی ماں کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔

"تب تو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔" اس نے تجویز پیش کی۔ "ملتان واپس چلتے ہیں۔"

"ملتان تو میلسی سے نزدیک ہے۔ ادھر تو اور بھی زیادہ خطرہ ہے۔" لالی نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ مگر مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہاں سے جایا کہاں جائے۔ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا تو تھا نہیں۔ لے دے کے ایک غنی چٹّا کا گھر تھا۔ مگر وہ اس کے پاس جانا نہ چاہتا تھا۔ معاً اسے شادو یاد آگیا۔ وہ اس کا پرانا دوست تھا۔ بہت مخلص تھا اور اس کی مدد کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ شادو کا خیال آتے ہی اس نے فوراً کہا۔ "لائل پور چلتے ہیں۔ ادھر میرا پرانا یار شادو ہوتا ہے۔ اس کے پاس ہم آرام سے ٹھیر سکتے ہیں۔ لائل پور دور بھی ہے۔ جمعدار کے ادھر پہنچنے کا کم خطرہ ہے۔ سویرے ہی سویرے یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے لالی کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تینوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ لالی بتاتا رہا کہ آئندہ انھیں کیا کرنا ہو گا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے پہلے پہل تو لالی کی باتوں کو اہمیت نہ دی۔ طرح طرح کے سوالات کرتے۔ اپنے خدشات اور شک و شبے کا اظہار کرتے۔ مگر لالی نے سمجھا بجھا کر آمادہ کر لیا کہ جیسا وہ کہے گا دونوں اس پر عمل کریں گے۔

لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کلثوم بی بی بھی جھگی کے ایک گوشے میں سو گئے۔

صبح تینوں اٹھ کر بس میں سوار ہوئے۔ خانے وال پہنچے۔ اسٹیشن جا کر لائل پور کے ٹکٹ خریدے۔ ٹرین آئی تو تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ لالی لائل پور پہنچا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں، دونوں ہم راہ تھے۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے تینوں شادو کے گھر پر پہنچے۔ مگر گھر کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ سخت کوفت ہوئی۔ سردی کے ساتھ سناٹا بھی بڑھ گیا تھا۔ پاس پڑوس کے دروازے بند تھے۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ لالی حیران و پریشان کھڑا سوچتا رہا۔ کہاں جائے کس کے پاس جائے؟ شادو کے علاوہ شہر میں کوئی شناسا بھی نہ تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ رات اسٹیشن کے مسافر خانے میں بسر کی جائے۔

سردی میں زیادہ دیر ٹھہرنا ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ارشاد الٰہی کی ماں کا برا حال تھا۔ بوڑھی تھی اور جسم پر لباس بھی پھٹا پرانا تھا۔ وہ سردی سے سکڑی سکڑائی ایک کونے میں دبکی ہوئی کھڑی تھی۔ بادل نخواستہ تینوں واپس ہوئے۔ مگر گلی کے نکڑ پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے شادو آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی لالی کی جان میں جان آئی۔ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

"اوئے لالی تو اتنی رات کو کہاں سے آ ٹپکا؟" شادو نے آگے بڑھ کر لالی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو ہمیشہ ایسے ہی اچانک ملتا ہے۔ کہاں رہا اب تک؟"

"پہلے گھر کا دروازہ کھول۔ اندر بیٹھ کر آرام سے گل بات ہو گی۔" لالی نے سردی سے تھرتھراتے ہوئے کہا۔ "تو نہ ملتا تو پتہ نہیں اپنا کیا بنتا۔ رات گزارنے سٹیشن جا رہا تھا۔"

شادو نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ تینوں کو گھر کے ایک کمرے میں پہنچایا۔ چارپائیوں پر جھپاک جھپاک بستر لگائے۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو گرم گرم بستر ملے تو ان کے ہوش بجا ہوئے۔

شادو نے لالی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر لے گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "تو ان دونوں کو کہاں سے پکڑ لایا۔؟ کوئی نیا چکر چلایا ہے؟ یہ تو دیکھنے ہی میں بھک منگے لگتے ہیں۔"

"ایسا نہ کہہ۔ گورداسپور کے مہاجر ہیں۔ بہت پریشان ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے اپنے خاندان سے بچھڑ گئے۔ نہ جانے کب سے انھیں تلاش کر رہے ہیں۔" لالی نے کھل کر بات نہ کی۔ "میں ان کے خاندان والوں کو جانتا ہوں۔ دونوں کو ان سے ملانے لے جاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "یار زندگی بھر چوری ڈکیتی کی۔ کبھی کبھی نیک کام بھی کر لینا چاہیے۔" اس نے بات کا رخ فوراً موڑ دیا۔ "یہ بتا بھابی کہاں ہے؟"

"وہ اپنی چھوٹی بہن کے ویاہ میں شریک ہونے جہلم گئی ہے۔"

"کب تک ادھر رہے گی؟"

"ہفتے بھر سے پہلے تو اس کے واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں۔" شادو نے لالی کو بتایا۔ "پر تجھے اس کے واپس آنے کی فکر کیوں ہے؟ جب تک چاہے ٹھیر۔ تو پہلی دفعہ تو اس گھر میں آیا نہیں۔"

"مجھے زیادہ دن ادھر نہیں ٹھیرنا۔ اس کی واپسی سے پہلے ہی چلا جاؤں گا۔" لالی نے وضاحت کی ساتھ ہی دریافت کیا۔ "تو آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"میاں سبحان ہی کے پاس ہوں۔ ڈرائیوری کر رہا ہوں۔" شادو نے بتایا۔ "اسی کے ایک کام سے آیا تھا۔ کل چلا جاؤں گا۔"

"جانے سے پہلے ایک کام کرتا جا۔ مجھے اپنے لیے اور ان دونوں کے لیے کپڑے لتے سلوانے ہیں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں جب یہ اپنے گھر والوں کے پاس جائیں تو ٹھیک ٹھاک ہو کر جائیں۔"

"تیرا یہ کام کر کے ہی جاؤں گا۔" شادو نے لالی سے اتفاق رائے کیا۔ "تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ سچ کہتا ہوں ان کپڑوں میں تو یہ بے چارے بالکل بھکاری لگتے ہیں۔ ان کی مدد کر کے تو نے بہت چنگا کام کیا۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہ ہوئی۔ وہ کمرے میں گئے۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں لحافوں میں دبکے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔ شادو اور لالی بھی سونے کے لیے برابر کے کمرے میں چلے گئے۔

صبح اٹھ کر شادو پوریاں اور چھولے لایا۔ تینوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ میاں سبحان کی لمبی چوڑی پیکارڈ اس کے پاس تھی۔ دن چڑھے تینوں کو اس میں بٹھا کر بازار لے گیا۔ لالی تو سب کے لیے ایک ایک جوڑا سلوانا چاہتا تھا لیکن شادو کے مشورے پر دو، دو جوڑے سلوانے پر تیار ہو گیا۔ جو کپڑا انھوں نے پسند کیا شادو نے خریدا۔ لالی نے اصرار بھی کیا۔ مگر شادو نے اس کی ایک نہ سنی۔ قیمت اپنی جیب سے ادا کی اور درزی کو سلنے کے لیے کپڑا دے دیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کپڑے جلد سے جلد تیار کر دے۔

دوپہر کو شادو چلا گیا اور یہ وعدہ کیا کہ چند ہی روز میں واپس آکر ان کی خیر خیریت معلوم کرے گا۔

چوتھے روز کپڑے تیار ہو گئے۔ لالی درزی کے پاس گیا۔ سلائی ادا کر کے کپڑے لے آیا۔ تینوں نے اس روز گرم پانی سے غسل کیا۔ نئے لباس پہنے۔ مگر باہر نہ گئے۔ ان کا بیشتر وقت گھر ہی میں گزرتا۔ کبھی بازار بھی جاتے تو چوکنا رہتے۔ ہر دم جمعدار اکبر سانول کا خوف دامن گیر رہتا۔

دو روز بعد شادو بھی آ گیا۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "آگے تیرا کیا پروگرام ہے؟"

"تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔" لالی نے بتایا۔ "یہاں سے ان دونوں کے ساتھ لہور جاؤں گا۔ وہاں

ایک روز ٹھیر کر دیپال پور چلا جاؤں گا۔"

"لہور میں تو ٹھیرے گا کہاں؟" شادو نے دریافت کیا۔

"غنی چِنّا کے پاس ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔" لالی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ "سچ پوچھ تو میں اس کے پاس ٹھیرنا نہیں چاہتا۔ تجھے پتہ ہے' وہ چوری ڈکیتی کرتا ہے۔ اور میں نے یہ دھندا بالکل چھوڑ دیا۔"

"یہ تو نے ٹھیک سوچا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔" شادو نے خوش نودی کا اظہار کیا۔ "میں چنے کو کبھی نہیں ملا۔ صرف اتنا سنا ہے کہ کئی بار کا سزا یافتہ ہے۔ اس کے پاس تیرا ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ پولیس تجھے بھی مشتبہ نظروں سے دیکھے گی۔" اس نے تجویز پیش کی۔ "اگر تو کل لہور چلنا چاہے تو میرے ساتھ چل۔ میں لہور ہی جا رہا ہوں۔ ادھر میاں سبحان کی کوٹھی ہے۔ انیکسی میں جب تک چاہے ٹھیر سکتا ہے۔ ویسے کوٹھی بھی بالکل خالی ہے۔ میاں سبحان پرسوں رحیم یار خان جا رہا ہے۔ ادھر اس کی شکار گاہ ہے۔ باہر سے مہمان آئے ہیں۔ میاں سبحان ان کے ساتھ شکار کھیلے گا۔"

لالی نے اس کی تجویز بلا عذر مان لی۔ دوسرے روز ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کے ہم راہ میاں سبحان کی چمکتی دمکتی پیکارڈ میں بیٹھ کر لالی لاہور چلا گیا۔ شادو نے حسب وعدہ تینوں کے قیام کا بندوبست میاں سبحان کی کوٹھی کی انیکسی میں کرا دیا۔ شادو رخصت ہوتے وقت حسب معمول لالی سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ اس کی پیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے بولا۔ "دیپال پور سے واپسی پر بھی ادھر ہی ٹھیر جانا۔ میں کوٹھی کے نوکروں کو بول دوں گا۔ فکر نہ کر' تو ادھر آرام سے رہ سکتا ہے۔ میں بھی ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔"

شادو چلا گیا۔

تینوں نے رات انیکسی میں بسر کی۔ صبح ہوئی۔ دن چڑھے لالی نے ارشاد الٰہی کو اپنے ہم راہ لیا۔ انار کلی گیا۔ بازار سے اپنے اور ارشاد الٰہی کے لیے طلے دار کھسّے خریدے۔ عمدہ ململ کی پگڑیاں اور ان کے ساتھ کامدار سنہرے کلاہ بھی لیے۔ دو اونی لوئیاں بھی خریدیں۔ کلثوم بی بی کے لیے ایسی قیمتی جوتی خریدی جو بڑے گھرانوں کی زمیں داریناں اور چوہدرانیاں پہنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے لیے سفید کشمیری شال بھی لی جس پر سنہری کلابتو سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔

بازار سے واپسی کے بعد تینوں نے نہا دھو کر نئے لباس پہنے۔ میلے کپڑے دھلنے کے لیے ایک ملازم کے سپرد کیے۔ کوٹھی سے نکل کر اسٹیشن گئے۔ ریل گاڑی میں سوار ہر کر منٹگمری پہنچے اور وہاں

سے بس میں بیٹھ کر پاک پتن کے راستے کوٹلہ ہر کشن روانہ ہو گئے۔ بی رحمان کے اڈے پر بس سے اترے اور تانگے میں بیٹھ کر کوٹلہ ہر کشن پہنچ گئے۔

☆

سرما کی شام ختم ہو رہی تھی۔ مگر کہر میں لپٹا ہوا کوٹلہ ہر کشن جاگ رہا تھا۔ گھروں میں چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ چراغوں کی دھندلی دھندلی روشنی کہیں کہیں ٹمٹما رہی تھی۔ تانگا حویلی کے سامنے جا کر ٹھہرا۔ لالی تانگے سے اترا۔ ارشاد الٰہی بھی اپنی ماں کے ساتھ نیچے اترا۔ لالی نے تانگے والے کو کرایہ دیا۔ تانگا مڑا اور بی رحمان کی جانب واپس روانہ ہوا۔

نادر خان حویلی کے بڑے دروازے ہی پر مل گیا۔ اس نے تینوں کو حیرت سے دیکھا۔ ان کے لباس اور وضع قطع سے خاصا مرعوب بھی ہوا۔ خندہ پیشانی سے آنے کا سبب دریافت کیا۔

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اندر چل کر آرام سے بات ہو گی۔"

نادر خان نے مزید پوچھ گچھ کرنے سے گریز کیا۔ خاموشی سے انھیں حویلی کے اندر لے گیا۔ بڑے کمرے میں گیا۔ تینوں کو صوفوں پر بٹھایا۔ کمرے کی آرائش سے جاگیردارانہ شان و شوکت جھلکتی تھی۔ کلثوم بی بی نے گھبرا کر اپنی شال کے پلو سے بکل مارا اور منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ ارشاد الٰہی بھی گم صم تھا۔

لالی چونکہ پہلے بھی آ چکا تھا لہٰذا وہ زیادہ اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

نادر خان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اپنے بارے میں بتایا۔ "میں جی یہاں کا منیجر ہوں۔ میرا نام نادر خان ہے۔"

لالی نے اپنے متعلق کچھ کہنے سے اجتناب کیا۔ ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یہ جی چوہدری نور الٰہی کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی ہے۔" اس نے مڑ کر کلثوم بی بی کی طرف دیکھا۔ "اور یہ اس کی گھروالی ہے۔"

نادر خان نے حیران و پریشان ہو کر دونوں کو دیکھا۔ چند لمحے دم بخود بیٹھا رہا۔ مگر جہاں دیدہ اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "چوہدری بھی اکثر ان کا ذکر کرتا تھا۔ برسوں ان کو جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا۔"

"ضرور ڈھونڈتا ہو گا۔ یہ بھی اسے برسوں سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے ایسے بچھڑے کہ اب تک نہ مل سکے۔" لالی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ارشاد الٰہی تو ان دنوں چھوٹا ہو گا۔ اسے تو زیادہ یاد نہ ہو گا۔"

"چھوٹا تو ضرور تھا۔ پر مجھے بھی سب پتہ ہے۔" ارشاد الٰہی نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ ماں نے بھی اس کی تائید کی۔ "اسے پتہ تو ہونا چاہیے' جب ہم نے نصیر پور چھوڑا تو یہ لگ بھگ دس برس کا رہا ہوگا۔"

"بے جی۔" لالی نے ارشاد الٰہی کی ماں کو نادر خان کے سامنے احترام سے مخاطب کیا۔ "پر جتنا تجھے پتہ ہوگا اسے اتنا کہاں معلوم ہوگا۔" اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "تو نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔"

"ہن جی کیوں نہیں دیکھا۔" اس نے آہ سرد کھینچی۔ "کیا بتاؤں' کیسے بتاؤں۔ ہم پر کیا کیا گزری۔ اب تو سب کچھ ڈراؤنا سفنہ لگتا ہے۔" اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے پھیل گئے۔ "نصیر پور میں شان سے رہتے تھے۔ ادھر اپنی بہت وڈی زمیں داری ہوتی تھی۔ کیا نہیں تھا ہمارے پاس۔" وہ لمحہ بھر کے لیے نظریں جھکا کر سوچتی رہی' پھر گویا ہوئی۔ "میں نوں اب تک یاد ہے۔ عید سے ایک روز پہلے کی گل ہے۔ سب خوشی خوشی عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکے تھے اتنے میں سکھ بلوائیوں نے پنڈ پر حملہ کردیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "ہائے وہ کیسی ڈراؤنی کالی رات تھی۔ سب کچھ گھر میں چھوڑ چھاڑ کر ایسے نکلے کہ دوبارہ اسے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ جانے کیسے چھپتے لکتے ڈرے ڈرائے کسی نہ کسی طرح تریموں کے پتن پر پہنچے۔ نہ پوچھ ادھر کیسا کیسا ظلم ہوا۔ ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا۔" اس۔۔ بے قرار ہو کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ہائے ربا۔ تب ہی مرجاتی تو ٹھیک تھا۔"

اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نادر خان سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی گم صم تھا۔

کلثوم بی بی سسکیاں بھرتی رہی اور رک رک کر بتاتی رہی کہ تریموں کے پتن پر کس طرح بلوائی گھوڑے دوڑاتے ہوئے اچانک حملہ آور ہوئے۔ کس طرح انھوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ حملہ آوروں سے جان بچانے کے لیے کیوں کر انھوں نے قریب کے کھیتوں میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ کیسے اس کی جوان بیٹی صابرہ کو بلوائی اٹھا کر لے گئے اور بہن کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش میں اس کا پہلوٹی کا جوان بیٹا کرم الٰہی مارا گیا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ اوپر سے موسلا دھار بارش ہوتی تھی۔ دور دور تک کھیتوں کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی۔ بلوائی بالکل اچانک حملے کرتے تھے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے تھے۔ ملاح کشتیوں پر راوی کے اس پار لے جانے کا بھاری کرایہ مانگتے تھے۔ ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ اسی افراتفری میں

شوہر بھی بیوی بچوں سے بچھڑ گیا۔ پاکستان پہنچ کر بھی اس سے ملنا نصیب نہ ہوا۔

ارشاد الٰہی بھی بیچ بیچ میں لقمہ دیتا رہا۔ کبھی ماں کی تائید کرتا کبھی وضاحت کرتا۔ کوئی بات بھول جاتی تو یاد دلانے کی کوشش کرتا۔

نادر خان یہی دردناک روداد رحیم داد کی زبانی بھی سن چکا تھا۔ لیکن کلثوم بی بی نے جس قدر وضاحت سے رو رو کر اور دل گرفتہ ہو کر اسے سنایا' نادر خان اسے سن کر بہت متاثر ہوا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''چوہدرانی' تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ پر تو اب تک کہاں رہی؟ چوہدری کو تلاش کرتی ہوئی ادھر کیوں نہیں آئی؟''

کلثوم بی بی تو خاموش رہی۔ اس کے بجائے صرف ارشاد الٰہی کو بولنا تھا۔ لالی اسے اور اس کی ماں کو پچھلے چند دنوں میں اچھی طرح سمجھا بجھا چکا تھا۔ ضروری ہدایات دے چکا تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی نے فوراً وضاحت کی۔

''میں ماں کے ساتھ پہلے یہاں آیا تھا۔ تب میرا پیو ادھر نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ نہ ملا تو اسے ڈھونڈتا ہوا کیمبل پور چلا گیا۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ ادھر ہوتا ہے۔ تب سے ہم دونوں کیمبل پور میں رہے۔ ادھر آ ہی نہیں سکے۔''

''لیکن تم دونوں نے بہت دیر کر دی۔'' نادر خان نے مطلع کیا۔ ''مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔'' اس نے گہری سانس بھری۔ ''وہ اپنے رب کے پاس چلا گیا۔ اس نے دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس کی دوسری گھر والی کا نام شاداں تھا۔ پر چوہدری کی اس سے بنی نہیں۔ وہ بہت ضدی اور جھگڑالو زنانی تھی۔ اس کا غصہ بہت خراب تھا۔ ایک رات غصے سے ایسی پاگل ہوئی کہ اس نے سوتے میں چھری سے چوہدری کا گلا کاٹ ڈالا اور اسی چھری سے اپنے گلا کاٹ کر خودکشی کر لی۔ دونوں ہی ختم ہو گئے۔''

''ہم کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔'' لالی نے ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت روئے پیٹے۔ بہت سیاپا کیا۔'' وہ اب حرف مطلب پر آنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کلثوم بی بی تنک کر بولی۔

''نہیں جی' نہ ہم نے کوئی پٹنی ڈالی' نہ سیاپا کیا۔ ہم نے اس سے کیا لینا تھا۔ وہ نہ جانے کون بندہ تھا۔ ہم نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔''

لالی بہت سٹ پٹایا۔ وہ چاہتا تھا کہ رحیم داد کے ذکر کے بغیر ہی کام چل جائے۔ اس نے کوٹلہ

ہر کشن جانے سے پہلے ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کم سے کم بولیں۔ اسی وقت بولیں جب وہ ان سے بولنے کو کہے اور وہ جو کچھ کہے اسے خاموشی سے سن لیں۔ نہ اس کی مخالفت کریں اور نہ ہی اس کی کسی بات کی تردید کرنے کی کوشش کریں۔

ارشاد الٰہی نے لالی کی پریشانی بھانپ لی۔ اس نے فوراً ماں کو ٹوکا۔ ''اماں' لالی جو کہہ رہا ہے اسے کہنے دے۔ تو بیچ میں نہ بول۔''

''وے' میں کیوں نہ بولوں؟ تو چپ کر۔'' اسے بیٹے کی بات سخت ناگوار گزری۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ ''لالی کو کیا پتہ تیرا پیو کیسا بندہ تھا۔ میں نوں پتہ ہے اس نے کوئی دوسرا ویاہ نہیں کیا۔ وہ بہت نیک بندہ تھا۔ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ دوسرا ویاہ کرنے کی تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔'' اس نے نادر خان کی طرف دیکھا۔ ''میرے گھر والے کی نہ دوسری گھر والی تھی نہ کسی نے چھری سے گلا کاٹ کر اس کا خون کیا۔ وہ تو برسوں پہلے مر گیا تھا۔ تخت ہزارہ کے نزدیک چک ۵۸ میں اس کی موت ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کبر بھی دیکھی ہے۔'' اس نے ارشاد الٰہی کو مخاطب کیا۔ ''شادے' اپنے پیو کی کبر تو تو نے بھی دیکھی ہے۔ اکبر اور اس کی گھر والی جیناں نے دکھائی تھی۔ تیں نوں یاد ہے ناں۔''

ارشاد الٰہی نے جھنجلا کر ماں کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ لالی بھی خاموش رہا۔ مگر نادر خان خاموش نہ رہ سکا۔

''چوہدرانی کی باتوں سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ کوٹلہ ہر کشن کا جو زمیں دار تھا وہ کوئی دوسرا ہی چوہدری نور الٰہی تھا۔'' اس نے اس دفعہ براہ راست لالی کو مخاطب کیا۔ ''تجھے کسی نے غلط اطلاع دی۔''

لالی نے بات بگڑتے دیکھی تو فوراً پینترا بدلا۔ اب کھل کر بات کرنے کے سوا چارہ کار نہ رہا تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نادر خان' جیسا تو سوچ رہا ہے ایسا نہیں ہے۔ بے جی کو پتہ نہیں۔''

''کیوں نہیں پتہ؟'' کلثوم بی بی نے تلخ لہجے میں مداخلت کی۔ ''میں مرنے والے کے خلاف کوئی غلط بات نہیں سن سکتی۔'' وہ بے قرار ہو کر رونے لگی۔ سسکیاں بھر کر بین کرنے لگی۔ ''ہائے' اب وہ نہیں رہا تو اس پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ اسے بدنام کیا جا رہا ہے۔ میں نصیباں دی ماری یہ سن نے کو زندہ ہی کیوں رہ گئی؟''

لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ نرم لہجے میں کلثوم بی بی کو مخاطب کیا۔
"بے جی، کوئی تیرے گھر والے پر نہ الزام لگا رہا ہے نہ اسے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے پوری بات کہہ لینے دے۔"
ارشاد الٰہی نے لالی کی تائید کی۔ "لالی ٹھیک کہہ رہا ہے اماں۔ تو چپ کر کے اس کی گل بات سن لے۔"

لالی نے مڑ کر نادر خان کی جانب دیکھا۔ "ہاں تو جی میں یہ بتا رہا تھا کہ میں نے کوئی غلط گل بات نہیں کہی۔ بے جی بھی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اسے یہ پتہ نہیں کہ اس پنڈ کا جو زمیں دار تھا وہ اس کا گھر والا چوہدری نور الٰہی نہیں تھا۔ نہ وہ مہاجر تھا اور نہ کبھی نصیر پور میں رہا تھا۔ اس کا اصلی نام رحیم داد تھا۔ وہ اسی ضلع کے پنڈ احمد کوٹ کا رہنے والا تھا۔ ادھر اس کی چھوٹی سی زمیں داری ہوتی تھی۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر اس کا اپنے ہی پنڈ کے ایک زمیں دار سیف اللہ سے جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں سیف اللہ مارا گیا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی اور وہ جیل میں بند کر دیا گیا۔" لالی سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "ایک رات وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ اور نہر یاری دو آب کے نزدیک ویران ٹبوں میں جا کر چھپ گیا۔ ادھر اسے کمال پور کا حکیم چشتی مل گیا۔ اسے رحیم داد نے کتل کر دیا۔ اپنی جیل کی وردی اسے پہنا دی اور اس کے کپڑے لتے خود پہن لیے۔ پولیس نے اسے رحیم داد کی لاش سمجھا اور احمد کوٹ لے جا کر دفن کرا دیا۔"
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" نادر خان نے اپنے شک وشبے کا اظہار کیا۔ "کپڑے لتے بدل لینے سے دونوں کی شکلیں تو نہیں بدل گئیں۔ پولیس ایسی غلطی نہیں کر سکتی۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔"
"رحیم داد نے لاش کو پتھر سے کچل کر ایسا بگاڑ دیا تھا کہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔" لالی نے وضاحت کی۔ "پولیس نے اس کی شناخت جیل کی وردی سے کی۔ رحیم داد نے پولیس کو دھوکا دینے کے لیے لاش کو بگاڑا ہی کچھ اس طرح تھا۔"
"وہ اتنا دھوکے باز تھا۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" نادر خان نے حیرت کا اظہار کیا۔
"چپ کر کے سنتا جا۔ وہ کتنا وڈا دھوکے باز تھا۔ تجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں۔" لالی نے نادر خان کو بتایا۔ "حکیم چشتی کا خون کرنے کے بعد وہ چک ۵۸ پہنچا۔ وہاں اسے چوہدری نور الٰہی مل گیا۔ وہ کئی روز تک اس کے گھر میں چھپا رہا۔ چوہدری ان دنوں سخت بیمار تھا۔ میرا خیال ہے اس نے اپنے اور اپنے کلیم کے بارے میں رحیم داد کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک رات چوہدری چل بسا۔ اس کے مرنے کے بعد رحیم داد نے اس کے کلیم کے کاغذات چرائے اور رات کے اندھیرے میں باہر نکل

گیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے اس نے داڑھی رکھ لی۔ آنکھوں پر چشمہ لگانے لگا۔ اپنا نام بدل کر چوہدری نور الٰہی رکھ لیا۔ جعل سازی اور چار سو بیسی کر کے چوہدری نور الٰہی کے کلیم پر متروکہ اراضی اور جائیداد کی الاٹمنٹ کرا لی اور اس طرح کوٹلہ ہر کشن کا زمیں دار بن گیا۔" لالی نے مسکرا کر نادر خان کی طرف دیکھا۔ "اب تو سب کچھ تو ٹھیک طرح سمجھ گیا۔" پھر وہ کلثوم بی بی کی جانب متوجہ ہوئی۔ "بے جی، تجھے بھی اصل گل بات کا پتہ چل گیا۔"

"تو نے جو کچھ بتایا ہو سکتا ہے ٹھیک ہی ہو۔" نادر خان نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "پر یہ سمجھ نہیں آئی۔ تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟ تیری اس سے یاری دوستی ہوتی تو کبھی اس کے پاس ضرور آتا۔ پر میں تو یہاں کئی برس سے ہوں۔ میں نے تجھے ادھر کبھی نہیں دیکھا۔"

یہی وہ نازک مرحلہ تھا جس سے بچنے کے لیے وہ رحیم داد کے ذکر سے کترا رہا تھا۔ لالی کو یہ خدشہ تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے وہ باتیں بتانے پر مجبور ہونا پڑے جن کے اظہار سے بات بننے کے بجائے بگڑ جائے اور رحیم داد اور شاداں کے قتل کے شبے میں اسے دھر لیا جائے۔ بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مگر وہ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کی طرح سادہ لوح اور گھامڑ نہیں تھا۔ جہاں دیدہ اور گھاگ تھا۔ برسوں عادی مجرموں کے ساتھ رہ چکا تھا۔ پولیس سے بارہا سابقہ پڑ چکا تھا۔ لہٰذا بات بنانے کا گر جانتا تھا۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ نادر خان کے استفسار پر بتایا۔

"رحیم داد سے میری جان پہچان تھی۔ پر جب پولیس نے یہ بتایا کہ نہر باری دوآب کے نزدیک اسے کتل کر دیا گیا تو میں نے بھی مان لیا کہ وہ مر گیا۔ مجھے کیا پتہ وہ نام بدل کر ادھر زمیں داری کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں ایسا ہوا کہ برسوں بعد مجھے اچانک رحیم داد کا بہت پرانا اور گہرا یار جمال دین مل گیا۔ وہ مجھے بھی جانتا ہے۔ اسی نے مجھے رحیم داد کے بارے میں ساری باتیں بتائیں۔ شاید وہ مجھے یہ راز کبھی نہ بتاتا۔ پر اب تو رحیم داد اس دنیا سے جا چکا ہے۔ جمال دین اس کے بارے میں مجھ سے کچھ چھپاتا تو کس کے لیے چھپاتا۔" قدرے توقف کے بعد وہ حرف مطلب پر آگیا۔ "جمال دین سے مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں تو میں ان دونوں کو لے کر یہاں آگیا۔"

"یہاں کیوں آئے؟" نادر خان نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"رحیم داد نے جو کچھ کیا وہ جانے اور اس کا رب جانے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" لالی نے کھل کر بات کی۔ "پر اس نے جو زمیں داری اور جائیداد چھوڑی ہے اس کا اصلی مالک تو چوہدری نور الٰہی تھا ناں۔ اس کے وارثوں کی حیثیت سے اس پر ان دونوں کا حق بنتا ہے۔ اب یہ زمیں داری اور جائیداد ان کو ملنی چاہیے۔ یہی اس کے اصلی وارث ہیں۔"

نادر خان پرانا گھاگ تھا اور جس کا نمک کھاتا تھا اس کا وفادار بھی تھا۔ اس نے لالی کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ بے رخی سے بولا۔ "مجھے یہ تو پتہ نہیں اصلی چوہدری نور الٰہی کون تھا اور جعلی چوہدری نور الٰہی کون تھا۔ اور نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ یہ دونوں کس کے وارث ہیں۔" اس نے سراسر دروغ گوئی سے کام لیا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ ادھر کا جو زمیں دار ہوتا تھا اس نے موت سے پہلے اپنی زمیں داری اور جائیداد پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ کے ہاتھ بیچ کردی تھی۔"

لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ رحیم داد نے مرنے سے پہلے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہر راز پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ لیکن اس نے اشارہ تک نہ کیا کہ اپنی زمیں داری اور جائیداد فروخت کردی ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتا۔ لالی نے دبی زبان سے اپنے شک و شبے کا اظہار کیا۔ "میں نے سنا ہے وہ تو بہت شان سے زمیں داری کر رہا تھا اور بہت خوش بھی تھا۔ اسے زمیں داری اور جائیداد بیچنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"تیں نوں پتہ نہیں۔ وہ لائل پور میں کپڑا بنانے کا بہت وڈا کارخانہ لگا رہا تھا۔ کارخانے کے لیے اسے زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔" نادر خان نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جواز پیش کیا۔ "کارخانہ لگانے کے لیے اسے بہت زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بھی مشورہ کرتا رہتا تھا۔" اس نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ "میں نے منع بھی کیا، پر وہ نہ مانا۔ زمیں داری اور جائیداد بیچ کردی۔ اسے ڈیرہ غازی خان کے موضع دلاور والا میں بھی کلیم کی بنیاد پر اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی الاٹ ہوئی تھی۔ اس نے وہ اراضی بھی راجن پور کے زمیں دار سردار عظمت اللہ دریشک کے ہاتھ بیچ کردی۔"

نادر خان نے اس طرح جما کر بات کی کہ لالی کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس نے سوچا تھا کہ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو زمیں داری اور جائیداد مل گئی تو اسے بھٹے کی صبر آزما زندگی سے نجات مل جائے گی۔ ارشاد الٰہی اسے زمیں داری میں اپنے ساتھ لگا لے گا۔ اس نے لالی سے ایسا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے پھیل گئے۔ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"بیع کی رجسٹری وغیرہ بھی ہو گئی؟"

نادر خان اس کے استفسار پر کچھ گھبرا گیا۔ اس نے دبی زبان سے بتایا۔ "بیع کی رجسٹری شاید نہیں ہوئی۔"

لالی کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس نے کرید کر دریافت کیا۔ "بیع کی رجسٹری کیوں نہیں ہوئی؟ کوئی خاص وجہ تھی؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جب بیع کا معاملہ طے ہو رہا تھا میں ان دنوں سخت بیمار تھا۔ مجھے ٹائی فائڈ ہو گیا تھا۔" نادر خان نے عذر پیش کیا۔ "بیع کی رجسٹری شاید اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ مارشل لا کی زرعی اصلاحات کا کچھ چکر پڑ گیا تھا۔ پر میں نے وہ مختار نامہ دیکھا ہے جو چوہدری نے مرنے سے پہلے احسان علی شاہ کو دیا تھا۔"

"پر مختار نامے کی بنیاد پر کسی جائیداد کے وارثوں کو ان کے حق سے محروم تو نہیں کیا جا سکتا۔" لالی نے جیل میں قیدیوں سے سنی سنائی باتوں کا سہارا لیا۔ ان سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی روشنی میں اپنی قانونی سوجھ بوجھ کا اظہار کیا۔ "میں نے تو اس سلسلے میں یہی سنا ہے۔"

"یہ تو کوئی وکیل ہی بتا سکتا ہے۔" نادر خان نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

"یہاں آنے سے پہلے ہم نے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔" لالی نے نادر خان کو مرعوب کرنے کے لیے نیا حربہ آزمایا۔ "بلکہ ہم تو وکیل کو ساتھ لے کر آ رہے تھے۔ پر یہ سوچ کر اسے نہ لائے کہ پہلے معلومات حاصل کر لی جائیں۔"

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے حیرت زدہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مگر خاموش بیٹھے رہے۔

لالی کا حربہ کار آمد ثابت ہوا۔ نادر خان اس کی باتوں سے واقعی مرعوب ہو گیا۔ اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "زمیں داری اور جائیداد کے بارے میں تو ساری معلومات احسان شاہ سے ہی مل سکتی ہیں۔ ادھر کا زمین دار تو وہی ہے۔ میں تو پہلے بھی منیجر تھا اور اب بھی منیجر ہوں۔"

"تو مجھے احسان شاہ سے ملوا دے۔" لالی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "اصلی گل بات تو ہم نے اسی سے کرنی ہے۔" اس نے ذرا جما کر بات کی۔ "مختار نامہ دیکھنا ہے۔ اور دوسرے ضروری کاغذات بھی دیکھنے ہیں۔"

"شاہ جی سے ضرور مل لیں۔" نادر خان نے بلا عذر اس کی بات مان لی۔ "آج تو وہ پیراں والہ میں ہے۔ عام طور پر ادھر ہی ہوتا ہے یا لہور میں۔ ادھر بھی آتا رہتا ہے۔"

"وہ یہاں کب آئے گا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ یہاں کب آئے گا۔ اس کی مرضی ہے۔ جب جی کرتا ہے آ جاتا ہے۔" نادر خان نے لالی کو بتایا۔ "ویسے میں اسے اطلاع کروا دوں گا۔ تب تک تم تینوں مہمان خانے میں ٹھیرو۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔ روٹی ٹکر کھاؤ۔"

نادر خان نے ملازم کو بلایا۔ تینوں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ تینوں مہمان ہیں۔ ان کو مہمان خانے میں لے جا۔ لبھا سے کہنا ان کو آرام سے رکھے۔ کسی طرح کی بھی تکلیف نہ ہو۔"

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارشاد الٰہی بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کی ماں بھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی۔ تینوں ملازم کے ہم راہ باہر چلے گئے۔

نادر خان اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے سے پریشانی آشکارہ تھی۔ لالی نے اپنی باتوں سے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اٹھا اور اسی وقت پیراں والہ جانے کا ارادہ کیا۔

☆

مہمان خانے کا اب نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کی از سر نو تعمیر کی گئی تھی۔ توسیع بھی کی گئی تھی۔ پہلے مہمانوں کے قیام کے لیے صرف تین کمرے تھے۔ جنہیں ڈھا کر پانچ نئے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کر نیا فرنیچر ڈالا گیا تھا۔ ایک بڑا کمرہ تھا جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں سلیقے سے صوفہ سٹ رکھے تھے۔ بڑی چھوٹی میزیں تھیں۔ کرسیاں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر خوش رنگ پردے ڈالے گئے تھے۔ کمروں کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے کشادہ صحن تھا۔ اس کا کچا فرش پختہ کر دیا گیا تھا۔ صحن کے اردگرد کیاریاں تھیں۔ ان میں گلاب کثرت سے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ موسمی پودے بھی تھے جن میں رنگا رنگ پھول ہوا کے جھونکوں سے جھومتے تھے۔ فضا کو معطر کرتے تھے۔

صحن کے ایک گوشے میں مہمان خانے کی دیکھ بھال کرنے والے نوکروں کی رہائش کے لیے کوٹھریاں تھیں۔ چاردیواری بھی نئی تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں لکڑی کا مضبوط دروازہ لگایا گیا تھا۔

عرصہ ہوا جب لالی بھی مہمان خانے میں ایک رات قیام کر چکا تھا۔ اس وقت رحیم داد زندہ تھا۔ لالی نے مہمان خانے کو اس بار دیکھا تو بہت مرعوب ہوا۔ اس کی شان ہی نرالی تھی۔ اسے علیحدہ کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ارشاد الٰہی اور اسکی ماں کا قیام ایک ہی کمرے میں تھا۔ مگر یہ کمرہ بڑا تھا۔ اس میں دو مسہریاں تھیں جن پر اجلے بستر لگے تھے۔ ہر مسہری کے ساتھ میز رکھی تھی۔ میزوں کے علاوہ بیٹھنے کے لیے کرسیاں بھی موجود تھیں۔ کمروں میں خوبصورت لیمپ روشن تھے۔ لالی کی طرح ارشاد الٰہی اور اس کی ماں' دونوں ہی مہمان خانہ دیکھ کر مرعوب ہوئے تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مرعوب ہوئے۔ حیرت سے نظریں اٹھا کر ہر طرف دیکھتے تھے۔

لالی نے رات کا کھانا ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ ملازم نے دونوں میزیں ملا کر کھانا سلیقے سے چن دیا تھا۔ بیٹھنے کے لیے میزوں کے اردگرد کرسیاں لگا دی تھیں۔ کھانا لگانے کے بعد وہ دہلیز کے قریب مودب کھڑا رہا۔ کھانے کے دوران کسی کو پانی پینے کی خواہش ہوتی تو فوراً

بڑھ کر شیشے کے جگ سے گلاس میں پانی ڈالتا اور اسے احتیاط سے پیش کرتا۔ کھانا خوب مرغن تھا اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ تینوں بھوکے بھی تھے۔ انھوں نے بہت رغبت سے کھانا کھایا۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے تو ملازم نے برتن اٹھائے۔ دونوں میزیں جھاڑن سے صاف کیں اور انھیں اپنی سابقہ جگہ پر رکھ دیا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے وہ ٹھٹکا۔ مسکرا کر نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"میرا نام لہنا ہے جی۔ تسیں نوں پتہ ہی ہے۔ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں ابھی جاگ رہا ہوں۔ اپنی کوٹھڑی میں رہوں گا۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیں۔"

"نہیں، جی اب کوئی ضرورت نہیں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "روٹی تو نے مزیدار کھلائی۔ جی خوش ہو گیا۔"

لہنا نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو غور سے دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر مڑا اور خاموشی سے چلا گیا۔ کلثوم بی بی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "لہنا مجھے اور شادا کو گھور کیوں رہا تھا؟" اس کے لہجے میں اشتباہ تھا۔

"اپنے نئے زمیں دار اور اس کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔" لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "آگے اس نے ادھر نوکری جو کرنی ہے۔ بے بے، تو نے یہ نہیں دیکھا۔ لہنا نے کیسے آرام سے روٹی کھلائی۔"

"ہشیار اور کام کا بندہ لگتا ہے۔" ارشاد الٰہی نے لہنا کے بارے میں خوش نودی کا اظہار کیا۔

"اسے ہشیار تو ہونا ہی چاہیے۔" لالی نے ارشاد الٰہی کی رائے سے اتفاق کیا۔ "ادھر مہمان خانے میں وڈے افسر اور زمین دار آکر ٹھیرتے ہیں۔ ان کو ہر طرح خوش رکھنا پڑتا ہے۔"

"ویسے مہمان خانہ ہے بہت شاندار۔" ارشاد الٰہی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں جی بہت شاندار ہے۔ پر حویلی بھی کم شاندار نہیں۔" لالی نے مسکرا کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ "اب تو ادھر کا زمیں دار تو بن ہی رہا ہے۔ جیسی مرضی ہو ویسی شاندار حویلی بھی کر لینا۔"

"ایسا اپنا نصیب کہاں جو اتنی وڈی زمیں داری اپنی بن جائے اور رہنے کو ایسی شاندار حویلی ملے۔" ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مجھے تو سب کچھ ابھی تک سفنہ ہی لگتا ہے۔"

"اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔" ارشاد الٰہی نے بجھے ہوئے لہجے میں ماں کی تائید کی۔ "مجھے تو زمیں داری اور جائیداد ملتی ملاتی معلوم نہیں ہوتی۔"

"شادے، حوصلے سے کام لے۔" لالی نے اس کی مایوسی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں داری

اور ساری جائیداد تو تجھے ملنی ہی ملنی ہے۔ ہم نے کوئی دھوکا فریب تو کرنا نہیں۔ اس پر تیرا پورا پور حک بنتا ہے۔ یہ تیرے پیو کی جائیداد ہے۔ تو اور تیری ماں اس کے اصلی وارث ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پر نادر خان کی باتوں سے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔" ارشاد الٰہی ہنوز غیر مطمعن تھا۔

"یار تو کس چکر میں پڑ گیا۔ نادر خان کچھ ہی کہتا رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔" لالی نے وضاحت کی۔ "نادر کو تو خود کچھ پتہ نہیں۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ پہلے کہتا تھا کہ زمیں داری اور جائیداد کی بیع ہو گئی۔ میں نے پوچھ تاچھ کی اور وکیل سے مشورہ کرنے کی بات کی۔"

"تو نے کس وکیل سے مشورہ کیا تھا اور کب کیا تھا؟" ارشاد الٰہی نے حیرت زدہ ہو کر لالی کو ٹوکا۔

"وہ تو میں نے نادر خان پر رعب جمانے کے لیے سیدھی سیدھی بلف چال چلی تھی۔" لالی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ایسا چکر چلایا کہ وہ ایک دم گھبرا گیا۔"

"یہ تو میں نے بھی دیکھا وہ گھبرا سا گیا تھا۔ کہنے لگا بیع کی رجسٹری تو ہو نہیں سکی۔ مختار نامہ مل گیا ہے۔" ارشاد الٰہی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے اب تک کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوئی۔ نادر خان ایسے ہی چکر چلا رہا تھا۔" لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تو ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس کی نوکری کا جو معاملہ ہے۔"

"زمیں داری مل جائے تو نادر کو ہرگز نہ رکھنا۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے مداخلت کی۔ "مجھے وہ ٹھیک بندہ نہیں لگتا۔ اس کی تو چھٹی کر دینی چاہیے۔"

لالی نے چوکنا نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ "بے بے آہستہ بول۔ نادر سے ابھی بگاڑنا ٹھیک نہیں۔ ورنہ بہت گڑبڑ ڈالے گا۔ اسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم نے آگے کیا کرنا ہے۔"

"پر یہ تو سوچ۔ نادر نہ رہا تو زمیں داری کون چلائے گا۔" ارشاد الٰہی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "مجھے تو زمین داری کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کے چہرے کو دیکھا۔ "لالی، تو زمیں داری چلا سکتا ہے؟"

"ویسے تو زمین داری کا مجھے بھی کوئی تجربہ نہیں۔ پر میں یہ جانتا ہوں کہ زمیں داری تو منشی اور کاردار چلاتے ہیں۔ صرف ان کے کام کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔ وہ میں کر سکتا ہوں۔" لالی نے

اپنے بارے میں ارشاد الٰہی کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ "یہ تو تیری مرضی پر ہے۔ تو مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہے گا تو زمیں داری چلانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"ایسی گل بات نہ کر۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ "شادا تجھے کیوں نہیں لگائے گا؟ تو اور شادا علیحدہ تھوڑا ہی ہیں۔ میرے لیے تو جیسے شادا ویسے تو۔"

"تجھے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" ارشاد الٰہی نے لالی کو باور کرایا۔ "تیری ہی کوشش سے تو زمین داری مل رہی ہے۔ مجھے تو اس کے بارے میں پتہ تک نہیں تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میری مرضی کیا۔ سب کچھ تو تجھے ہی کرنا ہے۔ میں نے تو وہی کرنا ہے جو تو کہے گا۔"

"پتر اب تو ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے مسکرا کر لالی سے کہا۔ "تیرے لیے ویاہ کر وہٹی لاؤں گی۔ دونوں حویلی کے چوبارے میں رہنا"

"حویلی کے اوپر کے حصے میں کئی کمرے ہیں۔ شادا کی وہٹی ویاہ کر لانا تو دونوں کو ادھر ہی رکھنا۔" لالی نے مشورہ دیا۔ "بے بے تو بھی اوپر ہی کے کمرے میں رہنا۔ ضرورت پڑی تو اور کمرے بنوالیں گے۔ اوپر بہت جگہ ہے۔"

"نا پتر' میں کوٹھے پر نہیں رہ سکتی۔" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر منہ بگاڑا۔ "میں تو اوپر جا ہی نہیں سکتی۔ ہر دم تو کمر میں درد رہتا ہے۔ زینے کی سیڑھیوں پر کیسے چڑھ سکوں گی۔"

"ہاں اماں' سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے تجھے بہت تکلیف ہو گی۔" ارشاد الٰہی نے ماں کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ویسے بے بے' اوپر رہنے میں تجھے بہت آرام رہتا۔ گرمی میں تو رات کو شان سے سوتی۔" لالی نے کلثوم بی بی کو بتایا۔ "پر حویلی کا آنگن بھی بہت وڈا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں؟"

"اندھیرے میں کیا دیکھتی۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے اظہار خیال کیا۔ "حویلی مل گئی تو آرام سے دیکھوں گی۔ ابھی دیکھ کر کیا لینا۔"

"بے بے فکر نہ کر۔ حویلی بھی ملے گی اور زمیں داری بھی۔ بس تو دعا کرتی رہ۔"

"پتر' وہ تو میں کرتی رہی ہوں۔ ورنہ اپنے نصیب میں تو اب سب کے آگے بھیک کے لیے ہاتھ پھیلانا ہی رہ گیا ہے۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ "میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ نہ پوچھ مجھ پر کیسی کیسی مصیبت پڑی ہے۔"

"بے بے' اب تیری مصیبت کے دن ختم ہو گئے۔" لالی نے کلثوم بی بی کو تسلی دی۔ "اب تو شان سے زمیں دارنی بن کے ادھر رہنا۔ نوکرانیوں پر حکم چلانا۔"

"نصیر پور میں تو میں زمین دارنی ہی ہوتی تھی۔ کئی نوکرانیاں تھیں میرے گھر میں۔" ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی نے ایک بار پھر آہ سرد کھینچی۔ "بعد میں تو خود نوکرانی بننا پڑا۔ ہائے کیا کیا نہ ہوا میرے ساتھ۔"

"بے بے' بیتے دنوں کو بھول جا۔ آگے کی سوچ آگے کی۔" لالی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جماہی لی۔ "بہت نیند لگ رہی ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے اسے روکنے پر اصرار نہ کیا۔ وہ بھی بہت تھکے ہوئے تھے اور اب سونا چاہتے تھے۔

۵۴

آتش دان میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے۔ احسان علی شاہ آتش دان کے قریب آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ انگاروں سے پھوٹتی ہوئی روشنی میں سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذرا ہٹ کر اس کا منیجر مہربان علی بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔

احسان علی شاہ نے قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور اس کا چوبی دستہ ہاتھ میں دبائے ہوئے انگاروں پر جمی ہوئی راکھ کریدنے لگا۔ ذرا دیر تک وہ خاموشی سے انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر مہربان علی کی سمت دیکھا۔ پوکر آتش دان کے نزدیک دیوار سے ٹکا کر کھڑا کیا اور بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"تو گویا بات بنی نہیں۔" اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ "اور کیا کہتا تھا وکیل؟"

"کہتا تھا، کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری پر بغیر دستاویزی ثبوت کے زیادہ عرصے تک کبضہ نہیں رکھا جا سکتا۔"

"لیکن چوہدری نور الٰہی کا مختار نامہ تو میرے نام کا موجود ہی ہے۔" احسان شاہ نے گردن موڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ "اسے دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا؟ مختار نامہ بھی تو دستاویز ہی ہے ناں؟"

"شاہ جی، تسیں نوں پتہ ہے۔ مختار نامے پر چوہدری نور الٰہی کے جعلی دستخط بنائے گئے ہیں۔"

"پر یہ کون پوچھ رہا ہے کہ چوہدری کے دستخط اصلی ہیں یا جعلی؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"یہ سوال تو تب پیدا ہو سکتا ہے جب کوئی اسے عدالت میں چیلنج کرنے والا ہو۔ مجھے تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے جی۔ پر تیں نوں یہ بھی پتہ ہے۔ مختار نامے پر ان دنوں کی تاریخ پڑی ہے جب چوہدری زندہ تھا۔" مہربان علی نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "چوہدری کے مرنے کے بعد تو مختار نامہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اب اس کی کوئی کانونی حیثیت نہیں رہی۔"

"یہ بات تجھے وکیل نے بتائی ہے؟"

"ہاں جی اسی نے بتائی ہے۔"

"پر تو نے تو مختار نامہ وکیل کے مشورے سے بنوایا تھا۔"

"فوری طور پر کبضہ لینے کے لیے یہی نکتہ سمجھ میں آیا تھا۔" مہربان علی نے وضاحت کی۔ ساتھ ہی اپنی کارگزاری کا بھی اظہار کیا۔ "اسے فٹافٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی کوشش کرنی پڑی۔ کسی کو رشوت دی۔ کسی کی منت کی۔ مختار نامے کے لیے پرانی تاریخوں کا شامپ پیپر ہی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔"

احسان شاہ نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "مختار نامہ بنوانے سے تو کہیں بہتر تھا کہ بیع کی جعلی دستاویز تیار کروالی جاتی۔"

"اس کے لیے تو سب سے پہلے سوچا گیا تھا۔ بلکہ اس کا مسودہ بھی بن گیا تھا۔ پر اس کی رجسٹری کرانے میں کتنی مشکل پیش آرہی تھی۔" مہربان علی نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔ "رجسٹرار سے معاملہ طے بھی کر لیا جاتا تو سب سے دشوار مسئلہ زرعی اصلاحات کا تھا۔ تیرے پاس تو ۵ سو ایکڑ حد ملکیت سے زیادہ پہلے ہی زرعی اراضی موجود ہے۔ چوہدری نور الٰہی کی اراضی کیسے خرید سکتا تھا۔ تیں نوں یاد نہیں اس کے بارے میں کتنا سوچ وچار کیا گیا؟"

"یاد آیا۔ ایسی ہی دشواری پیش آئی تھی۔" احسان شاہ نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب تو یہ سوچ آگے کیا کرنا ہے؟"

"اس بارے میں تو وکیل سے ملنے کے بعد ہی سے میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔"

"کوئی نیا نکتہ کوئی نئی سکیم سمجھ آئی؟ تو نے تو دیر تک وکیل سے صلاح مشورہ کیا ہے۔ بہت سے پہلو سامنے آئے ہوں گے؟"

"میں نے تو جی یہ سوچا ہے کہ دوسرا مختار نامہ حاصل کیا جائے اور اس دفعہ چوہدری کے کسی وارث سے مختار نامہ لیا جائے۔ نہ پچھلی تاریخوں کا شامپ پیپر تلاش کرنے کی ضرورت نہ جعلی

دستخط کی۔"

"چوہدری کا تو اب کوئی بھی نہیں رہا۔ پہلی گھر والی اور بچوں کے بارے میں کہتا تھا۔ برسوں ڈھونڈتا رہا۔ ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ دوسری گھر والی تھی اس نے بھی اس کے ساتھ ہی خودکشی کر لی۔" احسان شاہ نے مہربان علی کو آگاہ کیا۔ "اب اس کے وارث کو کہاں سے پیدا کیا جائے؟ تو نے یہ نہیں سوچا۔"

"جب اس کا کوئی وارث ہی نہیں تو کسی کو بھی کھڑا کیا جا سکتا ہے۔" مہربان علی نے تجویز پیش کی۔ "کوئی بھروسے کی زنانی مل جائے تو کام آسانی سے بن سکتا ہے۔ اسے چوہدری کی گھر والی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ آرام سے نکاح نامہ بھی بن سکتا ہے۔ صرف عدالت سے اس کی وراثت کا سرٹیفکیٹ نکلوانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنی ہو گی۔"

"بات تو تیری سمجھ آتی ہے، پر ایسی زنانی کون ہو سکتی ہے جو اپنے بھروسے کی ہو اور آسانی سے مجھے مختار نامہ بھی دے دے؟"

"شاہ جی، یہ تو تیں نوں ہی سوچنا پڑے گا۔"

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کو تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر انگاروں کی آنچ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ مہربان علی بھی خاموش تھا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ مگر گہری خاموشی نے فضا کو بوجھل بنا دیا تھا۔

احسان شاہ نے گردن اٹھائی اور سامنے کی دیوار خواب ناک نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔ "چوہدری ہوشیار بندہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی بالکل غلط فیصلے کرتا تھا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ اس کی دوسری گھر والی نوکرانی رہ چکی ہے تو میں نے اسے شرم دلائی۔ اپنی غلطی پر ایسا پچھتایا کہ اسے طلاک دے کر الگ کرنے پر تیار ہو گیا۔" مہربان علی کی جانب دیکھے بغیر احسان شاہ بولتا رہا۔ "میری بھانجی سلیمہ سے ویاہ کرنے پر بالکل رضامند ہو گیا تھا۔ کہتا تھا شاہ جی، تیرے ساتھ رشتے داری ہو گئی تو میری عزت بڑھ جائے گی۔"

"سلیمہ بی بی کدھر ہوتی ہے جی؟" مہربان علی نے دریافت کیا۔

"میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔" احسان شاہ نے مڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ "اڑھائی برس کی تھی تو ماں چل بسی۔ پیو پہلے ہی گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد میں اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ تب سے وہ میرے ہی پاس ہے۔"

"اس سے زیادہ کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔" مہربان علی نے دبی زبان سے پوچھا۔ "شاہ جی

اگر تیں نوں کوئی اعتراض نہ ہو تو سلیمہ کو چوہدری کا وارث بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا تو چوہدری سے رشتہ بھی طے ہو چکا تھا۔ اپنے پنڈ کی مسجد کا ملا آرام سے نکاح نامہ تیار کر دے گا۔ نکاح کے گواہ اور وکیل کے لیے اپنے اعتماد کے ایسے بندے بھی مل جائیں گے جو ضرورت پڑنے پر عدالت میں گواہی دے سکیں۔ گواہوں کے لیے میں اور نادر خان تو موجود ہی ہیں۔ دو بندے اور تلاش کر لیں گے۔ تو وکیل بن جانا۔ وکیل تو وہٹی کی طرف کا ہوتا ہے ناں۔"

"تجویز تو تیری ٹھیک لگتی ہے۔ سلیمہ سے مختار نامہ بھی مل سکتا ہے۔" احسان شاہ نے مہربان علی کی رائے سے اتفاق کیا۔ ساتھ ہی اپنے خدشے کا بھی اظہار کیا۔ "مگر ایک نہ ایک دن تو اس کا ویاہ کرنا ہو گا۔ معلوم نہیں وہ کیسا بندہ ہو۔ بعد میں اس کی نیت خراب ہو جائے۔ زمیں داری اور جائیداد اپنی تحویل میں لینا چاہے۔ یہ جائیداد بہت ظالم ہوتی ہے۔"

"تیرے چھوٹے پتر، رحمان شاہ سے عمر کم ہے تو اس کے ساتھ سلیمہ بی بی کا ویاہ کر دے۔ تیں نوں رحمان شاہ کا ویاہ تو کرنا ہی ہے۔" مہربان علی نے مشورہ دیا۔

"میں تو سلیمہ کا ویاہ رحمان شاہ سے کرنے کے بارے میں پہلے ہی سوچ رہا تھا۔ پر اس کی ماں راضی نہیں ہوتی۔" احسان شاہ نے اپنی مجبوری بتائی۔ "وہ رحمان شاہ کا ویاہ کسی وڈے زمیں دار خاندان میں کرنا چاہتی ہے۔"

"جب سلیمہ بی بی خود وڈی زمین دارنی بن جائے گی تب تو اسے راضی ہو جانا چاہیے۔" مہربان علی نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "ویسے بھی رحمان شاہ کی ماں تیری گھر والی ہے۔ تیرا کہا کیسے ٹال سکتی ہے۔"

"رحمان شاہ کی ماں کو میں راضی کر لوں گا، پر اس سلسلے میں وکیل سے ضرور مشورہ کر لینا چاہیے۔"

مہربان علی کچھ کہنا چاہتا تھا اسی اثناء میں ملازم نے کمرے میں داخل ہو کر نادر خان کے آنے کی اطلاع دی۔ احسان شاہ نے نادر خان کو فوراً بلایا۔

نادر خان کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"کیسے آیا نادر؟" احسان شاہ نے اس کی غیر متوقع آمد پر حیرت کا اظہار کیا۔ "کوئی خاص گل بات تو نہیں؟"

"خاص ہی گل بات ہے۔" نادر خان نے جواب دیا۔

"آرام سے بیٹھ کر بتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

نادر خان کرسی کھسکا کر احسان شاہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے قدرے تامل کے بعد احسان شاہ کو بتایا۔ "شاہ جی، تجھے یہ بتانے آیا ہوں چوہدری نور الٰہی کی پہلی گھر والی آئی ہے۔ اس کے ساتھ چوہدری کا پتر ارشاد الٰہی بھی ہے۔"

"چوہدری کی گھر والی اور اس کا پتر۔" احسان شاہ سخت حیرت زدہ ہوا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "دونوں کہاں ہیں؟ کدھر ہیں؟"

مہربان علی نے بھی حیران و پریشان ہو کر نادر خان کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔

"دونوں آج شام کو آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بندہ اور ہے۔ اس کا نام لالی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہی چوہدری کی گھر والی اور اس کے پتر کو لایا ہے۔" نادر خان نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "میں نے تینوں کو مہمان خانے میں ٹھہرا دیا ہے۔"

"کس لیے آئے ہیں؟ اس بارے میں انھوں نے کچھ بتایا؟" احسان علی شاہ نے دریافت کیا۔

"چوہدری کے وارث کی حیثیت سے اس کی زمیں داری اور جائیداد پر کبضہ کرنے آئے ہیں۔"

"کیا ثبوت کہ وہ چوہدری کے وارث ہیں؟" مہربان علی نے جرح کرنے کے انداز میں نادر خان سے سوال کیا۔ "ان کے پاس وراثت کا سرٹیفکیٹ ہے؟ کوئی اور ایسی دستاویز جس سے یہ ثابت ہو سکے وہ چوہدری کی بیوہ ہے۔ ارشاد الٰہی اس کا پتر ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اب تک وہ رہے کہاں؟ پہلے کیوں نہیں آئے؟"

"انھوں نے ایسا کوئی ثبوت تو پیش کیا نہیں اور نہ میں نے ان سے کوئی ثبوت مانگا۔" نادر خان نے مہربان علی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے انھیں چوہدری کی زمیں داری کا کبضہ تو دینا نہیں تھا جو ان سے ثبوت مانگتا۔ بیکار میں جھگڑا کھڑا کرنے سے کیا فائدہ؟"

"تو نے ان سے پوچھ تاچھ تو کی ہوگی۔" اس دفعہ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"بالکل کی تھی جی۔" نادر خان نے مستعدی سے جواب دیا۔ "انھوں نے اپنے بارے میں بالکل وہی باتیں بتائیں جو چوہدری بتایا کرتا تھا۔ بلکہ چوہدری سے بھی کچھ زیادہ ہی تفصیل سے بتایا۔"

"یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہوا۔" احسان شاہ مطمئن نہ ہوا۔ "ہو سکتا ہے انھوں نے یہ ساری باتیں کسی سے سن رکھی ہوں۔ چوہدری بھی دوسرے مہاجروں کی طرح اپنے لٹ پٹ کر آنے کے بارے میں سب ہی کو بتایا کرتا تھا۔" اس نے نادر خان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "وہ دھوکے باز

بھی ہو سکتے ہیں۔ تو نے ان کے بارے میں کیا اندازہ لگایا؟"

"دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ وڈے زمیں داروں کی طرح اونچے طرے کی پگ لگائے شان سے آئے ہیں۔ ارشاد الٰہی کی ماں بھی عمدہ شال اوڑھے ہوئے چوہدرانی لگتی ہے۔ پر میرا اندازہ ہے کہ معمولی زمیں دار ہیں۔" نادر خان نے احسان شاہ کو آگاہ کیا۔ "تینوں دھوکے باز تو نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ دھوکے باز تو دراصل چوہدری تھا۔"

"چوہدری دھوکے باز تھا؟" احسان شاہ بہت چکرایا۔

"اس نے تو جی خود کو چوہدری نور الٰہی بنا رکھا تھا۔ اس کا نام تو رحیم داد تھا۔ اسی ضلع کے پنڈ احمد کوٹ کا رہنے والا تھا۔ مہاجر بھی نہیں تھا۔ اس نے تو نصیرپور کبھی دیکھا بھی نہیں جہاں کا چوہدری نور الٰہی تھا۔ وہ تو کئی سال پہلے فوت ہو گیا۔ رحیم داد اس کے کلیم کے کاغذات چرا لایا تھا۔"

"تجھے یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"لالی نے بتائی تھیں۔ وہ رحیم داد کو جانتا ہے۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟"

لالی نے رحیم داد کے بارے میں نادر خان کو جو کچھ بتایا تھا وہ اس نے تفصیل سے احسان علی شاہ کو بتا دیا۔

"وہ اتنا زبردست دھوکے باز اور فریبی تھا یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دیکھنے میں تو بالکل سیدھا سادا لگتا تھا۔" احسان شاہ نے مڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "مہربان، تو نے جو سکیم بنائی تھی وہ تو بیکار ہو گئی۔ اب تو کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔"

احسان شاہ کے بجائے مہربان علی نے نادر خان کو مخاطب کیا۔ "نادر، تو نے ان سے اتنی باتیں ہی کیوں کیں؟ یہ کہہ کر انھیں ٹرخا دیتا کہ زمیں داری اور ساری جائیداد کی شاہ جی کے نام بیع ہو چکی ہے۔ بہت عرصے سے اس کے پاس ہے۔ لکھا پڑھی کرنے کے بعد حاصل کی گئی ہے۔"

"مہربان علی، تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے؟" اس دفعہ بھی نادر خان کا لہجہ تیکھا تھا۔ "میرے اتنا کہہ دینے سے وہ چپ کر کے چلے جاتے؟ یہ اتنی وڈی جائیداد کا معاملہ ہے۔ کوئی بھی دعویدار اس طرح آسانی سے اپنے حق سے دست بردار ہو سکتا ہے؟ اول تو ہمارے پاس کوئی رجسٹری شدہ بیع نہیں۔ انھوں نے دیکھنی چاہی تو کیا دکھائیں گے؟" وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ "شاہ جی، وہ ایسے ہی جائیداد کے دعویدار بن کر نہیں آ گئے۔ وکیل سے مشورہ کر کے آئے

ہیں، بلکہ وکیل کو بھی اپنے ساتھ لانا چاہتے تھے۔ وہ تو عدالت میں چوہدری نور الٰہی کے وارث ہونے کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف مختار نامہ ہے اور وہ بھی جعلی۔"

"مختار نامہ تو بالکل بیکار ہے۔ اس کی اب کوئی کانونی حیثیت نہیں رہی۔" احسان شاہ کے اندر کا جاگیردار بیدار ہو گیا۔ چہرے سے جلال ٹپکنے لگا۔ اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "پر میں نے کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری اپنے پاس رکھنی ہے۔ وہ میں نہیں دینے کا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔"

"برا نہ منائیں جی تو ایک بات کہوں۔" مہربان علی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "چوہدری کی بیوہ سے نکاح کر لیا جائے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔"

"وہ میرے ساتھ نکاح کرنے پر کیوں تیار ہونے لگی اور اگر وہ تیار بھی ہو جائے تو اس سے کیا ملے گا؟" احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "اصلی وارث تو اس کا پتر ہے۔ جائیداد پر بیوہ کا حک تو روپے میں دو آنے برابر بنتا ہے۔" اس نے مہربان علی کی تجویز مسترد کر دی۔ "مجھے تو پوری جائیداد اپنے پاس رکھنی ہے۔"

"تب تو ان سے اس پر بات کی جا سکتی ہے کہ کچھ رکم لے کر وہ اپنے حک سے دست بردار ہو جائیں اور جائیداد شاہ جی کے نام کر دیں۔" مہربان علی نے نادر خان کو مخاطب کیا۔ "نادر، اگر ان سے گل بات کی جائے تو وہ کیا مطالبہ کریں گے؟ تیرا اندازہ کیا ہے؟"

"جائیداد سے تو وہ دست بردار نہیں ہونے کے۔ اگر کسی طرح تیار بھی ہو گئے تو بہت لمبی کیمت مانگیں گے۔" نادر خان نے قیاس آرائی کی۔ "ان کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے۔ وکیل سے مشورہ کر کے آئے ہیں۔"

"کیمت ہی دینی ہے تو جائیدار فروخت کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ میں پہلے ہی ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہوں۔ نیا مہمان خانہ بنوایا ہے۔ حویلی کی مرمت کرائی ہے۔ نیا فرنیچر ڈلوا دیا ہے۔ ٹیوب ویل لگوایا ہے۔" احسان شاہ نے نادر خان کی جانب دیکھا۔ "سارا خرچ تو تیرے ہی ہاتھوں سے ہوا ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ "میں نے اب کچھ نہیں دینا۔ اگر کچھ دینا بھی پڑا تو ان کو ہرگز نہیں دوں گا۔ اپنا کبضہ برکرار رکھنے کے لیے سرکاری افسروں کو دوں گا۔ ان سے تو روز ہی واسطہ پڑتا ہے۔ ان دونوں سے مجھے آگے کیا لینا۔"

مہربان علی اور نادر خان نظریں جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ آتش دان میں انگاروں کی آنچ دھیمی پڑ گئی تھی۔ احسان شاہ نے ہاتھ بڑھا کر پوکر کا چوبی دستہ پکڑا اور انگاروں کو آہستہ آہستہ کریدنے لگا۔ آنچ تیز ہو گئی۔ آتش دان سے ابھرتی ہوئی روشنی سرخی بن کر اس کے چہرے پر دمکنے

گی۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ کچھ دیر بعد نادر خان کی آواز ابھری۔ ”شاہ جی' ان تینوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وہ پوچھیں تو میں کیا جواب دوں؟“

”انھیں جواب کیا دینا۔“ احسان شاہ کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھری۔ اس کا چہرہ خوف ناک نظر آنے لگا۔ ”اب تو ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تینوں کا ٹنٹا ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ لاشیں رات کے اندھیرے میں ادھر کسی گھنے جھنگر میں دبا دی جائیں گی یا نہر میں ڈال دی جائیں گی۔“

نادر خان کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ ”شاہ جی' ایسا نہ سوچ۔“ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ ”وہ ایک نہیں تین ہیں۔ اکٹھے تین بندوں کو ٹھکانے لگانے سے بہت گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔“

”نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مہربان علی نے نادر خان کی تائید کی۔ ”ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ چوری ڈکیتی کا مکدمہ بنوا کر تینوں کو اندر کروا دیا جائے۔“

”سال دو سال بعد تینوں رہا ہو جائیں گے۔ فیر وہی مصیبت سامنے ہو گی۔“ احسان شاہ نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔“

”۳۰۲ کا مکدمہ بنوایا جائے۔“ مہربان علی نے نئی تجویز پیش کی۔ ”اس میں تو تینوں پھانسی سے بھی لٹک سکتے ہیں۔ پھانسی نہ ہوئی تو عمر کید سے تو نہیں بچ سکتے۔“

”دفعہ ۳۰۲ کے تحت کیس بنوانے کے لیے تو کسی کو کتل بھی کروانا پڑے گا۔“ نادر خان نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”ایسا بندہ کون ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو تھانیدار ہی بتا سکتا ہے کہ ضابطے کی کیا کارروائی کی جائے۔ مکدمہ تو اسے ہی بنانا ہو گا۔“ احسان شاہ نے مہربان علی کو مخاطب کیا۔ ”مہربان' تو ایسا کر کل صبح تھانے چلا جا۔ ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان کو یہاں لے آ۔ بہت دبنگ اور حوصلے والا پولیس افسر ہے۔ میرا بہت گہرا یار ہے۔ تجھے تو پتہ ہے میری ہی سفارش پر اسے ادھر تعینات کیا گیا ہے۔ میرا کام تو خوشی خوشی کرے گا۔“

”یہ تو جی میں نے بھی غور کیا ہے' تھانیدار شاہ نواز خان تجھے بہت مانتا ہے۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔“ مہربان علی نے احسان شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”پچھلے اتوار کی شام کو تو وہ ادھر تیرے ہی پاس تھا۔“

”اپنے ایک کام سے آیا تھا۔ ایک چکر میں پھنس گیا ہے۔ اسکے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔“

احسان شاہ نے بتایا۔ "اس کے لیے اوپر بات کرنی ہے۔ معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔"

"ان تینوں کا کانٹا بیچ سے نکل جائے تو سلیمہ بی بی کو چوہدری نور الٰہی کا وارث بنانے کے لیے کوشش کی جائے۔" مہربان علی نے اپنا منصوبہ ایک بار پھر پیش کیا۔ "ان تینوں کی اچانک آمد نے تو سارا پروگرام ہی گڑبڑ کر دیا۔"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں مہربان علی کی سکیم کیا ہے۔ پر شاہ جی' میرا خیال ہے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وکیل سے مشورہ کر لیا جائے۔" نادر خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ مہربان علی کے مقابلے میں اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا۔ "فریق مخالف کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ بھی اپنے وکیل سے کل بات کر کے آئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے پیچھے اور کون کون ہے۔ وہ ایسے ہی تو نہیں چلے آئے۔"

احسان علی شاہ کو نادر خان کی بات دل لگتی معلوم ہوئی۔ اس میں استدلال تھا' وزن تھا۔ اس نے نادر خان کی تائید کرتے ہوئے مہربان علی کی جانب دیکھا۔ "نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وکیل سے پہلے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ مہربان' تو کل وکیل کے پاس بھی چلا جا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لیتا آ۔ تھانیدار بھی ادھر ہی ہو گا۔ دونوں سے تفصیلی بات کرنے کے بعد ہی طے کرنا ہو گا آگے کیا کیا جائے۔ اس سے پہلے ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔" اس کے بدلے ہوئے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ نادر خان نے اس کی سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔ غیظ و غضب اب سرد پڑ چکا تھا۔ معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ غالب آ چکی تھی۔ احسان علی شاہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے' بہت سوچ سمجھ کے کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی مصیبت گلے پڑ جائے۔"

مہربان علی کو احسان شاہ کا بدلا ہوا رویّہ پسند نہ آیا۔ اور اس لیے بھی پسند نہ آیا کہ اسے بدلنے میں نادر خان کی رائے کو دخل تھا جسے وہ کم تر اور کوڑھ مغز سمجھتا تھا۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتا تھا کہ اس کی رائے کو بالادستی حاصل نہ ہو۔ وہ احسان شاہ کی نظروں میں سرخ رو نہ ہو جائے۔ مگر احسان شاہ نے اس وقت اس طرح دو ٹوک بات کی تھی کہ اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ احسان شاہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! جی۔ جی تیری مرضی۔ میں کل وکیل کے پاس بھی چلا جاؤں گا اور اسے اپنے ہم راہ لانے کی کوشش کروں گا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے جی۔" نادر خان نے احسان علی شاہ سے دریافت کیا۔

احسان علی شاہ نے ضروری ہدایات دے کر نادر خان کو رخصت کر دیا۔

☆

سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ کہر کی دھند چھٹ چکی تھی۔ سرما کی ہلکی بسنتی دھوپ پگھلے ہوئے سونے کی مانند ہر طرف پھیلی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد لالی اور ارشاد الٰہی مہمان خانے کے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ناشتے میں پراٹھے تھے جن پر تازہ مکھن رکھا تھا۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ آم کا اچار تھا اور لسی سے لبالب بھرے ہوئے کانسی کے اونچے اونچے گلاس تھے۔ رات کے کھانے کی طرح ناشتا بھی انھوں نے رغبت سے کیا تھا اور اب کرسیوں پر اطمینان سے بیٹھے دھوپ کی خوش گوار حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ارشاد الٰہی کی ماں کمرے کے اندر ہی تھی۔ کچھ دیر قبل نادر خان کی بیوی جنت اس کے پاس آگئی تھی۔ ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی کی کمر میں درد کی کسک رہ رہ کر اٹھ رہی تھی۔ وہ لحاف اوڑھے خاموش لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کا غبار چھایا تھا۔

جنت نے اس کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے خیریت دریافت کی۔ کلثوم بی بی نے کراہتے ہوئے بتایا۔ ”کمر میں سخت درد ہے۔ سردی میں درد اسی طرح بڑھ جاتا ہے۔ آج کچھ زیادہ ہی ہے۔“ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر ہولے ہولے دبانے لگی۔

جنت نے فوراً ایک نوکرانی کو بلایا۔ اپنے گھر سے تیل کی شیشی اور پیتل کی کٹوری منگوائی۔ کٹوری میں تیل ڈالا۔ نوکرانی کو ہدایت کی کہ تیل چولہے کی آنچ پر رکھ کر گرم کرلائے۔ نوکرانی تیل گرم کر کے لے آئی تو جنت نے اس میں انگلی ڈبو کر اندازہ لگایا کہ تیل زیادہ گرم تو نہیں ہے۔ تیل نیم گرم تھا۔ جنت نے نوکرانی سے کہا۔

”چوہدرانی کی کمر میں سخت درد ہے۔ مریم تو تیل سے کمر کی مالش کر دے۔“

مریم نے تیل کی کٹوری سنبھالی اور کلثوم بی بی کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ مالش کرنے لگی۔ مالش سے کلثوم بی بی کو بہت آرام ملا۔ جنت کرسی پر بیٹھی کلثوم بی بی کی دل جوئی کرتی رہی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

مالش کرانے کے بعد کلثوم بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جنت کی ہدایت پر مریم نے کلثوم بی بی کے سر میں تھوڑا سا تیل ڈال کر سر اور بالوں میں کھپایا۔ کنگھی سے بالوں کو سنوارا اور چوٹی باندھنے لگی۔

جنت تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ کلثوم بی بی اس کے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر ہوئی۔ جلد ہی آنے پر اصرار کیا۔

مریم خاموش بیٹھی اس کی چوٹی گوندھتی رہی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔

کمرے کے باہر صحن میں لالی اور ارشاد الٰہی ابھی تک کرسیوں پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ ان کے قریب ہی گلاب کے پھولوں کا تختہ تھا۔ سفید اور عنابی گلاب ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے شاخوں میں جھول رہے تھے۔ ان کی پنکھڑیوں پر ابھی تک شبنم کے قطرے چمکیلی دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

لالی اور ارشاد الٰہی کو نادر خان کا انتظار تھا۔ مگر وہ ابھی تک ان کے پاس آیا نہیں تھا۔ دھوپ کی تمازت رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں کے چہرے تمتمانے لگے اور پسینے کی نمی پیشانی پر محسوس ہونے لگی۔

لالی نے اکتا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ارشاد الٰہی کو مخاطب کیا۔ "یار یہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ باہر نکل کر اپنی زمیں داری تو دیکھیں۔"

"نادر خان کا انتظار نہیں کرے گا؟"

"اتنا انتظار تو کر لیا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ باہر ہی مل جائے۔"

ارشاد الٰہی نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونون آگے بڑھے اور مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔ گاؤں کی رڑی میں پہنچے۔ اس وسیع میدان میں مزارعے اور کمی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ سب انھیں مڑ مڑ کر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سویرے ہی سے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک بوڑھے نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"سنا ہے جی' تسی پنڈ کے نئے زمیں دار ہو۔"

لالی نے ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ چوہدری نور الٰہی مرحوم کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی ہے۔ اپنے پیو کی زمیں داری سنبھالنے آیا ہے۔ اب یہ ادھر ہی رہے گا۔ اس کی ماں بھی ساتھ ہی آئی ہے۔"

"ہن جی ضرور سنبھالے اپنے پیو کی زمیں داری۔" بوڑھے نے مسکرا کر خوش نودی کا اظہار کیا۔

ارشاد الٰہی کی گردن تن گئی۔ سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ لالی نے بھی چہرے پر رعب اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

دونوں گردنیں اونچی کیے رڑی سے گزر کر کھیتوں کی طرف نکل گئے اور ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک راستے پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ یہ اتنی کشادہ پگڈنڈی تھی جس پر دو آدمی

اطمینان سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ اس کے دونوں جانب کھیت تھے۔ ان کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ربیع کی فصل کی بوائی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ گندم اور جو کے نرم و نازک پودوں نے کھیتوں میں سبز مخمل بچھا دی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں سے پودے بار بار جھومتے۔ کھیتوں میں سبزے کی لہریں اٹھتیں۔

کہیں کہیں نکّے کے پاس بیٹھے ہوئے مزارعے آڈ کے پانی سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر رہے تھے۔ لالی اور ارشاد الٰہی بے نیازی سے گردن اٹھائے چپ چاپ ان کے قریب سے گزرے۔

دونوں کھیتوں کے آس پاس کچھ دیر گھومتے پھرتے رہے' پھر باغوں کی طرف چلے گئے۔ آم کے اکا دکا درختوں میں بور آگیا تھا۔ سفید سفید پھولوں کے گچھوں پر شہد کی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ چند درختوں میں کیڑا لگ گیا تھا۔ ایک ادھیڑ مالی ایسے پودوں پر کیڑا مار دوا چھڑک رہا تھا۔ دونوں کو اس نے سلام کیا اور زیادہ مستعدی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

مالٹے کے درخت دیکھ کر دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ سرخ سرخ مالٹے شاخوں سے جھولتے ہوئے بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ لالی نے ہاتھ اونچا کر کے ایک مالٹا توڑا اور ارشاد الٰہی کی جانب بڑھا کر بولا۔ "شادے' یہ مالٹا دیکھ رہا ہے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "باغ تو کھیتوں سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ یار بہت وڈی زمیں داری ہے۔ زندگی بھر عیش کرے گا۔"

مالٹے کے ایک درخت کی اوٹ سے باغ کا رکھوالا نمودار ہوا۔ دونوں کے قریب آیا اور حیرت زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" اس نے ارشاد الٰہی کی سمت اشارہ کیا۔ "تو نے اسے نہیں پچھانا؟ یہ کوٹلہ ہر کشن کا نیا زمیں دار ہے۔ چوہدری نور الٰہی کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی۔"

رکھوالے نے فوراً ارشاد الٰہی کو سلام کیا۔ گھگیا کر معذرت کرنے لگا۔ "معاف کرنا جی۔ میں نے پچھانا نہیں۔ پہلی بار ادھر آئے ہو ناں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ سرخ مالٹا شاخ سے توڑا اور ارشاد الٰہی کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس بار تو جی فصل پچھلے برس سے بھی چنگی ہے۔"

ارشاد الٰہی فوراً زمیں دار بن گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر خوش نودی کا اظہار کیا۔ دونوں آگے بڑھ گئے۔ رکھوالا ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لالی اور ارشاد الٰہی دیر تک باغوں میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ جب تھک گئے تو واپس مہمان خانے میں چلے گئے اور سیدھے اس کمرے میں پہنچے جس میں ارشاد الٰہی اپنی ماں کے ساتھ ٹھیرا تھا۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ ارشاد الٰہی کی ماں موجود نہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ لالی نے لہنا کو

بلایا۔ کلثوم بی بی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ جنت کے ہم راہ حویلی دیکھنے گئی ہے۔

لالی نے مسکرا کر لہنا سے کہا۔ "لہنے، بہت پیاس لگی ہے ٹھنڈی لسی پلا۔"

لہنا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ابھی لایا جی۔" وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

لہنا ذرا ہی دیر بعد لسی سے بھرے ہوئے دو گلاس لایا اور دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ لالی اور ارشاد الٰہی لسی پینے لگے۔ لہنا نے دریافت کیا۔ "کوئی اور حکم جی؟"

"نہیں، اب تو ٹر جا۔" اس دفعہ ارشاد الٰہی بولا۔

لہنا چلا گیا۔ دونوں لسی پینے لگے۔ اسی اثناء میں نادر خان آگیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے معذرت کی۔ "معاف کرنا جی۔ میں سویرے نہیں آسکا۔ رات کو شاہ جی سے ملنے پیراں والہ چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس لیے دیر سے سو کر اٹھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟"

"ویسے تو بہت آرام ہے۔ پر کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔" لالی نے بتایا۔ "ہم اپنے ساتھ کپڑے لتے تو لائے نہیں تھے۔ ادھر ٹھیرنے کا ارادہ تو تھا نہیں۔ سوچا تھا شاہ جی سے گل بات کر کے واپس چلے جائیں گے۔ بعد میں آرام سے آئیں گے۔"

"کپڑوں کی فکر نہ کریں جی۔ نئے تیار ہو جائیں گے۔ حویلی کا اپنا درزی ہے۔ میں اسے بھیج دوں گا۔ وہ تینوں کی ناپ لے لے گا۔ میں آج ہی شہر جا کر کپڑا لے آوں گا۔ درزی سے کہوں گا فٹا فٹ کپڑے سی دے۔ کل شام تک کپڑے تبدیل کرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"کوئی فکر کی گل نہیں۔" ارشاد الٰہی نے مسکرا کر کہا۔ "ایک روز اور انھی کپڑوں میں گزارہ کر لیں گے۔"

"تو شاہ جی کے پاس گیا تھا۔ تیری اس سے کیا گل بات ہوئی؟" لالی نے فوراً وہ سوال اٹھایا جس کا جواب جاننے کے لیے وہ گزشتہ رات سے بے چین تھا۔

"وہ بہت مصروف تھا۔ کچھ سرکاری افسران اس کی حویلی میں ٹھیرے ہیں۔ انھی کے ساتھ باتوں میں لگا ہوا تھا۔" نادر خان نے صحیح صورت حال بتانے سے گریز کیا۔ گول مول جواب دیا۔

"تب ہی تو مجھے ادھر اتنی دیر ہو گئی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے بارے میں تیری شاہ جی سے گل بات ہی نہیں ہوئی۔"

ارشاد الٰہی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"بات تو ہوئی تھی' پر زیادہ تفصیل سے نہیں ہوئی۔" نادر خان نے مطلع کیا۔ "شاہ جی نے کہا ہے کہ وہ تم سے ملے گا اور آرام سے بیٹھ کر گل بات کرے گا۔"

"تو نے کیا اندازہ لگایا؟" لالی نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔ "ارشاد الٰہی کو زمین داری دینے میں کوئی جھگڑا ٹنٹا تو نہیں کھڑا کرے گا؟"

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔" نادر خان نے کھل کر بات نہ کی' ٹالنے کی کوشش کی۔ "وہ بہت وڈا جگیردار ہے۔ اس کی زمیں داری ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ زرعی اصلاحات کے تحت خاندان کے سارے ہی بندوں میں بانٹنے کے بعد بھی اس نے بہت زیادہ اراضی حکومت کو دے دی۔" اس نے قدرے تامل کے بعد نرم لہجے میں کہا۔ "کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری تو اس نے اس لیے سنبھال لی تھی کہ چوہدری سے اس کی بہت گہری یاری تھی۔"

"تب تو چوہدری نور الٰہی کے وارث کی حیثیت سے اسے ارشاد الٰہی کو ادھر کی زمیں داری دے دینی چاہیے۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"فکر نہ کریں جی۔" نادر خان نے دونوں کو اطمینان دلایا۔ "سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔ شاہ جی کو جیسے ہی فرصت ملی وہ تم سے ملنے خود ادھر آئے گا۔ تب تک ادھر آرام سے ٹھیریں۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"کپڑے لتے کا بندوبست ہو جائے تو ادھر ٹھیرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔" لالی نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"وہ تو جی کل شام تک ہو جائے گا۔" نادر خان نے یقین دلایا۔ "اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں یہاں سے اٹھ کر کپڑا لینے شہر چلا جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے ٹھٹکا۔ مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ "چوہدرانی کی دیکھ بھال کے لیے میں نے اپنی گھر والی کو لگا دیا ہے۔ وہ چوہدرانی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔"

نادر خان باہر چلا گیا۔

نادر خان سے گفتگو کرنے کے بعد لالی اور ارشاد الٰہی خاصے مطمئن ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں سے مسرت اور شادمانی عیاں تھی۔ وہ اپنے تاریک ماضی سے نکل کر روشن مستقبل میں داخل ہونے کے سہانے خواب دیکھ رہے تھے۔

☆

حویلی کے پچھواڑے دور تک پھیلا ہوا وسیع میدان تھا جو مویشیوں کی چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ جوہ تھا جس میں کیکر اور شیشم کے اکا دکا درخت تھے۔ خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہری بھری گھاس تھی۔ کہیں چھدری کہیں خوب گھنی۔ جوہ کے ایک طرف مویشیوں کا باڑا تھا جس کی چار دیواری کا ایک حصہ پچھلی برسات میں گر گیا تھا۔ پہلے اس جگہ اسکول تھا۔ یہ اسکول جمیلہ نے قائم کیا تھا۔ اس میں گاؤں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ جمیلہ بچوں کو خود پڑھاتی تھی اور اسکول کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ وہ اسے باقاعدہ سرکاری طور پر تسلیم شدہ پرائمری اسکول بنانا چاہتی تھی۔ مگر جب وہ کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر اپنے بڑے بھائی ہردیال کے ہم راہ سرحد پار چلی گئی تو عرصہ دراز تک اسکول کی عمارت ویران پڑی رہی۔ اسکول بند ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے چلانے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ احسان علی شاہ نے رحیم داد کے قتل کے بعد کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری اور تمام جائیداد پر قبضہ کیا تو اسکول کو مویشیوں کا باڑا بنا دیا۔

باڑے کی دیوار سے متصل ٹین کی چھت کا سائبان تھا۔ سائبان کے نیچے رحیم داد مرحوم کی جیپ کھڑی تھی جو اب عام طور پر نادر خان کے استعمال میں رہتی تھی۔

جیپ تو موجود تھی مگر ڈرائیور غائب تھا۔ نادر خان سائبان کے سامنے کھڑا ڈرائیور کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ لالی، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کے نئے لباس سلوانے کے لیے کپڑا لینے شہر جانا چاہتا تھا۔ ڈرائیور تو نہیں آیا۔ البتہ جوہ کے درمیان سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی پر لہنا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باڑے کی جانب آ رہا تھا۔

لہنا قریب پہنچا تو نادر خان نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”لہنے! تو مہمان خانے سے ادھر کیسے آ گیا؟“

”میں تو تجھے دیر سے پنڈ میں ڈھونڈ رہا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟“

”تجھ سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔“

”ایسی کیا گل کرنی تھی جو تو مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا؟“ نادر خان ہنوز حیرت زدہ تھا۔

”یہ جو ارشاد الٰہی مہمان خانے میں ٹھیرا ہے، کیا ادھر کا زمیں دار بن گیا ہے؟“ لہنا نے دریافت کیا۔

”ابھی تو نہیں بنا۔“ نادر خان نے جواب دیا۔ ”پر تجھے کیسے پتہ چلا؟“

”حد ہو گئی جی۔“ لہنا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”سارے پنڈ میں چرچا ہے کہ ارشاد الٰہی پنڈ کا نیا

زمین دار ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔" نادر خان نے بے زاری سے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تو ارشاد الٰہی کو کب سے جانتا ہے؟"

"میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔" نادر خان نے ایک بار پھر بے زاری کا اظہار کیا۔ "پر تو ایسی بات کیوں پوچھ رہا ہے؟ مہمان خانے میں جا کر اپنا کام کر۔ مہمانوں کو آرام پہنچا۔ انھیں کوئی تکلیف شکیف نہ ہو۔"

"وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔ میں تو تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ ارشاد الٰہی کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔"

"تو اسے پہلے سے جانتا ہے؟" نادر خان نے لہنا کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ "تب تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ وہ چوہدری نور الٰہی کا پتر ہے۔"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔ پر اتنا پتہ ہے کہ ارشاد الٰہی ایک بار پہلے بھی ادھر آ چکا ہے۔"

"وہ ادھر پہلے بھی آیا تھا؟ کب آیا تھا؟" نادر خان نے لہنا سے پوچھا۔ "میں نے کل رات سے پہلے اسے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"پچھلے سال بھی انھی دنوں وہ یہاں آیا تھا۔ تو اس روز لہور گیا تھا۔" لہنا نے بتایا۔ "میں حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے ادھر کے زمیں دار کے بارے میں پوچھا۔ اتنے میں شاہ جی کی گڈی حویلی کے آگے آ کر رکی۔ شاہ جی نے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ اس کے کپڑے لتے گندے اور پھٹے پرانے تھے۔ سر کے بال بھی گندے تھے۔ دیکھنے میں بھک منگا لگتا تھا۔ شاہ جی نے بھی اسے بھک منگا سمجھا۔ جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے چپ کر کے نوٹ لے لیا اور بنا کچھ کہے سنے چلا گیا۔"

"تجھے دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔" نادر خان کو یقین نہیں آیا۔ "چوہدری ارشاد الٰہی تو کسی طرف سے بھکاری نہیں لگتا۔"

"تجھے پتہ نہیں۔ وہ بھکاری ہی ہے۔" لہنا نے اس دفعہ ذرا جما کے کہا۔ "میں اسے اور اس کی ماں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" نادر خان نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ تیکھے لہجے میں ڈپٹ کر کہا۔ "آگے ایسی گل بات نہ کرنا۔ جا کر اپنا کام کر۔"

"نراض نہ ہو۔ پہلے میری پوری گل تو سن لے۔" لہنا نے نرم لہجے میں بتایا۔ "میں کوئی غلط گل

بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ ارشاد الٰہی کے یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میں جوند سنگھ والا گیا۔ تیں نوں پتہ ہے ادھر میرا چاچا رہتا ہے۔ میں اسی کے پاس گیا تھا۔ میں نے دیکھا بس سٹاپ پر ارشاد الٰہی بھیک مانگ رہا تھا۔ ساتھ میں اس کی ماں بھی تھی۔ وہ ایک درخت کے نیچے چادر بچھائے بیٹھی تھی۔ دونوں ہی بھیک مانگ رہے تھے۔"

نادر خان اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گیا۔ اس۔ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "لبنے! تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں جی۔" لبنا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "پچھلے مہینے میں جوند سنگھ والا گیا۔ تب بھی ارشاد الٰہی اپنی ماں کے ساتھ بس سٹاپ پر بھیک مانگ رہا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ساتھ میں میرا چاچا بھی تھا۔ اس نے بھی دونوں کو بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ میرے چاچا سے پوچھ لے۔ میں کل ہی جوند سنگھ والا جا کر اسے ادھر لے آؤں گا۔ وہ تو دونوں کو ٹھیک طرح پہچانتا ہے۔ روز ہی ان کو بھیک مانگتے بس سٹاپ پر دیکھتا ہے۔"

نادر خان نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں سامنے سے ڈرائیور آتا ہوا نظر آیا۔ نادر خان نے مڑ کر لبنا کی جانب دیکھا۔ "لبنے! تو جا کر مہمان خانے میں اپنا کام کر۔ مہمانوں کو پہلے کی طرح آرام سے رکھ۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو بالکل پتہ نہ چلے کہ تو ان کو جانتا ہے۔ اور کسی سے بھی ان کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔"

"تیں نوں مہمان خانے نہیں جانا؟" لبنا نے پوچھا۔

"پہلے شہر جانے کا ارادہ تھا۔ پر اب شاہ جی کے پاس پیراں والہ جاؤں گا۔" نادر خان نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

ڈرائیور اب قریب آ چکا تھا۔ لبنا نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

☆

دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی چمک دمک ماند پڑ گئی تھی۔ کلثوم بی بی مہمان خانے میں واپس آئی۔ لالی اور ارشاد الٰہی کمرے میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

کلثوم بی بی کا دل حویلی میں ایسا لگا کہ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صحن میں چارپائی ڈلوائی۔ اجلا بستر لگوایا اور ٹانگیں پسار کر اطمینان سے لیٹ گئی۔ دھوپ کی ہلکی ہلکی حدت سے اسے بہت سکون ملا۔ ایک نوکرانی اس کے قریب بیٹھ گئی اور آہستہ

آہستہ کمر اور پنڈلیاں دبانے لگی۔ عرصہ دراز بعد اسے اتنی آسائش نصیب ہوئی تھی۔ ایسا آرام ملا کہ آنکھ لگ گئی۔ وہ دیر تک سوتی رہی۔ آخر جنت نے ہولے ہولے جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ درزی کپڑوں کی ناپ لینے آیا تھا۔ لالی اور ارشاد الٰہی کی ناپ وہ مہمان خانے میں جا کر پہلے ہی لے چکا تھا۔ جنت نے کلثوم بی بی کی ناپ لے کر درزی کو بتا دی۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ جلد سے جلد کپڑے تیار کر دے۔

کلثوم بی بی کمرے میں پہنچ کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی تو لالی نے شکوہ کیا۔ "بے بے' تو حویلی میں جا کر ایسی بیٹھی کہ دوپہر کی روٹی کھانے بھی ادھر نہ آئی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "لگتا ہے حویلی تجھے بہت پسند آئی۔"

"ہاں جی بہت پسند آئی۔" کلثوم بی بی کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی۔ "بہت شاندار ہے۔ بالکل محل لگتی ہے۔ یہ وڈے وڈے کمرے۔ ایک نہیں کئی ہیں۔ ہر کمرے میں کپڑے لتے رکھنے کے لیے الماریاں' میزیں' کرسیاں' اچی اچی منجیاں۔ ان پر اجلے اجلے بستر لگے ہوئے۔ کیا نہیں ہے؟" اس نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "میں نے تو اپنے لیے ایک کمرہ پسند بھی کر لیا ہے۔"

"نوکرانیاں کیسی ہیں؟" ارشاد الٰہی نے دریافت کیا۔

"مریم تو ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ دیر تک بیٹھی میری کمر دباتی رہی۔" کلثوم بی بی نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "دوسری تو ایک دم بڈ حرام لگتی ہے۔ مریم کے سوا سب کو نکال کر دوسری نوکرانیاں لگاؤں گی۔"

"اماں' تو نے کسی نوکرانی سے جھگڑا تو نہیں کیا؟" ارشاد الٰہی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تیرا غصہ بہت خراب ہے۔"

"وے میں پاگل ہوں۔" کلثوم بی بی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو چپ کر کے سب کو دیکھتی رہی۔ زمیں داری اپنے پاس آجائے تب ان سے پوچھوں گی۔"

"زمیں داری تو ملنی ہی ملنی ہے۔ تو اس کی فکر نہ کر۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ "نادر خان دوپہر کو آیا تھا۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" ارشاد الٰہی کی ماں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"وہ کل رات شاہ جی سے ملنے پیراں والہ گیا تھا۔ کہتا تھا دو چار روز میں شاہ جی ادھر آئے گا۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" لالی نے کلثوم بی بی کو بتایا۔

"زمیں داری اور جائیداد تو مل جائے گی ناں؟"

"کیوں نہیں ملے گی؟" لالی نے کلثوم بی بی کو اطمینان دلایا۔ "شاہ جی ادھر آکس لیے رہا ہے۔"

کلثوم بی بی خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے مسرت جھلکنے لگی۔ عمدہ غذا کھانے کو ملی اور آرام و آسائش سے رہنا نصیب ہوا تو دو ہی دن میں اس کا روپ رنگ نکھر گیا۔ غربت و افلاس کا غبار مٹ گیا اور بجھی بجھی بے رونق آنکھوں میں چاندنی اتر آئی۔

لالی نے اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "بے بے تو تو ابھی سے وڈی زمیں دارنی لگ رہی ہے۔"

"زمیں داری تو تجھے اور شادا کو سنبھالنی ہے۔ "میں نے اس سے کیا لینا۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے بے نیازی کا اظہار کیا۔

"شادے!" لالی نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "آگے میں تجھے چوہدری کہوں گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "ہاں تو چوہدری جب تو کوٹلہ ہرکشن کا زمین دار بن جاتا تو مجھے اپنا منیجر لگا لینا۔"

"نادر خان کا کیا بنے گا؟" ارشاد الٰہی کی ماں نے فوراً اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "اس کی گھر والی جنت نے تو مجھے بہت آرام پہنچایا۔ میری ایسی دیکھ بھال کرتی ہے کہ تجھے کیا بتاؤں۔"

"اماں، تو اس کی فکر نہ کر۔" ارشاد الٰہی نے ماں کو اطمینان دلایا۔ "زمیں داری مل جائے تو اس کے بارے میں سوچیں گے۔ لالی کے ساتھ مل کر تو مجھے زمیں داری چلانی ہے۔"

تینوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ آئندہ کے منصوبے بناتے رہے۔

شام ہو گئی۔ مگر نادر خان نہ آیا۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ رات کالی کاجل ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ کوٹلہ ہرکشن سو گیا۔ لیکن نادر خان نظر نہ آیا۔

صبح ہوئی۔ کلثوم بی بی ناشتے سے فارغ ہوتے ہی حویلی میں چلی گئی۔ لالی اور ارشاد الٰہی کے لباس اتنے میلے کچیلے ہو گئے تھے کہ مہمان خانے سے باہر جاتے ہوئے انھیں عار محسوس ہوا۔ انھوں نے صحن میں کرسیاں ڈلوائیں اور دھوپ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دونوں کی حجامت بھی بڑھ گئی تھی۔ لالی نے لہنا کو بلایا۔ اس سے دریافت کیا۔ "لہنے، حویلی کا درزی ہے تو نائی بھی ہو گا؟"

"کیوں نہیں ہے جی، بالکل ہے۔" لہنا نے جواب دیا۔ "پر وہ کل شام سے جیون شاہ گیا ہوا ہے۔"

"یہ جیون شاہ کدھر ہے؟" اس دفعہ ارشاد الٰہی نے دریافت کیا۔

"عارف والا روڈ پر ہے جی۔ ادھر اس کی بہن ہے۔ اسے ملنے گیا ہے۔" لہنا نے بتایا۔ "کل صبح نہ آیا تو شام کو ضرور واپس آجائے گا۔"

"ادھر اور کوئی نائی شائی نہیں ہے؟" لالی نے ہاتھ سے رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ "داڑھی بنوانی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔ سر کے بال بھی کٹوانے ہیں۔"

لہنا نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ "فکر نہ کریں جی۔ میں پنڈ کے نائی سینا کو لے کر آتا ہوں۔ سینا بھی بہت ہشیار نائی ہے۔"

لہنا چلا گیا۔ دوپہر کو کھانا لے کر آیا تو لالی نے نائی کے بارے میں پوچھا۔ لہنا نے نظریں جھکا کر کہا۔ "سینا تو جی بیمار ہے۔ اسے بکھار ہے۔ ٹھیک ہو گیا تو کل بلا لاؤں گا۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

دو روز گزر گئے۔ لیکن نادر خان نظر نہ آیا۔ نہ جنت کو اس کے بارے میں کچھ معلوم تھا نہ لہنا کو۔ بار بار پوچھنے پر بھی دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لالی اور ارشاد الٰہی سخت پریشان تھے۔ ان کے لباس پچھلے پانچ روز میں بہت میلے کچیلے ہو گئے تھے۔ حجامت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ابھی تک نہ حویلی کا نائی جیون شاہ سے واپس آیا تھا اور نہ گاؤں کے نائی سینا کا بخار اترا تھا۔ کچھ تو سردی کے باعث اور کچھ اجلا لباس نہ ہونے کے سبب دونوں غسل بھی نہ کر سکے تھے۔ وہ کوٹلہ ہرکشن میں زمین دارانہ کروفر اور آن بان سے داخل ہوئے تھے۔ اب اپنی پرانی جون میں آگئے تھے۔ وضع قطع سے کسی بھٹے کے جمعدار معلوم ہوتے تھے۔

☆

جمعرات کی شام تھی۔ لالی اور ارشاد الٰہی کمرے میں بیٹھے نادر خان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ باہر کہر کا ہلکا نیل گوں دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ارشاد الٰہی کی ماں بھی کمرے میں موجود تھی۔ اسے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ رضائی اوڑھے پلنگ پر دو تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔

"نادر خان کدھر چلا گیا؟" ارشاد الٰہی کی ماں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا "اب تک واپس نہیں آیا۔"

"پتہ نہیں کدھر چلا گیا۔ کسی کو بتا کر بھی نہیں گیا۔" لالی نے اسے بتایا۔ "لگتا ہے شاہ جی کے پاس گیا ہے۔ اس نے روک لیا ہو گا۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" ارشاد الٰہی نے بھی اس کی تائید کی۔ "ورنہ وہ اب تک ضرور آجاتا۔ اسے

گئے ہوئے کئی روز ہو گئے۔"

نادر خان کے بارے میں تینوں کئی روز سے ایسی ہی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ لالی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک مہمان خانے کے باہر جیپ کے ہارن کی تیز آواز شام کے سناٹے میں ابھری۔ ہارن کی آواز سنتے ہی لبھا اپنی کوٹھری سے نکلا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ارشاد الٰہی نے لالی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے نادر خان واپس آ گیا۔"

"ہو سکتا ہے احسان علی شاہ بھی اس کے ساتھ ہی آیا ہو۔" لالی نے ارشاد الٰہی کے خیال سے اتفاق کیا۔ اپنی لوئی کھول کر دوبارہ جسم کے گرد لپیٹی اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ارشاد الٰہی بھی اپنی لوئی درست کرنے لگا۔

لبھا اندھیرے سے نکل کر دروازے کی دہلیز پر نمودار ہوا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "پولسے آئے ہیں۔"

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "پولیس والے یہاں کیوں آئے ہیں؟"

ارشاد الٰہی بھی گھبرا گیا۔

"پتہ نہیں جی، کیوں آئے ہیں؟" لبھا نے بتایا۔ "دونوں کو باہر بلاتے ہیں۔"

لالی چند لمحے دم بخود بیٹھا رہا۔ پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی اپنی اونچے طرے کی پگ اٹھا کر سر پر رکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔

"شادے، تو بھی میرے ساتھ آ۔"

ارشاد الٰہی نے بھی اپنی پگ اٹھا کر سر پر رکھی اور لوئی سنبھالتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی آگے بڑھا۔ ارشاد الٰہی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے اور مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔ انھوں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ دھندلی دھندلی کہر میں لپٹے ہوئے پانچ پولیس والے سامنے کھڑے تھے۔ دو پولیس کی یونیفارم میں تھے اور تین سادہ لباس میں تھے۔ ان کے عقب میں دو جیپیں کھڑی تھیں۔

"دونوں میں لالی کون ہے؟" ایک پولیس والے نے پوچھا جو ہیڈ کانسٹیبل معلوم ہوتا تھا۔

لالی نے آگے بڑھ کر بتایا۔ "میرا نام جی لالی ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر دریافت کیا۔ "کیسے آنا ہوا جی؟"

"اندر جا کر بیٹھ جا۔" ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ اٹھا کر ایک جیپ کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں جانا ہے؟" لالی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ آگے نہیں بڑھا۔

"تھانے چلنا ہے۔"

"تھانے کیوں چلنا ہے؟"

"یہ وہیں پہنچ کر پتہ چل جائے گا۔"

"مجھے تھانے کیوں لے جا رہے ہو؟ میں نے کوئی جرم کیا ہے؟" لالی جرح کرنے لگا۔ "میرے خلاف کوئی وارنٹ شارنٹ ہے؟"

"اوئے بکواس نہ کر۔" ہیڈ کانسٹیبل نے ڈپٹ کر کہا۔ اور جھپٹ کر لالی کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس نے پلٹ کر قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔ "فضل دین اسے جیپ میں بٹھا۔ لیکن پہلے اس کی تھوڑی گرمی اتار دے۔ بہت کنون چھانٹتا ہے۔"

لالی تھپڑ کھا کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ فضل دین نے بڑھ کر لالی کی گردن دبوچی۔ زور سے دھکا دیا اور پینترا بدل کے ایسی کراری لات ماری کہ لالی لڑکھڑا کر گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی اونچے طرے کی پگ بھی ایک طرف جا کر گری۔ دو کانسٹیبلوں نے اسے اٹھایا اور دھکے دیتے ہوئے جیپ کے قریب لے گئے۔ یہ رحیم داد مرحوم کی جیپ تھی جسے لالی پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دونوں کانسٹیبلوں نے لالی کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ ایک کانسٹیبل اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ارشاد الٰہی سہما ہوا کھڑا تھا اور لالی کی تذلیل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "اوئے تو کیوں کھڑا ہے۔ تیں نوں تھانے نہیں جانا؟" وہ ایک بار پھر فضل دین کی جانب متوجہ ہوا۔ "اس کے بھی ٹھڈ لگا۔ کیسا شان سے اکڑا کھڑا ہے۔"

فضل دین نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے زور زور سے دو لاتیں ایسی ماریں کہ ارشاد الٰہی ڈگمگا کر گرا۔ اٹھا اور پھر گرا۔ اس کی اونچے طرے کی پگ بھی قریب کی ایک جھاڑی میں جا کر گری۔ اسے بھی دھکے دے کر دوسری جیپ میں پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ یہ احسان علی شاہ کی جیپ تھی اور ڈرائیور بھی اسی کا تھا۔

لالی اور ارشاد الٰہی جیپوں میں بٹھا دیے گئے تو ایک کانسٹیبل مہمان خانے میں گیا۔ واپس آیا تو ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی اس کے ہم راہ تھی۔ وہ اس قدر حواس باختہ تھی کہ کئی بار ٹھوکر کھا کر گری۔ وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اسے ارشاد الٰہی کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ایک کانسٹیبل بھی دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسرا آگے کی نشست پر ڈرائیور کے قریب بیٹھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اس جیپ میں بیٹھ گیا جس میں لالی موجود تھا۔

ڈرائیوروں نے انجن اسٹارٹ کئے۔ دونوں جیپیں آگے بڑھیں۔ لہنا مہمان خانے کے دروازے پر سہما ہوا کھڑا تھا اور جیپوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو آن کی آن میں کہر کے دھند لکے میں اوجھل ہو گئیں۔

☆

حوالات میں اندھیرا تھا۔ سیلن تھی اور سخت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ لالی' ارشاد الٰہی اور اس کی ماں' تینوں دیواروں سے لگے سکڑے سکڑائے ٹھنڈے فرش پر لیٹے تھے اور سردی سے کپکپا رہے تھے۔ ان کے علاوہ حوالات میں دو ملزم اور بھی تھے۔ وہ قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لائے گئے تھے۔

ارشاد الٰہی کی ماں جب لالی اور ارشاد الٰہی کے ساتھ حوالات میں داخل ہوئی تو اس قدر خوف زدہ تھی کہ بت بنی خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی گھبرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھتی کبھی ارشاد الٰہی کو۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس کچھ بجا ہوئے تو اس نے لالی سے پوچھا۔

"لالی پتر' پولسئے ہم کو پکڑ کر کیوں لائے ہیں؟"

ارشاد الٰہی بھی اب تک دم بخود بیٹھا تھا۔ اس نے بھی لالی سے ایسا ہی سوال کیا۔ لالی کیا جواب دیتا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ تینوں کو گرفتار کر کے کیوں حوالات میں بند کیا گیا ہے؟ اسے صرف اتنا شبہ تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے احسان علی شاہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن پولیس نے ان کے خلاف کیا الزام عائد کیا ہے اس کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ مگر اس نے اپنے شبے کا ارشاد الٰہی اور اس کی ماں سے مطلق اظہار نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔

"پتہ نہیں پولیس نے ہم کو کیوں پکڑا ہے؟ سمجھ نہیں آتی ایسی کارروائی ہمارے خلاف کیوں کی گئی؟ صبح ہونے ہی پر پتہ چل سکے گا۔" اس نے چوکنا نظروں سے باہر کی جانب دیکھا۔ کسی کانسٹیبل کو دروازے کے قریب نہ پایا تو رسان سے دونوں کو سمجھایا۔ "ایس ایچ او کے سامنے میں جو بیان دوں تم دونوں بھی وہی کہنا۔ یہ ہرگز نہ بتانا کہ تم جوند سنگھ والا کے بس شاپ پر بھیک مانگتے تھے۔ بے بے' تو زیادہ نہ بولنا۔ تو بھی مصیبت میں پھنس جائے گی اور ہم کو بھی پھنسوا دے گی۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

لالی دونوں کو اسی طرح دیر تک سمجھاتا بجھاتا رہا۔ طرح طرح سے تسلی دیتا رہا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ خوف زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جاڑوں کی پہاڑ سی رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ تینوں سونے کی کوششیں کرتے رہے۔ بے

چین ہو کر بار بار پہلو بدلتے۔ مگر سو نہ سکے۔ آنکھ لگ جاتی تو ذرا ہی دیر بعد کھل جاتی۔ کڑاکے کی سردی تھی اور طرح طرح کے اندیشے ستاتے تھے۔ البتہ دوسرے دونوں ملزم حوالات کے ایک گوشے میں بے خبر سو رہے تھے۔ وہ اقبال جرم کر چکے تھے یا ان کو امید تھی کہ جلد ہی ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔

صبح ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان کے سامنے تینوں کی پیشی ہوئی۔ وہ بڑا قوی ہیکل پولیس افسر تھا۔ چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ تینوں کو کھڑا رکھا۔ وہ کچھ دیر تینوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔

''تم سب کیا کرتے ہو؟ کوٹلہ ہرکشن کس لیے آئے تھے۔''

''ہم جی کیمبل پور سے آئے تھے۔ ادھر ہماری زمیں داری ہے۔'' لالی نے تینوں کی نمائندگی کرتے ہوئے وہی کہا جو اپنے بارے میں نادر خان کو بتا چکا تھا۔ اس نے ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''یہ چوہدری نور الٰہی کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی ہے۔ اس کا پیو کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار ہوتا تھا۔ اسے پچھلے ہی دنوں اس کی موت کا پتہ چلا۔ اس کے وارث کی حیثیت سے یہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے پیو کی زمیں داری اور جائیداد سنبھالنے کو ٹلہ ہرکشن آیا تھا۔''

ارشاد الٰہی نے بھی ایسا ہی بیان دیا۔ کلثوم بی بی نے اس کی تائید کی۔

''تو گویا تم زمیں دار ہو۔'' تھانیدار شاہ نواز خان اعوان نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ''اور کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری کا قبضہ لینے آئے ہو۔''

''ہاں جی، ہم اسی لیے آئے ہیں۔'' لالی نے بیٹھنے کے لیے کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''سیدھا کھڑا ہو۔'' تھانے کے ایس ایچ او نے زور سے لالی کو ڈانٹا۔ وہ ایک دم روایتی تھانے دار بن گیا۔ چہرے پر خشونت چھا گئی۔ آنکھوں سے جلال برسنے لگا۔ اس نے تینوں کی پشت پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی جانب دیکھا اور آواز میں گھن گرج پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''میرداد!''

کانسٹیبل میرداد بڑھ کر آگے آیا اور اپنے جوتوں کی ایڑیاں کھٹاک سے ٹکرا کر سلیوٹ کیا۔

''ان کو منشی سمندر خان کے پاس لے جاؤ۔'' تھانے دار نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ ''اسے کہو ان کو لتر پریڈ کرائے۔ ایسی کہ زمیں داری کی گرمی بالکل اتر جائے۔''

میرداد نے حکم کی تعمیل میں زمیں داری کی گرمی وہیں اتارنا شروع کر دی۔ اس نے تڑاق سے لالی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ٹانگ گھما کر ارشاد الٰہی کے چوتڑوں پر زور سے ٹھڈ لگایا۔ کلثوم بی بی کا بازو

پکڑ کر جھٹکا دیا۔ تینوں کو مارتا پیٹتا' دھکے دیتا باہر لے گیا۔

تھانے دار شاہ نواز خان اطمینان سے بیٹھا ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور تینوں کی درگت بنتے دیکھتا رہا۔

کانسٹیبل میرداد انھیں اس جگہ لے گیا جہاں ملزموں سے اقبال جرم کرایا جاتا تھا۔ تینوں کو وہاں پہنچا کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔

کلثوم بی بی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں لالی سے پوچھا۔ "لالی پتر یہ لتر پریڈ کیا ہوتی ہے؟"

"یہ سب ہم کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔"

"پر ہم کو کیوں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟" کلثوم بی بی نے پوچھا۔ "ہم نے کیا جرم کیا ہے جو ہمارے ساتھ ایسا کیا جا رہا ہے؟"

کلثوم بی بی بہت دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ ارشاد الٰہی بھی سہما ہوا تھا۔ لالی نے قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے یہ سارا چکر احسان علی شاہ نے چلایا ہے۔ اس نے جائیداد اور زمیں داری پر زبردستی کبضہ جو کر رکھا ہے۔ وہ تم دونوں کو زمیں داری اور جائیداد دینا نہیں چاہتا۔ پولیس کے ذریعے دباؤ ڈلوا رہا ہے تاکہ ہم جائیداد اور زمین داری اس سے نہ لے سکیں۔ اس کے علاوہ اور تو کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔"

"مجھے تو زمیں داری اور جائیداد ملتی ملاتی ملوم نہیں ہوتی۔" کلثوم بی بی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے بے حوصلے سے کام لے۔ زمیں داری اور جائیداد سب کچھ تم دونوں کو ملے گی اور ضرور ملے گی۔ تمہارا اس پر کنونی حک بنتا ہے۔" لالی نے اس کی ہمت بندھائی۔ ساتھ ہی ایک بار پھر خبردار کیا۔ "پر بے بے تو بالکل وہی کہنا جو میں نے کہا ہے۔ گھبرانا نہیں' سب ٹھیک ہی ہو گا۔" اس نے مڑ کر ارشاد الٰہی کی جانب دیکھا۔ "شادے! تو بھی حوصلہ رکھ۔ ڈرنا شرنا نہیں۔ سچی بات یہ ہے۔"

مگر وہ سچی بات بتا نہ سکا۔ میرداد واپس آ گیا۔ اس کے ہم راہ سات کانسٹیبل اور تھے۔ ان میں منشی سمندر خان بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ گینڈے کی طرح بھدا اور خوف ناک تھا۔ جسم مضبوط تھا۔ دوسرے بھی ہٹے کٹے اور کیم شحیم تھے۔

میرداد نے لالی' ارشاد الٰہی اور اسکی ماں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سمندر خان کو

بتایا "یہ رہے جی ملزمان۔ دھوکا دہی اور چار سو بیسی کے الزام میں کوٹلہ ہر کشن سے گرفتار کر کے لائے گئے ہیں۔"

"حوالدار جی' ہم نے نہ کوئی چار سو بیسی کی ہے اور نہ کسی کو دھوکا دیا ہے۔" لالی نے منشی سمندر خان کو مخاطب کرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ "ہمارے خلاف یہ بالکل غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ ہم تو کوٹلہ ہر کشن۔"

"بکواس نہ کر۔" منشی نے لالی کو غصے سے جھڑک دیا۔ آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "مجھے پتہ ہے تم کوٹلہ ہر کشن کس لیے آئے تھے۔" اس نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔ "لیا ایس نو چھتر۔"

ایک کانسٹیبل بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیوب ویل کے پٹے کے دو ٹکڑے دبے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک لگ بھگ دو فٹ لمبا تھا۔ یہ چھتر تھے۔ ان کو لتر بھی کہا جاتا ہے۔ لالی ایسے چھتر پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ تھانے میں ملزموں کے خلاف ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سمندر خان کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔

"حوالدار' میری گل تو سن۔"

سمندر خان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کانسٹیبلوں سے کہا۔ "ان دونوں کو چھتر پریڈ کے لیے تیار کرو۔" اس نے لالی اور ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

لالی نے بار بار احتجاج کیا۔ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بات سننے کے بجائے تھپڑوں اور لاتوں سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ کانسٹیبلوں نے دونوں کے کپڑے اتارے اور مادر زاد برہنہ کر دیا۔ کلثوم بی بی ایک گوشے میں دہشت زدہ بیٹھی تھی۔ اس نے لالی اور اپنے جوان بیٹے کو اس عالم میں دیکھا تو بدحواس ہو کر اپنا منہ چادر سے چھپا لیا۔

دونوں کو برہنہ کر کے فرش پر اوندھے منہ لٹا دیا گیا۔ چار کانسٹیبل لالی اور ارشاد الٰہی کا ایک ایک ہاتھ دبا کر بازوؤں پر بیٹھ گئے۔ ایک کانسٹیبل' لالی کی دونوں ٹانگیں جوڑ کر پنڈلیوں پر اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں پیر اس کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ارشاد الٰہی کی ٹانگیں دبوچ کر اسی طرح ایک اور کانسٹیبل بیٹھ گیا۔ کانسٹیبلوں نے دونوں کو اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ وہ اپنے جسموں کو بالکل نہ ہلا سکتے تھے۔

جب دونوں کانسٹیبلوں نے لالی اور ارشاد الٰہی کو بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تو سمندر خان آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھتر دبا تھا۔ دوسرا چھتر میرداد کے ہاتھ میں

تھا۔ وہ بڑھ کر ارشاد الٰہی کے قریب پہنچ گیا۔ سمندر خان اور میرداد ہاتھ گھما گھما کر لالی اور ارشاد الٰہی کی کمر اور چوتڑوں پر سڑاک سڑاک چھتر مارنے لگے۔

لالی کے لیے یہ نیا تجربہ نہ تھا۔ وہ تھانوں کے اندر پولیس کے ہاتھوں کئی بار چھتروں کی مار کھا چکا تھا۔ اینٹوں کے بھٹوں پر بھی جمعدار اور کارندوں کے ہاتھوں اسی طرح پٹ چکا تھا۔ البتہ ارشاد الٰہی کو پولیس کے ایسے تشدد سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ مگر بھٹوں پر جمعدار اور کارندوں کے ہاتھوں وہ بھی بارہا چھتروں کی مار کھا چکا تھا۔ لہٰذا دونوں نے نہ دہائی دی اور نہ واویلا کیا۔ خاموشی سے مار کھاتے رہے۔ صرف دانتوں کو بھینچ کر سسکیوں کی سی آوازیں منہ سے نکالتے اور تکلیف سے بے قرار ہو کر ادھر ادھر پہلو بدلنے کی کوشش کرتے۔

ارشاد الٰہی کی ماں نے کچھ دیر تو ضبط کیا۔ سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور بیٹے پر ہوتے ہوئے ظلم و ستم کو دیکھتی رہی۔ بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔ آخر اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بے قرار ہو کر گڑ گڑانے لگی۔

"وے اسے نہ مار۔ اسے ٹی بی ہے۔ اسے بخار رہتا ہے۔ کھانسی کے ساتھ خون آتا ہے۔ یہ مر جائے گا۔"

"اوئے بکواس نہ کر۔" کانسٹیبل میرداد نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی۔ پھر تڑپ کر اٹھی اور میرداد کے پیروں پر سر رکھ دیا جو ارشاد الٰہی کی چھتر سے پٹائی کر رہا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کلثوم بی بی کی کمر اور پیٹھ پر ٹھوکریں ماریں۔ غصے سے دھتکارا۔ گالیاں دیں۔ بال پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن اس نے پیر نہ چھوڑے۔ میرداد کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ مارتے مارتے تھک بھی گیا تھا۔ اس نے مڑ کر حوالدار سمندر خان کی جانب دیکھا۔

"بہت ہو گیا۔ اتنا کافی ہے اس کے لیے۔"

سمندر خان بڑھ کر قریب پہنچا۔ ٹھوکر مار کر ارشاد الٰہی کو حکم دیا۔ "کھڑا ہو جا۔"

ارشاد الٰہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عالم یہ تھا کہ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ حواس بجا نہیں تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ٹکر ٹکر سمندر خان کو دیکھ رہا تھا۔

☆

میرداد، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔

ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان ابھی تک اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دونوں کو گردن اٹھا کر دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”اتر گئی زمیں داری یا ابھی کچھ اور اتاری جائے۔“

ارشاد الٰہی دم بخود کھڑا رہا۔ مگر اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔ ”نہیں جی، ہم نے کوئی زمیں داری ومیں داری نہیں کرنی۔“

”کیا یہ سچ ہے، تم دونوں اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا پر بھیک مانگتے تھے؟“ ایس ایچ او نے دریافت کیا۔

کلثوم بی بی نے وضاحت کرنا چاہی۔ ”وہ ایسا ہے جی، جب ہم نصیر پور سے پاکستان پہنچے تو شادا کا پیو...“

”بکواس نہ کر۔“ ایس ایچ او شاہ نواز خان نے غصے سے ڈانٹا۔ ”جو پوچھتا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔“

”ہن جی، ہم دونوں جوند سنگھ والا کے بس سٹاپ پر بھیک مانگتے تھے۔“ کلثوم بی بی نے گھبرا کر اعتراف کیا۔

”کیمبل پور تم دونوں کس سلسلے میں گئے تھے؟“

”نہیں جی، ہم ادھر کبھی نہیں گئے۔“ ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ہم نے تو جی کیمبل پور دیکھا بھی نہیں۔“

”لالی، تم کو کہاں ملا تھا؟“ تھانیدار شاہ نواز خان اعوان نے سوال کیا۔

”وہ جی پہلی بار مجھے لہور میں ملک نثار کے بھٹے پر ملا تھا۔“ اس دفعہ ارشاد الٰہی نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ادھر پتھیرے ہوتے تھے۔“

”ہم کو تو جی کچھ پتہ نہیں تھا۔“ کلثوم بی بی نے صفائی پیش کی۔ ”لالی ہم کو بہکا کر زمیں داری اور جائیداد دلانے جوند سنگھ والا سے کوٹلہ ہرکشن لایا تھا۔“

تھانیدار نے لمبی ”ہوں“ کی۔ ہولے ہولے گردن ہلائی۔ ”تو لالی تم دونوں کو کوٹلہ ہرکشن لایا تھا۔“ لمحہ بھر کے لیے اس نے خاموشی اختیار کی۔ پھر دریافت کیا۔ ”مائی، تیرا اور کون کو ہے؟ میرا مطلب ہے۔ کوئی شریکا، کوئی عزیز دار۔“

”میرا بس یہی ایک پتر ہے۔“ کلثوم بی بی نے ارشاد الٰہی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں۔ وڈا پتر کرم الٰہی تھا۔ پاکستان آتے ہوئے تریموں کے پتن پر سکھ بلوائیوں نے اسے مار ڈالا۔ میری وڈی دھی صابرہ تھی۔ اسے بلوائی اٹھا لے گئے۔ چھوٹی میرے ساتھ پاکستان آئی

تھی۔ وہ بھی مر گئی۔ گھر والا بھی نہیں رہا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ "اب تو جی ہم دونوں کا کوئی بھی نہیں رہا۔"

"ٹھیک ہے۔" تھانیدار شاہ نواز نے مڑ کر کانسٹیبل میرداد کی طرف دیکھا۔ "میرداد' ان کو لے جاؤ۔ روٹی شوٹی کھلاؤ۔ انھیں آرام سے رکھو۔"

میرداد نے ایک بار پھر اٹینشن ہو کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان کے ہم راہ دروازے کی جانب بڑھا۔ ایس ایچ او نے اسے ٹوکا۔ "میرداد۔"

میرداد ٹھٹکا۔ پلٹ کر ایس ایچ او کی جانب متوجہ ہوا۔ ایس ایچ او نے حکم دیا۔ "ان کو حوالات میں پہنچا کر لالی کو ادھر بھیج دو۔"

تینوں چلے گئے۔ ایس ایچ او شاہ نواز خان خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

لالی ایک کانسٹیبل کے ساتھ ایس ایچ او کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

تھانیدار نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "تو کیمبل پور کا زمیں دار ہے ناں؟"

"ہاں جی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

"تیری زمیں داری ابھی نہیں اتری۔ کچھ اور اتاری جائے۔" تھانیدار نے غضب ناک ہو کر ڈانٹا۔ "ارشاد الٰہی کے ساتھ اینٹوں کے بھٹے پر تو نہیں تیری ماں کا کوئی یار پتھیرا لگا ہوا تھا؟"

لالی نے چونک کر تھانیدار کو دیکھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ سر جھکایا اور خاموش کھڑا رہا۔

"کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری پر دھوکے فریب سے کبضہ کرنے کے لیے تجھے کوئی اور نہیں ملا؟" تھانیدار تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "اوہ لاریاں جوند سنگھ والا پر بھیک مانگنے والے یہ دونوں بھکاری ہی تجھے ملے۔"

لالی سمجھ گیا کہ سارا کھیل بگڑ گیا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے سب کچھ اگل دیا۔ اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے پسپائی اختیار کی۔ عاجزی سے بولا۔ "غلطی ہو گئی جی۔"

"سوال یہ ہے کہ تو نے یہ خطرناک کھیل کیوں کھیلا؟" تھانیدار شاہ نواز خان نے زور دے کر پوچھا۔ "سچ سچ بتا' تو نے ایسا کیوں کیا؟ کس لیے کیا؟" اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "جھوٹ بولا تو منجی چڑھاؤں گا۔ رولر پھروا دوں گا۔ الٹا لٹکا کر چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔ ایسی مار لگاؤں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔"

"میں نے جی جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔" لالی نے گڑگڑا کر صفائی پیش کی۔
"یہ ٹھیک ہے جی ارشاد الٰہی اور اس کی ماں جوندوالا سنگھ کے بس سٹاپ پر بھیک مانگتے ہیں۔ پر یہ بالکل سچ ہے ارشاد الٰہی کوٹلہ ہرکشن کے زمیں دار چوہدری نور الٰہی مرحوم کا پتر ہے اور اس کی ماں چوہدری کی بیوہ ہے۔ دونوں اس کی جائیداد کے اصلی وارث ہیں۔"
"پر نہ تو ارشاد الٰہی نے اور نہ ہی اس کی ماں نے اپنے بیان میں ایسی کوئی گل بات میرے سامنے کہی۔" تھانیدار نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ "تو اویں پھنے خان بن کے آگیا۔"
لالی مرعوب نہ ہوا۔ اس نے نڈر ہو کر کہا۔ "دونوں نے تیرے سامنے ڈر کے مارے ایسی گل بات نہیں کہی۔ پر وہ عدالت میں جا کر یہی کہیں گے جو میں نے تجھے بتایا۔ یہ تو چوہدری نور الٰہی کے کلیم کے کاغذات سے ثابت ہو جائے گا کہ اس کا وارث کون ہے۔"
"تو نے کسی وکیل شکیل سے اس سلسلے میں مشورہ کیا ہے؟" تھانیدار کا لہجہ اس دفعہ بدلا ہوا تھا۔

لالی نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ خوف اور دہشت کے حصار سے وہ رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ابھی تو جی مشورہ نہیں کیا۔ پر بعد میں تو کیا جا سکتا ہے۔"
"جو تیرا جی کرے ضرور کرنا۔ یہ تیرا اور ارشاد الٰہی کا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔" تھانیدار نے اپنی غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "پر مجھے جو تفتیش کرنی ہے وہ تو کرنی ہی کرنی ہے۔ اس سلسلے میں تجھ سے بعد میں گل بات کروں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کی جانب ہاتھ اٹھاتے ہوئے کانسٹیبل کو ہدایت کی۔ "اسے لے جا۔ حوالات میں بند کر دے۔"
ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان نے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور دفتر سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کانسٹیبل نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ کانسٹیبل دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

☆

شام کو احسان علی شاہ کی جیپ تھانے کے باہر آکر رکی۔ نادر خان نیچے اترا اور تھانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تھانیدار شاہ نواز خان اعوان اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں خاموشی سے جا کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ آگے بڑھی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔
جیپ پیراں والہ پہنچی تو پہر رات گزر چکی تھی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ سر شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ تھانیدار اور نادر خان جیپ سے باہر نکلے۔ حویلی کے مہمان خانے میں پہنچے۔

آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ احسان شاہ آتش دان کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ تھانیدار کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ تھانیدار کو صوفے پر بٹھایا۔

احسان علی شاہ کا منیجر مہربان علی بھی کمرے میں موجود تھا۔ نادر خان بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش تھے۔

"شاہ نواز۔" احسان شاہ نے تھانیدار کو مخاطب کیا۔ "تو نے تینوں کی پٹائی شٹائی بھی کرائی؟"

"وہ تو جی کرانی ہی تھی۔" تھانیدار نے جواب دیا۔ "اس کے بغیر کیسے کام چلتا۔"

"انھوں نے کچھ کام کی گل بات بتائی؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"زیادہ ٹارچر کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ تینوں نے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔" تھانیدار نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "نادر خان کی اطلاع بالکل درست ہے۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا پر بھیک مانگتے تھے۔ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ پر تجھے یہ پتہ نہیں ارشاد الٰہی پہلے پتھیرا تھا۔ لالی بھی پتھیرا رہ چکا ہے۔ دونوں ایک ہی بھٹے پر کام کرتے تھے۔ وہیں دونوں میں میل جول پیدا ہوا۔"

"لالی پتھیرا رہ چکا ہے؟" نادر خان نے حیرت سے تھانیدار کو دیکھا۔ "وہ تو خود کو کیمبل پور کا زمیں دار بتاتا تھا۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس شان سے آیا تھا کہ میں تو اسے زمیں دار ہی سمجھا۔"

"مجھے بھی پہلے اس نے یہی بتایا تھا۔" تھانیدار نے کہا۔ "لیکن تر پریڈ کے بعد تینوں میرے سامنے پیش کیے گئے تو ساری زمیں داری شمیں داری بھول گئے۔ گڑگڑانے لگے۔ فریاد کرنے لگے۔ سب کچھ اگل دیا۔"

"تب تو تینوں کے خلاف سیدھا سیدھا دھوکا دہی کا کیس بنتا ہے۔" احسان علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"دھوکا دہی کا کیس ہی تو نہیں بنتا۔ ورنہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔" تھانیدار نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تینوں آسانی سے اندر ہو جاتے۔ سزا بھی لمبی ہو جاتی۔"

"دھوکا دہی کا کیس کیوں نہیں بنتا؟" مہربان علی نے دریافت کیا۔

"یار مہربان علی، تو نے اپنے یہ بال کہاں سفید کر لیے؟" تھانیدار نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں مہربان علی کو مخاطب کیا۔ "یہ تو سوچ اتنی وڈی زمین داری اور جائیداد پر کوئی بھکاری یا بھٹے کا معمولی پتھیرا دعویٰ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتا ہے؟ اس کے دعوے کی کچھ تو بنیاد ہو گی۔ ایسے ہی تو زمیں

داری اور جائیداد لینے نہیں چلے آئے۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ "کیس کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ ارشاد الٰہی کوٹلہ ہرکشن کے زمیں دار چوہدری نور الٰہی مرحوم کا پتر ہے اور کلثوم بی بی اس کی بیوہ ہے۔ اگر معاملہ عدالت میں گیا تو ارشاد الٰہی کا وکیل محکمہ سیٹلمنٹ کے ریکارڈ سے ثابت کر دے گا کہ دونوں چوہدری نور الٰہی کے وارث ہیں۔ تلاش کر کے اور بھی دستاویزی ثبوت مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ گواہ بھی آسانی سے مل جائیں گے۔ گورداس پور کے ادھر بہت مہاجر ہیں۔ ان میں موضوع نصیرپور کے رہنے والے بھی ہوں گے۔"

"کوئی اور کیس بنا کر تینوں کو اندر نہیں کرایا جا سکتا؟" احسان علی شاہ نے پوچھا۔

"اندر ہی کروانا ہے تو ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو 'انسداد گداگری ایکٹ کے تحت آسانی سے جیل بھجوایا جا سکتا ہے۔ اصلی دعویدار تو وہی دونوں ہیں۔" تھانیدار شاہ نواز خان نے وضاحت کی۔ "لیکن یہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۰۹ ہے اور اس دفعہ کے تحت زیادہ سے زیادہ چھے مہینے کی سزا ہو گی۔ رسہ گیری یا چوری ڈکیتی کا کیس بھی مشکل سے بنے گا اور اگر بن بھی گیا تو زیادہ لمبی سزا نہیں ہو گی۔" اس نے احسان شاہ کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "شاہ جی' کیس کے ان پہلوؤں پر وکیل کے ساتھ بیٹھ کر ہم پہلے ہی دیر تک غور کر چکے ہیں۔ اور آخر اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ایسے فوجداری مقدمات سے تیرا کام نہیں بنے گا۔ یہ جائیداد کا جھگڑا ہے۔ سیدھا سیدھا سول کیس ہے۔ اس کا فیصلہ تو عدالت دیوانی سے ہو گا۔ اسے لڑنے کے لیے تیرا کیس بہت کمزور ہے۔ میری یہ رائے وکیل نے بھی تسلیم کی تھی۔"

"جب کوئی مضبوط کیس ہی نہیں بنتا تو فیر تینوں کا ٹنٹا ہی کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔" احسان علی شاہ کی آنکھیں آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ آنچ میں کچھ زیادہ ہی سرخ نظر آنے لگیں۔ چہرے سے سفاکی جھلکنے لگی۔ "لاشیں بھی آسانی سے ٹھکانے لگائی جا سکتی ہیں۔"

"شاہ جی' پہلے بھی تو ایسا کہہ چکا ہے۔ میں ایک بار فیر تجھے کہوں گا۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔ ایسے خطرناک چکر میں نہ پڑ۔" تھانیدار کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "تیں نوں پتہ ہے' میرے خلاف قتل کے ایک کیس میں پہلے ہی انکوائری ہو رہی ہے۔ میرے تھانے کی حدود میں ایک نہیں اکٹھے تین قتل ہو گئے تو میں مارا گیا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "کیا تو میری نوکری لینا چاہتا ہے۔"

"کچھ اور سوچ۔" احسان علی شاہ نے زور دے کر کہا۔ "یہ سمجھ لے کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری میں نے ہرگز ہرگز نہیں چھوڑنی۔" اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔ "میں یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی

بھک منگا یا کمی کوٹلہ ہرکشن میں زمیں داری کرے جس کا میں زمیں دار رہ چکا ہوں۔ اب تو یہ میری عزت اور آن کا سوال بن گیا ہے۔"

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر مہربان علی کی آواز ابھری۔ "اب تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" تھانیدار نے دریافت کیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں سے سمجھوتہ کر لیا جائے؟" مہربان علی نے دبی زبان سے اپنی تجویز پیش کی۔ "انھیں یہ پیشکش کی جائے کہ وہ کچھ رقم لے کر اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائیں اور شاہ جی کے نام زمیں داری اور جائیداد منتقل کرنے پر راضی ہو جائیں۔ دونوں بھک منگے ہیں۔ آسانی سے تیار ہو جائیں گے۔ تھانے میں ایس ایچ او صاحب کی طرف سے دباؤ ڈالا جائے تو کام آرام سے بن جائے گا۔"

"یہ تجویز مہربان علی نے پہلے بھی پیش کی تھی۔ اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔" نادر خان نے مہربان علی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہونے کی بہت لمبی کیمت مانگیں گے۔ تب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ بھک منگے اور بالکل کنگال ہیں۔ اب تو صورت حال ہی بدل گئی۔ وہ بہت کم پر تیار ہو جائیں گے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں زیادہ سے زیادہ ۵۰ ہزار میں معاملہ طے ہو سکتا ہے۔" مہربان علی نے براہ راست احسان علی شاہ کو مخاطب کیا۔ "شاہ جی' کیا خیال ہے۔ اتنے روپے پر سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے؟"

"پچاس ہزار تک تو میں دینے کو تیار ہوں۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دے دوں گا۔" احسان علی شاہ نے مہربان علی کی تجویز بادل نخواستہ قبول کر لی۔ "جب ان کے خلاف کوئی مضبوط کیس ہی نہیں بنتا تو اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"شاہ جی' ایسا ہرگز نہ کرنا۔" تھانیدار نے مہربان علی کی تجویز سختی سے مسترد کر دی۔ "ایسا کیا گیا تو مجھے ڈر ہے ۵۰ ہزار روپے کے ساتھ ساتھ کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"وہ کیسے؟" مہربانی علی نے حیران و پریشان ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"سمجھوتے کی دستاویز پر دستخط ہونے کے بعد جب ۵۰ ہزار روپے مل جائیں گے تو لالی ان کو کسی وکیل کے پاس لے جائے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ بالکل ایسا کرے گا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔"

تھانیدار نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ "ویسے بھی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ لالی ہو یا کوئی اور وہ لاکھوں روپے کی اتنی وڈی جائیداد صرف ۵۰ ہزار میں دینے پر کیسے تیار ہو جائے گا؟ وہ وکیل کے ساتھ جا کر تھانے میں رپٹ درج کرائیں گے کہ شاہ جی نے ان سے زبردستی دستاویز پر دستخط کروا لیے۔ اعانت جرم کے الزام میں مجھے بھی ساتھ میں شامل کریں گے کہ میں نے تھانے میں لے جا کر ان پر دباؤ ڈالا۔ ڈرایا دھمکایا۔ میرے خلاف حبس بے جا میں رکھنے' مار پیٹ اور تشدد کرنے کے الزام میں دفعہ ۳۰۷ کے تحت مقدمہ چلائیں گے۔ ابھی تو وہ بالکل ننگے بھوکے ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں۔ ۵۰ ہزار روپے ان کے ہاتھ میں آئے تو اسی سے شاہ جی کے خلاف شان سے مقدمہ لڑیں گے۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ احسان شاہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مہربانی علی اور نادر خان بھی گم صم تھے۔ آتش دان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک زور سے چٹخی۔ ایک شرارہ تیزی سے ابھرا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا فضا میں بکھر گیا۔

احسان شاہ نے چونک کر آتش دان کی جانب دیکھا اور لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے انگاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر تھانیدار کی طرف متوجہ ہوا۔ "شاہ نواز' تو یہ چاہتا ہے کہ میں کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری ان بھک منگوں کو دے دوں۔ یہ نہیں ہو گا۔" اس کے چہرے پر غم و غصے کے سائے پھیل گئے۔ "تو میری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟ تیری یاری میرے کب کام آئے گی؟"

"شاہ جی۔" تھانیدار نے احسان شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "۵۰ ہزار انھیں دینے کی بجائے تو مجھے دے سکتا ہے؟"

"یہ روپے تو لے لے۔ پر میرا کام پکا ہونا چاہیے۔" احسان علی شاہ فوراً رضامند ہو گیا۔

"رب سوہنہ' مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی لینا حرام ہے۔" تھانیدار نے قسم کھا کر احسان شاہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "اگر ایک بندہ ہوتا تو دس ہزار ہی میں کام بن جاتا۔ لیکن وہ اکٹھے تین ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "اب تک تو لیتا ہی رہا مگر تیری خاطر اس دفعہ رشوت دوں گا اور ان سب کو دوں گا جن سے مجھے کام کرانا ہے۔"

"مگر تو میرا کام کرائے گا کیسے؟" احسان علی شاہ نے پوچھا۔ "روپے تو میں تجھے کل ہی صبح پہنچا دوں گا۔"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" تھانیدار نے کھل کر بات نہیں کی۔ "میں چاہتا ہوں تیرا کام بھی بن جائے اور کوئی خطرہ بھی مول لینا نہ پڑے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "شاہ جی اب مجھے

جانے دے۔ تیرے کام کے لیے ابھی سے کوشش کرنی ہوگی۔" تھانیدار شاہ نواز اعوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تیرا کام تو ہو جائے گا لیکن میرے کام کا کیا بنا؟"

"تو میرا کام نہ بھی کرتا تب بھی تیرا کام تو مجھے کرانا ہی تھا۔" احسان علی شاہ نے تھانیدار کو یقین دلایا۔ "تو اس کی فکر نہ کر۔ تیرے کام کے لیے کل ہی لہور جا رہا ہوں۔"

احسان علی شاہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆

حوالات سے قتل کے دونوں ملزم جا چکے تھے۔ اب صرف ارشاد الٰہی' اس کی ماں اور لالی رہ گئے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ مگر ارشاد الٰہی پولیس کی مار سے ابھی تک سنبھلا نہیں تھا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ کروٹ بھی بدلتا تو بدن سے ٹیس اٹھتی۔ وہ فرش پر نڈھال پڑا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں لیٹی تھی۔ وہ دل گرفتہ اور بجھی بجھی سی تھی۔ کوٹلہ ہر کشن کے قیام کے دوران اس نے مستقبل کے جو سنہرے خواب دیکھے تھے' بکھر کر تار تار ہو چکے تھے۔

لالی کے بھی کمر اور پیٹھ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ مگر وہ حوصلے والا تھا۔ کئی بار اس سے بھی زیادہ سخت مار کھا چکا تھا۔ اس نے ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو تسلی دینا چاہی مگر انھوں نے بے رخی اختیار کی۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ لالی نے ان کے رویّے میں یہ تبدیلی دیکھی تو صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں مطلق نہ پسیجے' بلکہ ارشاد الٰہی کی ماں نے نفرت سے منہ بگاڑ کر جھڑک دیا۔

"وے تنگ نہ کر۔ ہم نے اب تجھ سے کوئی گل بات نہیں کرنی۔"

لالی نے ڈھیٹ بن کر اسے منانے کی کوشش کی۔ "بے بے' بہت ناراض ملوم ہوتی ہے۔ مجھے بتا' تو اتنی ناراض کیوں ہے؟"

کلثوم بی بی نے اسے گھورا اور ایسا منہ پھیرا کہ دوبارہ پلٹ کر نہ دیکھا۔

تینوں کھانا کھا چکے تھے۔ انھیں کمبل بھی دیے گئے تھے۔ مگر بہت بوسیدہ اور گندے تھے۔ ان میں جوئیں بھی تھیں۔ لیکن انھیں اوڑھ کر وہ سردی سے کسی قدر محفوظ رہ سکتے تھے۔ وہ فرش پر خاموش لیٹے تھے۔ انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ صرف لالی نے ایس ایچ او کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ تینوں کو دھوکا اور فریب دہی کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کیا گیا ہے۔ لیکن وہ صفائی پیش کر چکا تھا اور مزید صفائی پیش کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

تینوں رات گئے تک جاگتے رہے۔ حوالات کے باہر پولیس والوں کے بولنے اور بھاری بھاری

بوٹوں سے چلنے پھرنے کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن ان کے پاس کوئی نہ آیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے تینوں سو گئے۔

صبح ہو گئی۔ کوئی ان کے پاس نہ آیا۔ دن چڑھے انھوں نے ایس ایچ او کو اپنے دفتر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر اس نے تینوں میں سے کسی کو اپنے دفتر میں نہ بلایا۔ بہت دیر بعد وہ باہر نکلا۔ تینوں نے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے سے اسے دیکھا۔ لیکن اس نے مڑ کر ایک نظر بھی ان پر نہ ڈالی۔ خاموشی سے چلا گیا۔

دوپہر ہو گئی۔ لیکن نہ کوئی کانسٹیبل ان کے پاس آیا اور نہ ہی کھانے کو کچھ ملا۔ وہ شام تک انتظار کرتے رہے۔ بھوک نے ستایا تو لالی نے لوہے کا دروازہ ہلا ہلا کر شور مچایا۔ کھانے کو مانگا۔ ارشاد الٰہی تو چپ پڑا رہا۔ مگر اس کی ماں چپ نہ رہی۔ اس نے بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

وہ زیادہ دیر ہنگامہ برپا نہ کر سکے۔ چار کانسٹیبل شام کے دھندلکے میں حوالات کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے ننگی ننگی گالیاں دیں۔ تھپڑوں اور لاتوں سے تینوں کو بے رحمی سے مارا پیٹا۔ ان کے جسم پر جو لباس تھا اسے بھی نوچ ناچ کر تار تار کر دیا۔ کھانے کو بھی کچھ نہ دیا۔ واپس گئے تو کمبل بھی اٹھا کے لے گئے۔

پہر رات گزر گئی۔ تینوں بھوک سے نڈھال تھے۔ اور ٹھنڈے فرش پر لیٹے سردی سے کپکپا رہے تھے۔ دفعتہً حوالات کا دروازہ کھلا۔ اس دفعہ تین کانسٹیبل اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بالٹیاں دبی تھیں۔ ان میں کیچڑ اور غلاظت ملا ہوا کالا کالا پانی بھرا تھا۔ ارشاد الٰہی، اس کی ماں اور لالی نے ان کو دیکھا۔ مگر سہمے ہوئے پڑے رہے۔ کانسٹیبلوں نے گندے پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں تینوں پر الٹ دیں۔ انھوں نے احتجاج کیا تو کانسٹیبلوں نے ٹھوکریں مار مار کر اور ڈانٹ ڈپٹ کے خاموش کرا دیا۔

تینوں پہلے ہی سردی سے کپکپا رہے تھے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جسم پر پڑا تو سردی سے ان کا اور برا حال ہو گیا۔ دو کانسٹیبل حوالات کے باہر دروازے پر تعینات تھے۔ وہ وقفے وقفے سے اندر جاتے تینوں کو جھنجھوڑتے اور زور زور سے ٹھوکریں مارتے۔ تمام رات وہ یہی کارروائی کرتے رہے۔ نہ خود سوئے اور نہ ہی ارشاد الٰہی، اس کی ماں اور لالی کو سونے دیا۔

دن نکلا، کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی بدل گئی۔ دو نئے کانسٹیبل آ گئے۔ وہ بھی وقفے وقفے سے اندر جاتے۔ جھنجھوڑتے، لاتیں مارتے، ٹھوکریں لگاتے۔ طرح طرح سے ستاتے۔ انھوں نے دن میں بھی تینوں کو سونے نہ دیا اور نہ ہی کھانے کو کچھ دیا۔

شام کو دونوں کانسٹیبل چلے گئے۔ دو نئے کانسٹیبل ڈیوٹی پر آ گئے۔ انھوں نے بھی لالی، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو نہ کھانے کو کچھ دیا اور نہ ہی سونے دیا۔ رات بھر تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دیتے رہے۔ ڈانٹتے ڈپٹتے رہے۔ جھنجھوڑتے رہے۔ ٹھوکریں اور لاتیں مارتے رہے۔ انھیں بیدار رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزماتے رہے۔ بھوک اور شب بیداری سے وہ اس قدر بے حال تھے کہ نہ بول سکتے تھے نہ بات کر سکتے تھے اور نہ ہی کسی طور احتجاج کر سکتے تھے۔ جاڑوں کی یہ طویل اور سرد رات بھی تینوں نے سخت اذیت اور کرب کے عالم میں بسر کی۔

صبح ہوتے ہی رات کی شفٹ کے کانسٹیبل رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے گھنٹہ بھر بعد صرف ایک کانسٹیبل آیا۔ وہ ان کے لیے کھانا بھی لایا مگر مسلسل فاقہ کشی اور شب بیداری کے باعث وہ اس قدر ناتواں اور نڈھال تھے کہ ان سے کچھ کھایا نہ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی تینوں کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈالی گئیں اور کانسٹیبلوں کی نگرانی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا دیا گیا۔

عدالت میں پولیس کی جانب سے ان کے خلاف چالان پیش کیا گیا جس کے مطابق تینوں کی گرفتاری لیونسک ایکٹ کے تحت عمل میں آئی تھی۔ پولیس نے انھیں پاگل اور جنونی قرار دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مسمیان لالی اور ارشاد الٰہی اور مسمات کلثوم بی بی لاوارث اور بے سہارا ہیں۔ کوئی ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرنے والا نہیں۔ ان کو اگر آزاد اور کھلے بندوں گھومنے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تو وہ حالت جنون میں نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی زندگی کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہٰذا عدالت مجاز سے درخواست کی جاتی ہے کہ امن عامہ کے بہترین مفاد میں انھیں اس وقت تک نظر بند رکھنے کے احکامات صادر کیے جائیں جب تک ان کا ذہنی توازن درست نہ ہو جائے۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو مجسٹریٹ کے روبرو تینوں کی پیشی ہوئی۔ پیش کار نے ان کے مقدمے کی مسل مجسٹریٹ کے ملاحظے کے لیے پیش کی۔ اس نے مسل کھولی۔ پولیس کے چالان کا مطالعہ کیا۔ گردن اٹھا کر تینوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ بال خاک دھول اور میل سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرے اور لباس کیچڑ اور گندے پانی سے آلودہ ہو کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ مسلسل جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لالی کی شلوار کا ایک پانچا غائب تھا۔ دوسرا نصف سے بھی کم رہ گیا تھا۔ قمیص پر جگہ جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ آستینیں بھی غائب تھیں۔ ارشاد الٰہی کے جسم پر میلی چیکٹ قمیص تھی اور شلوار پھٹ کر جانگیا بن گئی تھی۔ اس کی ماں

کے سر سے دوپٹہ غائب تھا۔ کرتا اور شلوار اس طرح پھٹے ہوئے تھے کہ وہ نیم برہنہ ہو گئی تھی۔

تینوں سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کے گھناؤنے چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجسٹریٹ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے سروں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ وہ بے چین ہو کر بار بار اپنے بالوں کو کھبڑ کھبڑ کھجا رہے تھے۔ وضع قطع اور حلئے سے تینوں پاگل اور سودائی نظر آ رہے تھے۔

مجسٹریٹ ٹکٹکی باندھے ذرا دیر تک ان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر سر جھکا کر فیصلہ لکھنے لگا۔

لالی کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ عدالت کو اس ظلم و ستم سے آگاہ کرے گا جو اس پر، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں پر پچھلے چند روز میں پولیس کے ہاتھوں ڈھایا گیا تھا۔ مقدمے کی نوعیت اور اصل حقیقت تفصیل سے مجسٹریٹ کے سامنے بیان کرے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے نہ اس سے کوئی سوال کیا نہ ہی اس کا بیان ریکارڈ کیا۔ تینوں سے سرے سے کوئی بات ہی نہیں کی۔

لالی خاموش کھڑا سوچتا رہا اور مجسٹریٹ سر جھکائے لکھتا رہا۔ اس نے پولیس کے موقف کی تائید کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ جیل کا ڈاکٹر حسب قاعدہ تینوں کا معائنہ کرے اور اگر وہ بھی اپنی طبی رپورٹ میں انھیں پاگل اور ذہنی عدم توازن کا شکار قرار دے تو تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۶ کے تحت ان کے خلاف ضابطے کے کارروائی عمل میں لائی جائے۔

مجسٹریٹ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پولیس کی نگرانی میں تینوں کو ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ لالی نے ڈسٹرکٹ جیل کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ مجسٹریٹ نے جوڈیشل ریمانڈ پر تینوں کو جیل میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابھی مقدمے کی سماعت مکمل نہیں ہوئی۔ وہ اس جیل میں پہلے بھی حوالاتی کی حیثیت سے رہ چکا تھا۔ لہٰذا اسے بخوبی علم تھا کہ جن ملزموں کے مقدمات زیر سماعت ہوتے ہیں انھیں سینٹرل جیل کے بجائے ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ آئندہ پیشی پر وہ اپنے بیان میں کیا کہے گا اور کس طرح تینوں کو مظلوم اور بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرے گا؟

جیل میں پہنچنے کے بعد ڈاکٹر نے تینوں کا طبی معائنہ کیا۔ مگر اس نے بھی مطلق پوچھ گچھ نہ کی۔ چند ہی منٹ میں تینوں کو نبٹا دیا اور ان کے پاگل اور جنونی ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے اپنی رپورٹ جیلر کو پہنچا دی۔

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے خلاف کیا کارروائی کی جا رہی ہے۔ لالی بھی صورت حال سے قطعی بے خبر تھا۔ مگر جب اسے اور ارشاد الٰہی کو اس عقوبت خانے میں داخل

کیا جانے لگا جس میں پاگلوں کو قید رکھا جاتا تھا تو لالی بہت سٹ پٹایا۔ اس نے گھبرا کر احتجاج کیا۔

"اوئے نمبردار، یہ تو چریا وارڈ ہے۔ اس میں کیوں بند کر رہا ہے؟" وہ لال ٹوپی والے نمبردار کی جانب متوجہ ہوا۔ "یار، میں پاگل شاگل نہیں ہوں، میرا دماغ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

نمبردار نے منہ بگاڑ کر اسے غصے سے ڈانٹا۔ "اوئے چپ کر۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "ہر پاگل یہاں آکر شروع شروع میں ایسی ہی بکواس کرتا ہے۔" اس نے دھکا دے کر لالی کو اندر کر دیا۔ لالی برابر واویلا کرتا رہا۔ "نمبردار، میری گل تو سن۔ یار، میری گل تو سن۔" مگر اس نے لالی کی ایک نہ سنی۔ پلٹ کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ وہ حیران و پریشان کھڑا ٹکر ٹکر اس کا منہ تک رہا تھا۔ نمبردار نے ایک ہاتھ سے اپنی لال ٹوپی درست کی اور دوسرے ہاتھ سے ارشاد الٰہی کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ نمبردار نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا۔ بے نیازی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

قریب ہی زنانہ پاگل خانہ تھا۔ ارشاد الٰہی کی ماں کو اس میں پہنچا دیا گیا۔ پاگل خانے کی کوٹھری میں دو عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ دونوں ہی سڑی سودائی تھیں۔ کلثوم بی بی کو دیکھ کر انھوں نے بے ڈھنگے پن سے قہقہے لگائے۔ طرح طرح سے شکلیں بنائیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں کیں۔ خود کو ان کے نرغے میں پا کر کلثوم بی بی اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ چیخنے چلانے لگی۔

"ہائے میں مر گئی۔ یہ تو پاغل خانہ ہے۔" وہ غضب ناک ہو کر پاگل اور دیوانی عورتوں کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگی۔ "چپ کرو کنجریو۔ پرے ہٹو۔ میں پاغل شاغل نہیں ہوں۔" اس نے چیخ چیخ کر لالی کو بھی گالیاں اور کوسنے دیے۔ "وے لالی حرام دے۔ تیرا بیڑا ڈبے۔ ہم جوند سنگھ والا میں بھلے چنگے تھے۔ خانہ خراب، تو بہکا کر ہمیں وہاں سے لے آیا اور یہاں پاغل خانے میں ڈلوا دیا۔ وے تیرا ککھ نہ رہے۔ تو مر جائے۔"

کلثوم بی بی کی چیخ پکار چریا وارڈ میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے کوسنے اور طعنے سنے تو سخت پریشان ہوا۔ غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ اپنی بے بسی اور مجبوری پر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ پھر وہ ارشاد الٰہی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ فرش پر بے حال پڑا تھا۔ رک رک کر کھانس رہا تھا۔ کھانستے کھانستے اس نے ایک بار تھوکا تو بلغم کے ساتھ کہیں کہیں خون بھی ملا ہوا تھا۔ لالی گھبرا کر اس کی جانب بڑھا اور قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ارشاد الٰہی کے ماتھے پر ایک ہاتھ رسان سے رکھ دیا۔ ماتھا گرم تھا۔ ارشاد الٰہی کو بخار تھا۔ لالی اور زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"شادے! کیسی طبیعت ہے؟"
ارشاد الٰہی آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی نے اصرار کیا۔ لہجے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "بہت طبیعت خراب ہے؟" اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ "یار کچھ تو بتا۔ کیسی طبیعت ہے؟"
ارشاد الٰہی نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا۔ جھنجلا کر بولا۔ "کیسی بھی طبیعت ہے، تجھے اس سے کیا لینا؟"

"یار، تو بھی اپنی ماں کی طرح مجھ سے ناراض ہے۔" لالی نے خفگی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو تم دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ تجھے اور تیری ماں کو کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری اور جائیداد مل جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ اتنی خوشی ہوتی کہ میں تجھے بتا نہیں سکتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر میری طرح تم دونوں کی بھی قسمت خراب ہے۔"
ارشاد الٰہی نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ کچھ دیر اسی عالم میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لالی نے مزید کچھ نہ کہا۔ ارشاد الٰہی بھی خاموش لیٹا تھا اور رک رک کر کھانس رہا تھا۔
ان دونوں کے علاوہ کئی پاگل قیدی وہاں اور بھی موجود تھے۔ تین تو ایسے تھے جو اس وارڈ میں دس سال سے بھی زیادہ عرصے سے قید تھے اور ایک بوڑھا تو اتنا نحیف و ناتواں تھا کہ بولتا تھا تو آواز بھی لڑکھڑاتی تھی۔ مگر سب اس وقت خلاف معمول خاموش تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور سر جھکائے گم صم بیٹھا تھا۔ یکایک پشت کی جانب سے کسی نے اونچی آواز میں صدا لگائی۔
"اوئے بھول جا۔"

لالی چونکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ایک پاگل بائیں پیر کے گھٹنے پر دایاں پیر نکائے نہایت اطمینان سے آسن جمائے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لالی سخت حیران و پریشان ہوا۔ وہ سلیم لودھی تھا۔ ہاں وہی تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا۔ مگر اب وہ بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال سرکنڈوں کی مانند کھڑے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔
لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے سلیم لودھی کو دیکھ رہا تھا جسے اس بار بھی تخریب کاری اور ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں نظر بند کیا گیا تھا۔ اسے گرفتار کرکے پہلے شاہی قلعہ 'لاہور' کے عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا جہاں اس قدر ذہنی اور جسمانی تشدد کیا گیا کہ وہ اپنا ذہنی توازن

برقرار نہ رکھ سکا۔ لیکن ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرنے کے بجائے اسے پچھلے مہینے منٹگمری جیل منتقل کردیا گیا اور چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رکھا گیا۔ سلیم لودھی اس وقت لالی کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھا۔ اس کے لاغر جسم پر جیل کی وردی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ مراقبے کے عالم میں بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اسی عالم میں اس نے داہنا ہاتھ اٹھایا۔ انگشت شہادت کو چھت کی جانب بلند کیا اور پھروہی صدا لگائی۔ "اوئے بھول جا۔" سلیم لودھی نے اوئے کو اس طرح لمبا کر کے کھینچا کہ اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

لالی نے دل گرفتہ ہو کر سوچا' سلیم لودھی واقعی پاگل اور چریا ہو گیا ہے۔ اس کی اس صدا کا نہ معلوم کیا مطلب ہے۔ لیکن' اس خود فراموشی کے عالم میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے اور صرف پاگل اور دیوانہ رہ گیا ہے۔ اسے بھی سب کچھ بھول جانا چاہیے۔ یہ بھی بھول جانا چاہیے کہ وہ لالی ہے۔ اب وہ صرف ایک پاگل ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ جیل کے چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رہ کر اسے سلیم لودھی کی طرح پاگل ہی بن کر رہنا ہو گا۔ یہ ایسا وارڈ ہے جس میں داخل ہونے کا تو راستہ ہے مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس میں قیدی بننے کے بعد کوئی رہائی پا کر نہیں نکلتا۔ اس کی لاش ہی نکلتی ہے۔

سلیم لودھی نے ایک بار پھر اونچی تان میں صدا لگائی۔ "اوئے بھول جا۔"

ارشاد الٰہی پر یکایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچ کر زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس نے کھنکار کر فرش پر تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا خون کا لوتھڑا بھی نکلا۔ ارشاد الٰہی نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔

۱۸ر ستمبر ۱۹۸۹ء

(ختم شد)

وزارتِ مذہبی امور زکوٰۃ وعشر حکومتِ پاکستان

Great People to Fly With

تعاون۔ پی آئی اے

Printed at PIA Press